BROWN BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224350
UNIVERSAL
LIBRARY

PEACE CONFERENCE

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

ماہنامہ

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

فروری / مارچ
۱۹۵۱ء
قیمت سالنامہ دو روپے

سالانہ نو روپے
ششماہی پانچ روپے
فی پرچہ بارہ آنے

مکتبۂ شاہراہ ○ دہلی

نگار

راہ نما — ادارہ، ۳

مقالے

غلط رجحان — سید سجاد ظہیر، ۵
نیا ادبی فن — ممتاز حسین، ۹
ادبی تنقید — ڈاکٹر سلامت اللہ، ۱۳
جدید اردو شاعری — محمد حسن، ۱۶
میرے بھی صنم خانے — احمد ندیم قاسمی، ۲۳
فاختہ — سید وقار یحییٰ، ۳۸

نظمیں

اودھ کی خاکِ حسیں — سردار جعفری، ۴۱
جُدائی — فراق گورکھپوری، ۴۷
کارواں — احمد ندیم قاسمی، ۴۹
ہیپی جیک — مخمور جالندھری، ۵۱
بدھ جی کا جنجال — دامق جونپوری، ۵۳
سرتاج — قتیل شفائی، ۵۵
خوں بہا مانگتے ہیں — حسن اعرانی، ۵۶
قرار دادِ مقاصد — احمد ریاض، ۵۸
الٹی سیدھی — کمال احمد صدیقی، ۶۰
اک نور کا طوفاں دیکھیں گے — جگن ناتھ آزاد، ۶۴
آج سوچتا ہوں — مجید امجد، ۶۵
دل پیت کی آگ میں جلتا ہے — ابن انشا، ۶۶
میری سنو — سلیمان اریب، ۶۷
واعظ نے کہا — جمیل ملک، ۶۸
تحفظ — حسن طاہر، ۶۹
کشمیر کی راہ — افضل پرویز، ۷۱
تخلیق — بلراج کومل، ۷۲

غزلیں

معین احسن جذبی، غلام ربانی تاباں، ۷۳
ظہیر کاشمیری، عارف عبد المتین، ۷۴
سید فیضی، سلیم واحد سلیم، ۷۵
ظہور نظر، تقی انجم، ۷۶

افسانے، خاکے

میں انتظار کروں گا — کرشن چندر، ۷۷
ہیروں کا ہار — انوس، ۸۷
بڑا مکان — مہندر ناتھ، ۱۰۱
دیوداسی — شوکت صدیقی، ۱۰۵
اک جہاں یہ بھی ہے — حمید اختر، ۱۱۵
کارپوریشن ایک اکڑا اور بھس نگر — مرزا ادیب، ۱۲۶
ریشم کا دل — دیوندر اسر، ۱۳۰
حسن مسیح — نوتیجہ، ۱۳۳
ایک کہانی، جو مکمل نہ ہو سکی — پرکاش پنڈت، ۱۳۵

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک اسپینی نظم، ۱۴۱
ایک برمی نظم، ۱۴۱
ایک روسی نظم، ۱۴۲
ایک تاجیکی نظم، ۱۴۳

جائزے

نقد حیات (ممتاز حسین) — کمال احمد صدیقی، ۱۴۴
ستاروں سے ذروں تک (جگن ناتھ آزاد)
میراث (پرکاش پنڈت)

○ پبلشر۔ منشی عبدالقدیر۔ مکتبہ شاہراہ۔ دہلی
○ پرنٹر۔ کمنہ پرنٹنگ پریس۔ دہلی

راہنما

پنجابی کی ایک مثل ہے کہ "ڈھڈ نہ پیاں روٹیاں تے سبھے گلاں کھوٹیاں" یعنی جب تک پیٹ میں روٹی نہیں پڑتی دُنیا جہان کی باتیں بیکار ہیں۔ وہ عورت کا حُسن ہو یا بچے کی مُسکراہٹ، نوجوان کی باہوں کے بٹھے ہوں یا بوڑھے کے چہرے کی جُھرّیوں میں سے جھانکتا ہوا ماضی کی روایات کا ورثہ۔ روٹی کے ہونے سے ہے اور روٹی کے نہ ہونے سے فنا ہو جاتا ہے۔

ایک فاقہ کش سے نفیس اطوار اور کردار کی توقع بے سود ہے۔ بھوک حرام اور حلال کی تمیز مٹا دیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح قحطِ بنگال نے تہذیبی روایات اور وقار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ جب بھوک والدین کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ مٹھی بھر اناج کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو، اپنی لڑکیوں کی عصمت کو فروخت کر دیں۔ جب خاوند اپنی شریکِ حیات کو بیوا بنانے پر مجبور ہو جائیں اور جب بھائی اپنی بہنوں کے دلال بن جائیں تو بھوک مُلک سے غداری کرنے پر بھی آمادہ کر سکتی ہے۔

ایک بھوکی قوم نہ گیتا کے اُپدیشوں کا پالن کر سکتی ہے اور نہ قرآن اور انجیل کے احکام پر کاربند ہو سکتی ہے۔ من وسلویٰ کی روایت اور جنّت میں لذیذ میووں کا وعدہ بھی اس عظیم اور ناقابلِ تردید حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ روٹی انسانی زندگی میں اوّلین اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اجنتا اور ایلورا کی مصوّری اور نقاشی ہو یا تاج محل کی صنّاعی۔ کالیداس، غالب اور ٹیگور کی شاعری ہو یا پریم چند اور کرشن چندر کے افسانے۔ اودے شنکر کا رقص ہو یا فیاض خاں کی موسیقی ایک بھوکی قوم کے لئے یہ سب کچھ بے وقعت سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ فاقہ کی حالت میں نہ صرف فن کی طرف طبیعت مائل ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے تصوّر ہی سے جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے۔ فاقہ زندگی کی تمام نفاستوں سے متنفر کر دیتا ہے۔

غالباً اسی لئے ہندوستان کے غذائی سنکٹ کے پیشِ نظر ہمارے بڑے بڑے نیتا عوام کو کم کھانے، ایک وقت کھانے اور اناج کے بجائے کیلے اور شکر قند کے استعمال کی مضحکہ خیز تلقین فرما رہے ہیں اور دادا ٹرومین کو تار پر تار دے رہے ہیں کہ ہمیں گندم دو۔ ہم ایشیا میں اشتراکیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ گندم کا ہونا ہی سب کچھ ہے اور گندم کا نہ ہونا کسی مُلک کی خارجہ اور داخلہ پالیسی پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ اور جب کسی مُلک کی خارجہ اور داخلہ پالیسی (غیر جانبداری کے بڑے بڑے دعوں کے باوجود) کسی ایسے مُلک کی محتاج ہو جاتی ہے جو صرف قیمتیں برقرار رکھنے کے لئے لاکھوں من اناج بھٹیوں کا ایندھن بنا دیتا ہے یا سمندر میں غرق کر دیتا ہے اور گنتی کے افراد کے ذاتی مفاد کے تحفظ کے لئے دنیا پر بھیانک جنگ مسلط کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتا ہے تو دستِ نگر مُلک میں جیلیں تعمیر ہونے لگتی ہیں۔ روٹی روٹی چلّانے والے عوام پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگا کر گولیوں کی بوچھار شروع ہو جاتی ہے۔ اور فوج اور پولیس کی تعداد میں دھڑا دھڑ اضافے ہونے لگتے ہیں۔

نیتاؤں کے سُنہری آدیش کی پالنا کے لئے نہیں بلکہ کسی حیلے بھی روٹی میسّر نہ آنے سے ہندوستان کے کروڑوں

انسان بھوکے پیٹ یا آدھے پیٹ سوتے ہیں اور کئی علاقوں میں تو قحط کی سی کیفیت پیدا ہو چکی ہے لیکن انھیں کہا جاتا ہے کہ وہ صبر سے کام لیں۔ ہمارے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ نہیں کہ اِدھر اُسے رگڑا اور اُدھر اناج کے ڈھیر لگ گئے۔ ہم اس لئے ٹیکسوں کی بھرمار کر رہے ہیں کہ ہم درخت اُگانے کی مہم پر کروڑوں روپیہ صرف کر سکیں۔ جب درخت اُگ آئیں گے تو بادل بننا شروع ہوں گے اور پھر بارشیں ہوں گی اور پھر آپ کے کوٹھے اناج سے بھر جائیں گے۔ اس لئے اے ہمارے ملک کے پیارے عوام! ہمیں کوسنے اور ہماری نیّت پر شک کرنے کے بجائے ہمارا ہاتھ بٹائیے اور فی الحال ہمیں اپنے بنگلوں کے لانوں میں ٹریکٹر پر سوار ہو کر فوٹو کھنچوانے اور گملوں میں گیہوں اُگانے کا شوق پُورا کرنے دیجیے۔ آپ اگر بھوک سے مر بھی گئے تو آپ کی اولاد آپ کے ایثار اور محنت کا ثمر پائے گی۔

ہندوستان کے عوام، کہ ایثار اور محنت کے لئے کمربستہ ہیں، آپ کے شوق میں رخنہ انداز نہیں ہونا چاہتے وہ تو صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ جو ہزاروں ایکڑ قابلِ کاشت زمین بیکار پڑی ہل سہاگے کی شکل کو ترس رہی ہے اس پر انھیں محنت کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ چین کی عوامی جمہوریہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ چیانگ کائی شیک کے دورِ بدانتظامی میں وہاں سدا بہار قحط جلوہ افروز تھا لیکن آزادی کے ایک سال کے اندر ہی چین نہ صرف خود کفیل ملک ہے بلکہ ہندوستان کو بھی امسال چاول کی بہت بڑی مقدار دے رہا ہے۔ آخر چین کی عوامی جمہوریہ کے لیڈروں کے پاس بھی تو الہ دین کا چراغ نہ تھا۔ انھوں نے تو صرف زمین پر سے وہ ناگ فنا کر دیئے جو جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے روپ میں بیٹھے اس کی کوکھ میں بس بھرا کرتے تھے۔ زمینیں کسانوں میں بانٹ دی گئیں تاکہ وہ غاصبوں کے لئے نہیں، اپنے لئے، اپنے ملک کی خوشحالی کے لئے محنت کریں۔

لیکن ہمارے نیتا اس قسم کے کسی اقدام کے بجائے داد ٹرومین کی خوشامدیں کر رہے ہیں جو گندم کے ایک ایک دانے کے عوض ہمارے ملک کا ایک ایک نوجوان خریدنا چاہتا ہے اور اپنی تیسری جنگ کی مکروہ سازشوں میں ہمیں اپنا شریک کار بنانا چاہتا ہے۔ ہمارا یہ اندیشہ اس وجہ سے اور بھی پختہ ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے امن پسند عوام دہلی میں کل ہند امن کانفرنس کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے تھے کہ وہ امن کے حق میں ہیں اور دُنیا کو تیسری جنگ کی لعنت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس لئے امن چاہتے ہیں کہ وہ خوش حال زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے ادب، آرٹ، تہذیب اور کلچر کو فروغ دے سکیں۔ لیکن انھیں دہلی میں اس کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہ دی گئی۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وزارت داخلہ کے اس فیصلے کے پیچھے داد ٹرومین کی خوشنودی حاصل کرنے کے علاوہ اور کوئی مصلحت نہیں ہے اور ہم یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے فیصلوں سے عوام کے شعور کو اور جِلا ملتی ہے، ان کی امن کی خواہش اور زور پکڑتی ہے اور وہ کھرے اور کھوٹے کی پہچان اور بھی آسانی سے کر سکتے ہیں۔

غلط رُجحان

سید سجاد ظہیر

کوئی سال بھر ہوا میں نے آواز (بمبئی) میں راجندر سنگھ بیدی کا ایک خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انھوں نے میر تقی میر کی شاعری کے متعلق ایک دو جملوں میں یہ کہا تھا کہ ہم اس سے سوائے زبان اور سادگی کے اب اور کچھ نہیں سیکھ سکتے۔ اس وقت میرے پاس آواز کا وہ نمبر نہیں ہے کہ میں بیدی کے الفاظ کا اقتباس نقل کر دوں لیکن ان کا مفہوم یہی تھا۔ اتفاق سے میں ان دنوں میر کے کلیات کا ایک بار پھر مطالعہ کر رہا تھا اس لئے کہ میر میرے محبوب ترین شاعروں میں سے ہے۔ بیدی کے اس جملے کو پڑھ کر میرے دل کو سخت چوٹ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی خود ایک سنجیدہ اور اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں اور ترقی پسند ادب کی تحریک میں وہ اور میں رفیقِ کار ہیں اس لئے میرے لئے یہ ضروری تھا کہ ان کی رائے کو اہمیت دوں اور سوچوں کہ غلطی پر کون ہے، وہ یا میں۔ میں چاہتا تھا کہ آواز میں اس مسئلے کے متعلق کچھ لکھوں لیکن اس کی فرصت نہیں ملی اور معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

چند دن ہوئے شاہراہ (دہلی) کا نومبر ۱۹۵۸ء کا شمارہ میری نظر سے گذرا۔ اس میں میں نے اپنے دوست ہنسراج رہبر کی تنقید خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "مرزا شوق لکھنوی" پر پڑھی۔ بدقسمتی سے یہ کتاب مجھے دستیاب نہیں ہو سکی۔ رہبر نے اپنی تنقید میں مرزا شوق کی مثنویوں "زہرِ عشق" اور "بہارِ عشق" پر ان الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:۔

"مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں، کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے، اسے بلند نہیں کیا، کیا ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کر کے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کا منھ چڑانا ہے۔ فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے انھوں نے گڑے مردے اُکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے ادب میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاریوں کو دہرایا جائے۔"

میں نے شوق کی "بہارِ عشق" نہیں پڑھی ہے اس لئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن رہبر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تبصرہ شوق کی دونوں مثنویوں پر ہے یعنی وہ زہرِ عشق کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس میں 'سیہ کاری' 'عیش کوشی' کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں زندگی کو بلند نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں 'فحش نگاری' اور 'عفونت' ہے اور بہتر یہ ہے کہ شوق کی مثنوی کو شائع کر کے گڑے مردے نہ اکھیڑے جائیں۔

مجھے زہرِ عشق کے اس تجزیے سے قطعی اختلاف ہے۔

زہرِ عشق میں ایک بہت سیدھا سادھا اور نہایت دردناک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک نوجوان مرد اور ایک خوبصورت لڑکی جو پاس کے گھروں میں رہتے ہیں اتفاق سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ دل و جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ان میں خط و کتابت شروع ہوتی ہے۔ بعد میں چوری چھپے ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد لڑکی دو مہینے تک لڑکے سے ملنے نہیں آتی۔ آخر ایک رات جب وہ آتی ہے تو کہتی ہے کہ اس کے گھر والوں کو اس محبت کا پتہ چل گیا ہے۔ لوگ اس پر آوازے کستے ہیں۔ اس کے والدین میں:

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں بھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں

اب وہ نہ تو یہ روز روز کی ذلت برداشت کر سکتی ہے اور نہ اس سے جدائی کا ہی الم اٹھایا جائے گا۔

وہ بھیجے ہم سے جبکہ بیزار کریں جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

اس لئے اب وہ زہر کھا کر مر جانا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ لڑکی اپنے عاشق کو سمجھاتی ہے۔

ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ　　نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بسئے اُلفت تمام پھیلی ہے　　باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

موت اور زیست کی چند باقی گھڑیوں میں وہ تمنا ظاہر کرتی ہے کہ:

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو　　آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں　　ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

نوجوان کو ان باتوں کا یقین نہیں آتا تھا لیکن دوسرے دن جب پاس کے گھر سے رونے دھونے کی آواز اٹھی تو اسے یقین آگیا کہ واقعی اس کی محبوبہ زہر کھا کر مرگئی۔ کرب اور بے بسی کے عالم میں نوجوان نے بھی زہر کھا لیا لیکن خواب میں اسے اپنی محبوبہ نظر آئی اور اس نے اسے یاد دلایا کہ میں نے تم سے وصیت کی تھی کہ میری وجہ سے تم اپنی جان نہ دینا، اب یہ تم کیا کر رہے ہو؟

دل سے میرا بھلا دیا کہنا　　ہاں یہی چاہیئے تھا کیا کہنا

اس خواب کے بعد گویا وہ دوبارہ زندہ ہو گیا، مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

عشق میں ہم نے یہ کمائی کی　　دل دیا غم سے آشنائی کی

مرزا شوق کی یہ مثنوی تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کے لحاظ سے اُردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔

جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے، جسے جاگیری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مر جاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ جاگیری مذہبی عقیدہ، رواج، اخلاق انھیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ آزادی سے محبت کرکے، اپنی مرضی سے اپنا شریکِ زندگی چننا، شریف بہو بیٹیوں کا شیوہ نہیں ہے۔ شادی ایک فرض ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتیں مرد کی خدمت کریں اور اولاد پیدا کریں۔ ایک طرف جاگیری نظام کے مذہبی اور اخلاقی تصورات دوسری طرف مرد کی معاشی حکمرانی عورتوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ سماجی نظام اور اسی مرد کی تابع اور خانہ زاد رہیں جو کہ دوسروں نے ان کے لئے چن دیا ہے۔ اب ان کی محبت کوئی اختیاری چیز نہیں۔ جاگیری سماج میں مردوں کے بھی یہی فرائض تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مردوں نے اپنے لئے آزاد محبت کی دوسری راہیں نکال لی تھیں۔ انھیں اس کا اختیار تھا کہ وہ طوائفوں، لونڈیوں وغیرہ سے عشق کریں۔ اس فعل کو گناہ سمجھنے کے بعد بھی سماج مردوں کو اس کی اجازت دیتا تھا، یہ ایک تسلیم شدہ بات تھی۔ لیکن سماج کے ان ظالمانہ "اخلاقی" اصول اور رسوم کے خلاف ہمیشہ بغاوت ہوتی رہتی تھی۔ سماج کے معاشی نظام کی سطح پر اگر ہم دیکھیں تو غلامی کے عہد میں غلاموں نے آقاؤں کے خلاف بڑی بڑی بغاوتیں کیں، جاگیری عہد میں کاشتکار نیم غلاموں نے مسلسل بغاوتیں کیں۔ یہی بغاوتیں تاریخ کا ارتقائی عمل تھیں۔ بادی النظر میں اور بورژوا مورخین کے نزدیک یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوتیں ناکام ہوئیں اور آقا اور جاگیردار دوبارہ ان کو دبا کر اپنا خونی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ ان "ناکام" بغاوتوں کے بعد مظلوم محنت کش طبقہ پہلے کے مقابلہ میں اپنے لئے زیادہ حقوق حاصل کر لیتا تھا اور گو کہ اس کا استحصال جاری رہتا تھا لیکن اس کی پُرزور بغاوتوں کے مقابلے میں معاشی اور اخلاقی اور نظریاتی طور پر پہلے سے بہتر ہو جاتی تھی۔ سماج ایک زیادہ اونچی سطح پر پہنچ جاتا تھا۔

بالکل اسی طرح اگر ہم انسانی سماج میں جنسی محبت کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عہدِ وحشت (جب کہ قدیم اشتراکی نظام قائم تھا) عہدِ غلامی، عہدِ جاگیری، عہدِ سرمایہ داری اور اب عہدِ اشتراکیت کے آغاز میں جنسی محبت کا بھی ارتقا ہوا ہے اور اس ارتقا میں جدلیت کا اصول کارفرما رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو جنسی جبلت ہے اور دوسری طرف سماج کا معاشی، سیاسی اور اخلاقی نظام ہے۔ ہر مخصوص عہد اور سماجی نظام میں جنس کی بنیادی جبلت کو پورا کرنے کے لئے ایسے قانون اور رسوم وضع کئے جاتے ہیں جو اس سماج کی ضروریات کو پورا کریں اور ان کے مطابق ہوں۔ لیکن یہ قوانین اور رسوم آسمان سے نازل نہیں ہوتے، یا کسی بڑے آدمی کی طرف سے سماج پر مسلط نہیں کئے جاتے بلکہ انسان اجتماعی طور پر اپنے زندگی کے تجربے سے یعنی مختلف طبقوں کے تصادم اور ان سے پیدا ہونے والے اخلاقی یا مذہبی خیالات کے تصادم اور جدل کے نتیجے کے طور پر رفتہ رفتہ وضع ہوتے ہیں اور سارے سماج پر چھا جاتے ہیں۔ سماج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبہ کا بھی ارتقا ہوا ہے۔ اس میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی، انفرادیت اور نزاکت پیدا ہوئی ہے۔ مختلف عہدوں کی عشقیہ شاعری اور دوسرے

فنونِ لطیفہ اس تبدیلی کی شہادت ہیں۔

مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے متعلق جذبات، تصورات، رسوم و رواج (جو مختلف دوروں میں مختلف رہے ہیں) ایک طرف جنسی جبلّت اور دوسری طرف سماجی ضرورتوں کے تقاضوں کا اظہار کرتے ہیں۔ عشقیہ شاعری اس ضروری اور لازمی سماجی واقعے کے اظہار کا ایک پہلو اور ایک مخصوص فنی طریقہ ہے۔ ہم اچھی اور بہترین عشقیہ شاعری اس شاعری کو کہیں گے جو ایک خاص عہد اور دَور میں سماج کے بہترین اور بلند ترین جنسی محبت کے جذبے کا اظہار کرے، جس کی وجہ سے مرد اور عورت کے جنسی تعلق زیادہ لطیف، حسین، نرم، متوازن اور گہرے ہوں۔ جس کی وجہ سے جنسی معاملات میں سماج کے ترقی پسند تقاضے پورے ہوں اور جو محبت کے جبلی جذبے کو اس کی جنسی سطح سے پھیلا کر سماج میں عام طور سے انسان دوستی، شرافت، خلوص، مودت اور تہذیب کے جذبات پیدا کرے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جنسی محبت کا جذبہ ایک عظیم تہذیبی قوت بھی ہے، اور اس کا اظہار صرف بالغ مرد اور عورت کے مخصوص تعلقات اور افزائشِ نسل کی شکل میں ہی نہیں ہوتا بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کی تخلیق اور اس سے آگے بڑھ کر والدین اور ان کی اولاد بھائی بہن، بھائی بھائی، دوستوں اور رفیقوں میں باہمی تعلقات، ہر انسان میں ہمدردی اور انسانیت، ترحم، مدارات اور شائستگی پیدا کرنے میں بھی اس کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تصوف یا بھگتی کے فلسفے میں عقیدہ رکھنے والے مخلص بزرگ جب عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی میں قریبی تعلق بتاتے تھے تب وہ در اصل اسی سچائی کا اظہار ایک غیر سائنسی اور ابتدائی طریقے سے کرتے تھے اور اسی سبب سے رجعت پرست، کٹر مذہبی قسم کے لوگ ان سے ناراض رہتے تھے۔

یہ ہیں وہ اصلی اسباب جن کی وجہ سے ہر دور اور ہر عہد میں بہترین انسانوں اور فنکاروں نے عشق اور محبت کے موضوع پر عظیم ترین فن کی تخلیق کی ہے اور اس کے وسیلے سے انسانی دل میں حرارت، رقت اور اپنی روح میں حلاوت اور تابندگی پیدا کی ہے

اس کا کیا سبب ہے کہ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن، ہیر رانجھا کی محبت کی داستانوں کو اور اسی قسم کی اور داستانوں اور ان کے منظوم تذکرے کو پوری پوری قوم، کروروں عوام نے صدیوں تک اپنے سینے سے لگایا؟ یہی کہ ان داستانوں اور نظموں کے مصنفوں نے اپنی تخلیقوں میں نہ صرف اپنے عہد کے بہترین اخلاقی اور انسانی جذبات کا فن کارانہ اظہار کیا، انھوں نے ان المیوں کے ذریعے سے انسانوں کے محبت کرنے کے حق کے لئے بھی جدوجہد کی اور ان فرسودہ سماجی بندھنوں کے خلاف سخت احتجاج کیا جو معمولی انسانوں سے مذہب، رسم و رواج یا طبقہ واری تفریق کی بنا پر اس حق کو پیروں سے کچل دیتے تھے۔ یہ عوام کی انفرادی آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ تھا جو کہ طبقہ واری سماج میں مسلسل جاری ہے۔

یہی نہیں۔ ان داستانوں اور نظموں میں ان کے قبیلہ واری یا جاگیرداری خول کے باوجود، اس بات کے باوجود کہ آج ہم بہت سے ان مذہبی یا اخلاقی تصورات کو مسترد کر دیتے ہیں جو کہ ان میں پیش کئے گئے ہیں، اس کے باوجود کہ موجودہ سماجی اور معاشرتی ماحول اس سے بہت مختلف ہے جن کا ان میں ذکر کیا گیا ہے پھر بھی یہ نظمیں، داستانیں اور اشعار ہمارے لئے آج بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ عشق و محبت کا لازوال شعلہ جب تک انسانی قلب میں فروزاں ہے، جب تک فطرت یا سماج کے ناسازگار حالات کے خلاف انسان کی جدوجہد کا وش جاری ہے اور جب تک انسانی شعور ارتقا کی نئی منزلیں طے کرتا ہوا اپنی زندگی اور احساسات کو ہر دم نئی اور بہتر اور زیادہ حسین ترتیب دیتا ہے اور ہر لحظہ پہلے سے زیادہ حسین خواب دیکھتا ہے اور اپنے ان احساسات اور خوابوں سے حسن کی تخلیق کرتا ہے اس وقت ہم کو ماضی کی ہر وہ فنی تخلیق متاثر کرے گی اور ہماری زندگی کو زیادہ مہذب اور حسین بنائے گی جن میں اس قسم کی خواہشات، جذبات اس طرح کے خوابوں اور خیالوں کا کامیابی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے۔

بیدی اور میر معلوم ہوتا ہے ایسا نہیں سمجھتے۔ ان کی ظن غالباً یہ ہے کہ چونکہ میر اور مصحفی جاگیری عہد کے شاعر تھے، چونکہ وہ شعوری طور پر اس عہد کے فلسفے اور عقیدے اور اخلاق کو مانتے تھے، اور چونکہ جاگیری عہد کے محبت کے متعلق خیالات رجعت پسند تھے، اس لئے ان کی شاعری ہمارے لئے فضول اور بیکار ہے۔ ہمیں ان سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ایسا سمجھنا گمراہ کن ہے

یہ صحیح ہے کہ میر اور مصحفی کے فلسفیانہ اخلاقی تصورات جاگیری عہد کے تھے، اس لئے ہم ان کو قبول نہیں کر سکتے لیکن ان کی فن کارانہ تخلیق صرف یہی نہیں ہے اس میں اس سے بہت زیادہ اور باتیں بھی ہیں۔

مثنوی زہرِ عشق میں محبت کے گہرے جذبات کا اظہار، سچائی، درد اور بڑی انسانیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی محبت کے گہرے المیہ کا بڑی سادگی

اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بارآور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا۔ زہرِ عشق میں ایک طرف تو سماج کے رسوم اور تصورات کا تذکرہ ہے، دوسری طرف اس میں دو معمولی انسانوں کی سچی محبت کا بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی اور جاگیری سماج کے ظالمانہ قوانین اور رسوم سے نفرت ہوتی ہے۔ مثنوی ہر گز پست قسم کے فحش جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی، اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے، ان کا تزکیۂ نفس ہوگا، ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات اُبھریں گے، ان کی زندگی کسی قدر زیادہ مہذب ہوگی۔

پہلے زمانہ کی بہترین عشقیہ شاعری (جس میں میرؔ کے اچھے اشعار اور غزلیات شامل ہیں) چونکہ گہرے انسانی جذبات کا سچا اور حسین اظہار کرتی ہے، چونکہ وہ سنگدلی کے بجائے دردمندی، ظلم و ستم کی جگہ ہمدردانہ تلقین کرتی ہے، چونکہ وہ زندگی، فطرت اور سماج میں حُسن کی متلاشی ہوتی ہے، اس لئے وہ ہمارے لئے ایک بیش بہا تہذیبی جوہر ہے۔ آج زوال پذیر طبقے (جاگیردار اور سرمایہ دار) اور ان کے وجعت پرست اور بدتہذیب نمائندے عوام کی اس دولت کو اُن سے چھین لینے کے درپے ہیں۔ وہ محنت کشوں اور دانشوروں کو بھوکا ہی نہیں مارتے، ان کو مہذب زندگی کے تمام ضروری مادی وسائل سے ہی محروم نہیں کرتے، انھوں نے محبت کو بھی جنسِ بازاری بنا دیا ہے۔ عوام کو محبت کرنے کے حق سے محروم کر دیا ہے اور سماجی رشتوں میں سے ہمدردی اور انسانیت کو بالکل خارج کر دیا ہے! ان کی درسگاہوں کتابوں اور رسالوں میں انسان دوستی اور حیات آفرینی کا نہیں، انسانوں سے نفرت اور زندگی سے گریز کا سبق دیا جاتا ہے۔ ان کا منتہائے کمال ایٹمی طاقت اور ریڈیائی شعاعوں کو استعمال کر کے تمام بنی نوع انسان کو ہلاک کر دینے کا منصوبہ بنانا ہے، اور یہی بات انسانیت کو یہ بشارت دیتی ہے کہ انسانیت نہیں بلکہ اس کے بدخواہوں کے خاتمے کی آخری گھڑیاں قریب آگئی ہیں۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بیدیؔ اور رہبرؔ جیسے حساس اور انسان دوست ادیب آج ترقی پسندوں کے پلیٹ فارم سے ایسے کلمے کہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند نہیں کرتے، اس سے متاثر اور مستفید نہیں ہوتے، اس کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ بالکل یہی برطانوی سامراجی اور لکھنؤ کے نوابین بھی سمجھتے تھے جنھوں نے مثنوی زہرِ عشق کی اشاعت اور طباعت کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ بالکل یہی رویہ آج ہمارے ملک کے ان غیر مہذب رئیسوں اور امیروں اور ان کے خوشہ چینوں کا ہے جو اُردو اور ہندی کی لڑائی لڑنا تو خوب جانتے ہیں لیکن جن میں میرؔ یا غالبؔ، سورداس یا رس کھان کی ایک سطر بھی سمجھنے یا محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کا رویہ تو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، اس لئے کہ وہ تو جہالت اور تنزل کے علم بردار ہی ہیں۔ ترقی پسندوں میں اس قسم کے رجحانات اس بات کی غمّازی کرتے ہیں کہ مردود طبقوں کے زوال پذیر نظریے اور خیالات کبھی کبھی غیر شعوری طور پر ہمارے اندر بھی سرائت کر جاتے ہیں، بظاہر وہ بڑے "انقلابی" طور سے پیش کئے جاتے ہیں، مثلاً کہا یہ جاتا ہے کہ "ہم تو انقلابی ہیں، ترقی پسند ہیں، ہمیں عشق و محبت کی شاعری سے دُور رہنا چاہیئے" لیکن ان کا مطلب یہ ہوتا ہے:- "ہم دشمن طبقوں کے غیر انسانی اور غیر مہذب رویّے اور نظریے کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ ہم ماضی کے عظیم انسانی ورثے کو مسترد کرتے ہیں۔ ہم نامکمل، بے حس اور مجہول رکھے جانے پر قانع ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جد و جہد کرنا چاہیئے۔

(پاکستان کے کسی مقام سے موصول ہوا)

نیا ادبی فن

ممتاز حسین

بلنسکی کا کہنا ہے کہ ادب اور سائنس اپنے مختلف النوع مواد کی وجہ سے نہیں بلکہ مختلف طریق اظہار کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ سائنس جن چیزوں کو منطق اور استدلال سے ثابت کرتی ہے ادب انھیں چیزوں کو ذہنی تصویروں کے ذریعے دکھاتا ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہاں بلنسکی کے ذہن میں سائنس کا مفہوم سماجی علوم سے تھا نہ کہ طبیعاتی سائنس سے کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑیگا کہ سماجی علوم نہ کہ طبیعاتی سائنس کا گہرا تعلق ادب کے ساتھ ہے۔ حالانکہ ادب طبیعاتی علوم سے بھی فائدہ اُٹھاتا ہے۔ بہرحال یہ بات اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جبکہ آپ طبیعاتی سائنس اور سماجی علوم کے بنیادی فرق کو جانیں۔ طبیعاتی سائنس یعنی نیچرل سائنس کا تعلق انسان کے پیداواری عمل سے براہ راست ہے لیکن سماجی علوم کا تعلق انسان کے پیداواری عمل سے براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ایک مخصوص اقتصادی بنیاد پر قائم شدہ superstructure کے ساتھ ہے اور گویہ بات صحیح ہے کہ طبیعاتی سائنس کی ترقی بھی طبقاتی کش مکش میں ہو رہی ہے اور اس میں بھی بورژوا طبقہ طبقاتی مفاد کے ماتحت غیر سائنسی نظریوں کے داخل کرنے سے باز نہیں آرہا ہے لیکن اس طبقاتی یورش سے طبقاتی سائنس کی نوعیت پر حرف نہیں آتا ہے اسے کوئی بھی طبقہ استعمال کرسکتا ہے وہ ایک مخصوص super structure کا حصہ نہیں ہے وہ ایک مخصوص اقتصادی بنیاد کے خاتمے کے ساتھ یا اس کے بعد ختم نہیں ہوجاتی ہے تاوقتیکہ سائنس کے میدان کا کوئی انقلاب پرانے نظریوں کو غلط نہ ثابت کردے۔ اور سائنس کے میدان کے انقلابات مخصوص اقتصادی بنیاد کے تغیرات کے پابند نہیں ہوتے ہیں بلکہ ان کا تعلق براہ راست انسان کے پیداواری عمل سے ہوتا ہے۔ سائنس انہیں معنوں میں غیر طبقاتی ہے، اسے کوئی بھی طبقہ استعمال کرسکتا ہے اس کی اثباتی خدمات کو کسی مخصوص اقتصادی بنیاد کے خاتمے کے ساتھ رد نہیں کردیا جاتا

لیکن سماجی علوم کی ہیئت مختلف ہے کیونکہ سماجی علوم میں طبقاتی نقطۂ نگاہ کا جھلکنا لازمی ہے تاریخی مادیت کو جو ہمارے نزدیک سائنس کا درجہ رکھتی ہے بورژوا طبقہ صرف اس وجہ سے اسے سائنس تسلیم نہیں کرتا ہے کہ آپ اس کے ذریعے موت کا حکم لگاتے ہیں۔ تاہم یہ کہنا بھی کہ بورژوا طبقہ یا کوئی اور استحصالی طبقہ سماجی علوم میں کسی قسم کی اثباتی خدمت انجام دے ہی نہیں سکتا ہے غلط ہوگا کیونکہ تاریخی شواہد کے منافی ہے۔ اینگلز نے مارگن کی تحقیقات سے جو فائدہ اٹھایا ہے وہ ہمارے سامنے ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ سماجی علوم میں کوئی بھی استحصالی طبقہ وہ خدمت انجام نہیں دے سکتا ہے جو دنیا کا پرولتاریہ طبقہ یا اشتراکی نظام دے رہا ہے کیونکہ سماجی علوم کو سائنسی معیار پر اسی وقت پہنچایا جاسکتا ہے جبکہ آپ استحصال کی بنیادوں کو ختم کردیں اسی وقت پوری انسانیت اس کی صداقت اور حقانیت کو عمل اور تجربے کی بنیاد پر تسلیم کرسکتی ہے۔ ایسی صورت میں طبقاتی نظام کے کسی بھی دور میں نہ صرف سماجی علوم بلکہ ادب بھی غیر طبقاتی نہیں رہا ہے کیونکہ ادب کو سماجی علوم سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح سماجی علوم میں استحصالی طبقے نے چند اثباتی خدمات انجام دی ہیں اسی طرح ادب کے میدان میں بھی استحصالی طبقے کے ادیبوں نے بھی اثباتی خدمت انجام دی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ بالزک کے ادب کو لے سکتے ہیں۔ بالزک کا ادب اس کی طبقاتی ہمدردی کے خلاف فرانس کے معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ اور اسی حصے سے بالزک کا ادب انسانی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

ان حالات کے ماتحت ادب کو ایک طبقاتی مظہر قرار دیتے وقت ہمیں چند چیزوں کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔

۱۔ طبقاتی نظام میں کوئی بھی ادیب غیر طبقاتی پوزیشن اختیار نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی طبقاتی پوزیشن کو بدل سکتا ہے۔ خود اپنے طبقے کے مفاد اور نقطۂ خیال کے خلاف جاسکتا ہے۔

۲۔ طبقاتی نظام میں ادب کی ترقی superstructure کی ترقی کے ساتھ وابستہ رہی ہے ادب کے ذریعے ایک مخصوص اقتصادی بنیاد اور اس سے علاقہ طبقوں کو مدد پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ادب یہ خدمت، سماجی علوم کے مخصوص نقطۂ نگاہ کی ترویج ہی کے ذریعے کرتا رہا ہے لیکن جہاں ادیب نے استحصالی طبقے یا حکمران طبقے کے فلسفے، مذہب، سرّیت اور سماجی علوم کے ان نظریوں سے آزاد ہوکر جو استحصالی مفاد کے حامل رہے ہیں۔ حقیقت کو براہ راست منعکس کرنے کی

کوشش کی ہے۔ سماجی زندگی کے نئے سے نئے رشتے خارجی طور سے دریافت کئے ہیں، محکوم انسان کو جبر و تشدد کے خلاف ابھارا ہے۔ قومی آزادی کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کو پیش کیا ہے۔ وہاں اس نے انسانی تاریخ اور ادب کے میدان میں اثباتی خدمات بھی انجام دی ہیں اور وہ خدمات مخصوص اقتصادی ڈھانچے کے خاتمے کے ساتھ ناپید نہیں ہو جاتی ہیں۔ انھیں لازماً رد نہیں کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ان کی صحت کو کے انھیں آگے بڑھایا جاتا ہے اور یہ خدمات صرف اسی لئے رقم نہیں کی جاتی ہیں کہ ان سے انسانی تاریخ کے مطالعے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ان میں ذہنی تخلیق کا وہ فن پوشیدہ ہے جس کے اکتساب کے بغیر ذہنی تخلیق ناممکن ہے اور اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ فن یا تکنیک اپنی خدمت میں طبقات کا امتیاز نہیں کرتا ہے۔ فن یا تکنیک کا تعلق superstructure کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی آخری منزل میں انسان کے پیداواری عمل کے ساتھ ہے اور اسی لئے فن superstructure کے خاتمے کے ساتھ نہیں ختم ہوتا ہے بلکہ باقی رہتا ہے۔ فنی ترقی سے فائدہ اٹھائے بغیر کسی بھی سماج کی تشکیل ناممکن ہے۔ اور اس فنی ترقی میں ذہنی تخلیق کا فن بھی شامل ہے اور ہم ذہنی تخلیق کے فن کو اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جبکہ ہم ذہنی تخلیق کو ایک مخصوص تاریخی حالات میں مادی تخلیق کی روشنی میں جانچیں۔ اس کے بغیر فن کو سمجھنا ناممکن ہے اور چونکہ کسی بھی فن اور ہنر کے نظریئے میں زندگی کے نقطۂ نگاہ، زندگی کے عمل کو اولیت حاصل ہے اس لئے آپ ماضی کا جائزہ لینے سے پہلے اپنی زندگی کے تقاضوں کو سامنے لائیں یہ بات تو یہاں طے ہو چکی ہے کہ فن کا کام سماجی حقیقت کو زبان کے ذریعے ذہنی تصویروں میں منتقل کرنے کا ہے کیونکر اور کس طرح ـــــ اس کو وہی زندگی کا نقطۂ نگاہ متعین کرتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ سامراجی نظام یہ نیم جاگیردارانہ نظام جو ہم پر مسلط ہے قائم رہے تو آپ کی بہترین کوشش یہ ہوگی کہ ادب کے ذریعے اس کی ذہنی تخلیق کچھ اس طرح ہو کہ اس نظام کے خلاف نفرت نہیں بلکہ محبت پیدا ہو اس کا ذہنی عکس اتنا مجہول ہو کہ لوگوں میں اس کے خلاف عمل کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ نظام ختم ہو۔ ہمیں قومی آزادی حاصل ہو، عوام کی جمہوریت قائم ہو اور انسانوں کی تخلیقی قوتیں رہا ہوں تو آپ کا مطالبہ لازمی طور پر یہی ہوگا کہ سماجی حقیقت کی تخلیق ادب میں کچھ اس طرح ہو کہ لوگوں میں اس نظام کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہو۔ اس کے قلب و جگر میں حرارت اور اس کے دست و بازو میں حرکت پیدا ہو۔ فن کار کی طبقاتی پوزیشن ہمیں پر اس کے فن پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایک فن کار نے اسی ارادے اور نیت سے ذہنی تخلیق کا کام شروع کیا پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا تو آخر اس کا کیا سبب ہے۔ فن کار کا قصور تو بچوں کے ایسی بات ہوئی اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ سچی حقیقت منتقل نہ ہو سکی اور دوسرا یہ کہ ان ہستیوں کے ذریعے منتقل نہ ہوئی جو آپ کی ذات آپ کے مشاہدات، محسوسات اور ادراک سے قریب ہیں ادبی فن ہمیں پر ترسیل خیال کے اور دوسرے ذریعے سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ترسیل خیال اور ترغیب عمل کے اور بھی ذریعے ہیں۔ اور انھیں زندگی کی خدمت میں استعمال ہونا چاہیئے۔ لیکن ادبی فن کو صرف نہ سمجھ پانے یا اس پر دسترس نہ حاصل کر سکنے کے سبب سے ترک بھی کر دینا چاہیئے۔ جب تک کہ وہ زندگی کے نئے تقاضوں کو ساتھ دینے سے انکار نہ کر دیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اتنے اہم فیصلے پر پہنچیں ہمیں فن کی ماہیت اور اس کے تاریخی ارتقا پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ ادبی فن کی ماہیت کیا ہے۔ ادبی فن ذہنی تخلیق کا ایک مخصوص ہنر ہے جو اپنی آخری منزل میں مادی اقدار کی تخلیق میں مددگار ہوتا ہے لیکن براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ طریقوں سے یعنی انسانی ہوش و حواس اور ادراک و فہم اور قوتِ ارادی کی سرحدوں کو وسیع کر کے اور چونکہ یہ تمام چیزیں انسان کی اپنی تخلیق ہیں اس لئے انسانی ہوش و حواس وغیرہ کی تخلیق بھی فن کا کام ہے کیا یہ سمجھنا بڑا مشکل ہے کہ انسان اپنے ہوش و حواس کا خالق کیونکر ہے؟ میں تو مشکل نہیں سمجھتا ہوں۔ کیا قوتِ ذائقہ کی تربیت خوش ذائقہ چیزوں کی تخلیق کے بغیر ممکن ہے۔ کیا لمس کا وہ احساس جو مخمل کی نرمی کے ساتھ وابستہ ہے۔ مخمل کی تخلیق کے پہلے ممکن تھا؟ اسی طرح قوتِ ارادی اور قوتِ مدرکہ کی تخلیق بھی مادی قدروں کی تخلیق کے بعد ہی ممکن ہو سکی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان کی نفسیات میں گہرائی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ وہ اپنی فطرت کو خارجی دنیا کی تخلیق میں کھوتا ہے۔ فن کا یہ کام بھی ہے کہ وہ اس رشتے کو اجاگر کرے۔ مادی فتوحات سے انسانی نفسیات میں جو گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے آگہی پیدا کرے اور اسی طرح اس کے ہوش و حواس اور ادراک و فہم کو تیز کر کے اسے نئی سے نئی فتوحات پر آمادہ کر دے، عمل کا جذبہ بیدار کرے۔

لیکن فن کا یہ کام ہر منزلِ حیات میں یکساں نہیں رہا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ مخصوص تاریخی حالات پیداواری رشتے انسان اور فطرت کے رشتے اس کے حدود متعین کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ فن کا ترقی پسند نظریہ یہ ہے کہ ہم گذرے ہوئے دور کے فن کو ایک بلند و ارفع سطح پر لیجا کر حیاتِ نو کی خدمت میں استعمال کر سکیں نیا فن پرانے فن سے انھیں معنوں میں مختلف ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس کے خد و خال کو واضح کروں ادبی فن کی ترقی کا ایک تاریخی خاکہ سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں یونانی ادب ایک مخصوص اقتصادیات کی پیداوار ہے لیکن ان کی ذہنی تخلیق کا سیارہ اور جن اس پست اقتصادیات سے براہ راست متعین نہیں ہوا بلکہ بالواسطہ پیدا

رشتے اور انسان اور فطرت کے ان رشتوں کے ذریعے جن کا ذہنی عکس اساطیر میں ہے۔ یونانی ادب کا فن اور حُسن انھیں تاریخی حدود سے متعین ہوا ہے وہ فن اور حُسن اب واپس نہیں لایا جا سکتا ہے لیکن ایک بلند تر سیارہ پر نئے حالات کی ضروریات سے متعین ہو کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے عہد سے لیکر انیسویں صدی کے زمانے تک یورپ کے ادیب اور فن کار یونانی فن اور ادب کا مطالعہ کرتے رہے اور باوجود گہری عقیدت رکھنے کے وہ یونانی فن اور حُسن کو اپنے ادب اور فن میں واپس نہیں لائے ہیں بلکہ افادہ حاصل کر کے اپنے ادب اور فن میں ایک نیا حُسن پیدا کیا ہے جو یونانی ادب سے مختلف اور نیا ہے جہاں تک یونانی فن کا تعلق ہے اس کا کام بھی اس وقت کے انسانوں کے سماجی رشتوں کو بے نقاب کرنا، فطرت کے ساتھ ان کے رشتے کو دریافت کرنا اور زندگی کی نئی فتوحات کے لئے اکسانا تھا لیکن جن تاریخی حدود میں وہ گھرا ہوا تھا انھوں نے اس کے عمل کو بھی محدود کر رکھا تھا وہ فطرت کی تخلیق اور تشکیل میں سماجی قوتوں کو براہ راست متحرک نہ کرتا بلکہ بالواسطہ ذہنی علسم کے ذریعے اس زمانے کے انسانوں کا آئیڈیل حقیقت کی دُنیا سے منتقل کر کے اساطیری دنیا میں پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب میں تخیل کی زیادہ قوت کو زندہ حقیقت پر عمل کرنے کے بجائے علسماتی دُنیا کی تعمیر میں صرف ہوئی ہے۔ ارسطو کا نظریۂ فن بھی انھیں تاریخی حدود اور آقاؤں کے طبقاتی نقطۂ نگاہ سے متعین ہوا تھا۔ وہ فطرت کی تشکیل کو فن کا مقصد قرار دیتا ہے لیکن اس کی تشکیل میں انسانی عمل کو بنیادی قوت قرار نہیں دیتا ہے بلکہ اس قوتِ متخیلہ کو جسے وہ غیر مادی اور ربانی بتاتا ہے۔

ارسطو کا یہ نظریۂ فن جاگیردارانہ عہد تک نہ صرف یورپ بلکہ مشرق قریب کے بھی بہت سے ملکوں میں چھایا رہا۔ اس کی مقبولیت کا سبب جاگیردارانہ عہد کی وہ اقتصادیات تھیں جنھوں نے طریقِ پیداوار اور پیداوار کے اوزاروں کی ایجادات میں عہدِ غلامی کے مقابلے میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ وہی انفرادی طریق پیداوار وہی ہاتھ سے بُنانے والے اوزار اور ان کی مختلف صورتیں صدیوں تک قائم رہیں اور یہی دونوں چیزیں انسان اور فطرت کے رشتوں کو بھی متعین کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسان رینگتا ہوا آگے ضرور بڑھا لیکن تسخیر فطرت کے میدان میں کوئی انقلابی قدم نہ اُٹھا سکا۔ لیکن جس حد تک اس نے سیکانکس اور سائنس کو آگے بڑھایا اس نے اساطیری نظریوں میں بھی تبدیلی کی لیکن وہ انسان کو فطرت کی غلامی سے کسی انقلابی انداز میں آزاد نہ کرا سکا۔ فطرت کا خوف اور انسان کی مجبوری، پست اقتصادیات اور استحصالی طبقوں کے مفاد کی ترجمانی کرتی رہی۔ یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں یہی پست اقتصادیات اور روحانی غلامی جو کلیسائی مذہب کی شکل میں چھائی ہوئی تھی ادبی تخلیق کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنی رہی۔ لیکن صنعتی انقلاب کی آمد آمد اور اس کے بعد کے زمانے میں جگہ انسان کی طاقت میں بھاپ کی طاقت کا اضافہ ہوا۔ انفرادی طریق پیداوار کی جگہ سماجی طریقِ پیداوار نے لی اور ہاتھ سے گھڑنے والے اوزاروں کی جگہ بھاپ کی طاقت سے چلنے والی مشینوں نے لے لی تو نہ صرف پیداواری رشتوں ہی میں زبردست تبدیلیاں پیدا ہو گئیں بلکہ انسان اور فطرت کا رشتہ بھی بڑی تیزی کے ساتھ بدلتا گیا۔ مذہب کی تردید شروع ہوئی اور سائنس نے اپنے سفر کا آغاز کیا اب اسے فطرت کی تخلیق اور تشکیل میں ذہنی علسم اور علم کیمیا کی ضرورت نہ رہی کیونکہ اب وہ غیر تاریمیہ فطرت کو اپنی تجربہ گاہ میں تشکیل دے رہا تھا۔ انسان کی انہیں فتوحات نے اس زمانے کی ذہنی تخلیق کی نوعیت کو بدلا ہے اس زمانے کے ادب میں ایک نئی قوت اور جان آئی ہے جو جاگیردارانہ عہد کے دور میں نہیں ملتی ہے۔ جس زمانے تک بورژوا طبقہ اپنے اس تاریخی اور انقلابی عمل کو انجام دیتا رہا، جاگیردارانہ نظام کی بنیاد، اس کی تعمیر کو ڈھاتا رہا اس کا ادب جاندار اور متحرک رہا ہے اور اسی زمانے میں اس نے ارسطو کے نظریۂ فن کی تردید بھی کی ہے۔ لیکن بورژوا طبقے کے تاریخی رول کا یہ صرف ایک پہلو ہے اس کا دوسرا پہلو سرمایہ داری کے اندرونی تضاد اور بورژوا طبقے کے استحصالی کردار سے متعین ہوتا ہے۔ بورژوا طبقے نے جاگیردارانہ عہد کے انسانوں کی جن تخلیقی قوتوں کو رہا کیا وہ انھیں سے خوفزدہ ہو گیا۔ سوشل طریقِ پیداوار کو وجود میں لانے کے بعد اس نے مزدوروں کی تنظیم کے ذریعے سرمایہ داری کے تضاد ـــــ سوشل طریقِ پیداوار اور سرمایہ دارانہ تصرف ـــــ کو ختم کرنے کا خود ہی موقع بہم پہنچایا۔ اور جب بورژوا طبقہ اپنی موت کے مستقبل سے دوچار ہوا تو اس نے انسانوں کو از سرِ نو روحانی طور پر غلام بنانے کی کوشش کی۔ مادی فلسفے کی راہ کو چھوڑ کر ایڈیلیٹ فلسفے کی راہ اختیار کی سماجی علوم کی خارجیت میں طبقاتی مفاد کے ماتحت مداخلت کی اور انہیں ایڈیلیٹ نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی کوشش کی اور انہیں حلقوں اور سماجی علوم کے ذریعے اس نے انسان کے دل میں مقدر پرستی، ـــــ وغیرہ کے جذبات کو پھر سے بیدار کرنا شروع کیا۔ اور جس حد تک انسان کی تخلیقی قوتیں سرمائے اور مشین کی تخلیق بنتی گئیں۔ اس سے اس کی ذہنی صلاحیت اور فراست بھی چھنتی گئی۔ اور انسان کی زندگی پر سرمائے کا یہ تصرف اس حد تک آگے بڑھا کہ وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی مفلس ہونے لگا۔ انسانی جذبات کے اظہار سے محروم ہوتا گیا۔ کیونکہ اب انسان اور انسان کے درمیان صرف روپے کا رشتہ باقی رہ گیا تھا اس کے یہ معنی ہوئے کہ سرمایہ دارانہ دور میں سرمایہ انسان کا ایک مخالف وجود بن گیا۔ اس کا علم و اختیار، اس کا جبر و تشدد۔ سیاہ سے سفید اور سفید سے سیاہ کرنے کی طاقت اتنی اہم معلوم ہونے لگی کہ قدیم زمانے کا بڑے سے بڑا دیوتا یا فطرت یا مہیب طاقتوں کا احساس بھی حقیر نظر آنے لگا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاطی دور میں انہیں اسباب کے ماتحت ذہنی تخلیق کا نہ صرف مواد بلکہ فنی سیارہ بھی بہت ہی پست

ہوگیا ہے کیونکہ اب اس کی تخلیق اپنی تخلیق نہ رہی بلکہ سرمائے کی تخلیق بن گئی۔ لیکن ایک باجب انسان کی تخلیقی قوتیں رہا ہو چکی ہیں، پیداواری رشتے اور ذہنی نظریے بدلنے شروع ہو جاتے ہیں تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی بورژوا طبقے کے دانشوروں نے مارکسزم کی تخلیق کی جو بیک وقت ایک ذہنی نظریہ ایک سائنس اور لائحہ عمل دونوں ہی ہے مارکس اور اینگلز نے تمام علوم متداولہ اور سائنس کی مدد سے سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت، اس کی بنیادی شے، کموڈٹی کا پتہ چلایا سماجی معیشت کی ترقی اور تبدیلی کے قانون دریافت کئے اور سائنس اور میکانکس کی مدد سے تسخیر فطرت کے میدان میں انسان نے جو اپنی فتوحات رقم کی تھیں انھیں ایک ورلڈ آؤٹ لک (world out look) زندگی کے ایک جدلی نقطۂ نگاہ میں سمویا اور اس طرح سرمایہ داری کی گود سے جو اس کا مخالف وجود پیدا ہوا تھا یعنی پرولتاریہ طبقہ اسے ایک نئے نقطۂ نگاہ اور ایک نئے لائحہ عمل سے آراستہ کیا۔ یہ ہے انسانی تاریخ کی ابتدا۔ تاریخ کو شعوری طور پر ڈھالنے کی ابتدا۔ کیونکہ کارل مارکس کے زمانے سے پہلے نہ تو انسانی تاریخ کو ڈھالنے کا کوئی ایسی سائنس ہی تھی اور نہ کوئی ایسا مرتب لائحہ عمل اور نہ سرمایہ داری کے دور سے پہلے یہ چیز ممکن ہی تھی کیونکہ اس کی اساس پیداوار کے اوزار کی انقلابی تبدیلی اور سوشل طریق پیداوار پر ہے۔ بہرحال اسی نئے نقطۂ نگاہ اسی مرتب لائحہ عمل اور پرولتاریہ طبقے کے عمل نے پرولتاری طبقے کی ذہنی تخلیق اور اس کے فن کو بدل دیا۔ کارل مارکس کے زمانے سے پہلے بھی ادیب سماجی حقیقت کی مصوری کرتے۔ نئے سے نئے انسانی رشتوں اور اس کے جذباتی عوامل کو اجاگر کرتے لیکن وہ سماجی حقیقت کو انقلابی طریق کار میں پیش کرنے سے قاصر تھے کیونکہ انسان کے عمل نے ڈارون کی تحقیقات سے پہلے نامیہ اور غیر نامیہ مادے کی انقلابی حرکت کو دریافت نہیں کیا تھا حالانکہ یہ حقیقت خارجی طور پر موجود تھی لیکن انسان نے اسے دریافت نہیں کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے مشاہدے کو اتنا تیز بھی نہیں کر سکا تھا۔ مارکسی عہد سے پہلے یا تو حرکت کا تصور ارتقائی رہا ہے یا پھر تواتر کا (Recycle) چنانچہ مارکسی عہد کے پہلے کی حقیقت نگاری جسے کلاسکی حقیقت نگاری بھی کہتے ہیں انھیں تاریخی حدود سے متعین ہوئی تھی۔ مارکسی عہد میں سماجی حقیقت میں مداخلت کرنے والے عمل اور نقطۂ نگاہ کے باعث، اور تبدیر فطرت کی جگہ دنیا کی تبدیلی کو اہمیت دینے کے باعث کلاسکی حقیقت نگاری زندگی کے نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے اسے آگے بڑھایا گیا اور اسی کا نام انقلابی حقیقت نگاری یا اشتراکی حقیقت نگاری ہے لیکن انقلابی حقیقت نگاری کلاسکی حقیقت نگاری سے کیفیاتی اعتبار سے مختلف اور نئی ہے۔ اسے صرف کلاسکی حقیقت نگاری کی ایک وسعت یافتہ شکل نہیں بتایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت نگاری کی بنیاد انسان کی اس تخلیقی محنت کی مصوری ہے جو تاریخ کی تشکیل میں، معاشرے کی تبدیلی میں صرف ہو رہی ہے چنانچہ اس حقیقت نگاری میں صرف واقعیت ہی نہیں بلکہ انسان کا آئیدیل بھی ہے لیکن وہی آئیدیل جو حقیقت کے انقلابی طریق کار سے چھوٹ رہا ہے جو حال کا مستقبل ہے اس آئیڈیل یا حقیقت کا وہ انقلابی روپ ہمارے ملک میں کیا ہے؟ سامراجی اور نیم جاگیردارانہ نظام سے آزادی حاصل کر کے اپنے معاشرے کی تاریخ کا صحیح معنوں میں خالق بننا۔ آزادی کی اس جدوجہد کو پیش کئے بغیر ہمارا ادب انقلابی حقیقت نگاری کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔ واقعیت اور آئیڈیل کا یہ امتزاج، حقیقت کو انقلابی طریق کار میں پیش کرنے کا یہ گر اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ فنکار ان طبقوں کا طرفدار ہے جو اس کے آئیڈیل کی تخلیق کر رہے ہیں غلامی اور آزادی کی جدوجہد میں غیر جانبداری کے تو یہی معنی ہیں کہ آپ غلامی کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ اگر آپ کا وجود زندہ ہے اور مردہ نہیں ہے اور آپ اس ملک کو اپنا ملک سمجھتے ہیں تو اس کا بوجھ آزادی کے حق میں پڑنا چاہیئے۔ وہ بوجھ آپ کی حمایت کا نہیں بلکہ آزادی کے نقطۂ نگاہ، سیاسی اور اخلاقی حمایت کا بوجھ ہوگا۔ اور چونکہ یہ نیا فن زندگی کے نقطۂ نگاہ "تاریخ کا شعوری طور سے ڈھالنے کی ضرورت ہے وجود میں آیا ہے اس لئے اس نقطۂ نگاہ اور اسی ضرورت نے اس کے میڈیم کو بھی تھوڑا سا تبدیل کیا ہے۔ میں شروع میں عرض کر چکا ہوں کہ ادب کا میڈیم محتص ہے اظہار خیال سے اور دوسرے ذرائع سے۔ ادب کا میڈیم حسیہ ذہنی تصویروں (Sensuous images) کا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ فنکار اپنی ذہنی تصویروں کو انسانی محسوسات کے تجربوں کی مدد سے پیش کرتا ہے اور اگر ایسا نہ کرے تو ذہنی تصویریں ابھر ہی نہیں سکتی ہیں تشبیہ اور استعارے کی دنیا اس عرض سے وضع کی گئی ہے۔ ماضی کے ادب عالیہ میں اس میڈیم کا بڑا اچھا استعمال ہے لیکن تاریخی حد بندیوں کے باعث بیشتر اوقات ان کی ذہنی تصویروں میں ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے وہ بالعموم اس کا التزام نہیں کرتے ہیں کہ ان کی حسیہ ذہنی تصویریں ہوش و حواس کو چھوتی ہوئی ادراک کی اس منزل پر پہنچ جائیں۔ جہاں سے عمل کی قوتیں رہا ہوتی ہیں۔ قدیم ادب میں یہ سرمایہ موجود ہے لیکن تھوڑا ہے اور جستہ جستہ ملتا ہے۔ فیضی کے اس مصرع پر جو دعویٰ ہے ع:۔ "از شعلہ تراش کردہ ام حرف" اس کے تمام کلام پر صادق نہیں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انقلابی حقیقت نگاری میں ـــــ حرفوں کو شعلے ہی سے تراشنا ہے، روشن مضطرب اور متحرک ذہنی تصویروں کو تخلیق کرنا ہے تو پھر آپ کو اپنے سینے میں ایک بہت بڑے آتش کدے کو بھڑکانا ہے جس کی حرارت کا ذخیرہ لامحدود ہو۔ جو ساری ان روایات کا ذخیرہ ہو جن میں گرمی اور آگ موجود رہی ہو۔ اور وہ آتش کدہ اسی وقت بھڑکے گا اور آپ کے خون جگر کا ہر ایک قطرہ نعرہ زن ہوگا جبکہ حقیقت کا ادراک اور اس کا آئیڈیل آپ کی نبض حیات میں تحلیل ہو جائے گا۔ ورنہ وہ آتش کدہ خاموش رہے گا خواہ آپ زبان اور فن پر کتنی ہی آگہی نہ حاصل کر لیں۔

ادبی تنقید

ڈاکٹر سلامت اللہ

ادب میں تنقید کی بہت اہمیت ہے اور خاص طور پر ترقی پسند ادب کی تو یہ رہنما ہے اس لئے کہ تنقید ادب کو زندگی کی شاہراہ سے ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتی ہے اور اس کا رُخ ہمیشہ اس سمت میں رہتا ہے جہاں سے تو انا و حسین زندگی کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ لیکن تنقید ادب کی رہنمائی کے فرائض صرف اسی وقت ادا کر سکتی ہے جب کہ وہ سچائی پر مبنی ہو۔ یعنی تنقید کا انحصار سماجی حقیقتوں کے صحیح تجزیئے پر ہونا چاہیئے۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو ہماری تنقید کے موجودہ معیار میں بعض خامیاں نظر آتی ہیں۔ یہ خامیاں ان تنقیدوں میں بھی اکثر ملتی ہیں جو عام طور پر ہمارے جلسوں میں ادبی نگارشات پیش کی جاتی ہیں اور ان تنقیدوں میں بھی جو مضامین کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اس قسم کی بعض اہم خامیوں پر یہاں مختصر طور پر بحث کی جائے گی۔

ہماری تنقید میں یہ بات بنیادی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے زمانے کے سماجی حالات اور رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور سماجی حالات اپنے آخری تجزیہ میں طریق پیداوار کے رہین منت ہوتے ہیں۔ یعنی سماجی حالات ان اقتصادی رشتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان ضروریات زندگی کو فراہم کرنے کے دوران میں قائم ہوتے ہیں ان اقتصادی رشتوں کی بنیاد پر ہی ادب اور تمام علوم و فنون کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

یہ کلیہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن جب ہم اس کی روشنی میں کسی مخصوص دور یا سماج کے ادب کا جائزہ لیں تو ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کسی سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان جو اقتصادی رشتے ہوتے ہیں ان میں اور اس سماج کی ادبی تخلیقات میں کوئی میکانکی تعلق نہیں ہوتا۔ اکثر یہ تعلق سطح پر دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ اس کی کھوج کے لئے بہت گہرائی میں جانا پڑتا ہے۔ سماجی تضادات، عمل اور ردِ عمل کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ہمارے بعض ترقی پسند نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ ادب اور سماجی نظام میں ہمیشہ ایک لازمی رشتہ سیدھے سادے انداز میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر دورِ حاضر کے ادب پر تنقید کرتے ہوئے بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ ادب سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط پذیر دور سے متعلق ہے اس لئے یہ ترقی پسند نہیں ہو سکتا گویا سرمایہ دارانہ ممالک کے جتنے پسند ادب کے لئے یہاں ایک صورت جواز موجود ہے اگر یہ صحیح ہے تو پھر ادب میں ترقی پسندی کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ جب تک کہ سرمایہ دارانہ نظام ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ ہے ایک صحیح نظریئے کے میکانکی استعمال کا نتیجہ! ورنہ ادب انحطاط پذیر سرمایہ داری کے باوجود ترقی پسند ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ملک اور دوسرے ملکوں کی اس جدوجہد سے بھی تو متاثر ہو سکتا ہے جو ایک بھرپور اور خوش حال زندگی کے لئے کی جا رہی ہے۔ وہ سوویت یونین، چین اور عوامی جمہوریتوں کے ادبی انوار سے بھی تو روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

یہ تو سچ ہے کہ ادبی نظریات کی جڑیں اقتصادی زمین میں پیوست ہوتی ہیں لیکن تمام علوم کی طرح ادب میں بھی یہ نظریات اپنے مخصوص انداز میں نشو و نما پاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار وجود میں آنے کے بعد ان کی ترقی کم و بیش خود مختارانہ طور پر اپنے منطقی اصولوں کے مطابق ہونے لگتی ہے۔ ادب اپنی تاریخی روایات کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کے ورثے کے بل بوتے پر پھلتا پھولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ملکوں کی تاریخ میں ایسے دور بھی گذرے ہیں جبکہ انھوں نے مادی لحاظ سے پچھڑے ہونے کے باوجود ادبی اور علمی لحاظ سے بہت ترقی کی تھی۔ قدیم ہندوستان اور چین اس کی مثالیں ہیں۔ لہٰذا ادب کی پرکھ میں ہمیں اقتصادیات کے علاوہ ادب کی اپنی مخصوص تاریخی روایات کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔

ادبی تنقید میں اسی قسم کی ایک اور غلطی بعض اوقات رونما ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی ادیب کی نگارشات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کے طبقاتی تعصبات کا آئینہ ہیں گویا ادیب اپنے طبقاتی نظریات کی حدود کے باہر نہیں نکل سکتا۔ جیسے وہ اپنے طبقاتی تعصبات کے گھیرے میں کولہو کے بیل کی طرح چکر لگانے پر مجبور ہے یہ ادیب اور اس کے طبقہ کے باہمی رشتے کو سمجھنے کی ایک بھونڈی اور میکانکی مثال ہے۔ یہ تقدیر پرستی کا نظریہ ہے گو کہ یہ مارکسزم کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن دراصل اس کا مارکسزم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چنانچہ مارکسزم کے ایک بانی اینگلز نے اس قسم کی میکانکی تشریح کی پُرزور الفاظ میں مذمت کی ہے۔ پال ارنسٹ (Paul Earnst) نے مشہور

ڈراما نگار ابسن کے بارے میں اسی طرح کے بعض میکانکی نظریات پیش کئے تھے۔ اینگلز نے اسی سے متعلق کہا ہے "جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آپ اس مسئلہ (ابسن کے آرٹ) کا مادی نقطۂ نظر سے تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے یہ کہنا پڑے گا کہ جب مادی نقطۂ نظر کو تاریخی تحقیق میں واقعات کو سمجھنے کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک بالکل معینہ قالب سمجھ کر، اس میں تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر بٹھایا جاتا ہے، تو پھر وہ مادی نقطۂ نظر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔"

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ کسی ادیب کی نگارشات پر اس کے طبقاتی نظریات کا اثر نہیں پڑتا۔ یہ تو یقینی امر ہے لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ ادیب کا شعور اس کے اپنے طبقے کی چہار دیواری کے اندر مقید ہو کر رہ جائے۔ بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ادیب نظری اور عملی دونوں لحاظ سے اپنے طبقے سے کٹ جائے اور کسی دوسرے طبقے میں شامل ہو جائے۔ چنانچہ اس کی مثالیں ہر زمانہ اور ہر ملک میں ملتی ہیں۔ خود ہمارے دیس میں آج کئی ایک ادیب ایسے ہیں جو متوسط طبقے میں پیدا ہوئے تھے اور اسی طبقے کی ذہنیت اور روایات کو لے کر انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ لیکن آج وہ اپنے طبقے کے بندھنوں کو توڑ کر مزدوروں اور محنت کشوں کی صف میں جا ملے ہیں اور یہ ارتقائی عمل ان کے ادبی کارناموں میں صاف طور پر نظر آتا ہے۔

لہٰذا ہمارے ترقی پسند نقادوں کو کسی ادیب پر طبقہ واری لیبل چسپاں کرنے میں بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔ ورنہ ادیبوں کی صف میں اور زیادہ پھوٹ ہو جانے کا اندیشہ ہے جس سے بہر کیف ہمیں بچنا چاہیئے۔ آج ہمارے دیس میں امن، آزادی، جمہوریت اور بھرپور زندگی کے لئے جو جدوجہد ہو رہی ہے اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ تمام ادیب متحد ہو کر اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعے عوامی مورچے کو مضبوط بنائیں۔ یہ مورچہ آج سامراج اور اس کے حاشیہ نشین یعنی بڑے بڑے سرمایہ داروں کے گُٹ اور بچے کھچے جاگیردارانہ عناصر کے خلاف تمام محکوم اور نیم آزاد ملکوں میں بن رہا ہے اس جدوجہد میں ادیبوں اور تمام دانشوروں کا ایک درخشاں رول ہے اس رول کو پورا کرنے کے لئے ادیبوں کا باہمی اتحاد بہت ضروری ہے۔ اس لئے ہمارے نقادوں کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ہماری تنقید میں کبھی کبھی ایک اور نقص نظر آتا ہے۔ جو ادب میں حقیقت نگاری کے صحیح مفہوم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب کو زندگی کی سچی تصویر کھینچنی چاہیئے۔ اس تصویر میں وہ نقش بھی واضح ہونے چاہئیں جو زندگی کی کشمکش، تصادم اور تلاطم کو ظاہر کرتے ہیں اور وہ نقش بھی جو انسانی جدوجہد کی وجہ سے ابھی اُبھر رہے ہیں۔ یعنی اس تصویر میں نئی زندگی کی تشکیل کا عمل نمایاں ہونا چاہیئے کہ ادب کا رنگ روپ کس طرح تبدیل ہو رہا ہے اور زندگی کا دھارا کونسا رُخ اختیار کر رہا ہے۔ کون سی حاقتیں اس کی رفتار کو بڑھا رہی ہیں۔ اور کونسی اس کے بہاؤ کو روک رہی ہیں۔ یا غلط سمتوں میں موڑنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

ادب کو جب حقیقت نگاری کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو اس میں دو قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ حقیقت نگاری کو واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچنے یعنی فوٹو گرافی کرنے کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور دوسرے اشتراکی حقیقت نگاری کے نام پر انسانی زندگی اور سماج کے ارتقائی عمل کی درمیانی منزلوں کو چھوڑ کر یکدم آخری سیڑھی پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جہاں تک پہلی غلطی کا تعلق ہے، یہ اکثر ہمارے ادب کو زندگی کی جدوجہد کے لئے بے اثر بنا دیتی ہے یا اس کے لئے مُضر ثابت ہوتی ہے حقیقت نگاری محض واقعات کی ہو بہو تصویر کھینچ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق صرف اسی چیز پر ہو سکتا ہے جس میں اس حقیقت کا پتہ چلے جو نشو و نما پا رہی ہے، اُبھر رہی ہے اس لحاظ سے ان نگارشات کا حقیقت نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے جس میں عوامی جدوجہد کی ناکامی یا مجاہدوں کی پست ہمتی یا غداری کا ذکر اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ایسا ادب صرف مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس پیدا کر سکتا ہے، زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں معاونت نہیں کر سکتا۔ حقیقت نگاری دراصل وہ ہے جس میں عوامی جدوجہد کی ہر شکست، بشرطیکہ جدوجہد صحیح شعور کے ساتھ کی جا رہی ہو۔ نئی فتح کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

لہٰذا حقیقت نگاری زندگی کی صرف سچی تصویر کھینچنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ اس میں توانا خیالات، جذبات کی رنگ آمیزی کرتی ہے۔ وہ پختگیٔ شعور بھی عطا کرتی ہے اور جوشِ عمل بھی۔ وہ عوام کے لہو کو سوز یقین سے گرماتی ہے۔ اور ان کو فتح و کامرانی کے ایمان کے ساتھ منزل کی طرف بڑھاتی ہے۔

حقیقت نگاری کے معاملہ میں دوسری غلطی ادب کو حقیقی زندگی سے دُور لیجاتی ہے۔ کیونکہ ادب اس صورت میں ایسے مقاصد کی تبلیغ کرنے لگتا ہے جس کی تکمیل کے لئے ضروری حالات موجود نہیں ہوتے۔ اور اس لئے وہ سماج کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک کی مختلف زبانوں کے ترقی پسند ادب میں گذشتہ دو تین سال میں یہ رجحان خاصی شدت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ اور "ادب برائے انقلاب" کا نعرہ کبھی مدھم سروں میں اور کبھی با آوازِ بلند سنائی دیتا رہا ہے

اور یہاں انقلاب سے مُراد سوشلسٹ انقلاب ہے اس نظریئے کے ماتحت جو کچھ لکھا گیا ہے! وہ اور چاہے کچھ بھی ہو لیکن حقیقت نگاری کی مثال نہیں ہے اس لئے کہ ابھی ہمارا ملک پورے طور سے سامراجی اقتدار سے آزاد نہیں ہوا ہے اور مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے ابھی ہمیں سامراجی قوتوں اور ان ملکی عناصر کے خلاف جن کا مفاد سامراج کے ساتھ وابستہ ہے، ملک کے تمام طبقوں کا ایک متحدہ محاذ بنانا ہوگا اور سردست جمہوری انقلاب کی تکمیل کے لئے جد وجہد کرنی ہوگی اس سے قبل سوشلسٹ انقلاب کا نعرہ لگانا حقیقت پسندی کا ثبوت نہیں بلکہ جنیت پسندی کی دلیل ہے۔

ہمارے ادب میں حقیقت نگاری سے یہ جو انحراف ہوا ہے اس کی ذمہ داری کسی حد تک ہمارے تنقید نگاروں پر بھی عائد ہوتی ہے کہ جنھوں نے بعض اوقات اپنی خاموشی سے اور کبھی اپنی حمایت اور پُرزور تائید سے اس غلط اور نقصان دہ رجحان کو تقویت پہنچائی ہے۔

تنقید کی مذکورہ بالا خامی سے ملحق ایک اور چیز ہے۔ بعض تنقیدوں میں اس بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ ادب کو مزدور اور محنت کش طبقے کے قریب لانا چاہیئے یعنی نہ صرف ادب کا موضوع بلکہ تکنیک اور زبان بھی ایسی ہونی چاہیئے جو اس طبقے کے معیارِ فہم کے مطابق ہو۔ یوں تو یہ بہت صحت مند رجحان ہے لیکن اس میں بھی انتہا پسندی کا خطرہ مضمر ہے۔ اس سے ہمیں آگاہ رہنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں بھی ہمیں اپنے خیالات کے مطابق راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس وقت ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے ادب سے براہِ راست فائدہ اُٹھانے والوں کا حلقہ بہت محدود ہے خاص طور پر مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت فی الحال ہمارے ادب سے مستفیض نہیں ہو سکتی۔ موجودہ صورتِ حال میں ہمارا ادب صرف متوسط طبقے کے محنت کشوں تک کم و بیش محدود رہے گا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ان پڑھ لوگوں تک اس ادب کو پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان کے جلسوں اور تقریبوں کے لئے ایسی چیزیں لکھنی چاہئیں جنھیں وہ سمجھ سکیں۔ اس طرح ان کے معیارِ فہم کو اونچا کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

ادب کو آسان فہم بنانے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر موضوع ترقی پسندانہ ہے تو روایتی ادبی زبان میں لکھنے لکھانے پر کڑی نکتہ چینی کرنا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت ہمارا ادب جس طبقے کو براہِ راست متاثر کرے گا وہ روایتی زبان اور انداز بیان ہی سے مانوس ہیں۔ ادب کو مزدور طبقہ کے قریب لانے کے سلسلے میں لینن کی وہ تنبیہ بہت برمحل معلوم ہوتی ہے جو اس نے روسی انقلاب کے بعد ان جوشیلے نوجوانوں کو کی تھی جو "پرولتاری کلچر" کے نام سے ادب میں ایک انتہا پسند تحریک چلا رہے تھے۔ لینن نے کہا ہے کہ:۔

"پرولتاری کلچر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو خلا میں پھوٹ نکلے۔ یہ ان لوگوں کی ایجاد نہیں ہے جو اپنے کو پرولتاری کلچر کا ماہر سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ بہت بڑی حماقت ہے۔ پرولتاری کلچر اس علمی ذخیرے سے منطقی طور پر نشو و نما پائے گا، جو انسانیت نے سرمایہ دار سماج کے سائے تلے جمع کیا ہے۔"

اس میں کوئی کلام نہیں کہ ہماری تنقید کا معیار اونچا ہو رہا ہے۔ لیکن اس میں بعض اوقات وہی اُلجھن نظر آتی ہے جس کا ذکر گورکی نے "سوویت لٹریچر کے مسائل" کے سلسلے میں کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ہمارے نقاد ان تنقیدی فلسفیانہ تصورات سے محروم ہیں، جو ان کی رہنمائی کر سکیں۔ یہ نقاد۔ مارکس۔ اینگلز اور لینن کے بار بار وہی اقوال استعمال کرتے ہیں۔ لیکن موضوعات، لوگوں کے کیرکٹر، اور ان کے باہمی تعلقات کو ان حقائق کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش نہیں کرتے، جو زندگی کے تیزی سے بہتے ہوئے دھارے کے براہِ راست مشاہدے سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اور ہمارے کام میں ایسا بہت کچھ ہے جس کا مارکس اور اینگلز پہلے سے اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ ہمارے نقاد مصنف سے کہتے ہیں۔ "یہ چیز غلط ہے کیونکہ ہمارے استاذہ نے اس سے متعلق فلاں بات کہی ہے۔" لیکن یہ لوگ اس بات کے سمجھنے سے معذور ہیں کہ یہ چیز اس لئے غلط ہے کہ اصل واقعات مصنف کے بیان کو جھٹلاتے ہیں۔"

ہمارے نقادوں کو گورکی کے اس تبصرے سے سبق حاصل کرنا چاہیئے اور اپنی تنقید کی خامیوں کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے ادب کی ترقی میں مدد دینی چاہیئے۔

جدید اُردو شاعری
(ایک جائزہ)

محمد حسن

"جدید اُردو شاعری کی حد بندی راشد اور فیض کرتے ہیں۔ تنقید کے نزدیک اس دور کے حسن و قبح کو پرکھنے اور اس کی کامیابی اور ناکامی کو جانچنے کے لئے کچھ اور وقت اور فاصلے کی ضرورت ہے پھر بھی اُردو شاعروں کی نئی نسل کو اس دور نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ آج کے مسائل کو سمجھنے اور کل کے فن کی حفاظت کے لئے اس کا جائزہ لینا تنقید کا فرض بن جاتا ہے"۔

شاعری کے اس نئے دور کا تاریخی اور سماجی پس منظر کیا تھا۔ اس کے پیچھے شاعری اور ادب کی روایات تھیں اس کی پشت پر اقبال اور جوش کے فلاسفہ آدم سائے تھے ایک نے شاعری کو فکر کی پختگی اور فلسفے کی متانت سے آشنا کیا تھا دوسرے نے زندگی کی توانائی اور جذبے کی بے پناہ آگ سے۔ جدید شاعری کے پاس تکنیک کے تجربوں کی متاع بھی تھی۔ اختر شیرانی اور حفیظ نے وزن اور بحر کے نئے مرکبات تیار کئے تھے۔ اس طرح موضوع اور اسلوب دونوں حیثیتوں سے اُردو شاعری تبدیلی کے لئے تیار ہو چکی تھی اور جامد اسالیب کی جگہ نئے سانچوں میں ڈھلنے کے لئے بے تاب۔

جدید اُردو شاعری کا ذہن محض ادبی روایات ہی سے نہیں بنا اس کے پیچھے وہ سارا علمی اور ادبی سرمایہ تھا جو مغرب نے ہمارے سامنے لا ڈالا تھا۔ انگریزی اور یورپی ادب کے ذخیرے، ایلیٹ اور آڈن کا کھویا ہوا تفکر، رومانوی شاعروں کا سوز، حقیقت پسندوں کی تلخیٔ فکر اور اس کے ساتھ سائنس کی وہ فضائیں جن میں ذہن انسانی یقین اور اعتقاد کی ساری زنجیریں شکست کر کے آوارہ گھوم رہا تھا۔ ڈارون نے بتایا کہ انسان خدا کا نائب ہونے کی بجائے حیوانی وجود ہی کی ایک کڑی ہے۔ فرائڈ نے کہا کہ یہ کڑی بھی اپنے شعور اور عمل میں ان غیر مہذب جذبے ہی کی پابند ہے جس پر کسی کا اختیار نہیں۔

مانفس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اعلان کیا کہ موت اور جنگ، وبا اور قحط جرم ضعیفی کی سزائیں ہیں اور اس کمزور انسان کے لئے جو اپنے وجود کے سامنے بھرم کو توڑ نہیں سکتا۔ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ دنیا تنازع البقا کا ایک وسیع میدان تھی جس میں آرزو کا مطلب شکست آرزو کے سوا اور کچھ نہیں، جہاں پیسہ خدا ہے، مادی ضروریات مختار ہیں اور جذبۂ معصوم سادہ اُمیدیں محض اپنی آگ کی خس و خاشاک۔ اشرف المخلوقات کی خودی اور سربلندی کا سارا پندار شکست ہو گیا۔

مارکس نے پھر بھی انسانی عمل کو کارگر ٹھہرایا اور تصورات کی تبدیلی اور قدروں کی اضافیت پر زور دیتے ہوئے بھی یہ امید دلائی کہ دنیا بدلی جا سکتی ہے ماحول کو تبدیل کیا جا سکتا۔ یہ تبدیلی بہتری کے لئے ہوگی اور یہ حقیقی بھی ہے اور لازمی بھی۔

وہم و یقین کی اس دھوپ چھاؤں میں ہماری شاعری پروان چڑھی۔ جذبۂ محض اور روحانی سرمستی کا اثر دھندلا ہوتا گیا اور فکر ابھرنے لگی۔ علم سے آشنا کبھی گھبرائی ہوئی الجھی ہوئی مجروح کبھی روشن۔ تابندہ اور یقین خود آگہی سے آراستہ۔ اس کے چاروں طرف مغرب سے آئے ہوئے علم کی تشکیک اور جستجو ہی نہ تھی جس نے انسان کو بتلایا تھا کہ زندگی اتنی سادہ اور آسان نہیں جتنا رومان نگاروں نے اسے سمجھ رکھا تھا۔ اس کے گرد ہندوستانی سماج کی ناہموار سطح بھی تھی۔

غلامی، سیاسی اور ذہنی۔ جاگیر دارانہ قدریں ارضی اور سماوی، مذہب کے تعویذ اور مناقشے، سرمایہ داری شہروں کا بڑھتا ہوا بحران اور اقتصادی تشنج۔ اس فضا نے نئے دور کی آمد آمد کا اعلان کیا۔ اس ماحول میں شاعرانہ ذہن نے بہت کچھ بنایا بہت کچھ بگاڑا، سوچا اور جھنجھلایا، کبھی پرچم کاندھے پر سجایا اور اسے بدلنے چلا کبھی چاند تارے نوچ ڈالنے کے حوصلے کئے مگر یہ ماحول، خارجی حقیقت کا یہ پرتو، ہمارے شاعرانہ ذہن پر مستولی تھا حقیقت کا

یہی گرانبار احساس جدید شاعری کی حد بندی کرتا ہے اور اس کے لہجے کو قدیم سرمایۂ شعر سے علیحدہ کرتا ہے۔

اس نئے لہجے نے فن کے پیکر میں اظہار پایا۔ اظہار کی مختلف صورتیں تھیں اور ہر منفرد شاعر کے کلام اور اسلوب میں اس کی جگہ اور اس کی نوعیت نرالی تھی۔

جدید اردو شاعری کے اس لہجے کی پرورش رومانوی دور نے کی۔ رومانوی دور جذبے کی فرمانروائی کا دور ہے اور اس آئینہ خانے میں قوت، حیات اور جمالیاتی تکمیل کے آدرش ملتے ہیں، اس کے رنگ اور صوت مختلف ہوتے ہیں۔ یہ جذبہ کبھی اقبال کو مردِ مومن کے خواب دکھاتا ہے کبھی جوش کو فطرت پرستی اور انقلاب پرستی پر اکساتا ہے، کبھی اختر شیرانی کو منزل لیلیٰ کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے اور کبھی حفیظ کو تیرہ سو سال پرانی عظمتوں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ نسلی اور قومی عظمت کی بازیافت کا عہد ہے اور اسلوب کے لحاظ سے نغمے کی نئی ترتیب اور سانچے نئے تجربوں کا۔

نئی شاعری جذبے کی اسی فراوانی اور اسالیب کی اسی تلاش کا نتیجہ ہے لیکن جذبے کی آگ یہاں افسردہ ہونے لگتی ہے اور فکر سورج کی طرح طلوع ہو کر رومانویت کے فانوسوں کو بھپکا کر جاتی ہے۔

جذبے اور فکر، رومان اور حقیقت کی یہ امتیازی لکیر اس دور کے تمام تر شعرا کے کلام میں ملتی ہے فیضؔ نے تو "دلے بفروختم جانے خریدم" کہہ کر اس کی حد بندی کر دی اور اپنے کلام کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا "سرِ وادیٔ سینا" "آج کی رات" اور "میرے ندیم" سے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" "رقیب سے" "پول" اور "میرے ہمدم میرے دوست" تک یہ منزل پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ راشد کی نظمیں "سوچتا ہوں کہ اے واقفِ الفت نہ کروں" اور "لارنس باغ" جیسے رومانوی تاثر پاروں سے "دریچے کے قریب" "دانشہ نہ" اور "پہلی کرن" تک پہنچتے پہنچتے آہستہ آہستہ اس درمیانی خط سے گذرتی ہیں جب سنگین حقیقتیں ایک چھناکے کے ساتھ سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیتی ہیں:-

"یہ مگر کیا تھے، خیالات تھے، اوہام تھے دیوانے کے
نہ وہ گل چہرہ کنیزیں تھیں نہ دل شاد غلام
در و دیوار کے وہ نقش نہ دیواریں تھیں
سنگ اور خشت کے ڈھیروں پہ تھا کائی کا نزول
اور وہ ڈھیر بھی موجود نہ تھے"

(خرابے)

جذبی کی ابتدائی غزلوں سے لے کر "طوائف" اور "نقاد سے" تک بڑی منزلیں ہیں اور یہ وہ منزل ہے جو جذبے کو فکر تک لاتی ہے مجاز کی نظمیں یا مکمل انقلابی ہیں یا پورے طریقے پر رومانوی۔ شاعر کی رومانوی سرمستی دونوں کے امتزاج کی اجازت نہیں دیتی۔ "نورا" "آج بھی" اور "مادام" ایک سمت اور "مژدہ" "انقلاب" اور "خوابِ سحر" دوسری طرف۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی رومانوی نظموں میں لطیف اشارے ملتے ہیں اور انقلابی نظموں میں کہیں رومانوی کونپلیں لپک جاتے ہیں۔ جیسے آہنگ نو میں:-

پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو

اور عشرتِ تنہائی کا آخری بند۔ ساحر کے کلام میں یہ حد بندی رومانوی سرمستی سے شروع ہو کر "فن کار" اور "کوی نے سوچا تھا" سے گذرتی ہوئی "میرے گیت تمہارے ہیں" اور "آج" تک پہنچتی ہے۔ یہی خط جعفری کی شاعری سے بھی گذرتا ہے گو اس کی تطعیت کم ہے۔

یہ صورتِ دار و شاعری کی ایک نئی منزل تھا اور اس کے اپنے امکانات بھی تھے اور اندیشے بھی۔

زندگی کی طرف یہ نیا رویہ جدید اردو شاعری کی خصوصیت ہے ہمارے شاعروں نے جس طرف دیکھا نہ تھا اب اس طرف دیکھا یہ اور بات ہے کہ فکر آشنائی اور علم کے آگے سر جھکا دینے کی اس کوشش نے جذبے اور رومان کے وہ حوصلہ نواز چراغ گل کر دیئے۔

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے

وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم

کہیں انفرادی درد کو اجتماعی کرب میں سمونے کی کوشش کی اور اسے ہجوم میں گم کر دیا کبھی کلبۂ احزان میں اسیر کر کے داخلی خلاؤں کے سپرد کر دیا۔ کہیں جعفری نے جنم لیا کہیں میراجی نے۔

جدید شاعر کے نزدیک زندگی نہ داخلی خواہش تھی۔ نہ بایا جال۔ کائنات نے ایک خارجی حقیقت کا روپ لے لیا تھا جسے نہ بھلایا جا سکتا ہے اور نہ جس سے منہ پھیرا جا سکتا ہے۔ اختر شیرانی کی مہ پرستی اور اقبال کا اعتماد اور جوصدا یہاں کہیں نہیں ملے گا۔ اُمید پرست اور مارکسی شاعروں میں بھی نہیں۔ ہمارا شاعر زندگی کے بارے میں سوچتا زیادہ ہے اس سے لرزاں اور خائف ہے اس کو نظر بھر کر دیکھنے کی ہمت کم تا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" کو چھوڑ کر کوئی طویل نظم نہیں لکھی گئی۔ اقبال کے ساقی نامے اور حفیظ کے شاہ نامے کے لئے جس دل جمعی اور خارجی زندگی کے بارے میں بے باک رویے کی ضرورت ہے وہ یہاں مفقود ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے جو طویل نظمیں لکھی جا رہی ہیں ان کی حیثیت خارجی عمل سے زیادہ داخلی خود کلامی کی ہے۔

اپنے میں کھوئی ہوئی یہ تلخ کام فکر ہر قدم پر ملتی ہے۔ یہ ایک نیم فکری نیم جذباتی مرکب ہے جو باہری دنیا سے صرف اسی حد تک واقف ہے کہ اس کے بارے میں سوچ سکے۔ ہمارا شاعر ایک فکری وجود ہے ایک سوچنے والا ذہن ہے۔ ٹھوکریں کھانے اور اسنگ مے لعل گانے والا مضطرب خوش نوا شاذ و نادر ہی کہیں ملتا ہے۔

حقیقت پسندی نے محبت اور حسن کے بارے میں بھی نیا تصور قائم کیا اور یہ نیا تصور جدید شاعروں میں کم و بیش سبھی نے اپنایا۔ وہ حسن جس پر دل و ایمان لٹتے تھے اور جس کے مل جانے سے تقدیر رنگوں ہو جانے کا یقین رہتا تھا خلا میں گم ہو گیا تھا اس کی جگہ گوشت پوست کے نسوانی ڈھانچے ابھر رہے تھے۔ ان کے دروازوں پر دربان نہیں امارت اور سماجی وقار کے پہرے تھے یہ محلسرائے کی چہار دیواری میں نہیں طبقاتی تقسیم اور اقتصادی ناہمواری کی دیواروں میں اسیر یا محفوظ تھے۔

عشق اخلاطونیت سے گذر کر جسم کی مایوس پکار تک اب وہ عبادت لب و رخسار کی حدود سے نکل کر محبوب سے قریب آتا ہے "غم جاناں" دست حنائی کے لمس سے گذر کر غم دوراں تک پہنچتی ہے۔ غم جاناں پر جان دینے کی بجائے اسے غم دوراں پر کندہ ڈالنے کا ذریعہ بناتا ہے کبھی اسے غم دوراں ہی کا ایک حصہ سمجھ کر اس میں محو ہو رہتا ہے کبھی اسے فراموش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

راشد کی محبت خالص جنسی اور مادی ہے اسے جذباتی سیرابی کی آرزو بھی نہیں اس کا سارا وجود اسی مادی کرّے پر رومان اور عشق کے مسائل طے کر لیتا ہے "پہلی کرن" کے سوا اور کہیں بھی اس کا دل کسی اشارۂ ابرو یا جنبش لب کا آسرا نہیں چاہتا:۔

اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشی و عشرت کے لئے
اور تری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کے لئے

(عہد وفا)

فیض حسن کی مجبوریوں اور اداسیوں سے واقف ہو کر بھی عارض پر غازے کے غبار اور ٹمٹماتے ہوئے آویزے کا خیال کرتا ہے ملبوس کی افسردہ مہک اور ہنستی ہوئی راتوں کی کسک کے تذکرے کرتا ہے جو اسے کشاں کشاں کائنات کے درد اور غم دوراں کے مسائل تک لے جاتے ہیں "پہلی کسی محبت" شکست ہوتی ہے حسن کے چہرے پر آلام کی گرد کے نشانات ابھرتے ہیں اور عشق اپنی دوروزہ جوانی کی شکستوں کا شمار کرتے ہوئے رومانوی ناکامی کو بھی:۔

مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے

فراق کے کلام میں عشق آرزو اور شکست آرزو، محرومی اور کامرانی کا ایک گلستان ہے جہاں سایہ بھی ہے اور رنگ بھی۔ وہ ایک تصور پرست کا جذبۂ بے باک نہیں سنبھلا ہوا ٹھہرا ہوا تجربہ ہے جو انسانی وجود کو میسر آیا ہے۔ کبھی حسن کی یہ تابناکی زندگی کی رونق اور جینے کی حسرت کو اُجاگر کرتی ہے جیسے "شام عبادت میں" :۔

جیوں گا ہاں جیوں گا میں نگاہِ آشنائے یار

کبھی اداس کرتی ہے کبھی اداسی بھی غم روزگار کی تلخی کے مقابلے میں بھلا دی جاتی ہے اور شاعر اسی اداسی کے لئے، زندگی کے اسی حوصلے کے لئے، اسی حسرت تعمیر اور شکست آرزو کے لئے تڑپتا ہے، کبھی حسن کی اداسیوں کا خیال کرتا ہے :۔

یہ دُکھ یہ درد، یہ آزردہ حالیاں تیری
جو چوم چوم نہ لوں سب اُداسیاں تیری

کبھی اپنے جبر و اختیار کے تذکرے :۔

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی سکیں
ان انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑتا ہوں میں

جذبی کی "طوائف" اور "تو ہی تبلا" میں حسن آلام اور شکست آرزو سے بے پروا نہیں رہتا۔ راشد نے جو بات "خندۂ بے باک سے پہچانی تھی :۔

میں ترے خندۂ بے باک سے پہچان گیا
کہ تری روح کو کھاتا سا چلا جاتا ہے
کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے کوئی الم زہرہ گداز

(داشتہ)

جذبی نے اسے بڑے فن کارانہ وقار اور خلوص کے ساتھ کہا ہے :۔

جن فضاؤں میں بھٹکتے ہیں خیالات ترے
ہے وہاں کون بجز میرے ترا ہم پرواز
کون سمجھے گا سوا میرے ترا حزن و الم
جب ترے دوش پہ بکھری بھی نہ ہو زلفِ دراز

جذبی نے پہلی مرتبہ افسردگی میں حُسن پانے کی سعی کی ہے یہ حسن کاری کا ایک نیا خاکہ ہے۔

عشق کے بارے میں مجاز نے ایک نیا رخ پیش کیا، یہ رُخ مجاز ہی پیش کر سکتا تھا کیونکہ اس کے کلام میں فکر کی تلخ پختگی کی بجائے زندگی کی اُمنگ اور جذبے کا والہانہ پن ملتا ہے، جذبی کی افسردگی کے برخلاف مجاز کا عشق سرمست اور حسن شاداب اور جوان ہے۔ وہ نہ تشنہ کام ہے اور نہ آورش وادی۔ وہ شکستوں سے گھبرانے کا نہیں ان میں ٹھہر کر گیت گانے کا عادی ہے۔ ناکامیوں سے اسے محبت نہیں لیکن ناکامیاں اسے مایوس نہیں اُمنگ اور حوصلہ دیتی ہیں۔

میں ہوں مجاز آج بھی زمزمہ سنج و نغمہ خواں

یں 'آج بھی' کا ٹکڑا سرمد کی اس رباعی کی بازگشت اپنے ساتھ لاتا ہے :

سرما بگزشت و ایں دل زار ہماں
گرما بگزشت و ایں دل زار ہماں
العصر تمام سرد و گرم عالم
برما بگزشت و ایں دل زار ہماں

اس کا عشق جراحت آشنا ہے سرمست اور انجام سے بے پروا۔ سرکش اور شوخ۔ مجاز فکر کی افسردگی کا نہیں جنون کی طوفانی مستی کا شاعر ہے۔
ساحر نے نسوانی پیکر کی تصویر سارے متاع ارمان میں سمو کر بنائی پورے حوصلے کے ساتھ زندگی کے آدرش، محبت کرنے اور من کو پالینے کے منصوبے بنائے اور پھر ان خوابوں کی شکست کا نظارہ بھی کیا۔ پرخلوص اور پاکیزہ محبت کی جو تصویریں ساحر نے کھینچی ہیں نشاط اور طرب کے جو خاکے اس کی شاعری میں اسیر ہیں وہ کہیں اور نہیں ملتے۔ "کبھی کبھی" اور "میں نہیں تو کیا" میں یہ احساس پوری شدت سے اُجاگر ہوا ہے۔

جدید اردو شاعری غم جاناں سے غم دوراں کی طرف ایک طویل سفر ہے 'غم دوراں' کا یہ احساس بڑا ہی متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ یہاں زلف و عارض کے سائے بھی خنک اور سرد ہوتے نظر آتے ہیں اور ان میں بھی زندگی کی محرومی اور تشنگی ساتھ نہیں چھوڑتی حسن اور رومان کے نخلستان سکون نہیں دیتے پناہ البتہ دیتے ہیں۔ یہ لمحہ لمحہ غنیمت ہو مگر کرب اور درد سے بھرپور ہے۔
زندگی کے ہمہ شکن ماحول نے کاغذی پھولوں سے سجی ہوئی زنجیروں سے ساری آرائشیں نوچ پھینکیں اور ان کا آہنی اور بے رنگ روپ ظاہر کر دیا۔ کچھ شاعروں نے زندگی کے مسائل سے اُلجھنے کی کوشش کی اور کچھ نے اپنے گریبان ہی کو غنیمت جانا۔ وہ اپنے ہی خول کی طرف لوٹنے لگے کیا وہ حسن کے قصیدے لکھ جبکہ حسن کے یہ خاکے بھی اس کے پاس نہیں رہ سکتے؟ کیا وہ عشق کے نغمے گائے جبکہ عہد وفا اور پیمان ابدی سبھی فریب ہیں۔ کیا وہ اس سماج کے لئے لکھے جو اس کے دکھ درد، اس کی زندگی اور موت سے بے پروا ہے جو اس کی نظم کو محض ایک جنس کی طرح خریدنا چاہتی ہے۔
شاعری میں داخلیت کے اس سنگین جذبے نے دخل پایا یہ جذبہ پچھلے دور کی داخلیت سے مختلف تھا کیونکہ اس کے پاس جذبۂ معصوم نہیں تھا فکر مسموم تھی۔ میراجی کی شاعری اس جذبے کی ترجمان ہے ان کی شاعری ہمارے سارے تشنج، تلخی اور اعصابی کھچاؤ کو پوری عریانی اور بے باکی کے ساتھ اسیر کرتی ہے ان کی زبان اور تمثیلیں وہ ہیں جو اپنی انفرادی دنیا طلسم بنائے ہیں۔ انفرادیت کے اس خول سے کبھی کبھی ایک اجتماعی سرت اُبلتی ہے ایک انسان۔ ایک سماجی اور مجلسی انسان۔ پکار اُٹھتا ہے:

مرے پیارے لوگو
مرے پاس آؤ ——

گر 'سمبالسٹ' شاعروں کی زبان اجنبی ہے اور جذبات مجروح اور ناشناسا۔ اس طرز خیال میں میراجی کا اخروسیع اور کچھ عرصے کے لئے ادبی زندگی پر حاوی رہا پھر بھی میراجی کے سوا اور کوئی شاعر کامیابی سے اس اسلوب کو اختیار نہیں کر سکا اس کے لئے جس تکنیک مکمل اور جس طاقتور غیر سماجی "انا" کی ضرورت تھی وہ انقلابی شاعری کے رواج سے پیدا نہ ہو سکی اور یہ طوفان جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے اُتر بھی گیا۔

انقلابی شاعری جلد ہی جدید اردو شاعری کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ ترقی پسند مصنفین سے متعلق ہو کر شاعروں کو توطیت کی بجائے امید اور ہم کی جگہ ایک ایسا یقین ملا جس نے کم از کم وقتی طور پر سارے مسائل کو حل کر دیا۔ مجاز اور ساحر گو دیر تک انقلابی شاعر نہ رہ سکے پھر بھی ان کے ہاں انقلابی فلسفے کی یہ گونج ایک بازیافت کی حیثیت رکھتی ہے فردوس گم گشتہ کی بازیافت "طلوع سحر" اور "طلوع اشتراکیت" دونوں اس کی مظہر ہیں۔
اُردو میں انقلابی شاعری کی روایت جوش سے شروع ہوتی ہے۔ یوں تو حالی اور اکبر۔ اقبال اور ظفر علی خاں کی شاعری کو بھی اس ضمن میں رکھ سکتے ہیں لیکن موجودہ ذہن انقلابی شاعری سے آج جو مفہوم سمجھتا ہے اس کی بنیاد جوش ہی نے استوار کی۔ جوش نے انقلاب کا نعرہ ایک رومانی گھن گرج کے ساتھ لگایا تھا ان کے نعرۂ جنگ میں صلیبی لڑائیوں کے رجز کی گونج تھا جہاں شاعر 'جہان خراب' کی ساری کوتاہیوں کو کچھ اس جذبے سے مٹانا چاہتا تھا:

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

جوش کے کلام میں انقلاب داخلی آرزو مندی کی ایک تمثیل ہے اختر شیرانی کے کلام کی سلمیٰ، منزل لیلیٰ۔ رندوں کے لئے مژدۂ جاں نواز اور ناخوشگوار عناصر

کے لئے عذابِ الیم کی بشارت۔ اس کا حکیماد جواز معدوم ہے۔

مجاز کی "انقلاب"۔ "مطرب سے" "مزدور" اور "ہمارا جھنڈا" میں بھی یہی رجزیہ رنگ ملتا ہے۔ بنیادی طور پر مجاز کا کلام سنجیدہ ہوئی لطیف رومانیت کا شاہکار ہے۔ اس میں دورِ وسطیٰ کے یورپ کی فضا کا احساس ہوتا ہے وہی انفرادی ہیرو ازم کا داخلی جذبہ مصیبتوں میں گھرنے کا شوق، انھیں فتح کرنے کا ارمان جو اسے انقلاب کی طرف لے جاتا ہے:

صحرا ہو خارزار ہو وادی ہو آگ ہو
اک دن انھیں صعیب منازل میں ہم بھی ہوں
اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں
چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغ آب دار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

یہ تمنا اس کی بھی انقلابی نظموں میں کارفرما ہے: 'سرمایہ داری' مجھے جانا ہے ایک دن' اور 'اندھیری رات کے مسافر' میں اس کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ پھر انھیں جانبازوں کی طرح نازنینوں کی بے پایاں محبت، سرکش آرزو انھیں جان پر کھیل کر پانا۔ وہی عارض و لب کی حکایتیں۔ فتوحات کے ولولے، جنگی مہمات اور انقلابی نغموں کی آگ، حراحتوں سے محبت اور خطرپسندی کا جوش، کمند و سپر کے چرچے، شہریاروں سے رقابت کا جنوں اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کرنے کا حوصلہ ——— ایک نیا ہیجان لے کر آتا ہے جو ذہن میں کسی نائٹ کی یاد تازہ کر دیتا۔ یہی وہ آہنگ ہے جو مجاز کی شاعری کو بیک وقت انقلابی آگ اور رومانوی نغمگی سے آشنا کرتا ہے۔

انقلابی شاعری کو جعفری نے ایک نئے رخ سے پیش کیا۔ یہاں اسے رومانوی آرزومندی اور حکیمانہ فکر کو سونے کی کوشش کی گئی تھی یا منتشک اور سیاسی نظریوں ہی کو نہیں وقتی موضوعات کی صحافت کو شاعرانہ وقار اور فنی ابدیت بخشنے کی سعی کی گئی جعفری نے انقلابی شاعری کو نئی توانائی ہی نہیں تابناکی بھی بخشی۔ آواز اور رجز ہی کو نہیں رنگ اور نور کو بھی فروغ دیا:

شہر اور گاؤں شربت کے پیالے ہیں
جو وادیوں اور میدانوں کی کشتیوں میں سجائے گئے ہیں
ایک ایک کر کے ان کو اٹھا لو
اپنی صدیوں کی پیاس اب بجھا لو

شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہارے بیٹے تمہاری فریاد سن رہے ہیں .....
وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں۔

"نئی دنیا کو سلام" انقلابی شاعری کا نیا روپ ہے۔ اس کی کامیاب نظموں نے انقلابی شاعری کو نئی بلندیوں سے آشنا کیا۔ جعفری ان گنے چنے شاعروں میں ہے جو علم کی بے یقینی کا شکار نہیں جن کے پاس یقین کا نور ہے اور اعتقاد کی روشنی۔ اس میں انفرادی فکر کی کمی، داخلی سوز کا فقدان اور خطابت کی بہتات نظر آتی ہے جو شاعرانہ تناسب کا طلسم شکست کر دیتی ہے مثلاً "سیلاب چین کے ابتدائی تین صفحے۔ یہ بے جا تکرار اور غیر محتاط طور پر زور دینا جگہ جگہ پر نامناسب حد تک پہنچ جاتا ہے۔ جعفری کی انقلابی شاعری نے نئے موضوعات اور اظہار کی نئی دولت بخشنے میں ایک کارنامہ انجام دیا ہے آئندہ نسلیں اس سمندر سے موتی چن لیں گی اور خالی سیپیاں ساحل پر پھینک دیں گی۔

ساحر کی انقلابی شاعری میں البتہ ایک نئی آن بان ہے گھن گرج کم اور نغمگی زیادہ اس کے طوفانی اور شوخ رنگ نظموں میں بھی ایک ایسی نرمی آمیز ہے جو محض داخلی جذبے ہی سے پیدا ہوتی ہے 'شہزادے' 'جاگیر' اور 'فن کار' حکیمانہ فکر اور داخلی جذبے کے کامیاب نمونے ہیں۔ وقتی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی یہ داخلی شائستگی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ "آج" اس کی کامیاب مثال ہے:

"ساتھیو۔ میں نے برسوں تمہارے لئے
چاند تاروں بہاروں کے سپنے بنے
حسن اور عشق کے گیت لاتا رہا
آرزوؤں کے ایوان سجاتا رہا.....
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
دربدر پھر رہا ہوں ——
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو۔"

کیفی نے وقتی موضوعات پر کامیاب نظمیں لکھنے کا تجربہ کیا۔ اس نئے تجربہ میں ظفر علی خاں اور اکبر کی سادگی نہیں اس کے اجزا ہنوز پختگی سے آشنا نہیں ہوئے۔ کیفی کے پاس شعریت، روانی اور سادگی ادا کی متاع ہے لیکن اس نے اپنے لئے جن منازل کا انتخاب کیا ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے دوسرے لوازمات کی ضرورت

اس طرح جدید اردو شاعری ایک نیا احساس اور نیا ادراک لے کر پیدا ہوئی احساس سے تلخی، داخلی الجھن، خود سپردگی اور بغاوت کے جذبے جاگے اور ادراک نے خارجی دنیا کے دیکھنے اور اسے بدلنے کا خیال پیدا کیا حقیقت ایک بے رحم دیوی کی طرح سامنے آئی۔ ہمارا شاعر ایک ایسی دنیا میں اپنے وجود کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس نے پہلی بہار دیکھی تھی۔ علم اور آگہی سے تاریکی کے غلاف اُتر رہے تھے اور اندھیرے کی عادی نگاہیں فہم اور یقین، جستجو اور بازیافت کے سہارے دھیرے دھیرے اُجالے کی طرف اٹھ رہی تھیں ان میں کہیں "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلاشدی" کی کیفیت اور کہیں ایک نئے اعتماد کی جھلک۔

شاعری میں بہرحال خارجی دنیا پوری سنگین حقیقت اور بے رحم سچائی کے ساتھ در آئی تھی رومان کے پردے اُلٹتی۔ داخلی رنگ محلوں کو چمکتا چور کرتی۔ اب اپنے گریبان سے اُلجھنے کا شغل ہی سب کچھ نہ تھا آج جراحتوں کے چمن سامنے کھلنے لگے تھے اور چمن بندیٔ دوراں کا فریضہ شاعر کو چارو ناچار قبول کرنا پڑا۔ آج شاعر کی آواز داخلی گہرائیوں ہی سے نہیں کائنات کی وسعتوں سے بھی آنی چاہیئے۔ اسے محض جذبے سے گرانبار نہیں علم اور شعور سے دچا ہوا بھی ہونا چاہیئے۔ یہی جدید شاعرانہ عظمت کا نیا نشان تھا اور اُردو شاعری کی نئی شاہراہ۔ اس نئی روشنی میں کتنی تابناکی اور دل آویزی کیوں نہ ہو پھر بھی یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ چراغ بھی

چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

میرے بھی صنم خانے

(ایک جائزہ)

احمد ندیم قاسمی

کسی مصنف کے پہلے ناول کے متعلق عموماً یہ خطرہ ہوتا ہے کہ اس میدان میں ناتجربہ کاری یا ناتجربہ کاری کا احساس اس کی جملہ فنی اور تخلیقی قوتوں کو بروئے کار آنے میں مارج ہوگا اور اس لئے ناکام رہیگا۔ خاص طور سے اردو زبان کے کسی ناول کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس زبان کے نئے ناول نویسوں کے سامنے اس صنف ادب کا کوئی معیار ہی نہیں۔ سرشار کے فسانۂ آزاد کو اردو کے ناولوں میں شمار کرنا میری نظر میں زیادتی ہے، شرر نے تاریخی ناول لکھنے کی کوشش تو کی لیکن تاریخ کا ناس مار دیا۔ ان کے ناولوں میں سب کے سب مسلمان فرشتے اور سب کے سب غیر مسلم خصوصاً عیسائی ناپاک ہیں۔ اور پھر ان کے ناولوں کے بیشتر ابواب میں بلبلیں بولنا شروع کرتی ہیں تو کئی صفحوں پر بولتی ہی چلی جاتی ہیں اور بادِ سحر چلتی ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ راشد الخیری بھی شرر کی ترقی یافتہ صورت ہیں، وہ محض رقت کے بادشاہ ہیں، اور شکستہ پری ان کا محبوب موضوع ہے۔ البتہ نذیر احمد کو اصلاح پسندی اور اخلاق پرستی کے شغف کے باوجود ناول کی تکنیکی تعمیر کا احساس ہے۔ پھر بھی ان کے ناولوں کو معیار قرار نہیں دیا جاسکتا، مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان ادا غنیمت ہے، پھر پریم چند ہیں جن کے ناول گئودان اور میدانِ عمل وغیرہ ہمارے سامنے اردو ناول کی ایک سنوری ہوئی ستھری اور اُجلی تصویر لے آتے ہیں، پریم چند کے ناول آغازِ سفر کا بڑا مبارک شگون ہیں، البتہ منزل نہیں قرار پاسکتے، اس کے بعد کرشن چندر کا شکست ہے، عصمت کا ٹیڑھی لکیر ہے، یا پھر عزیز احمد کے کوئی نصف درجن ناول ہیں، کرشن چندر بلاشبہ اپنے پہلے ناول میں کامیاب ہوا ہے۔ مگر فن کی اس تکمیل اور پختگی سے اس کا ناول ایک حد تک محروم رہ گیا ہے۔ جس کے آئینہ دار اس کے بیشتر مختصر افسانے ہیں عصمت اپنے ناول میں ان گنت واقعات کی چولیں ٹھیک سے نہیں بٹھا سکی، اور اگر اس کا بے حد شگفتہ، شوخ اور فنی اپج سے لدا ہوا طرزِ اظہار اس کا ساتھ نہ دیتا تو یہ ناول ایک ذہین جذباتی عورت کی ڈائری بن کر رہ جاتا، اس ناول میں شمن کے سوا جتنے کردار ہیں وہ خشک پتوں کی طرح جھڑتے چلے جاتے ہیں اور پھر ایک بار جھڑتے ہیں تو اتنے ضخیم ناول کے انجام تک ان میں سے بیشتر کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ناول آٹو بائیگرافیکل ہے، اس لئے اس میں ناول کی تکنیک سے آزادی برتی گئی ہے، لیکن میں تو قرۃ العین حیدر کے ناول "میرے بھی صنم خانے" کو آٹو بائیگرافیکل کہتا ہوں اس کے باوجود ٹیڑھی لکیر کے مقابلے میں یہاں پختہ کردار نگاری اور تسلسل اور عمل واثرات کا فن کارانہ امتزاج ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ٹیڑھی لکیر کو جہاں سے بھی پڑھیئے۔ آپ عصمت کی بے پناہ فنی گرفت اور اس کی اسلوبی انفرادیت سے مرعوب و متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے عزیز احمد میں ناول نگاری کی قوتیں ضرور موجود ہیں لیکن زندگی کے بارے میں اُن کا نظریہ کہیں کہیں خطرناک حد تک مریضانہ ہوگیا ہے، ان کی زبان بھی اُن کے خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور پھر وہ اتنے ناول لکھنے کے باوجود اب تک آکسفورڈ کے سفر کو فراموش نہیں کرسکے، وہ اپنے ہر ناول میں ولایت کا ذکر کچھ اس ٹھاٹھ سے لے آتے ہیں جیسے اُن تمام ناول نویسوں کے عجز کا مذاق اُڑا رہے ہیں جو بے چارے اب تک ولایت کی زیارت سے فیض یاب نہیں ہوسکے، یا جیسے قرۃ العین کے ناول کا ایک کردار صالحہ خاتون المعروف شہلا رحمن ہے، جو بڑی بڑی شخصیتوں سے اپنی خیالی رفاقت اور موانست کا ذکر کرنہیں سکتی۔ اس بے چاری کی طبقاتی پوزیشن ہی ایسی ہے کہ یہ تکرار اس کا وظیفۂ حیات بن گئی ہے مگر عزیز احمد تو ناول کے ایک کردار کے بجائے ایک ناول نویس ہیں، بہرکیف اب اگر ان حالات میں اُردو کا کوئی ادیب ناول لکھنے بیٹھے تو وہ اپنے آس پاس اپنی زبان کا کوئی ایسا ناول نہیں پاسکے گا جسے مستقبل میں "کلاسک" سمجھا جاسکے۔ میرے بھی صنم خانے" کی تکنیکی خوبیوں یا خامیوں ـــــ اُردو کے

کسی ناول کی خوبیوں یا خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ صدر حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے، اور پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ مصنف دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ادب کے مطالعہ سے فائدہ اٹھانے کا اہل ہے یا نہیں۔ اس نے یورپ کے غیر فانی ناول پڑھے ہیں یا وہ خالص مشرقی تعلیم کے باعث ایسا کرنے کے قابل نہیں، "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ میری اطلاع کے مطابق انگریزی ادب کی ایم۔ اے ہے، اس لئے ہم اسے ناول کی تعمیر کرداروں کے تصادم اور عام تکنیک سے پوری طرح آگاہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہ تاریخ کے کس دور میں ہے، اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے اور وہ اس سے کس زاویئے سے اور کس حد تک متاثر ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کا پلاٹ آدھ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے کے گرد گھومتا ہے، اس گھرانے کے معمر اور بزرگ افراد گردوپیش کی زبردست سیاسی و سماجی تبدیلیوں سے بے خبر ہیں بلکہ بے خبر رہنا چاہتے ہیں، نوجوان افراد کو ان تبدیلیوں کے علاوہ اپنے نئے فرائض کا بھی احساس ہے مگر ان کے ذہنوں میں اپنے طبقے کی چند ایسی قدریں رچی بسی ہوئی ہیں کہ وہ خارجی زندگی کے بحر ذخار میں عملی طور پر داخل نہیں ہو سکتے۔ ذہنی شناوری اور غوطہ زنی ضرور کرتے ہیں۔ اور اسی لئے ایک بلبلہ پیما میں رہتے ہیں۔ وہ آراستہ پیراستہ ایوانوں میں صوفوں پر بیٹھ کر آتشیں انقلابی مضامین لکھتے رہ جاتے ہیں۔ ہوتے ہوتے تغیر پذیر حالات کے تقاضے انہیں بالکل غیر ارادی طور پر اس بحر ذخار میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا طبقے کا، ان کے ارادوں اور دلولوں کا اور ان کی بڑی ہی عزیز قدروں کا ایک بے پناہ المیہ شروع ہوتا ہے۔ قرۃ العین نے اس المیے بلکہ ان بہت سے المیوں کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے، مگر یہ سب کچھ پیش کرتے ہوئے اس کا اپنا نکتہ نگاہ کیا ہے؟ وہ جس بات کو اتنی رقت اور دلسوزی سے بیان کرتی ہے وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں، اور اس المیے کے بعد پرٹوٹ جاتے ہیں یا وقتی طور پر بھٹکتے ہیں، اس بارے میں ہمیں بہت سے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کے فیصلہ کرنا ہوگا!

اس ناول کو ایک "فیملی ساگا" کہا جا سکتا ہے (کاش مجھے اس کا اردو مترادف مل سکتا) مناظر بڑی تیزی اور خوش اسلوبی سے بدلتے ہیں اور پھر ان مناظر کو مصنف کی مصلحت کے بجائے حالات اور تقاضے بدلتے ہیں اور اس لئے "اتفاقات" کے بجائے منطقی نتائج بن جاتے ہیں۔

کردار بے شمار اور متنوع ہیں، ان سب کی الگ الگ افتاد طبع کے باوجود انھیں گرفت میں رکھنا بہت مشکل تھا۔ شروع شروع میں ان کی دلچسپیاں، ان کے مشاغل، ان کے نظریئے بالکل یکساں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن ہولے ہولے (مصنفہ کے بجائے) حالات و واقعات ان کی پارٹیوں اور قہقہوں اور لطیفوں کے نقابوں کے اُدھر عجیب مناظر پیش کرتے ہیں، وہاں سب کردار ایک دوسرے سے الگ کھڑے ہیں۔ اُن کی راہیں الگ ہیں، ان کی منزلیں الگ ہیں، اور پھر اتنے الگ ہونے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں، یہی قرب اور یہی اختلاف اس ناول کا پلاٹ ہے، یہ کردار اپنے ماحول اور طبقے کی خصوصیات کے مدنظر غیر معمولی اور ابنارمل انسان نہیں، ان میں کچھ ایسی پیوست اور جمود بھی نہیں۔ ایسے بھی ہیں جو مرنے کے باوجود نہیں مرتے، ناول ختم کرنے کے بعد بھی اُن کی فتح آنکھیں کچھ کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اور ان کا جیتا جیتا خون جسم کا سیاہ نہیں ہونے پاتا تقریباً سب ورثہ دار طبقے کے افراد ہیں، چند نچلے متوسط طبقے سے بھی تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے، نوجوان کرداروں میں ورثہ والی غرور و تکبر بھی بہت کم ہے، شاید اس لئے کہ قرۃ العین نے طبقہ داری رشتوں کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ ورنہ طبقاتی تصادم ان کرداروں کے اور بہت سے پہلو نمایاں کرتا، اگر قرۃ العین سے یہ تقاضا کیا جائے کہ اس ناول کے سب کے سب کردار عملاً انقلابی کیوں نہیں اور عوامی تحریکوں میں عملاً کیوں شامل نہیں ہوتے تو یہ زیادتی ہے؟ ادیب اپنے کرداروں کے یقینوں اور ایمانوں، مفروضوں اور کلیتوں سے کیسے الگ ہو سکتا ہے: بُرے بھلے کردار ہر ناول میں آتے ہیں اور آنا چاہئیں، دیکھنا یہ ہے کہ ادیب کرداروں کے کس گروہ کا ساتھ دیتا اور ان کی قدروں کو اچھالتا ہے، وہ خیر جانبدار تو قطعاً نہیں رہ سکتا۔ "میرے بھی صنم خانے" پڑھتے وقت جگہ جگہ یہ خیال چبھن سی پیدا کرتا ہے کہ اس ورثہ والے طبقے سے اُدھر بھی تو ایک دنیا ہے اور اس نے ہمارے فن کاروں کی طرف کتنی بے تابی سے ہاتھ پھیلا رکھے ہیں۔ اور یہ دنیا کتنی گنجان آباد اور کتنی دکھی اور اُداس اور پھر ان دنوں کتنی خود آگاہ اور خود نگر ہو گئی ہے۔ یہ دنیا مانا شہر میں پیادوں اور مزدوروں کی صورت میں ضرور ظاہر ہوتی ہے اور آخر میں دہلی کے پرانے قلعے میں سُرخ کمبلوں میں لپٹی نظر آتی ہے، مگر یہ جھلکیاں ایسی ہی ہیں جیسے ایک بھاگتی ہوئی موٹر دکھانے والے مووی کیمرے کو سڑک پر پیدل چلنے والے مسافروں کی تصویریں مجبوراً لانا پڑتی ہیں اور وہ یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتا کہ ان کے پاس موٹر کیوں نہیں،

اس عوامی دنیا کی تباہی اور بربادی ناول کے چند مرکوزی کرداروں کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنے سروں پر سے ماضی کا شبنمی تاج جھٹک کر پرے پھینک دیں

لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے، وہ بورژوا کے بورژوا ہی رہتے ہیں، اسی لئے قرۃ العین کے اس ناول کی کینوس بہت محدود ہے، اور فی الحال ہم اسی محدود کینوس کو سامنے رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔

میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس ناول کا ہیرو کسے قرار دیا جائے، کرن کو یا پی چو کو، یہ دونوں کردار ناول کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھائے ہوئے ہیں، دونوں دلوں اور امنگوں سے لدے پھندے ہیں، دونوں نے عام تعلیم یافتہ بورژوازیوں کی طرح اپنے لئے ایک ایک بوٹو پیا تعمیر کر رکھی ہے، روشنی (رخشندہ) ناول کا مرکز اور محور ہے، پی چو اس کا بھائی ہے اور کرن بھی اُسے بالکل سگی بہن کی طرح چاہتا ہے، یہ دونوں کردار ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اچانک ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ صرف یہیں سے کرن کا پلہ بھاری نظر آنے لگتا ہے، وہ بمبئی جا کر بھی "روشنی بی بی" کو اپنا عزیز مشترکہ اخبار "نیوایرا" جاری رکھنے کی تلقین کرتا ہے، وہ کشمیر کے محاذ پر بھی "نیوایرا" کے لئے مضمون لکھنا نہیں بھولتا۔ اور پی چو سچ مچ فرار ہو جاتا ہے۔ لیکن کرن اور پی چو کی موتیں کچھ ایسی مشابہ ہیں کہ کرن کی عظمت اور پی چو کی شکست خوردگی پھر سے ایک سطح پر آ جاتی ہیں۔

البتہ ناول کی ہیروئن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ وہ صرف روشنی ہے، وہ قطعی صحت مند اور نارمل لڑکی جو آخر میں اپنی راہ سے بھٹک کر بھی نہیں بھٹکتی اور جس کا کردار اتنا واضح، غیر مبہم اور حقیقی ہے اور اس میں کچھ ایسا شدید خلوص ہے کہ یہیں سے مجھے اس ناول کے "آٹو بائیگرافیکل" ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

روشنی ایک بہت عجیب سی مگر بے حد حقیقی جذباتی بھول بھلیاں میں سے گذرتی ہے، اور ناول نگار پوری دیانتداری سے اس کا ساتھ دیتی ہے، روشنی "میڈ بیٹرز پارٹی ان لمیٹڈ" کی جان ہے، وہ ایک آزاد خیال اور انقلاب پسند اخبار کی مضمون نگار ہونے کے باوجود اپنے بورژوائی مرتبے سے نیچے اُترنا گوارا نہیں کرتی، مگر اس کا یہ مقام عجیب بے ضرر اور معصوم سا لگتا ہے، اس کی وجہ میرے خیال میں وہی کرداروں کے طبقاتی CONFLICT (تصادم) کا فقدان ہے، وہ سلیم سے محبت بھی کرتی ہے تو کچھ ایسے انداز میں کہ کوئی اس پر رحم کھانے کا احسان نہیں کر سکتا، وہ اس قسم کا موقع ہی نہیں دیتی، اور جب محبت کے علاوہ اس کی کئی دوسری توقعات بھی ناکام رہتی ہیں تو لکھنؤ سے دور مانا تھیٹر میں سکون ڈھونڈتی ہے، ایک لحاظ سے یہ اس کا فرار ہے، مگر مانا تھیٹر آ کر وہ بیکار نہیں بیٹھی رہتی، دوسری بار جب یہاں آتی ہے تو یہاں فسادزدہ علاقوں میں خاصا کام کرتی ہے۔ اور اس کے بعد لکھنؤ سے بمبئی اور بمبئی سے دہلی اور دہلی سے لکھنؤ آ کر اپنا سفر ختم کرتی ہے، یہ تمام سفر فراری آثار لئے ہوئے ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم، اُس کے دماغ کے اردگرد پھیلے ہوئے دھندلکے چھٹنے لگتے ہیں اور آخر لکھنؤ واپس آ کر یہ دھندلکے کچھ ایسے ناپید ہو جاتے ہیں کہ حقیقت کی بے رحم چمک سے اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور وہ ایک ایسی بلند و بالا دیوار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے جو بہت سی منزلوں والے ایک عالی شان ایوان کے جل کر گر جانے کے بعد تنہا تنہا جھلسی جھلسی کھڑی رہ جاتی ہے، جس سے ڈر بھی لگتا ہے اور جس پر رحم بھی آتا ہے، اور بدقسمتی سے اُسے دیکھ کر نئی تعمیر کا خیال تک نہیں آ سکتا۔

روشنی اردو ادب کا ایک غیر فانی کردار بن سکتی تھی۔ بشرطیکہ قرۃ العین حیدر اس کی آخری چکا چوند کو گرفت میں لے سکتی، اور اُسے یہ معلوم ہوتا کہ زندگی محض کھڑی کا جالا نہیں اور انسان کبھی شکست نہیں کھا سکتا، اگر وہ شکست مان کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتا، تو ہم آج بھی غاروں میں رہنے والے ابتدائی انسانوں سے کچھ مختلف نہ ہوتے، بہرکیف ہندوستان (بلکہ پاکستان کا بھی) جاگیردار طبقہ ——— حقائقِ حیات سے کسی حد تک آگاہ طبقہ روشنی میں مجسم ہو کر رہ گیا ہے، اور پھر روشنی ایک عام انسان ہے، وہ سلیم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے، اور یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کسی اتوار کو وہ لکھنؤ نہ آ سکے، یا جب آئے تو اس کے پاس تک نہ بیٹھے، اس سے کوئی گمبھیر پُر معنی بات ہی نہ کرے، وہ روتی ہے اور پھر ایک ٹانیئے میں آنسو پونچھ کر "میڈ بیٹرز پارٹی" میں شامل ہو جاتی ہے، وہ ایک بار اپنے "مرمریں مینار" پر سے بھی اُترتی ہے، وہ "کوئین روز" جس سے بات تک کرنا اُسے گوارا نہیں، آخر کار اس کی میزبان بنتی ہے، یہاں ہمیں قرۃ العین حیدر کے معمولی سے طبقاتی احساس کا پتہ چلتا ہے۔

کرن اور پی چو کے بارے میں پہلے مختصر طور پر کہا جا چکا ہے، کرن جو ایک دُنیا گھوم آیا ہے، صحافی ہے، وہ انڈونیشیا اور چین تک ہو آیا ہے، اُس کے بڑے پاکیزہ "آئیڈیل" ہیں اور پھر وہ گنتی کو چاہتا ہے اس لئے کبھی کبھی اس کا "موڈ" خراب ہو جاتا ہے، "روشنی بی بی" کو وہ شاید اس کے بھائی پی چو سے بھی زیادہ چاہتا ہے، کرن ایک عظیم انسان ہے اور اس کی عظمت اس کی موت تک قائم رہتی ہے۔

پی چو خوش باش اور ہیپی گو لکی" قسم کا انسان ہے، مگر اپنے ایک دوست حفیظ احمد کی یورپین بیوی کرسٹابل سے دبا دبا تعلق خاطر جب اہل کر ظاہر ہوتا ہے اور اسے فاش شکست کا احساس ہوتا ہے تو وہ ایسا بھاگتا ہے، ایسے دردناک انداز میں بھاگتا ہے اور پھر آخر تک بھاگتا رہتا ہے کہ روشنی تک اس کا سُراغ نہیں پا سکتی، وہ کمزور ہے، کم حوصلہ ہے، جب روشنی کو چودھری شمیم (اور شاید سید افتخار بھی) دھمکی دیتے ہیں کہ وہ اُسے اخبار "ملت بیضا" یا کسی اور پرچے میں بدنام کردیں گے تو روشنی کا استقلال قابل داد ہے، مگر پی چو "نیوایرا" کی پالیسی بدلنے کے حق میں ہے "میاں کی خاطر اور کروا ہا راج کی خاطر!" اور پھر نہ میاں رہتے ہیں اور کروا ہا راج اور نہ وہ "احول" آئینے کے سامنے کھڑے" وہ جھروکے میں سے جب تکیں ..... " گانے والا اور نیلے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہن کر سگرٹ کا دھواں روشنی کے چہرے پہ چھوڑ دینے والا اور بڑی سنجیدہ صورت بنا کر بڑا پریکٹیکل مذاق کرنے والا پی چو، خوبصورت اور ہر دلعزیز پی چو جب شکست کھا کر اور فرار ہوتے ہوئے گھوڑے سے گر کر زخمی ہونے کے بعد ہسپتال میں روشنی سے کہتا ہے "بھاگ جاؤ رخشندہ بیگم ـــــ بھاگ جاؤ" تو کتنے بے شمار شکستہ دل اور جذباتی نوجوان ہمارے سامنے اُبھر آتے ہیں، اور اس وقت خیال آتا ہے کہ کاش قرۃ العین نے طبقوں اور ان کے سماجی رشتوں اور طبقاتی کشمکش کے ذریعے اُبھرتی ہوئی نئی تخلیقی قوتوں کا مطالعہ کیا ہوتا یا فراق گورکھپوری کے اس شعر پہ ہی غور کر لیا ہوتا ؎

کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ درد محبت سہی، تو کیا مر جائیں!

گنی، کرسٹابل اور ڈائمنڈ کے کردار بھی نامکمل نہیں، گنی ان سب سے اہم معلوم ہوتی ہے، شاید اس لئے کہ وہ بے حد حساس ہے وہ "نیوایرا" کے اداریئے لکھتی ہے اور ہنومان جی کے سامنے پرشاد چڑھاتی ہے اور تلک لگاتی ہے، اور آخر ستھرا جاکر اور پھر کرن کی موت کے بعد راہبہ بن کر اپنے آگے پیچھے ہر طرف ایک عجیب تقدس کی سفید سفید برف کے گالوں ایسی فضا چھوڑ کر یوجا کے ایک چکر میں کھو جاتی ہے ڈائمنڈ "اسکینڈلز کی انسائیکلوپیڈیا" اور "بُوا زبُوکی تازہ ترین جلد" ہے، اور بے حد دلچسپ اور تیز و طرار، ان کے علاوہ اوما ہے، دل اور نیروز ہیں (فیروز تازہ ترین نظافت کی پوٹ ہے) عباسی خاندان کی محل شبو اور شعلہ پری ایسی چمکتے دمکتے بھاری بھاری غراروں والی "پیکل" مہریاں ہیں جنھیں کروا ہا راج والوں کی ساری تاریخ از بر ہے۔ مجھے تو خالص پنجابی کیپٹن ٹونی اور سائیس رام بھروسے کی بیوی رمینا اور اس کی سوت گینڈا اور ڈاکٹر لینا دینا کرنک اپنی بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے کردار نگاری کے عمدہ نمونے معلوم ہوتے ہیں، مگر روشنی، کرن اور پی چو کے بعد جو کردار سادی اہمیت سے ناول میں چلتے پھرتے ہیں وہ چودھری شمیم، ڈاکٹر سلیم، قمر آرا، شہلا رحمن، انور اعظم، زینت ریاض، کومن روز، خورشید، پولو، لالہ اقبال نرائن اور پھر کنور صاحب اور کنور رانی ہیں (ناموں کی ترتیب سے قطع نظر)

کنور رغبان علی خاں، پی چو، پولو اور روشنی (رخشندہ عرفان) کے باپ ہیں، اور ماضی کی بڑی یادگار ہیں اپنے بھوتے ہوئے صوفے پر بیٹھے "قانون شیخ" اور "مثنوی شریف" اور حافظ اور بوعلی سینا کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، فیروزے اور عقیق کی بہت سی انگوٹھیاں پہنتے ہیں، پیچوان گڑگڑاتے ہیں، کبھی کبھی ڈنروں میں شریک ہوتے ہیں یا گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہومز میں ـــــ "ایک احسان فراموش نئی نسل" کو جاگیردارانہ نظام کے خلاف نعرے لگاتے سنتے ہیں اور بالکل متاثر نہیں ہوتے، معمر انگریزوں سے کبھی کبھی شطرنج کھیل لیتے ہیں اور اپنی کھوکھل آن بان کا تحفظ فرماتے رہتے ہیں، ریاست کے کاروبار سے بھی الگ رہتے ہیں کیونکہ یہ کام کنور رانی نے لالہ اقبال نرائن کی مدد سے سنبھال رکھا ہے، ان کی زندگی میں کوئی حادثہ رونما نہیں ہوتا اور جب حالات فوری پلٹا کھاتے ہیں تو وہ اپنی شوکت، ناموس، وضعداری اور نوابی ٹھاٹ کے ریت کے محل کو گرنے سے نہیں روک سکتے، پرانے انگریز گورنروں (جن میں مغربی پنجاب کے آخری انگریز گورنر موڈی بھی شامل ہیں) کو بچھڑے ہوئے محبوبوں کی طرح یاد کرتے ہیں اور ایک روز جب ڈھلتے دن کی زرد روشنی مانا ٹھیر میں ان کے کمرے میں ٹنگی ہوئی گرد آلود تصویروں پر مضمحل ہو کر گرنے لگتی ہے، تو وہ بڑے سکون سے کتاب ایک طرف رکھ کر اور دیوار کی طرف کروٹ بدل کر انتقال کر جاتے ہیں۔ قرۃ العین نے کنور صاحب کے پیکر میں پرانے جاگیری نظام کو جو صورت بخشی ہے، وہ اپنے باریک سے باریک خطوں اور خموں اور رنگوں کے ساتھ بڑی مکمل ہے اور کنور صاحب کی یعنی پرانے زمینداری نظام کی اس چپ چاپ

موت کا قرۃ العین نے مرثیہ نہیں پڑھا، صرف موت کی اطلاع دی ہے۔

کنور رانی (سلطنت آرا بیگم) ہمیں ہر وقت جائے نماز پر ہی بیٹھی نظر آتی ہیں، وہیں لالہ اقبال زراین سے ریاست کے انتظامی امور کے بارے میں باتیں کرتی ہیں، وہیں سے پی چو اور روشنی کو احکام بھجواتی ہیں، اور پی چو اور روشنی کے رشتوں کی مہم سر کرتی رہتی ہیں۔ مہینہ میں ایک آدھ بار فلاور شو کی صدارت فرمالیتی ہیں، صرف دوپہر کو خاصے کے وقت کنور صاحب کو اذنِ باریابی دیتی ہیں، انھیں پو لو اور پی چو سے محبت ہے، اس لئے کہ روشنی ان سے سینیئر کیمبرج پاس کرنے کے بعد تک جدا رہی ہے (روشنی کنور صاحب کی چہیتی ہے) اگر ریاست کا کوئی اہم کام درپیش ہوتا ہے اور کنور صاحب سے استمداد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو کنور رانی انھیں یہ کہہ کر چٹکیوں میں اُڑا دیتی ہے "ای کا جانت ہیں مے بس اب رہے دیو" سندیلے کا چودھری شمیم ان کا کوئی بہت دُور کا عزیز ہے، کوشش کرتی ہیں کہ روشنی ان سے شادی کرلے، ناکام ہوکر وہ روشنی کو پھٹکارتی ہیں اور جب کنور صاحب مرجاتے ہیں تو چودھری سے خود ہی شادی فرما کر سندیلے تشریف لے جاتی ہیں ـــــ جاگیردارانہ ذہنیت کا یہ ایک اور بڑا کریہہ نمونہ ہے۔

شہلا رحمٰن اس ناول کا ایک اور سچا اور باقی رہنے والا کردار ہے۔ یہ گھنگھریالے بالوں والی شاعرہ بہت ہنستی ہے، اور ہنسنے کے باوجود بہت قابل رحم رہتی ہے، مڈل کلاس کی ایک ایسی لڑکی جو اونچے بورژوا طبقے کے طور طریقے اختیار کرنے کے لئے کتنے سوانگ بھرتی ہے مگر ـــــ "ارے ہائے، یہ اس کی زندگی تھی ـــــ اتنی بے رنگ ـــــ اتنی بے مزہ ـــــ یہ ٹریجک مڈل کلاس ـــــ یہ گھسا ہوا بورژوا طبقہ" ـــــ وائی ڈبلیو سی اے میں رہنے لگتی ہے، مغربی رقص سیکھتی ہے، بڑی بڑی شخصیتوں سے بڑے گہرے مطالعے کا مظاہرہ کرتی ہے، شاعرانہ موڈ "طاری" کرتی ہے لیکن آخر میں ـــــ "اب سب ختم ہوگیا۔ سب ختم ہوگیا" کہتی اور عجب ورفاقت کے لئے ہاتھ پیر مارتی پس منظر میں چلی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ زینت ریاض ہے، جو چھتیس برس اور چار مہینے کی ہے لیکن بڑے ٹھاٹ سے چوبیس سالگرہ مناتی ہے، بے تحاشہ میک اپ کرتی ہے، شادی کرنے کے لئے بڑی مایوسانہ کوششیں کرتی ہے۔ "سیٹرڈے کلب" کی نشستیں بڑی پابندی اور اہتمام سے منعقد کرتی ہے۔ لیکن اس کلب میں شامل ہونے والے کھوکھلے اور بے روح "سپرانٹلکچوئیل" قسم کے لوگوں میں سے کوئی آکسفرڈ چلا جاتا ہے، کوئی یورپ کی سیر سے واپس ہی نہیں آچکتا، کوئی اس سے متاثر ہونے کے بجائے اُس سے پوچھتا ہے: "آپ کو میرا یہ گھوڑا پسند ہے؟" ـــــ اس کا دوان رواں پکار اُٹھتا ہے کہ "ارے تم تو خود مجھے پسند ہو" اور پھر "اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں ـــــ اگر خواہشیں گھوڑے ہوتیں!" ـــــ شہلا رحمٰن اور زینت ریاض کے کردار اس خود فریبی کے کامیاب نمونے ہیں جو درمیانے طبقے کا خاصہ بن چکی ہے،

قمر آرا اور کوئین روز ناول کی تعمیر کے سلسلے میں بڑی اہمیت حاصل کرگئی ہیں۔ قمر آرا اور سلیم کی شادی کا واقعہ یا حادثہ کچھ ایسے چپکے سے ہوتا ہے کہ ایک لمحے کے لئے تو پڑھنے والا اسے ناول نویس کی زیادتی اور ستم رانی سمجھنے لگتا ہے، مگر جب سلیم کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے تو اس کالی کالی پلکوں والے پُراسرار نوجوان ڈاکٹر کے بارے میں ہم تھوڑا سا حیران رہنے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں ـــــ "ٹھیک ہے، وہ ایسا ہی تھا، وہ تو لڑکیوں میں سے انتخاب کرتا پھرتا تھا" ـــــ اور قمر آرا! وہ انتہائی قدامت پسندانہ ماحول میں پلی ہوئی لڑکی جو مسلم سکول میں داخلہ لیتی ہے اور بڑی اونچی چہار دیواری میں رہتی ہے۔ سلیم سے صرف ایک لمحاتی ملاقات کے بعد اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور آخر کار چپکے سے شادی کرلیتی ہے۔

کوئین روز ایک ناچنے والی اینگلو انڈین لڑکی ہے۔ جب وہ محبت کرتی ہے تو اس کا احساس کمتری بڑا کربناک ہوتا ہے مگر وہ کتنی وسیع القلب ہے اور اس کے دل میں کتنی انسانی محبت ہے۔

ان کے علاوہ کنور صاحب کا بڑا لڑکا پو ہے، اسے صرف کتے پالنے کا شوق ہے۔ وہ آخر میں حالات سے مایوس ہونے کے بجائے عین فسادات کے دنوں میں ٹریکٹر خرید نے کلکتہ چلا جاتا ہے اور ترائی کے جنگلوں سے خام لکڑی کا کارخانہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے کتے بیچ دینے اور اپنی ریاست اور روایات کو قائم رکھنے کا تہیہ کرلیتا ہے۔

اور پھر خورشید ـــــ قمر آرا کا بھائی ـــــ جو سارے ناول میں ایک سائے کی طرح لہراتا رہتا ہے، جو "تم زوال پذیر زمیندار لوگ" کہہ کر اور کمیونسٹ بن کر ناٹھیر سے غائب ہو جاتا ہے، اور آخر میں فوجی وردی میں ملبوس دہلی میں یہ کہتا سنائی دیتا ہے "میں نے اب سوچنا چھوڑ دیا ہے"

لالہ اتیال نرائن اودھ کا وفادار کائستھ ہے، وہ اپنے لاکھوں ہندو بھائیوں کے اصرار اور دھمکیوں کے باوجود کروا راج کے مسلمان زمیندار کا وفادار رہتا ہے، اور اکثر مونڈھے پر بیٹھا، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے زندہ پھانکتا نظر آتا ہے۔

اب آخر میں کرن اور پی چو کا سا جھگڑا پیدا ہوتا ہے، ڈاکٹر سلیم اور چودھری شمیم میں سے "ولین" کون ہے! دونوں بے انتہا سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر سلیم "میڈ ہیٹرز پارٹی" میں گھس کر بیٹھتا ہے اور چودھری شمیم باہر سے یلغار کرتا ہے، سلیم پراسرار ہے اور چودھری شمیم بالکل "واشگاف"۔ سلیم دوست بن کر آتا ہے اور شمیم دھمکی بھی دے دیتا ہے، لیکن سلیم اگر روشنی کے بجائے قمر آرا سے محبت کرتا ہے، تو اس کے حق میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے روشنی سے کبھی غیر معمولی تعلق نہیں بڑھایا، وہ روشنی سے بھی اسی طرح ملتا ہے جیسے گنی، ڈائمنڈ اور کرسٹابل سے، مگر شمیم کو کنور رانی کو لکھتا ہے کہ اسے فرزندی میں قبول کیا جائے۔ اور پھر ناکام ہو کر کنور رانی ہی سے بیاہ رچا کر سندیلے چلا جاتا ہے، وہ لکھنؤ کی سڑکوں پر اپنی پرانی فورڈ کار کھڑکھڑاتا پھرتا ہے، بڑے بھڑکیلے رنگ کے کپڑے پہنتا ہے، اور جب روشنی کا ذکر آتا ہے تو کہتا ہے "بڑی ماسٹر پیس لونڈیا ہے!" —— اس ایک فقرے ہی سے اس کا کردار نمایاں ہے،

اور سب سے آخر میں امیر پور راج کا انور اعظم جسے "گلیمر بوائے" کہتے ہیں، اور یہ بڑا مناسب نام ہے، ایک زوال پذیر طبقے اور ایک لٹے ہوئے رجواڑے کا بڑا "بھڑکیلا" سا نمائندہ —— بجھتے ہوئے چراغ کا آخری "لشکارا"۔ وہ آخر کچھ ایسا قابل رحم ہو جاتا ہے کہ شہلا رحمٰن اور زینت ریاض کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔

یہ ہیں اس محدود دنیا کے کردار، جنھیں گرفت میں رکھے رہنا بڑا مشکل کام تھا، مگر قرۃ العین کردار نگاری کے معاملے میں کامیاب رہی ہے، میں کرداروں کی تفصیل میں اس لئے گیا ہوں کہ سارے ناول کا محور اس کے کردار ہی ہوتے ہیں، اور ان ہی کی خوبیوں اور خامیوں سے ادب پارے میں زندگی کی چہل پہل نظر آ سکتی ہے "میڈ ہیٹرز پارٹی ان لمیٹڈ" یعنی غفران منزل کے ان مردوں عورتوں کو محض اس لئے قابل اعتنا نہ سمجھنا کہ ان میں سے جاگیردار طبقے کے افراد ہیں، ان کے نظریات و جذبات معلوم کئے بغیر انھیں رد کر دینا بد دیانتی ہوگی، اور یہ سب کون ہیں؟ اور کیا کرنے جمع ہوئے ہیں؟ یہ خود قرۃ العین حیدر کی زبانی سُنیئے:۔

وہ طرح طرح کے لوگ تھے، رنگ محلوں میں رہنے والے، راجکمار اور راجکماریاں تھیں، اور تپتی مٹی پر پیدل گھومنے والے نوجوان تھے اور سفید ساریاں پہنے خاموش آنکھوں والی لڑکیاں تھیں جن کے بالوں میں جوہی کے شگوفے سجے تھے، مٹی کے چراغوں کی جھلملاتی روشنی میں ان کے دل دھڑک رہے تھے، اور ان کے چہروں پر امید اور مایوسی اور بے یقینی اور خود اعتمادی کی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، وہ بہت کچھ سوچتے تھے، بہت کچھ کر چکے تھے، انھیں ابھی بہت کچھ کرنا تھا، ان کے چاروں طرف ایک بہت بڑی اندھیری دنیا پھیلی ہوئی تھی، اس دنیا سے وہ لڑتے آئے تھے، اس دنیا کے لئے انھیں ابھی اور لڑنا تھا، ان کے درمیان انقلابی خیالات والے بھی تھے، اعتدال پسند بھی اور قنوطی بھی، بہت سے اپنے میں ہمت نہ پاتے تھے کہ جو کچھ وہ سوچتے ہیں سب کہہ اور کر ڈالیں، بہت سے ہر سے اپنی بات سنوانا چاہتے تھے، وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شکستوں اور ناکامیوں کے عادی ہو چکے تھے، پھر بھی اُن سب میں ایک جذبہ تھا، ایک ہمت تھی، زندگی کی حرارت تھی، ایک چھوٹے سے گروہ کی زندگی کی نہیں، یہ کروڑوں انسانوں کی زندگی تھی، اس میں گرمی تھی، طاقت تھی، دیوانگی تھی، زندہ رہنے کا عزم اور مستقبل کی اچھی طاقتوں پر بھروسا، ان کے تماقتوں نے بڑے بڑے معرکے فتح نہ کئے تھے۔ ان کے آگے بڑھنے سے جو رکھیائیں بن رہی تھیں ان کو نئی اندھی اندھیری آندھیاں مٹاتی جاتی تھیں، لیکن وہ ہمت نہ ہارتے تھے، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتے تھے، یہ نوجوان لوگ ان کے شائع کئے ہوئے رسالوں اور مضمونوں کی اپیل، ان کی آرگنائزر کی ہوئی آرٹ کی نمائشوں کے ہجوم، ان کی تنظیم کی ہوئی ہڑتالوں اور مظاہروں کی کامیابی، ان میں سے بہت سے قید کی صعوبتیں جھیل چکے تھے بہت سے پولیس کی سنگینوں کا مقابلہ کر چکے تھے ..... ان کے سامنے ایک آدرش تھا، ایک شعور تھا، ایک خیال تھا۔ اس آدرش کے لئے اب تک بہت خون بہایا جا چکا تھا۔ دنیا کے سامنے نظریں نیچی کرنی پڑتی تھیں، عمل اور ردِ عمل کے چکر میں پڑ کر ایک عالم دیوانہ ہوا جا رہا تھا، بہت دفعہ ایسے وقت آئے تھے کہ ان کی ہمتیں ان کا ساتھ چھوڑ دیتیں، ان کے جی چھوٹے ہو جاتے ..... لیکن وہ مٹی کے دیئے پھر جل اُٹھتے۔ اُن کا جذبہ پھر واپس آ جاتا..... غالباً یہ شدید قسم کی جذباتیت تھی، لیکن جذباتیت کمزور خالی انسانوں کے لئے بہت بڑا سہارا ہے، انسان محض مشین گن کبھی نہیں بن سکتا۔

ٹالسٹائی نے آرٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آرٹ ایک ذریعہ ہے جذبات کو متاثر کرنے کا —— یہ تعریف ایک حد تک صحیح ہے لیکن سوال

یہ ہے کہ جذبات کس انداز، کس زاویئے سے متاثر ہوتے ہیں، صرف اس طرح اچھے اور بُرے ادب کو پرکھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔ فرانس کا جین پال سارتر بھی تو بڑا ادیب ہے، وہ بھی تو جذبات کو متاثر کرتا ہے، لیکن اس کے زاویۂ نگاہ کے باعث اس کی تحریریں انسانی ارتقا کے حق میں زہر کا حکم رکھتی ہیں، اُردو کے ادیبوں میں محمد حسن عسکری بُرے ادیب نہیں، ان کی تحریروں میں قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے، لیکن اُن کے نقطۂ نظر کی کلیت اور زندگی کے متعلق ان کا انفعالی نظریہ ہماری قومی زندگی کے لئے نہایت خطرناک ہے، ادب کے قاری کو شکستہ اور دل شکستہ، مایوس اور اداس چھوڑ کر الگ ہو جانے سے ہم آرٹ کے اعلیٰ مقاصد کی نفی کریں گے۔ آرٹ کے ذریعہ جذبات کو کچھ اس طرح متاثر کرنا کہ ہم زندگی کو بہتر بنانے، سوسائٹی کو استحصالی قوتوں سے نجات دلانے اور انسان کی تخلیقی قوتوں کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں، صحیح، دیانتدارانہ، ترقی پسندانہ اور اس لئے آفاقی آرٹ ہے، اور کسی فن پارے کے مجموعی تاثر ہی کے مدنظر یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ پڑھنے والے کا ذہن کس طرح متاثر ہوا۔ یہ ہر ادب پارے کی کسوٹی ہے اور یہی ترقی پسندانہ تنقید ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کے مجموعی تاثر کو دو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے ـــــ دلچسپ اور دلگداز ـــــ لیکن صرف یہ کہہ دینے سے میں تبصرہ نگاری کے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو جاؤں گا، اس لئے تفصیل میں جانا لابدی ہے اور یہ فیصلہ کرنا بھی ضروری ہے، بلکہ ہمیں یہی فیصلہ کرنا ہے کہ قرۃ العین حیدر ہمارے جذبات کو اس ناول کے ذریعے کس طرح متاثر کرتی ہے۔

ناول کے موضوع پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے، ترقی پسند ادیب بیشک اور مسولینی پر کہانیاں لکھ سکتا ہے، وہ ٹروٹسکی اور چرچل کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے، لیکن اس ضمن میں اگر وہ ان فاشی اور سامراجی کرداروں کو عوامی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھے گا، اگر وہ ان آمروں کی سرگرمیوں کو کروڑوں محنت کش انسانوں کے روزمرہ کے تجربات کی روشنی میں نہیں پرکھے گا تو نہ صرف یہ کہ وہ ترقی پسند تحریک کے مقاصد کی خلاف ورزی کرے گا بلکہ انتہائی درجہ کا رجعت پسند قرار پائے گا، ایک زوال پذیر سماجی ادارہ جو اپنا تاریخی فرض پورا کر چکا ہے، اور جو اب اس ضعف و نقاہت کے عالم میں کروڑوں انسانوں کے علاوہ قومی آرٹ اور کلچر کی بھی اجارہ داری چاہتا ہے؛ اگر اس کے نزع کے عالم کو فن میں منتقل کر دیا گیا ہے، تو یہ "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ کا کوئی معمولی ادبی کارنامہ نہیں، ساتھ ہی ہمیں یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ مصنفہ اس بورژوا طبقے میں پروان چڑھی ہے جس کی ریاکاری اور بے حسی کو اس نے بے نقاب کیا ہے، وہ اس ماحول کو اچھی طرح جانتی ہے جس میں کنور صاحب صرف پیچوان گڑگڑا کر گورداہا راج کی ملکیت کا حق ادا کرتے رہتے ہیں ـــــ اب اگر اس اداسے کے زوال کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفہ اسے قائم رکھنے کی آرزو کی مرتکب نظر آئے اور زوال پذیر بورژوا تہذیب کا تجزیہ صرف ایک "دیانت دار بورژوا" کی حیثیت سے کرے تو ہم اسے کسی صورت میں ترقی پسند اور خلاق ادیب نہیں کہہ سکتے، قرۃ العین کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی جب اس استحصالی اور نوچنے کھسوٹنے والے طبقے پر بھرپور نکتہ چینی اور طنز کیا جا سکے۔ رخشندہ "آن لکر" کا تازہ پرچہ اُٹھاتی ہے:۔

"راجکماری فلاں کا یہ پورٹریٹ جو مشہور پولش آرٹسٹ مادام فلاں نے تیار کیا ہے، مسٹر فلاں اور بیگم فلاں جو یہ گرمیاں کشمیر میں گذار رہے ہیں، مس فلاں جنھوں نے راجکمار فلاں کے ساتھ اس چیتے کا شکار کیا۔ تاج اور دلنگڈن کلب اور گلمرگ کی پارٹیوں کے گروپ ـــــ احمق شکلوں کے فوجیوں اور ان کی "چار رنگ" دلہنوں کی تصویریں ـــــ یہ بیچارے لوگ ـــــ یہ بیچاری دُنیا ـــــ یہ بیچاری زندگی"

ایک اور جگہ "دل کا پورا باب ان مصنوعی لوگوں کے لئے جیسے وقف کر دیا گیا ہے، (۳۱۲ سے ۳۱۸ تک) اس کی ابتدا "اوڈیٹر۔ ڈیٹر ـــــ ایکٹ از فنی" سے ہوتی ہے، اور یہ الفاظ مسز چندر راہری ہر پال ادا کرتی ہیں، وہ ایک آئی سی ایس کی بیوی ہیں اور پام کے درختوں کے نیچے سبز بید کی آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی لیموں کے ایک پتے کو "اپنی چھوٹی سی خوبصورت ناک" کے قریب لے جاتی ہیں، اور "زندگی" کے بارے میں یہ عظیم فلسفیانہ نظریہ بیان کرتی ہیں "لائف از فنی!" ـــــ وہاں بیگم اصغر امام ہیں جو برج کے کھیل کو "ازلی اور ابدی بُرج" کہہ کر اپنی طے شدہ زندگی کا جھنڈا پھوڑ دیتی ہیں، ڈاکٹر سلیم کے چلے جانے کو وہ سب یوں محسوس کرتی ہیں جیسے سلیم ان سب کا محبوب تھا۔ اور وہ سب اس کی تاک میں تھیں، اور پھر راجکماری کمل گڈھ تشریف لاتی ہیں، وہ ایک "تازہ ترین خبر" سے لدی ہوئی ہیں۔ سلیم نے فیرز والی لڑکی کے ساتھ موٹر میں گھومتا دیکھا گیا! ـــــ اور یہ سُن کر وہ سب معزز اور اونچے درجے کی خواتین اپنے اپنے "شیری" کے گلاس ایک ساتھ زور سے میز پر رکھ دیتی ہیں اور مسز چندر راہری ہر پال کا فلسفہ سب کے آڑے آتا ہے "لائف از فنی" ـــــ یہاں "از" پر زور دیا گیا ہے، یعنی یہ کائنات شکن تھیوری ثابت ہو کے رہی! ـــــ اِدھر اُدھر کے "اسکنڈلس" کی باتیں ہوتی ہیں، پی چو، اور راجہ احمد اور رخشندہ عرفان ـــــ اور پھر بیگم اصغر امام

جو شروع سے مری میٹھی ہیں، "فضا کے مکمل سکوت سے اُکتا کر" محض گرمی محفل کے لئے "شانتی نکیتن" والے بہت بڑے آرٹسٹ اوشیر لہری کے انتقال کی خبر سناتی ہیں، اور پھر جس انداز میں یہ معزز خواتین" اتنے بڑے فن کار کی موت کا ردِ عمل ظاہر کرتی ہیں، وہ بے انتہا دردناک ہے اور قرۃ العین حیدر کے موثر طنز کا نمونہ! ایک صاحبہ صرف "چچ چچ چچ" پر اکتفا کرتی ہیں، دوسری معلوم کرنا چاہتی ہیں کہ کیا لہری نے کسی رومینٹک طریقے سے خودکشی کی؟ دوسری کہتی ہیں اور بڑی حسرت سے کہتی ہیں "ارے نہیں بڈھا ڈیسر، محض ہارٹ فیل!" ــــ "پوڑ پور مسٹر لہری!" راجکماری کمل گڈھ کشن پر سر رکھے ہوئے کہتی ہیں اور پھر کیا وہ خوبصورت بھی تھے سکینہ ڈارلنگ؟" لیکن اس کے بعد جب قرۃ العین ہری ہر پال کے تو ان الفاظ میں تو "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ نے طنز کا زہر بھر دیا ہے "مجھے ضرور مائنڈ کروا دینا سکینہ ڈارلنگ، میں ہری سے کہوں گی کہ کچھ سوسائٹی کے اگلے ڈنر پر مسٹر لہری کی اس بے وقت موت پر ایک ریزولیوشن بھی پاس کروا دے!" ــــ "یہ مجھے ضرور مائنڈ کروا دینا" اور پھر ڈنر پر" ــــ اور پھر کچھ سوسائٹی کے ڈنر پر" ــــ اور پھر اتنی عظیم موت پر" ریزولیوشن بھی" پاس کرانے کا خیال! ــــ اس "فینسی ڈریس شو" کے کرداروں کو، اس کھوکھلے بورژوا طبقے کی ریاکاری کو ضرور ریکارڈ میں آنا چاہیئے تھا، اور قرۃ العین نے ہماری سماجی تاریخ کی ضرورت کو بڑی دیانت سے ریکارڈ کر دیا ہے، اس باب میں طنز آگے چل کر انتہا کو پہنچ گیا ہے "آرٹسٹ بے حد دل چسپ ہوتے ہیں" پر بحث ہو رہی ہے تو رانی جے پال سنگھ ایک لطیفہ ارشاد فرماتی ہیں، "اب ان ہی مسٹر لہری کو دیکھا تم نے، بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ کو مر گئے، ہاؤ ایبسرڈ!" اور بیگم اصغر امام اپنی نازک باریک آواز میں" ہنس کر اس لطیفے کی داد دیتی ہیں "ہاؤ ایبسرڈ ــــ!! ہاہاہا ــــ سنیہہ ڈارلنگ یو ڈو میک می لاف!"

کنور صاحب اور کنور رانی کے کردار بجائے خود اس طبقے پر بڑا پُر زور اور گہرا طنز ہیں، ان دو کرداروں میں یہ طبقہ اور اس کی زوال پذیری اور اس کا کھوکھلا پن سب خصوصیات مجسم ہو کر رہ گئی ہیں۔

کئی جگہ مصنفہ نے اس ناول کے "مین سین" غفران منزل کے ذریعہ پوری بورژوایت اور جاگیرداری پر طنز کئے ہیں۔ ایک تو اس عمارت کا پرانا پن اور پھر لکڑی کے زینے تھے جن پر بچھے ہوئے قالین اب بالکل گھس چکے تھے" ــــ

اس کے علاوہ ایک اور مختصر سا اقتباس دیکھئے:۔

"خاندانوں اور انسانوں کا یہ اونچا پن اور نیچا پن، یہ بڑھیا کوالٹی اور گھٹیا کوالٹی، یہ حسب نسب اور ارسٹوکریسی کے سلسلے ــــ انسان بھی گویا نمائش کے کتے یا دریس کے گھوڑے ہیں جن کے سلسلۂ نسب اور کوالٹی کے اظہار سے ان کی قیمتیں چکائی جاتی ہیں"

ان کے علاوہ روشنی کا زوردار کردار ہے، پھر کرن ہے، اور گنی ہے، اور پی چو ہے، کہانی بڑے زور سے بلندی کی طرف لپکتی ہے، بڑے حسن اور بڑی پھرتی اور چستی سے، بلندی پر جا کر جب اُترتی ہے تو اس میں دلکشی ہے، دلگدازی ہے، رقت ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک کمی کھٹکتی رہتی ہے ہم آگے بڑھتے ہیں مگر کمی کا احساس قائم رہتا ہے۔ ہم ناول ختم کر لیتے ہیں مگر کمی بدستور چبھتی رہتی ہے، یہ کمی کیا ہے؟ وہ کون سا نکتہ ہے جو رہ گیا ہے یا جس پر قرۃ العین نے پوری توجہ صرف نہیں کی؟ یہ اُمید کی قوت کی کمی ہے، یہ رجائیت کی کمی ہے، اور ایک بہتر نظامِ حیات کے شعور اور اُمنگ اور ولولے کی کمی ہے اور یہ بہت بڑی کمی ہے۔

قرۃ العین شاید یہ تو نہیں چاہتی کہ کنور صاحب اور کنور رانی والا زمیندارانہ نظام پھر سے تازہ دم ہو جائے اور لاکھوں انسانوں کا لہو اُن کی غفران منزلوں اور اُن کے کروا ہاراجوں اور ان کے کلبوں اور ہوٹلوں کی آبیاری میں کام آئے، وہ اس نظام کا ماتم بھی نہیں کرتی، صرف اس کے سکرات کے عالم بلکہ اس کے انتقال کی اطلاع دیتی ہے، ہمیں کنور صاحب پر رحم نہیں آتا، ہمیں کنور رانی سے بڑی شدید نفرت ہو جاتی ہے، زمیندارانہ نظام سے بھی گھن آنے لگتی ہے، ہم بڑی ظالمانہ اور قدامت پسندانہ قدروں کے محل کو دھڑام سے گرتا ہوا بھی دیکھتے ہیں۔ مگر اس سے آگے کیا ہے؟ کرن کا ماتم ہے جو ایک انقلابی نوجوان تھا، مگر کرن کا انقلابی نظریہ خالص بورژوائی ہے، پی چو کا ماتم ہے جو ایک جذباتی نوجوان تھا، مگر یہ جذباتیت فرار کا دوسرا روپ ہے، اوشیر لہری کا ماتم ہے جو مصور تھا، مگر اس کی مصوری کرن کے انقلاب اور پی چو کے جذبات سے کچھ مختلف نہیں تھی، خورشید پر طنز ہے، جو کمیونسٹ بن کر گھر سے بھاگ آیا تھا، مگر آخر میں اس نے سوچا چھوڑ دیا تھا روشنی کی ذہنی تباہی پر اظہارِ افسوس ہے، وہ ایک تیز و طرار اور باہمت لڑکی ہے مگر آخر میں وہ صرف غلامیں گھڑتی رہ جاتی ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین کو پرانے جاگیرداروں اور زمینداروں سے تو نفرت ہے، مگر ان کی نئی نسل سے اسے ہمدردی ہے، اور وہ انھیں ان کے بلند و بالا میناروں پر سے اُترتا بلکہ گرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی

یہ عجیب و غریب تضاد قطعی نہ پیدا ہوتا اگر ناول کے کرداروں کا CONFLICT (تصادم) طبقاتی ہوتا، محض ذہنی اور جذباتی نہ ہوتا، اور قرۃ العین کو اس مسئلہ حقیقت کا علم ہوتا کہ ہمارے جذبات، ہمارے اخلاقی معروضے، ہماری سماجی قدریں، ہماری تہذیب اور ہمارا کلچر سب کچھ ہمارے خارجی حالات کی تخلیق ہیں۔ وہ ہمارے طبقہ داری رشتوں کے نتائج ہیں۔ قرۃ العین یقیناً زمینداری نظام پر طنز کرتی ہے، لیکن یہ طنز طبقاتی تضاد سے زیادہ نمایاں ہوسکتا تھا، پھر یہ طنز تیزی حد تک اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے جب کنور صاحب اور کنور مانی سے نفرت کے ساتھ ساتھ پی چرا اور روشی سے پیار کا احساس ملتا ہے، یہ پیار جاندار بھی ہوسکتا تھا اگر ناول نگار ان کرداروں کو موت اور مایوسی کے اندھیرے میں نہ دھکیل دیتی، اور ناول کے نوجوان کرداروں کو غفران منزل اور کروا ہاراج سے الگ کرکے دکھاتی اور پھر یہ نوجوان کردار ناول میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ناول کے مجموعی تاثر کو وضع کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے، کسی مقام پر بھی ان نوجوان کرداروں کے نظریات میں تبدیلی یا انقلابی کیفیت کا احساس نہیں ہوتا، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ قرۃ العین نے سماج کی طبقاتی تقسیم کا گہرا مطالعہ نہیں کیا، اور یہ اس ناول سے بھی بڑی ٹریجڈی ہے، یہ بات بھی نہیں کہ قرۃ العین زندگی کے نئے تقاضوں سے بے خبر ہے، یا عوام سے بیگانہ ہے، یا ہندوستان و پاکستان کے برسر اقتدار طبقے کی حکمت عملیوں کے خلاف کچھ نہیں کہتی یا اُن کی عاقبت نااندیشانہ اقدامات پر صاد کرتی ہے، نہیں :-

"ارے ہم تو آزادی کے دیوانے تھے کہ ہماری جنتا کے رہن سہن کے ڈھنگ کا معیار اونچا ہو، ہماری بڑی آرزو تھی کہ کوئی جاہل اور بھوکا نہ رہے، اقتصادی اور طبقاتی کش مکش اور جہالت کی مجبوریوں سے ہم چھٹکارا پا جائیں، عوام جن کے پاس کچھ نہیں ہے، جو خود کچھ نہیں ہیں اپنے دکھوں سے نجات حاصل کرسکیں"

لیکن ان دکھوں کا مداوا کیا ہے؟ عوام کس طرح جہالت اور دوسری مجبوریوں سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں؟ قرۃ العین کے پاس اس کا نہ کوئی جواب ہے اور نہ علاج، یہی کمی ناول کے مجموعی تاثر میں یوں الجھی ہوئی ہے جیسے لکھن کے گولے میں ایک لمبا سا بال! وہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کانگرس اور مسلم لیگ کے بڑے چھوٹے رہنماؤں کی خود غرضیوں اور عوام کے لہو سے ہولیاں کھیلنے کو بھی بے نقاب کرتی ہے اور واضح انداز میں بتاتی ہے کہ یہ سب کچھ ہوا تو کیوں ہوا۔ اور اس میں بورژوا لیڈروں، پنڈتوں اور ملاؤں کا کتنا ہاتھ تھا۔ وہ موجودہ "پارلیمانی جمہوریت" سے بھی مطمئن نہیں، برسر اقتدار طبقہ سے بھی شاکی ہے۔ لیکن ایسا کیوں کہ وہ نامکمل ارادوں اور ان سلجھی الجھنوں کا ایک ڈھیر ——— ایک گورکھ دھندا چھوڑ کر ناول ختم کردیتی ہے، اور اتنے بھڑکیلے اور اُلجھتے ہوئے موضوع کو بہت حد تک سرد اور "کولڈ" چھوڑ دیتی ہے، ناول میں وعدے ہیں جو پورے نہیں ہوئے، عقدے ہیں جو حل نہیں ہوئے، تضاد ہیں جو متصادم نہیں ہوئے۔

کہیں کہیں تو یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ قرۃ العین کی دو شخصیتیں ہوگئی ہیں، اگرچہ میں ایک انسان کی دو شخصیتوں کا قائل نہیں ہوں، لیکن قرۃ العین کے خیالات کا تضاد کچھ ایسا ہے کہ محض ایک نکتے کی وضاحت کے لئے وقتی طور پر اس تقسیم کو قبول کرکے آگے بڑھنا ہوگا ——— ناول نگار کی ایک شخصیت نے زمیندار طبقہ کی معنوی زندگی کا آپریشن کردیا ہے، دوسری شخصیت کو اس طبقے کے مٹ جانے کا ہلکا سا افسوس ہے، ناول میں عوام سے جو ہمدردی کی گئی ہے وہ بھی کہیں کہیں ذاتی ہوکر رہ گئی ہے، معلوم ہوتا ہے یہ ہمدردی قرۃ العین کی ہے: "میرے بھی صنم خانے" کی مصنفہ نہیں، اور پھر ان کی مشکلوں کا بھی کوئی علاج نہیں، "نیو نیورلینڈ والے پیٹر پین" کے اس انسان کا سا طرز عمل تو واقعی نہیں جو بھیڑیوں کی طرف اُلٹے قدموں بھاگ کر انھیں ڈراتا تھا، کیونکہ قرۃ العین کا سیاسی شعور کچھ ایسا ناپختہ نہیں معلوم ہوتا، مگر اس طبقے کو عوام کی تباہی و ویرانی کی ذمہ داری سے الگ نہیں کیا جاسکتا جس کی موت اس ناول کا موضوع ہے، اور قرۃ العین یہ ذمہ داری اس طبقے کے سن رسیدہ کرداروں پر ضرور ڈالتی ہے، مگر نوجوان کرداروں کے یوٹوپیا پر کوئی الزام نہیں دھرتی، قرۃ العین تو بیسویں صدی کی ناول نگار ہے، سولھویں صدی میں شیکسپیر کا کنگ لیئر بھی ایسے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا، اُس نے بھی کہہ دیا تھا کہ :-

POOR NAKED CREATURES, WHERESOE'ER YOU ARE,
THAT BIDE THE PELTING OF THIS PITILESS STORM,
HOW SHALL YOUR HOUSELESS HEADS AND UNFED SIDES,
YOUR LOOPED AND WINDOW'D RAGGEDNESS DEFEND YOU
FROM SEASONS SUCH AS THESE? O, I HAVE TA'EN
TOO LITTLE CARE OF THIS.

میں یہ نہیں کہتا کہ کنور صاحب یا کسی اور کردار کو کنگ لیئر کے سے الفاظ کہنا چاہیئے تھے، مگر ہمیں اس صدی کے فن کار سے یہ توقع ضرور تھی کہ اس کی تحریر میں اس

اس احساس کی رو مسلسل رواں رہتی، یہ بات تو میری سمجھ میں آسکتی ہے کہ ناول کے کردار پورٹیکو میں بیٹھ کر آم کھاتے ہیں، کیچڑ میں چھپک چھپاک مچاتے ہیں، ساون کے جھکے ہوئے بادلوں کے سائے میں جامنیں گراتے ہیں، گھر، کالی بدلیاں گھر آئیں تو انھیں صرف ایک خیال آتا ہے کہ کچھ ان پکانا چاہیئے، وہ اپنے بالوں سے گرد کے بجائے موسری کی کلیاں جھاڑتے ہیں اور بعد میں جب تاریخ ہند کا سب سے بڑا دردناک سانحہ یعنی ملک گیر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوتے ہیں تو روشنی اور کرن کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتے بھی ہیں، مگر کرن مرجاتا ہے اور روشنی حواس باختہ ہو جاتی ہے اور ناول ختم ہو جاتا ہے، ایک جگہ کرن کو اپنے اخبار کی طرف سے فسادات کلکتہ کے حالات دیکھنے کے لیے جانے کا حکم ملتا ہے تو غفران منزل میں لڑکیاں منگو پارٹی کی تیاریوں میں مصروف نظر آتی ہیں اور روشنی ضرور سوچتی ہے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے — مگر کیا کچھ اور بھی نہیں کہنا چاہیئے تھا؟

انسانیت سے رومینٹک انداز کی محبت بڑی گمراہ کن ہے، یورپ کے ایک شاعر نے ایک سماجی اور سیاسی انقلاب کو روکنا چاہا تو مختلف طبقات کی آپس کی غلط فہمیاں دُور کرنے کی مہم شروع کر دی! ہمارے یہاں جماعت اسلامی بھی طبقاتی کشمکش کو کچھ اسی انداز سے ختم کرنے کے درپے ہے، یورپ کے اس شاعر اور پاکستان کی جماعت اسلامی دونوں کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ طبقات کی آپس کی سب سے بڑی غلط فہمی دولت کی ناجائز تقسیم اور پیداواری سامان پر ناجائز قبضہ اور پیداواری قوتوں کا استحصال ہے۔ قرۃ العین کو بھی اس حقیقت کو سمجھنا اور اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جب ہی وہ رخشندہ عرفان کو غفران منزل سے آگے وسیع کھیتوں میں لے جا سکیں گی ساری انسانیت کا احترام بڑا پاکیزہ جذبہ ہے، مگر مجھے اس ضمن میں انگریزی کے ایک نقاد کا یہ قول نہیں بھولنا کہ اگر غور کیا جائے تو اصل مسئلہ فارم کا نہیں، میٹر کا ہے صورت کا نہیں موضوع کا ہے، فارم تو تمام انسانوں کی ایک ہے، غفران منزل کے کنور صاحب اور مانا ٹھیر کے مزارعہ کی فارم ایک ہے مگر میٹر میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اور میٹر ہی سے ہم رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا تعین کرتے ہیں، اور ہمیں ان انسانوں کا ساتھ دینا ہے جو ترقی پذیر انسانیت کی امید گاہ ہیں، یہ "ہیومنزم" کی بحث اس لئے آئی ہے کہ کہیں قرۃ العین کی انسان دوستی رومانی تو نہیں، اسے انسانوں سے پیار ہے، اور وہ CLASS بھی نہیں ہے، پھر اس کا نقطۂ نگاہ اتنا الجھا الجھا کیوں ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ طبقاتی تقسیم اور اس کی بنیادوں کو پوری طرح نہیں سمجھتی، اس نے ایک سماجی اور ثقافتی المیے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس نے قوت واقتدار کے پرانے چشموں کو خشک ہوتے دیکھا ہے، مگر اس المیے کی بنیادیں تو بہت گہری تھیں اور اس کے اثرات بے پناہ تھے، میں یہ نہیں کہتا کہ قرۃ العین ناول کے آخر میں ایک طویل لیکچر کر کے ادیب کی سماجی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتی تھی، بلکہ میں تو ناول میں شروع سے آخر تک یہ جاگتا ہوا شعور دیکھنا چاہتا تھا، میں مصنفہ کے اس احساس کی جھلکیاں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ زوال کیوں رونما ہوا۔ عالمگیر عوامی تحریکوں اور عوام بیداری سے مصنفہ کو اتنے اہتمام اور التزام سے الگ (DETACHED) نہیں ہونا چاہیئے تھا، مجھے یہاں مارکس کے "نوٹ بکس" یاد آرہے ہیں جو اس نے اپنی بیٹی کے لئے لکھے تھے کچھ اس قسم کے الفاظ لکھے تھے کہ تمہاری تنہا مسرت کش کمش حیات ہے، اور تمہارا پسندیدہ ترین مقولہ یہ ہے کہ کوئی انسان — یا کوئی سی انسانی خصوصیت اجنبی نہیں!

"میرے بھی صنم خانے" میں ایک جگہ روشنی نے :-

"قطعی طور پر ارادہ کر لیا کہ وہ ان سب کمبخت سازوں کو زور سے ایک دوسرے سے ٹکرا دے گی اور اُن کے پاش پاش ہوئے ٹکڑوں اور جھنجھناتے تاروں اور پردوں سے ایک ایسا نئی قسم کا راگ ایجاد ہو گا جسے سارے بیوقوف سنگیت وشارد اور خود بھگوان شیو تک نہ پہچان پائینگے"۔

یہی پرانے سازوں کو توڑ کر ایک نیا راگ ایجاد کرنے کی امنگ محل نظر ہے، اس لئے کہ یہ نیا راگ تو ایجاد ہو چکا ہے، اور مستقبل ہر باشعور ادیب سے متوقع ہے کہ وہ اس نئے راگ کا احساس رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ ترقی کا نام سنتے ہی تیوریاں چڑھا کر پیچھے ہٹ جانے والے گروہ میں سے نہ ہو، اور قرۃ العین یقیناً اس گروہ میں سے نہیں! البتہ ترقی کا نام سن کر وہ آگے قدم بڑھانے کے بجائے ٹھٹک ٹھٹک جاتی ہے، قرۃ العین عوامی ترقی کا نام سُن کر دوسرے کئی ادیبوں کی طرح ناراض نہیں ہوتی البتہ سوچ میں ضرور پڑ جاتی ہے، اس سوچ کی انڈر کرنٹ سی — ایک رَو سی سارے ناول میں دوڑتی چلی گئی ہے، جس کو اگر آخر میں روشنی کے کردار کا سنبھالا سہارا دے جاتا تو یہی رَو ایک طوفان بن سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہی اس ناول کی ٹریجڈی ہے، روشنی اس ناول کا مرکز و محور ہے، آخر میں اس کی مایوسی اور وہم بخود سا ہو کر رہ جانے کی کیفیت، اس کے دماغی توازن کی گڑبڑ بظاہر شاید سمجھ ہو، لیکن اتنے بڑے تمدنی المیے کے ردعمل کی ایک اور صورت بھی تو تھی، اور وہ زیادہ خوشگوار، زیادہ جاندار صورت تھی، اور وہ صورت یہ تھی کہ روشنی ان تمام شکستوں کا جرات سے مقابلہ کرنے کے بعد اس پاس کے بکھرے ہوئے ملبے سے ایک نئے عزم، ایک تازہ ولولے کے ساتھ اُبھرتی۔ اور اگر وہ اُبھر سکتی، اگر وہ "خالی خالی آنکھوں سے چاروں طرف" دیکھتی نہ رہ جاتی، اگر اس کا

"دماغ اور ذہن بالکل خالی" نہ ہو جاتے۔ اور اگر اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے کے بجائے نئے ارادوں اور نئی تعمیر کے لئے نارمل رفتار سے دھڑکتا، المختصر اگر روشنی اپنے کو TRANSFORM کر سکتی، اگر اس میں اتنی جرأت ہوتی کہ وہ ماناٹھیر کے مزارعوں اور کہاروں کو مستقبل کا امین قرار دے سکتی تو یہ بیتی ہوئی ٹریجیڈی کا کتنا خوشگوار انجام ہوتا، روشنی کے کردار سے ابتدا میں مجھے یہی امید تھی، وہ اپنے اصولوں کے لئے "نیو ایرا" کی پالیسی میں تبدیلی کرنے کے خیال کی بڑے زور سے مخالفت کرنے والی اور اس کے لئے پی چو ایسے عزیز بھائی سے لڑ بیٹھنے والی روشنی کو ان حالات میں بڑے ٹھاٹ سے ابھرنا چاہیئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا مصنفہ کا یہی انداز یہی ATTITUDE ہے جس پر مجھے سب سے بڑا اعتراض ہے، اور میں پھر اس بات کو دہراؤں گا کہ اس کی وجہ صاف ہے، قرۃ العین کو یہ علم تو ہے کہ ہماری معاشرت طبقات کے خانوں میں بٹی ہوئی ہے، اور نچلا طبقہ اونچے طبقات سے سوائے اندھا دھند غیر انسانی اور غیر اخلاقی استحصال کے اور کچھ نہیں پاتا، ـــــ لیکن مصنفہ کو طبقاتی رشتوں کا علم نہیں، تاریخ کی تضاد اور تصادم قوتوں کا بھی علم نہیں! اور اس سلسلے میں بھی وہ واضح نہیں کہ انسانی تمدن کا ایک دور زوال پذیر ہو کر یکسر ختم نہیں جاتا، بلکہ اسی کے ملبے سے ایک نئی تہذیب کے سوتے پھوٹتے ہیں اور زندگی کے ارتقائی سلسلے میں موڑ ضرور آسکتے ہیں لیکن نہ پڑاؤ آتے ہیں نہ واپسی کا سفر ہوتا ہے اور نہ آخری منزل آتی ہے، غفران منزل اور کروا پاراج کے اُجڑنے کے بعد دھرتی کی ہری بھری آغوش پہ خزاں نہیں ٹوٹ پڑتی، بلکہ اس دھرتی کے بیٹے زندگی کو بہتر صورت میں نکھارتے ہیں اور سولسری کی کلیاں پھر بھی گرتی رہتی ہیں، اور شام کے سناٹوں میں موسیقی کا سا انداز باقی رہتا ہے،

ناول میں اس زبردست کمی کے باوجود میں قرۃ العین حیدر کے اجتماعی شعور سے مایوس نہیں ہوا، میرا اندازہ ہے کہ اگر قرۃ العین ذرا سی اور محنت کرے اور زندگی کے مسائل کو سراسر جذباتی یا وجدانی انداز میں دیکھنے کے بجائے سائینٹفک نقطۂ نظر سے جانچے تو اس کا ادبی مرتبہ بہت بلند ہو جائے گا، مجھے تسلیم کرنا ہوگا کہ قرۃ العین نے اختر حسین رائے پوری کی بیان کردہ حکایت کے مطابق کسی راجہ کے اس درباری کی حیثیت اختیار نہیں کی جو دریا کی لہریں گننے کی تنخواہ لیا کرتا تھا۔ قرۃ العین نے دوسرے بورژوا ادیبوں کی طرح اپنے ناول کو ڈرائنگ روم کے چمکتے دمکتے خرنجر پہ سر اٹھاتے ہوئے ریشمی پردوں کی صورت نہیں دی، اس نے سوچا ہے، وہ متاثر ہوئی ہے، اُسے سیاسی اور سماجی بوالعجبیوں کا بھی احساس ہے، اور یہ بڑی خصوصیت بات ہے، وہ دنیا کی سیاسی، سماجی اور ادبی ترقی پسند تحریکوں کی بھی دشمن نہیں معلوم ہوتی، اس نے طنز کا نشتر چلاتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کیا، وہ ساری دنیا پر ہنستی ہے، اس لئے کہ سب سے پہلے وہ خود پہ ہنستی ہے، اور اپنے ماحول، اپنے طبقے اور ان کے مصنوعی رواجوں اور کھوکھلی روایتوں کا مذاق اڑایا ہے، وہ اس ناول میں اس بورژوائی مرمریں مینار پر سے بھی اُتر آتی ہے جس پر بیٹھ کر اس نے اپنی ابتدائی کہانیاں لکھیں۔ اب وہ پناہ گزینوں اور شرنارتھیوں کو دیکھ کر بڑی شدت سے متاثر ہوئی ہے :-

"ہمارے دماغ خالی ہیں، ہماری نظریں خالی ہیں، ہماری روحیں خالی ہیں، ہم کچھ سوچنا نہیں چاہتے، کچھ سمجھنا نہیں چاہتے، ہماری آوازیں اپنی آوازیں نہیں ہیں، ہماری آوازیں کہیں گم ہو گئی ہیں، ہم سرگوشیوں میں بھی کچھ نہیں سن سکتے، ہم اپنے دلوں سے بھی باتیں نہیں کرتے، وہ جو اسی طرح آنکھیں کھولے کھولے اندھیرے کے اس پار پہنچ گئے، ان کی پتلیوں میں ہماری تصویریں اسی طرح رہ گئی ہیں، جس طرح اب ہم تمہارے سامنے کھڑے ہیں، لیکن تمہاری آنکھوں میں کاجل ہے، اور مسکراہٹ ہے اور تم یہاں سے جا کر یہاں کی خاک اور گرد اپنے سفید چینی کے ٹائلوں والے غسل خانوں میں دھو ڈالو گی، اور شام کو جائے کی میز پر بیٹھ کر اگلے روز کا پروگرام بناؤ گی"

یہ شرنارتھیوں اور پناہ گزینوں نے کہا ہے اور روشنی نے سوچا ہے اور قرۃ العین نے لکھا ہے، اس اقتباس کی آخری سطروں میں قرۃ العین کا ذرا طبقاتی شعور بھی جھلکی مارتا ہے، پھر وہ کٹھ ملّاؤں کو بھی نہیں معاف کرتی جو عورت کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"نیک عورت کو سال میں صرف دو مرتبہ کپڑے بنوا دو، ایک جاڑوں کے اور ایک گرمی کے، اور ہفتے میں ایک روز گوشت کھلا دو، یعنی صرف جمعے کے جمعے، اور پندرھویں دن سر کا تیل اور آنکھوں کا سرمہ مہیا کر دو، اور بس اس سے آگے وہ کسی اور چیز کی مستحق نہیں!"

کانگریس اور مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں کے متعلق بھی وہ کسی نوع کی جذباتیت کی شکار نہیں ہوئی، اب اگر کانگریس پر تنقید کو ہندو دشمنی اور مسلم لیگ پر تنقید کو حب روایت، پاکستان دشمنی سمجھ لیا جائے، تو میرے خیال میں یوں سمجھنے والوں کی "خرابی معدہ" کے باعث انھیں نظر انداز کر دینا چاہیئے، یہ وہ لوگ ہیں جو "آزادی" کے اعلان

کو ابھی تک ہضم نہیں کر سکے، ان کے نزدیک تو جاگیرداری کی مخالفت بھی اسلام دشمنی ہے، سو قرۃ العین مسلم لیگ اور کانگرس کی وقتی ہر دلعزیزی سے مرعوب نہیں ہوئی اور اسی لئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سیاسی شعور کچھ ایسا روایتی بھی نہیں، سیاسی شعور کی ایک آزمائش (۱۹۴۳) اور باقی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں خواجہ احمد عباس جیسے پرانے پرانے ترقی پسند بھی بہک گئے ہیں (پاکستان کے ترقی دشمن نقادوں اور ایڈیٹروں نے تو بھنگ کر اعلان بھی کر دیا ہے کہ وہ خط مستقیم میں بیٹھے ہیں) اور یہ مقام ہے انگریز کی سیاست کے بارے میں ادیب کا نقطۂ نظر اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم میں اس کا ہاتھ ـــــ اور مروجہ نظام سیاست کو آزادی کا مقدس نام دینے کی عام بیماری ـــــ

قرۃ العین نے اس معاملے میں کوئی لگی لپٹی نہیں اٹھا رکھی۔ حفیظ احمد کی مطلقہ بیوی کرسٹابل کو روشی انگلستان رخصت کرنے بمبئی آتی ہے اور جب کرسٹابل کو الوداع کہنے لگتی ہے تو ـــــ

"خدا حافظ ـــــ انھوں نے کہنا چاہا ـــــ خدا حافظ برطانیہ کی کرسٹابل ڈورین ـــــ ہم تمہارے آگے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم تمہارے جلانے کے لئے لالہ رُخ اور غزان منزل کے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے جی بھر کے تمہاری قوم کو گالیاں دیا کرتے تھے، اب تم جا رہی ہو، اس لئے کہ ہم نے تمہیں نظر انداز کر کے خود ہی ایک دوسرے کو گالیاں دینی شروع کر دی ہیں، لیکن کرسٹابل ڈورین ـــــ انھوں نے کہنا چاہا ـــــ جب تم اپنی ہری وادیوں اور کینٹ کے مرغزاروں میں حفاظت سے واپس پہونچ جاؤ، تو ہمیں ریڈ کراس کی امداد بھیجتے ہوئے (اور یہ امداد مل رہی ہے بفضلہ تعالیٰ ـــــ ندیم) ہمارے لئے اپنے خدا سے دعا کرنا کہ اے خدا انھیں معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں، ـــــ لیکن کرسٹابل ڈورین! بڑا افسوس یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، پچھلے کئی برسوں سے یہ جانتے چلے آئے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ـــــ"

اس ساری عبارت کی معنویت کے علاوہ "تمہیں نظر انداز کر کے" کا ٹکڑا خاص طور پر قابل غور ہے، جس کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ سارا کیا دھرا انگریز کا ہے، اور وہی اس تباہی کا مستحق تھا جو ہم نے اپنے ہی بھائیوں پر انڈیل دی،

اور پھر جب ۱۹۴۷ء والے "انقلاب" کا ذکر آتا ہے اس سلسلے میں بڑے بڑے ترقی پسند بھٹکے ہیں مگر قرۃ العین نے روشی کی زبانی یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔

"..... وہ چیخی ـــــ انقلاب! ـــــ انقلاب!! ـــــ ارے یہ انقلاب ہے! شرم نہیں آتی تمہیں ایسی نظمیں پڑھ کر خوش ہوتے ہوئے؟ ملک بھر کے اس قتل عام کو تم کرانتی کے مقدس نام سے پکارنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

اور پھر ان ہی دنوں ـــــ جب سارے ملک میں قیامت برپا ہوئی ـــــ

"امریکن نامہ نگاروں کے کیمرے کلک کلک کرتے، لائف اور پوسٹ میں قرون وسطیٰ کے اس ہندوستان کی مذہبی جنگ کی تصویریں چھپتیں امپریل جم خانے میں رقص ہوتے، اور لیڈی پامیلا ماؤنٹ بیٹن اغوا شدہ عورتوں کے کیمپوں میں جا کر ان سے ہاتھ ملاتیں"

اور آخر میں ـــــ

انسانیت کی تاریخ میں کہیں اس سے زیادہ حماقت انگیز جنوں کبھی ہوا ہے؟

قرۃ العین کا یہ سیاسی شعور یا یہ صحیح پولیٹیکل نقطۂ نظر اس سے مایوس نہیں ہونے دیتا، یہ درست ہے کہ اس سیاسی شعور کے مقابلہ میں ایک صحت مند سیاسی و سماجی نظام کی اسٹنگ کی کمی محل نظر ہے، اور اگر قرۃ العین اپنے ناول کے مرکزی کردار روشنی کی طرح اس کے بعد بھی خالی خالی آنکھوں سے خلا میں دیکھتی رہ گئی تو یہ ٹریجیڈی روشنی کی ٹریجیڈی سے بھی آگے نکل جائے گی، لیکن ابھی اس کی فنی دیانت پر اعتراض کرنا زیادتی ہوگی، اس ناول کے موضوع میں اس کا خلوص شعوری نہیں بلکہ بے خبری کا خلوص ہے، مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی وہ اُلٹے قدم چل کر "بھیڑیوں" کو ڈھانے کی لایعنی کوشش نہیں کرے گی بلکہ اس رواں دواں میں شامل ہو کر مستقبل کی طرف لپکے گی جس میں عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، صدیقہ بیگم، سرلا دیوی اور دوسری خواتین پہلے سے شامل ہیں، یہ تو مسلمہ ہے کہ قرۃ العین قدامت کا ساتھ نہیں دے گی، اس لئے کہ قدامت پر اس کا بھرپور طنز بیلے ناول میں نمایاں ہے، ایک جگہ پر اس نے آغا میر کی ڈیوڑھی میں "شاہ اودھ" کے دربار کی بڑی پُر اثر تصویر کھینچی ہے، یہ "شاہ اودھ" لکھنؤ کے پرانے نوابوں کی اولاد میں سے ہیں، اور بڑی مشکل سے گذر بسر کرتے ہیں، وہ انگریزوں کے اعلان آزادی

کے بعد کانگریسی حکومت سے اپنی اودھ کی بادشاہی واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں اور کچھ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے سارا اودھ ان کے قدموں کے نیچے بچھا ہوا ہے، وہ اپنی مجلس مشاورت کے سکریٹری چھمن صاحب سے کہتے ہیں:۔

"توں قبلاں چھمن صاحب۔ ہماری رعایاں گویاں بالکل خوشی سے، انسے کوئی موذی تنگ تو نہیں کر رہاں؟"

اس نوعیت کا تیز اور تند طنز کرنے والی قرۃ العین قدامت کی قوتوں کے ساتھ تو یقیناً نہیں ہے، لیکن وہ کوئی واضح فیصلہ بھی نہیں دے پاتی، اس نے اقبال کے جس مصرعے میں سے اپنے ناول کا نام چنا ہے، اس کا دوسرا ٹکڑا پہلے ٹکڑے سے زیادہ مناسب تھا، ناول کا نام "تیرے بھی صنم خانے" ہوتا تو کیا بُرا تھا۔ یہ "میرے" میں جو اپنائیت ہے بڑی گمراہ کن ہے، ان "میرے صنم خانوں" کی روشنی خالی خالی آنکھوں سے اوٹرم روڈ پر گھومتی رہ جاتی ہے، اور پشکن ایک صدی پہلے کہہ چکا ہے کہ "کہا جاتا ہے کہ غم ایک اچھا مدرسہ ہے، ہو سکتا ہے! ـــــ لیکن میرے خیال میں مسرت بہترین دارالعلوم ہے!"

اگر قرۃ العین اپنے ناول کے مرکزی کرداروں کے ساتھ عوام کا رشتہ قائم رکھ سکتی، تو پڑھنے والا ان کرداروں سے ایک فاصلے پر نہ بیٹھا رہ جاتا، پڑھنے والے کی حیثیت ایک تماشائی کی نہ ہوتی، بلکہ ایک اداکار کی، اور اس کمی کا وہی ایک علاج تھا، عوامی تجربات سے آگاہی اور طبقاتی رشتوں کا شعور،

اب قرۃ العین کے انداز، اسلوب اور مشاہدے کی طرف آیئے، اس نے اپنے موضوع کو سچائی سے نباہا ہے، اور کہیں بھی فنی پاکیزگی اور ادبی دیانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، ناول میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں کہ اگر کوئی ناتجربہ کار یا بیمار ذہنیت کا ادیب ہوتا تو آن کی آن میں چوما چاٹی شروع ہو جاتی، اور ایسے ایسے معرکے سر ہوتے کہ پیشہ ور مخمش نگار نک دم بجز دہ جاتے، جب سب لوگ بیدار دماغی کے کمرے میں ڈاکٹر سلیم کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں یا جب "ہر میجسٹی ہز میجسٹی" کا کھیل کھیلتے ہوئے پی چو جذبات کی زد میں آ کر کرسٹابل کو اپنی باہوں پر اُٹھا لیتا ہے ـــــ یہ بڑے نازک موقعے ہیں۔ مگر قرۃ العین نے انھیں بڑی ذمہ داری سے پیش کیا ہے، ان کرداروں کا ماحول ہی ایسا ہے کہ دوسرے طبقے کے پڑھنے والے ان میں فحاشی کے عنصر کو صرف تلاش ہی نہیں کرتے بلکہ متوقع رہتے ہیں کہ ابھی کوئی ایسی بات ہو گی جس سے ریڑھ کی ہڈی پر گدگدیاں سے رینگنے لگیں گے، مگر ایسا نہیں ہوتا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گلی میں سے گذرتے ہوئے چلمن کی اوٹ میں کوئی "شعلہ جوالہ" دیکھ کر بے ہوش ہو جانے والا اور صرف خلوۃ سونگھ کر ہوش میں آ سکنے والا نوجوان کافی عمر تک اپنی ماں بہن کے سوا کسی اور عورت کی صورت دیکھ ہی نہ پاتا، اور ہماری اردو شاعری کی مثنویاں ان ہی "پردہ نشین" قسم کے نوجوانوں کی تخلیق کردہ ہوتی ہیں۔ اور وہ لڑکیاں اور لڑکے جو غفران منزل کے کمروں، برآمدوں اور باغوں میں چہکتے پھرتے ہیں، اور ایک دوسرے کو تنہا پا کر بھی دوست یا بھائی بہن ہی رہتے ہیں ـــــ دراصل ہر عورت کو محض غزال ختن نہیں سمجھتے،

قرۃ العین کا مزاح بھی اس کے فن کی نمایاں خصوصیت ہے، اس کے قہقہوں کا سبھاؤ اور اس کے مزاح کی حدت سمجھنے کی چیز ہے، وہ کسی ایسے ادارے کو برداشت نہیں کر سکتی جسے اپنے بارے میں کسی نوع کا ادعا (PRETENSION) ہو، اور اسی لئے وہ شہلا رحمن، زینت ریاض، کنور صاحب، کنور رانی، نام نہاد شاہ اودھ اور پھر اصغر امام، مسز ہری ہر پال اور رانی کمل گڈھ وغیرہ پر بڑی شدت مگر بڑی تہذیب سے برسی ہے، اور یہی کامیاب مزاح اور طنز کی خصوصیت ہے، لیکن مجھے قرۃ العین سے ایک زبردست شکایت ہے، ترقی پسند شاعروں میں سے چند ایک وارفتہ مزاجوں کا اس نے مذاق اُڑایا ہے، اور اس کا حق ہر ادیب کو حاصل ہے کہ وہ ہماری خامیوں کو واضح کرے، مگر ناول کے واحد کمیونسٹ کردار خورشید کی ناکامی کے ذریعے اور ویسے بھی کئی مقامات پر کمیونسٹوں کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار نہیں کیا گیا، کمیونسٹوں کو گالیاں دینا ہر شخص کا وطیرہ ہو چکا ہے، جو یا تو کمیونزم کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں، یا اشتراکیت دشمن ممالک افراد اور اداروں کے پروپیگنڈے سے اندھا دھند بغیر سوچے سمجھے متاثر ہے، کمیونسٹ بھی انسان ہوتے ہیں، اور وہ بڑے اچھے انسان اور بڑے دلیر اور ایثار پیشہ انسان ہوتے ہیں، اُن کے لمبے بالوں، اُجڑی صورتوں، میلے کپڑوں، خستہ حالی، غریبی یا مفلوک الحالی کا مذاق اڑا دینا بڑی کھوکھلی سی بات ہے، اور پھر یہ ایک اوفیشن چل نکلا ہے کہ کمیونزم کو بُرا نہیں کہتے البتہ کمیونسٹوں کو بُرا کہتے ہیں، اور اس آڑ میں جبر و تشدد کی حکمت عملی شہ پاتی ہے۔ سارتر کا ایک کردار یاد آتا ہے جو سوشلسٹ ہے، سارتر اس پر طنز کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس نے علم حاصل کرنے کے لئے لائبریری کا مطالعہ شروع کیا، مگر سب سوشلسٹوں کی طرح مطالعے کا کوئی نظام اس کے ذہن میں نہیں تھا، اس لئے اس نے ابجدی لحاظ سے کتابیں پڑھنا شروع کیں، اور پھر لائبریری میں بچوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرتا رہا! ـــــ سارتر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ سوشلزم کا مخالف نہیں البتہ سوشلسٹوں کے ضرور خلاف ہے جو عموماً اسی نوعیت کے فرد ہوتے ہیں۔ بہرکیف کمیونسٹوں اور اشتراکیوں کو بُرا بھلا کہنا ایک فیشن سہی جو آج پاکستان میں بھی بڑا مقبول ہو رہا ہے، مگر ایک سوچنے سمجھنے والے ادیب کو اس قسم کا نقطۂ نظر تخلیقی زیب نہیں دیتا، اور ہماری سوسائٹی کے دوسرے افراد کے مقابلے میں

کیمونسٹ نوجوان اخلاقی لحاظ سے کہیں زیادہ بلند اور سربرآوردہ ہیں، تقابل ہوتا تو اور بات تھی، معاملہ واحد کردار کا ہے،

زبان اور انداز بیان صاف ستھرے اور بے حد خوشگوار اور شیریں ہیں، اس سے پہلے یہ شکایت عام تھی کہ قرۃ العین انگریزی الفاظ کو مکالموں کے علاوہ بیانیہ عبارت میں بھی استعمال کرنے کی عادی ہے؛ مگر اس ناول میں تو اس کی زبان نہایت صاف ستھری ہے اور انداز بیان میں اس کے بیشتر افسانوں کی سی الجھن نام کو نہیں، اسلوب کے معاملے میں آرنش ڈرامہ نویس سین اوکیسی کے بارے میں چارلس ہیوٹ کے الفاظ یاد آرہے ہیں :-

HE HAS LED A HARD LIFE AND HE HAS A HARD MIND.

(اس نے بڑی کڑی زندگی بسر کی ہے اس لئے وہ بڑے کڑے مزاج کا آدمی ہے)

قرۃ العین کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے :-

SHE HAS LED A CALM LIFE AND SHE HES A CALM MIND.

(اس نے پرسکون زندگی بسر کی ہے اس لئے اس کا مزاج بھی پُرسکون ہے)

اور یہی سکون، توازن اور پاک و صاف رنگینی ناول کی زبان اور بیان کی جان ہیں، وہ مختصر الفاظ استعمال کرتی ہے، بڑی قوت سے استعمال کرتی ہے، اور بڑی صفائی سے بہت کم مدت میں بہت زیادہ کہہ جاتی ہے، انداز بے حد رومانی اور شاعرانہ ہے، مگر یہ کوئی ایسی اعتراض کی بات نہیں، ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم ادیب اور فن کار ہیں اور ہم خبروں کے ترجمے نہیں کرتے، ادب تخلیق کرتے ہیں (ویسے خبریں جمع کرنا اور ان کے ترجمے کرنا کوئی گناہ نہیں، بڑا معزز اور اہم پیشہ ہے) اسی لئے میں قاضی عبدالغفار، امتیاز علی تاج، کرشن چندر، اور قرۃ العین حیدر اور خود اپنے طرز تحریر کو ادب کے لئے بے حد ضروری سمجھتا ہوں، قرۃ العین حیدر اتنے شگفتہ اور اتنے رومانی انداز کے باوجود غم دالم کی بھی بڑی کامیاب عکاسی کرتی ہے، اوشیر لہری، پی چا اور کرتن کی موت پر اس نے جو کچھ لکھا ہے انھیں اردو ادب کے غیر فانی ٹکڑوں میں بلند مرتبہ ملنا چاہیئے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین کو زبان اور اسلوب پر کافی قدرت حاصل ہے، میں نے ہمیشہ عصمت اور ہاجرہ کے ذرا ذرا سے بالکل سیدھے سادے لفظوں میں زندگی اور کشمکش زندگی کے کتنے چشمے ابلتے دیکھے ہیں، کرشن اور چند دوسرے افسانہ نگار جن میں خود میں بھی شامل ہوں، تفصیل میں جانے کے عادی ہیں اور شاید یہ ہمارا نقص ہے، شاید مختصر افسانہ نویسی کے لئے یہ ایک نقص ہے (چند لوگ کہتے ہیں اور میں اب تک ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں) لیکن قرۃ العین رنگین نگار ہونے کے باوجود کم از کم اس ناول میں تو چند لفظوں کی انفرادی ترکیب سے اکثر بہت سی باتیں کہنے لگی ہے، اور اگر اس انداز کو شعوری طور پر ترقی دینے کی کوشش کی تو بڑی کامیاب ہوگی،

اس ناول میں ایک بالکل نئے اسلوب کا بھی تجربہ کیا گیا ہے، قرۃ العین بات کہتے کہتے کہنے والے کی نفسی حالت کو بریکٹ میں لکھ دیتی ہے، یہ طریق کار اکثر کامیاب رہا ہے مگر کہیں کہیں "بور" ہونے لگتا ہے، خصوصاً اس وقت جب بڑے زور کا مکالمہ جاری ہو اور درمیان میں ایک دم بریکٹ شروع ہو جائیں، بہرکیف تجربہ بُرا نہیں اور اسے ترقی دے کر خاصہ پُراثر بنایا جا سکتا ہے، یورپ کے عینیت پسندوں نے اس تجربہ کے ساتھ زیادتیاں کی ہیں، اسی لئے وہاں یہ طریقہ اب کچھ ایسا پسند نہیں کیا جاتا،

فطرت اور مناظر فطرت کی عکاسی میں قرۃ العین کو کمال حاصل ہے، اس سلسلے میں وہ بہت کامیاب ہے۔ کرشن چندر کی طرح اس نے مناظر میں جیسے گھل کر ان کے بارے میں لکھا ہے، اور پھر کچھ ایسے دلربا اور شگفتہ انداز میں کہ کئی بار یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم شعر پڑھ رہے ہیں، سید امتیاز علی تاج نے شاید اسی رنگینی سے ذرا ضرورت سے زیادہ متاثر ہو کر لکھ دیا ہے کہ :-

"قرۃ العین کی تحریر الجھے اور تھکے ہوئے دماغ کے لئے فرحت کا پیغام لاتی ہے"

اگر ادب صرف فرحت کا پیغام لانے کا کام دینے لگے تو میرے خیال میں گرمیوں میں لیمن کی ایک برف لگی بوتل اور سردیوں میں گرم چائے کی ایک پیالی اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے، امتیاز صاحب نے شاید جلدی سے فلیپ کے لئے یہ رائے لکھ دی۔ اگر وہ سارا ناول پڑھتے تو یقیناً قرۃ العین کی اس کامیاب کوشش کو صرف "فرحت بخش" کہہ کر اسے مختلف شرتوں کی فہرست میں شامل نہ کر ڈالتے۔ یہاں اقتباس پیش کر کے میں طوالت کا مرتکب نہیں ہونگا (اگرچہ اب تک یہ ارتکاب ہو بھی چکا ہے) کہنا صرف یہ ہے کہ یہاں موسری کی کلیاں ہیں، پروائی کے نم جھونکے ہیں، شبنم آلود سفید شگوفے ہیں، باغوں پر جھکی

ہوئی گھٹائیں ہیں، سناٹے ہیں (اور سناٹوں کی مختلف قسموں کا تو کوئی شمار ہی نہیں) گلابی جاڑے ہیں، یوکلپٹس کے جھنڈ، اسوک کی قطاریں اور پھر ان کے لانبے لانبے لیٹے ہوئے سائے ہیں۔ بنفشے کے شگوفے اور زرد گلاب کی بیلیں ہیں، گومتی ہے اور گھاگھرا ہے، اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ رنگ ہیں، خوشبوئیں ہیں آوازیں ہیں، اور یہ سب کچھ اتنی فن کاری سے ناول کے کینوس میں شاید اس لئے سمویا جا سکا ہے کہ قرۃ العین افسانہ نگار اور ناول نویس کے علاوہ کامیاب مصور بھی ہے، اور رقص و موسیقی کے بارے میں اس کی معلومات و تجربات گوناگوں ہیں۔

اکثر ابواب اس قسم کے فقروں پر ختم ہوتے ہیں ــــ "مینہ چھاچھم برسنا شروع ہوگیا" ــــ "باہر سڑک کے نیلے دھندلکے میں لپٹا ہوا سناٹا زیادہ تیزی سے چیخنے لگا" ــــ "اسوک کی قطاریں ساکت کھڑی ہیں" ــــ اس قسم کے ابواب کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض اوقات کوئی باب ختم کرنے سے پہلے خواہ مخواہ آنے والے آخری منظر یا تی ٹچ کا خوف ذہن پر ناچنے لگتا ہے، اسی لئے یہ فقرے کہیں کہیں بیکار نظر آنے لگتے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کا یہ ناول اردو کا ایک کامیاب ناول ہے، کیونکہ یہ سرگباشی سامنتی دور کی ایک فن کارانہ تاریخ ہے، ذہانت سے لبریز لیکن دو طرفہ خلوص سے آلودہ۔

آخر میں مجھے گورکی کے الفاظ میں قرۃ العین سے پوچھنا ہے کہ:

"ثقافت اور کلچر کے علمبردارو! تمہارا رُخ کدھر ہے؟"

"کیا تم کلچر کی محنت کش قوتوں کے ساتھ ہو یا ڈاکوؤں کے اس نظام کے ساتھ جو سر سے شروع ہو کر نیچے کی طرف مسلسل گل رہا ہے!

تمہارا رُخ کدھر ہے؟"

قرۃ العین حیدر کو جلد از جلد اپنا رُخ مقرر کر لینا چاہئے، اس لئے کہ اس میں ترقی کے واضح امکانات ہیں، رُخ کا تعین اس کے لئے بھی مفید ہوگا اور اردو ادب کے لئے بھی۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور میں پڑھا گیا)

پرکاش پنڈت کے افسانوں کے افراد متوسط طبقے کی اکائیاں ہیں جنھیں یہ سلجھا ہوا افسانہ نگار متوسط طبقے کے پریشان کن سوالات حل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہر ذہین افسانہ نگار اور ادیب کی طرح پرکاش پنڈت نے اپنے سماجی تجربے، ماحول اور ذہنی کاوش سے اس سماجی شعور کو پا لیا ہے جس کے بغیر موجودہ سماج کے تکلیف دہ سوال کسی طرح حل نہیں ہو سکتے اسی لئے ان کے افسانے حیات افروز ہوتے ہیں۔

(کرشن چندر)

میراث

ایک تہذیبی امانت ــــــــ

جسے ماضی کے عوام نے اپنی جمہوری روایات سے بھرپور کیا

جسے حال کی عوامی جدوجہد نے توانائی اور چمک بخشی

اور ــــــــ جسے پرکاش پنڈت آنے والے دور کو سونپتا ہے

قیمت تین روپے (3/-/-)

مکتبہ شاہراہ - دہلی

فاختہ

سید ذکی یحییٰ

کہتے ہیں اگلے زمانہ میں جب دنیا کا شعور ابھی تک سادہ اور عنصری حالت سے آگے نہ بڑھا تھا، اور اس نے مظاہر قدرت کو پرکھنے سے زیادہ کچھ نہ سیکھا تھا، متمدن ہنوز اپنی طفولیت کے گہوارہ میں انگڑائیاں لے رہا تھا، تو امن کی زندگی بسر کرنے کی غرض سے ایک خاص نشان کی ضرورت پڑی جو امن کی قوتوں کو ابھار سکے اور تباہ کن جنگ و جدال کے خلاف سلامتی کا محاذ قائم کر سکے۔ زیتون کی شاخ اس کام کے لئے چن لی گئی۔ یہ چناؤ دانائے زندگی کے ذریعہ عمل میں نہیں آیا بلکہ نفع و نقصان کے اس غیر شعوری فلسفہ کے ماتحت تھا، جس پر نابالغ دنیا کا ایمان بالغیب تھا، لیکن زیتون کی یہ نازک شاخ اپنی بے بال و پری کے باعث امن کا صحیح کل اور زندگی بخش پیام دنیا کے طول و عرض میں پہونچانے کے قابل نہ تھی۔ نابالغ توہم پرست سماج کی ناہموار اور غیر تربیت یافتہ تخلیقی قوت نے اس مسئلہ کا حل سوچا اور بالآخر اس نے ایک ایسے جاندار کو تلاش کیا جو مزاج اور عادات کے اعتبار سے حلیم الطبع اور بے ضرر تھا۔ اس طرح امن کے محاذ میں فاختہ بھرتی کی گئی اور زیتون کی خوش رنگ شاخ اس پرند کی چونچ میں دیدی گئی۔ گویا امن کے پیغام کو بال و پر لگائے گئے تاکہ دنیا اس سے روشناس ہو سکے۔

سادہ لوح سماج کی ستم ظریفی کہئے یا نجی ملکیت کی طرف تاریخی عمل کی نئی کروٹ، بہرحال رفتہ رفتہ امن کا یہ نشان مشتری کی مغرور بیٹی سترا کو سونپ دیا گیا جو بیک وقت، جنگ و جدال، عقل و دانش، اور فنون لطیفہ جیسے متضاد شعبوں پر حکمراں خیال کی جاتی تھی۔ یعنی تخریب اور تعمیر کی قوتیں اعلیٰ طبقہ کی میراث قرار دیدی گئیں۔ روما اور یونان کے مغرور اور جابر فاتحوں کی پیشانیاں اسی شاخ زیتون کے مقدس ہاروں سے سجائی جانے لگیں، حالانکہ ان کی فتنہ سامانیوں نے ملک کے ملک روند ڈالے اور کر رہا پا بہ زنجیر غلاموں کی پیشانیاں اپنے قدموں پر جھکا دیں۔ اب نہ وہ ابتدائی سماج کی سادہ اور اجتماعی تقسیم کار باقی رہی اور نہ آدمی کی عزت دوقار کا دستور۔ آزاد نفسانیں آزاد انسانوں کے گیت، قدرت سے راز و نیاز کی باتیں سب پرانی کہانیاں بن گئیں۔ روما کا قانون اور فوجی نظام، یونان کا فلسفہ اور حکمت، اعلیٰ طبقوں کی رہنمائی، مضبوطی اور فرمانروائی کا ضامن بن گیا۔ سماجی ارتقا کی تاریخ مختلف زاویوں سے دیکھے جانے کے باوجود اس امر پر متفق معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی انسان کے غیر طبقاتی سماج سے ابھر کر جب کروڑ ہا توہ آقا اور غلام، شریف اور رذیل کے بندھنوں میں جکڑا ہوا پایا گیا۔ ان آقاؤں اور شریف زادوں نے عقیدہ اور عمل کے سارے وسیلوں کو اپنے چنگل میں دبوچ لیا۔ پھر اگر زیتون کی شاخ اور فاختہ کا امن پر ور وجود، جنگ کی دیوی سترا کی طرف منسوب ہونے لگا اور روما و یونان کے ڈاکو فاتحوں کا زینت سر بن گیا، تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیومالا کے زمانہ کے توہم پرست و خفا فی ان فلسفیوں سے کہیں زیادہ حقیقت پرست تھے جن کی مابعد الطبیعاتی بھول بھلیاں نے حقیقت و اصلیت کے تمام نشانات مٹا کر خالص تخیل کا ایک ایسا پیچ دار طومار کھڑا کر دیا، جس میں ایک مرتبہ داخل ہو کر واپسی کی کوئی گنجائش نہیں اور جہاں بھٹکتے رہنا ہی اعلیٰ ترین معراج ہے۔ برخلاف اس کے دیومالا کے مفکر قدرت کے جبر سے تنگ آ کر کبھی قدرت کے سامنے سر جھکاتے اور کبھی اس کو زیر کرنے کے لئے ایسی طاقتیں تخلیق کرتے تھے، جو انھیں قدرت کی غلامی سے نجات دلا سکیں۔

ایک مجلس میں ذکر تھا کہ انسان اپنی پوری تاریخ میں دو طرح کی لڑائیاں شروع سے اب تک لڑتا چلا آیا ہے۔ ایک قدرت سے جنگ اور دوسری سماجی ناانصافیوں کے خلاف اپنے ہمجنسوں سے جنگ۔ ایک قدیم الخیال بزرگ جو عقل دشمنی میں یدطولیٰ رکھتے تھے "قدرت" کو

"خدا" سمجھ بیٹھے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، بے تحاشہ برس پڑے۔ بے چارہ ترقی پسند پہلے تو بھونچکا رہ گیا پھر حواس درست کر کے "قدرت اور خدا" کا فرق سمجھانے لگا۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا اس لئے "قدرت" کی بجائے "مظاہر قدرت" کی ترمیم پیش کر کے اپنی جان بچانا چاہی۔ یہ ترمیم بھی مجلس کے بحرانی درجۂ حرارت میں کمی نہ کر سکی بالآخر سعدی کے چار مصرعے دلائل کے اسلحہ خانے سے نکالے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　　تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　　شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

بادل، ہوا، چاند، سورج، ستارے اور فضا سب مظاہر قدرت ہیں۔ یہ انسان کے فرماں بردار ہیں اور روٹی حاصل کرنے میں انسان کی مدد کرتے ہیں، اگر انسان لاپرواہی برت کر ان سے کام نہ لے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔ مولانا کو یہ بات تو پسند نہ آئی کہ قدرت کو انسان کے ماتحت کر دیا جائے لیکن سعدی کے کلام سے انحراف کرنا بھی ان کے نزدیک کفر کے مترادف تھا "نیست پیغمبر و لے دارد کتاب" اس لئے کسمسا کر چپ ہو گئے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ دیومالا کے مفکر زندگی کے تقاضوں سے مجبور ہو کر پرستش کرنے کے باوجود جس قدرت کو مطیع کرنے کے محض خواہشمند تھے، وہ مسلسل جدوجہد کے ذریعہ اپنی مطلق العنانی سے دست بردار ہو جانے پر مجبور کی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ دیومالا کے دیوتا اور دیویاں، چاند، سورج، ہوا، پانی، ستارے، فضا، سعدی کے دور میں تخت الوہیت سے معزول ہو کر انسان کے خادم بن چکے تھے۔ یہ اطاعت جو انسان کے دماغ اور دست و بازو سے حاصل کی گئی تھی، بادشاہ اور رعایا کے طرز کی نہ تھی، بلکہ معیشت کی ضروریات سے نسبت رکھتی تھی۔ نہ یہ تیروں کی بوچھار، تلواروں کی جھنکار، اور توپوں کی گرج سے حاصل کی گئی، بلکہ فاختہ کے پُرامن بازوؤں کے سایہ میں اس کا سراغ ملے گا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ امن اور جنگ میں پسندیدہ چیز کون سی ہے؟ اس سوال کے جواب پر ہی بے چاری فاختہ کی قدر و منزلت کا دارومدار ہے۔ ماہر نفسیات کے نزدیک افعال کا تعلق دماغ اور مزاج کی خاص حالت اور کیفیت سے ہوتا ہے۔ لہٰذا امن اور جنگ بھی تلون مزاجی کے مدوجزر کے مظہر ہوتے ہیں۔ میکانکی قسم کے مادہ پرست، امن اور جنگ کی دونوں صورتوں کو اس شعور کی اطمینان طلبی سے تعبیر کریں گے جو انسانی جسم کے منظم مادہ میں مضمر ہوتا ہے۔ جبلیت پرستوں کا مذہب اس عالم رنگ و بو پر قہقہے مارتا ہوا عالم مثال کے مجرد تصورات میں امن اور جنگ کا کھوج نکال لائے گا۔ لیکن ان سب میں آسان تجزیہ روحانی دیوتاؤں نے کیا ہے یعنی جنگ، قادر مطلق، خدائے ذوالجلال کی صفت قہر و غضب، اور امن اس کی شان کریمی کے لیے متضاد مظاہر ہیں جو اگرچہ آزاد مشیت کے فرمان کے تابع ہیں، لیکن جب جب انسان بتائے ہوئے راستہ سے ہٹ جاتا ہے، تب تب جنگی عقاب ان پر جھپٹ پڑتا ہے اور جیوں جیوں وہ رضا و اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے، تیوں تیوں فاختہ کی سُریلی "کو کو" فضا کو امن کے نغموں سے بھر دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک تعبیر قابل سماعت ہے جو خالص سودیشی ہونے کی وجہ سے بوکسِ شمشیر خراج تحسین حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس دبستان خیال کے ماہروں کی دریافت یہ ہے کہ امن کی دیوی انڈین نیشنل کانگریس ہے اور جنگ کا دیوتا عالمی کمیونزم ہے، جن کی ہندوستانی شاخ کے خون سے اہنسا کے مرکب کو کافی زود اثر بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن ان تمام افکار اور تعبیرات کے باوجود، یہ بات اب تک حل نہ ہوئی کہ امن اور جنگ میں پسندیدہ چیز کون سی ہے اور "فاختہ" کو "عقاب" پر کیوں ترجیح دی جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "فاختہ" اور عقاب دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جنگیں لڑی جاتی ہیں تاکہ امن قائم ہو، اور امن قائم کیا جانا ضروری ہے تاکہ بخوبی جنگی تیاری کی جا سکے۔ تو پھر یہ سوال ہی بیکار اور غیر معقول معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اور امن کے درمیان کون سی چیز پسندیدہ ہے۔ جدلی مادیت تاریخی تعبیر میں مختلف طبقوں کے درمیان مسلسل جنگ کو ناقابل تردید تاریخی واقعہ تسلیم کرتی ہے۔ اشتراکیت جو سماجی ارتقاء کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے، جنگ کرنے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ اس لڑاکو سماج میں تشدد کے جواب میں اہنسا کا نظریہ ہر خوش نما فلسفہ ان تمام تحریکوں کے لئے موت کا سامان بہم کرتا ہے جو سماجی ناانصافیوں اور لوٹ کھسوٹ کو مٹا کر، عدل و مساوات اور سچی جمہوریت قائم کرنا چاہتی ہیں۔ 'اہنسا' نیکی اور بدی کے مجرد تصورات کی چیستاں پیش کرتا ہے اور نیک و بد کردار کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے بدی سے نفرت اور بدکردار سے محبت اہنسا کے فلسفہ کی ایک ایسی خطرناک ترکیب ہے جو آنکھوں میں خاک جھونک کر سرمایہ دار لیڈروں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے تاکہ وہ اطمینان اور چین کے ساتھ اپنی لوٹ کھسوٹ جاری رکھیں۔ جدلی مادیت بدی اور بدکردار کے الگ الگ وجود

تسلیم نہیں کرتی۔ اور اس لئے بدکرداروں سے محبت کرنے کا ناقابل عمل اصول اس کے نزدیک سامراج کی تائید کی ایک زیادہ خطرناک اور پُرفریب شکل ہے۔ واقعات بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آج ہندوستان میں سرمایہ داری کے غیر سماجی عناصر اہنسا کے سایہ میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ پھر دھوکہ کیوں کھایا جائے تشدد پسندیدہ چیز نہیں۔ لیکن اس کا مقابلہ کن ہتھیاروں سے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نادار اور دولتمند طبقوں کے تاریخی جھگڑوں کا فیصلہ اہنسا کے ہتھیار سے نہیں کیا جاسکتا جو خونی سامراج کے اسلحہ خانے میں مصلحتاً سجایا گیا ہے۔ یہ سامنے ہی کی بات ہے کہ اہنسا کے بڑے بڑے جگادری لیڈر محنت کشوں کی جدوجہد کو کچلنے کے لئے امتناعی نظربندی اور مزدوروں کے متعلق جابرانہ قانون بنا بنا کر پولیس اور فوج کے ذریعہ اہنسا کا پرچار کر رہے ہیں۔

بہرحال "فاختہ" اور "عقاب" دراصل دو ذریعے ہیں۔ طبقاتی مقصدوں کو حاصل کرنے کے لئے ان دونوں کو ضرورتِ وقت کے لحاظ سے استعمال کیا جاتا رہا ہے اور اس وقت تک کیا جاتا رہے گا جب تک اقتصادی ڈھانچہ کی ناہمواریاں باقی ہیں اور تمام دنیا میں صحیح جمہوریت قائم نہیں ہوتی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انسان کی صحرائی زندگی سے لیکر موجودہ متمدن زندگی تک حملہ آور کون ہوتا چلا آیا ہے اور کس نے حملوں کو روکنے اور عوامی زندگی کو بہتر بنانے کی مسلسل جدوجہد کی ہے۔ وہ کون سا طبقہ ہے جس کی زندگی کی ساری مسرتیں مستقل امن سے وابستہ ہیں اور جو "فاختہ" کے سایہ میں قدرت کی بے پناہ طاقتوں کو مسخر کر کے انسانی سماج کو ہر خوف سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ داری اس نصب العین میں اپنی موت کے کھلے آثار دیکھتی ہے اور اس لئے عقاب جنگ سے اس کی بنیادی دوستی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ کمیونزم کے مقاصدِ جنگ کے ذریعہ پورے نہیں کئے جا سکتے، اس لئے لازماً وہ امن کی فضا کا طلبگار رہے۔ کمیونزم ایک زندہ حقیقت بن چکا ہے اور اس کی مختصر تاریخ سامراجی ہوسناکیوں کی روک تھام سے بھری ہوتی ہے۔ وہ امن عالم کے لئے دعوت پر دعوت دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے مضمحل خنجر سوانگ کے باوجود اس کی دعوت پھیلتی جا رہی ہے۔ سامراج بوکھلا گیا ہے اور ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائشوں پر آزمائشیں کر رہا ہے۔ یونان کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ مشہرت کی خاطر اگر تم ڈائنا کا مندر تعمیر نہیں کرا سکتے، تو جو موجود ہے اس کو ڈھا دو!" تاریخ شہرت دینے میں بدناموں اور نیک ناموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے۔

فاختہ کے بازو مضبوط ہیں۔ تیز سے تیز بمبار بھی اس کی اُڑان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ عقاب کی آنکھوں کا خون اور پنجوں کی زہر آلود تیزی ختم کر کے دم لے گی۔ اس کی پشت پر کروڑہا عوام کا عزم راسخ اور چونچ میں شاخِ زیتون کا امن پرور پیغام ہے۔ وہ آغاز میں امن کی دیوی تھی اور انجام میں امن کے پرچم کا حسین نشان۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

آج دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک ترقی پسند تحریک لہریں لے رہی ہے اور دنیا کے تمام باشعور شاعر یک زبان ہو کر امن، اخوت اور اشتراکیت کے حق میں اپنی آواز بلند کر رہے ہیں ——— اور یہ آواز

دیس دیس

میں گونج رہی ہے

'دیس دیس' میں روس، چین، جاپان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان، چیکوسلواکیہ، ہنگری، یونان اسپین، برما، ملایا، انڈونیشیا، ٹرکی، کابل، برازیل، ہندستان، پاکستان، افغانستان، ایران، پولینڈ، ویت نام فلپائن، البانیہ، کاکیشیا، کوریا، تبت، فارس اور ہر چھوٹے بڑے دیس کی منتخب نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ (زیر طبع) مرتبہ و مترجم: پرکاش پنڈت

مکتبۂ شاہراہ دہلی

سردار جعفری

اودھ کی خاکِ حسیں

گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کی مانند اُڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سُن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصوّر کے زخم خوردہ
اُفق سے یادوں کے کارواں یوں گذر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے
چمکتے تاروں کے مُسکراتے ہجوم گذریں

میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
کہاں ہیں وہ دلنواز باہیں
وہ شاخِ صندل
کہ جس پہ انگڑائیوں نے اپنے حسیں نشیمن بنا لئے ہیں
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سُریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں

فضاؤں میں میگھ دوت[1] پر واز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پیڑوں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے
شفق کی سرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

(۲)

مرے تصوّر میں ساقیوں کا خرام رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں
وہ گاؤں جو سیکڑوں برس سے بسے ہوئے ہیں
کسانوں کے جھونپڑوں پر ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹا میں کھولے ہوئے کھڑے ہیں

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر

[1] "میگھ دوت" یعنی بادل۔ اس نام کی مشہور نظم کالی داس نے لکھی تھی جس میں بادل محبت کا پیامی ہے۔

جو اپنے ہاتھوں کے کھُردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکّی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سُنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھِل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توّے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور اُن کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری گدگدیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سُرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمیں کو گود میں اُٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی ہوئی جبیں کو
ہزار بوسوں سے جگمگا دوں

(۳)

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سُن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
وہ کھیتیوں میں بہار بن کر رواں دواں ہیں
اندھیری کانوں کی تیرگی میں
وہ نُور بن کر اُتر رہے ہیں
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اُگے ہوئے ہیں

کُدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں
زمیں کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ہلوں کے مالک لرز رہے ہیں

غریب سیتا کے گھر پہ کب تک رہے گی راون کی حکمرانی
دروپدی کا لباس اس کے بدن سے کب تک چھنا کرے گا
شکنتلا کب تک اندھی تقدیر کے بھنور میں پھنسی رہے گی
یہ لکھنؤ کی شگفتگی مقبروں میں کب تک دبی رہے گی
سروں کے اوپر مصیبتوں کے پہاڑ کب تک گرا کریں گے
بلکتی آنتوں کو بھوک کب تک ڈسا کرے گی
زمیں کے سینے پہ قاتلوں کے گروہ کب تک چلا کریں گے
خباثتیں کب تک اہنسا کا روپ دھارے پھرا کریں گی

کساں جو اپنی پاک دھرتی پہ جانور کی طرح جُھکے ہیں
وہ جن کی پیٹھوں پہ بھاری اینٹیں لدی ہوئی ہیں
جو کچے چمڑے کے سخت جوتوں سے پٹ رہے ہیں
یہ جسم جو کارخانے داروں کی بھٹیوں میں اُبل رہے ہیں
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں
یہ خون جو نفع خوریوں کی تھیلیوں میں کھنک رہا ہے
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پہ اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں
یہ کانپتی مفلسی جو آئی ہے چھاتیوں کا لگان لے کر
یہ ننھے بچے جو مالکوں کے مویشیوں کو چرا رہے ہیں
جو کھیت مزدور بھوکے رہ کر زمیں سے گیہوں اُگا رہے ہیں
یہ اپنے سینے کی آگ کب تک دبا سکیں گے

یہ اپنی نفرت کا زہر کب تک چھپا سکیں گے
یہ زخم کب تک ہرے رہیں گے

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سُرخ شعلے اُبل رہے ہیں
غموں کی بھاری سِلیں دلوں سے سرک رہی ہیں
شجاعتیں گوپھنوں کو لے کر نکل رہی ہیں
جھکے ہوئے سر اُبھرتے سورج کی شان و شوکت سے اُٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے
یہ آسمانِ خموشش طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے
یہ مُسکراتی ہوئی فضا سُرخ آندھیوں سے بھری ہوئی ہے
یہاں کا ایک ایک چپّہ لاکھوں بغاوتوں سے بسا ہوا ہے
بغاوتیں جو مغل شہنشاہیت کی چولیں ہلا چکی ہیں
بغاوتیں سامراج کو جو بلندیوں سے گرا چکی ہیں
بغاوتیں جو فرنگیوں کے دلوں پہ ہیبت بٹھا چکی ہیں
یہی پرانی بغاوتیں پھر نئے سرے سے جواں ہوئی ہیں

(۴)

مرے وطن کی زمیں کو ناپاک کرنے والو
میں ان پُرانی نئی عوامی بغاوتوں ہی کا ترجماں ہوں
میں اپنے اہلِ وطن کے احساس اور جذبات کی زباں ہوں
میں خاک سے کہہ رہا ہوں اپنے اناج کو کوکھ میں چھپا لے
لُٹیرے کھیتوں میں پھر رہے ہیں

.. ..

میں لاکھوں مزدور نوجوانوں کے ساتھ میداں میں آ رہا ہوں
غدر کے مقتول سورماؤں کو مرقدوں سے اُٹھا رہا ہوں
میں چوری چورا کے سوئے شیروں کو گیت گا کر جگا رہا ہوں

شاہراہ

چمن کے پھولو چمن میں اک آگ سی لگا دو
لچکتی شاخو فضا میں زنجیر بن کے پھیلو
زمیں کی دھاتو ہوا میں جوالا مکھی اُچھالو
ملوں کے پہیّو بغاوتوں کے ترانے گاؤ
کہاں ہو اے نیکیوں کی فوجو
بدی کے اونچے محل گرا دو
صداقتو آؤ جھوٹ کے سانپ کو کچل دو
حیات کی تیز و تند موجو فنا کے خاشاک کو بہا دو
سحر کی کرنو اندھیری راتوں کے سر پہ برسو
عوام کے دشمنوں کا نام و نشان مٹا دو

(۵)

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّو
جو سیکڑوں میل دُور سے اُڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
میرے وطن کی زمیں سے میرا سلام کہنا
اُسے بتانا
کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
وہ کالا قانون ایک دیوار بن کے رستے میں آ گیا ہے
جسے اہنسا کا نام لے کر پجاریوں نے کھڑا کیا ہے
مگر یہ دیوار روک سکتی نہیں ہے مجھ کو
اُبلتے جوالا مکھی کو کون دبا سکا ہے؟
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دُور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفتوں سے باہر نہیں گیا ہوں

(زیرِ طبع کتاب
"پتھر کی دیوار"
کی ایک نظم)

سنٹرل جیل ناسک
ستمبر ۱۹۴۹ء

فراق گورکھپوری

جُدائی

شجر حجر پہ ہیں غم کی گھٹائیں چھائی ہوئی
سُبک خرام ہواؤں کو نیند آئی ہوئی

رگیں زمیں کے مناظر کی پڑ چلیں ڈھیلی
لَویں فلک کے چراغوں کی جھلملائی ہوئی

یہ خستہ حالی، یہ درماندگی، یہ سناٹا
فضا نیم شبی بھی ہے سنسنائی ہوئی

دھواں دھواں سے مناظر ہیں شبستاں کے
سیاہ رات کی زلفیں ہیں رسمسائی ہوئی

یہ رنگ تاروں بھری رات کے تنفس کا
کہ بوئے درد میں ہر سانس ہے بسائی ہوئی

خُنک اُداس فضاؤں کی آنکھوں میں آنسو
ترے فراق کی یہ ٹیس ہے اُٹھائی ہوئی

سکوتِ نیم شبی گہرا ہوتا جاتا ہے
رگیں ہیں سینۂ ہستی کی تلملائی ہوئی

ہے آج سازِ نواہائے خونچکاں اے دوست
حیات تیری جُدائی کی چوٹ کھائی ہوئی

مری اِن آنکھوں سے اب نیند پردہ کرتی ہے
جو تیرے پنجۂ رنگیں کی تھیں جگائی ہوئی

سرشک پالے ہوئے تیرے نرم دامن کے
نشاط تیرے تبسّم سے جگمگائی ہوئی

لٹک وہ گیسوؤں کی جیسے پیچ و تابِ کمند
لچک بھوؤں کی وہ جیسے کماں جھکائی ہوئی

سحر کا جیسے تبسّم دمک وہ ماتھے کی
کرن سہاگ کی بیندی کی لہلہائی ہوئی

وہ انکھڑیوں کا فسوں، روپ کی وہ دیوئیت
وہ سینہ روحِ نمو جس میں کُنمُنائی ہوئی

وہ سیج سانس کی، خوشبو کو جس پہ نیند آجائے
وہ قدِ گلاب کی اک شاخ لہلہائی ہوئی

وہ جھلملاتے ستارے ترے پسینے کے
جبینِ شامِ جوانی تھی جگمگائی ہوئی

ہو جیسے بتکدہ آزر کا بول اُٹھنے کو
وہ کوئی بات سی گویا لبوں تک آئی ہوئی

وہ دھج و دلبری وہ کام روپ آنکھوں کا
رسیلی اداؤں میں وہ راگنی رچائی ہوئی

وہ خواب گاہ میں شعلوں کی کروٹیں دمِ صبح
وہ بھیرویں تری بیداریوں کی گائی ہوئی

وہ مسکراتی ہوئی لطفِ دید کی صبحیں
تری نظر کی شعاعوں کی گدگدائی ہوئی

لگی جو تیرے تصوّر کے نرم شعلوں سے
حیاتِ عشق ہے اس آنچ کی تپائی ہوئی

ہنوز وقت کے کانوں میں چھچھاہٹ ہے
وہ چاپ تیرے قدم کی سُنی سُنائی ہوئی

ہنوز سینۂ ماضی میں جگمگاہٹ ہے
دمکتے روپ کی دیپاولی جلائی ہوئی

لہو میں ڈوبی اُمنگوں کی موت روک ذرا
حریمِ دل میں چلی آتی ہے ڈھٹائی ہوئی

رہے گی یاد جواں بیوگی محبت کی
سہاگ راگ کی وہ چوڑیاں بڑھائی ہوئی

یہ میری پہلی محبت نہ تھی مگر اے دوست
اُبھر گئی ہیں وہ چوٹیں دبی دبائی ہوئی

سپردگی و خلوصِ نہاں کے پردے میں
جو تیری نرم نگاہی کی تھیں بٹھائی ہوئی

اُٹھا چکا ہوں میں پہلے بھی ہجر کے صدمے
وہ سانس دُکھتی ہوئی آنکھ ڈبڈبائی ہوئی

یہ حادثہ ہے عجب تجھ کو پا کے کھو دینا
یہ سانحہ ہے غضب تیری یاد آئی ہوئی

عجیب درد سے کوئی پکارتا ہے تجھے
گلا رُندھا ہوا آواز تھرتھرائی ہوئی

کہاں ہے آج تو اے رنگ و نور کی دیوی
اندھیری ہے مری دُنیا لُٹی لُٹائی ہوئی

پہونچ سکے گی بھی تجھ تک مری نوائے فراق
جو کائنات کے اشکوں میں ہے نہائی ہوئی

احمد ندیم قاسمی

کارواں

جرسِ کارواں کی موسیقی — کارواں کے خرام کی غماز
جرسِ کارواں کی خامشی — کارواں کے قیام کی غماز
جرسِ کارواں کی نالہ زنی — سعیِ ناتمام کی غماز

○

نہ ترنّم ملا نہ سنّاٹا — نہ مقدّر میں نالۂ شب تھا
چند قزّاق جا رہے تھے کہیں — ہمسفیرو! یہ کارواں کب تھا
دل میں پوشیدہ لاش کی سی بساند — لب پہ گو احترامِ مذہب تھا
زندگی زندگی پکارتے تھے — مردہ خوری قدیم مشرب تھا
ان کی آنکھوں میں پیاس جلتی تھی — ہم کو جس پر گمانِ کوکب تھا

○

جرسِ کارواں کی دُھن کیسی — کارواں کا سُراغ بھی تو ملے
جس کی لو راستہ سجھاتی ہے — عزم کا وہ چراغ بھی تو ملے

○

خامشی اک طویل سوچ میں ہے — اُترے آتے ہیں برف کے گالے
چار سو ٹوٹتے ہوئے تارے
ہر طرف عنکبوت کے جالے

ناگہاں خامشی میں لہر اُٹھی　　نیند میں کوئی جیسے کچھ گا لے
جیسے اُمڈی ہوئی گھٹا میں ہلال　　جیسے صحرا کی گود میں لالے

○

جرسِ کارواں کے منتظرو　　چاپ قدموں کی سُن سکو تو سُنو
یہ کروڑوں نقوشِ پا ـــــ یہ پھول　　اپنی نظروں سے چُن سکو تو چُنو

○

کارخانوں میں ہونکتا فولاد　　جوششِ تخلیق میں ہے شعلہ بیاں
کھیت، کانیں، کٹے ہوئے کہسار　　ہاں، یہی تو ہیں کارواں کے نشاں
وہ اسی راستے سے گذرے ہیں　　جن کی جانب ہے اک جہاں نگراں
اِن کے دم سے زمیں کا ذوقِ نمو　　اُن کے دم سے حیات زمزمہ خواں
اُن کی تخلیق، محورِ تہذیب　　اُن کی محنت سے زندگی آساں
اُن کا ماضی غبار آلودہ　　اور مستقبل آفتابِ جواں

○

رہزنوں کا حصار ٹوٹ چکا　　اہتمامِ سفر کرو تو چلیں
خون کی خوفناک دلدل سے　　ہمصفیرو! اُبھر چلو تو چلیں
جرسِ کارواں کے منتظرو!　　چاپ قدموں کی سُن سکو تو چلیں

مخمور جالندھری

ہیپی جیک

ہیپی جیک ..... بستی میں
آ رہا ہے لنگڑاتا
جھرّیوں کے جالے میں
عمر مرثیہ خواں ہے
بائیں ٹانگ میں لرزہ
دایہ کی جہالت ہے
بازوؤں کے پٹھوں میں
کسمساتا غصّہ ہے!
تن پہ جھولتے پیوند
ورثے کی نوازش ہیں
اُس کے کندھے پر تھیلا
اُس کی سوکھی روٹی ہے
ایک ٹین کا ڈبّہ
اُس کا سچّا ساتھی ہے
آ رہا ہے لنگڑاتا
ہیپی جیک بستی میں

۲

ہیپی جیک ـــــ نام اُس کا
طنز ہے پرایوں کی
گوری نسل کے آقا
حکمران مشرق کے
جب کہیں سے اُٹھتے ہیں
اپنی بذلہ سنجی کی
یاد چھوڑ جاتے ہیں
ہیپی جیک ـــــ نام اُس کا
ایسی خوش مذاقی کا
ایک نقش باقی ہے
ہیپی جیک بھگتو تھا
برجا، احمدو، بھگتو
نام ہیں فلاکت کے
اِن سے مفلسی کی بُو
پھوٹ پھوٹ پڑتی ہے
جو عظیم ہیں اُن کے
نام بھی رسیلے ہیں
بھگت رام سے بھگتو
چٹکیوں میں بنتا ہے
لیکن آج بھگتو سے
بھگت رام بننے تک
جانگسل تگ و دو ہے
.... اور فاقہ کش بھگتو
ہیپی جیک بن کر بھی
فاقہ مست رہتا ہے
نام کے بدلنے سے
زیست کب بدلتی ہے

۳

ہیپی جیک بننے تک
ہیپی جیک نے برسوں
لاکھ صدمے جھیلے ہیں
ذلّتیں اٹھائی ہیں
گورے حکمرانوں کی
ٹھوکریں بھی کھائی ہیں
.... اور پسینہ چھڑکا ہے
دل میں جاگتی نفرت
بدلی ہے تبسّم میں
اپنی بھیگی آنکھوں میں
آنسوؤں کو روکا ہے
اپنے ہونٹ بھینچے ہیں
شکوے تک دبائے ہیں
.... اور لہو جلایا ہے
میل بھی کھنگالی ہے
رنگ بھی اُتارا ہے
جوتیاں بھی پونچھی ہیں
بوجھ بھی اُٹھایا ہے
گندگی بھی دھوئی ہے
کوئی کام ہو اُس نے
بے مزہ نہیں سمجھا
جس نے جو کہا فوراً .....
کر دیا سلیقے سے
جس نے جو دیا اُس کو
لے لیا خموشی سے
.... اور اس شرافت پر
ہیپی جیک کہلایا
ضبط اُس کی خوش طبعی
جبر خوش مزاجی ہے
اور لوگ کہتے تھے
"ہیپی جیک ..... بھولا ہے
دانت تک نہیں منہ میں
جتنا کام چاہے لو ....
جتنے دام چاہے دو
چاہے کچھ نہ اس کو دو

مسکراتا رہتا ہے
ایک کام کرواؤ
بیس کام کرتا ہے
ہیپی جیک ناخوش تھا
ہیپی جیک ناخوش ہے

۴

ہیپی جیک ۔ بستی میں
آرہا ہے لنگڑاتا
راہ میں پڑے کاغذ
خالی ڈبیاں، چھلکے
پیڑ سے گرے پتّے
سب سمیٹ لاتا ہے
اس کے واسطے ہر ایک
چیز کارآمد ہے
ردّی بک ہی جاتی ہے
سوکھے پتّے جلتے ہیں
روٹیاں پکاتے ہیں
خالی ڈبیوں سے بھی
کچھ کھلونے بنتے ہیں
روتے بچے ہنستے ہیں
ہیپی جیک ... بستی میں
آرہا ہے لنگڑاتا

وہ ٹہلتا آتا ہے
جانتا ہے بستی میں
لوگ راہ تکتے ہیں
شام لال بابو کے
بوٹ ہوں گے بے پالش
ڈاکٹر کی بیوی کے
ہوں گے سب گھڑے خالی
ٹھیکے دار کے گھر میں
اُپلے، کوئلے، ایندھن
ختم کل کی شب سے ہیں
سائیکل بشن سنگھ کی
ہوگی آج بھی پنکچر
سیٹھ کی حویلی کی
نالیاں بھری ہوں گی
ڈاک خانے کا بابو
پان لانے بھیجے گا
ہیپی جیک کا گھر گھر
انتظار ہوتا ہے
وہ نہ آئے جو گھر سے
کتنے کام رُک جائیں
اُس کا آنا اور جینا
کس قدر ضروری ہے

۵

ہیپی جیک .... بستی میں
آرہا ہے لنگڑاتا
اُس کو آنا پڑتا ہے
کیونکہ آس پاس اُس کے
آندھیاں ہیں آہوں کی
غول ہیں وباؤں کے
موت جال پھینکے ہے ....
آدمی کی دُنیا میں
آج دھُول اُڑتی ہے
آج اُس نے سمجھا ہے
آج اُس نے جانا ہے
اُس کو بھوک لگتی ہے
اُس کو نیند آتی ہے
میٹھا سینک بستر کا
اُس کو بھی بُھاتا ہے
اکثر اُس نے چاہا ہے
وہ بھی دیر سے جاگے
اُس کی پسلیوں میں بھی
سردیوں کی برفابی
تیر بن کے چُبھتی ہے

سائیکل پہ چڑھنے سے
راہ جلد کٹتی ہے
پاؤں بوٹ میں رہ کر
کھُردرے نہیں ہوتے
پکّے گھر میں رہنے سے
چھت نہیں ٹپکتی ہے
اس لئے وہ آج اپنا
حق وصول کرتا ہے
پورے دام لیتا ہے
دام کم جو دے کوئی
ناک بھوں چڑھاتا ہے
اُس کا کام کرنے سے
روز ہچکچاتا ہے
اب گھروں میں چرچا ہے
"ہیپی جیک .... لوبھی ہے
جونک اور کھٹمل ہے
اس کا جی نہیں بھرتا
یہ بڑا ندیدہ ہے
کچھ اگر نہیں ملتا
کھانڈ مانگ لیتا ہے
چائے مانگ لیتا ہے
دال مانگ لیتا ہے

وامق جونپوری

بدھ جی کا جنجال

بدھ کالے بازار کی جننی بدھ سے جگ جگ کال
بدھ کی ڈائن اگلے اگنی، بدھ اگیا بیتال
بدھ سے دھرتی کانپ رہی ہے بدھ مایا کی چال رے ساتھی
بدھ مایا کی چال
بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——
بدھ سے چھٹکارا پائے تو دنیا ہو خوشحال
دل سے کلا ہٹی ہے سونا مل سے نکلے مال
من مندر میں ناچ اٹھیں تب رادھا اور گوپال رے ساتھی
رادھا اور گوپال
بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——
ایک ہی سنکٹ کے ہیں دونوں بدھ اور پونجی روپ
گرنے لگا بازار کوئی تو بھرکے نیا بہروپ
پونجی وادی بدھ کر بیٹھے بدھ پونجی کی ڈھال رے ساتھی
بدھ پونجی کی ڈھال
بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——
پچھلے بدھ سے آج تلک ہم سر نہ اٹھانے پائے
اٹم بم کا ایک دھماکا اب تک دل دہلائے
ڈالر شاہی پھر اٹھی ہے لے کے وہی بھونچال رے ساتھی
لے کے وہی بھونچال
بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——
روٹی مانگو مائن کا ٹو کھیت میں بوئی آگ
جل کے ہدلے بم برسائے پاپ گگن کا ناگ
امن کا پیاسا ننگا بھوکا مانو ہے بے حال رے ساتھی
مانو ہے بے حال
بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——

بُدھ کا راگ بھینکر چیخیں بدھ سب کا ابھمان
امن کے گانے کتنے سندر امن کی میٹھی تان
امن کے گیتوں سے ہم بُدھ کو کردیں گے پامال رے ساتھی
کردیں گے پامال

بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——————
گھن گھن گھن بیڑوں سے کہدو ڈوب مریں ساگر میں
نوکر سینا پاپی جنرل چھپ جائیں اب گھر میں
جنگ نہیں اب جنگ نہیں اب جنگ کی ہے ہڑتال رے ساتھی
جنگ کی ہے ہڑتال

بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——————
کالی فوجیں باغی ہوکر لے بھاگیں ہتھیار
گوری فوجیں تھک تھک کر اب مان رہی ہیں ہار
جتنا ناحق خون بہا ہے اتنی دھرتی لال رے ساتھی
اتنی دھرتی لال

بُدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——————
بُدھ کا پول کھُلا تو پونجی آٹھ آٹھ نیر بہائے
مانو دشمن ایٹم بم سے ڈالر دل بہلائے
امن کی شکتی سے جنتا کا ہردے مالا مال رے ساتھی
ہردے مالا مال

بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——————
امن کے آگے سارے گورے پیلے کالے ایک
امن غلامی کی لعنت کو اک دم دے گا پھینک
دیکھیں تو کوئی کھینچے گا کیسے اب حبشی کی کھال رے ساتھی
اب حبشی کی کھال

بدھ جی کا جنجال رے ساتھی بدھ جی کا جنجال ——————
ڈگر ڈگر پر نگر نگر میں امن کا ڈنکا باجا
ایک نیا سنسار بنے گا جنتا جس کی راجا
جس میں نہ کوئی مور کھ رہے گا اور نہ کوئی کنگال رے ساتھی
اور نہ کوئی کنگال

بُدھ جی کا جنجال رے ساتھی بُدھ جی کا جنجال ——————

قتیل شفائی

سرتاج

چلمن سے اُبھرتی ہیں کھنکتی ہوئی کرنیں
گاتی ہے فضا میں کوئی زرپوش گلائی
میں حلقۂ نغمات میں حیران کھڑا ہوں
آنکھوں میں سمیٹے ہوئے اک جشنِ طلائی

یہ جشنِ مسرت جسے تخلیق کیا ہے
آرام سے بیتے ہوئے پچاس برس نے
یہ قافلۂ عمر کی روندی ہوئی منزل
پُوجا ہے جسے حرص کی آوازِ جرس نے

یہ سانس، یہ سوکھے ہوئے پتّوں کا ترنّم
یہ جسم، یہ ٹوٹا ہوا پیتل کا کٹورا
یہ رنگ، یہ تیزاب میں ڈوبی ہوئی چاندی
یہ عمر، یہ بھادوں کی ہواؤں کا ہلورا

کچھ بھی نہ سہی خون کی بے کیف حرارت
دولت نے اسے پیار کا حق دے تو دیا ہے
گلچیں کی مچلتی ہوئی مشتاق نظر نے
کونپل کو حنا بارِ قلق دے تو دیا ہے

راتوں کا جس ہو کہ گجر دم کی ہوائیں
گجروں کی یہ جھنکار جھروکے میں رہیگی
جب تک نہ حقائق سے ہٹا دے کوئی پردہ
عورت یونہی اخلاق کے دھوکے میں رہیگی

حسن اعرافی

خوں بہا مانگتے ہیں

کسی اور ہی خواب میں تھے مگن ہم
نگاہوں میں رقصاں تھے رنگیں سویرے

سرِ خلد جیسے کوئی حورِ ارضی
لٹیں دھیرے دھیرے سنوارے، بکھیرے

چمکتی ہو بجلی، برسنے سے پہلے
ہوں دست و گریباں اُجالے، اندھیرے

وہ دوشیزگی، جس پہ شرباں جوانی
مگر ہو مقدّر میں تیرے نہ میرے

اُٹھے، حُسنِ گجرات اور آسیا پر
بدیسی غزل چھیڑ دے، منہ اندھیرے

تخیّل میں 'پاکیزگی' رقص فرما
اُڑاتی ہرے آنچلوں کے پھریرے

وہ شنگیت گوئے، سمجھ میں نہ آئے
مگر اس کی دُھن کے دلوں میں بسیرے

سماعت میں 'جھنکار' کی سحر پاشی
مسافر سیہ مست، چوکس لٹیرے

دھماکا، دھواں، آگ، بھونچال، طوفاں
سفینہ نہ ملّاح، سائے گھنیرے

کنارے کنارے چلے آنے والو!
جو 'طوفاں' میں گذری، تمہیں کیا بتائیں!

غمِ قوم میں رات دن 'گھلنے' والو!
تمہیں دل کے ناسور کیسے دکھائیں؟

زبانوں پہ تالے، لبوں پہ ہیں مہریں
تمہیں اپنے دُکھ درد کیسے سُنائیں؟

جہاں ہو درندوں کی اندھی خدائی
وہاں عام جاندار کیا داد پائیں!

تمہاری نظر میں یہ آزادیاں ہیں
تو بتلایئے کس جہنّم میں جائیں؟

یہ بارانِ فالج ہی چارہ گری ہے
تو بیمار کس کے لئے ہاتھ اُٹھائیں؟

اگر امن ہے نام اس خامشی کا
تو ہم سورجوں کو دیئے کیا دکھائیں!

یہ اہلِ وطن اور ان کی یہ حالت
کہ ہنسنا بھی چاہیں تو آنسو بھر آئیں!

مقامِ تاسّف ہے، خدامِ ملّت!
تمہیں اور کس نام سے ہم بلائیں؟

وہ خونیں تماشا دکھایا جنھوں نے
یہاں سے وہ جائیں بھی، لیکن نہ جائیں ؟

نکالا جنھیں قوم نے موجِ خوں سے
وہ 'محسن' نئی آڑ میں لوٹ آئیں ؟

یہ اقوام کے بحرِ خوں کے 'مچھیرے'
نئے بھیس بدلیں، نئے جال لائیں ؟

وطن میں چلیں چام کے دام اُن کے
ہمارے لہو سے جو ڈالر کمائیں ؟

یہاں آکے جلتی پہ کیوں تیل ڈالیں
وہ اپنے ہی گھر کی لگی تو بجھائیں !

جو اقوام و جمہور میں پھوٹ ڈالیں
ہمیں حرفِ امن و اخوّت پڑھائیں !

سئول اور لاہور سے قاہرہ تک
اِسے چیر ڈالیں، اُسے پھاڑ کھائیں ؟

بہانے سے چاہیں کہ وہ ایشیا میں
بھیانک ہلاکت کے بمب آزمائیں ؟

حقیقت کی للکار ہے اور ہی کچھ
ذرا اپنی آنکھوں سے پردے ہٹائیں !

ہے جن سے تمہارا دلی دوستانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

ہے جن بھیڑیوں کی روش جارحانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

جو قصّاب ہیں قاتلانِ زمانہ !
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

جنھیں نوحۂ زخمیاں ہے ترانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

عزائم ہیں جن کے، کھُلے جارحانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

جلاتے ہیں جو امن کا آشیانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

گھماتے ہیں جو ایٹمی تازیانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں !

تمہارے ہیں جو ہم نسب، ہم فسانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں

جو غدّار ہیں مجرمانِ زمانہ
اُنھی سے تو ہم خوں بہا مانگتے ہیں

احمد ریاض

قرار دادِ مقاصد

آج پھر مسکرا رہے ہو تم
تیز خنجر چھپا کے دامن میں

دے رہے ہو نوید موسمِ گل
بھیج کر خود خزاں کو گلشن میں

اپنی تاریخ کی بقا کے لئے
آگ سلگا رہے ہو خرمن میں

آج پھر تم دکھانے آئے ہو
اک مکمل حیات کی تصویر

آج پھر سونپنے کو اٹھے ہو
اک حسیں کائنات کی تقدیر

آج پھر بڑھنی شورشوں کے لئے
لائے ہو معجزات کی زنجیر

اور کل بھی تمہارے ہم منصب
ایسے دیپک جلا کے لائے تھے

اپنے اپنے نفیس دامن میں
چاند تارے سجا کے لائے تھے

اپنے اپنے وقار کی خاطر
سینکڑوں بت بنا کے لائے تھے

بت تراشے گئے "مقدس بت"
زیست کی مستقل غلامی کے

نقش ڈالے گئے "حریری نقش"
آدمیت کی ناتمامی کے

گیت گائے گئے "رسیلے گیت"
پیاس کے اور تشنہ کامی کے

کبھی سرداریوں کی زد میں حیات
کچھ قبیلوں میں ہو گئی تقسیم

کبھی بٹ کر ملوکیت کا درد
جھک گئی لے کے جذبۂ تعظیم

کبھی جاگیرداریوں کا فریب
کھا گئی برسبیلِ جہلِ عظیم

کبھی ابھرا نظامِ زرداری
نسل اور رنگ کے دھندلکوں میں

کبھی جمہوریت نے رقص کیا — اعتقادات کے محلکوں میں
کبھی مذہب نے رہنمائی کی — ذہن اور دل کے تنگ حلقوں میں
تاجرانہ ضرورتوں کے عوض — آدمی تُل گیا ترازو میں
اقتدارانہ جنگ کے ہاتھوں — زندگی بٹ گئی من و تو میں
ہر بغاوت کی گونج ڈوب گئی — وقت کے سرد سرد پہلو میں

اور تم ہو کہ آج پھر اُٹھے — تیز خنجر چھپا کے دامن میں
دینے آئے ہو پھر نوید بہار — بھیج کر خود خزاں کو گلشن میں
کہنہ تاریخ کی بقا کے لئے — آگ سلگا رہے ہو خرمن میں
اب کہ، جب اک حسین مستقبل — اپنے بازو بڑھا چکا ہم تک
اب کہ، جب کاروانِ فہم و شعور — بھول بکھرا تا آ چکا ہم تک
اب کہ، جب یہ جلوس علم و ہُنر — نئے آدم کو لا چکا ہم تک
اب کہ، جب وقت کی ہر اک کروٹ — زیست کا اہتمام کر بھی چکی
اب کہ، جب زندگی کے چہرے سے — گنگ صدیوں کی گرد اتر بھی چکی
اب کہ جب رینگتے زمانوں کی — کہنگی اپنی موت مر بھی چکی
اب کہ جب خاکسار ذہنوں میں — ڈھل چکی ہے شعور کی جوالا
اب کہ جب جدّ و جہدِ پیہم سے — رِس چکا ہے جمود کا چھالا
اب کہ جب مرگ ساز ہاتھوں نے — دامنِ ظلمات چاک کر ڈالا
اب تمہاری قرار دادِ حیات — زیست کو مات دے نہیں سکتی
اب تمہاری یہ ساحل آرائی — کوئی کشتی بھی کھے نہیں سکتی
اب تمہاری ہوس کی گہنائی — اک سنبھالا بھی لے نہیں سکتی

کمال احمد صدیقی

الٹی میٹم

تمام انسان
جہان بھر کے تمام ایماندار انسان
حیات کو جن کی محنتوں نے وقار بخشا، دوام بخشا
عروسِ گیتی کی آرزو کو جنھوں نے طرزِ کلام بخشا
حقیر و ناچیز خاک کو جن کی قوتوں نے مقام بخشا
جنھوں نے غلّے کی فصل اُگائی
جنھوں نے خود اپنے خون سے کی ہے نسلِ انساں کی آبیاری
جو کاٹتے ہیں جگر پہاڑوں کا تاکہ ہم کو
ہمارے چولھوں کو، موٹروں اور کارخانوں کو کوئلہ اور تیل ملتا رہے ہمیشہ
جو کارخانوں میں رات دن کام کر رہے ہیں ہماری آسودگی کی خاطر
اور اپنی محنت کو بیچتے ہیں ہماری آسائشوں کی خاطر
جو درس گاہوں میں علم کا درس دے رہے ہیں
ہماری آئندہ نسل کو۔ تاکہ زندگی اور بھی حسیں ہو
وہ طالبانِ علوم جن پر ہے انحصارِ حیاتِ فردا
تمام فن کار، اہلِ دانش ـــــ جنھیں محبت ہے زندگی سے
تمام سائنسدان جو خیر و امن کی برکتوں کی خاطر
ہیں رات دن منہمک اسی دُھن میں نسلِ انساں کے دوش پر سے کسی طرح محنتوں کا بارِ عظیم کم ہو
ہوا، سمندر، پہاڑ، دریا

برستے بادل ــــ چمکتے سورج کی تیز کرنیں
ہر ایک موسم
غرض کہ فطرت
کسی طرح آدمی کو ہو اختیار ان پہ
کہ آدمی اس جہان کو، تیرہ خاکداں کو
سنوار دے اس طرح کہ جنّت کے ہر تصوّر کو شرم آئے!
وہ پادری جو بجائے زردار کی مشیّت کے نوعِ انساں کو درس دیتے ہیں راستی کا
وہ رہنمایانِ دیں جنھوں نے خود اپنے یزداں کو اہرمن کے حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے
جو زیستی کے بجائے انسان کی ترقی کے حق میں ہیں، اور پیار، الفت، اخوت اور دوستی کی تبلیغ کر رہے ہیں
جو ظلم اور جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، اور شیطان کے بجائے جو ساتھ دیتے ہیں آدمی کا
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگِ عظیم میں اپنی عصمتوں کو
غنیم فوجوں کے ہاتھوں مجروح کر چکی ہیں
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگِ عظیم میں اپنی عصمتوں کو
بس ایک روٹی کے واسطے قتل کر چکی ہیں
وہ عورتیں جو کہ پچھلی جنگِ عظیم کی نذر کر چکی ہیں مسرّت اپنی، سہاگ اپنا
وہ لوگ جو اپنے بھائی بہنوں کو، باپ ماں کو، جوان بچّوں کو، ننھے بچّوں کو، دل کے ٹکڑوں کو، زندگانی کے آسروں کو
گذشتہ جنگِ عظیم میں بھینٹ دے چکے ہیں
وہ لوگ جن کے حسین چہرے لڑائیوں میں جھلس چکے ہیں
وہ لوگ جو اپنے دست و بازو کو، اور ٹانگوں کو، اور آنکھوں کو، اور کانوں کو، پچھلی جنگِ عظیم کی نذر کر چکے ہیں
وہ لوگ جن کو گذشتہ جنگِ عظیم محروم کر چکی ہے
بھرے مکانوں، سجی دوکانوں، لہکتے کھیتوں، مہکتے کھلیانوں کے نظاروں کی دل کشی سے
تمام تاجر ــــ جو چور بازار کو سمجھتے ہیں ایک نعمت
تمام انسان ــــ جن کو آزادیاں ہیں حاصل

تمام محکوم آدمی جو کہ اپنی آزادیوں کی خاطر
مصیبتوں کا شکار ہیں۔ پھر بھی لڑ رہے ہیں
وکیل اور جج ——— جنھوں نے اپنا ضمیر بیچا نہیں ہے اب تک
وہ ڈاکٹر جو مریض کی جیب کے بجائے مریض کا درد دیکھتے ہیں
تمام آزاد پیشہ انسان
تمام ملاح اور مچھیرے
تمام لوہار اور موچی
تمام حلوائی اور بیرے
تمام بابو
تمام مزدور، اور معمار، اور مالی
تمام بھشتی، تمام بھنگی
تمام دھوبی، تمام کوری، تمام بنیے
جو دوسری جنگ کی گرانی میں پس رہے ہیں!

تمام انسان،
جہان بھر کے تمام ایماندار انسان جانتے ہیں
کہ جنگ لعنت ہے ——— ایک لعنت
عوام کے واسطے تباہی ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے، لیکن
ہے جنگ خوروں ——— اجارہ داروں کی، چور بازاری کرنے والوں کی اک تجارت!

وہی ہیں جغرافیہ کی سمتیں، جو کل تلک تھیں
مگر جہاں تک ہے نسل اور رنگ کا تعلق
عوامی تاریخ کا تعلق

نہ کوئی مشرق ہے اب نہ مغرب
تمام انسان ایک ہیں، اور اپنے دشمن کو جانتے ہیں
تمام انسان ایک آواز ہو کے اعلان کر رہے ہیں
ہمیں محبت ہے زندگی سے

ہم اپنی تاریخ کے خزانوں کے پاسباں ہیں
ہمارے ماضی کی یادگاریں
کہ جن کی بنیاد میں ہمارے عظیم اجداد کا لہو ہے
ہمیں گوارا نہیں ہے ہرگز کہ کوئی شیطان ایک لمحے میں ان کو مسمار کر کے رکھ دے
کوئی بھی سازش ہمیں نہ گمراہ کر سکے گی
ہم آج تنبیہ کر رہے ہیں
ہر ایک قاتل، ہر ایک انسانیت کا دشمن
ہر ایک ظالم، ہر ایک جابر
ہر ایک ڈاکو، ہر ایک رہزن
ہر ایک فرعون اور راون
ہر ایک چنگیز اور ہلاکو
ہر ایک تیمور اور نادر
ہر ایک ہٹلر، میسولینی اور ہر ایک ٹوجو
یہ خوب اچھی طرح سے سُن لے
عوامِ عالم کبھی نہ بخشیں گے مجرموں کو
جو ایٹمی جنگ کے گناہِ عظیم کی ابتدا کریں گے۔ !!

جگن ناتھ آزاد

اک نُور کا طوفاں دیکھیں گے

دو چار ہی دن میں ایک نیا اندازِ گلستاں دیکھیں گے
ہم خاک کے ذرّے ذرّے میں تصویرِ بہاراں دیکھیں گے

اے جوشِ جنوں اک روز تجھے یوں سلسلہ جنباں دیکھیں گے
جتنے خاموش عنادل ہیں اُن سب کو غزلخواں دیکھیں گے

یوں آمدِ فصلِ بہاری کو گلزار میں رقصاں دیکھیں گے
اے شاخِ فرومایہ تجھ کو ہر سمت گل افشاں دیکھیں گے

اس طرح کھُلے گا رازِ چمن ہر پھول بنے گا سازِ چمن
اِک نکہتِ گل کی موج میں ہم کل رازِ گلستاں دیکھیں گے

وہ شمع جو آج بھی روشن ہے آندھی کے تھپیڑے کھا کھا کر
اُس شمع کا نور زمانے میں ہر سمت پہ افشاں دیکھیں گے

کہتے ہیں جس کو دردِ بشر اُس درد کو اے روحِ فردا
ہر درد میں شامل پائیں گے ہر سانس میں غلطاں دیکھیں گے

وہ خاک کہ جس کے دامن میں ظلمت کے سوا اب کچھ بھی نہیں
اُس خاک کے ذرّے ذرّے کو خورشید بہ داماں دیکھیں گے

ظلمات کی ہر اک موج کہیں سورج کی کرن بن جائے گی
اے شامِ الم اک روز تجھے ہم صبحِ درخشاں دیکھیں گے

جب صبح کو سورج چمکے گا ہم اُس کی حسیں تابانی میں
ہر غم کا مداوا پائیں گے ہر درد کا درماں دیکھیں گے

اُن سب کو ہراساں دیکھیں گے حائل ہیں جو اپنے رستے میں
اے آج کی مشکل تر منزل! ہم کل تجھے آساں دیکھیں گے

وہ محفل جو بے رنگ ہے آج اس محفل میں کل صبح کو ہم
اک حُسن کا دریا دیکھیں گے اک نور کا طوفاں دیکھیں گے

دنیا میں فروزاں ہونے سے جس ضو کو ابر نے روکا ہے
اُس ضو کے مستقبل کی قسم اس ضو کو خراماں دیکھیں گے

اے رازِ محبت بول ذرا، یہ عقدۂ نازک کھول ذرا
انسان سے آخر کب تک ہم انساں کو گریزاں دیکھیں گے

آخر ترا دھوکا کھائیں گے پابندیٔ انساں ہم کب تک
کب تک نہ بھلا ہم دُنیا میں آزادیٔ انساں دیکھیں گے

اس وقت جو اپنے فکر میں ہے اس وقت جو اپنے عزم میں ہے
اس طرح کی اک تصویر تری اے عالمِ امکاں دیکھیں گے

مجید امجد

آج سوچتا ہوں

(۱)

اور آج سوچتا ہوں، کہ کیوں میرا سوزِ دل
تیرے محل کا جشنِ چراغاں نہ بن سکا
تیری وفا سے پردۂ محمل نہ اُٹھ سکا
میرا جنوں، چاکِ گریباں نہ بن سکا

(۲)

آنکھوں میں ممکنات کی طغیانیاں لئے
تو ساحلِ حیات پہ حیراں کھڑی رہی
دُور، اک تڑپتی ناؤ، اُفق کے نشیب میں
لہروں کی سیڑھیوں سے اُترتی چلی گئی

(۳)

دَورِ زماں کی ایک چمکتی سی موڑ پر
تیرے قدم کی چاپ کا میں منتظر رہا
دُور ــــ اک حجابِ نُور سے چھنتا ہوا سرود
پل بھر ــــ اُبھر کے کھولتے لمحوں میں گھل گیا

(۴)

آج اس تمام کاہشِ جاں سوز کا مآل؟
دُکھتی سی اک خراش جبینِ خیال پر!
بھولی سی ایک یاد جواب بھی کبھی کبھی
پرتولتی ہے گنگرۂ ماہ و سال پر،

(۵)

دُنیا تو اک طلوعِ مسلسل کا نام ہے
لیکن ہماری زیست کی مچلی ہوئی کرن
جب بجھ گئی تو تیر گئی لازوال ہے
تو شمعِ انجمن ہے، نہ میں شمعِ انجمن!

(۶)

یہ غم نہیں کہ قصۂ لیل و نہار میں
ہم اک حسین باب نہ ایزاد کر سکے
افسوس یہ ہے، جی تو رہا ہوں ترے بغیر
لیکن یہ فکر تیرے لئے کون مر سکے

ابن انشا

دِل پیت کی آنچ میں جلتا ہے

دل پیت کی آنچ میں جلتا ہے، ہاں جلتا رہے اسے جلنے دو
اس آگ سے یارو دور رہو، ٹھنڈی نہ کرو پنکھا نہ جھلو
ہم رات دِنا یونہی گھلتے رہیں، کوئی پوچھے کہ ہم کو نا پوچھے
کوئی ساجن ہو، کوئی دشمن ہو، تم ذکر کسی کا مت چھیڑو
سب جان کے سپنے دیکھتے ہیں، سب جان کے دھوکے کھاتے ہیں
یہ دیوانے سادہ ہی سہی، پر اتنے بھی سادہ ہیں یارو؟
کس میٹھی تپش کے مالک ہیں، ٹھٹھری ہوئی آگ کے انگیارے
تم پاس کبھی بیٹھے ہی نہیں ــــ تم کیا سمجھو، تم کیا جانو

دل پیت کی آنچ میں جلتا ہے، ہاں جلتا رہے اسے جلنے دو
اس آگ سے تم تو دُور رہو، ٹھنڈی نہ کرو پنکھا نہ جھلو
ہر محفل میں ہم دونوں کی کیا کیا نہیں باتیں ہوتی ہیں
ہم کیا سمجھیں، ہم کیا جانیں، کیوں ہم کو بھلا دے دیتے ہو
دل چل کے لبوں تک آ نہ سکا، اب کھل نہ سکے غم کھا نہ سکا
اپنا تو بس اتنا قصہ تھا، تم اپنی سُناؤ، اپنی کہو
وہ شام کہاں وہ رات کہاں، وہ وقت کہاں وہ بات کہاں
جب مرتے تھے مرنے نہ دیا، اب جیتے ہیں اب جینے دو

دل پیت کی آنچ میں جلتا ہے، ہاں جلتا رہے اسے جلنے دو
اس آگ سے انشا دور رہو، ٹھنڈی نہ کرو پنکھا نہ جھلو
لوگوں کی تو باتیں سچی ہیں، اور دل کا بھی کہنا کرنا ہوا
پر دوست ہماری مانو تو ــــ یا اُن کے رہو یا اپنے رہو
اس کھیل میں ہر بات اپنی کہاں ــ جیت اپنی کہاں مات اپنی کہاں
یا کھیل سے یکسر اُٹھ جاؤ، یا جاتی بازی جانے دو
راہی بھی نہیں رہزن بھی نہیں، بجل بھی نہیں خرمن بھی نہیں
ایسا بھی بھلا ہوتا ہے کہیں، ہشیار بھی ہو مجذوب بھی ہو

سلیمان اریب

میری منطق

(اپنے ہر اس دوست کے نام جو کبھی میرا "ہم پیالہ" رہا ہو)

منکرِ بادۂ گلفام کوئی کیا ہوگا ؟
میں بھی اے دوست نہیں
آج بھی شام کے سنولائے ہوئے لمحوں میں
یادِ مے دل میں دبے پاؤں جو آجاتی ہے
میرے ترسے ہوئے ہونٹوں پہ شفق کی سُرخی
آسمانوں سے اُتر آتی ہے
جگمگا اٹھتے ہیں آنکھوں میں کنول
اور چہرے پہ مرے
پھول سے کھل جاتے ہیں
پھر بھی میں بادۂ گلفام کو ٹھکراتا ہوں
یعنی حافظ کی روایات کو ٹھکراتا ہوں
کیوں ؟ ترا آئینۂ چشم ہے حیراں حیراں
اور تو مُنہ کو مرے تکتا ہے
جیسے میں خیرہ مذاقی پہ اُتر آیا ہوں
میں تجھے کیسے مگر سمجھاؤں
میری منطق تو فقط اتنی ہے
دسترس میں نہ ہو جب تک سب کے
آبِ کوثر ہو کہ "آبِ گلفام"
وہ مرے واسطے اور تیرے لئے بھی ہو حرام

جمیل ملک

"واعظ" نے کہا

نیک بندوں کو دکھانے کے لئے "ایک نئی راہ نجات"
وال اسٹریٹ کے "واعظ" نے کہا
"میرے پرچم کے تلے آج صف آرا ہو کر
ابنِ مریم کے اصولوں کا تحفظ کر لو
حضرتِ عیسیٰ کا پیغام نہ مٹنے پائے
کہ مذاہب کو بچانے کا یہی راستہ ہے

میں تمہیں "ایٹم و ڈالر" دوں گا
یہ وہ "دولت" ہے کہ جس کو پا کر
"وادیٔ خلد" میں انسان پہنچ جاتا ہے
"دائمی امن و سکوں" پاتا ہے

اک نظر چین کی جانب دیکھو
موج در موج بڑھی آتی ہے چنگیز کی، تیمور کی فوج
کوریا اس کی بدولت ہے جہنم بکنار
ایشیا کو یہ نگل جائے گی"

وال اسٹریٹ کے واعظ کو نہیں ہے معلوم
نیک بندے تو سبھی رازِ دروں جانتے ہیں
اور چنگیز کو تیمور کو پہچانتے ہیں

ہیروشیما کی تباہی بھی انھیں ہے معلوم
ناگاساکی کے کھنڈر بھی ہیں انھیں یاد ابھی
کوریا پر جو ستم ڈھائے گئے ہیں اب تک
کون ہے جو نہیں اُن سے واقف

نیک بندوں پہ ہے یہ بھی روشن
چین کو کس نے کیا ہے آزاد ؟
کون چنگیز تھا جو لوٹ رہا تھا اس کو ؟ ؟

نیک بندوں کو خبر ہے یہ بھی
کون برما میں، ملایا میں، ہر اک ملک میں ہے تیغ بکف
روحِ چنگیز کو دنیا سے مٹانے کے لئے ؟

وال اسٹریٹ کے واعظ سے یہ جا کر کہدو
روحِ چنگیز بھی مٹ جائے گی
نیک بندے ہی ہر اک ملک میں یہ کام کریں گے مل کر
کام ـــــ جو روس میں اور چین میں لوگوں نے کیا
اُن پہ مذہب کا فسوں آج نہیں چل سکتا
ایک مدت سے وہ یہ دوزخ و جنت کے فریب
زندگانی کے تلاطم میں ڈبو آئے ہیں

(انجمن ترقی پسند مصنفین راولپنڈی)

حسن طاہر

تحفظ

(قانون تحفظِ "عامہ" کے نام)

امن جمہوریت آزادی کی خواہش مجھ کو
تنگ و تاریک حوالات میں لے آئی ہے
ظلم عیسیٰ کو بھی سولی پہ چڑھا دیتا ہے
جہل منصور کو کہتا ہے یہ سودائی ہے

جب سے طبقات میں تقسیم ہوئی ہے دُنیا
تب سے یہ ظلم کے انداز چلے آتے ہیں
پھر بھی ہاتھوں میں لئے مشعلِ مستقبلِ زیست
ہر نئے دَور کے جانباز بڑھے جاتے ہیں

جب بھی تاریخ نئے موڑ کی جانب لپکی
چور ہوتے گئے طبقات کے رنگین زجاج
زیر دستوں نے زبردستوں سے جب ٹکر لی
وقت نے بڑھ کے دیا عظمتِ انسان کو خراج

شام ۱۹۶۸ء

آج اک جنسِ پُر آشوب و فرومایہ نے
اک زمانے کو خریدار بنا رکھا ہے
چند لوگوں نے چمکتے ہوئے سکّوں کے طفیل
عرصۂ دہر کو بازار بنا رکھا ہے

آج سرمائے کی لعنت کو مٹانے کے لئے
قومِ مزدور بصد عزمِ جواں اُٹھی ہے
کارخانوں سے، گلی کوچوں سے کھلیانوں سے
زندگی تیغ بکف، شعلہ فشاں اُٹھی ہے

ان گنت صدیوں نے اس دن کی گواہی دی تھی
جاگ اُٹھے ہیں ستائے ہوئے ملکوں کے غلام
صبحِ پیکن نے مجھے اس کی بشارت دی ہے
چھانے والی ہے محلّاتِ زر و سیم پہ شام

آج لاہور کے مزدور ہزارے کے کسان
لے کے ہاتھوں میں بغاوت کے عَلَم اُٹھے ہیں
رعب سے ایٹم و ڈالر کے نہیں رُک سکتے
منزلِ شوق کی جانب جو قدم اُٹھے ہیں

اپنے آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر تم کو
ایک میں کیا ہوں ہزاروں کو جکڑنا ہوگا
چند روز اور ابھی اپنا تحفظ کر لو
تمہیں جمہور کے سیلاب سے لڑنا ہوگا

(انجمن ترقی پسند مصنفین راولپنڈی میں پڑھی گئی)

افضل پرویز

کشمیر کی راہ

ایک اِک میل پہ بیسیوں بل کھاتی ہے
اِس کی اِک سمت پھیلتے ہوئے تاریک نشیب
دوسری سمت مہیب اور بھیانک کہسار
پستیوں میں گرے کہسار سے یا سر پھوڑے
سیدھے رستے سے بھٹک جائے اگر کوئی کار
ورنہ یہ راہ تو فردوس کو ہی جاتی ہے

بلراج کومل

تخلیق

سرسبزی، مستی، شادابی، جھونکوں کا مدھم سنگیت
ہرے بھرے کھیتوں میں ننھے منّے پودوں کی سرسر
مٹّی کے زرخیز بدن کی سوندھی سوندھی سی خوشبو
روپہلی چمکیلی دھوپ کی پیاری پیاری سی لذّت
پیڑوں کے ٹھنڈے سایوں میں شفقت کی ہلکی سی آنچ
پگڈنڈی کے موڑ پہ لہرائے آنچل کی رنگینی
جسموں میں قوّت کی موجیں، آنکھوں میں بھرپور چمک
ہنستے کھیلتے ننھے بچّے، انگ انگ میں خمّاری
زرخیز و شاداب زمیں پہ ہستی یوں لہراتی ہے
جیسے اک معصوم سی بچّی گڑیا لے کر ناچ اُٹھے

سینے، باہیں، زلفیں، ہونٹ، جواں جسموں کی لہراہٹ
رقص و نغمہ، جام، مینا، ساقی کی آنکھوں کی تھکن
محل و ایوان، گرمیٔ لذّت، خوابوں کا مسرور جہاں
مسجد کے اونچے مینارے، مندر کا سونے کا کلس
شور و غوغا، ہنگامے، انسانے جینے مرنے کے
محکومی، کلفت، شورش، زخموں کی بوچھاریں ہر سو
جنگ، قحط، بیماری، حسرت ـــــ جینے والوں کی دولت

رنگ رنگ کے پرچم، ظلم و تشدّد کے سارے ساماں

جینے والوں کی دُنیا، ہر لمحہ رنگ بدلتی ہے
خستہ امکانات کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی ہیں
آبادی اور ویرانہ ـــــ مفہوم بدلتے رہتے ہیں
دکھتی روتی دھرتی ہے ہستی یوں شور مچاتی ہے
جیسے اک ننھی بچّی، شفقت کی بھوکی، چیخ اُٹھے

آج مگر سینے میں یہ احساس دھڑکتا ہے پیہم
میں اس دور کا انساں ہوں جس میں سارے انسانوں نے
اپنے جیتے جاگتے عزم، امن و سکوں کی قوّت سے
ایک نئے امکان کی شمع روشن کی ہے دھرتی پہ
ایک نئی منزل کی جانب اپنے قدم بڑھائے ہیں
قوّت، محنت اور مسرّت کے رستے اپنائے ہیں

احساسات کی تصویریں، یہ سائے دوڑتے لمحوں کے
دھرتی کی تخلیق ہیں اس کی گود میں پلتے پھولتے ہیں

معین احسن جذبی

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں
ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں
سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں
ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بیباکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں
افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں
ہر فتح کے غرور میں بے وجہ بے سبب
احساسِ انفعالِ ہزیمت کہاں سے لائیں
آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں
وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں، ندامت کہاں سے لائیں
ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
ناآزمودہ کار کی جرات کہاں سے لائیں
ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں
سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

غلام ربانی تاباں

○

مرے وجود سے تاریخ میں اُجالا ہے
میں وہ سحر ہوں جسے ظلمتوں نے پالا ہے
وہ دن بھی آئیں گے جامِ شراب چھلکیں گے
ابھی تو زندگی اک زہر کا پیالا ہے
چراغ گل کرو ——— تاریکیوں کے فرزندو
فضا میں رندوں نے جامِ سحر اُچھالا ہے
ہوئی ہے پرورشِ فکرِ غم کی چھاؤں میں
نظر کو منظرِ دار و رسن نے پالا ہے
جمی ہوئی ہے جبینِ طلب پہ گردِ ہوس
نگار و نقشِ جنوں پر خرد کا جالا ہے
ہزار بند و سلاسل ——— ہزار دار و رسن
مگر یہ دورِ تشدد تو مٹنے والا ہے
عجب مذاق ہے جمہوریت فرنگی کی
گلے میں رات کے تاروں کی جیسے مالا ہے
وطن کی لاج سے ان کو غرض رہے نہ رہے
وطن کی لاج کی قیمت تو اک نوالا ہے
اسی کا نام ہے آزادیٔ خیال مگر
نظر پہ پہرہ ہے تاباں زباں پہ تالا ہے

ظہیر کاشمیری

○

میری منزل تو بتا اے دلِ بیتاب مجھے
لے چلے راہ نما جانبِ گرداب مجھے
میں وہ تھا سازِ جنوں چھیڑ ہی گیا آخرِ کار
بزم بھی رکھ نہ سکی تشنۂ مضراب مجھے
اب تو کوئی بھی تلاطم ہو باندازۂ دل
اب تو ہر موجِ حوادث ہوئی پایاب مجھے
آخرش مل ہی گیا مجھ کو سکونِ حاصل
آخرش مل ہی گئی فطرتِ سیماب مجھے
اب یہاں سرد اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
اب جلانا ہے یہاں شعلۂ جانتاب مجھے
کاش مل جائے کوئی ملحدِ اخلاص پسند
راہ میں چھوڑ گئے منبر و محراب مجھے
وہی زنداں، وہی زنجیر بپائی ہے ظہیر
پھر بھی آزاد سمجھ بیٹھے ہیں احباب مجھے

عارف عبد المتین

○

یہ ربطِ شام و سحر ہے بہت الم انگیز
مرا اصولِ تصادم، ترا اصولِ گریز
گرفتہ دل ہے حدوں میں مذاقِ رعنائی
مرے جنوں کو نہیں راس حُسنِ کم آمیز
رمِ حیات مجھی سے نہیں ہے وابستہ
بہت دنوں سے ہے رفتارِ کائنات بھی تیز
انھیں کے ہاتھوں سے دامانِ گُل بھی ہوگا چاک
یہ خار، جن کے لہو سے ہے جامِ گُل لبریز
نہ ہو سکے گی کبھی بزمِ آرزو تاریک
ترے خیال کی قندیل اگر رہی ضوریز
ستیزہ کاریٔ پیہم مری سرشت میں ہے
مری شراب کا نشہ نہیں خمار انگیز
شعورِ کوہکن آتش بہ گام لپکا ہے
مہیب شعلوں کی زد میں ہے شوکتِ پرویز

سید فیضی

○

روئے فطرت پہ دل کشی ہو گی
وہ بھی کیا صبح زندگی ہو گی
دل ہے آزردۂ بہار۔ نہ چھیڑ
نکہتِ گل سے برہمی ہو گی
تیری نظروں میں ہے جو خندۂ گل
اک چُرائی ہوئی ہنسی ہو گی
جانتا ہوں کہ وہ نگاہِ کرم
میرے زخموں کو ڈھونڈتی ہو گی
بے قراری ہو یا سکوں، کچھ ہو
مجھ کو ہر حال میں خوشی ہو گی
اک خلش زار، ایک ہنگامہ
اور کیا شرحِ زندگی ہو گی
کیا اُٹھے گا کسی سے پردۂ راز
آگہی دشمن، آگہی ہو گی
سجدے سجدے میں فرق لازم ہے
ورنہ توہینِ بندگی ہو گی
اپنی جھوٹی تجلّیاں نہ بکھیر
چاند ہو گا تو چاندنی ہو گی
میں نہیں چاہتا فریبِ وفا
تیرے پندار میں کمی ہو گی
وقت آنے تو دے ابھی فیضی
دل کی دُنیا ہی دوسری ہو گی

سلیم واحد سلیم

○

تجھے گلہ کہ محبت سے مجھ کو مس ہی نہیں
مجھے یہ فکر کہ کیوں زندگی میں رس ہی نہیں
قدم قدم پہ گلستاں میں بچھ رہے ہیں دام
قفس ہیں اور بھی صیّاد کا قفس ہی نہیں
فلک بھی عظمتِ انساں کے گیت گاتا ہے
یہ مت کہو کہ ستاروں پہ دسترس ہی نہیں
ہمیں حیات کی موجیں ہمیں ہیں بحرِ حیات
ہماری زیست فقط ایک دو نفس ہی نہیں
اُبھارتی ہے جو پس ماندگانِ منزل کو
نویدِ قربتِ منزل بھی ہے جرس ہی نہیں
مذاقِ دید پہ ہے منحصر وگرنہ سلیم
چمن میں لالہ و گل بھی ہیں خار و خس ہی نہیں

ظہور نظر

○

بجا کہ دھند میں لپٹا ہوا اُجالا ہے
طلسمِ شب یہ مگر ٹوٹنے ہی والا ہے
نہ چھین پاؤ گے ہم سے خیالِ عظمتِ دیرینہ
یہ وہ جنوں ہے جسے عقل نے سنبھالا ہے
بہ زعمِ دار و رسن ہم سے بات مت کیجے
ہمیں بھی خواہشِ دار و رسن نے پالا ہے
کل اُن کے ہونٹ چُنیں گے ہمارے گیتوں کو
جنھوں نے آج ہمیں بزم سے نکالا ہے
ہمیں نہ دیکھ شکوک آفریں نگاہوں سے
کہ تیرے غم کو غمِ زندگی نے ٹالا ہے
وہیں ہیں ہم، کہ جہاں تھے اگرچہ دشمن نے
ہزار بار ہمیں مثلِ مے اُچھالا ہے
نظر پرانی نگاہیں بدل کے دیکھ اِسے
نیا نظام نئے آدمی نے ڈھالا ہے

تقی انجم

○

پھول ایک اک کر کے مرجھاتے رہے
ہم بہاروں ہی کے گن گاتے رہے
ان کی بے مہری کو کہہ کر مصلحت
ہم بھی اپنے جی کو بہلاتے رہے
تیرگی شامِ غم بڑھتی گئی
چاند تارے نور برساتے رہے
منزلیں اب تک ہیں گرمِ انتظار
قافلے آتے رہے جاتے رہے
وہ طلسمِ خواب ہائے آرزو
آنکھ کھلنے پہ بھی یاد آتے رہے
اُن کے ہر عذرِ شکستِ عہد پر
ہم فریبِ آرزو کھاتے رہے
ہائے انجم کس قدر نایاب لوگ
زندگی بھر ٹھوکریں کھاتے رہے

میں انتظار کروں گا

کرشن چندر

ڈی ڈی دیکھنے میں بڑی نازک اور رُسک تھی۔ اس کی خوبصورتی سنگِ خاندان کی کسی پُرانی چینی صراحی کی طرح تھی جو کسی امیر گھر کے منقش طاق میں یا اونچے اونچے محلوں والے دریچے میں اپنی صبیح رعنائی لئے جگمگا رہی ہو۔ پہلے دن جب میں کاغذ کے پھول بیچنے نکلا تو مجھے وہ بالکل اسی طرح نظر آئی جس طرح میں نے ابھی بیان کیا۔ وہ اپنے بڈھے باپ ہانگ کے ساتھ کاغذ کے تراشے پر کاغذ کے پھول شکوفے، بیلیں، گجرے، شاخیں، ٹوکریاں، ٹوپیاں اور پنکھے اُٹھائے کھڑی تھی۔ سردی کا موسم تھا اور اس نے نیلے رنگ کی ایک صدری پہن رکھی تھی۔ اور نیلے رنگ کا ایک پائجامہ جس میں بھی روئی کی تہہ لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔ یعنی وہ ان پرانی چینی عورتوں میں سے نہیں تھی جن کی چال دیکھ کر ہمیشہ سرکس کے تنے ہوئے رسے کا خیال آتا ہے جس پر سرکس والیاں چھاتا ہاتھ میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔

بڈھے ہانگ کا چہرہ ایک سوکھے ہوئے سیتا پھل کی طرح تھا۔ زمانے کے سرد و گرم نے اُسے اچھی طرح سے کوٹ پیٹ کر اس پر طرح طرح کے نشان بنا دیئے تھے اس چہرے کو دیکھ کر آپ ایشیا کے پچھلے پچاس برس کی تاریخ پڑھ سکتے تھے۔ آنکھوں میں ڈر اور چالاکی اور اندھی جہالت، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بھنوؤں کی لکیریں۔ غلامی کی زنجیر در زنجیر ائیں رخسار پر ایک زخم کا سیاہ نشان جو رخسار کی ہڈی سے شروع ہو کر جبڑے تک چلا گیا تھا۔ یہ زخم اسے ہانگ کانگ میں ملا تھا۔ جب رکشے کو دھکا چلانے کے جرم میں اُسے ایک گورے نے دھکے پیٹا تھا۔ ٹھوکروں سے اور چابک سے۔ ایسے ایسے اس کی پیٹھ پر اور جسم کے دوسرے حصوں پر کئی نشان تھے۔ جبر و استبداد کی تاریخ کے سیاہ و سنگ میل جو اس کی زندگی میں ایک صیاد کی طرح اُبھرے اور اک جلاد کی طرح اپنی بے رحمی کے نشان چھوڑ کر آگے چلے گئے۔ بہار کیسے آتی ہے۔ شگوفے کیسے پھوٹتے ہیں۔ پھول کیسے کھلتے ہیں۔ شاخ بانمر کیسے سرسبز ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی نے پہلے تو ایک بہت بڑی بھوک دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑی چٹان دیکھی۔ پھر ایک بہت بڑا صحرا دیکھا۔ اور جب وہ یہاں تک پہنچا تو اس کی ہمت نے اسے جواب دیدیا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ جدوجہد کرنا فضول ہے زندگی ایسی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ اس میں بے شمار لوگ پستے ہیں اور چند لوگ مزے کرتے ہیں۔ چند لوگ عزت پاتے ہیں اور بے شمار لوگ بے عزتی سہتے ہیں۔ چند لوگ ظلم کرتے ہیں اور بے شمار لوگ ظلم سہتے ہیں اور اس کا کوئی مداوا نہیں ہے کیونکہ اونچے دیوتاؤں نے جو آسمان کے اوپر رہتے ہیں یہ زندگی ایسے ہی بنائی ہے۔ اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بھی گناہ ہے اور جب اس نے یہ سوچ لیا۔ تو اس نے اپنے بادبان گرا دیئے۔ اپنا مستول جھکا دیا اور اپنی کشتی کو کھینچ کر بمبئی کے ساحل پر لے آیا۔ اب وہ دس سال سے بمبئی کے ایک گندے محلے کمانی پورہ میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے ایک چینی طوائف سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس کا خاوند بھی تھا اور دلال بھی۔ دن کو خاوند کا حق جتاتا تھا رات کو دلالی کرتا تھا۔ افیون کھاتا تھا۔ چانڈو پیتا تھا۔ اور کبھی کبھی غصہ آنے پر اپنی پہلی بیوی کی بیٹی ڈی ڈی کو پیٹ بھی لیا کرتا تھا۔ آٹھ سال اسی منزل میں اچھے گذر گئے مگر آسمان کے اونچے دیوتاؤں کو اس کا آرام اور سکون کب گوارا تھا۔ اس لئے انھوں نے اس کی طوائف بیوی کو اس سے چھین لیا اور جب وہ چند دن بیمار رہ کر اگلے جہان سدھار گئی تو بڈھے ہانگ کو اور اس کی بیٹی ڈی ڈی کو جو اب جوان ہو گئی تھی کاغذ کے پھول اور پنکھے بیچنے کا دھندا کرنا پڑا۔

اور آج آسمان کے دیوتاؤں نے اس پر ایک اور ظلم ڈھایا۔ یعنی مجھے اُس کے بالمقابل پھول بیچنے پر مجبور کر کے کرافورڈ مارکیٹ بھیج دیا۔ بڈھے ہانگ کی آنکھوں میں خوف اور چالاکی اور اندھی جہالت کی گہری نفرت مجھے دیکھ کر چمک اُٹھی۔ اور اس نے اپنی بیٹی سے چینی زبان میں کچھ کہا۔ اور اس نے بھی میری طرف نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

حالانکہ میں اس نفرت کے لائق نہ تھا۔ مجھے بھی مجبور کر دیا گیا تھا۔ میں دراصل ایک بہت بڑا آرٹسٹ بننا چاہتا تھا۔ رنگوں سے مجھے شروع ہی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور دسویں تک مجھے جس کلاس میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی وہ ہی آرٹ کی کلاس تھی۔ میں دن بھر تصویریں بناتا رہتا۔ طرح طرح کے پھول اور نقش و نگار اجاگر کرتا رہتا اور دوسرے مضامین کی طرف بہت کم دھیان دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دسویں میں فیل ہو گیا اور میرے چچا نے جو میرے ماں باپ کے مر جانے کے بعد میرے

اخراجات کے کفیل تھے مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے تھوڑے دنوں کے بعد جب ان کے دفتر میں تخفیف ہوئی اور وہ باہر نکال دیئے گئے تو انھوں نے بھی اپنے گھر میں تخفیف کی اور مجھے باہر نکال دیا۔ اب مجھے وہاں سونا پڑا جہاں چند ایک رزیلوں کو چھوڑ کر بمبئی کے سارے شریف آدمی سوتے ہیں۔ یعنی فٹ پاتھ پر۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے پہلے دو چار دن تو مجھے بڑے عجیب عجیب سے خواب آئے۔ مثلاً میں نے دیکھا میرے پاس ایک پیکارڈ گاڑی ہے اور میرے چچا اس کے ڈرائیور ہیں۔ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں اور ان ممتحنوں کو ڈانٹ رہا ہوں جنھوں نے مجھے دسویں میں فیل کر دیا تھا۔ میں پیرس میں ہوں اور دنیا کے بڑے بڑے آرٹسٹ مجھے اپنی تصویریں دکھاتے ہیں اور میں حقارت سے ان کی تصویریں دیکھ کے کہتا ہوں۔ بچے! کیا بیہودہ آرٹ ہے تمھارا۔ لیکن اس کے بعد جب مجھے دو چار فاقے لگے اور رات کو خواب میں بھی روٹیاں نظر آنے لگیں تو میں نے سوچا کچھ کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے میں نے کلرکی کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ کلرکی کے لئے گریجویٹ ہونا اور گریجویٹ ہو کر کسی بڑے آدمی کا سالا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک حجام کے ہاں نوکری کر لی۔ حجام بال کاٹتا تھا۔ میں سر پر برش پھیرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں حجام نے اپنی دوکان بند کر دی۔ کیونکہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں فاقے، بے کاری، بھوک اور راشن سے لوگوں کے سر کے بال اُڑتے جا رہے ہیں۔ پہلے لوگ حجام سے بال کٹوانے کے لئے آتے تھے اب خالی سر پر برش پھروانے کے لئے آنے لگے اور حجام نے مجبور ہو کر اپنی دوکان بند کر دی۔ آج کل وہ وارسا میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ اس کے بعد میں نے مل میں نوکری کی۔ پھر سمگلنگ کی۔ پھر پکڑا گیا۔ پھر تین مہینے جیل میں بند رہا۔ اس کے بعد مل مالکوں نے سب جگہ میرا حقہ پانی بند کر دیا۔ یعنی جہاں باہر کر دیا اب مجھے کسی مل میں کام نہیں ملتا تھا۔ ناچار میں نے خوانچے والے کا کام کیا، ایرانی ہوٹل والے کے ہاں ملازمت کی۔ مگر کہیں پاؤں نہیں جمے۔ آخر کار سوچ سوچ کر میں نے کاغذ کے پھول تیار کر کے انھیں کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے بیچنے کا کام شروع کیا۔ میں ایک عرصے سے دیکھ رہا تھا کہ یہاں ان پھولوں کی اچھی خاصی بکری ہو جاتی ہے۔ بہت سے چینی اس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ چند ایک دیسی لوگ بھی ہیں۔ مگر ہاتھ کی صفائی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے دو چار روز کے بعد ہی کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے سے کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یا شاید کہیں اور کوئی دھندا کرتے ہوں گے اس لئے یہاں جو چینی پھول بیچنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ مستقل نظر آتے ہیں۔ مگر اپنے دیسی لوگ بہ نظر آتے ہیں۔ وہ بیچ بیچ میں نظر آتے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں گم ہو جاتے ہیں۔ دو تین چینی کالبا دیوی روڈ کو جانے والی سڑک کی طرف کھڑے رہتے ہیں۔ دو تین بوری بندر جانے والی سڑک کے سامنے، دو چار ہنگنگ داس مارکیٹ کے سامنے موجود رہتے ہیں۔ البتہ کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے جہاں ٹرام کا جنکشن ہے وہاں میں صرف بڈھے ہانگ اور اس کی لڑکی ذی ہی کو دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں ذرا مقابلہ کم ہے۔ بکری کی گنجائش زیادہ ہوگی۔ اس لئے میں بھی اپنے پھول پتیاں لے کر وہیں جم گیا۔ میرا جمنا وہیں اتنا ہی ضروری تھا جتنا بڈھے ہانگ اور اس کی بیٹی ذی ہی کا مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا۔

خیر بڈھے ہانگ کی نفرت کی تو مجھے اتنی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن ذی ہی جیسی جوان خوبصورت لڑکی کی نفرت میں کیسے برداشت کر سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ میرے پھول اُن سے بُرے تھے۔ پھول کاٹنے کا سلیقہ مجھے آگیا تھا۔ اگرچہ جیب کاٹنے کا سلیقہ ابھی تک نہ آیا تھا۔ کرسنتھم کے گچھے دار پھول ایسے اچھے بنائے تھے میں نے کہ رات کی پارٹیوں میں شریک ہونے والے سستے قسم کے جذباتی لوگ انھیں ہاتھوں ہاتھ خرید کے لے گئے۔ میرے گلوں میں جنگلی بیلوں کے سُرخ گلاب دیکھ کر آپ بلبل کا چہکنا سن سکتے تھے۔ اور سفید چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ جھالر دار پتے اتنے اچھے کترے تھے میں نے کہ لوگ ان سفید پھولوں کو ان جھالر دار پتوں کی خاطر ہی لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ کاغذ کے پھول خریدنے والے لوگ بڑے گھٹیا اور احمق ہوتے ہیں یہ لوگ نقلی عورتوں کے سامنے نقلی محبت کرتے ہیں۔ نقلی پھولوں کے ساتھ نقلی خوشبو لگا کے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں اور نقلی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے نقلی جنت کو سدھار جاتے ہیں۔ چنانچہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے تمام پھول بیچ دیئے۔ خالی گلاب کی ایک ڈنڈی باقی رہ گئی۔ وہ میں نے ذی ہی کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے اپنے بالوں میں ٹانک لے۔ مگر ذی ہی نے بڑی سختی سے اس ڈنڈی کو توڑ مروڑ کر پرے پھینک دیا اور بڈھے ہانگ نے مجھے غصّے سے گھور کے کہا۔ "آج تو میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے۔ لیکن اگر کل کو تم یہاں مجھے نظر آئے تو یا تو غنڈوں سے پٹوا دوں گا۔ یا پولیس سے کہہ کے تمھیں گرفتار کروا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ پولیس سب کی ہے۔ پولیس والا تمھارا کیا چچا لگتا ہے۔

ہانگ نے کہا۔ میں یہاں خالی کھڑے ہونے کے لئے پولیس کے سنتری کو آٹھ آنے دیتا ہوں۔

میں نے اپنی بھری ہوئی جیب کے سکّے کھنکھنائے اور اس سے کہا۔ تم اٹھنّی دو گے تو میں بارہ آنے دوں گا۔ اور دوسرے دن جب پولیس کا سنتری آیا۔ تو میں نے یہی کیا۔ اس پر وہ بے چارا ہانگ بہت مجبور ہو کر رہ گیا۔ اور آخر کار اسے مجھ سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ سمجھوتے کی پہلی شرط یہ تھی کہ۔ میں اس کی لڑکی

کو بھگا کے نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جو پھول وہ بیچتے ہیں وہ میں تیار نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ میں کاغذ کے پھولدار پنکھے لاکے نہیں بیچوں گا۔ یہ اُن کی سنا پلی رہے گی۔ آخری دو شرطیں میں نے مان لیں۔ لیکن پہلی شرطوں جوں دن گذرتے گئے اور مجھے ذی ی اچھی سے اور اچھی لگنے لگی۔ مجھے وہ پہلی شرط اکھرنے لگی۔ لیکن ذی ی میری طرف بالکل توجہ نہ کرتی تھی اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ کیونکہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی کے چھوٹے سے تجربے کی بنا پر یہ ضرور جانتا تھا کہ جو لڑکیاں پہلی ملاقات ہی میں چپڑ چپڑ باتیں کرنے لگتی ہیں وہ نہایت خطرناک ہوتی ہیں اور کہیں آپ کا ہاتھ غلطی سے ان کے کندھے سے بھی لگ جائے تو فوراً پولیس تک معاملہ لے جاتی ہیں۔ مگر ذی ی ایسی نہ تھی وہ مجھ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اکثر اپنے غلافی پپوٹوں کے اندر سے مجھے یوں دیکھتی تھی کہ میں سوچتا تھا شاید ان غلافی پپوٹوں کے اندر کی آنکھوں کے اندر اور بھی کئی آنکھیں بند ہیں۔ جو مجھ کو نظر نہیں آتی ہیں۔ اور میرا دل اس کی نظر کے سامنے یوں کانپنے لگتا تھا جیسے سکول کا بچہ ہیڈ ماسٹر کے بید کے سامنے۔

بڈھے ہانگ نے میرے دل کی حالت کا اندازہ کر کے ایک دن جب ذی ی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ مجھ سے پوچھا۔ "تم ذی ی سے شادی کرو گے؟"

شادی؟ میں نے چونک کے کچھ اس سے کچھ اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں! ہاں! بڈھے ہانگ نے ایک بڑی ہی چالاک مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں والا منہ کھولتے ہوئے کہا۔ ذی ی سے شادی کرو گے۔ اور اب تم کر بھی سکتے ہو۔ کماتے ہو اچھے خاصے، صورت شکل بھی معقول ہے۔ پڑھے لکھے بھی ہو اور میری ذی ی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہے، وہ انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ اور چینی بھی۔ سارے کماٹی پورہ میں اس جیسے پھول اور کوئی تیار نہیں کر سکتا ہے نہ انگریزی ٹوپیاں۔ نہ پنکھے، وہ کوئی اَجڈ گنوار نہیں ہے۔

میں نے کہا اچھا میں ذی ی سے شادی کر لوں گا۔ گو میرا ارادہ اُسے بھگا کر لیجانے کا تھا۔

ہانگ بولا۔ وہ میں جانتا ہوں۔ ایسا بدھو نہیں ہوں۔ آدمی کی نظر پہچانتا ہوں۔ مگر تم میرے جیتے جی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

میں نے کہا۔ کوشش تو کی جا سکتی ہے کامیابی چاہے نہ ہو۔ یہ بات آسمان کے دیوتاؤں پر چھوڑ دینی چاہیئے۔

ہانگ بولا۔ یہ بات تو میں پولیس والوں کے سپرد کروں گا۔ آسمان کے دیوتاؤں پر اس معاملے میں ذرا کم بھروسہ کرتا ہوں۔

میں نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ تو میں بھگانے کا خیال چھوڑ دیتا ہوں۔ شادی پر رضامند ہوا جاتا ہوں۔ کتنے روپے لو گے؟

ہانگ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ایک بڈھا مالدار چینی جس کا ورنڈ میں رستوران بھی ہے۔ ذی ی کے ایک ہزار دیتا تھا۔ میں نے بڈھا سمجھ کر ہاں نہ کی۔ تمہیں چھ سو میں دے دوں گا۔

چھ سو میں کہاں سے لاؤں گا؟

ہانگ نے کہا۔ قسطوں میں دیدینا۔

میں چپ ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

ہانگ نے کہا۔ قسطوں میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ آج کل تو ریڈیو، گاڑی، فرنیچر ہر چیز قسطوں پر مل جاتی ہے۔ تم چالیس پچاس روپیہ مہینہ بھی دو گے تو سال بھر میں ادا ہو جائیں گے۔ اگلے سال تم شادی کر لینا۔

میں نے کہا۔ مجھے منظور ہے۔ لاؤ ہات۔

بڈھے نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ آج سے تم سمجھو کہ میرے بیٹے ہو گئے۔ اس لئے ایک عقل کی بات کہتا ہوں۔ ہر روز اپنی کمائی میں سے کچھ نکال کے مجھے دیتا جا۔ مہینے مہینے حساب کرنا بھی مشکل ہو جائیگا۔ روز کا روز بیجا تو بچ جاتا ہے۔ مہینے کے بعد بچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے مجھے تجربہ ہے اس چیز کا۔

میں نے کہا۔ بہت اچھا روز کا روپیہ سوا روپیہ مجھ سے لے لینا۔ باقی مہینے کے آخر میں۔

شاباش کہہ کر بڈھے ہانگ نے پھر مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا۔ اور کہنے لگا۔ گرڈی ی کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے۔ نہ تمہارے سلوک سے اور نہ تمہاری کسی بات سے اُسے یہ پتہ چلے کہ ہم لوگ کیا کرنے والے ہیں۔ اور ہاں شادی سے پہلے میں اسے تم سے زیادہ بات چیت کا موقع بھی نہیں دوں گا۔ ہمارے ہاں یہ دستور نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ہمارے ہاں بھی یہ دستور نہیں ہے۔

بڈھے ہانگ نے کچھ کھانستے کچھ ہنستے کے بیچ میں کہا۔ اور یہ بہت اچھا دستور ہے جب تک مرد عورت ایک دوسرے سے بات نہ کریں، بھرم قائم رہتا ہے۔ مجھی کو لو، جب میں نے ذی ی کی ماں سے شادی کی مجھے پتہ نہ تھا کہ اس کی زبان کتنی تیز چلتی ہے۔ اور اُسے بھی یہ پتہ نہ تھا کہ میرے منھ سے کتنی بو آتی ہے۔ شادی کے بعد دونوں کا بھرم کھل گیا۔ ہاہاہا۔

ہاہاہا میں بھی خوب ہنسا پھر ایکدم سنجیدہ ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔ "ذی ی کی زبان کیسے چلتی ہے؟"

وہ بولا۔ فکر نہ کرو۔ چاندی کی گھنٹی ہے۔ چاندی کی۔

اس واقعہ کو چھ مہینے گذر گئے۔ میں ابھی تک ہانگ کو ڈیڑھ سو روپے ہی دے سکا تھا۔ کیونکہ روزگار کئی دفعہ سندھی پڑ جاتا ہے۔ مگر ہانگ بیچارا میری مجبوری سمجھتا تھا۔ اس لئے چیکے سے میں جو رقم بھی دیتا تھا قبول کر لیتا تھا۔ میرا سلوک ذی ی سے اور ذی ی کا سلوک مجھ سے اسی طرح تھا۔ یعنی کم گوئی اور کم نگاہی۔ بلکہ اکثر تو اس کی طرف سے شدید عدم توجہی کا اظہار ہوتا تھا جو مجھے گاہے گاہے سخت پریشان کر دیتی۔ اور میں اپنی دلی حالت اس پر ظاہر کرنے کے لئے بیتاب ہو جاتا۔

آخر ایک روز مجھے موقعہ مل گیا۔ مون سون کے دن تھے۔ مسلسل دھار بارش ہو رہی تھی میں اپنے کاغذ کے پھولوں کو لئے ٹرام اسٹینڈ کے اندر دبکا کھڑا تھا۔ میرے قریب ہی ایک بڈھا موسنگ پھلی پر کوئیوں کی بھنی ٹوکری رکھے بیٹھا تھا۔ ایک بھک منگا لڑکا اپنے چیتھڑوں سے بدن ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے رات بجا رہا تھا۔ اس کے پتلے پتلے بازوؤں پر اور ٹانگوں پر کھال سنڈی منظر آتی تھی اور اس کا پیٹ آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ چاروں طرف زور کی بارش ہو رہی تھی لوگ دوکانوں میں دبکے کھڑے تھے۔ سڑکوں پر کہیں کہیں بند وکٹوریہ نظر آجاتی یا پھر بند موٹریں شیشے چڑھائے ہارن بجاتی ہوئی ادھر سے ادھر گذر جاتیں۔ کھڑے کھڑے دن ڈھل گیا شام ہو گئی۔ بتیاں جگ اُٹھیں لیکن بارش بند نہیں ہوئی۔ ٹرام اور بس کا چلنا بھی بند ہو گیا۔ لیکن بارش بند نہیں ہوئی۔ میں چپ چاپ بھیگتے ہوئے ٹرام سٹینڈ کے ایک کونے میں اپنے کاغذی پھول لئے ذی ی اور بڈھے ہانگ کے انتظار میں کھڑا رہا۔ آج دن بھر سے ذی ی کو نہ دیکھا تھا۔ روز دیکھتا تھا۔ اس لئے نہ دیکھنے کی خلش سے ناواقف تھا آج معلوم ہوا کہ جیسے روز مرہ کی جان سے دیکھا جائے اسے ایک روز کا نہ دیکھنا کتنا کھل جاتا ہے۔ کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ آج بارش کتنی اُداس ہے۔ مارکیٹ کے سامنے کے کھمبے کتنے اکیلے ہیں۔ سڑک کتنی سنسان ہے۔ ٹرام کی لائن کتنی دور تک چپ چاپ اپنے سینے میں کسی انجانے غم کو چھپائے چلی گئی ہے۔ زندگی جو کل تک کاغذ کے پھولوں کی طرح کھل اُٹھی تھی۔ آج کس طرح ایک کلی کی طرح بند ہو گئی ہے جیسے اس نے محبت کے سارے دروازے مجھ پر بند کر دیئے ہوں اور مجھے باہر سڑک پر ٹرام سٹینڈ پر کھڑا کر کے خود کہیں چلی گئی ہو.....

یکایک کسی نے میرے قریب آ کے مجھ سے پوچھا۔ آج کتنے کے پھول بکے؟

پوچھنے والے نے سوال اتنے قریب سے آ کے کیا کہ اس کے سانس کی حدت میرے رخساروں کو چھو گئی۔ اور جب میں نے اُسے دیکھنے کے لئے سر اُٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پرے کر لیا اور میری آنکھوں میں ذی ی کی غلافی پلکوں کی چمک دوڑ گئی۔ ہاں یہ ذی ی ہی تھی۔ ایسی بارش میں پھیلی ہوئی۔ خوشبو کی طرح اُڑتی ہوئی۔ بھیگے بالوں میں بھیگی خوشبوئے۔ اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر ایک عجیب سی چمک ہویدا تھی۔

میں نے کہا۔ اس بارش میں تم اکیلے اس وقت کیسے آ گئیں۔ اور ہانگ کہاں ہے؟

اس نے کہا۔ انھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سوا روپیہ لانے کے لئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے دوا لانی ہے۔

میں نے چپکے سے سوا روپیہ دے دیا۔

وہ بولی۔ یہ سوا روپیہ کہاں سے آیا۔ آج تو پھول بکے نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا۔ کل کے بچے تھے۔

وہ بولی۔ کل بھی تو سوا روپیہ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ تمھیں کیسے معلوم ہے۔

وہ بولی۔ میں سب جانتی ہوں۔

میں چپ رہا۔

وہ بولی۔ کب تک یہ سوا روپیہ آپ دیتے رہیں گے ؟

میں نے کہا۔ جب تک چھ سو پورے نہیں ہو جاتے۔

ذی ی نے اک آہ بھری۔ بولی۔ وہ آپ سے چھ سولے رہے ہیں۔ ایک اور سے آٹھ سو پر سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ تیسرے سے بارہ سو پر سودا ہوا ہے۔ ذی ی تو ایک ہے شادی تین جگہ کیسے ہوگی

میں ہکا بکا ہو کر اس کے منھ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری حیرت دیکھ کر بولی۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

میں نے غصّے میں آکر کہا۔ یہ بہت بُری بات ہے۔

ذی ی نے اک آہ بھری۔ بولی۔ اس سے بھی بُری بُری باتیں ہم نے دیکھی ہیں۔

لیکن میں نے تو تمھارے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا۔ میں نے اور بھی برافروختہ ہو کے کہا۔

ذی ی نے ایک بڑے اُداس اور پھیکے لہجے میں جس میں بے انداز تھکن موجود تھی میری طرف مڑ کے کہا۔ کیا یہ سودا کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے پوچھ لیا تھا۔ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ چینی عورت کے پاؤں اب بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اب وہ اپنے پاؤں سے چل کے کہیں بھی جا سکتی ہے!

جس انداز سے اس نے "کہیں" کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قریب سے اُٹھ کے کہیں دور چلی گئی ہے۔ اور شاید وہ کہیں بہت دُور چلی گئی تھی ہندستان سے آگے، برما سے، سیام سے، ہند چینی سے آگے چین کے کھیتوں میں اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔

وہ بولی۔ بہت آہستہ آہستہ.....

آج مجھے اپنا دیس یاد آ رہا ہے۔ جہاں لوگ نئی زندگی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ جہاں میری جیسی لڑکیاں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ ایک میں ہی یہاں سڑ رہی ہوں۔ کاش کوئی مجھے کہیں سے پر دیدے تیں آج ہی اسی وقت اُڑ کر پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں جہاں یہ لڑائی ہو رہی ہے۔

یہ کیسی لڑائی ہے؟ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ذی ی آج بول رہی تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ پھر ایک لمبے وقفے کے بعد بولی۔ تم جانتے ہو میرا اصلی نام ذی ی نہیں ہے۔

نہیں؟

میرا اصلی نام کچھ اور تھا۔ یہ نام میں نے خود رکھا ہے۔ ذی ی ایک بہادر چینی لڑکی تھی جو چیانگ کائی شیک کے ظلم کے خلاف بہادری سے لڑتی ہوئی شہید ہو گئی میں بھی ذی ی کی طرح لڑنا چاہتی ہوں۔

کس لئے؟

وہ بولی۔ تمھیں کیسے سمجھاؤں ــــ اچھا کوشش کرتی ہوں..... سُنو..... جہاں ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں ہان ندی بہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام ــــ کوانگ شا ہے۔ وہاں پرانا شاپتوں کے جھنڈ ہیں۔ اور آڑو کے پیڑ ہیں۔ اور ندی کے کنارے کنارے تو تے کے درخت اپنی شاخیں ندی پر جھکائے دور تک چلے جاتے ہیں گھاٹ کے اوپر سارے گاؤں کے اوپر نگاہ رکھتا ہوا بوڑھے سردار دُو کا گھر ہے۔ جس نے میرے باپ کی زمین چھین کر اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا اس وقت میں صرف چار سال کی تھی۔

گاؤں سے کیوں نکالا؟

اس لئے کہ قرضہ نہ دیا جا سکا۔ جو بوڑھے سردار نے میرے باپ کو میری ولادت کے موقع پر دیا تھا۔

یکایک مجھے اپنا چچا کے گھر سے نکلنا یاد آیا۔ میں نے کہا۔ ارے اب میں سمجھ گیا۔

کیسے؟ وہ بولی۔

بس اپنے تجربے سے ۔

اپنا تجربہ بہت ضروری ہے

اچھا آگے بتاؤ ۔

وہ بولی ۔ پھر ہم اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں میں آگئے ۔ وہاں ہم دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں مزدوری کرتے رہے ۔ میری ماں بہت خوبصورت تھی ۔

میں نے کہا ۔ اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے ۔

وہ شرمائی ۔ کچھ خوش ہوئی ۔ بولی ۔ تم تعریف کر چکو تو آگے چلوں ۔

اچھا آگے چلو ۔

چونکہ میری ماں بہت خوبصورت تھی اور ہم لوگ بہت غریب تھے ۔ اس لئے وہ دوسرے لوگ جن کے کھیتوں میں ہم کام کرتے تھے ۔ ہم سے کام کرانے کے بعد عیش بھی چاہتے تھے ۔ میرے باپ کو یہ منظور نہ ہوا ۔ اس لئے ہم اس گاؤں سے بھی نکل آئے ۔

پھر ؟

پھر بہت سخت کال پڑا ۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے ۔ میرے باپ نے تنگ آکے اپنی بیوی کو ایک امیر بڈھے کے پاس دو ہزار میں بیچ دیا ۔

تمہاری ماں کو ۔

ہاں اسی کو ۔

ان دو ہزار ڈالروں سے ہم لوگ ہانگ کانگ آئے ۔ سُنا تھا ۔ وہاں رکشا کا اچھا بزنس ہوتا ہے ۔ میرے باپ نے ایک رکشا خرید لی ۔ اور رکشا چلانے لگا ۔ گورے لوگ شراب پی کے اکثر دنگا تو کرتے ہیں لیکن ایک دن میرے باپ کو ایک گورے نے اتنے چابک مارے کہ وہ بے ہوش ہوگیا ۔ پھر گورے نے اس کی رکشا کو آگ لگا دی ۔

دو ہزار ڈالر جل گئے ۔ پھر ؟ میں نے پوچھا ۔

پھر اس نے کہا ۔ پھر میرے باپ نے مجھے بیچنا چاہا ۔ لیکن میں بہت چھوٹی تھی ۔ بہت کمزور تھی ۔ بہت دُبلی پتلی تھی ۔ کوئی مجھے خریدنے پر تیار نہ ہوا ۔ آخر ایک پادری نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا ۔ نوکرانی ۔ پادری کی بیوی انگریزی پڑھانے لگی ۔ دو بڑے اچھے دن تھے ۔ میں اچھی خاصی تندرست ہوگئی ۔ مگر میرے باپ کو کوئی نوکری نہ ملی ۔ اس لئے اس نے ایک انگریزی کمپنی کے گودام میں چوری کی اور پکڑا گیا ۔ اور دو سال کی سزا ہوگئی ۔

میں چپ چاپ سن رہا تھا ۔

وہ بولی ۔ اس نے چاول چُرائے تھے گودام سے ۔ کیونکہ وہ بھوکا تھا اور وہ اس لئے بھوکا تھا کہ اس کے چاول اس کے کھیت سے چُرا کے چیانگ کائی شیک کی سرکار نے انگریزوں کے گوداموں میں بھر دیئے تھے ۔ اور امریکنوں کے گوداموں میں ان لوگوں نے نہ صرف اس کے چاول چُرائے تھے بلکہ اس کے کھیت بھی ہتیا کے سردار ڈو کو دیدئے تھے ۔

وہ دیر تک چپ رہی ۔

میں نے کہا پھر ؟

وہ بڑی بے دلی سے بولی ۔ پھر ہم سنگاپور آگئے ۔ سنگاپور سے ملایا گئے ۔ وہاں ربڑ کے باغوں میں کام کرتے رہے ۔

وہاں سے برما آگئے ۔ پھر بمبئی آگئے ۔ آگے تم جانتے ہو ۔

اور اب ؟ میں نے پوچھا ۔

اور اب میں تم سے یہ کہتی ہوں کہ تم میرے باپ کو سوا روپیہ دینا بند کر دو ۔ میں تم سے کیا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی ۔

کیوں ؟

میں واپس چین چلی جاؤں گی۔ جس دن میرے پاس روپیہ ہوا۔ میں چین چلی جاؤں گی۔

تو پھر تو مجھے روز ڈیڑھ روپیہ دینا چاہیئے۔

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ "میں یہ روپیہ لے کر چین چلی جاؤں گی تو تمہیں کیا ملے گا۔

میں نے کہا۔ میں انتظار کروں گا۔"

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی بولی۔ میں تو اتنی اچھی نہیں ہوں۔ خاک بھی اچھی نہیں ہوں۔ تم میرا خیال نہ کرو۔ دیکھو تمہارے ہندوستان میں کتنی اچھی لڑکیاں ہیں۔ ان کی آنکھ کتنی اچھی ہوتی ہے۔ آنکھیں کتنی بڑی بڑی نیلی جیسے ابھی چہرے سے باہر نکل پڑیں گی۔ ہائے ایسی اچھی آنکھیں تو میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ یہ تم کو کیا ہوا ہے۔

میں نے کہا۔ تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔

وہ میرے قریب آکے بولی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

میں نے کہا۔ اب میرے پاس صرف مونگ پھلی کے پیسے رہ گئے ہیں۔

میں نے مونگ پھلی والے سے کہا۔ دو آنے کی مینگ دو۔

وہ بولی "مینگ مونگ پھلی کو کہتے ہیں؟ بالکل چینی نام معلوم ہوتا ہے مینگ۔"

مونگ پھلی کھاتے کھاتے کئی بار ہاتھوں میں ہاتھ الجھے۔ لیکن الجھ الجھ کر پھر سلجھ گئے۔ اس کی آنکھوں کی مکمل نکاہی بے حد عمیق ہو چلی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں بھی کانپ رہا تھا۔ اور چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ چاروں طرف لوگ ہیں۔ پھر بھی کیسی تنہائی ہے۔

میں نے کہا۔ اور کتنی اچھی تنہائی ہے۔

وہ ہنسی۔ بولی۔ اب میں جاتی ہوں۔

میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا۔ اپنے دل سے صرف اتنا کہا۔ اب یہ کہیں بھی چلی جائے اس سے کچھ نہ ہوگا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔

اور بہت سا وقت گذر گیا۔ وقت گذرنے کا پتہ صرف شام کے اخبار سے معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ پتہ چلتا تھا کہ پی پنگ ختم ہو گیا۔ پی کنگ فتح ہو گیا شنگھائی ختم ہو گیا ماؤ کی فوجیں چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئیں۔ اور ہانگ کانگ کی ساحلی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ جس روز یہ ہوا یعنی چین کی فوجیں ہانگ کانگ کی سرحد پر پہنچ گئیں۔ اسی روز ہماری محبت کی سرحد بھی آن پہنچی۔

وہ بولی۔ بس اب کرایہ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ لڑائی تو یہاں بھی لڑی جا سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ وہ تمہارا کام ہے۔ میں وہاں جاؤں گی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ ذی ی۔ دنیا تو جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑی ہے۔ اس کام کو تو یہاں سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ آؤ ہاتھ میں ہاتھ دو۔

وہ ہچکچائی۔ کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر تک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا۔ پھر بڑی نرمی اور ملائمیت سے اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے آزاد کر لیا اور میرا ہاتھ اکیلا رہ گیا۔

اس نے کہا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے اپنے دھن جانے دو۔ میں یہاں رہی تو کبھی خوش نہ رہوں گی۔ ہاں وہاں جا کے سوچوں گی۔

میں نے کہا۔ اچھا میں انتظار کروں گا۔

جانے سے پہلے بڈھے ہانگ اور ذی ی میں بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ بڈھا ہانگ واپس جانا نہیں چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی واپس چین چلی جائے۔ اس لئے وہ رویا دھویا۔ اس نے ذی ی کو دھمکایا۔ مارا پیٹا۔ معاملہ پہلے پولیس میں اور بعد میں عدالت تک لے گیا۔ مگر ذی ی بالغ تھی اور اب وہ اپنے دھن جا سکتی تھی۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ محبت کے مضبوط ہاتھ بھی اسے روک نہ سکے۔ اور وہ بمبئی سے کلکتے اور کلکتے سے ہانگ کانگ چلی گئی۔ جانے سے قبل کوئی زیادہ بات چیت مجھ سے نہیں ہوئی۔ الوداع کے وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ خوشی کی چمک تھی اور ایک عجیب

بیقراری اور بے تابی۔ ہاں بالکل روانہ ہوتے وقت اس نے ایک بار مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے کان میں کہا۔ میں ضرور آجاؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

اور وہ چلی گئی۔

اور اس کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی خوشبوئیں پر لگا کے اس کے ساتھ اُڑ گئی ہیں۔ اور میرے ہاتھ میں صرف کاغذ کے پھول رہ گئے ہیں۔

بڈھا ہانگ اسے رُخصت کرنے کے لئے بھی نہیں آیا اس کے بعد مجھے بھی نہیں ملا۔ شاید اس نے پھول بیچنے کا دھندا ہی بند کر دیا۔ بعد میں مجھے ایک چینی پھول بیچنے والے سے پتہ چلا کہ اس نے ایک دوسری چینی طوائف سے شادی کر لی ہے اور ہر وقت افیون کی پینک میں مست رہتا ہے۔

بہت عرصے کے بعد مجھے ذی ی کا خط ملا۔

پیارے

یہ خط میں تمھیں اپنے گاؤں سے لکھ رہی ہوں۔ جو ہان ندی کے کنارے واقع ہے جہاں ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں اور ان پر فیروزے اور کپھراج کی سی خوبصورت پتیاں نکھر رہی ہیں۔ آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہیں۔ اور وہاں جہاں سردار دُو کا گھر تھا وہاں اب ہمارے گاؤں کا سکول ہے۔ زمین ہم سب کسانوں کو پھر سے مل گئی ہے۔ اپنی ماں کا پتہ بھی میں نے چلا لیا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ جس زمیندار نے اسے قحط کے دنوں میں میرے باپ سے خریدا تھا وہ آج کل وطن سے غداری کرنے کے جرم میں اور بلیک مارکیٹ کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے یہاں مجھے سکول میں استانی کا کام سونپا گیا ہے۔ جانتے ہو۔ میں اب بچوں کو انگریزی پڑھاتی ہوں۔ کیا تم سوچ سکتے ہو کہ تمھاری ذی ی کبھی بچوں کو سکول میں انگریزی پڑھائے گی۔ کبھی کبھی میں خود ایسا سوچتی ہوں تو خوشی سے اچھل پڑتی ہوں۔ ایسی خوشی کیا کبھی ممکن تھی۔ کن مصیبتوں سے ہم نے اپنی آزادی حاصل کی ہے۔ سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے۔ میں نے تو اس آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب ساری زندگی بھی اس کام میں لگا دوں تو کم ہے۔

تم یہاں کبھی آجاؤ تو کیسا رہے۔ حیران رہ جاؤ گے یہ دیکھ کر کہ کیا یہ وہی چینی ہیں۔ یہ وہی گاؤں ہے۔ ساری دھرتی بدل گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہمارے گاؤں کی چڑیوں تک کو یہ احساس ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو چکے ہیں۔ اپنے ضمیر کے خود مالک ہیں۔

جب تم یاد آجاتے ہو تو تمھیں یہاں دیکھنے کی خواہش کرتی ہوں۔ یہاں پر ایک لڑکا ہے جو اکثر تمھیں بھلا دینے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

تمھاری

ذی ی

میں نے ذی ی کے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ کئی بار خط لکھ کر پھاڑ دیا۔ ادھر کچھ اور پریشانیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ زنگین کاغذ کے دام بڑھ گئے۔ بیلیں اور شاخوں میں جو تار خرچ ہوتا تھا اس کے دام بیوپاریوں نے بڑھا دیئے۔ مہنگائی ہونے سے لوگ کاغذ کے پھول کم خریدنے لگے۔ لوگوں کے پاس اپنے کپڑوں کے لئے پیسے نہ رہے تو وہ کاغذ کے پھول خرید کے کیا کرتے۔ میں اکثر بھوکا اور ننگا رہنے لگا۔ چڑچڑا اور پریشان۔ دو تین دفعہ پولیس والوں سے تو تو میں میں ہوئی۔ مجھے خود آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس بھلا سنتری کو بارہ آنے روز کہاں سے دیتا۔ سنتری نے مجھے دو تین روز بڑے پیار محبت سے سمجھایا۔ بتایا کہ وہ رشوت خور نہیں ہے۔ رشوت سے اُسے سخت نفرت ہے۔ مگر اس کے گھر میں بیوی بیمار ہے۔ دوا کے لئے تنخواہ میں سے پیسے نہیں بچتے۔ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ خالی خولی ایمانداری سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اور پیٹ بُری بلا ہے۔ مگر میرے پاس پیسے کہاں سے آتے تھے جو میں اُسے دیتا۔ ناچار غصے میں آکے اس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ آوارہ گردی کے الزام میں مجھے پندرہ دن کی قید ہو گئی۔

جب میں قید سے چھوٹ کے آیا۔ تو مجھے ذی ی کا ایک اور خط ملا۔

پیارے

تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ جلدی لکھو کیا بات ہے۔ یہاں پر اب کے ہمارے گاؤں میں فصل پہلے سے ڈیوڑھی ہے پر کسی زمیندار

کو فصل کا حصّہ نہیں دینا پڑا۔ ساری کی ساری فصل اپنی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئی ہیں۔ گھٹتی جا رہی ہیں۔ اور معاشی حالات جو بگڑ چکے۔ اپنے آپ ٹھکانے پر آ رہے ہیں۔

کل ہمارا قومی تیوہار کا دن تھا۔ سارے گاؤں میں ہنڈ والے جگائے گئے۔ چراغاں ہوا۔ ناچ اور گانے۔ سکول کے باہر گاؤں والوں نے ملکے ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس موقع پر میں نے ایک بڑا ہنڈ ولا تیار کیا۔ جو چکر کھا کر گھومتا تھا۔ جیسے سرکس یا نمائش کے ہنڈولے گھومتے ہیں۔ گاؤں والے میری کاریگری دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور مجھے ایک چاندی کا تمغہ انعام میں دیا۔ سکول میں بھی میرے کام کو بہت پسند کیا جا رہا ہے۔

کیا تم میری کسی بات سے خفا ہو؟

تمہاری

ذی ی

اس خط کا میں نے یہ جواب دیا۔

پیاری ذی ی

خوش رہو۔ میں ابھی ابھی پندرہ دن کی جیل کاٹ کے آیا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ میرا گناہ یہی تھا کہ میں بیکار تھا۔ مجھے میری بیکاری کی سزا ملی۔ حالانکہ سزا اس وزیر کو ملنا چاہیئے تھی جس کے راج میں میں بیکار رہا۔ یہاں کام کا بہت مندا ہے آج کل۔ پھل نہیں بکتے۔ اناج مہنگا ہو گیا ہے۔ کپڑا بھی مہنگا ہو گیا ہے۔ ہر چیز کے دام بڑھتے جا رہے ہیں۔ سوچتا ہوں۔ ایسا یہاں کیوں ہو رہا ہے کہ یہاں قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ اور تمہارے ہاں گھٹ رہی ہیں ایسا میں تمہاری محبت کی وجہ سے نہیں سوچتا۔ بلکہ آس پاس کے حالات کی وجہ سے سوچتا ہوں۔ اور نہ بھی سوچوں تو کیا کروں۔

یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم خوش ہو۔ میری خوشی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ باقی رہا۔ اس لڑکے کا معاملہ جو مجھے تمہارے دل سے بھلا دینے کی فکر میں ہے۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کیا کرتی ہو۔ اس کی مجھے فکر کیوں؟

تمہارا اپنا

اس کے بعد جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو اس کا خط آیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔ "اس جنگ نے میری زندگی کے سارے ارادے بدل دیئے ہیں۔ میں اب وہ کبھی نہیں ہو سکتی جو میں پہلے سوچتی تھی۔ اب میں کوریا کی جنگ میں چینی و الیٹیرن کے جا رہی ہوں وہاں نرس کا کام کروں گی۔ اور اگر کبھی زندہ رہی تو شاید تم سے ملنے کی کوئی صورت نکل سکے۔ ورنہ الوداع"۔ آخری فقرہ تھا۔ "اچھا تو یہی ہے کہ مجھے دل سے بھلا دو۔ ہم وہاں ملے۔ جہاں حالات ایک دوسرے سے "ٹکرا رہے تھے۔ ایک بہاؤ پر نہیں ملے۔ مخالف بہاؤ پر ملے۔ اس لئے ایک لمحے کے لئے رُک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اب میں تو خندقوں، گولیوں اور آہنی باڑھوں کے رستے پر جا رہی ہوں۔ اپنے کاغذی پھولوں کو میرے رستے سے ہٹا دو۔ پیارے۔ میرے وطن کی زندگی، کوریا کی زندگی۔ سارے ایشیا کی زندگی خطرے میں ہے"۔

اس کے بعد اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں اس کے باپ سے ملنے گیا۔ لیکن وہ تو ہمیشہ کے لئے اپنی بیٹی کو دل سے بھلا چکا تھا۔ اور ذی ی بھی اس سے ناطہ توڑ چکی تھی۔ کسی ایک خط میں بھی اس نے مجھ سے کبھی اپنے باپ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ایک آخری مجبوری تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے کٹ گئی۔ اب ذی ی آزاد تھی۔ اور کوریا چلی گئی تھی۔

کوریا کی جنگ نے کئی پانسے بدلے۔ کئی رُخ پلٹے۔ مگر ذی ی کی کوئی خبر نہ ملی۔ آزاد چین کی پہلی سالگرہ آئی اور چلی گئی۔ میں نے اس کے گاؤں کے سکول میں کئی خط ڈالے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ روز اخبار دیکھتا تھا۔ کیونکہ کوریا کی جنگ اب ذی ی کی ہی جنگ نہ تھی۔ وہ اب میری بھی جنگ تھی۔

کل بڑے اخبار دیکھنے سے ذی ی کا پتہ چل گیا۔ کوریا کی لڑائی کے متعلق اس میں ایک تصویر چھپی تھی۔ جس میں چند امریکی بہادر سپاہی پس منظر میں کھڑے تھے اور اپنے سامنے انھوں نے کوریائی اور چینی سپاہیوں کے بارہ سر کاٹ کے اینٹوں پر رکھ دیئے تھے۔ ان بارہ سروں میں ایک سر ذی ی کا تھا۔ بارہ کیا اگر ایک لاکھ سر

بھی ہوتے تو میں اپنی ذی ی کا سر پہچان لیتا۔ اس کے ہونٹ بند تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ذی ی جو ذی ی کی طرح اپنے وطن کی خاطر اور شاید بہت سے وطنوں کی خاطر جن سے اُسے دُور کا بھی علاقہ نہ تھا شہید ہوگئی۔

پھر میرے سینے میں وہی دھڑکتی اُبلتی ہوئی شام آئی جب چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ اور ہم دونوں ایک ساعت کے جزیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لئے تنہا کھڑے تھے۔ ذی ی جو ایک دائم محبت کی دائم جوانی کے لئے مرمٹی۔ آج میرے ہاتھ میں اس کا کٹا ہوا سر تھا۔ زندگی کی ہنڈکلی کی طرح جس میں چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ میں تجھ سے کیا کہوں؟ میری محبت کی آخری شام۔ کس طرح تیرے بالوں کو چوم کے کہوں۔ لے میرے پیار کا آخری سلام اور سوجا۔ اپنی عمیق نگاہیں میرے ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بخش دے۔ اور پھر اپنی آنکھیں بند کرلے اور سوجا! "سوجا چین دیس کی محبوبہ۔ میرے گلاب۔ میرے کرسنتھم۔ میرے یاسمن۔ میرے سوتیا کے پھولوں کی رانی۔ آج کی رات ہم سب پر بھاری ہے۔ ہم اس لئے کہ ہم تجھے موت سے نہ بچا سکے۔ اُن پر اس لئے کہ وہ تیرا سر کاٹ سکے۔ تیرا دل۔ تیری عقل۔ تیرا احساس نہ کاٹ سکے۔ ایسی کاٹ کسی تلوار میں نہیں ہے۔ جو ایشیا کی محبت کو کاٹ سکے۔ وُہ ایک آدم خور وارد امریکی آدم اور ان کے انگریزی، فرانسیسی اور ترکی غلام ملکر بھی ایشیا کی محبت کو ختم نہیں کرسکتے۔

آج میں اس چیز کو سمجھ گیا ہوں کہ تو میرے پاس پھر آئے گی۔ جس طرح دو ہزار سال پہلے میں چل کر تیرے پاس گیا تھا۔ اسی طرح آج دو ہزار سال کے بعد تو چل کر میرے پاس آئے گی۔ اور پھر تجھے اور مجھے اور دنیا کے عوام کو ہم سے کوئی جدا نہ کرسکے گا۔

اس چیز کو میں آج سمجھ گیا ہوں۔ اس لئے ذی ی میں آج تیرا انتظار کرتا ہوں۔ کیونکہ جب میں ذی ی کا انتظار کرتا ہوں۔ تو میں روشنی کے ہنڈولے کا انتظار کرتا ہوں۔ تو میں بہار کا انتظار کرتا ہوں.....!

جب سماج افسردگی اور یاسیت کا شکار ہوجاتی ہے
جب ماحول پر اُداسی کے غمناک بادل مسلّط ہوجاتے ہیں

تب

کرشن چندر

ان شکستگی کی تصویروں میں زندگی کے رنگ بھرتا ہے اور اپنی تحریروں سے عوام کی بجھتی ہوئی نگاہوں میں اُمید کی مشعلیں روشن کرتا ہے ——— ہندوستان کے اس ہردلعزیز افسانہ نگار کی نگارشات کے

دو نئے مجموعے

جنھیں مکتبہ شاہراہ پیش کررہا ہے

میں انتظار کروں گا (نئے افسانے) (زیرِ طبع)

سنگ ریزے (طنزیہ مضامین) (زیرِ طبع)

ان مجموعوں کے ہر افسانے اور ہر مضمون کے ساتھ کارٹون اور قلمی اسکیچ بھی شامل ہیں

ہیروں کا ہار

انور

(بچوں کے لئے نصیحت آموز کہانی)

ایک تھا راجہ ــــــ

لیکن ایسا راجہ نہیں جیسے راجہ رامچندر یا راجہ ہرش یا راجہ بکرماجیت۔ ان سمولی ناموں والے راجاؤں کی اس راجہ کے سامنے کیا حقیقت تھی۔ اگر ان راجاؤں میں سے آج کوئی زندہ ہوتا اور ONLOOKER کے پہلے صفحے پر خوبصورت رنگین تصویر کے نیچے یہ نام پڑھ لیتا:۔

MAHARAJ ADHIRAJ CHHATAR PATI MAHABAARAT JEET SINGH JEE

K.C.S.I., G.C.I.E., K.C.V.O., G.C.B.,

L.C.M., G.C.M.

RULER OF PARLOK PUR

تو وہ کھوڑ قوام کے بغیر ہی بے ہوش ہو جاتا یا پرلوک پور پڑھنے سے پہلے ہی پرلوک سدھار جاتا۔

اس لئے میں نے غلطی کی جو اُسے راجہ کہا۔

اچھا اب سنو!

ایک تھا مہاراجہ اور ایک تھی مہارانی ــــــ

مہارانی یعنی بڑی رانی۔ یعنی بہت سی جونیئر رانیوں پر ایک سینئر رانی۔ جیسے بہت سے کلرکوں پر ایک ہیڈ کلرک اور جس طرح بہت سے کلرکوں پر ایک ہیڈ کلرک کا ہونا ضروری ہے اسی طرح بہت سی رانیوں پر ایک مہارانی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مہارانی کے بغیر ریاست کا ولیعہد پیدا نہیں ہو سکتا۔ مہاراجہ مہا بھارت جیت سنگھ جی کی ساٹھ رانیاں ایک ولیعہد بھی پیدا نہ کر سکیں۔ اس لئے انھیں یکے بعد دیگرے مہارانی کے عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ یعنی ساٹھ فاعل اکٹھے ہو کر ایک مفعول پیدا نہ کر سکے۔ لیکن رانیاں تو خود مفعول ہیں۔ مہاراجہ مہا بھارت جیت سنگھ جی کو خود ایک ولیعہد پیدا کرنا چاہیئے تھا لیکن ہزار کوششوں کے باوجود ایک مفعول پیدا نہ کر سکا۔ اور جب بالآخر اس سارے معاملے کی ترکیب نحوی کی گئی تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ مہا بھارت سنگھ جی مفعول ہے۔ اس کی ساٹھ رانیاں فاعل اور مستقل نفس محذوف۔

مہارانی بہت خوبصورت تھی کیونکہ وہ انگریز تھی۔ اور اس کا انگریز ہونا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ ولیعہد پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ لنڈن کے ایک ہوٹل میں ایک سال کے قیام کے دوران میں مہاراجہ مہا بھارت جیت سنگھ جی اپنی ہونے والی مہارانی کے مرد دوستوں میں بہت مقبول ہو گئے تھے۔ اور جب ان کی ہونے والی مہارانی نے انھیں بتایا کہ وہ اس سے جلد شادی کر لیں نہیں تو ولیعہد پیدا ہو جائے گا تو انھیں یقین نہ آیا اور انھوں نے یہ کہہ کے بات ٹالنا چاہی کہ یہ ناممکن ہے لیکن جب ہونہار مہارانی نے انھیں عدالت میں گھسیٹ کر لے جانے کی دھمکی دی تو مہاراجہ مہا بھارت جیت سنگھ جی نے ہتھیار ڈال دئے اور دوسرے روز اخباروں میں یہ سرخیاں دیکھی گئیں۔

ہندوستان کا ایک راجہ ہوٹل کی ایک حسین ملازمہ

کے دامِ محبت میں

ایک والیٔ ریاست اور ایک رذیل لڑکی

کا سا شقہ

مہاراجہ مہابھارت جیت سنگھ جی
اور
مس ہیلن ہمفری
کی شادی

میں نے اخلاق پر بُرا اثر کرنے والی کہانی شروع کر دی ہے۔

دراصل اب ہمیں مہاراجوں اور مہارانیوں کی کہانیاں سنانا بند کر دینی چاہئیں۔ ان کی کہانیاں اخلاق پر بُرا اثر کرتی ہیں۔ ان کی زندگیاں سیاہ کاریوں اور ستمرانیوں سے بھرپور ہیں۔ ان کی کہانیاں خودغرضیوں اور ریاکاریوں سے لتھڑی ہوئی ہیں۔ کیونکہ ان کہانیوں کے راجے ایسے نہیں جیسے رامچندر یا راجہ ہرشن یا راجہ بکرماجیت۔

آؤ تمہیں ایک چرواہے کی کہانی سنائیں۔

ریاست پرولک پور میں ایک گاؤں ہے۔ سورج غروب ہو رہا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے گیہوں اور گنے کے پودے لہلہا رہے ہیں۔ درختوں کے جھنڈ میں سے رہٹ کی آواز آ رہی ہے۔ کیاری میں پانی چھوڑ کر کوئی کسان کہیں گا رہا ہے۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے ہیں۔

گاما چرواہا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پیپل کا سایہ دور پہنچ گیا۔ شام کی زرد دھوپ میں گاما کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے پیپل کی اُبھری ہوئی جڑ پر سے اپنی کھدر کی پگڑی اُٹھائی اور اس سے اپنی پیشانی پونچھ ڈالی۔ آج وہ بہت دیر تک سویا رہا ہے۔ وہ سارا فرجوا اپنی لاٹھی میں کپڑوں کی گٹھری، دھوڑی کے سوتے موٹے جوتے اور روٹیوں کا رومال پروئے ہوئے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا اور روٹی کھانے کے بعد اس کے سستی کے برتن میں سے ایک پیالا پی کر اس کے پاس لیٹ گیا تھا، اُٹھ کر جا چکا تھا۔ گائیں جوہڑ کے کنارے بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ اور بھینسیں سر پانی سے باہر نکالے ہوئے جوہڑ میں آرام سے بیٹھی تھیں۔

گاما انگڑائی لے کر کھڑا ہو گیا۔ کھدر کی پگڑی سر پر باندھ لی۔ بسی کے خال برتن کو چنگیر میں رکھ کر کپڑے سے باندھا اور لاٹھی میں پرو لیا۔ پتھر پھینک پھینک کر بھینسوں کو جوہڑ سے نکالا۔ اور گاؤں کی طرف چل دیا۔

سامنے پیپل، پلکن، نیم اور بڑ کے درختوں میں گھرا ہوا گاؤں شام کی زرد دھوپ میں نہاتا دکھائی دے رہا تھا۔

کچے راستے پر مان سنگھ اور اس کے چار بیٹے مویشیوں میں گوڈی کر کے واپس گاؤں جا رہے تھے۔ مویشیوں کو کچے راستے کی طرف آتے دیکھ کر مان سنگھ کے چاروں بیٹے گرد سے بچنے کے لئے تیز تیز چلنے لگے۔ اس طرح ان کا باپ جو شاید تیز نہیں چل سکتا تھا ان کے پیچھے رہ گیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد مویشیوں کے پیچھے گاما سے جا ملا۔

مان سنگھ نے کہا۔ "گاما، بیگو کا کیا حال ہے؟"

گاما بولا۔ "جو میرے رب کی مرضی، مان سنگھ۔ دیکھ کیا لکھا ہے قسمت میں۔"

"حالت کچھ اچھی نہیں، میں دیکھنے گیا تھا آج۔"

"ہاں، مان سنگھ، مجھے تو اب امید نہیں رہی۔"

"میرا خیال ہے حکیم رحمت علی کی دوائی موافق نہیں اس کو۔"

"حکیم تو اچھا ہے۔"

"کہو تو بابا سندر داس کو دکھا دوں۔ کل آ رہے ہیں۔ یاترا پر۔"

"مان سنگھ، بابا سندر داس کے علاج پر ذرا خرچ زیادہ آتا ہے۔ حکیم رحمت علی کو جو دے دیتے ہیں لے لیتا ہے۔"

"خرچ کا فکر نہ کر، گاما۔"

"دکھا دے پھر۔"

اب سورج دیوان ہند رسنگھ کے مہمان خانے کی تیسری منزل کے برابر آ گیا تھا۔ دیوان ہند رسنگھ کا مہمان خانہ گاؤں سے آدھے میل کے فاصلے پر اس کی نئی

کوٹھی سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔ اس کے لئے یہ موقع مناسب ہے۔ کیونکہ اس سے ملحقہ باغ کی فصیل کے آگے ریاست پرولک پور کی مشہور شکار گاہ ہے۔ دیوان ہمندر سنگھ اس مہمان خانے کو تارکول کی سڑک کے ذریعے پرولک پور سے ملانا چاہتا تھا لیکن ریاست کا بجٹ اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ پھر ریاست کی تاریخ میں ایک ایسا مقام آگیا جس کے سامنے ریاست کے بجٹ کو بھی سرنگوں ہونا پڑا۔ ریاست کے ولیعہد نے یکایک فیصلہ کر لیا کہ وہ دیوان ہمندر سنگھ کی چھوٹی لڑکی کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ دیوان ہمندر سنگھ نے سوچا اب مہمان خانے سے پرولک پور تک تارکول کی سڑک بن جائے گی۔ اس سڑک کے ذریعے ولیعہد کی بارات مہمان خانے میں اُتر آئے گی۔ تمام ریاستوں کے راجے مدعو کئے جائیں گے۔ مہمانوں کو دس روز تک مہمان خانے میں ٹھہرایا جائے گا۔ ناچ، گانے، شراب اور شکار سے ان کا دل بہلایا جائے گا۔

مان سنگھ نے کہا، "بارات آگئی ہے۔"

گاما بولا، "باجوں اور پٹاخوں نے مجھے بھی جگا دیا تھا۔ میں نے ذرا سر اُٹھا کر ہاتھی، گھوڑوں اور موٹروں کو سڑک پر گھومتے، ٹہلتے اور چیڑ پیپل کے سائے میں آرام سے سوتا گاؤں والوں نے تو آج کھیتوں میں کام بھی نہیں کیا۔"

"بے وقوف ہیں۔"

مان سنگھ نے کہا۔ "جب بارات مہمان خانے کے پاس پہنچ رہی تھی۔ عورتیں، جوان، بوڑھے تماشا دیکھنے کے لئے مہمان خانے کے پاس جمع ہو گئے دیوان جی کو یہ بات بُری لگی۔ اتنے بڑے بڑے مہمانوں کا استقبال ننگے سچوں اور میلے کپڑوں سے ہوگا۔ انھوں نے لوگوں کو واپس گاؤں جانے کا حکم دیا۔ جب لوگوں نے پولیس کا کہنا نہ مانا تو اس نے لاٹھی چلا دی۔ لوگ وہاں سے تو ہٹ گئے لیکن کھڑے اب بھی وہیں ہیں۔"

"بے وقوف ہیں۔"

مہمان خانے کے باغ سے پہلی آتش بازی آسمان کی طرف بلند ہوئی۔ پھر ایک اور۔ پھر ایک اور۔ یہ آتش بازیاں اوپر جا کر پھٹ جاتی تھیں اور ان میں سے تین رنگ کے پتنگے نکلتے تھے۔ سبز، زرد اور سُرخ۔ فضا حسین ہو جاتی تھی۔

گاما اور مان سنگھ آتش بازیوں کا تماشہ دیکھتے رہے۔ اور چلتے رہے۔

پھر گاما بولا، "سُنا ہے کچھ گاؤں والوں نے شادیانہ دیدیا ہے۔"

مان سنگھ نے جواب دیا۔ "کل رات کے واقعہ کے بعد گاؤں والے کچھ سہم گئے ہیں۔ پولیس والوں نے ڈنڈا بازی کر کے آدھے گاؤں سے شادیانہ وصول کر لیا ہے۔ باقی آدھا گاؤں اس سختی کی وجہ سے شادیانہ دینے کے پہلے سے بھی زیادہ خلاف ہو گیا ہے۔ اس لئے پولیس کی سختی اور بڑھ گئی ہے اور اب تو وہ عورتوں کی بے عزتی بھی کرنے لگے ہیں میں بھی اس ڈر کے مارے آج صبح شادیانہ دینے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن جب میرے لڑکوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے اور مجھے پکڑ کر کھیت میں گوڈی کے لئے لے گئے۔"

گاما ہنسنے لگا۔

"یار، مان سُوں، تو ہے ڈرپوک۔ کل رات جب پولیس نے پنچائت پر ڈنڈے برسانے شروع کئے تو بھاگ کر نیم پر چڑھ گیا اور میں حیران ہوں کہ تیجا سیاں کو یہ خیال کیسے آیا۔ کہنے لگا۔ لاٹھیاں چھین لو۔ بھئی بڑے تگڑے ہیں ہمارے لڑکے۔ منٹوں میں پولیس والوں سے لاٹھیاں چھین لیں۔ اور پولیس والے تتر بتر۔ اور تو نیم سے نیچے اُتر آیا۔"

اور گاما پھر ہنسنے لگا۔

مان سنگھ بولا۔ "یار گھر جا کر میری بُری گت ہوئی۔ تیجا سیاں پہلے تو میری بزدلی پر خفا ہوا۔ پھر چاروں اس قدر ہنسے کہ میں زمین میں گڑ گڑ گیا۔ اس کے بعد وہ تیری دلیری کی تعریفیں کرنے لگے کہ اگر تو لوگوں کو ہاتھ اُٹھانے سے نہ روکتا تو گاؤں کے جوان لڑکے پولیس والوں کی بوٹیاں کر دیتے۔ اور پھر وہ دلاور خاں کو یاد کرنے لگے۔"

گاما ہنسی بند ہو گئی۔

مان سنگھ نے کہا۔ "جب سے ہمارے گاؤں میں یہ گڑبڑ شروع ہوئی ہے۔ گاؤں کے جوان لڑکے دلاور خاں کو بہت یاد کرنے لگے ہیں۔"

گاما نے کوئی جواب نہ دیا۔

اگر گاؤں کے جوان لڑکے دلاور خاں کو یاد کرنے لگے ہیں تو گاما کو کیا۔ گاما اب دلاور خاں میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ گاما دلاور خاں میں کوئی دلچسپی کیوں لے

دلاور خاں نے گامے کے لئے کیا کیا ہے۔ وہ تو اس کے لئے مستقل تکلیف کا باعث بنا رہا ہے۔ اس نے اسے رات دن محنت کر کے بھوکا نہ مرنے دیا، اسے تک پہنچایا تھا۔ پھر اس نے اس کے بی اے کے امتحان کا داخلہ دینے کے لئے لالہ لال چند سے پچاس روپے قرضہ لیا تھا۔ پھر وہ خود داخلے کی فیس لے کر پولوک پور گیا تھا۔ اور ہوسٹل کے دروازے کے سامنے ایک لڑکے سے اس کی یہ گفتگو ہوئی تھی۔

"دلاور خاں کا کمرہ کون سا ہے، بیٹا؟"

"کون دلاور خاں بابا؟ دلاور خاں دیوانہ؟"

"نہیں دیوانہ نہیں۔ دلاور خاں۔"

"یہاں ایک لڑکا دلاور خاں دیوانہ رہتا ہے۔ سامنے والے کمرے میں۔ وہ جہاں تالا لگا ہے۔"

"کہاں گیا ہے وہ؟"

"آپ اُسے کیسے جانتے ہیں بابا؟"

"وہ میرا بیٹا ہے۔"

"اوہ! معاف کیجئے۔ اندر تشریف لے آیئے۔"

"بیٹا، مجھے دلاور خاں سے ملا دو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اس کو نہیں مل سکیں گے۔"

"کیوں؟"

"وہ جیل میں ہے۔"

گامے کے بدن پر رونگٹے رینگنے لگے تھے۔ وہ وہیں زمین پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ دلاور خاں کو مزدوروں کی ایک ہڑتال کرانے کے جرم میں کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ اور جب ہڑتال نے بلوے کی صورت اختیار کر لی تھی تو اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ لڑکا جس کا نام بچپن میں دلاور خاں تھا جوان ہو کر دلاور خاں دیوانہ بن گیا تھا۔ دیوانہ! اس نے سوچا کہ جیل میں جا کر اسے دلاور خاں کو بتانا چاہیے کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ وہ بالکل دیوانہ ہو گیا ہے۔

وہ اُٹھا اور لڑکوں سے بولا۔ "مجھے جیل تک پہنچا دو۔"

اور اس وقت شہر کی طرف سے ایک لڑکا آیا اور اس نے بتایا کہ دلاور خاں دیوانہ جیل سے بھاگ گیا ہے۔

اور اس وقت سے لے کر اب تک معلوم نہیں دلاور خاں دیوانہ کہاں ہے۔ کہیں بھی ہو۔ گامے کو کیا۔ گامے کو اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ گامے کو اب اس میں کوئی دلچسپی کیوں لے۔

وہ چپ چاپ مویشیوں کے پیچھے گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا۔

گامے کی خاموشی کو دیکھ کر مان سنگھ کو خیال آیا کہ اس نے غلطی کی۔

شام کے سائے گہرے ہو گئے۔ آتش بازیوں کے رنگ زیادہ شوخ ہو گئے۔ مہمان خانے سے شادی کے بینڈ کی ہلکی ہلکی آواز آنے لگی۔

ایک پگڈنڈی سے لالہ لال چند گامے اور مان سنگھ کے ساتھ آ کر مل گیا۔

"سلام، چودھری غلام محمد جی۔ ست سری اکال، سردار مان سنگھ جی؟"

"سلام!"

"ست سری اکال؟"

"مان سنگھ جی، تیجا سنگھ پولیس سے جھگڑ رہا تھا۔"

مان سنگھ گھبرا گیا۔ "کیوں، لالہ جی؟ کیا بات تھی؟"

لالہ لال چند نے کہا۔ "اللہ بخش شادیانہ دینے کے لئے نکلا تو تیجا سنگھ نے کہا۔ چاچا اللہ بخش، تو پنچائت کے فیصلے کی خلاف ورزی کر رہا ہے پولیس کے سپاہیوں نے تیجا سنگھ کو کمیسوں سے پکڑ کر دو تھپڑ مارے اور اللہ بخش نے حوالدار کو شادیانہ دیدیا۔ پولیس چلی گئی تو اللہ بخش کا بیٹا فتح محمد آیا۔ جب تیجا سنگھ نے اس کو سارا حال سنایا تو فتح محمد نے اپنے باپ کو بہت گندی گندی گالیاں دیں۔"

مان سنگھ نے گھبراہٹ میں پوچھا۔ "لالہ جی، زیادہ تو نہیں مارا پولیس نے تیجا سیاں کو؟"

لالہ لال چند نے جواب دیا۔ "نہیں بس دو تھپڑ مارے تھے۔"

کچھ دیر تک تینوں چپ چاپ مویشیوں کے پیچھے چلتے رہے۔

آخر لالہ لال چند نے کہا۔ "مان سنگھ جی۔ ہم نے خواہ مخواہ حاکموں سے جھگڑا مول لے لیا ہے۔ میرا خیال ہے دیدینا چاہیئے ہمیں شادیانہ۔ کیوں چودھری غلام محمد جی؟"

گاما بولا۔ "پنچائت کی مرضی ہے۔ لالہ جی۔ پولیس نے پنچائت پر ڈنڈا اٹھا کر اس کو بہت نا راض کر دیا ہے ـــــ"

لالہ لال چند نے بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن اب اجی کچھ نہیں بگڑا چودھری جی۔ آپ جیسے اور سردار مان سنگھ جیسے سیانے ذرا اشارہ کر دیں تو سارا گاؤں تیار ہو جائے شادیانہ دینے پر۔ آخر کیا فائدہ ہے۔ ذرا سی بات پر سارے گاؤں کی بے عزتی ہو رہی ہے۔ آج رات کو پنچائت کر کے سب کو سمجھا دو۔ جو دے سکتے ہیں وہ تو دے ہی دیں گے جن کے پاس روپیہ نہیں ہے، ان کو میں معمولی سود پر روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"لالہ جی۔ اگر صرف روپے کی بات ہوتی تو شاید اتنا جھگڑا نہ ہوتا۔ اصل میں کئی باتیں ہیں۔ میری مثال لو۔ وہ مجھ سے میراثی شادیانہ مانگتے ہیں۔ میری بیوی کا جو دو چار دن کی مہمان ہے۔ میرے لڑکے کا جو بارہ سال سے لاپتہ ہے۔ میری چار لڑکیوں کو جن کی شادی میں نے ریاست سے باہر کر دی تھی۔ بتایئے، یہ انصاف ہے۔ کل تیجا سیاں، گاؤں کے دوسرے لڑکوں سے کہہ رہا تھا۔ انصاف تو یہ ہے کہ ٹکا جی اپنی ہونے والی بیوی کو ایک رات کے لئے میرے پاس بھیج دیں تو میں سارے گاؤں کا شادیانہ دیدوں گا۔ لڑکے ہنس پڑے۔"

گاما، مان سنگھ اور لال چند بھی ہنس پڑے۔

اور یکایک دیوان ہند سنگھ کے مہمان خانے میں رنگ برنگے قمقمے روشن ہو گئے۔ گاؤں کے جوہڑ میں مختلف رنگوں کی روشنیوں کا عکس جھلملانے لگا۔ تارکول کی دھلی ہوئی سڑک اس کے عکس سے قوس قزح بن گئی۔ سڑک کے دونوں کنارے اگے ہوئے درختوں کے پتے جگمگانے لگے۔

لالہ لال چند نے کہا۔ "چلو مان سنگھ جی۔ ہم بھی تماشا دیکھ آئیں۔"

مان سنگھ بولا۔ "چلو"

لالہ لال چند نے گامے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "آیئے، چودھری جی، آپ بھی آجائیں۔ گاؤں آگیا ہے اب جانور چلے جائیں گے۔"

مان سنگھ بولا۔ "ٹھیک ہے، گا سیاں آجا۔"

گامے نے جواب دیا۔ "میں نہیں جا سکتا، مان سوں۔ بارہ کی بھینس بیمار ہے۔ نون تیل دینا ہے۔ اور گیندے کی گائے شاید گھر پہنچنے سے پہلے ہی بیا جائے۔ اور بیگو کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔"

لالہ لال چند اور مان سنگھ ایک پگڈنڈی پر ہو گئے۔

گاما انہیں دیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

لال چند سر پہ پگڑی بہت کم باندھتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ سر پہ پگڑی باندھ لے تو بودی رکھنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بودی رکھنے والوں کو تو سر کے بال بھی چھوٹے چھوٹے رکھنے چاہئیں تاکہ لوگ بودی کو بال ہی نہ سمجھیں۔ بلکہ بودی کی شان کو دوبالا کرنے کے لئے سر کو استرے سے منڈوانا چاہیئے۔ لال چند کا سر استرے سے منڈا ہوا ہے اور اس نے اپنی گیارہ انچ لمبی بودی کو بوٹ کے تسمے کی طرح باندھا ہوا ہے، اور بودی کا گچھا اس کے پیچھے اس طرح لٹک رہا ہے جس طرح اٹلی کے درخت پر چمگادڑ۔ بودی کا یہ گچھا لال چند کے کان میں ٹنکے ہوئے جنیو سے پھنس پھنس کر ڈھیلا ہو گیا ہے۔ لال چند کی بودی کی طرح اس کا جنیو بھی لوگوں کو نظر آنا چاہیئے۔ اس لئے وہ ململ کی قمیض پہنتا ہے

جس میں جنیو کا پوتر دھاگا اس کے پیٹ کے خمیرے آٹے پر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اور جب شام کو تنظر بلی کی قمیص میں سے گندگی جنیو تک نہیں پہنچتیں تو لال چند ایک پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے، پیتل کی گڑوی سے تہارت کے بعد بچا ہوا پانی پیپل کی جڑ میں پھینک دیتا ہے۔ جنیو کا ایک سرا قمیص سے باہر نکال کر کان میں ٹانگ لیتا ہے اور کہتا ہے ہری اوم تت ست۔

اور مان سنگھ سر پر پگڑی ضرور باندھتا ہے کیونکہ اگر وہ سر پر پگڑی نہ باندھے تو لوگ کہیں گے کہ یہ واہگورو جی کا خالصہ کیس نہیں رکھتا۔ واقعی مان سنگھ کیس نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ گنجہ ہے۔ اور سکھ ہو کر گنجہ ہونا ایسا ہے جیسے کار توس کے بغیر بندوق رکھنا۔ مان سنگھ اپنے بیس پچیس بالوں کو بل دے کر مکھی کے برابر گانٹھ میں باندھ لیتا ہے اور نیم کے نیچے بیٹھا اونگھتا رہتا ہے اور جب کسی کو سامنے سے آتا دیکھتا ہے تو جلدی جلدی اپنی نیلے کھدر کی پگڑی سر پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اونچی آواز میں کہتا ہے۔ ست سری اکال واہگورو جی دی پھتے!

گامے نے سوچا، جوہڑ کے پاس پہنچ کر لال چند مان سنگھ سے کہے گا۔ "سردار مان سنگھ جی، یہ گاما بڑا حرامی ہے۔ یہ ہمیں خراب کرے گا۔ ساری ریاست میں ایک ہمارا ہی گاؤں ہے جس نے شادیانہ نہیں دیا۔ اور یہ سب اس کی شرارت ہے۔ اسی کی مہربانی سے ایک بھینسا ہوا ہمارے گاؤں میں پولیس اور فوج چکر کاٹ رہی ہے۔ میری مانو تو ابھی میرے ساتھ چل کر مہاراج کو شادیانہ دے دو۔ میں کہہ دوں گا مہاراج کو کہ سردار جی گامے نے بہکا دیا تھا۔ اور اب ہم دونوں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" مان سنگھ کہے گا۔ "لالہ جی، بات تو ٹھیک ہے۔ مہاراج کے درشن بھی ہو جاتے۔ پر اس وقت میرے پاس روپے نہیں۔" اور لال چند فوراً بولے گا: "روپوں کا فکر نہ کرو، مان سنگھ جی، روپے بہت۔" پھر جب دونوں مہمان خانے کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ان کو تیجا سیاں مل جائے گا۔ وہ مان سنگھ پر خفا ہو جائے گا۔ اور کہے گا۔ "باپو، تو کدھر پھرتا ہے۔ چل گھر۔" اور مان سنگھ چپ چاپ لال چند کو چھوڑ کر گاؤں کی طرف چلدے گا۔ اور لال چند ہجوم میں پہنچ کر اللہ بخش سے کہے گا: "اللہ بخش، یہ مان سنگھ بہت ہی بے وقوف ہے۔ یہاں بے وقوف۔"

دیوان ہمندر سنگھ کے مہمان خانے میں بینڈ کی آوازیں زیادہ بلند ہو گئیں۔ مہمان خانے کی دیواروں پر بجلی کے قمقموں کا جال زیادہ واضح ہو گیا۔ روشنیوں کے اس طوفان میں مہمان خانے کا اسٹیلین ہر مرد و زن تک نظر آنے لگا۔ اور مہمان خانے کے گیٹ پر تماشائیوں کا ہجوم ان گنت ہو گیا۔

اس گاؤں نے دو دفعہ خوشی کے جشن دیکھے ہیں۔ ایک دفعہ اب: شادی کی شادی پر۔ ایک دفعہ پہلے جب لفٹیننٹ کرنل ہمندر سنگھ وکٹوریہ کراس لے کر جنگ سے واپس آیا تھا۔ پھولوں سے لدی ہوئی کاریں پھولوں سے لدا ہوا لفٹیننٹ کرنل ہمندر سنگھ پرلوک پور کے راجہ کے اور دالسرائے کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے بڑے بڑے عہدہ داروں کا ایک لمبا جلوس تھا۔ یہ جلوس اس جگہ پر آکر کھڑا ہو گیا تھا جہاں اب مہمان خانہ بنا ہوا ہے۔ یہاں لفٹیننٹ کرنل ہمندر سنگھ وی، سی کی ماں نے اپنے بہادر بیٹے کے ماتھے پر ٹیکا لگایا تھا۔ یہیں وائسرائے نے اپنے کسانوں اور مزدوروں کے چندے سے جمع کی ہوئی اسی ہزار کی تھیلی پیش کی تھی۔ اسی جگہ پر وائسرائے نے ایک پرجوش تقریر میں پرلوک پور کے راجہ کو ہمندر سنگھ جیسا سورما مہیا کرنے پر مبارکباد پیش کی تھی۔ وائسرائے نے اپنی تقریر میں بتایا تھا کہ پرلوک پور کے راجہ نے جو اٹھارہ ہزار قبائلی جنگی خدمات کے لئے پیش کئے تھے انھوں نے مختلف محاذوں پر بہادری کے حیرت انگیز کارنامے دکھائے، اور ان میں سے اکثر ترقی کر کے کرنل کے عہدے تک پہنچ گئے ہیں۔ آخر میں انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی طرف سے پرلوک پور کے راجہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور پبلک کو بتایا کہ برٹش گورنمنٹ نے پرلوک پور کے راجہ کو

مہاراج ادھیراج چھترپتی مہابھادر جیت سنگھ جی

کے، سی، ایس، آئی۔ جی، سی، آئی، ای۔ کے، سی، وی، او۔ جی، سی، بی

ایل، سی، ایم۔ جی، سی، ایم

کے خطابات عطا کئے ہیں۔ اور مہاراج ادھیراج مہابھادر جیت سنگھ جی نے اپنی جوابی تقریر میں لفٹیننٹ کرنل ہمندر سنگھ وی، سی کو اپنا مستقل دیوان مقرر کر دیا تھا۔

دیوان ہمندر سنگھ اب بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ اس لئے جب وہ پرلوک پور سے آتا ہوا کبھی کبھی اپنی کار گامے کے پاس کھڑی کر لیتا ہے تو گاما اس کو سندر نہیں کہتا۔ دیوان جی کہتا ہے۔ اور ہمندر سنگھ اس کو غلام محمد نہیں کہتا۔ گاما کہتا ہے۔

"گاسیا، کیا حال ہے؟"

"شکر ہے مالک کا، دیوان جی۔"

"دلاور خاں کا کچھ پتہ چلا ؟"

"کیا پتہ چلے گا اس کا، دیوان جی، مر کھپ گیا ہوگا۔"

"بے وقوف ہے۔ اگر اب بھی معافی مانگ لے تو ریاست میں کوئی اچھا عہدہ دے دوں۔"

اور یہ کہہ کر وہ کارکو سٹارٹ کر لیتا ہے اور گامے کو گرد کے بھونچال میں چھوڑ جاتا ہے۔ اور گاما غصہ سے لال پیلا ہو کر ایک موٹی سی گالی جھاڑ دیتا ہے۔

لیکن اگر گامے کا باپ زندہ ہوتا تو گامے کو بہت شرمندہ کرتا۔ اس نے اس کو غلام محمد بنانے کی بہت کوشش کی۔ وہ اس کو مہندر سنگھ اور گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مکتب میں پڑھنے کے لئے بھیجتا تھا۔ وہ اسے کھیتی باڑی کے ذلیل کام سے بچانا چاہتا تھا لیکن گاما مکتب میں پڑھنے کے بجائے بڑھنے جاتا تھا۔ وہ دوسری جماعت میں چار سال فیل ہو کر سب لڑکوں سے بڑا ہو گیا حتیٰ کہ مہندر سنگھ بھی جو گامے کے چار سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ آ کر مل جاتا تو کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ سب لڑکوں سے موٹا تھا۔ اور جب ایک دن ماسٹر سنت رام غلط سوال والوں کی بس قطار کو دیکھ کر انتہائی غصے میں حقہ پینے لگ گیا تو اس نے مہندر سنگھ سے کہا کہ وہ ہر لڑکے کے سر پر دو دو تھپڑ مار دے اور جب مہندر سنگھ نے ایڑیاں اٹھا کر گامے کے منہ پر تھپڑ مار دیئے تو گامے کو بہت غصہ آیا۔ کیونکہ گاما اپنے ہم جماعتوں کو اور سکول کے بیشتر لڑکوں کو کشتی میں دیکھتے دیکھتے چت کر دیتا تھا۔ اس دن چھٹی کے بعد گامے نے راستے میں مہندر سنگھ کو بالوں سے پکڑ کر اچھی طرح مارا۔ دوسرے دن ماسٹر سنت رام نے کلاس میں گامے کو کان پکڑوا کر اس کی پیٹھ پر اینٹ رکھ دی۔ گاما تھک کر بیٹھ گیا تو ماسٹر سنت رام نے اس کی کمر پر ڈنڈا دے مارا۔ گاما کر سہلانے کے لئے کان چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اینٹ ماسٹر سنت رام کے پیروں پر گری۔ ماسٹر سنت رام نے ایک دھنہ اور ڈنڈا مارنے کے لئے اٹھایا۔ گامے نے زور سے دھکا دے کر کرسی کو الٹ دیا۔ ماسٹر سنت رام کا سر چوبترے کے کونے سے ٹکرا کر لہولہان ہو گیا اور گاما ہمیشہ کے لئے سکول کی قید سے آزاد ہو گیا۔

لیکن اگر گامے کا باپ زندہ ہوتا تو گامے کو بہت شرمندہ کرتا۔ کیونکہ مندر دیوان مہندر سنگھ بن گیا اور گاما چودھری غلام محمد نہ بن سکا۔ مندر اور گامے نے دو مخالف سمتوں میں ترقی کی تھی۔ مندر دیبی۔ اسے پاس کرنے کے بعد ایک دبلا پتلا کمزور نوجوان تھا اور گاما اس وقت اردگرد کے تمام گاؤں میں مشہور دیو ہیکل پہلوان پھر پہلی عالمگیر جنگ شروع ہو گئی پرولک پور کے راجہ نے جنگ کی بھٹی میں ایندھن ڈالنا شروع کر دیا۔ گاما، مہندر سنگھ، مان سنگھ۔ اللہ بخش۔ سعادت علی اور دوسرے۔ گاما معمولی سپاہی بھرتی ہوا اور مندر و سیکنڈ لیفٹننٹ۔ لیکن گامے کے باپ کو اب بھی مندر و کے باپ کو نیچا دکھانے کی اُمید تھی۔ معلوم نہیں اسے کیوں خیال تھا کہ پڑھائی کے میدان میں مندر و جیت گیا۔ تو لڑائی کے میدان میں گاما جیتے گا پھر اس نے سُنا کہ مہندر سنگھ ترقی کر کے میجر ہو گیا ہے اور غلام محمد سپاہی کا سپاہی ہے پھر اُس نے سنا کہ مہندر سنگھ کو شکست خوردہ محاذ سے صحیح سلامت بھاگ آنے کی بہادری پر وکٹوریہ کراس مل گیا ہے اور غلام محمد نے فالس نائک کا بیج بھی حاصل نہیں کیا۔ پھر اس نے سُنا کہ غلام محمد نے اپنے کمانڈنگ آفیسر کو رات کے وقت گھی کے پیسے چور اکر بیچتے ہوئے پکڑ لیا۔ اور اس جُرم میں غلام محمد کو ایک سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ اس کے بعد گامے کے باپ کو اپنے بیٹے کی بے وقوفی اور نالائقی پر کوئی شبہ نہ رہا۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ اس دنیا سے نامراد چلا گیا۔

گاؤں بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ مگر جلدی پہنچنے کے خیال سے موسیوں نے اپنے قدم تیز کر دیئے تھے۔

گاؤں کی طرف سے اللہ بخش تیز تیز آتا ہوا دکھائی دیا۔

اور پاس آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کلام محمد، کہیں فتح محمد ملے تو اسے کہنا گھر نہ آئے۔ گھر میں تلاشی ہو رہی ہے اور پولیس اُسے پکڑنا چاہتی ہے۔"

گامے نے پوچھا۔ "کیوں ؟ کیا ہوا ؟ کیا بات ہے ؟"

اللہ بخش بولا۔ "مہاراج کا ہیروں کا ہار چوری ہو گیا ہے۔"

"پھر تیرے گھر میں تلاشی کیوں ہو رہی ہے۔ تو نے تو شادیانہ دیدیا تھا۔"

"شادیانہ دیا ہو یا نہ دیا ہو۔ تلاشی سارے گاؤں کی ہو رہی ہے۔ ویسے بھی پولیس کو فتح محمد سے ضد ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں نے شادیانہ دے دیا ہے تو اُس نے مجھے اور پولیس والوں کو بہت گالیاں دی تھیں۔"

یہ کہہ کر اللہ بخش بھاگتا ہوا چلا گیا۔

گامے نے سوچا یہ گاؤں کی بے عزتی ہے۔ شادیانہ نہ دینے کی وجہ سے ڈنڈے کھانے میں عزت تھی چور کھلا کر تلاشیاں کروانے میں بے عزتی ہے۔ بہت بڑی بے عزتی

لُٹتے لُٹتے ہماری ساری دولت لٹ گئی لیکن ہم نے اپنی عزت ہمیشہ سنبھال کے رکھی ہے کیونکہ عزت بہت بڑی دولت ہے ایک انمول موتی۔ ہیروں کے ہار سے زیادہ قیمتی۔

سردار سعادت علی خاں کی گھوڑی کی ٹاپیں سنائی دیں۔

"سلام علیکم، گامے۔"

"وعلیکم السلام۔"

"چٹھی آئی ہے شوکت کی!"

"کیا لکھا ہے؟"

"کپتان ہو گیا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"تیری دعا ہے، گامے!"

"بڑی خوشی ہوئی۔ شوکت بڑا لائق لڑکا ہے۔"

دراصل گامے کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس کی خوشی اور غم کی گہری لہریں سنجیدگی کے گہرے سمندر بن گئی ہیں۔ اسے دیوان ہمدرد سنگھ کی دولت اور اس کا شاندار مہمان خانہ مرعوب نہیں کرتا اس کو آتش بازی کے خوشنما رنگ اور بینڈ کی سُریلی آوازیں اپنی طرف نہیں کھینچتیں۔ یہ ان پڑھ سعادت علی جو فوج میں اس سے جونیئر تھا، صوبیدار میجر ہو کر سردار صاحب کہلانے لگا۔ گامے کو بُرا محسوس نہیں ہوا۔ بیگو نے متواتر ایک دوسری کے بعد پانچ لڑکیاں پیدا کیں۔ گامے کو افسوس نہیں ہوا اور جب پانچ لڑکیوں کے بعد دلاور خاں پیدا ہوا تو گامے کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ پھر اس کو اپنی پانچوں لڑکیوں کی شادیاں لالہ چند سے قرض لے کر کرنی پڑیں۔ اس نے قرض لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی اور پھر جب اس نے قرض کے بڑھتے ہوئے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اپنی تیس بیگھے زمین بھی بیچ دی تو اسے کوئی رنج نہیں ہوا۔

یہ قناعت اور برداشت گامے نے اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں پائی ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کئی پشتوں سے ایک نادار زندگی کے مانوس سائے میں سسکتے چلے آئے تھے وہ زندگی کی جنگ میں افلاس کے کند ہتھیاروں سے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے پھر ان کی شکست نے ان کے ہاتھوں پر لکھ دیا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ پھر مسلسل خاموشی مسلسل جمود، مسلسل قناعت مسلسل برداشت۔ پھر یہ گھٹیا نادار طبقوں کے خون میں حلول ہو جاتی ہیں۔ پھر گامو پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش اس کے ماتھے کی لکیروں میں لکھ دیتی ہے کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے۔ دولت نہیں ہے، اقتدار نہیں ہے، آرام نہیں ہے۔ جھوٹ نہیں ہے، ریاکاری نہیں ہے، بے ایمانی نہیں ہے۔ صرف گامو ہے، خالص گامو، گامو کے لوگ اس خالص گامو کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اس سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اس کے مشوروں کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے تجربوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جب ایک دفعہ لالہ چند کے ہاں ڈاکہ پڑ گیا تھا۔ اور رائفلوں کی مدد سے ڈاکو پچیس ہزار روپیہ لے گئے تھے اور جاتے وقت لالہ لال چند کے بہی کھاتے جن میں گاؤں والوں کے قرضے کا حساب کتاب تھا جلا کر خاک کر گئے تھے تو بہت سے قرض خواہوں نے لالہ لال چند کو رقمیں واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا اس وقت اگر جانتا تو گامو بھی ایسا کر سکتا تھا لیکن اس کی بجائے جب لال چند نے اس کے گھر آ کر اسے کہا۔ "چودھری غلام محمد جی، آپ کی طرف میرے ایک ہزار چھ سو روپے نصف جس کا آٹھ سو روپیہ ہوتا ہے واجب الادا ہیں۔ اس میں پانچ سو روپے اصل زر اور گیارہ سو روپے سود کے ہیں۔ ٹھیک ہے نا اہلہ راج" گامے نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے، لالہ جی" لال چند خوش ہو کر بولا۔ "واہ جہاراج، چودھری جی، دھن ہیں آپ۔ آپ نے سچائی کی لاج رکھ لی۔ گرپا کرکے یہاں انگوٹھا لگا دیں۔ بس۔ بس۔ بس، واہ جہاراج واہ۔ پرماتما آپ کو خوش رکھے۔" اور اب اس ایمانداری کے نتیجے کے طور پر لال چند گامے کی تیس بیگھے زمین کا مالک ہے۔

تو کیا گامے کے سینے میں دل کے بجائے اینٹ ہے؟

گامے کے سینے میں دل کی بجائے اینٹ نہیں ہے۔ گامے نے اپنے سینے میں دل کے بجائے اینٹ رکھ لی ہے۔ جب گامو نے اپنے سینے سے دل نکال کر اس کی جگہ اینٹ رکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس کے دل کا ایک کونا بہت کمزور تھا اس کمزور کونے کا نام دلاور خاں تھا۔ دلاور خاں کو اس نے بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھا کر بی۔ اے تک پہنچایا تھا۔ وہ دلاور خاں کو ایک بڑا آدمی بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے یہ خواہش اپنے باپ سے وراثت میں پائی تھی۔ اس لئے یہ خاصیت، قناعت اور برداشت کی ان خاصیتوں سے جو اس نے اپنے آباؤ اجداد سے پائی تھیں، زیادہ واضح اور زیادہ طاقتور تھی۔ صدیوں کی نادار اور غلام زندگی انسانوں میں دو قسم کے جذبے پیدا کرتی ہے

ایک تو اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تمنا۔ دوسرے اس سے سمجھوتہ کر لینے کی خواہش۔ یہ دونوں جذبے ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ پہلا جذبہ اپنے ماحول سے نفرت کرنے پر مجبور کرتا ہے اور اس سے نکل کر کسی بہتر ماحول میں داخل ہونے کی تڑپ پیدا کرتا ہے یہ جذبہ زندگی اور زندگی کے لئے جد وجہد سے کام لینے کا سبق سکھاتا ہے اور جرأت کا سرچشمہ ہے۔ دوسرا جذبہ شکست کا اعتراف ہے اور قناعت اور برداشت کا درس دیتا ہے۔ قناعت اور برداشت انسان کو زندگی کی اصل لذتوں سے بے پروا کر کے ایک مرنجان مرنج درویش بنا دیتے ہیں۔ مرنجان مرنج درویش صدیوں تک زندگی سے محروم رہ کر اس سے انتہائی بے پروائی سے پیش آتا ہے اور اس طرح زندگی کی توہین کر کے اس سے انتقام لیتا ہے ان دونوں جذبوں میں سے ایک وقت میں ایک جذبہ انسان میں کام کرے تو وہ جذبے کی کمی بیشی کے لحاظ سے دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام کر گذرتا ہے۔ دقت اس وقت پیش آتی ہے جب دونوں جذبے ایک وقت میں ایک انسان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ گامے میں یہ دونوں جذبے ایک وقت میں جمع ہو گئے تھے۔ اس نے اس ماحول سے بھاگ نکلنے کی خواہش اپنے باپ سے پائی تھی۔ اور قناعت اور برداشت اپنے آبا و اجداد سے۔ اس لئے ماحول سے بھاگ نکلنے کی خواہش قناعت اور برداشت سے زیادہ طاقتور تھی۔ لیکن چونکہ وہ خود اس ماحول سے بھاگ نکلنے کے قابل نہ تھا۔ اس لئے اس نے اپنے لئے قناعت اور برداشت چن لئے اور دلاور خاں کے لئے اس ماحول سے فرار۔ اس لئے اس نے اپنا سارا اثاثہ لگا کر دلاور خاں کو بی اے تک پہنچایا۔ لیکن دلاور خاں بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی گامے کو منجھدھار میں چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ اس وقت سے لیکر اب تک گاما قناعت اور برداشت کی مدد سے اپنی اصلی خواہش کا گلا گھوٹنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور آخر اس نے اپنے سینے سے دل نکال کر باہر پھینک دیا۔ اور اس کی جگہ اینٹ رکھ دی۔

لیکن گامے کے سینے میں اینٹ نہیں ہے، دل ہے، ابھی جب سردار سعادت علی خاں نے شوکت کے کپتان ہونے کی خوشخبری سنائی تھی تو اس کی آنکھوں کے سامنے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے آ گئے تھے ایک کا نام شوکت علی تھا دوسرے کا دلاور خاں، وہ دونوں اسکول جانے لگے تھے۔ پھر وہ بڑے ہو گئے کالج میں داخل ہو گئے شوکت علی بی اے پاس کر کے آرمی میں بھرتی ہو گیا اور ترقی کرتے کرتے کپتان بن گیا۔ دلاور خاں بی اے پاس کرنے کی بجائے جیل میں چلا گیا اور پھر وہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ گاما بیگو کے سرہانے بیٹھ کر کہنے لگا۔ "بیگو تو تو پگلی ہے پہلے بھی تو پگلی تھی تو نے دو بیٹے اور تین بیٹیاں مرنے میں، وہاں دلاور بھی ہی" پھر گامے کا باپ منظر آیا اور بولا "یہ جھوٹ ہے۔ یہ دھوکہ ہے۔ تو ہار گیا ہے۔ ہمیشہ رستم جیت گیا ہے۔ دلاور خاں ہار گیا ہے۔ شوکت علی جیت گیا ہے۔" گاما چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

گاما چپ چاپ گردن جھکائے مویشیوں کے پیچھے جا رہا تھا۔

سردار سعادت علی خاں نے کہا۔ "تیرے لڑکے نے تجھے بہت دھوکہ دیا ہے گامے۔"

گاما بولا۔ "چھوڑ یار۔ وہ مرد دو جیسا ہوا ویسا نہ ہوا۔"

"میں صرف یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ ہوتا تو کرم دین اتنی جرأت نہ کرتا۔ آج اس نے مار مار کے بھاتی کا برا حال کر دیا۔ میں نہ پہنچتا تو وہ شاید اسے مار ہی ڈالتا۔"

"کب؟ کیا ہوا تھا؟"

"آج دوپہر کو میں بیگو کو دیکھنے گیا تھا۔ میرے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے وہ بھاتی کو لینے کے لئے آیا تھا۔ بھاتی بولی۔ ماں بیمار ہے، وہ نہیں جا سکتی کرم دین کہتا تھا کہ وہ اسے ضرور لے کر جائیگا۔ کیونکہ وہ ڈرتا ہے کہ اس کی ماں کی تیمارداری نہیں اسے مل نہ لگ جائے اس پر بھاتی کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگی وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی مر جائے گی اس کے ساتھ نہیں جائے گی اس پر کرم دین نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ پھر بیگو کے اور میرے سمجھانے پر بھاتی روتی روتی کرم دین کے ساتھ چلی گئی۔"

"چلی گئی بھاتی؟"

"ہاں۔"

گاما اداس ہو گیا۔ بھاتی گامے کی سب سے چھوٹی اور سب سے لاڈلی بیٹی ہے۔ چار بیٹیوں کی شادیاں تو ریاست سے باہر دور دور کر کے بھاتی کی بہت اوپر بڑھ گئی تھی اس لئے اس کی شادی دور کر کے گامے اور بیگو کو اس کی جدائی گوارا نہ ہوئی وہ پاس کے ایک گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کی بڑی نہیں دور اور غریب ہونے کی وجہ سے اپنے ماں باپ کو ملنے بھی نہیں آ سکتیں۔ بھاتی تو پیدل چل کر ہی آ جاتی ہے اگر کرم دین نہیں آنے دیتا تو لڑ کر اکیلی ہی آ جاتی ہے اور ساری ساری رات اپنی بیاہ ماں کے سرہانے بیٹھی رہتی ہے۔ آج بیگو گھر میں اکیلی پڑی ہوگی۔

"اچھا گامیا، سلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

سردار سعادت علی خاں چلا گیا۔

گاؤں آگیا۔ موتیسی گلیوں میں گھس کر اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئے۔

گاما اکیلا رہ گیا۔

گاؤں کی بیرونی دیوار، مہمان خانے کی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ اس کے ایک طرف ناچ، شراب اور گانا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف اندھیرا، بھوک اور بیماری سہمے بیٹھے تھے۔ ایک طرف بینڈ بج رہا تھا دوسری طرف تلاشیاں ہو رہی تھیں۔ سڑک کے پار ملکن کے گھنے سائے میں گامے کا کچا کوٹھا چھپا کھڑا تھا۔ اس میں بگو اکیلی پڑی تپ دق میں جل رہی تھی۔ اور کرم دین پھاتی کو لے گیا تھا۔

گامے نے دُور سے تیجا سنگھ کو آتے دیکھا اور اسے پاس بلا کر کہنے لگا۔

"تیج بیٹے! ذرا گیند وے کہ دینا کہ گامے آدھے گھنٹے میں بیا جائیگی۔ اور بارُو سے ہوں دینا کہ نون تیل تیار کرے۔ میں بگو کو دیکھ کر ابھی آتا ہوں۔"

تیجا سنگھ نے جواب دیا: "چاچا، مجھے تو فرصت نہیں۔ میں تیرا پیغام کسی کے ہاتھ بھیجا دوں گا۔"

اور وہ چلا گیا۔

جوہڑ کے کنارے گاما اپنے کچے کوٹھے کی طرف چل دیا۔ اس کے کچے کوٹھے پر پکین کے گھنے سائے پڑے ہوئے ہیں۔ جند رنگھ کے مہمان خانے کی روشنیوں نے ان سایوں کو لمبا کر دیا ہے۔ اور یہ سائے بڑھ کر گامے کے دماغ کے اُفق تک پہنچ گئے ہیں۔ اور گامے کے دماغ کا اُفق تاریک ہو گیا ہے۔

جب گاما سڑک عبور کر رہا تھا اس نے اپنے دماغ کے تاریک اُفق میں سے ایک عجیب چیز دیکھی۔ سڑک کے ایک کنارے پر مہمان خانے کی رنگین روشنیوں کی زد میں ہیروں کا ہار پڑا جگمگا رہا تھا۔ اس نے ہار کو اٹھا لیا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اور اس نے سوچا کہ مہاراجہ اپنا ہار واپس لے کر کہے گا۔ "اپنا انعام مانگ"۔ میں کہوں گا۔ "مہاراج، میرے گاؤں میں تلاشیاں اور گرفتاریاں بند کر دی جائیں اور ریاست سے شادیانے کی رسم ہٹا دی جائے۔" اس طرح اس کے گاؤں کی لٹی ہوئی عزت واپس مل جائے گی۔ اور شاید اس طرح غریبوں کے دن پھر جائیں گے۔

گامے نے محسوس کیا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے اسے فوراً مہاراج سے ملنا چاہیئے۔ اسے فوراً گاؤں کی تلاشیاں اور گرفتاریاں بند کروانی چاہئیں۔ اس کو اپنا کچا کوٹھا۔ بگو کی بیماری۔ گیند و کی گائے اور بارو کی بھینس، سب کچھ بھول گیا۔ وہ سیدھا مہمان خانے کی طرف چلدیا۔

لیکن جب وہ اپنے کوٹھے کے برابر آیا اس کو اپنی لاٹھی میں لسی کا برتن پر دیا ہوا یاد آگیا۔ اس نے سوچا اس کو بستی کا برتن اور چنگیر ضرور گھر پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ وہ اپنے کوٹھے کیطرف مُڑ گیا۔ کوٹھے کے صحن کا دروازہ بند تھا لیکن اس دروازے کی کنڈی اندر اور باہر دونوں طرف سے کھل سکتی تھی۔ کیونکہ اگر بھاتی اندر نہ ہو تو بیمار بگو کو خود اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑے گامے نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور صحن میں کھڑا ہو گیا۔ بائیں طرف کوٹھے کا دروازہ کھلا تھا۔ سامنے طاق میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ پچھلی دیوار میں طاق کے ساتھ والی کھڑکی کھلی تھی۔ دائیں دیوار کے ساتھ چارپائی پر بگو کا ڈھانچہ پڑا تھا اور اس کے سرہانے کے پاس دلا درخاں دیوانہ بیٹھا تھا۔

گاما سکتے کے عالم میں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

دلا درخاں نے ایک کٹوری سے بگو کے منہ میں پانی ڈالا۔ اس پر جھک گیا اور اس کے کان کے پاس بولا۔

"ماں! ماں!"

گاما ڈر گیا۔ جلدی جلدی اندر آیا اور بولا

"کیا ہوا؟"

دلا درخاں نے چونک کر پانی کی کٹوری پھینک دی۔ اور کھڑکی میں سے باہر کودنے کے لئے اُٹھا لیکن پھر اپنے باپ کو پہچان کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

گامے نے بگو کی نبض دیکھی۔ تیز چل رہی تھی بستی کا برتن لاٹھی میں سے نکال کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اور پھر بگو کی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

"کتنی دیر سے بیہوش ہے؟"

"مجھے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔"

"بہت کمزور ہو گئی ہے۔ خوشی برداشت نہیں کر سکتی۔"

اس غیر متوقع ملاقات نے گامے کو حیران کر دیا ہے۔ بارہ سال کے بعد اپنے بیٹے کو دیکھ کر اس کے دل میں جذبات اور خیالات کے ایسے ایسے طوفان برپا ہو گئے کہ اس کی زبان شل ہو گئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ہے اور جانتا ہے کہ اسے چپ چاپ نہیں بیٹھنا چاہیے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن نہیں جانتا کہ کیا کہے۔ اُسے اپنے اعصاب کی اس بے حسی پر غصہ آتا جا رہا ہے اور اس غصے نے اس کے اعصاب کو اور بھی زیادہ بے حس کر کے اُسے یہ سمجھنے سے قاصر کر دیا ہے کہ وہ اس مہم کو اپنے بیٹے کے استقبال سے شروع کر سکتا ہے وہ اپنے خالی پن کو چھپانے کے لئے بیگو کے بے حرکت چہرے کی طرف لگاتار دیکھ رہا ہے لیکن اس وقت اس کے دماغ میں وہ خیالات پیدا نہیں ہو رہے جو اس سے پہلے بیگو کی بے ہوشی کی حالت پیدا کر دیتی تھی۔ اس وقت اس کے دماغ میں بالکل کوئی خیال نہیں۔ وہ بے حس، بے حرکت، بے زبان بیٹھا ہے۔

آخر اسے اس بات کا شدید احساس ہو گیا کہ وقت بہت قیمتی ہے۔ اسے جلد کچھ کرنا چاہیئے۔ چاہے اُسے کسی غلط مقام سے آغاز کرنا پڑے۔ وہ بولا۔

"کس نے بتایا تھیں کہ تمھاری ماں بیمار ہے؟"

"مجھے آپ کے بارے میں سب خبریں ملتی رہی ہیں۔"

"اور آخر تمھیں اپنے ماں باپ پر رحم آ گیا۔"

"نہیں، مجھے میرے رحم کا جذبہ یہاں نہیں لایا۔"

"میرا مطلب ہے کہ اس بارہ سال کے عرصے میں تمھیں کبھی کبھی ہمارا خیال تو آتا ہو گا۔"

"نہیں میں بہت قدیم الفرصت آدمی ہوں۔ میرے پاس ایسے خیالات کے لئے وقت نہیں۔"

گامے کی فطری خودداری کو صدمہ پہنچا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے وہی گستاخ لڑکا کھڑا ہے جس کا بچپن جھگڑیاں۔ گالیاں اور ماریں کھا کر گذرا ہے وہ ضدی اور ہٹ دھرم لڑکا جو گامے کی کوئی بات نہیں مانتا تھا، اور اپنی من مانی کارروائیاں کرتا تھا۔ بے ادب، بدتمیز لڑکا، ماں باپ کی عزت اور ان کی محبت سے عاری۔ گامے کو غصہ آ گیا۔

وہ بولا، "پھر تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

دلاور خاں نے جواب دیا۔ "میں یہاں آپ سے ملنے کے لئے نہیں آیا۔ مجھے آج اس گاؤں میں ایک ضروری کام ہے۔"

یہ اور بھی تلخ آمیز بات ہے۔ دلاور کی جارحانہ انداز کی باتیں کرنے کی عادت نہیں گئی۔ دلاور اپنا مقصد بیان کرتے وقت دوسرے کے جذبات کا خیال نہیں رکھتا۔ وہ سیدھی اور فوری گفتگو کرتا ہے تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور دوسرے کے دل میں غلط اور غیر ضروری امیدیں قائم نہ ہو جائیں۔ اس کے ذہن میں یہ بات اُبھری رہتی ہے کہ زندگی بہت تھوڑی ہے اور کام بہت زیادہ۔ اُسے باتیں نہیں کرنی، کام کرنا ہے۔ وہ آدمی نہیں مشین ہے۔

لیکن گامے کو کیا معلوم ہے کہ اس کے سامنے آدمی نہیں کھڑا مشین کھڑی ہے۔ وہ تو دلاور کی پیدائش سے لیکر اب تک اس کو اپنا بیٹا سمجھتا رہا ہے اور اس دوران میں ایک لمحے کے لئے بھی کبھی اسے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ غلطی کر رہا ہے وہ دلاور خاں کو ہمیشہ اپنی چیز تصور کرتا رہا ہے اور یہ بات اس کی سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ دلاور خاں اس کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ انسانیت کی چیز ہے۔

دلاور خاں کا جواب سن کر گامے کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھ رہا ہوں کہ تم اس گاؤں میں کیوں آئے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ تم میرے گھر میں کیوں آئے ہو؟"

"غلطی ہوئی۔ میرا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

جب دلاور خاں دروازے تک پہنچ گیا۔ تو گامے نے اُسے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

"ٹھہرو"

دلاور خاں ٹھہر گیا۔

"میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمھارا وقت ضائع نہیں کیا۔ تم نے میرا وقت ضائع کیا ہے میں مہاراجہ سے ملنے جا رہا تھا تم میرے راستے میں آ گئے۔"

دلاور خاں پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"اور میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تمھیں یہ خیال ہو گیا ہے کہ تم بہت عقلمند ہو گئے ہو تو اس غلط خیال کو دماغ سے نکال دو۔ تم وہی کتے کی دُم ہو۔ بارہ سال تک

نکی میں رہ کر بھی تمہاری دُم سیدھی نہیں ہوئی۔ بارہ سال تک دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی تم انسان نہیں بنے۔ تم جھوٹے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو کہ اس بارہ سال کے عرصے میں تمہیں کبھی ہمارا خیال نہیں آیا۔ تم نے سُنا ہوگا کہ تمہاری ماں مر رہی ہے۔ تمہاری ماں بارہ سال تک تمہارا انتظار کر کے اس دنیا سے نامراد جا رہی ہے۔ تم نے سُنا ہوگا کہ تمہارے باپ دادا کی جائداد لیا سیٹ ہوگئی ہے اور اب تمہارے ماں باپ بھوک اور غریبی میں سسک رہے ہیں۔ پھر تم ہمیں دیکھنے کے لئے آئے، لیکن تم اس قدر ذلیل، نالائق، ناکارہ، اپاہج اور بزدل ہو کہ ذمہ داریوں کے بوجھ کی شکل دیکھتے ہی تھرا گئے۔ اور فرار ہونے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جاؤ، جاؤ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔

اس نے حقارت سے دلاور خاں کی طرف پیٹھ پھیر لی۔ اور اپنی سوٹی اُٹھا کر باہر کی طرف چل دیا۔

دلاور خاں نے کہا۔ "ٹھہرئے"

گامو صحن میں ٹھہر گیا۔

"۔۔۔ اگر آپ مہمان خانے جا رہے ہیں تو میرا مشورہ ہے آپ وہاں نہ جائیں"

"کیوں؟"

اس سوال کے جواب میں دلاور خاں نے کچھ نہ کہا۔ اس لئے اس کے باپ کو اپنا سوال دہرانا پڑا۔

"کیوں روکتے ہو؟"

دلاور خاں بولا۔ "آپ کو میری مار کے پاس ٹھہرنا چاہیئے۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔"

گامو دلاور خاں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"تمہاری ماں کی حالت اچھی نہیں، تمہیں معلوم ہے؟"

"ہاں۔"

"پھر تم اس کے پاس کیوں نہیں ٹھہرتے؟"

دلاور خاں کے ماں کے ڈھانچے میں جنبش آئی۔ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بیمار نے آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد دیکھا اور مردہ آواز میں بولی۔

"پانی"

دلاور خاں دوڑ کر کٹوری میں پانی لایا۔ چارپائی کے سرہانے کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی ماں کے منہ میں پانی ڈالنے لگا۔

"دلاور بیٹے تم آ گئے؟"

"ہاں، ماں"

دلاور کی ماں نے اپنا کمزور سا ہاتھ اُٹھایا اور دلاور کے لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"کیا حالت ہوئی ہے تمہاری۔ کل صبح نہلاؤں گی"

دلاور خاں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پانی پلا کر کٹوری زمین پر رکھ دی۔ اور چارپائی کی پائینتی پر بیٹھ کر اپنی ماں کے سوجھے ہوئے پیروں کو دبانے لگا۔

گامو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

کلہاڑا لکڑی پر گرتا ہے تو لکڑی کو پھاڑ ڈالتا ہے لیکن کلہاڑا لوہے پر گرتا ہے تو کند ہو جاتا ہے۔ لوہا کمزور ہو تو لوہے کو نہیں کاٹ سکتا آگ کی مناسب مقدار موجود ہو تو لوہا پگھل جاتا ہے۔ لوہا مضبوط ہو تو لوہے کو کاٹ دیتا ہے۔ لیکن اس کو نرم نہیں کر سکتا آگ کی مناسب مقدار موجود ہو تو فولاد کی بنی ہوئی مشین پگھل کر آدمی کے گوشت کی طرح نرم ہو جاتی ہے۔

کلہاڑا لوہے سے ٹکرا کر کند ہو گیا تھا۔ لوہا آگ میں پڑ کر پگھل گیا تھا۔

گامو کو ان باتوں کا کچھ علم نہیں۔ وہ اس وقت کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ بیگو کی باتیں سن رہا ہے۔ کیا حالت ہو گئی ہے تمہاری۔ کل صبح نہلاؤں گی۔ پگلی۔ بالکل پگلی۔ اور پھر یکایک اُسے معلوم ہوا کہ وہ بھی پاگل ہے۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔

اس نے شکست خوردہ نظروں سے دلاور خاں کی طرف دیکھا اور بولا۔

"دلاور!"

دلاور خاں اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حیران ہوگیا۔

غصّے کے جذبات نے یکایک بلند ہوکر گامے کے دل کے کمزور حصّوں میں جو ایک گہرا شگاف کر دیا تھا۔ وہ اب تیزی سے بھر پور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ گامے پر رقت طاری تھی اس لئے وہ دیر تک کچھ نہ بول سکا اور بیچینی سے زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ دلاور خاں اپنے باپ کی اس نئی کیفیت سے نئے شگوفوں کا منتظر تھا۔

گامے نے کہا، "دلاور، تمھاری ماں جیت گئی۔ میں ہار گیا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے تمھارے چچا کو رام کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری باتوں نے تمھیں اور بھی پتھر بنا دیا۔ تمھاری ماں نے صرف ایک بات میں تمھارا دل جیت لیا دراصل ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو جیسی گذرنی تھی سو گذر گئی بھلیں تو ہم آرام کی زندگی گذارتے دیکھیں۔ تم بارہ سال سے مفروروں اور مجرموں کی زندگی بسر کر رہے ہو، ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ ہم خود تکلیفیں برداشت کر سکتے ہیں لیکن تمھیں تکلیف میں نہیں سکتے۔ ہم نے تمھیں بھلانے کی ہزار کوششیں کی ہیں، لیکن نہیں بھلا سکے۔ آج بارہ سال کے بعد تمھاری بیاری ماں نے تمھاری بگڑی ہوئی حالت دیکھی تو اسے تم کو نہلانے کا خیال آگیا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ نہلانے سے صرف تمھاری ظاہری حالت بدل جائے گی۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔ میں تمھاری بنیادی حالت بدلنا چاہتا ہوں۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ آج تم اس گاؤں میں ایسے موقع پر آئے ہو کہ میں تمھاری بنیادی حالت بدلنے کے قابل ہوں۔"

اس نے اپنی جیب سے ہیروں کا ہار نکال لیا اور اپنی بات کو جاری رکھا۔

"مجھے یہ ہار سڑک پر پڑا ملا ہے۔ میں اسے مہاراج کو واپس کرنے جا رہا ہوں۔ مہاراج اپنا ہار پاکر بہت خوش ہوں گے۔ اور مجھے منھ مانگا انعام دیں گے۔ میں کہونگا میرے بیٹے کو معاف کر دیا جائے۔ اور اُسے ریاست میں کوئی بڑا عہدہ دیدیا جائے۔"

دلاور خاں نے جواب دیا، "لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اب میں بچہ نہیں ہوں۔ جوان ہوگیا ہوں۔ اپنا نفع نقصان سوچ سکتا ہوں۔ اس لئے آپ کو میرے واسطے کچھ کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر تکلیف ہوئی کہ بارہ سال کی اس طویل جدائی نے آپ میں کوئی بہتر نتائج پیدا نہیں کئے۔ قدرت نے آپ کو بارہ سال کی یہ طویل جدائی عطا کر کے آپ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اس نے آپ کے جسم میں دو دل دھڑکتے دیکھے تھے۔ ایک میں سچ بولنے اور ظلم کے خلاف لڑنے کا جذبہ تھا۔ دوسرے میں خود غرضی اور اپنی مالی حالت کو بہتر بنانے کا جذبہ۔ آپ کا جسم دو مخالف جذبوں کی جنگ کا میدان تھا۔ آپ میرے فائدے کے لئے دوسرے جذبے کو پہلے جذبے پر کامیاب دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے مجھے پڑھانے لکھانے میں اپنا سب کچھ ضائع کر دیا۔ آپ مجھ میں غلامانہ ذہنیت پیدا کر کے میری صلاحیتوں سے ناجائز مالی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ لیکن انسانی اتقدار کی قوتوں کو یہ پسند نہ تھا۔ اس نے مجھ کو آپ سے چھین لیا اور اس طرح آپ کے اعلیٰ جذبات کو ادنیٰ جذبات پر فتح پانے کا سنہری موقعہ بہم پہنچایا۔ اور آپ کو اس معاملے میں کافی کامیابی حاصل ہوگئی تھی آپ نے سچائی سے کام نہ کر اور ظلم کے خلاف لڑ کر ریاست کے باشندوں میں ایک بلند مقام پیدا کر لیا ہے۔ لیکن آج مجھے آپ سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ آپ اپنے بلند مقام سے سرک کر بل زمین پر آگرے ہیں۔ یہ آپ نے بڑی شرمناک حرکت کی ہے۔ آپ کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیئے۔ بارہ سال کے بعد عرصے کے بعد مجھے یکایک دیکھ کر آپ کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں، میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ میں ریاست پر لوک پور کی آزادی کی تحریک کا ایک سپاہی ہوں۔ اور آپ میرے باپ نہیں ہیں۔ اس گاؤں میں شادیلے کے خلاف لڑنے والے سپاہی ہیں۔ اس لئے بیٹا اپنے باپ کے سامنے نہیں کھڑا۔ سپاہی سپاہی کے سامنے کھڑا ہے۔ آپ نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاکر اور ایک سپاہی کو دولت کا لالچ دیکر سپاہیانہ غلطت کی توہین کی ہے۔ آپ نے بڑی شرمناک حرکت کی ہے۔ آپ کو مجھ سے معافی مانگنی چاہیئے۔"

گامے کو پھر غصّہ آگیا۔ اس نے کہا۔ "میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ تم وہی کتے کی دم ہو۔ جو آج سے بارہ سال پہلے تھی۔ اور میں فضول تمھارے ساتھ اپنا مغز کھپا رہا ہوں۔ مجھے فوراً مہاراج سے ملنا چاہیئے۔ اور ان کا ہار واپس کر کے تلاشیاں اور گرفتاریاں بند کرانی چاہیں۔"

وہ سوٹی اٹھا کر باہر کی طرف چل دیا۔

لیکن دلاور خاں نے کوٹھے کے دروازے پر کھڑا ہو کے اس کا راستہ روک لیا۔

"آپ مہمان خانے نہیں جا سکتے۔"

مہمان خانے کی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔

گامے فکرمند ہو کر بولا۔ "میرا خیال ہے پولیس نے نہتے لوگوں پر گولی چلا دی ہے۔ مجھے جلدی جانا چاہیئے۔ میرا راستہ چھوڑ دو مجھے جانے دو۔ مہاراج کو فوراً جلدی

واپس نہ ملا تو اور خون بہہ جائے گا ؟

دلاور خاں نے کہا " مہاراجے سے زیادہ ہار کی ضرورت مجھ کو ہے۔ میری پارٹی کی مالی حالت خراب ہے۔ ہار میرے حوالے کر دیجئے "

گامے کے غصے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ گرج کر بولا۔ " میرے راستے سے ہٹ جاؤ "

دلاور خاں نے برابر کے بلند لہجے میں جواب دیا۔ " نہیں "

" میں کہتا ہوں میرے راستے سے ہٹ جاؤ "

" نہیں "

" ہٹ جاؤ ! "

" نہیں "

گامے نے اپنی سوئی اُٹھالی۔

دلاور خاں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔

عین اس وقت پولیس کا ایک جولدار چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر صحن میں داخل ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

" دلاور خاں، آپ کو قید سے فرار ہونے اور سٹیٹ کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ اور چودھری غلام محمد ہم ار کی چوری کے سلسلے میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں "

دلاور خاں کے ریوالور نے یکے بعد دیگرے پانچ فائر کئے اور پولیس کے پانچوں آدمی خاک اور خون کے ڈھیر بن گئے۔

تیجا سنگھ اور فتح محمد دوڑتے ہوئے اندر آئے۔

فتح محمد نے لاشوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ " ہم نے انہیں اندر داخل ہوتے دیکھا تو دوڑ پڑے، لیکن ہم جانتے تھے کہ دلاور خاں پر کوئی پہلے وار نہیں کر سکتا "

تیجا سنگھ نے کہا۔ " دلاور خاں، مہاراجہ، یوراج اور دیوان جی کو شوٹ کر دیا گیا ہے۔ گاؤں ہمارے قبضے میں ہے۔ مہان خانہ ہیڈ کوارٹر ہے کیپٹن شوکت سٹیٹ فورس کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہا ہے "

دلاور خاں دیوانہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ دوڑ کر تیجا سنگھ کے پاس گیا اور اسے گلے سے لگایا۔ پھر دوڑ کر فتح محمد کے پاس گیا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ اور دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

" مبارک ہو تمہیں اپنی پہلی فتح مبارک ہو لیکن ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ شروع ہوا ہے۔ چلو آگے بڑھیں۔ اور کیپٹن شوکت کی فوجوں کو گاؤں کی حدوں سے باہر روک دیں "

وہ تینوں باہر کی طرف چل دیئے۔

گامے نے کہا۔ " دلاور خاں ! "

تینوں باہر کے دروازے پر ٹھہر گئے۔ اور پلٹ کر گامے کی طرف دیکھنے لگے۔ گاما ان کے پاس آیا اور ہیروں کا ہار پیش کرتے ہوئے بولا۔

" میری طرف سے تحفہ "

" دلاور خاں نے ہار لے کر کہا۔ " شکریہ "

وہ تینوں چلے گئے۔

گاما بیگو کی چارپائی کے پاس آیا۔ بیگو کی نبض دیکھی۔ اس کے بازو اور ٹانگیں سیدھی کر دیں۔ اس کے اوپر چادر اوڑھا دی۔ پائنتی پر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں دلاور بیٹھا تھا۔ اور دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔

بڑا مکان

جوگندر ناتھ

وہ کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ اور یہاں سے وہ نیچے کی چیزیں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ نیچے سڑک پر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر تین چار عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے، اپنے اپنے بچوں کو گود میں لئے ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ایک مریل سی لڑکی کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اُن پر بھتیارے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تمباکو سے دانت صاف کر رہا تھا۔ دوسرا آئینے میں صورت دیکھ رہا تھا۔ ایک نائی بھیا کے بال انگریزی ڈھنگ سے بنا رہا تھا۔ سامنے ٹین کی دیوار پر دھوتی لٹک رہی تھی۔ دھونے کے باوجود یہ دھوتی کافی میلی اور گندی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ چیزیں، یہ لڑکے۔ یہ مرد اور یہ عورتیں تو وہ ہر روز دیکھتی تھی۔ ان سب سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ یہ روزمرہ کی زندگی تھی۔ اکثر سڑک پر سے ٹرک گذرتے تھے۔ سائیکل والے سائیکل پر بیٹھے گذر جاتے تھے۔ ٹھیلے والے آواز کستے ہوئے نکل جاتے تھے۔ مداری۔ تماشہ دکھانے والے۔ رسوں پر ناچنے والے اس سڑک پر آکر تماشہ دکھاتے۔ پیٹ کو دکھا دکھا کر لوگوں سے پیسے لیتے اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ لیکن اس کی نگاہ ایک ٹرک پر جمی ہوئی تھی جس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ اکثر ٹرکوں پر سامان لادا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کبھی کبھی اس سڑک پر سے گندگی سے بھرے ہوئے ٹرک بھی گذرتے تھے۔ اور وہ اکثر ناک پر پلو رکھ لیتی تاکہ بدبو سے طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ لیکن اس ٹرک میں یہ تُو نہ تھی۔ گندگی کا سامان نہ تھا بلکہ اس کی سہیلی کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ اس کی سہیلی ساتھ والے کمرے میں رہتی تھی۔ کافی سالوں کے بعد اس کی سہیلی اس کمرے کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ سنا گیا تھا اس نے ایک بہت بڑا مکان لے لیا ہے۔ ٹرک پر چیزیں لادی جا رہی تھیں۔ پہلے کچھ ٹرنک رکھے گئے۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل۔ ریڈیو۔ سائیکل۔ پلنگ۔ اس طرح مختلف چیزیں رکھی جا رہی تھیں۔ صبح صبح اس کی سہیلی جا رہی تھی۔ اسے بہت دُکھ تھا۔ دونوں اکثر مل بیٹھ کر باتیں کیا کرتیں تھیں۔ دونوں نے عملی زندگی اکٹھی شروع کی تھی۔ تجلی تہ سے یعنی اکسٹرا بن کر فلموں میں کام کرتی تھیں اور وہ تو ابھی تک اکسٹرا میں کام کر رہی تھی۔ ان دس سالوں میں اس کی زندگی نہ بدلی تھی۔ زندگی کی وہی جدوجہد۔ راشن اور کپڑے کی وہی لڑائی۔ کبھی روپے ہیں کبھی نہیں۔ کبھی بہن بیمار ہے، تو کبھی باپ۔ زندگی میں وہی کشمکش تھی۔ نہ جانے یہ جدوجہد کب ختم ہوگی۔ کب اچھے دن آئیں گے ـــــ کبھی کبھی وہ سوچتی!

وہ شانو کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ اس کی پیاری سہیلی تھی۔ اسے شانو کا وہ وقت بھی یاد تھا جب شانو کے پاس روپے نہ ہوتے تھے اور وہ اس سے روپے مانگا کرتی تھی۔ راشن کے لئے۔ یہ روپے اس نے کبھی واپس نہ کئے تھے۔ اور نہ ہی اس نے کبھی شانو سے روپے مانگے۔ اکثر شانو اس کی چپل پہن لیا کرتی تھی۔ ساڑھیاں مانگ کر لیجاتی تھی۔ کلپ پوڈر۔ سینو آکر لگایا کرتی تھی۔ اور اس طرح اکثر وہ دن رات اس کے ساتھ گذارہ کرتی تھی۔ لیکن ادھر دو سالوں میں اس کی کایا پلٹ گئی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس کا کمرہ سج گیا۔ صوفہ سٹ، ریڈیو، پلنگ، اچھے اچھے برتن، بجلی کا پنکھا، ساڑھیاں، چادریں، رنگین پردے اور اب تو نوکر بھی گھر میں کام کرنے لگے تھے حال ہی میں اس نے چھوٹی گاڑی خرید لی تھی۔ ان باتوں کے باوجود شانو اس کے کمرے میں آتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی۔ اس کی سہیلی میں ایک نئی شان۔ ایک نیا وقار، ایک نئی آن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ کہاں وہ دن رات گھر میں رہتی تھی۔ لیکن اب دن رات شوٹنگ، کبھی اس اسٹوڈیو میں کبھی اُس اسٹوڈیو میں۔ کبھی دن کو شوٹنگ کبھی رات کو شوٹنگ۔ اب تو شانو کو پل بھر کے لئے فرصت نہ ملتی تھی۔ وہ اس بات کو ضرور محسوس کرتی۔ لیکن اس نے اپنے دکھ کا اظہار شانو سے نہ کیا۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی قسمت میں شاید یہی کچھ لکھا تھا۔ وہ شانو کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ اس کی طرح بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کر سکتی تھی۔ ڈائیلاگ نہ بول سکتی تھی۔ کیونکہ اسے لکھنا پڑھنا نہ آتا تھا۔ اگر شانو نے ترقی کی تھی تو اسے حسد نہ کرنا چاہیئے شاید دُنیا کا یہی قاعدہ ہے کہ ایک ذہین آدمی دوسرے آدمی سے جلدی ترقی کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اس میں کیا کمی تھی۔ کیا وہ اس لئے زندگی میں ترقی نہ کر سکی کہ وہ شانو کی طرح خوبصورت نہ تھی اس کے جسم میں وہ دلکشی نہ تھی، وہ کشش نہ تھی، وہ بانکپن نہ تھا۔ جو شانو کے جسم میں تھا۔ اور شاید اسی لئے اسے فلموں میں رول نہ ملتے تھے اسے یہ جان کر بہت دُکھ ہوتا کہ وہ ساری عمر اکسٹرا کی اکسٹرا ہی رہی اور ایک سال کے بعد دوسرا سال چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کتنی بار سوچا تھا کہ وہ ایک ریڈیو خرید لے لیکن روپوں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ خرید سکی۔ آج کل اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دم پھول جاتا تھا شاید اس کا دل کمزور ہو گیا تھا۔ اکثر اسے ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں یکایک اس کے دل کی دھڑکن بند نہ ہو جائے۔ اکثر رات کو ڈراؤنے خواب آتے اور وہ صبح چونک کر اُٹھتی اور دن بھر یہ

خواب جوتوں کی طرح تعاقب کرتے۔ وہ موت سے بہت ڈرنے لگی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا اس کا بھائی تپ دق کے موذی مرض سے مرگیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا کافی علاج کرایا لیکن وہ چل بسا۔ اور آج کل جب کبھی اس کے سینے میں ہلکا سا درد اُٹھنے لگتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہیں اسے تپ دق تو نہیں ہوگیا۔ اگر اسے تپ دق ہوگیا تو اس کا علاج کون کرائے گا۔ اس کی دیکھ بھال کون کریگا

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ نیچے سے کسی نے آواز دیا۔ سامان ابھی تک رکھا جا رہا تھا۔ ابھی تک شانو اس سے ملنے نہ آئی تھی۔ کیا جانے سے پہلے وہ اس سے ملنے بھی نہ آئے گی۔ شاید وہ نہ آئے۔ اب تو شانو امیر ہوگئی تھی۔ اب وہ اس سے کیوں ملنے آئے گی۔ آج کل اس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا اور کچھ فلمیں کم بنتی تھیں۔ اور فلموں میں کام کم ملتا تھا ــــــ عمر کے بڑھنے کی وجہ سے وہ کچھ موٹی ہوگئی تھی۔ اور وہ اب لڑکی نہ دکھائی دیتی تھی۔ جب کبھی کالج کی لڑکیوں کا سین آتا، تو اسے اس سین میں کم بلایا جاتا۔ اگر وہ اسی رفتار سے موٹی ہوتی گئی تو کچھ مہینوں کے بعد اسے اکسٹرا میں بھی کام نہیں ملے گا۔ پھر وہ کیا کرے گی۔ کہاں سے کھائے گی۔ پیٹ کس طرح بھرے گی مکان کا کرایہ کہاں سے ادا کیا جائے گا۔ کچھ دن ہوئے ایک اکسٹرا سپلائر نے اُسے بوڑھی اماں کا رول کرنے کے لئے کہا تھا۔ اسے یہ بات سُن کر بہت غصہ آیا تھا۔ کیا وہ واقعی بوڑھی ہوگئی تھی۔ کیا وہ جوان لڑکیوں کے رولوں کے لئے کھڑی نہ ہوسکتی تھی۔ کیا وہ ہیروئن کے رول کے لئے انتخاب نہ کی جاسکتی تھی۔ اگر ہیروئن نہیں تو سائڈ ہیروئن ہی سہی۔ اور آج کل کی ہیروئن کونسی سدا جوان رہنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ بس میک اپ کرلیتی ہیں۔ چہرے کی ساری بدصورتی کو پوڈر میں چھپا لیتی ہیں۔ چھاتیوں کو ابھارنے کے لئے تنی ہوئی باڈی پہنتی ہیں۔ اگر بال لمبے نہیں ہوتے تو بازار سے خرید کر اپنی دُبلی پتلی چوٹیوں میں جڑ لیتی ہیں۔ اگر قد چھوٹا ہوتا ہے تو اونچی ایڑی کے سینڈل پہن کر اپنے لمبے قد کا مظاہرہ کریں گی۔ اللہ رکھی کے سلسلے میں تو اس نے عجیب وغریب باتیں سُنی تھیں۔ سنا گیا تھا کہ جوانی کے دنوں میں اللہ رکھی کی خوب بیچ دیکھ تھی۔ جدھر جاتی تھی لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے جسم میں وہ رعنائی تھی کہ پھول اسے دیکھ کر شرما جائے۔ آنکھوں میں وہ چمک تھی کہ لوگ دل تھام کر رہ جاتے اور چال میں وہ سرکشی تھی کہ لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن اب تو وہ دُبلی پتلی ہوگئی تھی۔ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ عورتیں تو خاص طور پر جلدی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ اللہ رکھی کا عالم شباب میں کیا زمانہ تھا کیا کچھ نہ تھا اس کے پاس۔ جب پہلی بار الفریڈ کمپنی کی فلم میں ہیروئن بن کر آئی تو ساری فلمی دُنیا میں تہلکہ سا مچ گیا۔ لیکن کچھ سالوں کے بعد وہ کیا سے کیا ہوگئی تھی۔ آج کل وہ ایک سستے قسم کے ہوٹل میں رہتی تھی۔ جس کا کرایہ اس نے چھ مہینے سے ادا نہیں کیا تھا۔ کل وہ اسے ملی تھی۔ کہنے لگی "کہیں کام نہیں ملتا۔ بوڑھیا ہونے کے باوجود اُسے میک اپ کرنے کی خواہش تھی۔ سارے چہرے پر لالی لگا لیتی۔ لیکن اس پوڈر اور سُرخی کے باوجود وہ تپ دق کی مریضہ معلوم پڑتی تھی۔ آج کل وہ فلموں میں ماں کا رول کرتی تھی۔ کہاں وہ فلم کی مشہور ومعروف ہیروئن، کہاں ماں کا رول۔ آج کل تو ماں کا رول بھی نہ ملتا تھا۔ اللہ رکھی کے گال اتنے پچک گئے تھے کہ وہ ایک بھوتنی دکھائی دیتی تھی۔ کہنے لگی "زبیدہ پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آج کل جس سے ملتی ہوں کہتا ہے۔ اللہ رکھی تمہارے گال کیوں پچک گئے ہیں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاتی ہو۔ تمہیں کس بات کا دکھ ہے۔ ذرا بنک کے روپوں کو ہوا لگاؤ۔ لیکن یہ لوگ نہیں جانتے کہ چھ مہینے سے کرے کا کرایہ نہیں دیا۔ ہوٹل کے مالک نے ترقی کرالی ہے۔ یہ کمرہ مجھے چھوڑنا پڑے گا۔ ادھر کام بالکل نہیں ملتا۔ ڈائریکٹر سیدھی طرح بات نہیں کرتے۔ کہاں موٹروں میں لے گھومتے تھے۔ اب سٹوڈیو میں جاؤ تو بیٹھنے کے لئے کرسی نہیں دیتے۔ چائے تک کو نہیں پوچھتے۔ پہلے وہ میرے گھر آتے تھے اب میں ان کے گھر جاتی ہوں لیکن دیکھے دیکھ کر دروازے بند کرلیتے ہیں۔ اگر کوئی دروازے کے اندر آنے دیتا ہے تو دیکھتے ہی ماتھے پر سو بل پڑ جاتے ہیں۔ نئی نئی چھوکریاں آگئی ہیں اب زمانہ ان کا ہے ہم بوڑھی عورتوں کو کون کام دیتا ہے۔ میں نے بُرا کیا جو روپوں کو بغیر سوچے سمجھے خرچ کر دیا۔ اب ہر شخص یہی کہتا ہے کہ تمہارے چہرے پر گوشت نہیں رہا۔ گال پچک گئے ہیں۔" وہ زبیدہ کو ایک کونے میں لے گئی۔ اور کہنے لگی۔ یہ طریقہ دیکھ لو۔ آج کل تم موٹی ہوتی جارہی ہو۔ لیکن جسم کا کیا ہے آج ہے کل نہیں ہے وہ اس نے منہ سے فوراً ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے نکالے۔ اور کہنے لگی۔ دیکھو میرا چہرہ۔ اس کا چہرہ دیکھ کر زبیدہ کانپ گئی۔ سارے بدن میں ایک جھرجھناہٹ سی پیدا ہوئی۔ اللہ رکھی کے دونوں گال بالکل ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ آنکھیں اور اندر دھنس گئی تھیں۔ اور اللہ رکھی آن واحد میں اتنی بدصورت اور بھیانک دکھائی دے رہی تھی جیسے اس کی روح ایک بھوت کی صورت میں اس کے سامنے کھڑی ہوگئی ہو۔ زبیدہ کا دل ڈوبنے لگا۔ اور اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ہائے یہ تمہیں کیا ہوگیا۔ تمہارے گال تو بالکل پچک گئے۔ ابھی تو تھوڑے تھوڑے بھرے ہوتے تھے۔ اللہ رکھی نے ڈبل روٹی کے ٹکڑے منہ میں رکھ لئے ایک ٹکڑا ایک گال کی طرف دوسرا ٹکڑا دوسرے گال کی طرف۔ اور دونوں ٹکڑے رکھ کر مسکرا اُٹھی۔ اس کی بے جان مسکراہٹ کو دیکھ کر زبیدہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے مردے میں جان پڑ گئی ہو۔ زبیدہ یہ دیکھ کر بولی۔ "تم تو بالکل جادوگرنی دکھائی دیتی ہو۔ اللہ رکھی نے بے جان مسکراہٹ کو اور پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آج کل کے

زمانے میں پیٹ بھرنے کے لئے انسان کو جوان بننا پڑتا ہے۔ شروع میں میں خدا پر یقین رکھتی تھی۔ لیکن اب نہیں رہا۔ نہ جانے وہ کہاں سویا ہوا ہے جو میری حالت پر رحم نہیں کھاتا اب تو مجھے یقین ہوگیا ہے کہ خدا نہیں ہے، کہیں نہیں ہے۔ کیوں تمھارا کیا خیال ہے؟" زبیدہ خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہی۔ ایک لمحہ گذر گیا۔ دوسرا لمحہ گذرا۔ اور زبیدہ بولی۔" مجھے خدا کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ لیکن ایک بات ضرور جانتی ہوں اللہ رکھی کہ یہ زندگی اچھی نہیں۔ عمر بھر محنت کرتے ہیں لیکن بڑھاپے کے لئے ایک پائی نہیں بچتی۔ کئی لوگ تو اللہ رکھی بڑا عیش کرتے ہیں۔ کاریں بھی ہیں نوکر بھی ہیں۔ راشن کے لئے روپے بھی ہیں۔ خیر اللہ رکھی یہ بتاؤ کہ یہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے منہ میں گل نہیں جاتے۔ اور منہ میں رکھ کر کیا تمھیں تکلیف نہیں ہوتی؟"

اللہ رکھی نے کہا۔" زبیدہ! پیٹ بھرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ تم ابھی جوان ہو یعنی مجھ سے کم عمر کی ہو۔ لیکن اس فلمی دنیا کا کوئی بھروسہ نہیں۔ نہ جانے کہ کل کیا ہو جائے۔ نئی لڑکیاں سب ان میں آ رہی ہیں۔ ہماری زندگی کا انحصار بھی تو ہمارے چہروں پر ہے۔ لوگ چہرے اور جسم کو دیکھتے ہیں پیسہ دام دیتے ہیں۔ عورت اس بھوک اور بیماری میں کب تک اپنے چہرے کی تازگی اور رعنائی قائم رکھے۔ خیر پچھلی باتوں کو جانے دو۔ آج بڑی مشکل سے ایک دن کا کام ملا ہے۔ جانتی ہو حبیب صاحب کو۔ دل کے بڑے اچھے ہیں۔ میری حالت کو دیکھ کر انھیں ترس آ گیا۔ یہاں جب تک کسی کو ایک دوسرے پر توس نہیں آتا وہ کام نہیں دیتا۔ میں نے سوچا کہ لو ایک دن کا کام جیسے بھر کا راشن نکل آئے گا۔"

زبیدہ یہ سوچ رہی تھی۔ اور سامنے دیکھ رہی تھی۔ اب سامان لاری میں رکھا جا چکا تھا۔ صرف مزدور سامان کو رسوں سے باندھ رہے تھے۔ زبیدہ کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر ساتھ والے کمرے میں چلی جائے۔ اور اپنی سہیلی کے گلے ملے اور کہے تم کتنی کٹھور ہوگئی ہو۔ کیا ہوا کہ تمھارے اچھے دن آ گئے۔ کیا ہوا کہ تمھارے پاس ریڈیو۔ پلنگ ٹی سٹ صوفہ سٹ اور دوسری چیزیں آ گئیں۔ لیکن میرا دل تو بڑا ہے۔ میرا سلوک تم سے کتنا اچھا تھا۔ کیا انسان کی قیمت صرف روپے سے ہوتی ہے۔ تمھیں یاد ہیں وہ دن جب تمھارے ماں باپ تمھیں مارتے تھے۔ اور تم میرے پاس آ کر روتی تھیں۔ اور میں تمھیں ہنسایا کرتی تھی۔ آج تم امیر ہوگئی ہو۔ اور مجھے بالکل بھول گئی ہو۔ میرے ساتھ والے کمرے میں رہتے ہوئے تم سے اتنا نہ ہوا کہ میرا حال پوچھ جاؤ۔ جانے سے پہلے ایک بار ملتی جاؤ۔ مانا تم ایک بڑے مکان میں جا رہی ہو۔ اب اس چھوٹے سے کمرے میں تمھارا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ زبیدہ نے پھر سوچا کہ کہیں شانو اس کی آہ پر ناک بھوں نہ چڑھائے۔ اس کے ماں باپ کہیں ادھر ادھر کی باتیں نہ کریں۔ شانو ایک دوہینوں سے ادھر نہ آئی تھی۔ ضرور جان بوجھ کر ادھر نہ آئی ہوگی۔ درست ہے۔ زبیدہ اب غریب ہوگئی تھی۔ یعنی شانو اب امیر ہوگئی تھی۔ اب روپوں کی دیوار درمیان میں حائل تھی۔

نیچے سے گاڑی کا ہارن بجا۔ زبیدہ نے جھانک کر دیکھا۔ ایک دبلا پتلا نوجوان کار سے اتر کر پاس کی کھڑکی سے ایک سفید ہاتھ ہوا میں لہرا گیا۔ ادھر سے انگلیں ہلیں۔ اور یہ نوجوان سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ یہ کس طرح کی دنیا ہے۔ وہ سوچنے لگی۔ لیکن سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے تب سے وہ کام کر رہی ہے۔ جب وہ چھ برس کی تھی کہ اس کی ماں نے اسے ایک بڑھیا کے پاس بھیجا تھا۔ وہ اس کے برتن مانجھتی تھی۔ برتن صاف کرتے کرتے اس کے ہاتھ کھردرے ہو گئے تھے۔ اور جب وہ جوان ہوئی تو اکسٹرا میں کام کرنے لگی۔ اور اب بیک اکسٹرا میں کام کر رہی تھی۔ اسے کام سے کوئی نفرت نہیں۔ بلکہ وہ دن بھر کام کر کے خوش ہوتی تھی۔ جس دن اسے کام نہیں ملتا تھا وہ بستر پر خاموش پڑی رہتی تھی۔ لیکن اتنا کام کرنے کے بعد بھی زندگی میں خوشی نہ تھی۔ مسرت نہ تھی۔ اجرت اتنی کم ملتی تھی کہ مشکل سے دو وقت پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس سے پہلے زبیدہ کی حالت کچھ سدھر گئی تھی۔ ان دنوں چیزیں سستی تھیں۔ کھانے پینے کی چیزیں آسانی سے مل جاتی تھیں۔ اناج اتنا مہنگا نہ تھا۔ اس وقت زبیدہ نے گھر کے لئے کچھ برتن خرید لئے تھے۔ سونے کی دس چوڑیاں بنالی تھیں۔ کانوں کے بندے، گلے کا ہار بنا لیا تھا۔ لیکن ان دو سالوں میں سب کچھ بک گیا تھا۔ چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں۔ کام کم ملنے لگا۔ پیٹ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سونے کی سب چوڑیاں بک گئیں۔ اور ساتھ جب بھائی بیمار ہوا تو رہی سہی سونے کی چیزیں ساہوکار کی نذر ہوگئیں۔ اب بازو بالکل ننگے نظر آتے تھے۔ جیسے موسم خزاں میں درختوں کی ٹہنیاں، ہرے ہرے پتوں کے بغیر بدصورت دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح اس کے ہاتھ، کان اور بازو، ان زیوروں کے بغیر ٹنڈ منڈ دکھائی دے رہے تھے۔ اب وہ دن بدن موٹی ہوتی جا رہی تھی۔ جسم میں ایک ڈھیلا پن، ادھیڑ موت کا ڈر، اور دیگر کمزوریاں اس کے دل و دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ عجیب سی بات تھی۔ زبیدہ نے سوچا کہ اس نے زندگی میں کسی کی برائی نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوشحال زندگی نہ گذار سکی۔ اور بڑھاپے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ بھوک، ڈر، بیماری اور بے بسی، چاروں طرف گھیرا ڈال رہی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے اللہ رکھی کا خیال آ گیا۔ کیا ایک دن اس کا حال اللہ رکھی کا سا ہو جائے گا۔ اسے بھی کام نہ ملے گا اس خیال کے آتے ہی اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آ گئی ——— نہیں۔ وہ اللہ رکھی کبھی نہ بنے گی۔ وہ اس حالت تک پہنچنے سے پہلے خودکشی کر لے گی۔

مرجائے گی لیکن منہ کے اندر ڈبل روٹی کے ٹکڑے نہ رکھ سکے گی۔ اللہ رکھی اب عورت نہ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا تھا۔ بچاری کا کیا قصور تھا حالات، وقت اور سماج نے اس کا حلیہ بدل دیا تھا۔ وہ بھوکی تھی۔ ننگی تھی۔ ایک ایک روپے کے لئے ترستی تھی۔ اللہ رکھی کا خیال آتے ہی زبیدہ شیشے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ہونٹوں پر لپ سٹک لگائی۔ اور بھویں درست کرنے لگی۔ . . . . . .

نیچے سے پھر کسی نے ہارن دیا۔ زبیدہ نے کھڑکی میں سے جھک کر دیکھا۔ وہی نوجوان اور شانو۔ دونوں اکٹھے کار کے باہر کھڑے تھے۔ نوجوان کا بازو شانو کی پتلی کمر کے گرد حمائل تھا۔ شانو نے پیچھے جھک کر دیکھا اور زبیدہ کو کھڑکی میں دیکھا۔ شانو نے جلدی سے ہاتھ ہلایا اس نے ہاتھ ہلانا چاہا لیکن اب شانو نوجوان سے مسکرا مسکرا باتیں کر رہی تھی۔ نوجوان نے ہوک کا دروازہ کھولا۔ شانو عجیب شان بے نیازی سے اندر داخل ہوئی۔ اس ہوک کے پیچھے سامان سے لدی ہوئی لاری کھڑی تھی۔ اب بلڈنگ سے کچھ عورتیں باہر سڑک پر آگئی تھیں۔ تقریباً سبھی شانو کو جانتی تھیں۔

لیکن اب شانو کی شان، عزت اور وقار اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے ان عورتوں کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ برسوں سے اس محلے اور اس کمرے میں رہتی تھی۔ اور یہ لوگ اور یہ عورتیں کئی برسوں سے اس محلے اور ان کمروں میں رہ رہے تھے۔ دن رات محنت مزدوری کرتے تھے اور ان کھولیوں میں دس دس پندرہ پندرہ آدمی رہتے تھے۔ یہ لوگ ایماندار تھے۔ ان کی بیویاں دن رات کام کرتی تھیں۔ اور اگر وقت بچتا تو پیسے کمانے کی سبیلیں سوچتیں۔ لیکن ان لوگوں نے ابھی تک ہوک کی سیر نہ کی تھی۔ ہوک خریدنے کی توفیق کس کو ہو سکتی تھی۔ اب ہوک دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ اور اس کے پیچھے ٹرک روانہ ہوا ——— اور زبیدہ سوچنے لگی۔ کیا وہ ایک دن اسی طرح ٹرک پر سامان رکھ کر ایک بڑے مکان میں جا سکے گی۔ اس نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا۔ ان کے فربہ زرد چہروں اور ان کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں اور گندے کپڑوں سے یہی سوال ابھر رہا تھا۔ کیا وہ دن آئے گا کہ ہم سب لوگ ایک بڑے مکان میں جا سکیں گے۔ جہاں کھلی ہوا ہوگی صفائی ہوگی۔ گھر میں گندگی نہ ہوگی گھٹن نہ ہوگی۔ ایک کمرے میں پندرہ انسان نہ سوئیں گے۔ ایک ہی کمرے میں کھانا پکانا، اسی میں نل، وہیں غسل خانہ، وہیں بچے جننا وہیں مل بیٹھ کر لڑنا۔ اور اسی کمرے میں زندگی کے آخری دن گذارنا۔ جہاں نہ دھوپ آتی تھی۔ صرف گندگی کی سڑاند سے دماغ بوجھل ہوجاتا تھا اور چہروں پر مردنی چھا جاتی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ہوک اور لاری نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ دور سمندر کراہ رہا تھا۔ ہوا تیز اور تند ہوتی جا رہی تھی۔ اور آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے پرواز کر رہے تھے۔ اور نیچے فٹ پاتھ پر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ بھیگے جا چکے تھے۔ اور سامنے ٹین کی دیوار پر ابھی تک ایک مسلی دھوتی ایک ننھی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔

چاندی کے تار، نئی بیاری، گالی، مائی ڈارلنگ ہوٹل، پاکستان سے ہندوستان تک، جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ

افسانوں کے ان چھ مجموعوں کا مصنف ہے

اور اب مہندر ناتھ اپنا اولین ناول

آدمی اور سکے

پیش کرتا ہے

قیمت ساڑھے تین روپے
(زیر طبع)

مکتبہ شاہراہ ○ دہلی

ہندر اپنے فن کے ارتقائی دور میں ہے اس کا شاہد اور تجربہ ہر گیر دستوں کا حامل ہو گیا ہے۔ ہندر رومان پرست نہیں ہے بلکہ حقیقت نگار ہے اس وجہ سے اس کے بیان میں تلخی، شدت اور الم ناس ناآسودگی ہے وہ انسانیت کے باب میں رومانی محبت کی ہلکی پھلکی شاعروں سے گزر کر طبقات کے اقتصادی کس بل کو دیکھتا ہے۔ یہ نیا رجحان بہت کم افسانہ نگاروں میں پایا جاتا ہے۔
ممتاز حسین

دیوداسی

شوکت صدیقی

"رات کی کالی چادر، ابھی چاروں اور دھرتی پر پھیلی ہوئی ہے!"

"سکھی کچھ باتیں کرو، کچھ رات کٹے، کچھ من ہلے!!"

تب مہاراج وکرما دتیہ کے راج سنگھاسن کی بائیسوں پتلی نے اپنی کتھا سنائی:۔

"پاٹلی پتر سے کوسوں دور پچھم کی اُور، مہاراجہ بھیم ساگر کی اجدھانی تھی۔ وہ سنگیت کا بڑا متوالا تھا۔ دور دور دیشوں کے گلا کار اس کے راج دوارے آتے اور منہ مانگا دھن پاتے اس بات کی چرچا سُنکر مگدھ پر دیش کی ایک نرتکی بھیم ساگر کے دوار آئی۔ اس کا بدن مانو کمل کی ڈالوں سمان لچکتا تھا۔ اس نے راج محل کے اندر اپنی کلا دکھائی۔ پھر ایسا ہوا کہ نرتکی نے ناچتے ناچتے، اپنے بالوں سے بیلے کی دو کلیاں نکالیں۔ پہلے ان کو ہونٹوں سے چوما، پھر ماتھے سے لگایا۔ اور ایک ایک پنکھڑی نوچ کر بکھرا دی۔ ایسا کر کے نرتکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے مدھماتے نینوں سے جل ساگر بہہ نکلے۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ قہقہہ لگا کر کھل کھلا اٹھی۔!"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"ہاں، اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ کیا بھید تھا؟"

یہ باتیں سنکر پتلی بتانے لگی: "بات یہ تھی کہ اسی سمے بھیم ساگر کی سبھا، راجکاری سارندہ چھپا کے ایک کنج تلے کھڑی کھوئی سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا تن بے کل ہو رہا تھا۔ وہ چندر بھان کے بانکے چتونوں سے گھائل ہو چکی تھی۔ جس کا منتر چوری، چوری سارندہ کا روپ دیکھ رہا تھا۔ یہ ہر دیو تھا، جو چنبیلی کی ڈال سے چمٹا ہوا تھا۔ سارندہ کی سندرتا کی دھوم اس نے اپنے دیش میں سنی تھی۔ وہ سورج بنسی پھتریوں کا بڑا اسچیلا راجکمار تھا، جن کی راجدھانی چکری بن کے آس پاس پھیلی ہوئی تھی۔ نرتکی یہ بھید جانتی تھی۔ پر بھیم ساگر کو کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اس نے اچنبھے سے پوچھا: "نرتکی پہلے تو روئی۔ پھر ہنسنے لگی۔ یہ بات میں جان نہ سکا۔" اس بات پر نرتکی مندر ہرنی کی طرح سینہ تان کر بولی "کلا کے پجاری مہاراج، تو نے شیتل روپ دیکھا ہے۔ پر ابلا کے من کو تو کلا میں نہ دیکھ سکا۔ یہ میری کلا کا اپمان ہے۔" اتنا کہہ کر وہ روٹھی ہوئی راج محل سے چلی گئی۔!!"

اور اسی طرح راج سنگھاسن کی منجولاؤں کی کتھا دیو بانی سے نکل کر نئے نئے روپ دھارتی رہی۔

انیر گنڈہ کا ریلوے اسٹیشن کھجری بن کے سب سے گنجان علاقہ میں واقع ہے۔ اب رات ہو چکی ہے اور مسافر خانہ کے مختصر سے سائبان کے نیچے الاؤ دہک رہا ہے۔ سردی برابر بڑھتی جا رہی ہے اور الاؤ کے گرد لوگ اکٹھا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر نرائن اونچی آواز میں کہہ رہا ہے۔

"پھر ایسا ہوا کہ ایک موڑ پر ہر دیو نے رتھ کو رکوا لیا اور نیچے اُتر کر چندر بھان سے بولا کہ میں دیوی کے درشن کرنے اوپر پہاڑی پر جا رہا ہوں۔ تم اتنی دیر تک یہیں ٹھہرے رہنا۔ اور اگر دھوپ سامنے والی چٹان سے نیچے اُتر آئے اور میں واپس نہ لوٹوں تو سمجھ لینا کہ اب میں لوٹ نہ سکوں گا۔ پھر بلا کچھ کہے سنے وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا بھوانی ماتا کے مندر کی طرف چل دیا۔

یہ مندر ایک اونچی چٹان پر بنا ہوا تھا۔ اور چڑھائی پر چڑھتے چڑھتے ہر دیو ہانپنے لگا تھا۔ جب وہ مندر کے بڑے دروازے کے پاس پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ پجاری لوگ ڈھولک بجا کر اونچے سروں میں بھجن گا رہے تھے۔ ان کے بیچ میں ایک کالا بھینسا گردن لٹکائے جھوم رہا تھا۔ اس کی گردن آدھی کٹ چکی تھی اور اس میں سے خون ٹپک ٹپک کر نیچے تھال میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ پر ہر دیو تو اپنی دُھن میں مگن تھا۔ ادھر اس نے کوئی دھیان ہی نہ دیا۔ اور سیدھا مندر کی طرف جانے لگا۔ اس پر بڑے پجاری نے ٹوک کر کہا: "ادھر کہاں جا رہے ہو۔ جانتے ہو دیوی نے ابھی تک بھوگ نہیں لگایا ہے۔ اب مندر کا دروازہ گیسے کھل سکتا ہے۔" مگر جب ہر دیو وہاں پہونچا تو مندر کا دروازہ اچانک کھل گیا اور وہ اندر چلا گیا۔ تب اس نے گھنٹیوں کو ہلا کر ڈنڈوت کیا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ "ماتا تو نے میری آن رکھ لی۔ راکھشسوں کی نظر اب ہمیشہ کے لئے میرے سامنے جھک گئی ہے۔ میں سارندہ کو بیاہ کرنے آیا ہوں۔ پر ماتا وہ چندر بھان کو چاہتی ہے

یہ بھید مجھے راستہ میں معلوم ہوا ہے۔ پھر بھی ماتا میری گردن تو اونچی ہے۔ میری بات تو رہ گئی۔ اس لئے آج میں اپنے لہو سے تیرا بھوگ لگاؤں گا" اتنا کہہ کر اس نے کمر سے لگی ہوئی تلوار نکالی۔ دیوی کے چرنوں سے سیندور لے کر ماتھے پر تلک لگایا۔ پھر اس نے اونچی آواز سے کہا "جے بھوانی کی! اور تلوار گردن پر چلا دی"

"چھتری کی بھی کیا بات ہوتی ہے۔ اپنی بات کے دھنی ہوتے ہیں"

"ہاں جی بڑا سا لاجیالا تھا جان پر کھیل گیا"

"یہ بھی اس نے اچھا ہی کیا ——!!

"باتیں بند کرو جی۔ ہاں پھر کیا ہوا؟"

ہرنرائن نے پھر کہنا شروع کر دیا "اب ذرا ادھر کی سنو۔ دیر تک جب ہردیو واپس نہ لوٹا اور چاروں طرف خوب دھوپ پھیل گئی۔ اب تو چندر بھان کو کھوج ہوئی۔ جانے کیا بات ہوئی جو ہردیو ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔ تب اس نے رتھ کے اندر بیٹھی ہوئی سارندہ سے جا کر کہا "ہردیو ابھی تک واپس نہیں آئے۔ معلوم نہیں کہاں اتنی دیر لگا دی۔ میں اوپر پہاڑی پہ جا کر ان کو دیکھتا ہوں" یہ بات سن کر سارندہ دھیرے سے بولی "ہاں، اب تم کو جانا چاہئے۔ مگر تم ان کو اپنے ساتھ ہی لانا۔ نہیں تو میرے سامنے نہیں آنا" اتنی بات سننا تھی کہ چندر بھان فوراً مندر کی طرف چل دیا۔ سارندہ چپ چاپ بیٹھی ہوئی انتظار کرتی رہی۔ بہت دیر ہو گئی۔ یہ دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہیں آیا۔ سارندہ بہت گھبرائی۔ سچ مچ کہیں دونوں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے۔ یہ سوچ کر اس نے بھی اپنا جی کڑا کیا اور رتھ سے باہر آ کر وہ بھی بھوانی ماتا کے مندر کو چل دی۔ اب وہاں جا کر وہ کیا دیکھتی ہے کہ دونوں خون میں نہائے ہوئے بے جان پڑے ہیں اور ان کی گردنیں کٹی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھنا تھا کہ سارندہ کے پران ہی جاتے رہے اور وہ پھٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دیوی کے چرنوں پہ اپنا سر دے مارا اور رو رو کر کہنے لگی "دیوی میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو نے میرا سہاگ اس طرح اجاڑ دیا۔ ابھی تو میں نے جی بھر کر ان کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اب میں ان کے بنا کیسے جی سکوں گی" اتنا کہہ کر اس نے ہردیو کی تلوار اٹھائی اور اپنی گردن سے لگا لی۔ اسی وقت مندر کے اندر بڑا ڈراؤنا قہقہہ گونجا اور آواز آئی "نراش نہ ہو ناری، دونوں کی گردنیں جوڑ دے، سب ٹھیک ہو جائے گا" آج ہم بنا بھوگ لئے ہی رہیں گے" پھر کیا تھا۔ سارندہ نے جلدی سے دونوں کی گردنیں جوڑ دیں اور مورتی کے چرنوں میں سر رکھ کر گڑگڑانے لگی۔ ذرا دیر بعد جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو دونوں زندہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اب تو سارندہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مارے لاج کے اس نے گھونگھٹ نکال لیا۔ پھر جب وہ تینوں مندر سے باہر آئے تو بڑا دروازہ اچانک زور سے بند ہو گیا اور اندر سے بڑی ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں۔ بھوانی ماتا بھوگ کے بنا چلا رہی تھی۔ مگر جلد ہی سارندہ کی ساری خوشی جاتی رہی۔ اس نے کیا دیکھا کہ گھبراہٹ میں اس نے ہردیو کا سر چندر بھان کی گردن سے لگا دیا ہے اور چندر بھان کا چہرہ ہردیو کے جسم پہ نظر آ رہا تھا۔ اب کیا ہو۔ سارندہ گہری سوچ میں پڑ گئی کہ دونوں میں سے کس کو وہ اپنا پتی کہے!!"

اتنا کہہ کر ہرنرائن ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کھنکھار کر پوچھا "اچھا اب تم ہی لوگ بتاؤ کہ سارندھ کس کو اپنا پتی مانے؟ اگر وہ ہردیو کو پتی کہتی ہے تو یہ پرایا جسم ہے۔ بھلا وہ اس کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہے۔ اور اگر چندر بھان کو پتی مانے جیتی ہے تو دنیا کیا کہے گی!!"

مسافر خانے کے اندر بالکل خاموشی چھا گئی اور الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سب کے چہرے حیرت زدہ نظر آنے لگے۔

اور گہری نیلی آنکھوں والا رگھبیر جو فارسٹ ڈیپارٹمنٹ میں منیجر ہے وہ لمبا اوور کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ اس کے سر پہ نرم روئیں والا سرمئی ہیٹ ہے۔ اس لئے وہ خیلتا چہروں والے مسافروں کے ساتھ الاؤ کے قریب نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ غلہ کے بوروں پہ بیٹھا ہوا خاموشی کے ساتھ کہانی سنتا رہا اور جب ہرنرائن سارندہ کو تذبذب کے عالم میں چھوڑ کر اس کا "ابائے" پوچھنے لگا تو رگھبیر نے چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک باگی مردولا کی کہانی دوہرانا شروع کر دی جس کے دھان پان سے جسم کو دیکھ کر مردولا کے بجائے لاجونتی کہنے کو جی چاہتا تھا۔ اور یہ بات ٹھیک بھی تھی۔ اس کی کنول کی سی شفاف آنکھیں ہر وقت بھیگی ہوئی سی معلوم ہوتی ہیں اور اگر کبھی وہ مسکرا دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہارسنگھار کے پھول ڈالیوں پہ جھڑ رہے ہیں۔ رگھبیر نے پہلی بار جب اس کو دیکھا تھا اس روز وہ بغل میں گٹھیں دبائے کنیا پاٹھ شالہ کو جا رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور وہ اتنی سہمی ہوئی معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ خود اپنے وجود میں چھپ جانا چاہتی ہے۔ تاکہ کوئی اس کو دیکھ نہ سکے۔ نہیں تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ رگھبیر کو اس کی یہ ادا بھا گئی۔ اب وہ روزانہ برگد کے گنجان پیڑ کے نیچے ٹھہر کر اس کا انتظار کیا کرتا۔ وہ اپنے

وقت پر آتی اور اسی طرح لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھبرائی ہوئی ہرنی کی طرح چپ چاپ گزر جاتی۔ ساری باتیں اسی طرح ہوتی رہیں۔ نہ کسی روز وہ گرکر بے ہوش ہوئی اور نہ رگھبیر کو کسی فلمی ہیرو کی طرح اس کو سنبھالنے کی جرأت ہوئی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ گنیا پاٹھ شالا میں کوئی جلسہ تھا۔ مردولا دیر سے لوٹی۔ اس روز بھی وہ اکیلی ہی تھی اور سانولی شام ہر طرف پھیل چکی تھی۔ رگھبیر نے اپنی سائیکل سنبھالی اور ایک نیچلے نوجوان کی طرح اس کے ہمراہ چلنے لگا۔ دونوں اسی طرح خاموش چلتے رہے۔ پھر ایک سنسان سی جگہ پر رگھبیر نے آہستہ سے کہا۔

"اس طرح تو پیدل چلتے چلتے آپ تھک جائیں گا۔"

مگر نہ تو اس نے رگھبیر کی طرف دیکھا اور نہ منہ سے کچھ بولی۔

رگھبیر نے پھر کہا: "دیکھئے آپ رکشا کر لیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہیں آپ چلتے چلتے گر نہ پڑیں۔"

لیکن وہ اسی طرح چپ چاپ چلتی رہی۔ البتہ اس کے قدموں میں اور لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی سہمی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ جیسے اب وہ رو پڑے گی۔ اور اس کے صندلی رخساروں پر آنسوؤں کی لڑیاں بکھر جائیں گی۔ رگھبیر اس کے قریب آ گیا۔ اور مسکرا کر بولا۔

"آپ کا جسم اتنا کومل ہے کہ میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ اس طرح اتنی لمبی سڑک پر پیدل چلتی رہیں۔"

اس دفعہ گھبرائی ہوئی مردولا نے کہا: "آپ کو ایسی باتیں کرتے ہوئے لاج نہیں آتی۔"

اور جیسے یکبارگی رگھبیر کی ہمت دوچند بڑھ گئی وہ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا: "لاج تو مجھے ضرور آ رہی ہے۔ یہ اپنی باتوں پر نہیں۔ ہاں تم اس طرح جو پیدل چل رہی ہو۔ یہ بات ضرور بری ہے۔ اب میں تم کو چلنے نہ دوں گا۔"

مردولا نے صرف اس کی طرف دیکھا اور سراسیمگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اس بات پر رگھبیر نے اس کا بازو پکڑا اور ذرا ڈانٹ کر بولا: "میری سائیکل پر بیٹھ جاؤ۔ بس اب تم مجھ کو بہت ستا چکیں۔ بھلا اس طرح تمہاری ایسی نازک لڑکیوں کو پیدل چلنا چاہئے۔" اور مردولا منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر چپ چاپ سائیکل پر بیٹھ گئی اور رگھبیر اس کو لے کر چلنے لگا۔

اب وہ اکثر بگد کے گھنے پیڑ کے تلے مردولا کو روک لیتا اور جتنی دیر تک چاہتا باتیں کرتا۔ پہلے پہل تو ایسا لگتا جیسے وہ بیچ مار کر یہیں سڑک پر رونے لگ گی۔ مگر پھر ایسا ہوا کہ وہ باتیں کرتے کرتے ہنس پڑتی اور اس کے منہ سے ہارسنگھار کے پھول جھڑنے لگتے۔ پھر بات یہاں تک پہونچ گئی کہ وہ رات کے سناٹے میں اس کے گھر چلا جاتا اور دروازے پر کھڑا ہو کر سیٹی بجاتا۔ وہ پالتو کتے کی طرح وہاں چلی آتی۔ لیکن یہ بات زیادہ دن تک چھپ نہ سکی اور جوگندر ناتھ کچھ تو بدنامی کے ڈر سے اور کچھ اس خیال سے چپ ہو گئے کہ ان کو مردولا کا کہیں نہ کہیں بیاہ تو کرنا ہی تھا۔ اور رگھبیر اچھا خاصہ لڑکا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا اور مردولا ڈھولک اور شہنائیوں کے شور میں ایک روز اپنے گھر سے بدا ہو کر رگھبیر کے یہاں آ گئی۔

شادی کے بعد مردولا بھلے گھر کی لڑکیوں کی طرح ایک سگھڑ پتنی ثابت ہوئی۔ سال بھر سے زائد کا عرصہ گذر گیا۔ کوئی ہنگامہ کوئی طوفان ان کی زندگی میں نہ اٹھا۔ میدانوں میں بہنے والی ندی کی طرح ان کی زندگی ایک ہی رفتار سے آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ البتہ مردولا اب ایک بچہ کی ماں بن چکی تھی۔ چنچل تو وہ کبھی نہ تھی۔ مگر تھوڑا بہت جو الھڑ پن تھا، اس پر اب سنجیدگی غالب آ گئی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر ابھی تک کنواریوں کی سی حیا تھی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی سی معلوم ہوتیں۔ اور کبھی "موڈ" میں آ کر وہ ہنس دیتی تو جیسے ہارسنگھار کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں رچ جاتی۔ انھیں دنوں ملازمت کے سلسلہ میں رگھبیر کا اکبرپور ٹرانسفر ہو گیا۔ یہاں کام بہت تھا۔ اس لئے وہ شام کے وقت گھر لوٹتا اور تھکا ہارا ہوا سا آ کر بے سدھ ہو کر لیٹ جاتا اور جب ذرا اس کی آنکھ لگ جاتی تو مردولا جوتے اتار کر گرم پانی سے اس کے پیر دھوتی۔ کنپٹیوں اور ماتھے پر آہستہ آہستہ تیل کی مالش کرتی۔ اور اس سب کام میں وہ اتنی احتیاط برتتی کہ رگھبیر اسی طرح پڑا ہوا خراٹے بھرتا رہتا۔ پھر ذرا دیر سو کر جب وہ اٹھتا تو وہ اس کو چائے پلاتی اور بچوں کی طرح ڈانٹ ڈانٹ کر چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھلاتی بھی جاتی۔ یہ آناً بڑا سکھ تھا جس کے سہارے وہ دفتر کے کام کو نباہتا جا رہا تھا۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ کام کی زیادتی سے عاجز آ کر وہ بھاگ کھڑا ہوتا۔

دفتر میں اس کے لئے اگر رنک تھا تو گھر کو مردولا نے ضرور سورگ بنا دیا تھا۔ لیکن اچانک یہ خواب اس کو بکھرتا ہوا معلوم ہوا۔ بات یہ تھی کہ ان دنوں وہ جلد ہی سو جایا کرتا تھا اور رات گئے اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اس نے اکثر دیکھا کہ اس وقت مردولا کمرے میں موجود نہ ہوتی اور اس کا بستر خالی پڑا ہوتا۔

اس بات کو وہ پوچھتا تو وہ کوئی نہ کوئی جواز پیش کر دیتی اور نہ جانے کیوں اس کی باتوں سے رگھبیر کو تسلی نہ ہوتی۔ ایک شبہ سا اس کے دل میں گھر کرتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن اس نے طے کر لیا کہ وہ اس بھید کو جان کر رہے گا۔ وہ ساری رات آنکھیں بند کئے خاموش پڑا رہا۔ پھر رات گئے، مردولا آہستہ سے اُٹھی۔ ذرا دیر تک خاموش بیٹھی ہوئی اس کو دیکھتی رہی۔ پھر جھک کر بچّے کے رخساروں کو چوما۔ رگھبیر کے پلنگ کے پاس آئی اور اس کے پیروں کو دھیرے سے چھو کر باہر چلی گئی۔ رگھبیر چپ چاپ پڑا ہوا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھی اُٹھ کر دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ مردولا دالان سے ہو کر اوپر زینہ پر چڑھنے لگی۔ پھر چھت پر جا کر وہ برابر والے مکان کی منڈیر پھاند کر اُس طرف چلی گئی۔ رگھبیر دیوار سے چپٹا ہوا کھڑا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس مکان میں ایک وکیل رہتا تھا اس کو وکالت سے زیادہ تنکا رکا شوق تھا اسی لئے ہر وقت وہ اپنی بندوقوں کو صاف کیا کرتا تھا۔ جب سے وہ اس مکان میں آیا تھا۔ رگھبیر نے ہمیشہ اس کو تنہا ہی دیکھا۔ ابھی تک اس کے گھر میں کوئی اور ہستی نظر نہیں آئی تھی۔ رگھبیر تیج و تاب کھاتا ہوا آہستہ آہستہ چھت پر ٹہلتا رہا۔ پھاگن کی مہکی ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں اور آخر تاروں کا چاند گیندے کے پھولوں کی طرح بسنتی نظر آ رہا تھا۔ سردی کے مارے اس کے پیر سن پڑتے جا رہے تھے۔ مگر وہ وہاں سے نیچے نہ گیا۔ اسی طرح جھنجھلاتا ہوا چھت پر چلتا رہا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد منڈیر پر مردولا کا سایہ لہرایا اور وہ آہستہ سے اُتر کر اپنی چھت پر آ گئی اور اسی وقت رگھبیر اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے تیز لہجہ میں کڑک کر پوچھا۔

"اس وقت تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

لیکن مردولا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گردن جھکائے مجرموں کی طرح خاموش کھڑی رہی۔

رگھبیر نے پھر کہا "بتاؤ تم کہاں گئیں تھیں؟"

اب کی اس نے نظر بھر کر رگھبیر کو دیکھا اور پھر بے اختیار روتے ہوئے اس کے پیروں پر گر پڑی۔ رگھبیر ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنے پیروں کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور نیچے آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ تمام رات اس کو نیند نہیں آئی اور نہ اس نے مردولا سے کوئی بات کی۔ سویرے بغیر کچھ کھائے پیئے وہ دفتر چلا گیا۔ شام کو آ کر بھی اسی طرح لیٹ گیا۔ مردولا نے بات بھی کرنا چاہی۔ مگر وہ کچھ بھی نہ بولا اور اسی طرح بستر پر دراز ہو کر سو گیا۔ رات گئے اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کا بستر آج بھی خالی پڑا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس نے چیخ کر کہا۔

"تم کو بتانا ہی پڑے گا کہ اس وقت تم کہاں جاتی ہو؟"

مردولا ذرا دیر چپ رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا "یہ بات تم نہ پوچھو تو اچھا ہے!"

مگر وہ باز نہ آیا۔ پوچھنے لگا "نہیں آج میں یہ بات جانے بغیر نہ رہوں گا۔"

مردولا آہستہ سے بولی "تو جو بات تم سمجھ رہے ہو وہ ٹھیک ہی ہے!" اتنا کہہ کر اس نے گردن جھکا لی۔

رگھبیر غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے جھپٹ کر اُس کی گردن دبوچ لی اور پھر اس کو بستر پر ڈھکیل کر اس نے کمرے میں پڑا ہوا ایک بید اٹھا لیا اور دیوانوں کی طرح اس کو مارنا شروع کر دیا۔ مگر مردولا خاموش پڑی رہی۔ نہ وہ روئی، نہ چیخی اور بید کی آواز کمرے کے اندر سڑاٹا مچاتی رہی۔ اس کے نازک جسم پر کائی کے سے دھبے پڑتے گئے۔ پھر مارتے مارتے رگھبیر ہانپنے لگا اور بے جان سا ہو کر اپنے بستر پر گر پڑا۔

اب کمرے کے اندر ننھے کیشو کے رونے کی آواز سنائی پڑ رہی تھی۔ جس کو اپنی چھاتی میں چھپائے ہوئے مردولا اسی طرح پڑی رہی۔ کبھی کبھی کوئی دبی ہوئی سسکی اس کے منہ سے نکل جاتی۔ تھوڑی دیر بعد رگھبیر نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ مردولا کی کنپٹی کے پاس سے جیتا جیتا خون بہہ کر اس کے صندلی رخسار پر ایک سرخ دھبہ بن کر رہ گیا تھا اور اس کا بلوز پشت پر سے پھٹ گیا تھا۔ جس کے اندر سے اس کی پیٹھ کی اجلی جلد نظر آ رہی تھی۔ اور اس پر "ریڈ اینڈ بلیو" پنسل کی طرح ایک لکیر کھنچ گئی تھی۔ وہ چپ چاپ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی اس کا دل بھر آیا۔ سچ مچ اس نے یہ بہت بُرا کیا۔ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا مردولا کا کومل بدن اس قابل نہیں ہو سکتا۔ یہ سوچ کر وہ اپنے پلنگ پر سے اُٹھا اور چپ چاپ اس کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جھک کر اس نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سرگوشی کے انداز میں آواز دی۔

"مردولا رانی، اٹھو!"

اس نے کروٹ بدل کر رگھبیر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

رگھبیر کہنے لگا "نہیں، نہیں تم مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں بہت برا آدمی ہوں"

اور پھر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بے تحاشہ چومنے لگا۔ پھر اس کے سینہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اب مردولا کی بھی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ دونوں دیر تک روتے رہے۔ پھر مردولا نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔

"اب میں کہیں نہ جاؤں گی۔ تم میری بات مان لو۔ ہاں اس مکان کو کل ہی چھوڑ دو۔ میں یہاں مر جاؤں گی۔ بھگوان کے لئے تم کل ہی اس گھر کو بدل دو۔ یہ بہت خراب جگہ ہے"

اور پھر وہ ہی ایک روز میں رگھبیر نے وہ گھر چھوڑ کر کہار باڑہ پر ایک مکان لے لیا۔ یہ مقام بڑا سنسان تھا۔ شہر سے دور ہونے کے علاوہ، قرب وجوار میں کوئی آبادی بھی نہ تھی۔ دھانکوں کے چند نیم پختہ مکان تھے۔ جن میں بہت سے سوپلے ہوئے تھے۔ جو دن بھر گوبر اٹھائے اِدھر اُدھر کوڑے کے ڈھیروں پر دوڑتے پھرتے تھے۔ اور رات کو تو بالکل ویرانی چھائی رہتی تھی۔ سرِشام ہی بستی پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ ادھر رگھبیر کے پاس دفتر میں کام اور بڑھ گیا تھا۔ اس لئے وہ اب اور بھی دیر سے واپس آتا۔ مردولا کے تنہا ہونے کے باعث رگھبیر نے ایک چوکیدار کو ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر والی کوٹھری میں رہتا تھا۔ اس کا نام پائینجو تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے گہرے، گہرے داغ تھے اور ایک آنکھ اندر کو بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو پھڑپھڑا کر جب وہ ہنستا تو بڑا بھیانک معلوم ہوتا۔

اس سنسان بستی میں رہتے ہوئے اس کو کئی ماہ ہو گئے اور وہ دفتر سے دیر میں لوٹتا رہا۔ ایک روز وہ دفتر سے گھر آنے کے بجائے ہیڈ کلرک کی اوداعی پارٹی میں الجھ گیا۔ جب وہ وہاں سے واپس لوٹا تو رات بہت ہو چکی تھی۔ گھر پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے پائینجو کی کوٹھری کا آواز دی۔ مگر وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کے دل میں ایک خیال آیا کہ ایسے میں اگر کوئی چوری کرنے آئے تو شاید کسی کو پتہ بھی نہ لگے۔ یہ جاننے کے لئے وہ آنگن کی چھوٹی سی دیوار پر کسی نہ کسی طرح چڑھ کے اندر پھاند گیا اور دبے قدموں کمرے کی طرف چلا تاکہ مردولا کو حیرت میں ڈال دے۔ مگر جب وہ کمرے کے قریب پہونچا تو وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ مردولا لیمپ کی دھندلی روشنی میں بالکل برہنہ نظر آ رہی تھی اور اس کا نازک جسم پائینجو کی گود میں پڑا تھا۔ وہ کئی منٹ تک اسی طرح بُت بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ باہر صحن میں آیا اور دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چلا گیا۔

باہر والے دروازے پر جا کر اس نے کھٹکھٹایا تو تھوڑی دیر کے بعد پائینجو نکلا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرا بڑا ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ رگھبیر کو دیکھتے ہی وہ کہنے لگا۔ "سرکار آج تو آپ نے بڑی دیر لگا دی۔ مردولا رانی بہت گھبرا رہی تھیں"

وہ گردن ہلا کر آہستہ سے بولا "ہوں"۔

پائینجو کہنے لگا۔ "اتنی دیر نہیں کرنا چاہئے۔ وہ بہت ڈرتی ہیں"

اس دفعہ رگھبیر نے گھور کر اس کو دیکھا اور دھیرے سے بولا "پائینجو، کل سے تم یہاں کام نہیں کرو گے۔ سویرے ہی تم کو تھری خالی کر دینا اور اپنی تنخواہ مجھ سے دفتر میں آ کر لے جانا۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔ مردولا اپنے بستر پر خاموش پڑی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے وہ دیر تک رونے کے بعد ابھی چُپ ہوئی تھی۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ بلکہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرے جب رگھبیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ چوکیدار جا چکا تھا۔ اس کی خالی کوٹھری بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ اب کی اس نے مردولا سے کچھ بھی نہ کہا۔ البتہ دفتر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر مردولا کو بلیر نگر لے جا کر اس کے میکے چھوڑ آیا۔

مگر مشکل سے مہینہ بھر گذرا ہوگا کہ مردولا اس کو بُری طرح یاد آنے لگی اور گھر کی تنہائی میں اس کا دم الجھنے لگا۔ آخر وہ خود کچھ دنوں کے لئے بلیر نگر چلا گیا لیکن مردولا کو اپنے ہمراہ واپس نہ لایا۔ اب اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ مہینہ کی شروع تاریخوں میں وہ مردولا کے پاس چلا جاتا اور چند روز قیام کر کے واپس آ جاتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ مردولا ایک اور بچہ کی ماں بن گئی۔ اب وہ اس کے ساتھ رہنے کے لئے ضد کرنے لگی تھی۔ آخر وہ اسے لے ہی آیا اور گھر میں پھر چہل پہل اور زندگی کی ہنگامہ آرائیاں گونجنے لگیں۔ بڑے سکھ کے دن گذر رہے تھے۔ مردولا بات بات پر اُسکو بچوں کی طرح منایا کرتی تھی اور اس کی انھیں باتوں نے اس میں جیسے بچپنہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا۔ مگر ایسے موقعوں پر اس نے اکثر یہ غور کیا کہ جب کبھی وہ اپنے چھوٹے بچہ کو گود میں لئے ہوئے پیار کرتا ہوتا تو مردولا اس کو جھین کر علیحدہ کر دیتی اور اس کے بجائے کیشو کو اس کی گود میں ڈال دیتی۔ یوں بھی چھوٹے بچہ کے ساتھ

اس کا برتاؤ بہت خراب تھا۔ بات بات پہ وہ اس کو پیٹنا شروع کر دیتی۔ وہ دیر تک پڑا ہوا بلکتا رہتا۔ مگر وہ اس کو کبھی منانے کی کوشش نہ کرتی اور ایک روز جب وہ چھوٹے بچے کو اپنے کندھے پر بٹھائے ہوئے قہقہہ لگا کر اونٹ کی سی چال میں صحن کے اندر ناچتا پھر رہا تھا۔ تو ایکا ایکی اندر کمرے میں سے مردولا نکل کر آ گئی۔ پہلے تو وہ کھڑی ہوئی تیکھی نظروں سے یہ تماشہ دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس کے قریب آ کر اس نے بچہ کو اس بری طرح چھینا کہ وہ پتھریلے فرش پر گر پڑا اور اس کے ہونٹ سے خون بہنے لگا۔ رگھبیر کو یہ بات بہت بری معلوم ہوئی وہ بگڑ کر بولا۔

"آخر تم اس سے سوتیلیوں کا سا برتاؤ کیوں کرتی ہو"

وہ تیزی سے بولی "تم اس بات میں مت بولا کرو"

"کیوں، کیا تمہارا ہی حق ہے، میں اس کا پتا نہیں ہوں؟"

مردولا کے چہرے پر ایک بارگی وحشت چھا گئی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ روتے ہوئے بچہ کا ہاتھ پکڑ کر دور تک گھسیٹتی ہوئی لے گئی اور پھر اس کے منہ پر تھپڑ مارنا شروع کر دیئے۔ اس بات پر رگھبیر ایکا ایکی بپھر گیا۔ اس نے مردولا کو جھٹکا دے کر کھینچا اور پھر اس کے بالوں کو پکڑ کر دیوار سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ اور چیخ کر کہنے لگا۔

"پھر مارو گی؟"

وہ بھی تیزی سے بولی "ہاں ماروں گی، چاہے تم مجھے جان سے مار ڈالو!" اور پھر وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگی "مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس سے نفرت ہے، نفرت ہے، نفرت ہے"

اور رگھبیر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ آخر وہ اس سے اس قدر کیوں جلتی ہے۔ بلکہ اس نے جھلا کر اس کے پیٹ پر کس کے لات ماری کہ وہ دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ اس دفعہ اُس نے کچھ بھی نہ کہا بلکہ زمین پر پڑی ہوئی چھوٹے بچہ کو گھورتی رہی۔ پھر اس نے چلا کر کہا "دیکھ رہے ہو اس کے منہ سے اسی طرح رال ٹپک رہی ہے جس طرح کیشو کے ماسٹر کے کٹے ہوئے ہونٹ سے رال بہا کرتی تھی یہ بھی اسی کی طرح گھناؤنا ہے۔ میں اس سے پیار نہیں کر سکتی۔ یہ میرا بچہ نہیں ہے۔ یہ تمہارا بچہ نہیں ہے۔ یہ اس ماسٹر کی اولاد ہے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایک بار پھر رگھبیر کو محسوس ہوا کہ وہ روشنی میں سے پھسل کر اندھیری گھاٹیوں میں گر پڑا ہے اور اس کے چاروں طرف تاریکی ہے اور خاموشی ہے۔ بہت دیر تک گہری سوچ میں پڑے رہنے کے بعد اس نے طے کر لیا کہ وہ اس اندھیرے میں نہیں رہ سکتا۔ اس جوامرادی مردولا کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ نہیں تو پاگل ہو جائے گا۔ سر پٹک کر مر جائے گا۔

اور پھر وہ اس اندھیرے سے باہر نکل آیا۔ اور اب دو سال سے زائد ہو چکے ہیں نہ وہ بلیرنگر گیا ہے اور نہ اس کو پتہ ہے کہ مردولا کس طرح ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ اب تک اس کو بھول نہیں سکا ہے۔ مگر یہ ساری باتیں، یہ ساری کتھا وہ کسی کو سنا نہیں سکتا۔ البتہ وہ اس وقت اتنا ضرور پوچھنا چاہتا ہے کہ "اے سارندہ کی کہانی سننے والو مجھے بتاؤ کہ میں مردولا کو کس طرح اپنی پتنی سمجھوں!" الاؤ کی تیز روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش بہت گہرے ہو گئے ہیں اور اس کی نیلی آنکھیں کسی غلط جھیل کی طرح دھندلی نظر آ رہی ہیں۔

لیکن ہرنراین کہانی کو ادھورا چھوڑ کر اب اپنے کوارٹر جا چکا ہے۔ اس لئے کہ سویرے بہت تڑکے اس کو ڈیوٹی پر جانا ہے۔ الاؤ کے گرد اب ملی جلی آوازوں کا شور بہت بڑھ گیا ہے اور رگھبیر گہری خاموشی سے چونک کر ایک بارگی سنبھل کر بیٹھ گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس کو آٹھ بجے سے پیشتر ہی کیمپ پہونچ کر نارسٹ کے نیلام کے کاغذات کنسرویٹر کے پاس ڈاک بنگلہ پر بھجوانا ہیں۔ یہ کام بہت ارجنٹ ہے۔ اگر حسب معمول سویرے والی ٹرین لیٹ آئی تو بہت برا ہوگا۔ کنسرویٹر نے شام ہی کو تاکید کر دی تھی کہ کاغذات بلا تاخیر ڈاک بنگلہ پر پہونچ جانا چاہئیں۔ صرف چھ میل کا تو راستہ ہی تھا۔ پھر اس نے اپنی بندوق سنبھالی۔ اس میں کارتوس ڈالے اور اس کو پشت پر لٹکا کر وہ چلنے کے لئے کمر بستہ ہو گیا۔

باہر کہر کا ہلکا سرمئی غبار پھیلا ہوا تھا اور ہوائیں سہمی ہوئی سی چل رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ ریلوے لائن پر چلنے لگا۔ اس کے قدموں کی آہٹ گہرے سناٹے میں برابر ابھرتی رہی اور ساہو کے گنجان درختوں کے اندھیرے میں جھینگروں کا شور ایک تیز دھن کے ساتھ جھنکار تا رہا۔ پھر ریلوے کے آؤٹر سگنل سے ذرا

آگے بڑھ کر وہ اس نیم پختہ سڑک کی طرف مڑ گیا، جو جھکے ہوئے درختوں کی تاریکی میں بالکل کھو چکی تھی۔ رگھبیر نے بندوق کو اب کندھے پر سے اتار لیا تھا اور اس کو مستعدی سے سنبھالے ہوئے محاذِ جنگ کے کسی سپاہی کی طرح چوکنا سا چل رہا تھا۔

کئی فرلانگ تک وہ اس تاریک سڑک پر اسی طرح چلتا رہا۔ اس کے قدم سنبھل سنبھل کر پڑ رہے تھے۔ نہ وہ اس اندھیرے سے سہما ہوا تھا اور نہ گھبراہٹ کا کوئی احساس تھا۔ حالانکہ اتنی رات گئے اس راستہ پر چلنا بڑا خطرناک تھا۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں وہ اس قدر سانحات سے گذر چکا ہے، جنھوں نے اس کو زندگی میں خاصہ REALISTIC بنا دیا ہے۔ اب اس کے لئے بڑے سے بڑے حادثہ کا احساس بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اسی طرح سنبھل سنبھل کر گہری تاریکی میں چلتا رہا، کچری بن کی ہوائیں درختوں میں دھیرے دھیرے سرسراتی رہیں۔ پھر گنجان درختوں سے نکل کر وہ ایک کھلی ہوئی جگہ پر پہونچ گیا۔ جہاں پر گیہوں کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ یہ تھارُوؤں کی بستی تھی۔ جو گھنے جنگلوں کے اندر رہتے ہیں کھیتی باڑی کرتے ہیں اور مویشیاں پالتے ہیں۔ کڑی محنت سے ان کے جسم ٹھوس نظر آتے ہیں مگر وہ گیہوں خود نہیں کھا سکتے۔ اس لئے کہ یہ بات ان کے بھاگ میں نہیں لکھی ہے۔ ساری فصل کٹتے ہی قصبہ کے بازاروں میں چلی جاتی ہے۔ وہ اپنا پیٹ مکئی سے بھرتے ہیں اور گیہوں کی بالیوں کو تہواروں کے موقع پر مندر میں چڑھاتے ہیں۔

رگھبیر اس مقام پر پہونچ کر الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کو راستہ کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دن میں تو ادھر سے اکثر گذرا تھا مگر اتنی رات گئے اس سڑک پر سے جانے کا کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ ٹھہر کر سوچنے لگا کہ اب کس طرف مڑے۔ اتنے میں ڈھول پٹنے کی آواز سنائی پڑی اور گیہوں کی کھیتیوں میں سرسراہٹیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد جب ڈھول کی آواز ڈوب گئی اور ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا تو اس نے زور سے سیٹی بجائی۔

کوئی جواب نہ آیا، کوئی آواز سنائی نہ پڑی،

اُس نے پھر سیٹی بجائی اور ٹھہر ٹھہر کر برابر سیٹی بجاتا رہا۔

اس دفعہ کھیتوں کے بیچ سے ایک تیز آواز ابھری، جو دیر تک گنجان درختوں میں تھرتھراتی رہی۔ رگھبیر اسی سمت چل دیا۔

اب کھیتوں کے اندر کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ رگھبیر وہیں پگڈنڈی پر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر بعد گیہوں کے لہراتے ہوئے پودوں میں سے نکل کر کوئی باہر آیا۔ کہر کے ہلکے دھندلے غبار میں رگھبیر نے دیکھا کہ وہ گٹھے ہوئے جسم والی کوئی عورت تھی۔ اس کی پشت پر بید کی بُنی ہوئی ٹوکری لٹک رہی تھی اور سر پر لپٹے ہوئے کپڑوں میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ پھر اُس نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

اس کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ رگھبیر نے اندازہ لگا لیا کہ وہ خوفزدہ معلوم ہو رہی ہے۔ وہ تیزی سے بولا "راستہ بھول گیا ہوں!"

وہ بولی "کہاں جانا ہے؟" وہ اب اس کے قریب آتی جا رہی تھی۔ رگھبیر کہنے لگا۔

"کیمپ جاؤں گا۔"

اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ رگھبیر لمحہ بھر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے کہا "تم فارسٹ روڈ کا راستہ بتا سکتی ہو!"

وہ آہستہ سے بولی "ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔" اور پھر وہ پگڈنڈی پر مڑتے ہوئے بولی "آؤ!" اور وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں بالکل خاموشی کے ساتھ کھیتوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی پگڈنڈی پر گذرتے رہے اور ان کے قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ کھیتوں سے گذر کر وہ پھر گنجان درختوں کے نیچے آ گئے تھے۔ یہاں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا اور خشک پتوں پر ان کے قدموں کی چاپ بڑی پُراسرار معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن رگھبیر جلد ہی اس خاموشی سے اُکتا گیا۔ اُس نے پوچھا۔

"تم اب تک جاگ رہی تھیں؟"

وہ بغیر مُڑے ہوئے بولی "ہاں۔ کھیتوں کی رکھوالی جو کرنا پڑتی۔ ساری رات مچان پر رہنا پڑتا ہے۔"

رگھبیر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنا لگا "اچھا تم کو کوئی ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ اور یہ تو جاڑے کی راتیں ہیں۔ بڑی سردی معلوم ہوتی ہوگی۔"

"یہ محنت تو کرنا ہی پڑتی ہے، آٹھ آنہ روز جو ملتا ہے۔"

اس بات پر رگھبیر کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس سے کچھ اور پوچھے۔ مگر وہ زیادہ باتیں کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس لئے وہ بھی خاموش ہو کر چپ چاپ چلنے لگا۔ پھر دونوں چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں پانی کی ایک پتلی دور تک پھیلی ہوئی، کہرا پھیلا ہوا دھندلکا اس پر سگریٹ کے دھوئیں کی طرح نیلگوں معلوم ہو رہا تھا اور جب وہ لکڑی کے پل پر سے گزرنے لگے تو عورت نے جھک کر کنارے سے ساری مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی۔ رگھبیر نے پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

وہ کہنے لگی "یہ دیوی سارندہ کا استھان ہے۔"

رگھبیر اچانک چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے پوچھا "کون تھی یہ دیوی؟"

"اور تو معلوم نہیں۔ پر اتنا سُنا ہے کہ وہ اپنے پتی کو کھوجتی ہوئی یہاں آکر سما گئیں۔ کہتے ہیں۔ شاردا ندی کی جو دھارا یہاں سے پھوٹتی ہے وہ دیوی سارندہ ہی کا روپ ہے۔ اب بھی وہ نگر انگر اپنے سوامی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ تب سے تھارو لوگوں میں یہ ریت ہے کہ مان لو کہ کسی عورت کا گھر والا مر جائے تو اس کو "بوڑ سہاگ" دیتے ہیں۔ اس میں اتنا دھن اکٹھا ہو جاتا ہے کہ کھیتی باڑی ہو سکتی ہے۔ ایکھ بوئی جا سکتی ہے۔ وہاں ایکھ میں بڑا فائدہ ہے۔ شکر تو اپنے کو ملتی نہیں، پر پیسہ اچھا مل جاتا ہے۔ ہاں، تھارو لوگ اسی لئے اپنی عورتوں کا بڑا مان کرتے ہیں۔"

وہ پل پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ کر چلتی رہی اور آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہی۔ مگر رگھبیر کو یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوئی۔ اس نے طنز کے ساتھ کہا "ہاں جبھی تو تھارو لوگ اپنی عورتوں کو بیچ ڈالتے ہیں۔ یہی مان کرتے ہیں؟" وہ کہنے لگی۔

"ہاں، ایسا تو کرنا پڑتا ہے۔ جب کوئی بیتا اپنے پر پڑ جائے تو زمین تک بیچ دینی پڑتی ہے۔"

مگر وہ پھر بھی متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا "اسی لئے تم رات کو سردی میں مچان پر بیٹھ کر چوکیداری کرتی ہو اور تمہارا گھر والا مزے سے پڑا سو رہا ہوگا؟"

وہ تیزی سے بولی "ایسی بات مت کرو۔ وہ تو بیمار پڑا ہے۔ پہلے وہ کڑی محنت کرتا تھا۔ سرکاری فارم پر قلی گیری کرتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک بار اس کو لوٹتے ہوئے بہت دیر ہو گئی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا اور بادل سب طرف چھائے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں وہ راستہ بھٹک گیا اور گہاری والے دلدل میں اُتر گیا۔ ساری رات اس میں پڑا ہوا چلاتا رہا۔ یہاں کے دلدل بڑے خطرناک ہیں۔ کیڑوں نے اس کے سارے پیروں کو چاٹ ڈالا۔ ریلوے اسپتال میں علاج کرایا۔ پر دونوں ٹانگیں بگڑ گئیں۔ اب وہ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ بس پڑا پڑا کھانسا کرتا ہے۔ گالیاں بکا کرتا ہے۔ ہاں جب آدمی کچھ نہیں کر پاتا۔ تب گالیاں ہی دیتا ہے۔"

اس کا لہجہ ایک بارگی سست پڑ گیا۔ اس کی آواز اتنی مدھم اور الجھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ خود بڑبڑا رہی ہے اور اس کی باتوں کا سننے والا کوئی نہیں رگھبیر ہمدردی کرنے کے انداز میں کہنے لگا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

مگر اس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ بغیر جواب دیئے ہوئے آہستہ آہستہ چلتی رہی۔

رگھبیر نے اس دفعہ بات بدلنے کے لئے یونہی پوچھ لیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"رکمنی!" پھر خود بخود چونک کر اس نے کہا "کیوں یہ بات تم نے کیوں پوچھی؟"

وہ کہنے لگا "اگر میں پھر کبھی ادھر سے آیا تو اس طرح سے تم سے مل سکوں گا۔ دیکھو نا تم اتنی دُور تک اتنی رات کو مجھ کو راستہ بتانے چلی آئیں!"

وہ روٹھنے کے سے انداز میں بولی "کوئی نہیں آتا، کوئی پھر نہیں ملتا۔"

"کیوں یہ بات تم نے کیسے جان لی؟"

وہ بتانے لگی "تمہاری طرح پچھلے دنوں ایک آدمی راستہ بھٹک گیا تھا۔ پھر وہ مجھے مل گیا۔ دیکھنے میں کوئی افسر لگتا تھا۔ پر نہ جانے وہ کیسا آدمی تھا۔ وہ رات بھر مچان پر میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ بالکل بچوں کی سی باتیں کرتا تھا۔ کہنے لگا "تم میری ماں ہو۔ میں اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا لیٹا ہوں۔" پھر وہ نہ جانے کیسی بُری بُری آہ زیں نکال کر خوب رویا، پھر اچانک پاگلوں کی طرح مجھے کاٹنا شروع کر دیا۔ مارے درد کے میرے آنسو نکل پڑے۔ سویرے جب وہ گیا تو مجھے دس روپے دیئے اور

ایک کیل بھی چھوڑ گیا۔ کہتا تھا میں پھر آؤں گا۔ مہینہ بھر سے اُوپر ہو گیا۔ پر کوئی بھی نہ آیا۔"

رگھبیر چپ چاپ اس کی ساری باتیں سُنتا رہا۔ پھر اس نے حیرت زدہ ہو کر سوچا۔ اسے یہ تو سالی ایک نمبر آوارہ نکلی۔ اور وہ پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رکشنی کو دیکھنے لگا۔ اس کا جسم بڑا اسڈول معلوم ہو رہا تھا اور چلنے میں اس کے کولہے ہر قدم پر جھولنے لگتے۔ وہ اس کو اسی طرح خاموشی سے چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ایکا ایکی کوئی سال کی سوئی ہوئی اس کی جنسی بھوک، یا جوج، ماجوج کی طرح اچانک انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ رگھبیر کے قدم ڈگمگانے لگے۔ پھر ایک مٹیالے سے ٹیلے کے پاس وہ ٹھہر کر کہنے لگا۔

"ٹھہر جاؤ رکشنی، میں اب تھک گیا۔"

اس نے ذرا تعجب سے کہا۔ "ارے ابھی سے!"

وہ ذرا دیر اس کو بھرپور نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہاں آؤ!" وہ اس کے قریب آ گئی۔ اور ایک بار گی رگھبیر نے گھسیٹ کر اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ مگر وہ پرندہ کی طرح اس کے بازوؤں میں پھڑپھڑا کر فوراً علیحدہ چلی گئی۔ پھر اس نے تیزی سے کہا۔

"یہ کیا بات ہے؟"

رگھبیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ جیب میں سے ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا۔ مگر رکشنی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

اس دفعہ رگھبیر نے دو نوٹ نکال کر اس کے سامنے کر دیئے۔ وہ اور دُور ہٹ گئی۔

رگھبیر بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اس نے جیب کے اندر سے تمام روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے، اس دفعہ وہ بڑے تیکھے لہجہ میں بولی۔

"نہیں، ایسی بات ٹھیک نہیں۔ میں اب کھیتی باڑی کروں گی۔ ہاں: میں اب کی فصل میں ایکھ کی بوائی کروں گی۔"

تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ گنجان درختوں میں ہواؤں کی چاپ بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ رکشنی کہنے لگی۔ "اچھا، اب میں جاؤں گی۔ دونوں بچے مچان پر سو رہے ہیں۔ سویرے سے انھوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بار بار اُٹھ کر روتے ہیں۔ اکیلی عورت کتنا کما سکتی ہے۔ بھوکا تو رہنا ہی پڑے گا۔ تم سیدھی پگڈنڈی پر جا کر داہنی طرف مڑ جانا۔ بس فارسٹ روڈ مل جائے گی۔" لیکن رگھبیر نے جیسے اس کی باتوں کو سنا ہی نہ تھا۔ وہ بیماروں کی طرح گردن لٹکائے نڈھال سا کھڑا رہا۔ اور رکشنی بغیر کچھ کہے ہوئے واپس جانے لگی۔

اور رگھبیر بھاری بھاری قدموں سے پگڈنڈی پر چلا۔ گھنٹہ بھر سے زائد ہو گیا۔ وہ پگڈنڈیوں کے جال میں الجھا ہوا برابر چلتا ہی رہا۔ مگر فارسٹ روڈ کا کوئی نشان نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر وہ پھر تھا روؤں کی بستی کی طرف چلا دیا۔ تاکہ رکشنی کے پاس جا کر راستہ کا ٹھیک ٹھیک پتہ معلوم کرے۔ مگر جب وہ بستی کے قریب پہونچا تو پگڈنڈی سے ذرا نیچے اُتر کر، نشیب میں ایک مکان کے اندر سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب رکشنی کو جا کر کیوں خواہ مخواہ پریشان کیا جائے۔ کیوں نہ اسی جگہ سے جا کر راستہ معلوم کر لیا جائے اور پھر وہ نشیب میں اُتر گیا۔ یہ مکان لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ جس کے اوپر چھپری نما پھوس کی گول سی چھت پڑی ہوئی تھی۔ چاروں طرف باڑ کھینچی ہوئی تھی۔ جس کو عبور کر کے جب وہ اندر داخل ہوا تو چکنی مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کے اندر مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ مگر وہ چپ چاپ چلتا ہوا جھکی ہوئی چھت کے نیچے چلا گیا۔ دروازہ بند تھا اور اس میں سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ رگھبیر نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پکارنے لگا۔

"اے، کوئی ہے، یہاں!"

مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کئی بار آواز دی لیکن کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔ شاید سب لوگ بہت گہری نیند سو رہے تھے۔ اس نے دروازے پر جا کر اس کو کھٹکھٹایا۔ اس دفعہ بھی کوئی نہ بولا۔ البتہ دروازے کو ہلانے سے ایک پٹ کھل گیا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کوئی چادر میں لپٹا ہوا سامنے فرش پر سو رہا تھا۔ اور اس کے سرہانے، طاق پر ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے۔ جس کی زرد روشنی میں لکڑی کی سیاہ دیواروں والا کمرہ بڑا آسیبی معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اندر چلا گیا اور سونے والے کے قریب جا کر اس کے چہرے پر سے چادر کو ہٹا دیا۔ مگر وہ مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑے بھیانک انداز میں کھلی ہوئی تھیں۔ زبان باہر نکل آئی تھی اور گردن کے پاس گہرا زخم تھا۔ جس پر خون کے گہرے سرخ لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ وہ جھکا ہوا بھی نظروں

سے اس کو دیکھتا رہا۔ پھر ایکا ایکی اس کو خطرے کا احساس ہوا اور وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر جب وہ جانے کے لئے مڑا تو اس نے دیکھا کہ دروازے پر رکشنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں شکار پر جھپٹنے والے عقاب کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ اس کو خونخوار نظروں سے گھورتی رہی اور رگھبیر سہما ہوا سا چپ چاپ کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ رکشنی کے چہرے پر چھائی ہوئی دیوانگی کم ہوتی گئی۔ وہ اندر آ گئی اور چپ چاپ کھڑے ہو کر لاش کو دیکھنے لگی۔ پھر ایک بار گی وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ پھر اس نے سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں رگھبیر سے کہا۔

"دیکھو، سارنگ مجھے ابھی تک دیکھ رہا ہے؛ تم اس کا منہ ڈھک دو، میں اب اس کو نہیں دیکھ سکتی۔"

پھر اس نے خود ہی بڑھ کر اس کے چہرے پر چادر ڈال دی، اور رگھبیر باہر چلا آیا۔ ذرا دیر بعد وہ بھی وہاں آ گئی۔ دونوں خاموش کھڑے رہے اور جب وہ مکان سے باہر جانے لگا تو رکشنی نے مڑ کر کہا: "سنو" اور وہ اس کے قریب آ گئی "تم چاہو تو رات بھر میرے ساتھ سو سکتے ہو۔ پر تم نے جو کچھ دیکھا ہے۔ وہ کسی سے نہ بتانا گے۔" رگھبیر نے اس کے شانے پر تھپتھپا کر بڑے صاف لہجے میں کہا۔

"نہیں! یہ بات میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ تم گھبراؤ نہیں، جاؤ تمہارے بچے مچان پر اکیلے پڑے ہیں۔"

وہ کہنے لگی "ہاں وہ بھوک سے رو رہے ہیں۔ میں ان کے لئے مٹھی بھر چاول ڈھونڈنے آئی تھی۔ میں چلی جاؤں گی۔"

اور رگھبیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا باڑھ کو عبور کر کے پھر پگڈنڈی پر آ گیا۔ گرم جگہ پر رہنے کے باعث ایکا ایکی اُسے باہر آ کر بڑی سردی معلوم ہوئی وہ اپنے کوٹ کے کالروں کو درست کرتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ "سالا یہ پیٹ ہی بڑی بُری بلا ہے ــــ!!"

مہاراج وکرما دتیہ کے راج سنگھاسن کی پتلیاں اب گونگی ہو چکی ہیں۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ایک ایسا بھی یُگ آئے گا کہ سارنگ کو رکشنی کا روپ دھارنا پڑے گا۔

نٹ ہمسن ــــــ نوبل پرائز یافتہ مصنف

کا

شاہکار ناول

بھوک

- جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے
- جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے
- جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بناتا ہے
- جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو کمربستہ کرتا ہے

مترجمہ: مخمور جالندھری

(زیر طبع)

مکتبۂ شاہراہ دہلی

حمید اختر

اک جہاں یہ بھی ہے

رابعہ سائے کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی اور عزنوی میرا عزیز دوست، بھائی اور رابعہ کو گھورتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ رابعہ ہمیشہ سائے کی طرح اس کمرے میں داخل ہوتی ہے اور عزنوی ہمیشہ مجھے اور اس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ وہ جب بھی اس کمرے میں آتی ہے تو دھوپ کی پہلی کرن کی طرح، جس کے آنے کا میٹھا سا خوشگوار احساس ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔ وہ کرن جو دریچے میں سے گذرتی ہوئی کمرے میں داخل ہو کر سوئے ہوئے انسان کا منہ چوم لیتی ہے مگر اس طرح کے سونے والے کے آرام میں خلل نہ ہو ـــــ لیکن یہ عزنوی جو حقیقت میں کمرے سے اپنے جسم کو باہر دھکیل دیتا ہے۔ کچھ اس انداز سے گھورتا ہے کہ اس کی کھا جانے والی نظریں پہروں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ جاتے وقت وہ اپنے چہرے پر غصہ، نفرت، مجبوری اور بے چارگی کے اتنے ٹیلے تاثرات جمع کر لیتا ہے کہ میں سہم جاتا ہوں ـــــ وہ پچھلے سال ڈیڑھ سال میں مجھے کئی لاکھ بار تنبیہہ کر چکا ہے کہ میں رابعہ جیسی آوارہ لڑکی سے ملنا چھوڑ دوں ورنہ وہ مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائیگا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے تعلقات ختم کرنے کے معاملے میں معلوم ہوتا ہے ہم دونوں یکساں کمزوری کا شکار ہیں کیونکہ باوجود کوشش کے نہ میں رابعہ سے تعلقات ختم کر سکا ہوں اور نہ عزنوی مجھ سے ـــــ رابعہ کے لئے تو خیر میرے دل میں کافی بڑی جگہ ہے لیکن عزنوی کے دل میں میرے لئے معلوم نہیں کیسے مشتعل جذبات موجزن ہیں کہ وہ مجھے نصیحتیں بھی کرتا ہے، چھوڑنے کی دھمکی بھی دیتا ہے اور کبھی کبھی یہ اعلان بھی کرتا رہتا ہے کہ وہ صرف میری دیکھ بھال کرنے کے لئے یہاں موجود رہتا ہے ورنہ میری عادتیں ایسی ہیں کہ اصولاً اسے بہت پہلے چھوڑ کر چلے جانا چاہئے تھا ویسے میں اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ واقعی میری دیکھ بھال کے لئے یہاں موجود ہے یا کسی اور مجبوری کی وجہ سے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اگر چاہے تو مجھے بہت تنگ کر سکتا ہے کیونکہ وہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ دس سال پہلے جن دو سو رائوں نے ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ لمبی بھوک ہڑتال کی تھی وہ ان میں سے ایک ہے۔ وہ بھوک ہڑتال اور ستیہ گرہ کرنے میں اتنا ہی تجربہ کار ہے جتنی رابعہ اپنے شوہر کو دھوکا دینے میں۔ مگر عزنوی اس ستائیس سالہ بھرے ہوئے جسم کی عورت کے سامنے ستیہ گرہ کر سکا ہے نہ بھوک ہڑتال۔ وہ اسے محض نفرت کرتا ہے اور اس کی وجہ سے اس نفرت اور بیزاری کا اظہار کبھی کبھی مجھ سے بھی کر دیتا ہے۔

رابعہ سے یا اسی قسم کی کسی دوسری عورت سے اس کے نفرت کرنے کی کئی وجوہات ہیں جو میں اپنی بزدلی کے باوجود اسے بتا چکا ہوں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے وہ بہت جذباتی ہو گیا ہے اور اس نے اپنے آپ کو قوم پرست کہنا ترک کر دیا ہے۔ پھر کچھ دن بعد وہ خدا کے وجود سے بھی منکر ہو گیا۔ کہتا میرا خیال تھا کہ اس طرح وہ خدا کے خلاف ستیہ گرہ کر کے کم از کم اپنے اندر بیٹھے ہوئے ستیہ گرہی کو تسلی دیتا رہتا ہے۔ دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ وہ رابعہ سے اور بقول اس کے رابعہ کی آوارگی سے ڈرتا ہے چنانچہ پچھلے کئی ماہ سے وہ مختلف طریقوں سے مجھے اس آوارہ عورت کے پنجے سے رہائی دلانے کی کوشش کر چکا ہے۔ لیکن رابعہ پر جو سورج کی پہلی کرن کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ عزنوی کی چالوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اسی طرح چپکے سے دبے پاؤں اس کمرے میں آجاتی ہے۔ جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہے۔

عزنوی کے جانے کے بعد رابعہ نے دروازہ بند کر دیا۔ اپنے رنگین برقعے کو تہہ کر کے میرے بستر کے تکیے پر رکھ دیا اور پلنگ کے سامنے میری اکلوتی ٹوٹی ہوئی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک میں اس کے سوٹ کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کا سوٹ اس وقت اچھا ہے یا خراب۔ یہ سوال اس کی آمد پر ہمیشہ میرے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں ابھی تک خود اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ جب میں اس کی شکل کے بارے میں غور کرتا ہوں تو ایک ساتھ میرے ذہن میں اس کی خوبصورتی اور بدصورتی کے ملے جلے نقوش ابھرتے ہیں۔ جب میں اس کے جسم کو غور سے دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں ایک ہی وقت میں انتہائی دلکشی اور انتہائی بھدے پن کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب میں اس کی عمر پر غور کرتا ہوں تو کبھی مجھے وہ اپنی عمر سے بہت کم ایک الھڑ نازنا شناس اور جذباتی لڑکی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور کبھی ایک سمجھ چالاک اور ڈھلی ہوئی عورت بن کر سامنے بیٹھتی ہے۔

یہ باتیں یقیناً عجیب و غریب ہیں۔ لیکن وہ اتنی ضدوں کا مجموعہ ہے کہ اس کے بارے میں کبھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ابھی جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے اس کا چہرہ اس پھول کی طرح شگفتہ معلوم ہوا جسے صبح کی شبنم نے دھو کر نکھار دیا ہو۔ پھر جب اس نے برقعہ کو تہہ کر کے میرے بستر کے تکیہ پر رکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ گیہوں کے کھیت

میں خود رو جنگلی گھاس کا ایسا پودا ہے جسے نلائی کرتے وقت کسان اٹھا کر باہر پھینک دے گا اور اسے کوئی افسوس نہ ہوگا لیکن وہ سرے ہی لمحے جب کرسی پہ بیٹھ کر وہ مسکرائی تو مجھے یوں معلوم ہوا جیسے وہ میری روح کو جلا بخش رہی ہو اور میں ایک گمبھیر اور پُراسرار پاکیزگی کے احساس سے سرشار ہوگیا۔

"دو دن سے تم نے مجھ سے آنکھ تک نہیں ملائی ..... میں نے کئی بار تمہیں دیکھا .... لیکن تم تو اس طرح پاس سے گذر جاتے رہے ہو جیسے مجھے جانتے ہی نہیں ہو تم اتنی جلدی اس قدر کس طرح بدل جاتے ہو۔ کبھی تو اس طرح بلاتے ہو کہ میں نہ آئی تو تمہارا دم نکل جائیگا۔ اور پھر اس طرح ....."

یہ بات اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہی اور رونے لگی۔

میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اے عورت کم از کم فی الحال اس طرح مت رو ..... کیونکہ ابھی تیری مسکراہٹ سے میرے ذہن میں پاگیزگی کے وہ پراسرار جذبات پیدا ہو رہے تھے جو اس قسم کی گھٹیا باتوں کی تاب نہ لاکر فنا ہو جاتے ہیں۔ کیا تو کم از کم چند منٹ کے لئے یہ رونا دھونا بند نہیں کر سکتی؟"

اس نے بروقت دار یچے کی طرح رونا دھونا ملتوی کر دیا۔ اور پھر مسکرانے لگی ـــــ یہ اس کی غالباً سب سے بڑی خوبی ہے کہ جب وہ رونے پہ آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آنسو ساری کائنات کو بہا کر لے جائیں گے۔ لیکن فوراً ہی بعد جب وہ مسکراتی ہے تو معلوم ہی نہیں ہوتا اس کے آنسو کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ رونے اور مسکرانے کے درمیان دو کسی عبوری سٹیج کی قائل نہیں۔ اسے اس طرح ہشاش بشاش دیکھ کر میں نے کہا "واب ایک دفعہ پھر سن لو کہ دو دن سے میں نے اس وجہ سے تم سے آنکھ نہیں ملائی کیونکہ پچھلے دو دن سے تمہارا ریلوے گارڈ خاوند گھر پر تھا اور صبح صبح جب اسے میں کوٹھے کی چھت پر کسرت کرتا ہوا دیکھتا ہوں تو تمہاری طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہوں کیونکہ تمہارے کابلی پہلوان کے سے خاوند کے ہاتھوں مرنا مجھے کسی قیمت پر بھی منظور نہیں۔ اور آئندہ کے لئے بھی یاد رکھو کہ وہ جب بھی گھر پر ہوگا میں آنکھیں بھی بند رکھوں گا اور وہ کھڑکی بھی جو تمہارے گھر کی طرف کھلتی ہے۔"

معلوم نہیں میرے اس فقرے سے اس نے اپنے خاوند کا تعریف کا پہلو نکالا یا اسے میری بذلہ سنجی کی کرامات سمجھا۔ بہرحال وہ خوش ہوگئی اور اس خوشی کے اظہار کیلئے کرسی سے اُٹھ کر میرے پلنگ پر آ بیٹھی۔ اور اپنے دونوں بازو پھیلا کر میرے کندھوں پر رکھتے ہوئے پھر رونے لگی۔

"پھر وہی حرکت! خوش ہوتی ہو تو رونے لگتی ہو اور غمگین ہوتی ہو تو مارے خوشی کے لوگوں کو کاٹتی پھرتی ہو۔ آخر کیا ہوا تمہیں؟ کیا تم اپنے خاوند سے تنگ ہو ـــــ؟"

"چلو بڑے آئے میرے خاوند کی بُرائی کرنے والے! آئندہ میرے سامنے اس کی بُرائی مت کرنا ـــــ" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا بلکہ کئی رنگ بدلے اور کان کے پاس اس کے سفید گالوں میں اس کی کھنچی ہوئی نیلی رگوں کا جال اور خون کا دباؤ صاف طور پر دکھائی دینے لگا۔

آدھ منٹ وہ اسی طرح کچھ سوچتی ہوئی بیٹھی رہی پھر اس نے اپنے جسم کو جھٹکا دیتے ہوئے اپنے سر کو میرے کندھوں پر سے اٹھایا اور برقعہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ بالکل اسی طرح سائے کی مانند جیسے آئی تھی ویسے ہی چپ چاپ غائب ہوگئی۔

لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ناراض نہیں ہوگی اور لوٹ کر پھر آئیگی۔ کیونکہ یہ پہلا اتفاق نہیں تھا کہ وہ اس طرح معمول سمجھ میں آنے والی کسی بات سے روٹھ کر چلی گئی ہو۔ ہمیشہ وہ ایسی ہی حرکتیں کرتی تھی اور میں ہمیشہ یہی سوچتا رہ جاتا کہ آخر وہ کونسی بات ہے جس سے وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے ـــــ اس کے خوش یا ناراض ہونے کا کوئی خاص قاعدہ یا اصول نہیں تھا۔ بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح کبھی وہ ہاتھ لگانے سے بگڑ جاتی ہے اور کبھی ہاتھ نہ لگانے سے۔ میں جب کبھی پیار بھرے جملے منہ سے نہیں نکالتا تو وہ بھولے پن سے اس کی وجہ پوچھ لیتی ہے اور بڑی میٹھی ادا سے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ میں اسے کہوں "رابعہ تمہارے بغیر میری زندگی محال ہے!" اس کے بالوں کو سہلاؤں اس کے ماتھے کو چوموں اور بے پناہ محبت کا اظہار کروں۔ لیکن جب میں اس کے لئے تیار ہو جاتا ہوں تو وہ تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اور مسکرا کر کہتی ہے۔ "تم میرے کون ہوتے ہو! تمہیں کیا حق ہے اس طرح کی حرکتیں کرنے کا!" اس طرح وہ میری بے چینی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتی ہے اور طرح طرح اپنی بچوں کی سی معصومیت سے اس کا اظہار بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس بیٹھنا، اس سے باتیں کرتے رہنا، اسے خوش رکھنا یا یہ فیصلہ کرنا کہ اس کا ایک دم سے رونا یا ہنسنا حقیقی جذبات کی وجہ سے ہے یا محض ایک بہانہ، بہت مشکل کام تھا اور اسی مشکل پہ آج پھر نئے سرے سے غور کرتے ہوئے میں نے اُٹھ کر اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکی کھول دی اور بازار کی طرف یونہی دیکھنے لگا۔

محلے کے اس بازار میں اور شہر کے اس عین مرکزی علاقے میں بڑے عجیب و غریب لوگ بستے ہیں۔ خود یہ علاقہ بھی کئی حیرت انگیز خصوصیات رکھتا ہے۔ دن بھر

یہاں گرد اُڑتی ہے اور بچے شور مچاتے ہیں اور اس علاقے کے رہنے والے اکثر بچوں کی چھوٹی چھوٹی معصومانہ لڑائیوں کو فن حرب کے جدید طریقوں تک لے آتے ہیں اور پھر خود اس معرکۂ جنگ و جدل میں اس قدر بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں کہ ضمانت دینے والے ہی انھیں اس سے نجات دلاتے ہیں۔

اس علاقہ کی سب نالیاں دن رات منھ کھولے پڑی رہتی ہیں۔ اور گھروں کی موریوں میں سے آنے والے غلیظ پانی کو کھلے میدان میں اس طرح پھیلا دیتی ہیں گویا انھیں اسی عظیم مقصد کے لئے بنایا گیا ہو۔ ان نالیوں میں سے پانی دن رات پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے اور پھر ان گڈھوں میں جا گرتا ہے جنھیں میونسپل کمیٹی کے کارکنوں نے شاید رفاہِ عام کی خاطر راستوں میں جگہ جگہ تیار کیا ہوا ہے۔

یہ علاقہ شہر کے عین وسط میں ہے اور اپنے کیرکٹر کی جملہ خصوصیات کی وجہ سے مجھے اس میں اور رابعہ کے گھر میں ایک خاص مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا بھی کوئی خاص اصول نہیں ہے۔ رابعہ اپنے خاوند سے آنکھ بچا کر مجھ سے محبت کا اظہار کرنے آتی ہے اور چاہتی ہے میں اس کے خاوند کے سامنے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھوں اور اسی خاوند کی بُرائی سُن کر ناراض ہو جاتی ہے اور بھاگ جاتی ہے اور اس علاقے کی میونسپل کمیٹی کی بتیاں چاندنی راتوں میں تمام رات جلتی ہیں۔ مگر اندھیاری راتوں میں آنکھ بند کئے بے سُدھ لٹکی رہتی ہیں۔

میرے اس کمرے کے قریب کوئی سڑک نہیں ہے اگرچہ بہت سی سڑکوں کے نشانات اب تک پائے جاتے ہیں جو آہستہ آہستہ گہرے گڈھوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی مجھے ہمیشہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس شہر کی ہر سڑک میرے اس کمرے میں سے ہو کر گذرتی ہے۔ دن بھر یہاں سے مختلف انسان، مویشی، سائیکل، چھکڑے اور ریڑھے گذرتے رہتے ہیں۔ چھکڑوں پر لدی ہوئی بوریاں، گوبھی کے پھول، شلجم اور غلاظت کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ اور چھکڑوں کے آگے وہ ہانپتے ہوئے پسینے نظر آتے ہیں جن کے مالکوں کی تھوتھنیاں ان بھینسوں سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہیں۔ کبھی کبھی میرے کمرے کے عین سامنے آ کر کوئی بھینسا عدم تعاون کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور زمین پر لوٹنے لگتا ہے۔ ایسے وقت میں سامنے کی دوکان پر بیٹھے ہوئے مولوی نور محمد کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کبھی گوبھی کے پھول یا چند شلجم اس بھینسے میں زمین پر گر جاتے ہیں تو وہ لپک کر کمال صفائی سے اٹھا لیتا ہے۔ اس کے ساتھی اگرچہ خاموش رہتے ہیں، لیکن اسے اس طرح گھورتے ہیں جیسے وہ ان کے حقوق پر چھاپہ مار ہو۔

اسی کمرے کے عین سامنے ایک تنور ہے جس کا مالک ضلع انبالہ کا ایک مہاجر ہے۔ وہ صبح سویرے نہایت اُجلے کپڑے پہنتا ہے، کان میں وہ بیڑیاں ٹھونس کر تنور پر آ بیٹھتا ہے۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور جوں جوں ان شعلوں کی تپش اس کے چہرے کی سیاہی کو چھیڑتی ہے اسے گذرے ہوئے دنوں کی یاد ستاتی ہے۔ اس کا نام بشیر محمد ہے میلی سی صافی پر گول روٹی کو رکھ کر وہ مکرتک تنور میں گھس جاتا ہے اور روٹی کو وہاں درج کر دیتا ہے۔ کبھی کان میں لگی ہوئی اس کی بیڑی اس عمل کے دوران میں آگ پکڑ لیتی ہے تو وہ اُسے اٹھا کر پھینکتے ہوئے پھیپھڑوں کے پورے زور سے کہتا ہے "ہات تیرے سالے نصیب کی! کہاں میاں بشیر محمد اور کہاں یہ ماں کا ـــــ تنور" اور پھر ادھر اُدھر بیٹھے ہوئے لوگوں پر ہمدردانہ نظر ڈال کر کہتا ہے "اجی جناب شیر، کہتے تھے گھر پر، اپنے مکان قطعے اپنی زمین تھی، اور خود میں کئی زبانوں کا ماہر ہوں عربی بول سکتا ہوں۔ وتعز من تشا..... فارسی بول لیتا ہوں۔ کے آمدی و کے پیر شدی؟ اور یہی کیا جرمن زبان میں بول سکتا ہوں۔ برلن زبان میں بول سکتا ہوں" "ابے برلن زبان کے بچے روٹیاں جل رہی ہیں ـــ" ایک آواز آتی ہے۔ اور بشیر محمد کمر تک تنور میں غائب ہو جاتا ہے۔

ایک بڑھیا میرے برابر کی ایک دوکان میں رہتی ہے اور ہر تیسرے دن اس دوکان کے فرش اور باہر کے چھ مربع فٹ صحن کو جو راستے میں پڑتا ہے بڑی محنت سے لیپتی ہے اور پھر وہاں سے گذرنے والوں کو صحن خراب کرنے کے الزام کی بنا پر گالیاں دیتی ہے، ان کے پیچھے بھاگتی ہے اور منھ سے کف چھوڑتی ہوئی ہانپتی کانپتی اگر بیٹھتی ہے کہ کوئی شریر بچہ پھر اس کے صحن پر سے ٹھپ ٹھپ کرتا ہوا گذرنے کی کوشش کرتا ہے اور بڑھیا اس کے تعاقب میں روانہ ہو جاتی ہے۔

غالباً اس کی دُنیا میں اس لاٹ شدہ دوکان کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اور وہ خود بھی کوزہ اور خود بہی گل کوزہ ہے اس کے منھ میں کوئی دانت نہیں ہے لیکن ہر شام کو وہ مکئی کے دانوں سے جھولی بھرتی ہے اور ان سے کھیلتی اور بھولے ہوئے گیتوں کو یاد کر کے بیٹھی ہوئی بھوتوں کی سی آواز میں گاتی رہتی ہے۔

اس کا خیال ہے کہ قیامت کا دن کافی لیٹ ہو چکا ہے۔ اصولاً قیامت اسی روز ہونی چاہیے تھی جس دن اسے اپنی بلڈنگ چھوڑنی پڑی تھی اور جس دن اس کے بوڑھے شوہر کو دشمنوں نے مار ڈالا تھا۔ جب وہ لڑائی جھگڑے سے فرصت پاتی ہے تو ہر راہگیر سے پوچھتی ہے "بھرتی کھل گئی ہے یا نہیں؟"

معلوم نہیں وہ خود بھرتی ہونا چاہتی ہے یا اس سے اس کی کوئی یاد وابستہ ہے۔ کیونکہ بھرتی کرانے کے لئے اپنی جان کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ بھی تو نہیں ہے۔

شاہراہ

اس بڑھیا کے عین سامنے والی دوکان میں مولوی نور محمد رہتا ہے۔ وہ اس محلے کی مسجد کا منتظم ہے۔ سوت کی بلیک مارکیٹ اور مسجد کے چندے کی وجہ سے پچھلے سال اس نے حج کر کے عاقبت کی فکر سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا ہے اور اب وہ حاجی نور محمد کہلاتا ہے۔

حاجی نور محمد سوت کے گٹھوں کے درمیان اس طرح بیٹھا رہتا ہے گویا ہلنے جلنے سے وہ ٹوٹ کر گر جائیگا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے جسم کے ایک آدھ حصے کو حرکت میں لاتا ہے۔ اس کا پورا جسم حرکت کرتے ہوئے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔ صرف اس کی زبان چلتی ہے۔ صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد وہ جم کر دوکان میں بیٹھ جاتا ہے اور لوگوں کو عاقبت سنوارنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی قرب و جوار کے بہت سے چھوٹے چھوٹے دستکار اس کے منہ سے فضیلت کی باتیں سن کر جھوم رہے تھے اور حقے کے کش لے رہے تھے۔

"زمانے کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ایک دوسرے نے لقمہ دیا "شراب خوری، زناکاری، جھوٹ مکر اور ریاکاری کا زور ہے۔ اللہ اپنا رحم کرے۔"

قربِ قیامت ہے، حاجی جی قربِ قیامت۔"

"دیانت داری تو دنیا سے غائب ہو گئی ہے" ایک جولاہے نے سوت کی گانٹھوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"حالانکہ دیانت داری کا بڑا اجر بارگاہِ خداوندی سے ملتا ہے ——" حاجی نور محمد نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "روایت ہے کہ مکہ مدینہ کا ایک غریب بھوکا مکڑا ہوا ندی کے کنارے چلا جا رہا تھا کہ پانی میں اسے ایک سیب تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ بھوکا تھا اٹھا کر کھا لیا۔ رات کو گھر آ کر قصہ بیان کیا تو نیک ماں نے کہا "بیٹے یہ تو نے بُرا کیا بغیر پوچھے تو نے کسی کا سیب کھایا ہے اگر تو نے اس کے مالک سے معافی نہیں مانگی تو تو کبھی اس کا کفارہ ادا نہیں کر سکے گا۔ جا اور ابھی جا کر اس کے مالک کی اجازت طلب کر ——"

"آہا ہا۔ واہ واہ" دو تین آوازیں آئیں۔

"تو جی پھر وہ پانی کے اُلٹے رخ چل پڑا اور چلتے چلتے آخر ملکِ مصر میں پہنچ گیا۔ کیونکہ وہ ندی اسی طرف سے آتی تھی۔ وہاں ایک باغ کے سیب کے درخت کی شاخ ندی کے اندر جھکی ہوئی نظر آئی۔ نوجوان نے جا کر اس کے مالک سے ماجرا بیان کیا۔ اور کہا مجھے معاف کر دو۔"

"تو اس نے کیا کہا؟" ایک آدمی نے بڑی بیقراری سے حاجی نور محمد سے پوچھا۔

"اس نے کہا کہ معاف تجھے میں کر دوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تو میری لڑکی سے کہ جو آنکھوں سے اندھی اور ٹانگوں سے لنگڑی ہے شادی کرے۔

نوجوان راضی ہو گیا اور رات کو جب اس نے اس لڑکی کو دیکھا تو وہ نہ تو اندھی تھی اور نہ لنگڑی بلکہ حوروں کی سی حسین اور خوبصورت چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ——"

"سبحان اللہ یہ ہوتا ہے دیانت داری کا اجر ——" نور جمال چوکیدار نے کہا۔

لیکن روایت ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ حاجی نور محمد اسی طرح مگن ہو کر داستان سنا رہا تھا۔ "اچھا تو صبح نوجوان نے مالک سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ شاید کچھ غلطی ہو گئی ہے کیونکہ لڑکی نہ لنگڑی ہے نہ اندھی —— تو مالک نے کہا وہ اندھی ہے اس وجہ سے کہ آج تک کسی غیر مرد کو اس نے نہیں دیکھا۔ اور لنگڑی ہے اس وجہ سے کہ اس چہار دیواری سے باہر اس نے قدم نہیں رکھا۔"

"ہائے ہائے —— تیری شان مولا۔ جزاک اللہ۔"

پھر کچھ دیر اور اسی موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد حاضرین نو چودہ روپے کی سوت کی گانٹھ کے بیس بیس روپے مولوی نور محمد کو دیکر رخصت ہو گئے اور میں کتنی ہی دیر کھڑکی میں کھڑا یہ سوچتا رہا کہ بنیا خواہ ہندو ہو یا مسلمان اپنے مطلب کی روایت تخلیق کرتا ہے اور نیکی کا پھل ضرور حاصل کر کے دکھا دیتا ہے اور مسلمان بنیا تو اس میں کچھ مدت بھی نہیں پڑنے دیتا بس اس ہاتھ سے نیکی کرو اور دوسرے ہاتھ سے اجر لے لو۔

کھڑکی بند کرتے وقت میرا ہاتھ ٹوٹی ہوئی سلاخ پر پڑ گیا جسے فسادات کے زمانے میں شاید کسی نے اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس ٹوٹی ہوئی سلاخ کے ساتھ کتنی کہانیاں وابستہ تھیں جو مجھے یاد آنے لگیں۔ کیونکہ کچھ ہی عرصہ پہلے میں نے اس بستی کے ہر گھر کو اُجڑتے اور لٹتے دیکھا تھا اور اس لوٹ میں

درد کی چند ٹیسوں کے علاوہ میں کچھ حاصل نہ کر سکا تھا اور درد کی ان ٹیسوں کی مہربانی سے میں نے اپنی بزدل پر شرافت کا ایک دبیز پردہ ڈال لیا اور خاموش ہو گیا۔

رفتہ رفتہ یہ بستی پھر آباد ہو گئی۔ اب اس میں غالباً میں ہی واحد وہ آدمی ہوں جو اس کے اُجڑنے اور پھر بسنے کی تاریخ سے واقف ہے۔ بسنے کو تو یہ بستی پھر بس گئی لیکن نئے آنے والوں نے ایک رابعہ کے علاوہ اس بستی کو اور کوئی ایسی چیز نہیں دی جس سے مجھے کوئی خاص دلچسپی ہو۔ رابعہ کی آمد سے میری جوانی اور زندگی کے زوال کا عمل رک گیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اب لازوال ہو گئی ہیں ——— یوں تو میری جوانی بڑے زور سے آئی تھی لیکن جب رخصت ہونے لگی تو مجھے اس کا علم بھی نہیں ہوا۔ رابعہ نے شاید اس حقیقت کو سمجھ لیا اور میری رخصت ہوتی ہوئی جوانی کو اس نے پکڑ لیا ہے کیونکہ وہ اس نشے کی مانند ہے جسے پی کر انسان وقت کی روانی کو رُکا رُکا محسوس کرتا ہے اور زندگی بھاگتی مشورچاتی کھلتی اور روندتی ہوئی حقیقت نہیں رہتی بلکہ اس میں ایک سکون اور طمانیت کا احساس ہونے لگتا ہے اور اب میں اسی سکون اور طمانیت کو لئے بیٹھا ہوں جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے اور سوچ رہا ہوں کہ رابعہ پھر کب آئے گی۔

اچانک غزنوی کی آمد سے میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ غزنوی ہمارے تیسرے شاعر ساتھی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔

یہ تیسرا ساتھی تیسرے درجے کا گھٹیا اعصابی شاعر ہے جو ہفتوں غائب رہتا ہے اور پھر کسی سہانی صبح کو اس کمرے میں آموجود ہوتا ہے۔ یہ شاعر عشق کی تلاش میں کافی گھس چکا ہے۔ لڑکیوں کو عشق پر آمادہ کرنے کے لئے اس نے پروگرام کے مطابق کئی لمبی لمبی نظمیں لکھیں مگر مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور اب اسے دیکھ کر گھسی ہوئی پشاوری چپل یا آم کی گٹھلی کا خیال آتا ہے۔ میں جب بھی اس کے چہرے پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا جیسے تازہ پاش شدہ میز پوش پر بے خیالی میں کسی کا ہاتھ پڑ گیا ہے اور اپنے نشان چھوڑ گیا ہے۔

"خیریت تو ہے؟"

"نہیں خیریت نہیں ہے۔ میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں..... ہر طرف سے تنگ آ کر آخر میں نے صحیح اسلامی طریقے سے عشق شروع کر دیا ہے اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں لیکن معاملات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتے ——— اور اب میں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا ———"

مزید پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے کوٹھوں کی چھتوں پر دھوپ تاپتی ہوئی بعض لڑکیوں پر عشق کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ اکثر کی طرف سے بہت حوصلہ افزا جواب بھی ملا۔ سلام و پیام بھی ہوئے۔ مسکرا کر اظہار محبت بھی ہوا لیکن اس سے آگے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔

غزنوی پلنگ پر سے اُٹھ بیٹھا اور اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "شاباش" لیکن شاعر نے غزنوی سے نہیں سُنا۔ وہ اپنی بات کہے جا رہا تھا۔ "پندرہ دن سے میرے اعصاب میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا ہے اور اگر صورت یہی رہی تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا ——— تم ہی بتاؤ دوستو لڑکی کی مرضی بھی ہے اور میری بھی اسے ملنے کی مرضی ہے۔ لیکن اب آگے راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ راستے میں دیواریں ہی دیواریں حائل ہیں ———"

میں نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "آہ ظالم سماج ———"

"سماج کے بچے چپ رہو..... یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

غزنوی نے شاعر کو کرسی پر سے اُٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور کہا۔ "تم بالکل اُلو ہو..... سُن رہے ہو۔ اگر تم نے اسلامی اور اپنی تہذیبی روایات کے مطابق عشق کرنے کا طریقہ اختیار کر لیا ہے تو اسلامی جہاد کی سپرٹ بھی پیدا کرو اور ایک دن سر پر کفن باندھ کر معشوقہ کے گھر کی دیوار پھاند جاؤ ——— کلیان ہو جائے گا۔"

شاعر کچھ دیر اسی طرح گم سم کھڑا رہا پھر باہر چلا گیا۔

شاعر کے جانے کے بعد غزنوی نے میری طرف کھسکتے ہوئے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ عورت کے بغیر زندگی محال ہے۔

میں نے گھبرا کے اس کے چہرے کی طرف دیکھا ——— وہ پتیلیں برس سے کچھ اوپر ہی ہو گا۔ اور اس وقت مٹی کے تیل کے دیئے کی روشنی میں وہ بوڑھے بیل کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"اب رابعہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

میرے اس سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا ——— اس کے چہرے پر اسی سکون اور طمانیت کے آثار تھے جو ستیہ گرہ، بھوک ہڑتال اور برہمچریہ سے پیدا ہو جاتے

ہیں۔ سونے سے پہلے آج بھی اس نے مجھے آوارگی سے باز آنے اور رابعہ جیسی آوارہ عورت سے تعلقات ختم کرنے کی تلقین کی اور پھر خراٹے لینے لگا۔

آدھی رات کے قریب بستی میں ایک ہنگامہ سا ہوگیا۔ شور کی آوازیں آنے لگیں اور ایک عام بھگدڑ مچ گئی۔ پولیس کی ایک بھاری جمعیت ناکہ بندی کر چکی تھی۔ اور سامنے ہوٹل کی تلاشی ہو رہی تھی۔ بشیر محمد کے تنور کے پچھواڑے بھی ایک مکان میں دو سپاہی گھس گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہوٹل کا مالک اور چار عورتیں پولیس والوں کے ساتھ اندر سے نکلتے نظر آئے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہاں عورتوں کا کاروبار باقاعدہ ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اس عمارت میں لالہ دھنی رام سیمنٹ کا کاروبار کرتے تھے اور نیچے تہ خانے میں سیمنٹ کی بوریاں رکھی رہتی تھیں۔ اب نیچے کولی وادی کے مہاجر رہتے ہیں جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے اس طرح لڑھکے کہ تحت الثریٰ میں پہنچ کر دم لیا۔ یہ کئی دہا جو خاندان ہیں۔ جب یہ آئے تھے تو ان کی عورتیں کلو کے سیبوں کی طرح سرخ تھے۔ لیکن ہوا اور روشنی کی کمی سے یہ سیب سڑ گئے ہیں، اور اب ان کے گرداگرد ایسے بیماریوں کا زور رہتا ہے جو ان کو نئے پرانے داموں خرید کر پیسے کے دو کے حساب سے بیچنا چاہتے ہیں۔

بالآخر پولیس کے لوگ ان عورتوں اور منیجر صاحب کو لے گئے۔ جو اس بات کی دلیل تھی کہ اب پھر ہوٹل والوں اور علاقہ پولیس کی چل گئی ہے۔ کیونکہ علاقہ پولیس کے چھاپہ مارنے کا مطلب یہ تھا کہ انھیں ہوٹل کی طرف سے حصہ یا نذرانہ نہیں ملا۔ یا اس دفعہ کم ملا۔ جب تک نئی شرح منافع کا سمجھوتہ نہ ہوگا اس قسم کی شور رہے گا۔

اسی شور میں معلوم نہیں کس طرح رابعہ دروازہ میں آکر کھڑی ہوگئی۔ ایسے عام غدر کے سنہری موقع کو وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ وہ ہزار آدمیوں کے بیچ سے گذر کر اس طرح آسکتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور دیواروں کے ساتھ سائے کی طرح حرکت کرکے چوری چھپے وعدہ یا بے وعدہ کسی کے پاس پہنچے میں اسے جو لطف ملتا ہے وہ اس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

میں نے سوئے ہوئے عزنوی پر ایک نظر ڈالی اور رابعہ کو بازو سے پکڑ کر چھت پر لے گیا۔ چاندنی رات میں اس کے برقعے کا بدلا ہوا فیشن اور رنگ صاف نظر آرہا تھا۔

"تمھارے پاس کتنے برقعے ہیں؟"

"سات"

"کیوں؟"

میرے کندھے پر زور سے کاٹتے ہوئے جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ بہت خوش ہے اس نے جواب دیا۔ "یہ بدذات محلے والے میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور اس بکرداڑھے مولوی نور محمد نے تو میرے آدمی سے بھی کہدیا ہے کہ ذرا گھر کا خیال رکھو گا رنڈوا صاحب! حالانکہ یہ لوگ خود مجھے تنگ کرتے ہیں۔ بھلا تم ہی بتاؤ، میں کیا برا کرتی ہوں ــــ؟"

"قطعاً کچھ نہیں ــــ مگر اس بات کا برقعوں سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق کیوں نہیں۔ میں برقعہ بدل بدل کر پہنتی ہوں تاکہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ کون پھر رہا ہے۔ اب میں سینما دیکھنے فیشنی برقعہ پہن کر گئی تھی۔ لیکن واپسی پر سیدھا برقعہ ہے ــــ"

"تو کیا سینما میں برقعہ بدلنے کا انتظام بھی ہوتا ہے ــــ؟"

"نہیں بابا۔ میں پہلے ایک سہیلی کے پاس گئی تھی یہ برقعہ سیراہار، تھا میں نے بدل لیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم نے کتنے برقعے مختلف سہیلیوں کے پاس رکھ چھوڑے ہیں؟"

"پانچ ..... اور دو اپنے پاس" اس نے دو انگلیاں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

برقعہ کا یہ افادی پہلو میرے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت میں نے برقعے کی مخالفت ترک کرنے کا عہد کر لیا۔

چاندنی رات میں اس کے گالوں پر آنسوؤں کے نشان بھی نظر آرہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیر تک روتی رہی ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیچے ٹھوڑی تک سرمئی لکیروں کے نشان صاف نظر آرہے تھے ــــ

"تم کہیں روئی ہو؟" میں نے دو انگلیوں سے اس کے گالوں کی سیاہ لکیروں کو چھوتے ہوئے کہا۔

اس نے اس بات کے جواب میں میرے دوسرے کندھے پر بھی کاٹ کھایا۔ اور کہا "ہاں میں جو فلم دیکھنے گئی تھی اس میں ایک بے وفا مرد کو عورت پر بڑے ظلم کرتے دکھایا ہے جسے دیکھ کر مجھے رونا آگیا اور میں سارا وقت روتی رہی ــــ"

"تم فلم کس کے ساتھ دیکھنے گئی تھیں؟" میں نے اس کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی "بس لگے اتنی سی بات پر پوچھ گچھ کرنے مرد بھی ایسے ہوتے ہیں۔ تمھیں کیا شک ہوا؟"

میں نے اپنے بیہودہ سوال پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔ "شک کی تو کوئی بات نہیں رابعہ! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا اور پھر تم سے ایسے سوال پوچھنے کا مجھے حق بھی تو نہیں ہے۔"

"حق کیوں نہیں؟ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو؟"

میں نے بات ٹال دی۔ "نہیں یہ بات نہیں بلکہ مجھے تو تمھاری یہ عادت بہت پسند ہے کہ تم ہر قصہ بدلنے تک کے کار و بار مجھے بتلا دیتی ہو ــــ"

وہ رام ہو گئی اور میرے کندھوں پر سر رکھ کر بسورتے ہوئے بولی "تم کافی اچھے آدمی ہو ..... بس ایک بُرائی ہے تم میں"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ تم سچی محبت کو نہیں مانتے ہو ــــ"

"ہوئے یہ پرانی بحث چھوڑو ــ اچھا یہ بتلاؤ کیا تم ابھی تک سچی محبت کی قائل ہو؟"

"ہاں اور مجھے تو تم سے بھی سچی محبت ہے؟"

"دیکھو میں نے تمھیں کتنی بار اس بات سے منع کیا ہے یہ تو بہت گھٹیا طریقہ ہے۔ اور اس وقت جو تم مجھ سے سچی محبت کا اظہار کر رہی ہو تو اس کی وجہ یا تو وہ فلم ہے جو تم ابھی دیکھ کر آئی ہو یا پھر ممکن ہے اس چھپکی ہوئی چائے کا اثر ہو۔"

"نہیں نہیں نہیں ..... مجھے ہے سچی محبت! اور تمھیں بھی کرنی پڑے گی ابھی! بولو"

میں نے اس کی ناراضگی سے ڈرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمھیں ہے تو مجھے بھی علیٰ ہذا القیاس"

دونوں ہاتھوں سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے اس نے زور سے کہا۔ "میں قیاس ویاس کی بات کچھ نہیں جانتی۔ صاف صاف کہو رابعہ مجھے تم سے سچی محبت ہے"

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

لیکن وہ ان پڑھ معشوقہ میرے اس مزاح سے محظوظ نہیں ہوئی بلکہ تڑپ کر الگ ہو گئی اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئی کہ میں نے اس کا دل توڑ دیا ہے اور چھت پر بیٹھا میں خالی خولی خلاؤں سے گھورتا رہا۔

اس دن میں نے پہلی بار اس عورت کے متعلق سنجیدگی سے غور کیا۔ اس کے دل کی تھاہ پا لینا کتنا مشکل ہے وہ معمولی جذبات سے اتنی شدت اور اتنی تیزی سے مغلوب ہوتی ہے کہ اس رو میں ہر چیز کو حتیٰ کہ خود اپنے آپ کو غرق کر دینے کے لئے تیار رہتی ہے۔

چھت پر سے اُتر کر بستر پر لیٹتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ کہیں معاملہ نازک صورت نہ اختیار کر جائے۔

وقتی طور پر معاملے نے نازک صورت اختیار نہیں کی کیونکہ اس واقعہ کے کئی دن بعد تک وہ آئی ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح اب بھی دو ایک دن کے بعد وہ پچھلی تمام باتوں کو بھول کر چلی آئے گی۔ کیونکہ جب بھی اس کے دل میں یہاں آنے کا خیال پیدا ہو گا وہ اس کو روک نہیں سکے گی۔ شعوری طور پر چاہے وہ لاکھ کوشش کرے لیکن اپنے دل میں اُٹھنے والے کسی طوفان، کسی جذبے کی مخالفت وہ جانتی ہی نہیں ہے۔ اس کا دل سلولائیڈ کے بنے ہوئے کھلونے کی اس کل کی طرح ہے جو کھلونے کو ہر حالت میں حرکت میں لائیگا۔ خواہ یہ حرکت اس کے لئے زیادہ نقصان رساں ہی کیوں نہ ہو۔ کئی دن تک میں یہی سوچ کر دل کو تسلی دیتا رہا کہ وہ کسی شعوری فیصلے پر جس کا تعلق اس کے دماغ سے ہو قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے وہ ضرور آئے گی۔

لیکن جب دو کئی دن تک نہ آئی تو مجھے یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ کہیں سلولائیڈ کے کھلونے کی وہ کل واقعی ٹوٹ تو نہیں گئی جو کھلونے کو گھماتی تھی، اُسے حرکت میں لاتی تھی۔

میں اسی ہی باتوں کے جال بُنتا رہا۔ کئی ہفتے گذر گئے، ایک مہینہ گذر گیا ..... دو تین چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اس دوران میں وہ کئی دفعہ میرے پاس سے مجھے چھوتی ہوئی اس طرح گذر گئی جیسے میری اس کی جان پہچان ہی نہیں ہے۔ کئی دفعہ رات کے اندھیرے میں میں اپنے کمرے میں ایک سایہ سا حرکت کرتا ہوا محسوس کرتا لیکن غور سے دیکھنے پر سوائے کمرے کی خالی اداس اور پھیکی فضا کے کچھ نظر نہ آتا ـــــ دیکھتے دیکھتے وہ حقیقت سے دور ہو گئی۔ اور میرے ذہن پر سوار ہو گئی۔ میرے ذہن میں اب بھی وہ ویسی ہی تھی۔ مسکراتی ہوئی اور روتی ہوئی، ہنستی ہوئی اور زندگی کو حرکت میں لاتی ہوئی۔ لیکن جب میں اس ذہنی ہیولے سے پیچھا چھڑا کے اسے اپنے گھر میں بیٹھے یا کوئی کام کرتے ہوئے دیکھتا تو وہ آنکھیں پھیر لیتی۔ یا جب وہ دروازہ کھول لیتی اور دروازہ کی آواز سُن کر میں کھڑکی میں آ کھڑا ہوتا تو وہ چہرے پر کسی خاص تاثر کو لائے بغیر چپ چاپ دروازہ بند کر لیتی۔

اب مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلولائیڈ کا یہ کھلونا دل نشتر بن گیا ہے۔ اور ایک پھانس کی طرح میرے دل میں چبھ گیا ہے۔ اس درد کی لذت سے میں پہلی دفعہ آشنا ہوا جس پر میں قابو نہیں پا سکتا تھا۔

اس پانچ مہینے میں اس بستی میں کئی تبدیلیاں ہوئیں، لیکن رابعہ کے رویے میں جو اس بستی کی صحیح نمائندہ ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس لمبے اور صبر آزما عرصے میں میرے گھر کے سامنے سے گزرنے والی سڑک میونسپل کمیٹی کے کاغذات میں سے دستیاب ہو گئی اور اس کی مرمت کا کام شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا۔ ایک دن صبح سویرے ایک ٹھیکیدار ترکی کی ٹوپی کالا کوٹ، شلوار اور کالے پمپ شوز پہنے ہوئے دس پندرہ مزدوروں کے ساتھ اس بستی میں نمودار ہوا۔ مزدوروں نے بڑی بڑی ٹوکریوں میں بھر کر کنکر، پتھر اور مٹی سے اس علاقے کے گڑھوں کو پاٹنا شروع کر دیا۔ تاروں کے بڑے بڑے ڈرم آ گئے اور سلفر کی بو اس علاقے کی ساری فضا میں پھیل گئی۔ دو چار مزدور تاروں کے بڑے بڑے ڈرم کڑھاؤں میں اُلٹتے، ان کے نیچے آگ جلاتے اور جب تاروں استعمال کے لئے تیار ہو جاتی تو پہلے اپنے کپڑے پالش کرتے پھر سیاہ تاروں کو سڑک پر پھیلا دیتے۔ سڑک کوٹنے کا انجن بھی ایک دن آ گیا اور دن بھر سیٹی بجاتا اس علاقے میں گشت کرتا رہتا۔ علاقے بھر کے بچے تمام مصروفیات چھوڑ کر انجن کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے۔ انجن کا بوڑھا ڈرائیور جو صورت شکل سے اچھا خاصا قلی نسخہ معلوم ہوتا تھا انھیں ماں بہن کی وہ ساری گالیاں دیتا جو اُسے یاد تھیں۔ مگر بچے ان سب گالیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے۔ تین مہینے سڑک کی مرمت کا کام ہوتا رہا۔ تین مہینے اس کام کے لئے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ جب فرلانگ بھر لمبائی پر کام مکمل ہوا تو بارش کا موسم شروع ہو گیا۔ ایک زوردار بارش ہوئی اور آدھی فرلانگ بنی ہوئی سڑک دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئی۔ باقی کی آدھی سڑک مکمل کرنے کے بعد ٹھیکیدار نے نئے سرے سے اس غائب ہونے والی سڑک کا سراغ لگا کر اس پر کام شروع کر دیا۔ لیکن دوسری بارش اس زور سے ہوئی کہ سڑک کے دونوں حصے صاف ہو گئے۔ بارش کا پانی تمام پتھروں اور کنکروں کو بہا کر لے گیا۔ اور سڑک کے نیچے کی زمین نے کنکروں کو دیواروں کے ساتھ بیٹھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور گویا اعلان کر دیا کہ اس علاقے میں وہ ان انقلابی تبدیلیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

اس ساری تبدیلی کا مجھ پر براہ راست اثر ہوا اور میں دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے لگا۔ لیکن رابعہ نے اس تبدیلی سے بھی کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

اس عرصے میں غزنوی بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے ایک دفعہ پھر مجھے اس آوارہ عورت کے پھندے سے بچنے کی تلقین کی۔ اور کہا کہ میں کسی شریف لڑکی سے شادی کر کے بیٹھ جاؤں۔ اور چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ ایک سڑک پر کسی شریف عورت کو چھیڑتا ہوا یا غالباً آوارگی پر مائل کرتا ہوا پکڑا گیا۔ جس پر اس کی خوب پٹائی ہوئی۔ اس کے بعد معلوم نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔

شاعر نے جب سے اسلامی جماعت کے ایک مولوی کی تقریر سنی ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہو جائے گی تو ہر آدمی کو لونڈیاں رکھنے کی اجازت ہو گی۔ اس کی زندگی میں زبردست تبدیلی آ گئی ہے۔ اب وہ باقاعدہ نماز پڑھتا ہے اور اسلامی حکومت کے قیام کی دعائیں مانگتا ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اسلامی جماعت کے منشور میں لونڈیاں تقسیم کرنے کی کوئی مشق نہیں ہے۔ وہاں بھی لونڈیوں کی خرید و فروخت ہو گی۔ اور خرید فروخت کے لئے پیسے درکار ہوں گے۔ اور پیسوں کے لئے کام کرنا پڑے گا۔ بشرطیکہ کام ملے۔ تمہیں کام نہیں ملے گا اور تم لونڈیوں سے محروم رہو گے۔ لیکن آج کل اس پر عرفان و اسرار کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور اس کے کان بند ہو گئے ہیں اب وہ اپنے دل کی آواز کے علاوہ اور کوئی آواز سُن ہی نہیں سکتا۔ اس لئے میں مجبوراً اس کی طرف سے قطعی مایوس ہو چکا ہوں۔

خاموش ہوگیا ہوں ــــ

اس علاقے میں اب پولیس کے چھاپے بھی نہیں پڑتے کیونکہ ہوٹل کے مالکوں اور علاقہ پولیس کے درمیان غالباً دو سالہ پیکٹ ہوگیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہوٹل کے مالکوں نے آٹھ دس چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو ایک وقت کے بچے کھچے کھانے اور ہوٹل کے عقب میں ایک تاریک کوٹھڑی میں سونے کی جگہ دینے پر ملازم رکھ لیا ہے۔ یہ ننھے ننھے بچے رات کو ہوٹل ہی میں سوتے ہیں۔ اب اگر قانون کی طاقت سے مجبور ہو کر علاقے کی پولیس نے چھاپہ مارا بھی تو ہوٹل کے مختلف کمروں میں سے ایک مرد اور ایک عورت نہیں نکلیں گے بلکہ میاں بیوی اور ایک بچہ ان کی شرافت کی سند کے طور پر پیش کر دیا جائے گا اور اس طرح سے اس علاقے کی زندگی کافی ہموار، باقاعدہ اور درست ہوگئی ہے اور ہر چیز اپنی موجودہ جگہ پر صحیح نظر آنے لگی ہے۔ بشیر محمد تنور والا البتہ ایک دن جُوا کھیلتے ہوئے گرفتار ہوگیا بعلوم نہیں اس وقت وہ جرمن زبان بول رہا تھا یا برلن زبان۔ اب اس کا تنور مردہ کتے کی طرح منہ کھولے پڑا رہتا ہے اور تنور کے کناروں سے ٹوٹ ٹوٹ کر مٹی اندر کی طرف گرتی رہتی ہے۔

مجھے ایک دن صبح سویرے اس کی گرفتاری کا علم ہوا۔ مجھے کمرے سے باہر نکلتا ہوا دیکھ کر حاجی نور محمد نے پکڑ لیا اور بشیر محمد کی گرفتاری کی داستان سُنا کر بڑے زور سے بولا "ارے یار یہ تو بڑا حرامی نکلا"

اور اس کے ساتھی دوسرے مولوی نے کہا "جی کیا پوچھو ہو بھائی قربِ قیامت ہے قربِ قیامت۔"

ایک مہینہ اور گذر گیا۔

میں نے اپنے دل کو سمجھا بجھا کر رابعہ کے متعلق غور کرنا چھوڑ دیا اور شاعر کی اصلاح کے متعلق سوچنے لگا کہ ایک دن رابعہ آگئی۔

اس نے اسی اطمینان سے برقعہ اتار کر پلنگ کے تکیوں پر رکھ دیا۔ ایک سنٹ کے لئے رُکی اور پھر اسی جگہ، اسی پرانی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "رابعہ تم اس غریب کے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

اپنی جگہ سے اُٹھ کر وہ میرے پلنگ پر آ بیٹھی اور بولی "تم مجھ سے شادی کر لو۔"

میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اپنے حواس قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ہکلا کر کہا۔ "لیکن تمہاری شادی تو ہو چکی ہے۔ تمہارے خاوند کا کیا ہوگا؟"

"میں اس سے طلاق لے لوں گی۔"

"وہ تمہیں طلاق دیدے گا؟"

"ہاں میں آج ہی۔ ابھی اس سے طلاق چاہتی ہوں۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔"

"شاید تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم بھی شاید مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو، اور میں بھی تم سے اپنے بارے میں بہت کچھ چھپا تا رہا ہوں۔ میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے۔ میں بالکل بیکار ہوں۔ (اور یہ سب کپڑے، یہ سوٹ جو تم دیکھ رہی ہو، میں نے نہیں بنوائے۔ بلکہ ادھر ادھر سے دوستوں کے جمع کئے ہیں۔ ایسی حالت میں تمہارا بوجھ کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟"

اس کے چہرے کا رنگ سفید ہوگیا۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے آج وہ اُٹھ کر نہیں گئی۔ بلکہ بڑے غصّے سے بولی۔

"تم بھی مجھے دھوکہ دینا چاہتے ہو۔ اس دُنیا میں سبھی لوگ دھوکہ باز ہیں۔۔۔۔"

لیکن کافی دیر تک بڑے اچھے اور صاف لہجے میں میں اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ ہے۔

بالآخر اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم کم از کم میرے ساتھ چلو اور میرے خاوند کے سامنے جا کر کہدو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔"

میں نے کچھ یوں محسوس کیا کہ جیسے میرے خلاف کوئی جال بچھایا جا رہا ہو۔

"میں نے کہا "آخر میں کیوں کہوں؟ اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کوئی مطلب نہیں۔ تم میرے لیے اس کے سامنے جا کر بس اتنا کہہ دو ——" یہ کہہ کر وہ معصوم بچے کی طرح رونے لگی اور کافی دیر تک کرسی پر بیٹھی روتی رہی۔

"دیکھو رابعہ میرا تمہارے خاوند کے پاس جا کر اس قسم کی بات کہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ یا پھر تم کم از کم مجھے یہ تو بتلاؤ کہ اس سے فائدہ کیا ہوگا؟"

وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی۔ "ڈھائی سال میں پہلی مرتبہ اس نے میری ہتک کی ہے میں اسے چھوڑ دوں گی —— لیکن وہ کہتا ہے تم سے اب کون شادی کرے گا۔ تم چل کر اس سے کہہ دو..... بس میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی۔"

وہ غصہ کے مارے کانپ رہی تھی۔

"تو کیا تمہاری شادی ہوئے صرف ڈھائی سال گزرے ہیں؟"

"اس آدمی سے تو ڈھائی سال ہی ہوئے۔"

"اچھا تو اس سے پہلے تم کتنے مردوں کو خاوند بنانے کی عزت بخش چکی ہو؟"

"پانچ کو ——" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تو مجھے تم چھٹا خاوند بنانا چاہتی ہو ——"

اب اسے میرے جملوں کے زہر کا احساس ہوا اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور رونے کے درمیان میں چیختے ہوئے اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔

دس سال پہلے اس کے باپ نے اسے پانچ سو روپیہ لیکر ایک آدمی سے بیاہ دیا۔ وہ سال بعد وہ اس آدمی سے لڑ پڑی۔ اس نے بتایا کہ وہ اسے اکثر پانچ سو روپے کا حوالہ دیکر تنگ کرتا تھا۔ ہر بار اسے بے عزتی کا احساس ہوتا، ہتک کا احساس ہوتا۔ بالآخر اس نے ایک دوسرے آدمی سے یہ رقم لیکر اس سے شادی کر لی اور رقم پہلے کو دی بھی۔ پھر تیسرے چوتھے اور پانچویں سے۔ اب اسے باپ کو درمیان میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ خود اس رٹ میں پڑ چکی تھی۔ اور اس کا باپ مر چکا تھا۔ اب صرف اس کا ایک چھوٹا بھائی اس دنیا میں رہ گیا ہے۔ جس کو ہر مہینے وہ دس روپے بھیجتی ہے۔ وہ گاؤں میں کسی رشتہ دار عورت کے پاس ہے۔ پچھلے دس سال سے وہ ان پانچ سو روپوں کے چکر میں پڑ کھلتی رہی تھی۔ کتنی ہی بار اس نے اس چکر سے اپنے آپ کو نکالنے اور آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔

میں نے اس کی کہانی پر غور کیا تو اس میں کوئی انوکھی بات نظر نہ آئی یہ تو اپنی پرانی کہانی ہے جتنی خود اس سماج کی تاریخ۔ اس میں کوئی نیا پن، کوئی اچھوتی نئی بات نہیں ہے، یہ تو وہی پرانی کہانی ہے جس میں عورتیں بکنے والی جنس میں تبدیل ہو کر بازار میں آجاتی ہیں۔ اس میں کوئی تنوع نہیں ہے۔

میں نے ایک دفعہ پھر آنکھیں اٹھا کر رابعہ کی طرف دیکھا دو شدت جذبات، غصہ اور اپنی ہتک کے احساس سے کانپ رہی تھی اور مجھے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "تم بھی میرے ساتھ وہی سلوک کرو گے، مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی"۔ پھر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور شاید فیصلہ کر لیا کہ اب اس کی شکست ہو گئی ہے۔

دو منٹ بت کی طرح خاموش بیٹھے رہنے کے بعد وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ غصے میں اس نے اپنے دونوں ہونٹوں کو کئی بار کاٹا اور بیٹھے بیٹھے کئی دفعہ اوز گئی۔ ایک لمبی جھرجھری لینے کے بعد اس نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "میں اب کیا منہ لیکر اس کے پاس جاؤں گی..... وہ مجھے طعنے دیتا ہے..... شاید اس کا دل مجھ سے بھر گیا ہے..... لیکن اس کو اس طرح میری ہتک تو نہیں کرنی چاہیئے تھی..... میں تم سے کچھ نہیں مانگتی..... تم کم از کم اس سے اتنا کہہ تو دو کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو..... پھر پیسوں کا میں خود انتظام کر لوں گی....."

اس کے سفید بیداغ گالوں پر سرمئی آنسوؤں کے دریا بہتے دیکھ کر اور اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں کو اپنے کانوں کے قریب محسوس کرتے ہوئے میرا سارا جسم کانپ اٹھا۔ میرے دل میں درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور میں نے ایک دفعہ تو یہ سوچا کہ یہ کہانی خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو، اس میں چاہے کوئی تنوع نہ ہو، لیکن اس وقت تو یہ معلوم ہو رہا ہے جیسے انسانی تاریخ نے پہلی بار ایک نازک آئینہ کو توڑ دیا ہے جیسے پہلی بار اس نازک عورت پر ظلم کی تلوار چلی ہے۔ اس کی کہانی کتنی پرانی ہے۔ لیکن اس میں کتنا درد ہے، یہ کتنی اچھوتی کتنی انوکھی کہانی ہے۔

کافی دیر گم سم بیٹھا میں یہ سوچتا رہا کہ اس دس سال کے عرصے میں یہ پانچ سو اور چار سو روپے کس طرح دیوار بن کر رابعہ کی خوشیوں میں حائل ہوتے رہے ہوں گے۔ جب بھی اس نے برابری کا دعویٰ کیا ہوگا۔ جب اس نے اپنے ساتھیوں سے عزتِ نفس کا مطالبہ کیا ہوگا ان روپوں کے زہر نے اس کو ڈس کر اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہوگا کہ تو آزاد نہیں تو پکی ہوئی بکری کی طرح مالک کی غلام ہے..... مجھے آہستہ آہستہ اس کی ساری حاقتیں ساری الجھنیں یاد آ رہی تھیں

اس کی بیقراری، اس کا ہر چیز کو، ہر انسان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ..... یہ سب باتیں اس کے ذہن میں گھر کر گئیں تھیں۔ لیکن اس نے شکست نہیں مانی۔ وہ دس سال مخالف ہواؤں سے لڑتی رہی۔ لیکن آخر آج شکست کھا گئی اور اب میرے سامنے سردی سے ٹھٹھری ہوئی بلی کی طرح بیٹھی کانپ رہی ہے۔

ایک دفعہ پھر میں نے اسے غور سے دیکھا ــــــ اگر وہ آزاد زندگی شروع کر سکتی ..... کسی سے سادی حق کے ساتھ محبت کر سکتی تو وہ کتنی مختلف کتنی ارفع اور عظیم عورت ہوتی ..... شاید اس طرح آنے والے زمانے کے لئے اپنی اس بیکراں محبت کی لازوال چنگاری یاں چھوڑ جاتی جو اس کی نس نس میں اب بھی بچی ہوئی ہیں ..... اگر کبھی کوئی اسے اس کاروبار کی دنیا اور اس کے چکر سے باہر نکال لیتا تو شاید اسے وہ اپنی وہ محبت بخشتی جو آج تک کسی عورت نے کسی مرد کو نہیں بخشی .....

مگر اب وہ کسی بوجھ کے تلے دبی پڑی سسک رہی ہے۔ "رابعہ اٹھو! میں تمہارے ساتھ چلوں گا"

میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس کے کابلی پہلوان کے سے خاوند کے سامنے اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے پادری یسوع مسیح کے مجسمے کے سامنے دو زانو ہو جاتے ہیں۔ دبی دبی گھٹی ہوئی آواز میں میں نے کہا ــــ "میں رابعہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں ....."

"تو کر لو .... مگر میرے تین سو ....." کابلی پہلوان چنگھاڑا۔

رابعہ نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ "تمہیں کچھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے ..... اس کا بھی انتظام ہو جائے گا"

یہ کہتے ہوئے وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اپنے گھر سے باہر لے آئی۔

میرے کمرے میں واپس آ کر اس نے اپنی آنکھیں زمین میں گاڑتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں جاتی ہوں ..... زندگی میں اب شاید ہی کبھی ملنا ہو... معلوم نہیں اب میں کہاں جا رہی ہوں ..... لیکن ایک دفعہ اس ذلیل آدمی کے پیسے دینے ضرور واپس آؤں گی ..... شاید اس وقت تم سے ملوں یا نہ ملوں ــــ"

روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور ایک دفعہ پورے زور سے۔ پوری محبت سے میرے کندھے اور گال پر کاٹا اور چپ چاپ رخصت ہو گئی۔

اسے دروازے میں سے باہر جاتا ہوا دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ وہ برقعہ بدل بدل کر ایک گھر سے دوسرے گھر، ایک خاوند سے دوسرے تیسرے اور پانچویں خاوند کے پاس پہنچی اور اب شاید چھٹے کی تلاش میں جا رہی ہے۔ لیکن آج بھی وہ ایسی ہی اچھوتی اور معصوم ہے جیسی کہ وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔

جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہا اس نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اسمیں اپنے خونِ جگر کا اضافہ کیا ہے اس کی شاعری میں ماضی کی بہترین فنی، روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (سردار جعفری)

بیکراں ــــــــ کے بعد

جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعہ کلام

ستاروں سے ذرّوں تک

قیمت دو روپے بارہ آنے

مکتبہ شاہراہ ۵ دہلی

کارپوریشن، ایک ڈاکٹر اور بھس نگر

میرزا ادیب

ابھی ساڑھے نو بجے تھے اور ٹھیک دس بجے کارپوریشن کا وہ ہنگامہ خیز تاریخی اجلاس شروع ہونے والا تھا جس میں حصہ لینے کے لئے ہر کونسلر ایک مدت سے تیاری کر رہا تھا۔ اس تیاری کی خاص وجہ یہ تھی کہ نئے الیکشن کا زمانہ بالکل قریب آ گیا تھا اور سب کے سب کونسلر کوئی اچھوتی اور مفید اسکیم پیش کر کے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی شہرت بحال کرنے کی فکر میں غرق تھے۔ ٹاؤن ہال کے وسیع صحن میں خلوص اور محبت کے ساتھ معانقے کئے جا رہے تھے، ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں اور بڑے تپاک کے عالم میں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی جا رہی تھی مگر اس ساری ہمہی اور گہما گہمی اور راز و نیاز کے پیچھے ذہنوں کے اندر ان تقریروں کے الفاظ گونج رہے تھے جنھیں کونسلروں نے اپنی سکیموں کی وضاحت کے لئے استعمال کرنا تھا اور جن پر کامیابی کا کافی انحصار تھا پورے دس بجے ٹاؤن ہال کے گھڑیال نے اجلاس کے شروع ہونے کا اعلان کر دیا۔ سب کونسلر اپنی اپنی کرسیوں میں بیٹھ گئے۔ میئر صاحب بھی تشریف لے آئے اور حسب معمول ایک خاص وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر متمکن ہو گئے۔ ہال میں کونسلروں کے لئے جتنی کرسیاں مخصوص تھیں وہ تمام بھر چکی تھیں لیکن ابھی تک وہ کرسی خالی تھی جو باقی کرسیوں سے الگ ایک کونے میں پڑی تھی اور جس پر کارپوریشن کی واحد خاتون کونسلر بیٹھا کرتی تھیں۔ اجلاس بڑے جوش و خروش سے شروع ہو گیا۔ تمام کونسلر اپنی سکیمیں پیش کرنے میں اور زیادہ تر دوسروں کی سکیموں کا مذاق اڑانے میں اس بری طرح منہمک تھے کہ انھیں بی بی جان کی آمد کا علم بھی نہ ہو سکا۔ بی بی جان چپ چاپ ہال میں داخل ہوئیں اور کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ تقریریں ہوتی رہیں، تنقیدیں جاری رہیں اور جب کچھ دیر کے لئے وقفہ ہوا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بی بی جان بڑے وقار سے کھڑی میئر سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کر رہی ہیں۔ اجازت مل گئی تو انھوں نے حاضرین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور سنجیدگی سے فرمانے لگیں۔ "جناب میئر اور بھائیو! میں نے پچھلے اجلاس کی تقریروں کو بھی بڑے غور سے سنا ہے اور ان تقریروں کو بھی بڑے احترام سے اپنے دل و دماغ میں جگہ دے رہی ہوں۔ اس میں شک نہیں سکیمیں پیش کرنے والوں کو پبلک سے گہری ہمدردی ہے اور یہ لوگ رفاہِ عام کے کاموں میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ مگر حضرات! مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ مجھے آپ لوگوں کی صحد و بینی کا شکوہ نہیں۔ تمام کی تمام تجویزیں شہر کے بارونق حصوں سے متعلق ہیں خدا کے کسی بندے کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ شہر سے ذرا دور نکل کر اس بدنصیب آبادی کی طرف بھی توجہ کرے جس کا نام "بھس نگر" ہے۔ میرا خیال ہے آپ میں سے اکثر بھائیوں نے اس بستی کا نام بھی کبھی نہیں سنا ہوگا۔ یہ ہے ہماری جہالت کی کیفیت ـــــ یہ فقرہ کہتے ہوئے مجھے شرم آ رہی ہے مگر کیا کیا جائے حقیقت کس طرح چھپائی جا سکتی ہے!"

میئر نے اپنی گنجی چندیا کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے بی بی جان کی طرف ذرا گھور کے دیکھا۔ بی بی جان مسکرا دیں۔

"بھائیو! میں نے پہلے ہی معافی مانگ لی ہے۔ دراصل اس وقت مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں ہے۔ "بھس نگر" کی جو دردناک حالت میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اس کا تصور کر کے بھی میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں ـــــ بھس نگر کو میں "بھوک نگر" کہتی ہوں۔ کیونکہ یہاں بھوک عام ہے۔ بضعف خدا کا کہ یہاں کم و بیش پانچسو انسان رہتے ہیں مگر آٹا پیسنے کی صرف ایک مشین ہے۔ یہ بات چھوڑیئے، اس وقت ہمیں اس سے زیادہ اہم باتوں پر غور کرنا ہے ـــــ سب سے اہم تو یہ ہے کہ "بھس نگر" میں رہنے والے مختلف بیماریوں کا شکار ہیں۔ وہاں ہر شخص کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہے۔ خدا کے لئے غور کیجئے آپ شہر کے بارونق بازاروں میں مزے لوٹیں اور آپ کے قریب ایک بستی میں سینکڑوں خاندان دوا دارو کو ترس ترس کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں۔ ہمارے لئے شرم کے مارے ڈوب جانے کا مقام ہے۔"

بی بی جان رومال نکال کر پاؤڈر سے چمکتی ہوئی پیشانی پونچھنے لگیں۔ تمام کونسلر مایوس سے نظر آ رہے تھے۔ بی بی جان بازی لے گئی تھیں۔ بی بی جان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"بھس نگر کی آبادی کارپوریشن پر ایک زندہ، ایک جیتی جاگتی طنز ہے ـــــ مگر میں نے عہد کیا ہے کہ "بھس نگر" کو جنت کا نمونہ بنا کے دموں گی۔"

کارپوریشن کا ہال کونسلروں کی تالیوں میں گونج اٹھا۔ بی بی جان کی آواز پرجوش ہو رہی تھی۔

"بھس نگر کے رہنے والوں کو وہ تمام بنیادی چیزیں میسر ہونی چاہئیں جو ہمیں شہروں میں حاصل ہیں۔ مثلاً صاف پانی، صاف ستھری خوراک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علاج معالجے کی سہولت۔ آج میں یہ تجویز پیش کرتی ہوں کہ فی الفور ایک لائق، مستند اور تجربہ کار ڈاکٹر کو وہاں بھیجا جائے جو بڑی ہمدردی اور محبت سے رات دن مریضوں کا علاج کرے

اگر ہم نے جلد سے جلد اس ضرورت کو پورا نہ کیا تو بھس نگر کے رہنے والے ان کتوں کی طرح مرتے رہیں گے جنھیں کار پوریشن زہر دے کر مارا کرتی ہے!"

بی بی جان نے رومال نکال کر سارا چہرہ پونچھا اور بڑی متانت سے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ان کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ حاضرین کو دیکھنے کے بجائے اپنے نیچے فرش کو دیکھ رہی تھیں۔

ان کی تجویز پر کئی کونسلروں نے تقریریں کیں اور قریب قریب سب نے ان کی تائید کی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد تمام کونسل اس امر پر متفق ہو گئے کہ "بھس نگر" میں ایک ایسا ڈاکٹر بھیجا جائے جو بڑا تجربہ کار اور ہمدرد ہو اور اس ڈاکٹر پر یہ شرط عائد کر دی جائے کہ وہ سوائے انتہائی ضروری کام کے شہر میں داخل نہ ہو۔ کارپوریشن کے جتنے تجربہ کار اور مستند ڈاکٹر ملازم تھے سب کے نام لئے گئے۔ لیکن سوائے "ڈاکٹر عبدالصمد کے کسی کو بھی اس کام کا اہل نہ سمجھا گیا۔ ڈاکٹر عبدالصمد پینتیس سال سے کارپوریشن کی ملازمت میں رہ کر لوگوں کا علاج کر رہے تھے اور بحیثیت ایک ہمدرد ڈاکٹر کے ان کی کافی شہرت تھی۔ قرعۂ فال انھیں کے نام پڑا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔ کونسلروں نے بی بی جان کو اتنی شاندار، مفید اور اچھوتی سکیم پیش کرنے پر دلی مبارکباد دی اور اخباری نامہ نگاروں نے تو انھیں جھٹ پٹ ہی میں لے لیا۔ بی بی جان نے ایک بار پھر بھس نگر کے رہنے والوں کی حالتِ زار کا نقشہ بڑے دردناک انداز میں کھینچ دیا ——— دوسرے دن کوئی اخبار بھی ایسا نہیں تھا جس میں بی بی جان کی سکیم کے متعلق ایک مفصل درج نہ ہو۔ سب اخباروں کے ایڈیٹروں کو پہلی بار بھس نگر کی آبادی کا حال معلوم ہوا تھا اور جونہی بی بی جان بھس نگر کے جہنم کو جنت میں تبدیل کرنے کا عزم بالجزم کر چکی تھیں اس لئے انھوں نے کارپوریشن کی اس واحد جواں ہمت اور بیدار مغز خاتون کو کونسل کی بڑی تعریف کی تھی۔

چند دن کے بعد اخبارات میں ایک اور بیان شائع ہوا۔ یہ بیان ڈاکٹر عبدالصمد کی طرف سے تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے قوم کو اپنے اس ارادے سے مطلع کیا تھا کہ وہ اپنی بقیہ تمام عمر بھس نگر والوں کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ اور جب تک ان میں کام کرنے کی ہمت موجود ہے وہ بھس نگر ہی میں رہیں گے۔ یہ بیان بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا اور کارپوریشن کا جب آخری اجلاس ہوا تو کارپوریشن کے سیکریٹری صاحب نے کونسلروں کو بتلایا کہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب ایک کمپونڈر اور ضروری ادویات کے ساتھ بھس نگر جا چکے ہیں۔ اور انھوں نے لوگوں کا علاج کرنا شروع کر دیا ہے!

اس کے بعد الیکشن کی ہنگامہ آرائی میں تمام "امیدوار" الجھ کر رہ گئے۔ جب نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اب ایک عورت کے بجائے دو عورتیں کارپوریشن کی کونسل منتخب ہو چکی ہیں۔ بی بی جان غریبوں کی ہمدرد تھیں اس لئے ان کے وارڈ میں کوئی خاتون بھی ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ دوسری خاتون ایک بیرسٹر کی تعلیم یافتہ بیگم تھیں۔ جو سیاسی کاموں میں اکثر حصہ لیا کرتی تھیں اور شہر میں ان کی کافی شہرت تھی۔ اسی شہرت کی وجہ سے انھیں کونسل منتخب ہونے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔

حسبِ معمول کارپوریشن کے اجلاس ہونے لگے۔ اور تو سب کچھ معمول کے عین مطابق تھا۔ فرق پڑا تھا تو صرف یہ کہ بیگم صاحبہ اور بی بی جان میں اکثر و بیشتر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ اس نوک جھونک نے جہاں ہر اجلاس کو بہت دلچسپ بنا دیا تھا وہاں اس کی وجہ سے ان دونوں عورتوں میں ایک دوسری سے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت بھی بیدار ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تاک میں رہتی تھیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو دوسری کو تمام کونسلروں کے سامنے ذلیل کر دیا جائے۔ کبھی اس مقصد میں بی بی جان کامیاب ہو جاتی تھیں اور کبھی بیگم صاحبہ!

وقت گذرتا گیا، نوک جھونک جاری رہی، الزام تراشنے کے نئے نئے طریقے بروئے کار آتے رہے یہاں تک کہ ایک بار پھر الیکشن نے کونسلروں کے اعصاب پر قبضہ کر لیا وہ سرگرمیاں جو کچھ عرصے سے مدھم پڑ چکی تھیں۔ یک لخت جاگ اٹھیں۔ اور ہر کونسلر اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے لگا۔

ایک غیر معمولی اجلاس میں بی بی جان نے ایک نئی سکیم پیش کر کے اپنی حریف مقابل کو بزعمِ خویش شکست دے دی۔ بی بی جان نے بڑے وقار سے کھڑے ہو کر فرمایا۔ جناب میئر! عزیز بہن اور بھائیو! آپ کو یاد ہو گا کچھ عرصہ ہوا، میں نے ایک سکیم پیش کی تھی کہ بھس نگر کے رہنے والوں کے لئے علاج معالجے کا انتظام کیا جائے۔ یہ میری بڑی اسکیم کا ایک حصہ تھا۔ اب میں اس اسکیم کا دوسرا حصہ پیش کرتی ہوں۔ میری تجویز یہ ہے کہ بھس نگر میں ایک سو زوں جگہ پر عورتوں اور بچوں کے لئے ایک شاندار باغ لگا دیا جائے ———"

بی بی جان نے اپنی تقریر ختم نہیں کی تھی کہ بیگم صاحبہ ہنسی ضبط کرنے کی وجہ سے ایک ایسی ہنڈیا بن کر رہ گئیں جس کی بھاپ بھاری ڈھکنے سے روک دی گئی ہو۔ ان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور ان کے منہ سے "کو کو، کو کو" کی سی آواز نکل رہی تھی۔

بی بی جان کو بڑا غصہ آیا اور انھوں نے ڈانٹنے کے سے لہجے میں کہا۔

"کسی تجویز کا جاہلوں کی طرح تمسخر اڑانا بڑی معمولی بات ہے ——— مزا تو جب ہے کہ فکر کر کے رفاہِ عام کا کوئی کام کیا جائے۔ مجھے افسوس ہے میری بہن کو

کسی مہذب مجلس میں بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔ کیا میئر کارپوریشن میں اس بدتمیزی کی اجازت دے سکتے ہیں۔ ہونہہ"

میئر صاحب اپنی کدو کی سی چندیا پر انگلیاں پھیر پھیر کر نہ جانے کیا چیز تلاش کر رہے تھے۔ انھوں نے میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھا لیا اور بی بی جان اپنی کرسی پر بیٹھ کر اپنے احتجاج کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگیں۔

بیگم صاحبہ نے رومال سے آنکھیں اور ناک پونچھی اور کھڑی ہو کے فرمانے لگیں۔

"میں کئی دن سے اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ میری معزز بہن اپنی یہ سکیم پیش کریں تو میں کچھ عرض کروں۔ آخر خدا خدا کر کے آج انھوں نے اپنی نہایت شاندار اور مفید سکیم پیش کر دی ہے یہ سکیم نہایت اچھی ہے، نہایت مفید ہے۔ مُجس نگر میں شاندار باغ بنے گا تو ہر بچے کی آیا بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر وہاں لے جائے گی، عورتیں وہاں پکنک بھی کریں گی اور ——"

بی بی جان غصے میں کھڑی ہو گئیں۔

"جناب میئر یہ کارپوریشن کا اجلاس ہو رہا ہے یہ کوئی سکول گراؤنڈ نہیں ہے —— معزز کونسلر کو کچھ کہنا ہے تو سنجیدگی سے کہے ورنہ خاموش بیٹھ جائے!"

مگر بیگم صاحبہ خاموش ہو کر نہ بیٹھیں —— انھوں نے ایک بار پھر رومال سے ناک صاف کی اور کہنا شروع کیا۔

"میں ہاؤس کو یقین دلاتی ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی سکول گراؤنڈ میں نہیں سمجھ رہی بلکہ کارپوریشن کے اجلاس میں کھڑی ہوئی محسوس کر رہی ہوں اور جو کچھ کہہ رہی ہوں، پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہی ہوں —— میں اپنی معزز بہن سے پوچھتی ہوں کہ پہلی سکیم اور دوسری سکیم کے درمیان جو اتنا لمبا عرصہ پڑا ہے اس میں ایک مرتبہ بھی انھوں نے "مجس نگر" میں جا کر دیکھا ہے کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب کیا کر رہے ہیں ——!"

"علاج معالجہ کر رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں!" بی بی جان نے بیٹھے بیٹھے کہا۔

"جی نہیں علاج معالجہ نہیں کر رہے ہیں"

"تو کیا ہل چلا رہے ہیں" ایک کونسلر کو مذاق سوجھا۔

"ہل نہیں آٹا پیسنے کی مشین چلا رہے ہیں" بیگم صاحبہ نے کہا۔ سب کونسلر ہنس پڑے۔ اب بیگم صاحبہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ کہنے لگیں۔

"میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست ہے۔ ڈاکٹر عبدالصمد جنھیں کارپوریشن نے مجس نگر کے لوگوں کا علاج کرنے کیلئے بھیجا تھا آٹا پیسنے کی مشین لگوا کر مزے کر رہے ہیں دن بھر بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ کس قدر شرمناک بات ہے۔ یہ حال ہے ہماری سکیم بازی کا"

میئر اور کونسلروں نے پہلے سوچا تھا کہ بیگم صاحبہ نے محض بی بی جان کو چڑانے کی خاطر یہ بات کہہ دی ہے مگر جب ان کے لہجے کو سنجیدہ دیکھا تو انھیں بھی کچھ احساس ہو گیا کہ یہ معاملہ بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے۔ کارپوریشن شاید زیادہ اس معاملہ کی طرف توجہ نہ کرتی لیکن جب اخبار والوں نے نمک مرچ لگا لگا کر اس واقعہ کو اپنے اخباروں میں درج کیا تو میئر اس امر کا نوٹس لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ کارپوریشن کا سکریٹری کارپوریشن کے محکمہ سے اسٹاف کے ساتھ اس معاملہ کی چھان بین کرے اور جو حقیقت برآمد ہو اسے آئندہ اجلاس میں پیش کرے۔

دوسرے اجلاس میں سکریٹری نے بیگم صاحبہ کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب عرصے سے علاج معالجہ نہیں کر رہے۔ انھوں نے آٹا پیسنے کی مشین لگوا رکھی ہے۔ اور وہیں دن بھر بیٹھے رہتے ہیں۔ کمپونڈر نہ جانے کہاں جا چکا ہے!"

سکریٹری کا بیان سُن کر کئی کونسلروں نے تقریریں کیں اور تقریباً سب اس امر پر متفق تھے کہ ڈاکٹر نے فرائض ادا کرنے میں سخت غفلت کا ثبوت دیا ہے اور اپنی خود غرضی سے کارپوریشن کو بدنام کر دیا ہے اس لئے اس پر مقدمہ چلانا چاہیئے۔

میئر نے فرمایا۔

"یہ کارپوریشن کی عزت و شہرت کا سوال ہے اس لئے ڈاکٹر کے جرم کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"

جب ڈاکٹر پر فردِ جرم لگائی جا رہی تھی تو پریس گیلری میں سے ایک آواز سُنائی دی۔

"مجھے جرم کے ارتکاب سے انکار نہیں —— مگر دو منٹ کے لئے میری بات سن لیجئے"

یہ الفاظ کہنے والے ڈاکٹر صاحب تھے۔ کونسلروں کی دلچسپی دوچند ہوگئی۔ سب کے سب ادھر دیکھنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے۔

"جناب میئر! مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں مریضوں کے علاج معالجے ہی کے لئے جس نگر میں گیا تھا۔ مگر وہاں جاکے میں نے دیکھا کہ جس نگر کے رہنے والے ایسی بیماریوں میں مبتلا ہیں کہ کارپوریشن کی معمولی دوائیں ان پر کارگر ثابت نہیں ہوسکتیں۔ میں نے سیکریٹری صاحب کو ان دوائیوں کے لئے لکھا جو کارپوریشن کے سٹاک میں نہیں تھیں۔ مگر جن کی شدید ضرورت تھی فوراً ہے یہ قیمتی دوائیں تھیں۔ ایک مرتبہ نہیں دو بار میں مرتبہ میں نے درخواست بھیجی۔ لیکن ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ میری درخواست پر مناسب غور کیا جائے گا۔ میں نے مجبور ہو کر ان لوگوں سے کہا بھائیو! جن دواؤں کی تمہیں ضرورت ہے وہ تو میسر نہیں ہوسکتیں۔ میں تمہیں نسخے لکھ دیا کروں گا۔ دوائیں شہر میں جاکر خرید لیا کرنا۔ یہ سن کر وہ کہنے لگے۔ جناب! ہمیں پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا تو ملتا نہیں ہے دوائیں کہاں سے خریدیں ——— فرمائیے میئر صاحب! میں کیا کرسکتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب تو ہمیں آٹا پیسنے کی مشین لگوا دی جائے۔ آٹا پیسنے کی جو مشین کام کر رہی ہے وہ ردی حالت میں ہے اس لئے کم سے کم آٹا پیسنے کا تو ضرور انتظام ہو جانا چاہیئے۔ اور میں نے اپنی جیب سے روپے خرچ کر کے مشین لگوا دی ——— جناب میئر ———"

مگر میئر کی بھنویں تن گئی تھیں۔

"تمہیں اس کی اجازت نہیں تھی۔ صرف علاج کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اپنی اس فیر ذمہ داری سے تم نے کارپوریشن کو بدنام کر دیا ہے"

"پر میں نے عرض کی ہے نا مطلوبہ دوائیں نہیں ——— اور انہیں روٹی اور کپڑا ———" ڈاکٹر اپنا فقرہ مکمل بھی نہ کر سکا۔

"بہرحال یہ جرم ہے ——— یہ کارپوریشن کی عزت کا سوال ہے ——— میرا خیال ہے تمام کونسلر اس امر کی تائید کریں گے کہ یہ صریحاً فرض ناشناسی ہے"

ڈاکٹر حیران کھڑا تھا ——— کونسلر بڑی دلچسپی سے کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اور اخباری نمائندے بڑی تیزی سے ڈاکٹر اور میئر کا مکالمہ نوٹ کر رہے تھے!

جیل میں رہ کر سردار نے اپنا اور سماجی حالات کا کڑی نگاہ سے سماجی تنقیدی تجزیہ کیا اور ایشیا کی خوبصورت سچائی ان پر موثر ہوئی اور انہوں نے اپنی طویل نظم "ایشیا جاگ اُٹھا" لکھی۔ جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی جس میں ایک کی شائستگی اور غنائی سندرتا ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا سماجی روپ سمٹ کر سما گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سن بلوغ کو پہنچتی ہے، جوان ہوتی ہے۔ اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان سربلندیوں کو چھوتی ہے جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ (کرشن چندر)

ایشیا جاگ اُٹھا

(دوسرا ایڈیشن)

(طویل نظم)

قیمت بارہ آنے

اور اس کے بعد

سردار جعفری اپنی نئی نظموں کا مجموعہ

مکتبہ شاہراہ ○ دہلی

پتھر کی دیوار (زیر طبع)

پیش کرتا ہے۔

دیوندر اسر

ریشم کا دل

جب میں رج دیو میں داخل ہوا تو وہ سو رہی تھی۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ ایک دم جاگ اٹھی۔ اس نے آواز پیدا کئے بغیر چٹخنی کھولی۔ مجھے اچانک اپنے سامنے پاکر وہ ناچ سی اٹھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے دبایا۔ اس کے گرم ہاتھوں کے لمس سے میرے جسم میں کچھ حرکت اور حرارت پیدا ہوئی۔ میں اندر جاکر بیٹھ گیا۔ وہ چند منٹ تک خاموش رہی اور میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اس نے آنسو بہائے اور پھر مسکرا دی اس نے شکوے کئے اور پھر خود ہی شرما گئی۔ وہ باتیں کرتی رہی اور میری طرف دیکھتی رہی۔ میں خاموش رہا اور مسکراتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس نے بہت سی باتیں کہیں جو میں سن نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کب اس نے اور کس ڈرامائی انداز میں مجھے ریشمی رومال پیش کیا۔ میں چونک اٹھا۔ رومال پر اس کی نازک انگلیوں نے لال ریشم کے دھاگے سے دل کی تصویر کاڑھ رکھی تھی۔ رومال کے بائیں کونے میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت حروف میں لکھا تھا۔

VOWS LIKE HEART ARE MEANT TO BE BROKEN.

(وعدے دل کی مانند توڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں!)

اس خوبصورت شکوہ آمیز فقرے کے بعد سوالیہ نشان تھا جیسے دل کی تصویر میں کالے دھاگے سے کاڑھا ہوا تیر کا نشان تھا۔ ریشم کا دل جدائی کی گھڑیوں میں بہائے گئے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ کتنا اچھوتا تصور تھا شمشی کا! ریشم کا دل! جب اس کے جذبات کی رو ذرا مدھم ہوئی اور میرے ذہن کو سکون ملا تو میں نے اُسے بتایا کہ میں روپوش ہوں اور خفیہ میری تلاش میں ہے۔ یہ سنتے ہی وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے ہمارے درمیان برف کا تودہ گر گیا ہو۔ وہ دور جا کھڑی ہوئی جیسے روپوش میں نہیں وہ ہے۔ من کی خوشی کے آنسو یکبارگی چھلک کر خشک ہو گئے۔ حیا کی سرخی ایک بار چمک کر زرد پڑ گئی۔ اور اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں پیار کی نقرئی کرنوں کے بجائے ڈر کے سانپ تیرنے لگے۔ اس کے چہرے پر بھورے کالے پیلے۔ زرد خیالوں کی پرچھائیاں پڑ رہی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھ کر میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ جو پردیپ کا چہرہ تھا۔ مگر جس میں کالج کے زمانے کا لاابالی پن نہیں تھا۔ بلکہ ایک روپوش کارکن کی زندگی کی سختی اور سنجیدگی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی۔ اس کا باپ اعلےٰ سرکاری افسر ہے۔ اتنی رات گئے ایک اجنبی کے ساتھ تنہائی میں باتیں کرنا اس کی رسوائی کا باعث بن سکتا ہے۔ خفیہ اس کی تلاش میں یہاں آگئی تو؟ وہ خود اور رسی جا رہی ہے اُسے پاسپورٹ نہیں ملے گا۔ معلوم نہیں اس کے ذہن پر کیا گذر رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی سچی محبت کے نام پر مجھ سے التجا کی کہ میں رج دیو سے فوراً باہر چلا جاؤں۔ اگر کسی کو میری آمد کا پتہ چل گیا تو وہ پھر مجھ سے کبھی نہ مل سکے گی اور میری جدائی میں گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ باہر خفیہ کا خطرہ تھا اور اندر شمشی کی سچی محبت کے رسوا ہونے کا ——— میں باہر برآمدہ میں ایک لحظہ کھڑا سوچتا رہا

چاندنی زہر میں ڈھلنے لگی اور شمشی اپنے باپ کے قدموں کی مدھم آہٹ سن کر اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ رج دیو کے سب دروازے بند ہو گئے۔ مگر رج دیو کا مین گیٹ اب بھی کھلا تھا۔ میں نے آخری بار اس کی خواب گاہ کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور روشنی بجھ چکی تھی۔ میرے پیچھے گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ان کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ سبز سبز پتوں پر شبنم کے موتی چاندکی روشنی میں چمک رہے تھے میرے سامنے کوتار کی دھندلی سڑک دور تک چلی گئی تھی۔ دور و یہ درختوں کے سائے ماضی کی یادوں کی مانند پھیلے ہوئے تھے۔ درختوں کی اوٹ سے بجلی کے قمقموں کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی جیسے کسی میلے آنچل سے کندن سا جسم جھانک رہا ہو۔ میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر میرے ذہن میں ایک اندھی گلی میں سیلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے مکان کی اندھیری کوٹھری میں دیئے کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ چاندکی کرنیں برف میں لگی ہوئی

معلوم ہونے لگی۔ میرے کوٹ کی جیب میں ریشمی رومال کا لمس بھی یخ بستہ ہو ۔ میرے ذہن میں چند گھنٹے پہلے کی یاد اب بھی تازہ تھی۔

یہ رات جاڑے کی سب سے زیادہ سرد رات تھی۔ جب میں پیڈمنٹ واپس آرہا تھا تو بجلی گھر کے قریب مجھے شبہ ہوا کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا ہے۔ تھوڑی دُور تک آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اپنے شبہ کو یقین میں بدلنے کے لئے میں سگریٹ سُلگانے کے لئے رُک گیا۔ وہ بھی وہیں رُک گیا۔ چاندنی رات میں میں نے اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ چاند چور کا ساتھی بھی ہے اور شاہ کا دوست بھی۔ میں پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ مجھے اس شہر میں آئے دو تین دن ہوئے تھے۔ گو میں شہر میں اجنبی نہ تھا۔ لیکن شہر کی گلیوں اور سڑکوں سے بخوبی واقف نہ تھا۔ اس لئے بھٹک جانے کا خدشہ تھا۔ تعاقب کرنے والے کا فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک بار تو مجھے محسوس ہوا کہ اگر وہ ہاتھ بڑھائے تو مجھے کندھے سے پکڑا جا سکتا ہے۔ میں محتاط ہو گیا اور اپنی رفتار ذرا تیز کر دی۔ لیکن اسے احساس نہ ہونے دیا۔ چند قدموں پر اسے دو آدمی اور مل گئے۔ انھوں نے آپس میں کچھ سرگوشی کی اور میری طرف تیزی سے بڑھے۔ خطرہ واضح ہو گیا۔ میرے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ میں یکایک بائیں ہاتھ کی ایک چھوٹی سی گلی میں مُڑ گیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ لیکن میری مایوسی کی حد نہ رہی جب میں نے گلی کو بند پایا۔ واپس لوٹنے کا مطلب اپنے آپ کو اُن کے ہاتھوں میں سونپ دینا تھا۔ میری جیب میں میری تازہ غیر مطبوعہ نظموں کا مسودہ کانپنے لگا۔ مسودے کے اوپر ریشمی رومال پڑا تھا۔ لیکن تلاشی کے بعد مسودے کا برآمد ہونا کوئی دشوار کام نہ تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے گیت چلتے نظر آئے۔ اس وقت زیادہ سوچنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ بائیں جانب ایک مکان کا دروازہ نیم وا پا کر میں اندر گھس گیا اور اندر سے چٹخنی لگا لی۔ سامنے صحن میں ایک معمر سا آدمی ٹوٹے ہوئے بٹنوں والی قمیص اور میل خوردہ خاکی نیکر پہنے روٹی پکا رہا تھا۔ صحن میں پتھر کے کوئلوں کا دھواں اور دُھند ایک دوسرے میں مل رہے تھے۔ میری آنکھوں میں جلن محسوس ہوئی اور پانی بھر آیا۔ میں سیدھا صحن میں چلا گیا۔ مجھے اچانک اپنے قریب پا کر وہ آدمی گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ابے کون ہو بے؟" اُس نے ڈانٹ کر پوچھا۔

میں خاموش رہا۔ میں اُسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں۔ بشنی کا گھر تو تھا نہیں۔ جہاں میں بغیر اجازت جا سکتا تھا اور آرام دہ صوفہ پر پاؤں پسار کر بیٹھ سکتا تھا اور جسم کو گرم رکھنے کے لئے سوکھے بید جلا سکتا تھا۔ یہ ایک اجنبی کا گھر تھا۔ یہاں صوفہ تو کیا۔ بیٹھنے کے لئے ایک چوکی تک نہ تھی۔ ایک چارپائی پر کپڑے وغیرہ بکھرے پڑے تھے۔

"کون ہو بے؟" اُس نے سوال کو دُہرایا۔ میں اس کی رُوکھی آواز سُن کر گھبرا گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے دوسرے ہاتھ سے میری کمر پر وار کیا۔ میں نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"دروازہ مت کھولو ——— پولیس اندر آ جائے گی۔"

اُس نے بولنے کے لئے منہ کھولا۔ میں نے دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"میں چور نہیں۔ کوی ہوں۔ میرا نام پردیپ ہے۔ کوی تا کھتا ہوں۔ خفیہ میرا پیچھا کر رہی ہے۔"

اُسے پہلے کچھ شبہ ہوا۔

"کیا نام بتا بے ———"

"پردیپ!"

"پردیپ ———" وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا۔

"پردیپ ——— کوی تا کھتے ہو۔ ہم سب مجور کمانے والے یا" اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ چارپائی وغیرہ سے کپڑے ہٹانے لگا۔

باہر زور زور سے دروازے پر گھونسوں کی بارش ہو رہی تھی۔

"تمہارے پاس کچھ ہے۔ لاؤ آگ میں جلا دوں۔"

"نہیں ــــــــــ" میں نے اس کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ کاغذات نہیں جلیں گے میری لاش جلے گی۔

"بھاگنے کا کوئی راستہ؟"

میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ ٹوٹنے والا تھا۔ گالیوں اور دھمکیوں کی آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

دروازہ ٹوٹ گیا

"چھت پر چلے جاؤ اور پچھلی دیوار سے نیچے کود جاؤ۔ نیچے بالو کا ڈھیر ہے۔ جلدی کرو۔ اگلی گلی میں ٹھہر جانا۔ میں اتنی دیر تک انھیں دھکے سے یہی روکتا ہوں۔" اُس نے مجھے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا اور خود ڈیوڑھی کی طرف لپکا۔

میں چھت سے کود کر پیچھے گلیوں میں سے ہوتا ہوا ششپی کے گھر پہونچ گیا۔ مجھے اس کا گھر ڈھونڈھنے میں دقت ضرور ہوئی۔ لیکن اس کے علاوہ مجھے اور کہیں پناہ بھی نہیں مل سکتی تھی۔ ایک طرف ششپی کا گھر تھا اور دوسری طرف کال کوٹھری۔ ششپی کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی لپٹ جائے گی۔ ابھی پچھلے خط میں ہی اس نے بڑے دلآویز انداز میں میری جدائی کا شکوہ کیا تھا۔ مجھے میکسن سن لیک کی وہ رات یاد آ رہی تھی۔ میں اور وہ کشتی پر بیٹھے جھیل کی سطح پر پورے چاند کی کرنوں کا ناچ دیکھ رہے تھے۔ کنول کے پتوں پر بکھری ہوئی پانی کی بوندیں ششپی کے آنسوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ وہ ہلکے ہلکے سروں میں ایک دیہاتی گیت گا رہی تھی اور میں اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ معلوم نہیں اُسے کیا سوجھی وہ ایک دم پانی میں کود گئی۔ جھیل بہت گہری تھی اور میں تیرنا نہیں جانتا تھا۔ اُسے پانی میں گرتے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا میں بھی پانی میں کود پڑا۔ بعد میں میں نے اس سے پوچھا "یہ کیا حماقت کی تھی تم نے؟" وہ مسکرا دی "تمہاری محبت کا امتحان لینے کے لئے" "اور میں پاس ہو گیا؟" میں اس کی طفلانہ حرکت پر ہنس پڑا۔ کتنا خطرناک کھیل کھیلا تھا اُس نے۔ اُس وقت اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ میرے لئے اپنے جیون کو بھی دے سکتی ہے۔ اس کی پیار بھری باتیں دو سال بعد پھر یاد آ رہی تھیں۔

اس سے ملنے کے بعد جو کچھ ہوا میری آنکھوں کے سامنے ایک ایسے خواب کی مانند گھوم رہا تھا جس پر یقین کرنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ ایسا معلوم ہوا کہ پچھلی تمام ملاقاتیں ایک حسین خواب کے علاوہ کچھ بھی نہ تھیں۔

میں سوچتے سوچتے ایک بار پھر اُسی مکان میں پہونچ گیا۔ جہاں سے میں جان بچا کر آیا تھا۔ میرے سامنے وہی میلا ہوا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ اس کے دونوں کواڑ ٹوٹ چکے تھے۔ ڈیوڑھی میں گھُپ اندھیرا تھا۔ میں نے اندر گھُسنا چاہا۔ دروازہ پر ہی میرا پاؤں کسی بھاری چیز سے ٹکرا گیا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے دیا سلائی جلائی۔ یہ تو وہی شخص تھا۔ جو کھانا پکا رہا تھا۔ وہ منہ کے بل گرا پڑا تھا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ بہہ کر جم رہا تھا۔ شاید انھوں نے اسے خوب زدوکوب کیا تھا۔ انھوں نے اس سے میرا نام پتہ پوچھنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ خاموش رہا ہوگا۔ خاموشی جس کی قیمت اس کی زندگی تھی۔ اس نے اس کی پوری قیمت ادا کی تھی۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر دو تین بار ہلایا۔ مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی میں نے اس کی نبضیں ٹٹولیں۔ وہ مر چکا تھا۔ وہ مر گیا تاکہ میں زندہ رہوں۔ میں جو اس کے لئے ایک اجنبی شاعر سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جو صرف ایک عام مزدور تھا۔ میرا ہاتھ یک لخت اپنی جیب پر چلا گیا۔ جس میں ریشم کا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے ریشمی رومال نکالا اور اس کے چہرے سے خون کے دھبے صاف کئے اور اسے اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس کی کوٹھری کا تمام ساز و سامان بکھرا پڑا تھا۔ رومال خون میں بھیگ کر لال ہو گیا اور لال دھاگے سے کاڑھا ہوا دل کا نشان اور خوبصورت الفاظ میں رقم کردہ تحریر

VOWS LIKE HEARTS ARE MEANT TO BE BROKEN.

(وعدے دل کے مانند توڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں !)

خون کی لالی میں غرق ہو گئے۔ چولہے میں آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس پر پڑی ہوئی روٹی جل کر راکھ ہو گئی تھی میرے ہاتھ میں ریشم کا رومال تھا جس پر اب کچھ بھی نہ لکھا تھا۔ اس آدمی کا نام بھی نہیں جس کے خون میں ریشم کا دل ڈوب گیا تھا۔

حسین صبح

نوریتیج

ایک بار کا ذکر ہے ـــــ اور اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا ـــــ ایک بہت ہی خوبصورت ملک پر سات سمندر پار بسنے والا ایک راجہ راج کرتا تھا پہلے اس خوبصورت ملک کے دو بہت خوبصورت نام تھے ایک کے معنی 'حسین صبح' کے تھے اور دوسرے کے 'راحت بخش آشیانہ' لیکن جب سے اس سات سمندر پار سے آنے والے راجہ کی یہاں حکومت ہوئی' اس نے حکم نافذ کر دیا کہ "آج سے اس ملک کے باشندے اپنی زبان میں اس کا نام نہیں لے سکتے اور آئندہ سے میرے حکم کے مطابق اس ملک کا سرکاری نام "غلام ملک" ہوگا۔ اس نام کے علاوہ اگر کوئی کسی دوسرے نام کا استعمال کرے گا تو اُسے قید کر لیا جائے گا" کہتے ہیں اس راجہ کو لفظ "غلام" کے ساتھ بہت ہی اُنس تھا اور اس نے اپنے لاڈلے کتے کا نام بھی "غلام" رکھ چھوڑا تھا

اور صرف اس خوبصورت ملک کا نام ہی تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ نئے حاکموں نے سارے ملک کے رنگ و ڈھنگ ہی تبدیل کر دیئے تھے۔ پہلے ماہ جیٹھ میں اس ملک کے کھلیان گندم سے خالی نہ رہتے تھے۔ بھادوں میں کھیتوں کے اردگرد دُور دُور تک دھان کی مہک پھیل جاتی تھی۔ بھینسوں کے تھن جنھیں یہاں 'امرت کٹورے' کہا جاتا تھا ـــــ ہمیشہ بھرے رہتے تھے اور لوگ اپنی محنت کے بل بوتے پر بڑے سکھ چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب سے یہ نئی حکومت شروع ہوئی ـــــ کھلیان چاہے پہلے ہی کی طرح خالی نہ ہوتے تھے۔ دھان کی مہک بھی پہلے ہی کی طرح پھیلتی۔ امرت کٹورے بھی اُسی طرح بھرپور تھے لیکن نئے حاکموں نے لوگوں سے ان تمام نعمتوں کو استعمال کرنے کا حق چھین لیا تھا اور صرف ہر چیز کو پیدا کرنے کے لئے سخت سے سخت محنت مشقت کرنے کا حق ہی ان کے پاس رہنے دیا تھا۔ جب تمام اشیاء کی پیداوار ہو جاتی تو نئے حاکم سب کچھ جمع کر کے بڑے بڑے قلعوں میں لے جاتے۔ ان قلعوں کے پھاٹک آہنی تھے اور باوردی سپاہیوں کا پہرہ۔ پھر قلعے کے انبار خانوں میں سے "غلام ملک" کے لوگوں کو تھوڑا تھوڑا اناج خیرات کے طور پر دیا جاتا۔ بس اتنا کہ وہ اگلی دفعہ ان تمام اشیاء کو پیدا کرنے کے قابل رہ سکیں کچھ بھینسیں دی جاتیں کہ وہ دودھ دیتی رہیں اور کچھ بیل تاکہ وہ ہلوں میں جُتے رہیں۔ اور بس، اس کے علاوہ ذرہ بھر بھی کچھ نہیں (البتہ ـــ وہ اس سے الگ تھلگ 'غلام ملک' کے چوہے موقع پا کر ان انبار خانوں میں سے ہڑپ کر جاتے تھے۔ لیکن ان حاکموں میں سے کئی ایک سمجھ دار حاکم ان چوہوں کی جگہ اپنے ملک کے چوہوں کو منگوا کر اس کمی کی تجاویز بھی سوچتے تھے۔) اور آخر ان قلعوں میں سے سب کچھ سمیٹ کر، جہازوں پر لاد کر، سات سمندر پار راجہ کے ملک میں بھیج دیا جاتا۔

جس طرح پہلے زمانے میں ـــــ جب لوگ اپنے ملک کو "حسین صبح" یا "راحت بخش آشیانہ" کہا کرتے تھے۔ مختلف موسم آیا کرتے تھے۔ کوئی کھیتوں کا موسم اکوئی پھولوں اور کوئل کے چہکنے کا کوئی ناچنے کودنے کا کوئی پھولوں کے کھلنے کا۔ اور کوئی پتوں کے جھڑنے کا۔ اسی طرح اب بھی مختلف موسم آتے۔ لیکن جس طرح باقی سب کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ موسموں کی نوعیت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ اب کوئی فاقوں سے مرنے کا موسم تھا تو کوئی تجہیز و تکفین کا، کوئی طبیعی کا تو کوئی بیٹھنے کا۔ کوئی جیل خانے تعمیر کرنے کا۔ تو کوئی لوگوں کو قیدی بنانے کا۔ اور یہ موجودہ موسم بھی گذشتہ موسموں کی طرح ایک خاص میعاد کے بعد آتے۔ جیسے قدرت کے اصولوں کے پابند ہوں۔

ملک کے باشندوں میں سے کچھ ایک کو نئے حاکموں نے اپنے خاص نوکر بنا لیا۔ انھیں قلعوں کے پھاٹک بند کرنے، دیسی چوہوں اور بوقت ضرورت دیسی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کام سونپا جاتا۔ ان نوکروں میں سے جو بہت نمک حلال ثابت ہوتے انھیں کاڑھی ہوئی زرد دیاں پہنا کر اور ہاتھوں میں سنگینیں تھما کر بڑے پہرہ داروں کا خطاب دیا جاتا۔ "غلام ملک" کے معزز حضرات اس خطاب کو سب سے بڑی عزت سمجھنے لگے۔

لیکن اس ملک کے عام لوگ جنھیں اپنے ملک کے پرانے ناموں سے محبت تھی۔ جو اِن ناموں کے چھن جانے سے اس طرح محسوس کرتے تھے جیسے کسی ڈاکو نے انکی مشکیں کس کر ان کی آنکھوں کے روبرو ان کی بوڑھی ماں کے تمام کپڑے اتار دیئے ہوں۔ ایک ایک کر کے ان کی ماں کے چاندی ایسے تمام سفید بال نوچ ڈالے ہوں۔ وہ تمام لوگ، کھلیان جنکی محنت کا ثمر تھے۔ دھان کی مہک نے جن کے پسینے سے جنم لیا تھا۔ جن کی محبت نے امرت کٹوروں کو چھلکایا تھا

وہ تمام لوگ نئے حاکموں اور ان سے خطابات حاصل کرنے والوں کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پہلے تو یہ حقارت یونہی سُلگتی سی رہتی۔ کیونکہ ان میں اُنسوؤں کی جلن ہوتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ آنسو خشک ہو گئے۔ اور مقدس نفرت انگاروں کی طرح دہک اُٹھی۔ اور پھر شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔

کھلیانوں اور کھیتوں میں سے نکل کر لوگ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ اور ان قلعوں کی طرف بڑھنے لگے جن میں ان کی محنت کے ثمر بند تھے اور ان جیلوں کی طرف بڑھے جن میں وہ بہادر قیدی تھے جنھوں نے اپنے ملک کو "غلام ملک" کہنے سے انکار کر دیا تھا اور دن دہاڑے سب کے سامنے "حسین صبح" کے گیت اپنے ملک کے پہاڑوں ایسی بلند آواز میں گائے تھے۔ وہ قیدی تھے جنھوں نے نئے حاکموں کے اہلکاروں کو اپنے کھلیانوں کو چھونے نہیں دیا تھا۔ دھان کی مہک کو لوٹنے نہ دیا تھا۔ اور امرت کٹوروں کو نوچتے ہوئے دستِ حرص کو کاٹ ڈالا تھا۔

لوگوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم سے سنگینوں والے سہم گئے۔ راجہ نے اپنے سات سمندر پار کے دیس سے اپنے سپاہیوں کو بھیجا۔ سپاہیوں نے لوگوں پر گولیوں کی بوچھار کی۔ لیکن گولیاں جیسے سمندر میں گر رہی تھیں۔ پھر سات سمندر پار کے راجہ نے لاتعداد بم بار جہاز بھیجے

لیکن لوگوں کا ہجوم اب ایک عظیم فوج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بم برستے اور کئی ان جھنڈوں سمیت گر پڑتے جن پر ایک آشیانے کی تصویر تھی جن پر حسین صبح کی کرنیں تھیں۔ لیکن جس قدر گرتے اس سے دگنے، اس سے چوگنے اس ملک کی ان گنت کچی بستیوں پر سے اس فوج میں آ شامل ہوتے۔ اور جھنڈوں کو بوسہ دیکر اٹھا لیتے فوج کا لحظہ بہ لحظہ زیادہ طاقتور ہوتی گئی۔ اور آگے بڑھتی گئی ــــ قلعوں کی جانب، جیلوں کی طرف ــــ جن کے ملک کے جسم پر چیچک کے بدنما چھالوں کی طرح اُبھرتے ہوئے تھے۔

لوگوں کی فوج آگے بڑھتی گئی اور کاڑھی ہوئی دردیوں والے ــــ وہی چوہوں اور بوقتِ ضرورت بیس لوگوں کو مارنے کے لئے رکھے ہوئے ملازم ــــ ان نئی قسم کے لوگوں سے خوفزدہ ہو کر جنگلوں میں جا چھپے۔ لیکن جس ملک کے ساتھ انھوں نے غداری کی تھی اس کے جنگلوں نے بھی انھیں پناہ نہ دی۔ کچھ لوگوں کی فوج کے ہاتھ لگ گئے۔ اور باقی کو سانپوں نے ڈس لیا۔ چیتوں اور شیروں کی خوراک بن گئے۔

اور وہ عالم جو سات سمندر پار سے آ کر یہاں بسے ہوئے تھے، اور ان کی سپاہ، اور بم برسانے والے اس قدر حواس باختہ ہوئے کہ کئی حاکم رات کو بھیانک خوابوں سے ہڑبڑا اُٹھتے اور ساتھ کی چارپائی پر لیٹی ہوئی اپنی بیوی کو دشمن کا جاسوس سمجھ کر گولی مار دیتے۔ اپنی ہی پلٹن کے دو سنتری شام کو جھپٹے میں ایک دوسرے کو دشمن سمجھ کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایک دوسرے پر گولی چلا دیتے۔ آسمان کی رفعتوں میں پرواز کرتے ہوئے بمباروں کو اس حسین ملک کے بادل اس طرح گھیر لیتے کہ وہ حاکموں کی عالیشان بستیوں اور قلعوں کو لوگوں کے گاؤں سمجھ کر ان پر بم برسانے لگتے۔

لوگوں کی فوج آگے بڑھتی گئی۔ اس قدر آگے کہ قلعوں کے آہنی پھاٹک ان کی دھمک ہی سے لرزہ براندام ہو گئے۔ اس قدر آگے کہ جیلوں میں بند بہادروں کے گیت شاہین کی پرواز کی طرح سرسراتے ہوئے ان کے گیتوں سے ہم آہنگ ہو گئے۔

لوگوں کی فوج اور آگے بڑھ گئی۔ اور پھر پھاٹک توڑ دیئے گئے۔ اور ان کی محنت کے ثمر آزاد ہو گئے۔ وہ جیلوں میں بند بہادروں سے بغلگیر ہو گئے۔

قلعوں اور جیلوں پر لوگوں نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ جھنڈے جن پر آشیانے کی تصویر تھی اور حسین صبح کی کرنیں تھیں۔ اور سہم لوٹ آئے ــــ کوئی گیتوں کا، کوئی جھولوں اور کوئیلوں کے کوکنے کا۔ کوئی چڑیوں کے چہکنے کا اور کوئی پتوں کے جھڑنے کا .....

(پنجابی سے ترجمہ:- پرکاش پنڈت)

ایک کہانی، جو مکمل نہ ہو سکی

پرکاش پنڈت

جیسے تیسے اس ایک نشست میں ہی مجھے ایک مزیدار چٹ پٹی کہانی گھڑنا اور گھسیٹنا ہے، کہانی عریاں نہ ہونی چاہیئے لیکن شوخ ہونا شرط ہے۔ عاشق اور معشوق محبت کی پینگیں بڑھاتے بڑھاتے بامِ بام تک تو پہنچ جائیں لیکن دو چار ہاتھ ادھر ہی کمند ٹوٹ جانی چاہیئے۔ عاشق کو محبوب کے سنگِ آستاں تک تو ضرور پہنچا یا جائے لیکن اگر اس نے سر جھوڑنے کی جسارت کی تو صاف فرمائیے گا کہانی شوخ کے بجائے عریاں ہو جائیگی اور "اٹھارویں صدی" کے معیار پر پوری نہ اُتر سکے گی اور آپ جانتے ہیں "اٹھارویں صدی" کا معیار ..... اور اگر صبح دس بجے تک میں ان تمام خوبیوں کی حامل ایک کہانی اور دو گھنٹے کی قصیدہ خوانی اور اپنی ازلی بے سروسامانی لے کر اٹھارویں صدی" کے دفتر میں نہ پہنچا تو اس کا مالک اور مدیر مجھے دس روپے تقدِ عنایت کرنے سے سخت دور ہوگا۔

اور یہ کہانی لکھنا اس لئے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ابھی ابھی جب میں چاندنی چوک میں سیر گشت کر رہا تھا اور مجھے کسی شوخ لڑکی کی تلاش تھی کہ جسے میں اپنی شوخ کہانی کی شوخ ہیروئن بنا سکتا اور میری جیب میں چار روپے اور چودہ آنے کی ریزگاری تھی اور لوگ باگ کل کی دیوالی کے لئے مٹھائیاں اور برتن بھانڈے اور غبارے خرید رہے تھے اور میں اس بھیڑ بھڑکے میں بے طرح گھر گیا تھا کسی منچلے نے کمال صفائی سے میری جیب کاٹ لی تھی۔ جیب کے کٹ جانے کا مجھے اتنا ملال نہیں کیونکہ بقول شخصے جو چیز بنی ہے بگڑے گی جو پیدا ہوا ہے مرے گا۔ ہر شے کا ایک وقت ہوتا ہے جو اپنے مصرف کے بعد ختم ہو جاتی ہے یعنی موت کا ایک دن معین ہے اب اس قمیص ہی کو لیجئے۔ گذشتہ دو برس سے میں اسے اپنے مصرف میں لا رہا تھا۔ سردی گرمی جاڑا، لُو ہر رنگ اور ہر حال میں یہ بڑی سعادتمندی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتی رہی، آخوش اسے بھی فنا ہونا تھا جب اس کی آستینیں نہ رہیں۔ کالر اپنی موت آپ مر گئے تو اس بے چاری جیب کی اوقات معلوم! حسرت اُن چار روپے چودہ آنے پر ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

یہ چار روپے چودہ آنے اگر میری جیب میں رہتے تو شاید میں یہ کہانی لکھنے نہ بیٹھتا۔ لیکن کل دیوالی ہے بکشی پوجا! اور گھر میں جوئی بھانگ نہیں گھر کی بکشی چار روپے چودہ آنے کے عم اور عفتہ میں تینوں بچوں کو پٹنے کے بعد لگے ہاتھوں اپنا سر بھی پیٹ رہی ہے۔ اس بُری گھڑی کو کوس رہی ہے جب مجھ ایسے پاجی کے ساتھ اس نے چار چکر لئے اور رہ رہ کر چھت کی طرف دیکھ رہی ہے جس کے اوپر بھگوان رہتا ہے اور جو اس کی آہ وزاری کی تاب نہ لاکر فوراً یم دیوت جی کو بھیجے گا اور اسے تمام دکھوں سے مُکتی مل جائے گی۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں تین بچے ہیں اور اللہ کا نام ہے اس لئے میں یہ کہانی ضرور لکھوں گا اگرچہ اس بیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کے معیار پر پوری اُترنے والی مصالحہ دار چٹ پٹی، نمکین نچڑی کہانی لکھنا کسی بھی پاجی کے بس کا روگ نہیں۔

جیب کٹنے سے پہلے میں خاصے اچھے موڈ میں تھا۔ موڈ تو اب بھی بُرا نہیں لیکن وہ بات کہاں کہ منہ میں کینی کا سگرٹ کلّوں میں بنارسی پان کی گلوریاں، جیب کے چار روپے چودہ آنے کا خمار اور چند گھنٹوں کی قلم گھسائی کے دس روپوں کا تصور اور پھر کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹوں کی تلاش ——— میرے اردگرد بہت سی لڑکیاں تھیں لیکن کہانی کوئی نہ تھی۔ یہ کہانی اگر مجھے "اٹھارویں صدی" کے بجائے بیسویں صدی کے لئے لکھنا ہوتی تو اس کے برعکس میں یہ کہتا کہ میرے اردگرد کہانیاں تو بہت تھیں لیکن لڑکی کوئی نہ تھی۔ آپ کہیں گے پاجی پن کی حد ہے اعداد وشمار کی رو سے عام حالتوں میں بھی چاندنی چوک میں ہر شام چار بجے سے آٹھ بجے تک کے عرصے میں چار ہزار آٹھ سو بیاسٹھ لڑکیاں موجود ہوتی ہیں اور دن تہوار کے موقع پر تو ساری دلی اُمڈ آتی ہے چاندنی چوک میں لیکن اے اٹھارویں صدی کے شوخی پسند قارئین شوخی کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے جس طرح مجھ ایسا کوئی مسخرا شوخی کا وہ معیار قائم کرنے سے سخت دور ہے جو گرمی وھتری ایڈیٹر صاحب نے عرصہ ایک چوتھائی صدی سے "اٹھارویں صدی" کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر مسلط کر رکھا ہے اور انھیں دنیا کی ہر بڑی شوخ، صرف محبت کے سہارے جینے والی اور اپنے محبوب سے دو چار ہاتھ ادھر کھڑی رہکر سرد آہیں بھرنے والی دکھائی دیتی ہے اسی طرح مجھے لڑکیوں کے جم غفیر میں بھی کوئی لڑکی دکھائی نہیں دیتی۔ اس بیسویں صدی میں لڑکی نام کی مخلوق عنقا ہے یہاں عورت بھی نہیں ہے، چاندی کے تاروں سے بندھی ہوئی اور انگلیوں کی جنبش پر ناچتی ہوئی کاٹھ کی پتلیاں ہیں

یہ فرق صرف منظر کا فرق نہیں ہے بنیک بلینس اور لمبی ہوئی جیب کا فرق ہے۔ کیا آپ نے کبھی تیلوں کا تماشہ دیکھا ہے؟

نہیں، مجھے آپ سے اس قسم کے اوٹ پٹانگ سوالات نہیں کرنے چاہئیں آپ نے تو اس توقع سے یہ کہانی پڑھنا شروع کی ہوگی کہ اس میں کسی ایسی لڑکی کا ذکر ہوگا کہ زلفیں جھمی کی نا گن ہوں گی۔ ہونٹ بوریں جیسے کے ہوں گے اور گلو بدن دآہو چشم بہر صورت ہوگی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی شبنمی کنج میں اپنے عاشقِ دلنواز کی بغل میں لیٹی ہوئی ..... لیکن نہیں، اس کے آگے تو شوخی ختم ہو جاتی ہے اور حقیقت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں اور حقیقت ہمیشہ عریاں ہوتی ہے اور اٹھارویں صدی میں عریانیت ..... معاف فرمائیے، مجھے اپنے دس روپوں کا خیال ہے۔

صبح دس روپے ملتے ہی میں سیر بھر تیل کی گرم گرم جلیبیاں، پاؤ آدھ پاؤ نمک پارے اور راستے ہی بھی اور سادے کے لڈو خریدوں گا۔ دودھ کے لئے کوک سے چلنے والا لنو، ہشنی کے لئے موی کاغذ میں لپٹی ہوئی رنگین گڑیا اور آدرش کے لئے سفہ سے بجنے والا سات سروں کا باجہ۔ بیوی کئی مہینے سے سلولائیڈ کی رنگین چوڑیوں کے لئے کہہ رہی ہے۔ کل اس کی بھی مراد بر آئے گی۔ دسوں بار سمجھا چکا ہوں کہ سلولائیڈ کی چوڑیاں ملنگ بیلنے کی عورتوں کے لئے نہیں ہوتیں کہ مرد جن کے دن بھر بجا بجا کے تھک جائیں اور دن رات چولھا۔ انھیں تو بتیس دانتوں میں زبان کی طرح رہنا چاہیئے لیکن نہیں مانتی ——— یہ اس میں بہت بڑا نقص ہے کہ وہ عقل اور قاعدے کی کوئی بات نہیں مانتی۔ پچھلے سال آدرش کے لئے جب اس کا پیٹ پھولا تو میں نے اسے سمجھا یا کہ موجودہ حالات میں ہر برس ایک بچہ پیدا کرنا پیٹ پر پتھر باندھ کر درخت اگانے کی مہم میں شامل ہونے سے کم خطرناک نہیں اور خدائے طب حکیم آمند نارائن جی کی خدمات حاصل کرنے کے لئے کہا کہ عرصہ اچاس برس سے دلی، جالندھر اور حیدر آباد سے ایک ساتھ چھپنے والے کثیر الاشاعت ہمدرد اخبار میں "حمل کا گرانا پاپ ہے" کے زیر عنوان اشتہار رہے ہیں اور اس عرصہ میں کئی اچاس ہوا سقاط کر چکے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے وہ حمل اور حمل کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتی اور راج رشی ٹنڈن جی کے اخلاطی فلسفہ پر خطرناک حد تک ایمان رکھتی ہے۔ چمڑے کے جوتے نہیں پہننے چاہئیں نمک ہی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، دودھ دہی، کھمن وغیرہ صحت کے لئے مضر ہیں۔ تمام دوائیاں بیکار ہیں اور فائدے کے بجائے نقصان کرتی ہیں ——— مکانوں میں رہنے سے صحت پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے کھلے آسمان کے نیچے ڈیرے جمانے چاہئیں۔ دن میں ایک بار کھانا کھانے سے ہاضمہ ٹھیک رہتا ہے۔ اور اگر ایکبار بھی نہ کھایا جائے اور منگا رہا جائے تو آنتا کو بڑی شانتی ملتی ہے شاید اسے معلوم نہیں کہ بابو جی تو حال ہی میں کانگرس کے پردھان بنے ہیں اور خدائے طب کا تجربہ نصف صدی کا تجربہ ہے "حمل کا گرانا پاپ ہے" یعنی یہ حمل گرانے کی تیر بہدف دوا ہے اور اس مقصد کے لئے ہمارے یہاں کو الیفائڈ ز سیں ہر وقت موجود رہتی ہیں"۔ بلیک مارکیٹ کرنا پاپ ہے" یعنی بلیک مارکیٹ ایک لاثانی دھندا ہے۔ "تشدد کرنا پاپ ہے" یعنی صرف ہمیں گولی چلانے کی سعادت حاصل ہے۔ "ہڑتال کرنا پاپ ہے" ہمیں تین سو نئی حیلوں کے ٹنڈز مطلوب ہیں ——— خیر کل میں اُسے سلولائیڈ کی رنگین چوڑیاں ضرور دلا دوں گا خود ہی جل مرے گی ایک دن۔

آپ ان باتوں پر لعنت بھیجئے اور اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے لبوں کی کہانی سُنئے کہ جس سے آپکو روحانی فیض حاصل ہوگا اور مجھے دس روپے نقد۔ ادھر ادھر کئی لڑکیوں کو گھورنے کے بعد جب اتفاقاً میری نظر اس پر پڑی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ چونکا دینے والی شبیہہ کی مالک تھی۔ گندھی ہوئی سیاہ عنبریں زلفوں کا ہالہ اس کے نورانی چہرے کے پیچھے لٹکا ہوا تھا اور سیاہ حالے میں سنہرا ج کی نازک سی ڈنڈی۔ پہلی نظر میں وہ مجھے اندر کے دربار کی ایک اپسرا دکھائی دی جو غلطی سے زمین پر اتر آئی تھی نازک گدگدے جلد پر آبی ریشم کی بیش قیمت ساڑھی موجود تھی لیکن جسم کے عضو عضو پر اجنتا کے غاروں کی عریاں نزکیوں کے اعضاء کا دھوکہ ہوتا تھا۔ وہ مسکرائی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات جلترنگ کے شیریں نغمے سے گونج اٹھی ہو۔ وہ ہنسی اور مجھے محسوس ہوا جیسے ساری کائنات جلترنگ کے شیریں نغموں میں ڈوب گئی ہو اور کچھ بھی باقی نہ رہا ہو۔ صرف جلترنگ کا نغمہ اور نغمے کے دوش پر بہتی ہوئی ایک اپسرا، ایک حورت، ایک نور، ایک شعلہ جوالا۔ دوسری نظر میں وہ مجھے فوارہ چوک میں گھڑی چاٹ کا بیچنے جاتی ہوئی دکھائی دی۔

اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جواب میں وہ مسکرا کر سیٹھ کچھوا نارائن کی طرف دیکھنے لگی اور پھر سیٹھ کچھوا نارائن تیوری چڑھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ اور انھوں نے بیکارڈ کے الٹرا ماڈرن ماڈل کا پٹ کھول دیا اور پیکارڈ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اور میں اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا کسی دوسری کار آمد لڑکی کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

سوچنے لگا کہ اگر کوئی دوسری لڑکی نہ ملی تو اسی لڑکی کے چہرے پر سے میکس فیکٹر کا میک اپ کھرچ کر اس پر شوخی کا غازہ مل دوں گا اور سیٹھ کچھوا نارائن کی جگہ مضبوط جھنتی ہاتھ پاؤں اور خوبصورت خدوخال کا کوئی البیلا نوجوان کھڑا کر دوں گا۔ دونوں فوارہ چوک میں پیکارڈ کے الٹرا ماڈرن ماڈل کے قریب کھڑے ہونے

کے بجائے کسی کھیت میں دھان کی پنیری لگا رہے ہوں گے اور لڑکی کے ہاتھ میں پنیری کے ننھے ننھے پودے ہوں گے، چاٹ کا پتہ نہ ہوگا اور اس کی آنکھوں میں شبے دبے حواس کا عکس نہ ہوگا اور اس کی جوانی کے تبسم پر پیرے نہ ہوں گے اور نوجوان کے ہاتھ میں بھی بلیک اینڈ وائٹ کا سگرٹ نہ ہوگا اور تو ند میں بلیک اینڈ وائٹ کی شراب نہ ہوگی اور چہرے کی جھریوں میں سے ذاتی ملکیت کی نئی نئی ہلڈنگوں، کارخانوں، بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے بلیو پرنٹ نہ جھانک رہے ہوں گے۔ لیکن پھر فوراً ہی مجھے اپنا ارادہ ترک کر دینا پڑا کہ ایسے محبوب اور محبوبہ کی کہانی بھی "اٹھارویں صدی" کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ "اٹھارویں صدی" کے معیار پر اس آسانی اور سادگی سے پورا نہیں اترا جا سکتا۔ اٹھارویں صدی تک کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کرنا ہوگی چنانچہ میں نے بزن کہا اور چوک پتھر والا کا رُخ کیا۔

ابھی میں چوک پتھر والا میں کھڑا اپنا سر ٹیک رہا تھا کوئی لڑکی ــــ کوئی مستقل، مسلسل، متواتر شوخ لڑکی، لیکن مجھے کوئی عارضی شوخ لڑکی بھی دکھائی نہ دی۔ جامع مسجد کی طرف سے آنے والی سڑک کے ساتھ میری بہت امیدیں وابستہ تھیں لیکن ادھر سے بھی نوا وند کی مستقل، مسلسل، متواتر ساپیٹ اور پاپ، چھاؤ رسات بچوں کے کمر توڑ پان پوشن سے چرمی، پرچڑی اور نحوست زدہ عورتیں ہی اُبھر رہی تھیں۔

میں نے سوچا کس قدر بیوقوف ہیں یہ عورتیں مجھے اور مگر می و محترمی ایڈیٹر صاحب کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہیں جدید فیشن کے شوخ لباس نصیب نہیں ہوئے تو سہ لہا سال پہلے کی شادی کے جوڑے نکال کر پہن لئے ہیں۔ لپ اسٹک خریدنے کی توفیق نہیں۔ نہ ہی ماتھے کی لمبائی بڑھانے کی خاطر بالوں کو جوتوں پر تھوپ لیا ہے اور کڑوے تیل سے تیار کردہ چپ چپے کاجل سے اپنی آنکھیں چندھی کر لی ہیں اور ملکۂ حُسن کا خطاب پانے اور میرے شوخ افسانے کی شوخ ہیروئن بننے سر بازار آ نکلی ہیں۔

سر پھوڑنے کے لئے میں نے چوک پتھر والا کا بنیادی پتھر کہ جس کی رو سے اس چوک کا نام پتھر والا چوک پڑا تھا، ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوک بھی دراصل چوک نہ تھا ایک تراہا تھا۔ ایک راستہ لال قلعہ سے شہنشاہوں کے رعب و دبدبے اور شاہی احکام لیکر نکلا تھا۔ ایک، جامع مسجد کا ایمان اور خدائی احکام لیکر چلا تھا اور یہ دونوں راستے یہاں آکر، ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اور اپنا نام چاندنی چوک بنا کر اور اپنے دائیں بائیں کدھانے، بینک اور تجارت کے گھوارے تعمیر کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ لوگ لال قلعہ کی طرف سے آ رہے تھے۔ لوگ جامع مسجد کی طرف سے آ رہے تھے اور چاندنی چوک کی طرف جا رہے تھے۔ پھر کچھ لوگ مجھے ایک اور راستے کی طرف بھی جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔

یہ راستہ چند قدم کا راستہ تھا اور ایک شراب خانے میں جا کر ختم ہو جاتا تھا اس مختصر سے راستے کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے ہی کسی پیر سخاں نے اس تراہے کا نام چوک رکھا ہوگا ــــ وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو وہ ایک چوک تھا اور چونکہ وہ ایک چوک تھا اس لئے چوک پتھر والا کی رو سے، وجہ تسمیہ سے قطع نظر وہاں پتھر ڈھونڈنا بھی لازمی تھا ــــ میں نے پھر پتھر کی تلاش شروع کی اور پھر یکایک میرا سر اس سے ٹکرا گیا۔

لیکن چکرا کر گرنے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ پتھر نہ تھا ایک شرابی تھا اور شراب خانے سے نکل کر پتھر بنا سو رہا تھا کہ اب کہاں جائے، کونسا راستہ اختیار کرے۔

میں نے اسے جامع مسجد کی طرف جانے کی تلقین کی۔

اس نے کہا "میں جامع مسجد کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے رم پی ہے اس لئے اب ادھر نہیں جانا چاہتا۔"

"تو ادھر، لال قلعہ کی طرف جاؤ" میں نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اس نے پیار سے میرے گال پر چٹکی بھری۔ "کیا اور کوئی لڑکی ملے گی؟"

لڑکی!

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ممکن ہے میری طرح اُسے بھی "اٹھارویں صدی" کے لئے کہانی لکھنا ہو "میں خود لڑکی کی تلاش میں ہوں"

"کیا تم نے بھی رم پی ہے؟"

"نہیں"

"اسکاچ؟" اس نے میرے تار تار لباس کا جائزہ لیتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں"

"ٹھرّا؟"

"پارسال دسہرے کے موقع پر پیا تھا۔"

"آج کیا پیا ہے تم نے؟"

"آج مجھے اٹھارویں صدی کے لئے کہانی لکھنا ہے"

اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے سنے چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا اور میں "اٹھارویں صدی" کی کہانی اور رم کے باہمی تعلق پر غور کرنے لگا۔ کس قدر ہم آہنگی تھی دونوں میں۔ استعمال اگرچہ مختلف تھے لیکن لڑکی لازم و ملزوم تھی اور پھر میں اسکاچ، رم اور ٹھرّے کے فرق پر بھی غور کرنے لگا۔ ذائقے مختلف تھے، ردِعمل مختلف تھا۔ تین طبقوں کا کتنا تضاد، مکمل رویداد تھی۔ اسکاچ، رم اور ٹھرّے میں، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی۔ زندگی کی بے حاصلی اور انتشار سب میں پایا جاتا تھا اور یہ انتشار اسکاچ کی شکل میں پیٹ میں پہنچ کر اوپر کی طرف رخ کرتا تھا اور رم کی شکل میں نیچے کی طرف اترتا تھا اوپر اور اوپر لاکھوں، کروڑوں، اربوں روپوں، بنگلوں، موٹر کاروں اور حرم کی مرمریں داشتاؤں کی طرف نیچے اور نیچے پیشہ ور عورتوں کے خفیہ اڈوں، تنگ و تاریک گلیوں اور رنڈیوں کے چکلوں کی طرف اور پھر عریب نواز ٹھرّا! بھیکے کی طرح چڑھتا تھا اور بھیکے کی طرح اُتر جاتا تھا۔ ٹھہرے کے غم کے بادل چھٹ جاتے تھے لمحہ بھر کے لئے زندگی نور میں جھل جاتی تھی دوسرے لمحے میں پھر اندھیرا چھا جاتا تھا اور بیوی چڑیل نظر آنے لگتی تھی۔

معاف کیجئے گا، میں بھی کیا بھوتوں چڑیلوں کا قصہ لے بیٹھا ہوں۔ دراصل مجھ میں بھی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ میں موقع محل دیکھے بغیر اندھا دھند ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہوں۔ آپ ہی بتائیے کہاں سیم تن، نازک بدن، نازک اندام شوخ لڑکیاں جو "اٹھارویں صدی" کا دل بلکہ جان بلکہ روح ہیں اور کہاں دن رات ہڈیاں ترڑوانے اور چمڑی ادھڑوانے کی دلدادہ پھوہڑ بیویاں۔ کسی اور پرچے کی بات ہوتی تو کہتے، چلو جانے دو، تھوڑا سا ہیک لو، چل جائیگا۔ لیکن اٹھارویں صدی میں ایسی کوئی بات نہیں چل سکتی۔ مگر میری محترمی ایڈیٹر صاحب اگر ایسی باتیں چلنے دیتے تو ان کا پرچہ اور پرچے کے ساتھ پلنگ توڑ گولیوں کا کاروبار کب کا چل چکا ہوتا۔

ہاں تو جب وہ شرابی نہاتے نڑی کی تلاش میں چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گئے تو میں نے سوچا اگر یہاں ایک شرابی کو لڑکی مل سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک صاحب ہوش و حواس اس سے محروم نہ ہے، میں بھی چاندنی چوک کی سڑک پر مڑ گیا۔ فوارہ چوک میں میں نے پھر چند کاٹھ کی پتلیوں کو چاٹ اور گول گپے کھاتے دیکھا لیکن ان کی طرف متوجہ ہونے کی میں نے ضرورت نہ سمجھی اور چوراہے میں فوارے کی پھوار کے نیچے جا کھڑا ہوا ـــــ ایک پنتھ دو کاج دماغ کو بھی ٹھنڈک پہنچے گی اور چاروں طرف نظر بھی دوڑائی جا سکے گی۔

یہ چوک بھی دراصل پتھر والا کی طرح ایک تراہا ہی تھا۔ چاندنی چوک کی سڑک میں سے صرف ایک سڑک پھوٹتی تھی جو صبح سفر، ہر شام سفر، اس دُنیا کا انجام سفر کی تلقین کرتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی لیکن جس طرح ایک مختصر سے راستے نے شراب خانے میں داخل ہو کر زندگی کی بے حاصلی اور انتشار کو وقتی طور سے تھام کر ایک تماشے کو چوک میں تبدیل کر دیا تھا اسی طرح اس جگہ بھی ایک مختصر سے راستے نے پولیس چوکی میں داخل ہو کر انتشار کو ختم کرنے کا ڈھونگ رچا کر ایک تراہے کو چوک بنا دیا تھا میں نے سوچا، یہاں وہاں کتنے ہی چوک پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن انتشار ختم نہیں ہوتا۔ انتشار ختم تھا ہی نہیں اور بڑھتا ہے اور شدت اختیار کرتا ہے اور جب تک یہ طویل و مختصر راستے کبھی انتشار تھامنے کے نام سے، کبھی انتشار ختم کرنے کے نام سے، کبھی خدا کے قہر سے ڈرانے اور عبرت دلانے کے نام سے، چاندنی چوک کی سیدھی اور ہموار سڑک کو کاٹتے رہیں گے تب تک انتشار بڑھے گا اور بڑھے گا اور بڑھے گا۔

فوارے کی ہلکی ہلکی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار نے غریب پر خدا کی مار کے مصداق میرے تمام کپڑے نمی سے بھر دیئے تھے اور میرا ذہنی انتشار بدستور قائم تھا۔ پھر جب اُکتائے جاڑے کی خشک اور خطرناک خنکی جسم میں نمونیہ کے احساس کی سوئیاں گھونپنے لگی اور لڑکی دہی ڈھاک کے تین پات رہی تو میں نے ہفتوں سے سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا پانچ روپے کا نوٹ بھنوایا۔ اور جسم کو حرارت پہنچانے کے لئے پان کے بیڑے میں پریمنٹ کی ٹیاں ڈلوائیں اور کینپی کے سگرٹ کے لمبے لمبے کش کھینچنے لگا ـــــ کہ جان ہے تو جہان ہے ـــــ

فوارہ چوک سے جب میں نے چوک گھنٹہ گھر کا رُخ کیا تو مایوسی اور نا اُمیدی کے بادل چھٹ چکے تھے اور آنکھوں میں نُور اور دل میں سرور پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالت عجیب ہونے لگی ـــــ سامنے نے کہیں کوکین تو نہیں ڈالدی میں نے اپنے تمتمائے ہوئے چہرے سے پسینے کا لیپ پونچھا اور حیرت سے ادھر اُدھر دیکھا ایک دوکان کی پیشانی پر آویزاں بورڈ "چلی ہی چلی" کی زبان میں چاروں طرف نور ہی نور پھیلا ہوا تھا۔ لڑکیوں کے غول کے غول تھے رسیل فوز کی طرح اُمڈے چلے آ رہے تھے میری

باچھیں کھل گئیں۔ اے نادان لڑکی! اب میرے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جائیگی۔ میں نے بڑھکر اس کی کلائی پکڑلی۔

ایک مختصر دھکے لئے آنہیں میں کھینچا تانی ہوئی۔ اس نے کسمسا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ہاتھ پاؤں پٹکے چیخ چلائی لیکن میں اسے اتنا سستے چھوڑنے کا نہ تھا اور آخر میری بھرپور گرفت نے اسے نڈھال کر دیا اور میں مالِ غنیمت کی طرح اُسے کشاں کشاں اپنے گھر کی طرف لے چلا۔

گھسٹتے گھسٹتے اس نے کہا: "اب میں تمہارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوں لیکن مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ میرے اغوا سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"دس روپے نقد" میں نے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں کی طرف دسویں بار دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا مجھ سے پیشہ کراؤ گے؟" وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں تم پر کہانی لکھوں گا۔"

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر، جو شاید ابھی تک چھوٹے تھے، ایک دلآویز تبسم مچل گیا "مجھ میں ایسی کون سی بات ہے؟"

"تمہارے ہونٹ بے حد خوبصورت ہیں ـــــ ان میں شوخی ہے"

"اور آنکھیں؟" وہ اپنی آنکھیں مٹکانے لگی۔

میں نے اسے روکا "مادام! اپنی آنکھوں کو ناحق تکلیف نہ دو۔ آنکھیں میرے پاس ہیں۔ ابھی ابھی ایک لڑکی اپنی پلکوں پر سوئے ہوئے خوابوں کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کی آنکھیں نکال لیں۔ زلفوں کی گھنیری سیاہ گھٹائیں، ابروؤں کے چلّہ چڑھے کمان، رخساروں کے جنگلی گلاب کے پھول ـــــ کانوں کی شنگرفی لوئیں اور بدن کی چمیلی مہک تک ہر چیز میرے پاس محفوظ ہے۔ صرف ہونٹوں کی کمی تھی سو تم مل گئیں اور میری جان! تم دیکھنا۔ صبح جب میں تمہیں ایک شوخ و شنگ محبوبہ بنا کر کرمی و محتری ایڈیٹر صاحب کے حضور میں پیش کروں گا تو وہ سیدھی انگلیوں گھی نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں گے۔"

"تم مجھ سے پیشہ کراؤ گے"۔ وہ پھر سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے شاید اب وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اپنے مفاد کو، اپنی مجبوری کا نام دیکر، اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رہوں گا۔ اُسے دس روپے میں فروخت کر کے دم لوں گا۔

میں نے اسے ڈھارس بندھانا ضروری نہ سمجھا کہ عورت ذات ہے از خود حالات سے سمجھوتہ کر لے گی۔ بڑی نیک واقع ہوئی ہیں ہندوستان کی عورتیں اور یقین جانئے میرا اندازہ غلط نہیں ہے کیونکہ اس وقت جب میں اُسے اپنے گھر اٹھا لایا ہوں اور اپنے مقصد کے لئے اس کا بے دریغ استعمال کر رہا ہوں، اس کے آنسو خشک ہو چکے ہیں۔ چہرے پر سے امید و بیم کے آثار بھی رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے ہیں اور اس نے ہلکا ہلکا مسکرانا بھی شروع کر دیا ہے ـــــ ابھی ہنسنے لگے گی نیک بخت!

سکونت اور ولدیت درج کر چکنے کے بعد میں نے اُسے اپنا سماشقہ بیان کرنے کو کہا۔

وہ شرما گئی۔

"مائی ڈیر شہزادی تخیل" میں نے اس کی جھجک کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیٹ کر کہا۔ "تمہیں اپنا سماشقہ بیان کرنا ہوگا"

وہ اور بھی شرمانے لگی۔

"میری پیاری ـــــ مختصر کہانی" بیچ میں لوچ پیدا کرتے ہوئے میں نے اُسے اس کے فرض کا احساس دلایا" یہ ضروری نہیں کہ تمہارا سماشقہ فی الواقع کوئی عاشق ہو۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سسی پنوں ـــــ اس قسم کے تمام قصوں کی مدد سے تم اپنا تو سیدھا کر سکتی ہو؟"

اسے لاج کے وہ لاجونتی کے بوٹے میں تبدیل ہونے لگی۔

"کیا غضب کرتی ہو؟" میں نے اس کے پیر پکڑ لئے "میرے بیوی بچوں پر رحم کھاؤ۔ کل دیوالی ہے اور گھر میں ٹھن ٹھن گوپال ہے اور تمہاری تلاش میں میں نے رہی سہی پونجی بھی لٹا دی ہے اور میں نے لاکھوں کے بول سہے سنگھ، تیرے لئے۔"

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ ستم ڈھانے پر تلی ہوئی تھی۔ بولی "تم میرے ہونٹ لے لو اور مجھے جانے دو"

میں نے کہا "تم اپنے کپڑے اتار دو اور جاؤ ـــــ ایسے کپڑے مجھے کہاں ملیں گے؟"

اس کے شرم سے اس کا نچلا دھڑ زمین میں گڑ گیا اور میرے ہوش اڑ گئے۔

بیوی اور تینوں بچوں کی مدد سے بڑی مشکل سے میں نے اُسے کھینچ کر باہر نکالا اور مسکرانے کی درخواست کی۔

وہ مسکرائی اور میری جان میں جان آئی۔

مسکرا چکی تو ہنسنے لگی پھر ہنستے ہنستے رونے لگی اور اس کے ساتھ ہی پھر میری روح فنا ہونے لگی

"اے شہزادی گلفام" میں نے گلوگیر آواز میں کہا "بتا کہ یہ تبدیلی طبعیاتی ہے یا کیمیاوی، ارضی ہے یا سماوی، داخلی ہے یا خارجی۔ تمھارے ایک ساتھ ہنسنے اور رونے کا سبب کوئی زمانہ بعید سبب کے کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی"

"میں ہنسی اس لئے ہوں" اس نے کہنا شروع کیا "کہ مجھے حاصل کرنے کے لئے تم نے اتنی صحرانوردی کی اور روئی اس لئے ہوں کہ اتنی صحرانوردی کے باوجود تم مجھے حاصل نہ کر سکو گے۔ ابھی آندھی جھکڑ اور بارش کا ایک طوفان آئیگا اور وہ لنگڑا دیو جس نے صدیوں سے مجھے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے آدم بو آدم بو کرتا آدھمکے گا اور پھر....."

"نہیں محترمہ نہیں" اس بار میں نے اُسے خوف کے گڑھے میں گرنے سے روکتے ہوئے کہا "میں بچہ نہیں ہوں"

"یعنی" اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔

"یعنی کہ تم میری نانی اماں نہیں ہو کہ مجھے ایسی کہانی سے خوف دلا کر اور تھپک تھپک کر سلا دو گی اور مکرمی و محترمی سلطنی ایڈیٹر صاحب بھی ایسے بچے نہیں ہیں جو تمھارے بھرے میں آجائیں گے انھیں تو ایک شوخ چنچل چلبلی....."

اس نے کہا "میں جانتی ہوں لیکن میری تمام شوخی چنچلتا اور چلبلاہٹ اس لنگڑے دیو نے غصب کر رکھا ہے۔ صدیوں سے میں اس کے سنہری جال میں پھنسی ہوئی ہوں وہ مجھے بیش قیمت ملبوسات اور زیورات لاکر دیتا ہے اور بڑی بے دردی سے مجھے چوستا چاٹتا ہے، اور کسی آدم زاد کو میرے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔"

"کیا یہ پیدائشی لنگڑا ہے؟" میں نے یونہی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" ایک لمحے کے لئے وہ رکی، جیسے صدیوں پہلے کا کوئی واقعہ یاد کر رہی ہو "پہلے یہ بہت خوبصورت تھا۔ بالکل آدم زاد معلوم ہوتا تھا اور اس لئے جب اس نے مجھے اپنے گھر ڈال لیا تو مجھے کچھ زیادہ برا نہ لگا لیکن رفتہ رفتہ اس کی صورت کریہہ ہوتی گئی، نیت میں فتور آتا گیا۔ اور اسے انسانی خون پینے کی لت پڑ گئی...."

"پھر تو اس نے اپنی ٹانگ کو بھی عمداً لنگڑا کر لیا ہوگا" میں نے خواہ مخواہ کی تفصیل سے تنگ آکر کہا۔

"نہیں" وہ پھر ایک لمحے کے لئے رکی، جیسے کوئی اور واقعہ یاد کر رہی ہو "جب مجھے اس سے گھن آنے لگی اور اس نے مجھے چوڑ چوڑ کر نیم جان کر دیا، اور خون چوسنے میں میری آڑ لینے لگا۔ تو میں اسے مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس سے پہلے کئی خوبرو نوجوان سو سو صورتیں اٹھا کر مجھے اس کے پنجۂ ظلمات سے نجات دلانے کے لئے آچکے تھے لیکن مجھے اس کی موت کا راز معلوم نہ تھا۔ آخر ایک دن مجھے پتہ چلا کہ شمال مشرقی علاقہ میں....."

"بس بس" میں نے چیخ کر کہا "آگے میں سب جانتا ہوں، تمھارے سیاست بگھارنے کی ضرورت نہیں"

"سیاست؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں سیاست، سو فیصدی سیاست، مشرق اور مغرب کی سیاست ——— اے سرکش لڑکی ہوش کی دوا کر میں نے تمھیں سیاست کے لئے نہیں، بوس و بوسوں کے لئے پھانسا ہے"

لیکن اس نے ہوش کی دوا نہیں کی بلکہ دونوں مٹھیاں تان کر میرے ہوش و حواس اُڑا دیئے اور میں سر پیٹنے میں بیوی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

"کل دیوالی ہے" اپنے سر میں آخری دھول جماتے ہوئے بیوی نے گوہر افشانی کی۔

"پرسوں دیوالہ ہے" دھپوں کا آغاز کرتے ہوئے میں گنگنایا۔

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک ہسپانوی نظم

پابلو نرودا

توضیح

تم پوچھو گے نرگس کے پھول کہاں ہیں
روح کو بالیدگی عطا کرنے والے لالہ زار کہاں ہیں
وہ بارش کہاں ہے جو ہمیشہ ٹپکاتی ہے ——
فراغت اور پرندوں کے ذکر سے بھرے ہوئے الفاظ کو؟
آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ مجھ پہ کیا گذری ہے
میرا گھر "پھولوں کا گھر" کہلاتا تھا
ہر طرف گیندے کے پھول کھلتے تھے
میرا گھر ایک دل خوش کن جگہ تھی
ہنستے کھیلتے بچوں اور اُچھلتے کودتے کتوں والی
وہ جلاد مراکو کے سپاہیوں اور ہوائی جہازوں کے ساتھ
اور جلاد ملاؤں کے ساتھ جو قاتلوں کو دعائیں دیتے تھے
بچوں کو ذبح کرنے کے لئے آئے
اور گلی کوچوں میں بچوں کا خون بہہ نکلا
جیسے بچوں کا خون بہا کرتا ہے

(ترجمہ)

ایک ہسپانوی نظم

کھن ٹھ ان

○

کہساروں کے پھولوں کی سُرخی
ہمارے شہیدوں کی یاد کو تازہ کرتی ہے
ان خود رو پھولوں کو دشمنوں کے گھوڑوں نے روند ڈالا
لیکن ان کی ازلی سربلندی میں خم نہ آیا
کیونکہ وہ جانتے تھے کہ
ہماری خاک سے جلد ہی دوسرے لہلہاتے ہوئے
غنچے اُگ آئیں گے
جو تعداد میں بھی زیادہ ہوں گے اور حسن و رعنائی میں
بھی ہم پر سبقت لے جائینگے
اس وقت دشمن کے ظالم سواروں کا نام و نشان بھی نہ ہوگا
یہ پھول ایک ایسے گلزار کی صورت اختیار کرلیں گے
جہاں دائمی بہار ہوگی
اور یہ ابد تک سربلندی اور سرفرازی سے
مہکتے اور لہلہاتے رہیں گے

(ترجمہ)

ایک روسی نظم

مایاکوفسکی

ٹاور

(یہ نظم پیرس کے ایفل ٹاور کو دیکھ کر لکھی گئی تھی)

ٹاور!
کیا تم بغاوت کے سردار بننا چاہتے ہو؟
تو آؤ
ہم تمہیں سردار چنیں گے
آؤ کہ یہ جگہ تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے
یہ پیرس، رنڈیوں اور رجعت پرست شاعروں کا پیرس
تمہارے لئے ٹھیک نہیں ہے

ڈرتے ہو ٹاور
گلیوں سے مت ڈرو

تم ڈرتے ہو
ہم تمہاری حفاظت کے لئے ٹریکٹروں کے جھنڈ کے جھنڈ لے آئینگے
تم اب بھی ڈرتے ہو
میں ملوں کو بھی تمہاری حفاظت کے لئے منگالوں گا
اگرچہ تیر کر جانا آسان نہیں
پھر بھی تمہارے لئے پیرس کی شہری مخلوق سے لدے ہوئے پل
ہماری آواز پہ پہلے ہی ہتے میں اٹھ کھڑے ہوں گے
اور ظالموں کو لوہے کی سلاخوں سے پاش پاش کردیں گے

آؤ ٹاور
ہمارے یہاں آجاؤ
وہاں تمہاری ضرورت ہے
چمکتے ہوئے فولاد
دھوئیں میں مسکراتے ہوئے
آجاؤ
ہم تم سے ملیں گے
تمہارا استقبال کریں گے
اپنی پہلی محبت سے بھی بہتر
ماسکو میں آجاؤ
ماسکو کھلا ہے
ہر شخص تمہیں اپنی گلی میں رکھنا چاہے گا
ہر شخص تم سے پیار کرے گا
دن میں ایک سو بار ہم تمہارے فولاد اور تانبے کو پالش کرکے
سونے کی طرح چمکا دیں گے
اس پیرس کو چھوڑ دو
وہ پیرس جو خوش پوش ننگوں کا شہر ہے
وہ پیرس جہاں جمائیاں لیتے ہوئے بولے دار پھیلے ہوئے ہیں
اس پیرس کو
بوبوں کے جنگلوں، عجائب گھروں اور سود کے قبرستانوں میں
ختم ہونے دو
قدم بڑھاؤ ٹاور

. . . . . .

فیصلہ کرو ٹاور
آج تمہارے اردگرد چاروں طرف
بغاوت پھیل رہی ہے
اور پرانے پیرس کی دھجیاں بکھر رہی ہیں

(ترجمہ)

ایک تاثیر کی نظم

مرزا تراسون زادے

یہ آنکھیں

طرح طرح کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اُن میں بعض جادوگر اور پرافسوں ہوتی ہیں
بہانے کرتی ہیں اور شرارت سمجھاتی ہیں۔ ایسی نگاہیں جن سے امان نہیں گھروں کو تہس نہس کر دیتی ہیں
بعض آنکھیں صبح کے ستارے کی مانند شعلے کی طرح چمکتی ہوئی ہوتی ہیں
بعض آنکھیں خوفزدہ ہرن کی آنکھوں کی طرح ہوتی ہیں، جو دور بھاگتی ہیں، گلی گلی بھٹکتی ہیں
بعض اُداس ہوتی ہیں، جیسے خزاں کا پتہ، جس کے نصیب میں موسم بہار نہیں
بعض قاتل کی تلوار کی طرح ہوتی ہیں، جو سینکڑوں دلوں کو اپنی گرفت میں لینے کے درپے ہوتی ہیں
بعض آنکھیں انتقام کی فکر میں رہتی ہیں، الماس سے بھی زیادہ روشن اور قاتل ہوتی ہیں
مجھے ایسی آنکھوں نے دیکھا، جب میں نے اپنے پیارے وطن کی سرحد کو پار کیا
بوڑھے پامیر پہاڑ کی پشت پر، میرے عظیم ملک کے مشرق میں اُداس مشرق کے باغوں میں، لاہور نام کا ایک ستم رسیدہ شہر ہے
ایک نے دوسرے سے کہا اور یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی کہ یہاں روس کے مہمان آئے ہوئے ہیں
اس خبر نے، دوستوں کے دلوں کو باغ باغ کر دیا اور دشمنوں کے دلوں میں شرارت کی چنگاری سُلگنے لگی
ہمیں دیکھنے کے لئے راستے میں دوست اور دشمن سبھی لپک کر پہنچے
لوگوں نے ہمیں اپنے حلقے میں لے لیا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے
تمام لوگ ہمیں دیکھنے میں مشغول تھے، اُن کے کان ہماری آواز پر لگے ہوئے تھے
میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، کبھی میں نے فخر محسوس کیا اور کبھی میں ان سے کترایا
میں نے اس بات پر فخر کیا کہ اس ملک میں بھی اکثریت ہماری محبت اور دوستی کا دم بھرتی ہے
میں کترایا اس لئے تھا کہ میری نگاہوں نے ہمارے بدخواہوں کو ٹٹول لیا
میں نے بدخواہوں کی آنکھوں میں دیکھا، میرے عظیم ملک کے لئے اُن میں بدی اور کینہ بھرا ہوا تھا
میرے آزاد عوام کے لئے، جنھوں نے اپنی محنت سے معجزے کر دکھائے ہیں، اُن کی آنکھوں میں نیستی بھری ہوئی تھی
پھر بھی میرے دل میں یہ اُمنگ تھی کہ اس دور دراز بستی میں بھی میرے وطن کے محافظ موجود ہیں
میرے وطن کے دوست اور اس کی حفاظت کے لئے جنگ آزما ہونے والے موجود ہیں
صلح امن کے چاہنے والے اور سکون و خوش حالی کے محافظ ہیں
ایسے دوست جن سے مل کر زندگی کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے
جو تمام برائیوں، سازشوں اور جنگوں کے مخالف ہیں
دشمنوں کے ناپاک ارادوں کو دیکھتے ہوئے دوستوں کا یہ حلقہ ہمارے اور قریب ہو گیا
امن کی قوتیں کچھ اور مضبوط ہو گئیں، جنگ کا خطرہ کچھ اور دور ہو گیا
اس موقع کی مناسبت سے یہ مثال بڑی اچھی ہے کہ صلح جنگ پہ فتح یاب ہوتی ہے

جائزے

کمال احمد صدیقی

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

"نقدِ حیات" ـــــ ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ
ضخامت :- ۱۶ × ۳۰ × ۲۰ کے ۱۷۱ صفحات ـــ قیمت ڈھائی روپے
ناشر و ـــــــــ الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد

اردو میں تنقید کی کمی فقدان کی حد تک ہے۔ ہمارے یہاں ایسے ناقدین کا توڑا ہے جو زندگی اور فن، دونوں کا صحیح شعور رکھتے ہوں۔ اگرچہ تنقید کے ارتقا میں اختر حسین رائے پوری اور اختر انصاری کا اہم ہاتھ رہا ہے۔ لیکن وہ بہت مختصر عرصے کے لئے اس میدان میں آئے اور جگنو کی طرح چمک کر غائب ہو گئے۔ سوائے ڈاکٹر علیم اور سید احتشام حسین صاحب کے ایک بھی "ایسی ہستی نظر نہیں آتی تھی جس کی رہبری پر اعتماد کیا جا سکے۔ اور ان دونوں میں بھی ڈاکٹر علیم بہت ہی کم لکھتے تھے۔ عبدالحق، عبدالحلیم نے کئی اچھی تنقیدیں لکھیں لیکن وہ "زندگی" اور "فن" کے لطیف امتیاز کو نظر انداز کر گئے۔ عبدالحق ملک میں ایک اچھے ناقد کی تمام خوبیاں ہیں لیکن وہ ابھی تک اس میدان میں اپنی تمام توجہ کے ساتھ نہیں آئے۔ آل احمد سرور صاحب نے بھی کچھ کام کی باتیں لکھی ہیں۔ لیکن انھوں نے ادب اور قاری دونوں کی رہنمائی کا فرض اپنے ذمہ نہیں لیا۔ تنقید کا یہ وصف ہونا چاہیئے کہ وہ ادیبوں کی رہنمائی بھی کر سکے۔ اور اس کے لئے "رومانوی" کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے تجزیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس تاریخی فرض کو احتشام صاحب اور ڈاکٹر علیم کے علاوہ ممتاز حسین نے سرانجام دیا ہے۔

اگر مردم شماری کی جائے تو تنقید نگاروں کی کافی تعداد مل جائے گی۔ لیکن باشعور اور ذمہ دار ناقدوں کی صف میں پچھلے چند سالوں میں صرف دو ناموں کا اضافہ ہوا ہے ـــــ اور وہ دو نام ہیں۔ ممتاز حسین اور محمد حسن۔ اس وقت ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "نقدِ حیات" میرے سامنے ہے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ممتاز حسین ادب اور تاریخ پر کامل دسترس رکھتے ہیں۔ اور جو بات کہتے ہیں شعور کی میزان پر تول کر کہتے ہیں۔ وہ ادب کو جامد اور میکانکی نہیں سمجھتے بلکہ اس بات کی کھوج لگاتے ہیں کہ وہ کونسی قوتیں ہیں جو ہر دور کے ادب کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتی ہیں۔ یہاں پر ممتاز حسین کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ یہ کبھی فراموش نہیں کرتے کہ خارجی حالات اور شعور اگرچہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن دونوں ایک۔ دوسرے سے الگ الگ بھی ہیں۔ یعنی دونوں بالکل ایک ہی نہیں۔ شعور کی پرورش میں سماجی حالات کے علاوہ روایات اور فکری تحریکوں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔ فکری تحریکیں اگرچہ سماجی حالات ہی کی پیداکردہ ہوتی ہیں۔ اور سماجی حالات سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے باوجود مروجہ کلچر کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ اور فکری تحریکوں پر اس مزاج کا بھی اثر ہوتا ہے۔

"نقدِ حیات" کے مطالعہ کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ ممتاز حسین جب کسی دور کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر نہ صرف اس دور کی فکری اور سماجی تحریکیں ہی ہوتی ہیں بلکہ وہ ان کے آپس کے رشتوں کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔ مروجہ تہذیبی اور سماجی زندگی کے علاوہ گذشتہ تہذیبی اور سماجی زندگی بھی ان کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ اور وہ ادبی تخلیقات کو طبقاتی زندگی کے اس پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ مارکسی تنقید کا یہ بنیادی اصول ہے لیکن جہاں تک اسے برتنے کا تعلق ہے۔ سوائے احتشام صاحب کے دوسرے ناقدین نے اسے محض رسم سمجھا ہے۔ اور اس پر زور نہیں دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات ادب اور تاریخ کے علاوہ بھی دوسرے سماجی علوم کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ چاہتی ہے۔ یہ بات کاوش اور جگر سوزی کے علاوہ پہلی بار کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت بھی چاہتی ہے۔ اور یہ جرأت ہمارے یہاں صرف دو چند تنقید نگاروں میں ہے۔ اس سلسلے ممتاز حسین ایک منفرد درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے نہ صرف زندگی کا مطالعہ کیا ہے، بلکہ اسے سمجھا بھی ہے۔ اور اپنی رائے دینے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔

"کلچر اور فرقہ پرستی"۔ "تنقید کا مارکسی نظریہ"۔ انفعالی رومانیت" اور "بدلتی ہوئی نفسیات" خیال انگیز مضامین ہیں۔ جن میں اکثر ایسی باتیں ہیں جو اردو میں پہلی بار معرضِ بحث میں لائی گئی ہیں۔

"ستاروں سے ذرّوں تک" ——— جگن ناتھ آزاد کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ

ضخامت :- ۱۶ × ۳۰ × ۲۰ کے ۱۹۲ صفحات ——— قیمت دو روپے بارہ آنے

ناشر: ——— مکتبہ شاہراہ - اردو بازار - دہلی۔

"بیکراں" کے بعد یہ جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعہ ہے، جو بقول مصنف ۱۹۴۹ء کے آخری چند ماہ اور ۱۹۵۰ء کے شروع کے چند ماہ کے کلام پر مشتمل ہے۔

"بیکراں" میں کئی جگہ پر ایک باشعور شاعر چونکتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اور زیرِ نظر کتاب میں وہ اچھی طرح بیدار ہو چکا ہے۔

"میرا موضوعِ سخن" اس مجموعہ کی پہلی اور سب سے طویل نظم ہے۔ "بیکراں" کی ایک نظم "آزادی کے بعد" (چند اشعار چھوڑ کر) اس میں ایک بند کے طور پر شامل ہے۔ یہ آزاد کے ذہنی ارتقار کی طرف ایک اشارہ ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات نے آزاد کے ذہن کو پہلی مرتبہ جھنجھوڑا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے تغزل کے علاوہ اپنے فن میں پہلی بار ماحول اور خارجی زندگی کو جگہ دی۔

"بیکراں" اس کا آئینہ ہے۔ لیکن پچھلے دو سال ۱۹۴۷ء سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ چین کی آزادی۔ جنگ بازوں کی سازشیں، امن کی بین الاقوامی تحریک برما، ملایا، ویت نام کے عوام کی روز افزوں ترقی کرتی ہوئی آزادی کی جد وجہد، ہندوستان کے شہروں اور جیلوں میں پولیس کی دھڑا دھڑ فائرنگ اور شہری آزادیوں پر حکومت کا سنگین احتساب ——— انھوں نے آزاد کے نیم بیدار ذہن کو پوری طرح بیدار کر دیا۔

"بیکراں" میں آزاد نے صرف اپنے مشاہدات ہی پیش کئے تھے۔ اس وقت وہ سماجی حقیقتوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی لگن اکثر ان کے جذبات کی شدت سے دب جاتی تھی۔ لیکن ان کا تجسس جاری رہا، اور آخر وہ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کا تجزیہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ——

"بیکراں" اور "ستاروں سے ذروں تک" کا مصنف ایک ہی ہے۔ "بیکراں" میں اس نے صرف مشاہدوں پر اکتفا کی ہے۔ پرانی دنیا اور پرانی اقدار کو مرتے ہوئے اور نئی دنیا اور نئی اقدار کو جنم لیتے ہوئے دیکھا۔ "ستاروں سے ذروں تک" میں اس نے پرانی دنیا اور پرانی اقدار کے مٹنے اور ان کے بطن سے نئی دنیا اور نئی اقدار کے جنم لینے کی وجوہ کا ادراک حاصل کرنے کے بعد آج کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔

جب آزاد نے سماج کی تشکیل میں "محنت" کا بنیادی رول (Role) معلوم کر لیا تو ایک ذہین اور ایماندار انسان کی طرح انھوں نے اپنی ذات کو جمہور سے وابستہ کر دیا۔ اب وہ ظالموں اور مظلوموں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ اب وہ جانبدار ہیں۔

انھوں نے دیکھا کہ وطن "آزاد" ہو گیا۔ اور انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ حالات نہیں سُدھرے:

اب بھی سرمایہ کے ہاتھوں، وہی پہلے کی طرح
تیغ ہے گردنِ محنت پہ رواں یہ بھی تو دیکھ! — صفحہ ۲۴

سیم و زر میں اُدھر انسان کو تلتا دیکھے،
اِدھر انسان عبدکاری نظر آئے تجھ کو! — صفحہ ۲۵

کیا تماشا ہے کہ آوارہ پھریں محنت کش
اور مسند پہ نظر آئیں تن آسانِ وطن! — صفحہ ۲۸

رنگِ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں۔
ایک کا سود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے! — صفحہ ۳۲

تو جو کہتا ہے کہ یہ دَور ہے انصاف کا دَور
اتنی نایاب پھر انصاف کی دولت کیوں ہے؟ — صفحہ ۳۴

کس لغت میں ہے یہ مفہوم مساوات، کہ ہوں
میرے دامن میں خذف، اور کے دامن میں گہر! صفحہ ۳۶

وہ اپنی جانب داری کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب ان کا فکرِ جمیل سیاروں، سمن زاروں اور آسمان کے نظاروں سے رشتہ توڑ چکا ہے، کیونکہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اور سماجی ناانصافیوں کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہنا جرم ہے

فن کی تخلیق میں مصروف رہوں فن کے لئے
اب کسی طور میں اس بات پر تیار نہیں
میں کہ فن کار ہوں، تبلیغ بھی ہے کام مرا صفحہ ۴۰

حالات کا دوسرا رُخ ان کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور وہ اس مستقبل کی بشارت دیتے ہیں جس کے لئے عوام جد وجہد کر رہے ہیں! اب آزاد قنوطی نہیں ہیں۔ بلکہ ایک بہتر مستقبل میں یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ آنے والا خوشحالیوں کا زمانہ واہمہ نہیں ہے۔

اس تجلی کو نہ کم جان، نظر[1] کھول کے دیکھ
ابدی نور ہے، انگریز کا فانوس نہیں! صفحہ ۴۱
لبِ مہجور پہ اس وقت جو ہے رقص کناں
حُریت کا وہ ترانہ تو نہیں رُک سکتا! صفحہ ۴۲

"جب حجابات اٹھے" بھی ایک کامیاب نظم ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ایسی تاریخ تھی جس سے ہندوستان کے عوام نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

اپنی محفل سے جب اغیار نے مجھ کو نکالا
ہم نے یہ سمجھا کہ اغیار کا اب دور گیا۔
کوئی سرمایہ و محنت میں تفاوت نہ رہا! صفحہ ۸۱

لیکن یہ اُمیدیں پوری نہ ہوئیں بلکہ حالات اور بدتر ہو گئے۔

انجمن میں وہی فرسودہ نظارے دیکھے صفحہ ۸۲
جوک کے ہاتھ میں جنتا کو سسکتے دیکھا "
اور پہلے سے بھی محنت کا تھا انجام زبوں صفحہ ۸۴
نظر آتی تھی ہر اک سمت فقط لوٹ ہی لوٹ "
دَور آیا تھا مساوات کا، آزادی کا!
مگر اس دور میں گفتار پہ پابندی تھی صفحہ ۸۵

اس میں شک نہیں کہ آزاد اپنے فن کو عوام کے بہت نزدیک لے آئے ہیں اور دونوں کی یہ قربت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔ آزاد کو غزل کے خادم پر جو قدرت حاصل ہے اس سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ "میرا موضوعِ سخن" بھی کئی مسلسل غزلوں کی زنجیر ہے۔ چند نظموں کے علاوہ آزاد کے جوہر غزلوں ہی میں کھلے ہیں۔ غزل کو انھوں نے رسمی تغزل کے لئے نہیں۔ بلکہ اپنے پیغام کے لئے استعمال کیا ہے۔

نظر کی حد تک لگا دیا ہے سیاہ راتوں نے شامیانہ
اسی اندھیرے میں دیکھتا ہوں اُبھر رہا ہے نیا زمانہ صفحہ ۴۷

---

[1] معلوم نہیں "ذرا غور سے دیکھ" کے بجائے "نظر کھول کے دیکھ" کیوں استعمال کیا ہے۔ "آنکھ کھول کے دیکھ" کے بجائے "نظر کھول کے دیکھ" نہ محاورہ میں ہے اور نہ اچھا لگتا ہے۔ آزاد نے زبان کا بہت خیال رکھا ہے اس وجہ سے یہ اور بھی کھٹکتا ہے۔ (کمال)

سُنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ ہم تو جادۂ منزل کو بھی منزل سمجھتے ہیں ! صفحہ ۵۵

چمن میں یہ زباں بندی کے احکام
کہاں جائیں، کسے آواز دیں ہم؟ صفحہ ۹۱

"کہاں جائیں، کسے آواز دیں ہم؟" اسی طرح کی کچھ اور چیزیں بھی اس مجموعہ میں مل جاتی ہیں۔ جنھیں پڑھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ "ستاروں سے ذرّوں تک" پیش کرنے میں آزاد نے ذرا جلدی کی۔ انھیں کچھ اور نظموں اور غزلوں تک انتظار کرنا چاہیئے تھا، یا پھر انتخاب میں کچھ اور سختی برتتے۔

اس کے باوجود "ستاروں سے ذرّوں تک" اپنے فنی اور معنوی محاسن کے اعتبار سے اچھی کتاب ہے۔ جہاں یہ آج کے آزاد کے مقام کا تعین کرتی ہے، وہاں کل کے آزاد کے بارے میں بھی واضح اشارے دیتی ہے۔ اپنے برجستہ، بے ساختہ، واضح کلاسیکی اور متنوع اندازِ بیان، عوام سے خلوص اور درخشاں مستقبل کے حصول کے عزم کے لئے یہ کتاب قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

میراث ——— پرکاش پنڈت کے افسانوں کا مجموعہ

ضخامت :- ۱۶ × ۲۰×۳۰ کے ۲۲۲ صفحات ——— قیمت تین روپے

ناشر :——— مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی

کتاب کے شروع میں ممتاز حسین کا پیش لفظ ہے۔ جو واقعی کتاب پڑھ کر لکھا گیا ہے۔ (بیشتر پیش لفظ بغیر کتاب پڑھے ہی لکھے جاتے ہیں ——— ممتاز حسین) اور جس میں پرکاش پنڈت کے فن کا بہت دیانتداری سے جائزہ لیا گیا ہے ———

"میراث" کو پڑھ کر سب سے پہلے جو خیال ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ پرکاش پنڈت کے افسانوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ انتخاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری اس کتاب کو پڑھ کر Bore نہیں ہوتا۔ آج افسانہ نگاری اردو ادب کی ایک بہت ترقی یافتہ صنف ہے اس کے باوجود آج بھی کسی افسانہ کو پڑھ کر Bore نہ ہونا اس کے لئے ایک Compliment سے کم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گنتی کے افسانہ نگاروں کے علاوہ باقی نے افسانہ کی اولین ضرورت یعنی دلچسپی کے عنصر کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں۔ میں سنجیدہ ادب کی بات کر رہا ہوں، فحاشی کے علمبرداروں کی طرف روئے سخن نہیں ہے۔ پرکاش پنڈت کے افسانے اس منفی تعریف سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ان کے افسانے پڑھ کر نہ صرف قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ بلکہ ان میں دلچسپی بھی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس وصف سے حظ اٹھانے کے لئے افسانہ نگار کو توجہ طلب کرتا ہے جس کی رسکن نے عام قاری کو نصیحت کی ہے اگر "میراث" کے افسانے روادی میں، نیند کے انتظار میں یا محض سفر کاٹنے کے لئے پڑھے جائیں تو میرے خیال میں ہرگز لطف نہ دیں گے۔ میں تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس مخصوص اندازِ نگارش میں مشکل پسندی کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا کہ طنز نگاری اور اختصار کو۔ پرکاش پنڈت نہ صرف مناسب الفاظ میں اپنی بات کہتے ہیں بلکہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کہتے ہیں۔ یہاں پر ان کی فنکاری اس نکتہ میں مضمر ہے کہ ان کے بیان میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس وہ اختصار سے شدید تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ جو اختصار و بیان میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ وہی افسانہ اور کردار کی تراش خراش میں بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مرکزی خیال سے نہ خود بھٹکتے ہیں اور نہ اس کے روادار ہیں کہ ان کا قاری بھٹکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ "میراث" کے افسانے "ریمبلنگ" خاکوں کے بجائے افسانے ہیں۔ اور اس کا مصنف اس بدعت سے محفوظ رہا جو آج بھی بغیر پلاٹ کے افسانوں اور افسانوں کے آزاد تسلسل کے نام پر رائج ہے۔ مختصر افسانہ نگاری بظاہر جتنی آسان ہے، تکنیک کے اعتبار سے اتنی ہی مشکل صنف ہے۔ ادبی اہمیت کے لحاظ سے میں افسانہ کو خاکہ پر ترجیح دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے نثر اور نظم میں، میں کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دیتا۔ لیکن اس کے باوجود جب کوئی خاکہ کو افسانہ گردانتا ہے تو مجھے الجھن ہوتی ہے۔ افسانے اور خاکے کے درمیان بہت واضح حدِ فاصل نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے گھل مل بھی سکتے ہیں۔ پھر بھی افسانہ میں کردار، پلاٹ اور عرصہ کا امتیاز ہیئت کے اعتبار سے اس کی شناخت مقرر کرتے ہیں۔ "میراث" کے افسانے تکنیک پر پرکاش پنڈت کے عبور کا آئینہ ہیں۔ وہ افسانہ میں پلاٹ اور کلائمکس اور فن میں توازن کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے پلاٹ مربوط ہوتے ہیں

اور ان کے کردار بے لگام نہیں ہوتے اسی لئے ان کے یہاں غیر ضروری جزئیات نگاری نہیں ملتی۔

جن کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی اور انھیں افسانہ لکھنا بھی ضرور ہی ہوتا ہے تو لازمی طور پر ان کو ٹیٹ پیندی یا غیر ضروری جزئیات نگاری کی آڑ لینا پڑتی ہے۔ جو کردار وہ تخلیق کرتے ہیں ان کا کوئی فرض منصبی نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا بے مقصد وجود انھیں سرکش بنا دیتا ہے اور ان پر افسانہ نگار کا قابو نہیں رہتا لیکن "پرکاش پنڈت" کے پاس کہنے کے لئے خاص باتیں ہیں۔ باتیں تو خاص نہیں ہیں، لیکن عام آدمی کے لئے وہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق روزمرہ کے مسائل حیات سے ہوتا ہے، جن پر سماج کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

سماج کی بنیاد فرد پر نہیں، افراد پر ہے۔ اور فرد کی اہمیت افراد کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سماج کی بنیاد داخلی زندگی کے بجائے خارجی زندگی پر ہے۔ داخلی زندگی کا تعین خارجی زندگی اور ماحول کرتا ہے نہ کہ خارجی زندگی اور ماحول داخلی زندگی کا عکس ہیں۔ مادی حقیقتیں ہی اصل حقیقتیں ہیں اور ان پر سماجی زندگی کی نشو و نما کا انحصار ہے ——— یہ وہ بنیادی فلسفہ ہے جس پر عبور حاصل کئے بغیر نہ انفرادی زندگی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اجتماعی زندگی کا۔ خاص طور سے ایک فن کار کے لئے اس فلسفہ پر عبور رکھنا نہایت ضروری ہے، ورنہ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ فن کار ہرگز نہیں کیونکہ حقیقت نگاری فن کی پہلی شرط ہے۔

پرکاش پنڈت اس فلسفہ پر عبور رکھتے ہیں اس لئے صاحب شعور بھی ہیں اور صاحب نظر بھی، اور اسی لئے حقیقت نگاری کی دشوار گذار منزل میں ان کا فن کامیاب ہے۔ "میراث" میں زندگی کے جو مطالعے انھوں نے پیش کئے ہیں، ممکن ہے وہ خود ان کے ذہن کی پیداوار ہوں، لیکن وہ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی سے اس درجہ مطابقت اور مماثلت رکھتے ہیں کہ ان کے افسانے پڑھتے وقت ہمیں ذرا بھی یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ ذہن کی اختراع ہیں۔ ان کے پیش کئے ہوئے مطالعے ہماری روزمرہ کی زندگی کے مشاہدوں میں سے ہوتے ہیں۔ جن سے کم و بیش ہم سب کبھی نہ کبھی دوچار ہوتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ عام انسان کا ذہن انھیں فراموش کر دیتا ہے اور ایک فن کار کا حساس اور تربیت یافتہ ذہن انھیں چن لیتا ہے اور مناسب کرداروں سے کام لیکر انھیں فن پارے کا لباس پہناتے ہیں جھنجھوڑتا ہے ہم جب ان واقعات سے یا ایسے ہی واقعات سے اپنی عملی زندگی میں دوچار ہوتے ہیں تو اکثر جزوی باتیں بنیادی باتوں کا پردہ بن جاتی ہیں۔ کیونکہ اس وقت ہم سب جذباتی ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک باشعور فن کار انہیں باتوں کو پیش کرتا ہے تو جزوی باتوں کے بجائے بنیادی باتیں ہی ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ واقعات کے اس انتخاب اور حسن ترتیب ہی کا نام کمال فن کاری ہے۔ "میراث" کے سلسلے میں مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ واقعات کا انتخاب اور حسن ترتیب اس کے افسانوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ان افسانوں میں ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ پرکاش پنڈت کے فن کے مستقبل کا تعین کرے گی۔ یہ ہے ان کا طنز۔ یہ طنز کنھیا لال کپور، کرشن چندر، بلونت سنگھ، عصمت یا دوسرے افسانہ نگاروں کے طنز سے مختلف ہے۔ تیکھا، بے باک، نشتر، دل میں اتر جانے والا، یا اس قسم کے دوسرے الفاظ اور فقرے اس کی تشریح نہیں کر سکتے۔ یہ مسلسل طنز ہے، جو واقعات، حالات، کردار اور انداز بیان کی مستقل ہم آہنگی چاہتا ہے۔ یہ طنز زندگی کے مطالعہ کا ایک خاص رویہ ہے۔ اس کے لکھنے کے لئے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے باشعور اور باذوق ہونا پہلی شرط ہے۔ اگر مجھے اصلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اسے "فطری طنز" کہوں گا۔ اس قسم کے طنز کی جھلکیاں تو "میراث" کے کم و بیش تمام افسانوں میں ملتی ہیں۔ لیکن "صبح کرنا شام کا" اور "میراث" (افسانہ) اس کی کامیاب مثالیں ہیں۔

مجھے "میراث" سے مستقبل کا ایک صاحب طرز طنز نگار اُبھرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے ——— اور شاید یہ میرا واہمہ نہیں ہے۔

PEACE CONFERENCE

اور اسی کے ساتھ

اُردو ادب میں بھی ایک اور تاریخی دستاویز کا اضافہ ہوا

۱۹۵۰ء

کا

بہترین ادب

مُرتبہ

سردار جعفری پرکاش پنڈت

قیمت 5/8

مکتبہ شاہراہ - دہلی

ایک تہذیبی امانت ——

جسے ماضی کے عوام نے اپنی جمہوری روایات سے بھر پور کیا

جسے حال کی عوامی جد وجہد نے توانائی اور چمک بخشی — اور

جسے پرکاش پنڈت آنے والے دور کو سونپتا ہے۔

میرا

پرکاش پنڈت کے ان افسانوں کا مجموعہ جن میں

زندگی کی خلافت، جیتی اور قسمت پر فتح پاتی ہوئی

فن کی — اپنی غیر معمولی سچائی اور عظمت کے ساتھ

ہماری سڑکوں، کھیتوں، بازاروں اور محلوں کی

کہانیاں جن پر پرکاش پنڈت کا قلم رقمت کی نشست

کرتا ہے۔

قیمت تین روپے

مکتبہ شاہراہ دہلی

انہیں دلفریب راستے کھانے کو

دلکش جھونپڑیاں رہنے کو

دلنواز پیشوف پہننے کو ملتے ہیں

اور فکر تونسوی نے ان آزاد غلاموں کی داستانیں لکھیں

ساتواں شاستر

فکر تونسوی کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ

دو ہزار سال جو سکاہت، تبسم اور قہقہے کے روپ

میں نکلا ہے۔ قیمت 2/12

مکتبہ شاہراہ - دہلی

مکتبہ شاہراہ - دہلی

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

اپریل، مئی
۱۹۵۱
قیمت ایک روپیہ

نو روپے
ششماہی پانچ روپے
فی پرچہ بارہ آنے

مکتبۂ شاہراہ ○ دہلی

نگار

راہ نما — پرکاش پنڈت، ۳

مقالے

سرمایہ داری اور کلچر — ال احمد سرور، ۵
جلال و جمال — جاں نثار اختر، ۱۸

نظمیں

رباعیاں — سردار جعفری، ۲۹
جھومر — ظہیر کاشمیری، ۳۴
شکستِ زنداں — احمد ریاض، ۳۵
دو آوازیں — احمد ظفر، ۳۶
انتظار اور ابھی — معصوم رضا راہی، ۳۷

غزلیں

مجروح سلطانپوری، ۳۹
وامق جونپوری، ۴۰
مجید شاہد، ۴۰

افسانے خاکے

بارود اور چیری کے پھول — کرشن چندر، ۴۱
دیوار کے پاس — خواجہ احمد عباس، ۵۲
ریس کورس — مہندر ناتھ، ۵۵
آنسو اور چھری — پریم ناتھ پردیسی، ۶۱
بنجارا — میکسم گورکی، ۶۴

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک بنگالی نظم، ۷۳

جائزے

گجر (قتیل شفائی) — کمال احمد صدیقی، ۷۴
ہفت رنگ (عرش ملسیانی) — "
ماؤں تنگ (فکر تونسوی) — "

سالنامہ ملاپ ،،

راجندر سنگھ بیدی، ال احمد سرور
اپندر ناتھ اشک، معین احسن جذبی
ہنس راج رہبر، محمد حسن
مخمور جالندھری، امرت رائے، حمید، سلطان
سیدہ فرحت، بلراج کومل، خلیل احمد، اور منظور احمد

○ پبلشر، منشی عبدالقدیر، مکتبہ شاہراہ، دہلی
○ پرنٹر، کھنہ لیتھو پریس، دہلی

راہنما

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور کے مثبت عناصر جب اپنا تاریخی رول ختم کر چکتے ہیں اور زندگی کی بہتر قدروں کے اُبھر آنے سے ان کی موت یقینی ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تحفظ کے لئے تاریخی ارتقاء کے راستے کا روڑا بن جاتے ہیں۔ اپنے خود ساختہ تہذیب و تمدن، قومی اور نسلی امتیاز اور مذہب کے من گھڑت اصولوں کی آڑ لیکر عوام کو گمراہ اور بہتر زندگی کے لئے جدوجہد کرتی ہوئی عوامی تحریکوں کو کچلنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں اور چونکہ وہ طبقہ اس وقت کا حاکم طبقہ ہوتا ہے اور اس کے پاس ہر طرح کے وسائل ہوتے ہیں اور قانون کی لاٹھی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس لئے اس گمراہ کن پروپیگنڈے اور اپنی جابرانہ حکمتِ عملی سے کچھ عرصہ کے لئے وہ اپنے آپ کو سنبھالا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس منفی اقدام میں حاکم طبقہ کے ساتھ ساتھ اس وقت کے نظام کی بدولت منافع کمانے والے بر سرِ اقتدار لوگ بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں اور اس طرح پرانے اور نئے میں، ظالم اور مظلوم میں ٹوٹنے والے اور لٹنے والے میں، انسانیت دشمن اور انسانیت دوست میں حدِ فاصل قائم ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں۔

آج کے اس دور میں دونوں طبقوں کا یہ تضاد واضح ترین صورت میں ہمارے روبرو ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سرمایہ دار ممالک اور ان کے بغل بچے تہذیب، تمدن اور مذہب کے نام پر عوامی جمہوری انقلاب کی طرف رواں دواں ارتقائی دھارے کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ تہذیب و تمدن اور مذہب کے یہ ٹھیکیدار ساری انسانیت پر تیسری بھیانک جنگ مسلط کرنے اور اس طرح اپنے آپ کو وقتی سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اور اپنی ان مکروہ سازشوں کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے نام نہاد "دانشوروں" کی مدد سے عوام کے دل و دماغ میں انسانیت دشمنی کا زہر سرایت کر رہے ہیں۔

حال ہی میں اس قسم کی ایک سازش کی داغ بیل ہندوستان میں بھی ڈالی گئی ہے۔ چند امریکی سرمایہ داروں نے چند ہندوستانی سرمایہ داروں کو جنھیں خود کو ملک اور کلا کار کہنے کا بھی فخر حاصل ہے "انڈین کانگرس آف کلچرل فریڈم" منعقد کرنے اور اس "کلچرل فراڈ" سے مشترکہ "توسید حاصل کرنے کا گر بتایا۔

اس کانگرس پر ہزاروں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا جس کے بارے میں بعض زندہ دار حلقوں کا بیان ہے کہ وہ ایک چھ ہندسوں والے امریکی چیک کی صورت میں عنایت ہوا تھا اور اس میں ایسے اشخاص اور انجمنوں کے نمائندوں نے شرکت کی جو کھلے طور پر کمیونزم کے مخالف ہیں اور تیسری جنگ کے حق میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیانات دے چکے ہیں۔ اس کانگرس کے سکریٹری نے ایک پریس کانفرنس میں صاف طور سے اعلان کیا کہ اس کانگرس کا مقصد ملک کو کمیونزم کے خطرے سے بچانا ہے (اور اینگلو امریکن بلاک کا ساتھ دینا ہے جسے ساری دنیا کو کمیونزم کے خطرے سے بچانے کی آٹھوں پہر فکر رہتی ہے) اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر اس ملک کی حکومت پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا تو ہماری آزادی فنا ہو جائے گی"۔

بھاڑے کے یہ ٹٹو کس آزادی کے فنا ہو جانے سے خوفزدہ ہیں، انھیں کیسے تہذیب و تمدن کا تحفظ منظور ہے۔ اس کا جواب خود انھیں کے بیانات، کانفرنس میں منظور کی گئی قراردادوں اور منشوروں سے مل سکتا ہے جس میں سویت روس اور کمیونزم پر کیچڑ اچھالنے، ترقی پسند ادب اور ادیبوں اور دانشوروں کو گالیاں دینے اور جنگی مقاصد کے لئے فضا کو سازگار بنانے کے علاوہ پنڈت نہرو کی خارجہ پالیسی اور امن کی کوششوں کی پُرزور مذمت کی گئی ہے۔ بند کمروں میں کی گئی اس کانگرس کے کرتا دھرتا مسٹر منو مسانی تھے اور اس کا افتتاح ہمارے وزیر خذا، جنھیں عام طور سے وزیر قحط کہا جاتا ہے مسٹر منشی نے کیا اور اس کی صدارت کے فرائض مسٹر جے پرکاش نرائن نے انجام دیئے اور اس میں امریکہ اور یورپ کے ان "دانشوروں" کو خاص طور سے مدعو کیا گیا جو سرمایہ داروں کے زرخرید غلام ہیں اور جن کے لئے تہذیب و تمدن کا دوسرا نام اپنے آقاؤں کے مفاد کو قائم رکھنا ہے۔

سارے ایشیا میں صرف ہندوستان ہی کو یکلخت اس تہذیب و تمدن کے لالے کیوں پڑ گئے ہیں اور اس کے غم میں مسٹر مسانی اور مسٹر منشی اور مسٹر تھامسن اور

مسٹر آڈن اور مسٹر سپنڈر اور مسٹر ملر ہی کیوں ٹسوے بہا رہے ہیں، اس طویل بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ امریکی سرمایہ دار اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ چیانگ کائی شیک کی "موت" کے بعد ایشیا بھر میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جسے کیمونزم کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے اور ہندوستان کو اس خدمانہ فعل کے لئے آمادہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کے عوام کو تہذیب و تمدن اور قومی اور نسلی برتری کا پُرفریب سبق سکھایا جائے کہ ہمیشہ یہی ہتھیار کارگر ہوا ہے۔

ماہنامہ مخزن لاہور

ہندوستان سے نظر اٹھا کر اگر ہم اپنے پڑوسی ملک پاکستان کی طرف دیکھیں تو ہمیں وہاں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت نظر آئیگی۔ اگرچہ ابھی وہاں "پاکستان کانگرس آف کلچرل فریڈم" کا انعقاد نہیں ہوا اور تھامسن اور آڈن اور سپنڈر اور ملر وہاں تہذیب و تمدن کا درس دینے تشریف نہیں لے گئے لیکن اس غیر معمولی کمی کو وہاں کی رجعت پرست طاقتیں بدرجۂ اتم پورا کر رہی ہیں۔ نوابوں اور جاگیرداروں کی حکومت اور سارا سرمایہ دار پریس عوام کو زندگی کی ترقی پسند قوتوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے مذہب اور خدا کے بھٹیارے اُدھیڑ رہا ہے اور فلسفۂ صبر و قناعت کا جال پھیلا رہا ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال ماہنامہ مخزن لاہور کے اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارے میں ملتی ہے جس کے مدیر محترم نے "برعظیم پر قتنہ پسند ادب کی یورش" کے زیر عنوان ۳۰۲ سے ۳۰۸ کے پانچ صفحات سیاہ کئے ہیں جو صوف نے ہندوستان کے ایک ترقی پسند رسالے (شاہراہ) میں سے چند اقتباسات درج فرما کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ "آزادی کے بعد ترقی پسندوں نے حب وطن کے ترانے نہیں گائے" اور "یہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ کو اور بھڑکاتے ہیں، مریض کو تسلی نہیں دیتے بلکہ اُسے بتاتے ہیں کہ تو سخت تکلیف میں مبتلا ہے" اور یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ "مغربی اقتدار نے ڈیڑھ سو سال تک ہمارے جسم کا خون چوسا ہے وہ کسی طرح دو تین سال میں بحال نہیں کیا جا سکتا" اور عوام کی جہالت کا ذکر فرماتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ "عوام کیا جانیں کہ جس دولت کی تقسیم کا یہ لوگ تقاضا کرتے ہیں وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی ..... اصلاح حال کے لئے ابھی برسوں کی محنت و مشقت اور قربانی کی ضرورت ہے" اور آخر میں اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہ "یہ لوگ ہیروشیما کے بے گناہ جاپانی مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں پر ایٹم بم نے جو ظلم کیا ہے اس سے بھی اپنے مقاصد کو حل کرنے کا کام لیتے ہیں ۔۔۔ پرچم امن عالم اڑاتے چلو ۔۔۔ ہیروشیما میں لال کھلاتے چلو" اور اس بات کا افسوس کرتے ہوئے کہ "ان میں نہ معابد کا احترام ہے نہ مذہب کا نہ خدا کا" اور "یہ قائم شدہ حکومتوں کو برباد کرنے کے لئے موجودہ معاشرہ کی تمام بنیادوں کو ڈھا دینا چاہتے ہیں" موصوف ہندو اور پاکستان کی حکومتوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ باہم مخلصانہ تعلقات پیدا کر کے ان "غداران وطن کی درون خانہ ریشہ دوانیوں کو ناکام و نامراد" بنائیں۔

مخزن کے محترم اور بزرگ حامد علی خاں نے پیشہ ورانہ تعصب سے کام لیتے ہوئے سپرد قلم فرما کر کوئی نیا اور غیر فطری کارنامہ انجام نہیں دیا ہے کیونکہ ان کی یہ گلفشانی ان کے طبقاتی مفاد کے سلسلہ کی ہی کڑی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ البتہ ہم ان سے اسٹیٹ اور حکومت کے بنیادی فرق کو سمجھنے کے لئے مزید مطالعہ کی سفارش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت جو وہ دونوں حکومتوں کو اپنے قیمتی مشوروں سے مالا مال کر رہے ہیں اس پر دونوں حکومتیں بہت پہلے سے عمل پیرا ہیں کبھی غیر ملکی حملے کا ہوا کھڑا کر کے اور کبھی نسلی اور قومی برتری کے زہریلے انجکشن دیکر فسادات کرا کے عوام کی توجہ بنیادی مسائل سے ہٹانے اور اس عرصہ میں ان کو کچلنے کے لئے زیادہ سے زیادہ گولی بارود بنانے میں مصروف رہیں۔

ہم ترقی پسند ادیب آزادی کے ترانے اس لئے نہیں گاتے کہ ہمیں آزادی نام کی چڑیا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم واقعی مریض کو فضل تسلیاں دینے کے قائل نہیں ہیں کیونکہ ہم اس کے مرض کی وجہ اور اس کا علاج بتانا مقدم سمجھتے ہیں۔

ہم اس حقیقت سے منحرف نہیں ہیں کہ مغربی اقتدار نے ڈیڑھ سو برس تک ہمارے جسم کا خون چوسا ہے۔ اور اسی لئے ہم میں مزید قربانی کے کمر سے پہننے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خون چوسنے کا وہ عمل بدستور جاری ہے بلکہ دوچند ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ جس دولت کی تقسیم کا ہم تقاضا کرتے ہیں وہ کس طرح پیدا کی جاتی ہے اور اس کے لئے ہم چین کی عوامی جمہوریہ کی مثال پیش کر سکتے ہیں جس نے آزادی کے ایک سال کے اندر اندر حقیقی دولت کے انبار لگا لئے ہیں۔

ہمیں "پرچم امن عالم" بلند کرنے کا بجا طور پر فخر حاصل ہے کیونکہ ہم کسی قیمت پر بھی اپنے بچوں کو جنگ بازوں کی ہوس پر قربان نہیں ہونے دینا چاہتے ہم اس حکومت اور اس طبقے کو انسانی مجرم قرار دیتے ہیں جو مٹھی بھر لوگوں کے منافع کی خاطر کروڑوں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا ہے۔ اور ہم جھوٹی تہذیب اور تمدن اور مذہب کے ان بہروپئے علمبرداروں پر لعنت بھیجتے ہیں جو چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر فروخت کر دیتے ہیں اور انسانیت دشمنوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بن جاتے ہیں۔

سرمایہ داری اور کلچر

ال احمد سرور

سرمایہ داری کے موجودہ دور میں تہذیب انسانی کو جو خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ اور جنگ، افلاس، بے روزگاری اور عالمگیر بے چینی کے حملے جس طرح بڑھتے جا رہے ہیں، وہ ارباب نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ امریکہ اور بعض نام نہاد جمہوری ملکوں میں عوام کو یہ کہکر دھوکا دیا جا رہا ہے کہ انسانی آزادی، تہذیب کے تحفظ اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی بجا آوری کی خاطر ہمیں روس اور اس کے حاشیہ نشینوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور یہ لڑائی گویا بعض امریکی اخبار، انسان کی آزادی اور اس کے تحفظ کی جنگ کہتے ہیں، ہندستان میں سماجی انصاف کی جدوجہد کو قوم پرستی کے منافی کہا جاتا ہے اور عوام دوستی کے علمبرداروں کو ہندستان کا دشمن ٹھہرایا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اخباروں، رسالوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں عوام کی بے روزگاری، جہالت اور غربت کو دور کرنے پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا ہندستان کے اعلیٰ پرچار پر قدیم ہندستان کی عظمت کے ترانے گا کر ہمارا حکمران طبقہ موجودہ محدود اور ناقص آزادی کی قیمتوں کو کم کرنا چاہتا ہے۔ ہندستان ایک زرخیز ملک ہے اور زراعتی اور صنعتی دونوں وسائل سے مالا مال ہے۔ اس کی آبادی کے لئے کافی غذا مہیا کرنا، اس کے لئے مشکل نہ ہونا چاہیئے۔ اس کی ضروریات سے زیادہ کپڑا یہاں بنتا ہے، مگر یہاں کے رہنے والوں کو نہیں ملتا۔ یہاں حالت اب بھی حیرت انگیز ہے اور جس رفتار سے تعلیم بڑھ رہی ہے اس کے مطابق مستقبل میں یہاں کے لوگوں کو مکمل طور پر خواندہ بنایا جا سکے گا۔ صنعتی تعلیم کی جو اسکیمیں ہیں وہ روپیہ کی کمی کی وجہ سے طاق نسیاں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی، ان کی عمر کی اوسط، ان کی کارکردگی، سب بہت کم ہیں اور جو طریقے انھیں پڑھانے کے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں، وہ اب بھی خاصے فرسودہ ہیں۔ پاکستان کی ضد اور عالمگیر جنگ کے خطرے کے نام سے اب بھی آمدنی کا بیشتر حصہ فوج پر صرف کیا جا رہا ہے۔ مذہبی اختلافات کم ہونے کی بجائے اور استوار ہوتے جا رہے ہیں۔ سائنس کے طریقۂ کار کو میکانکی طریقے سے برتا جا رہا ہے۔ سائنٹفک نظریہ اور عقلی استدلال بہت کم ملتا ہے۔ عوام کو روزی کی فکر سر اٹھانے کی فرصت نہیں دیتی کہ دنیا کے تہذیبی سرمائے سے لطف اندوز ہو سکیں۔ متوسط طبقہ دو چکیوں کے بیچ میں پستا جا رہا ہے اور حیران و پریشان سوچتا ہے کہ کدھر جائے۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ عیش امروز پر عمل کر رہے ہیں۔ کیونکہ انھیں یقین بھی حاصل ہے کہ کل نہ معلوم کیا ہو جائے۔ شاعر اور ادیب، انسان کو ان کے اچھے خواب اور قیمتی تجربے یاد دلانا چاہتے ہیں۔ موجودہ نظام کی چیرہ دستیاں انھیں دھنک کی طرف دیکھنے کے بجائے زرنگی کی بے رحم چمک کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ عالم اور دانشور کہتے ہیں کہ انسان کو موجودہ دور نے جانور بنا دیا ہے اگر وہ مہذب ہو جائے تو ایک دوسرے سے جنگ اور خونریزی اور ہوس چھوڑ دے۔ نفسیات کے ماہرین، انسان کے یہاں بہیمیت کی رگ دریافت کرنے میں مصروف ہیں تاکہ اس آب حیات سے انسانوں کی مردہ روح کو زندہ کیا جا سکے۔ عوام تہمت کو، متوسط طبقہ حکومت کو اور حکومت روس کو الزام دیتی ہے کچھ لوگ دبی زبان سے امریکہ کا بھی نام لے دیتے ہیں۔ غرض ذہنی الجھن، جذباتی تعصب سماجی تناؤ کی کچھ ایسا دور دورہ ہے کہ موجودہ انتشار اور خلفشار کے حقیقی اسباب پر توجہ بہت کم ہے وہ اسباب یہ ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں سرمایہ داری ایک خاص عروج کے دور پر پہونچ چکی ہے جسے ہم اجارہ داروں کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں جب اسے عوامی طاقتوں سے خطرہ محسوس ہوتا ہے تو وہ واضح طور پر فاشزم کا روپ دھار لیتی ہے۔ ہندستان کو غیر ملکی سرمایہ داری نے سرمایہ داری کی منزل پر پہونچنے

گام زن نہ ہونے دیا۔ اس کی زراعت کو غیر جاگیردارانہ نظام کے ماتحت رکھا صنعت و حرفت کی ترقی اپنے مخصوص سامراجی مقاصد کے ماتحت کی۔ حیلوں اور سرکوں کے جال بچھائے اور ملک میں امن و امان قائم رکھا مگر اس کا مقصد ہندستان کی خام پیداوار کو اپنے کارخانوں کے لئے فراہم کرنا تھا اس نے اپنی ضرورت کو بھی طرح پورا کرنے کے لئے ایک دفتری نظام اور ایک تاجر طبقہ پیدا کیا جس نے بڑھ کر سفید سرمایہ داری کے بجائے سیاہ سرمایہ داری کی حکومت قائم کرنی چاہی۔ ہندستان اتنا بڑا ملک ہے، اور اس کی تاریخ ایسی رہی کہ اس میں کئی قومیں اپنی اپنی زبانوں اور تہذیبوں کے ساتھ بستی ہیں۔ ان میں ایک عام وحدت بھی ہے اور بعض مخصوص روایات اور خصوصیات بھی۔ انگریز نے ان کی معاشرت میں بہت کم دخل دیا۔ ایک ادبی ہواری کو کافی سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب عالمگیر حالات کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی توجہ ہندستان سے ہٹانی پڑی تو اس نے اپنے اقتصادی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے ان لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت سونپ دی جن کا مفاد ان کے مفاد سے زیادہ قریب تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندستان میں قومیت کی سحر کیا اور آزادی کا ولولہ نہ تھا، مگر موجودہ آزادی صرف اس تحریک اور ولولے کا نتیجہ نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم اور اس کے پیدا کردہ حالات کا عطیہ ہے۔ قصہ ہے کہ حکمران طبقہ اپنے مفاد کو قائم رکھنے کے لئے علاوہ فوج اور خفیہ کے چند تہذیبی حربوں سے بھی کام لیتا ہے۔ یہ تہذیبی حربے سرمایہ دارانہ نظام نے سکھائے ہیں۔ اس لئے سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیات پر پہلے غور کر لینا ضروری ہے۔

سرمایہ داری کے تین بنیادی ستون ہیں۔ ذاتی ملکیت، مزدوروں کی اجرت اور مقابلہ۔ جاگیردارانہ نظام کی سب سے بڑی خصوصیت غلامی ہے اسی طرح سرمایہ داری کی سب سے بڑی پہچان اجرت پر مزدوری ہے۔ جاگیرداری میں زمین اور زمیندار سے ایک انسانی رشتہ ہے۔ سرمایہ داری میں انسانی رشتوں کی جگہ روپیہ کا رشتہ لے لیتا ہے۔ روپیہ کے رشتے نے بہت سی آسانیاں بھی پیدا کی ہیں۔ صنعت، تجارت اور زراعت میں اس سے بڑے بڑے کام انجام دیئے گئے ہیں۔ سرمایہ کے چند ہاتھوں میں پہونچ جانے کی وجہ سے بڑے پیمانے پر صنعتیں ممکن ہو گئی ہیں۔ سائنٹفک آلات نے اور میکانکی طریقوں نے زراعت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ اجرت کی وجہ سے کام زیادہ ہوا ہے۔ پیداوار ایسی ضروریات کے علاوہ جیسی ضروریات کے لئے بھی فراہم کی گئی ہے۔ سرمایہ داروں نے نئی منڈیاں فراہم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ زمین کے سینے کو چیر کر زر و جواہر سے دامن بھر لئے ہیں۔ مادی ضروریات کو ہر طرح پورا کیا ہے۔ بھاپ کو لئے، پٹرول، اور بجلی کی طاقت سے کام لے کر مشینیں تیار کی ہیں اور مشینوں کے ذریعے سے کم سے کم قوموں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا ہے۔ صناعی نے اتنی ترقی کی ہے کہ اس کی انتہا نہیں۔ کاشت کے بہتر طریقوں کے استعمال۔ ٹریکٹر اور دوسرے آلات کی ایجاد سے پیداوار اتنی بڑھ گئی ہے کہ ساری دنیا کو کفایت کر سکتی ہے۔ زار کے زمانے میں روس میں اسی فیصدی آبادی اتنی غذا فراہم نہ کر سکتی تھی کہ اس کے لئے اور باقی بیس فیصدی کے لئے کافی ہو۔ ہندستان کی نوے فیصدی آبادی کسی نہ کسی طرح دیہات سے وابستہ ہے، اور زراعت اس کا ذریعہ معاش ہے۔ مگر ہندوستان کی ضرورت کے لئے غلہ باہر سے منگانا جاتا ہے۔ یہ جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ سماج کا تحفہ ہے۔ سرمایہ دار سماج اگر روپیہ پیدا کرنے اور اسے چند اشخاص کے ہاتھوں میں پہنچانے میں مصروف نہ ہو تو وہ پیداوار کے لحاظ سے ویسی کیا ویسی ضروریات کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ پھر ذریعہ آمد و رفت کی ترقی نے سارے ممالک کو قریب کر دیا ہے۔ ایک ملک کے باشندے دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ ملک کے ایک حصے میں کمی ہو تو دوسرے بھرپور علاقوں کی یہ کمی پوری کی جا سکتی ہے۔ جاگیرداری کے زمانے میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ غلامی میں مشین کی یہ ترقی ممکن نہ تھی۔ نہ اسے اس طرح کام میں لایا جا سکتا تھا۔ مشین سے یہ وفاداری نہ تھی۔ بعض دوسرے خاندانی یا سماجی رشتوں سے وفاداری تھی۔ قومی اور بین الاقوامی منڈیوں کے لئے مصنوعات مہیا کرنا اور ایسی منڈیوں میں مقابلہ کرنا بہت مشکل کام تھا۔ ذاتی سرمایہ، آزاد تجارت، اجرت، نفع کے لئے لگاتار مقابلہ جو سرمایہ داری کے بنیادی ارکان ہیں پیداوار کی اس وسعت اور قدرتی وسائل پر اس قدر حکومت اور اسی طرح انسانی تہذیب کی اس وسعت کا باعث ہوئے۔

سرمایہ داری نے فرد کو آزاد کیا۔ خاندان، مذہب، قبیلے کی پابندیاں کم کیں۔ قوت متخیلہ پیدا کیا۔ آزادی خیال اور آزادی عمل کا تخیل پیدا کیا۔ انفرادیت کو ترقی دی۔ جمہوری ادارے بنائے۔ مساوات کا سنہرا خواب دکھایا۔ ایک ملک کے ادبی سرمایے کو دوسرے ملک تک پہونچایا۔ ایک چراغ سے سیکڑوں چراغ جلائے۔ سائنس اور تجربے کے لیے فضا تیار کی۔ عقلیت کی کسوٹی بخشی۔ ذہن کو ضبط و نظم دیا۔ ایک جذباتی انسان دوستی کی بنیاد ڈالی، حقیقت پسندی کی راہ دکھائی، نفسیات کی گرہیں کھولیں، قوموں کی تاریخ مرتب کی۔ تعلیم کو عام لوگوں کا حق قرار دیا۔ بیماریوں پر قابو پانے کی کوشش کی، زلزلوں، قحط، وباؤں، طوفانوں کو اسیر کیا۔ موت کی شرح کو کم کرنے کی کوشش کی۔ تہذیبی قدروں کو چند اوپری طبقوں کی میراث رکھنے کے بجائے ذاتی محنت اور کوشش سے سیڑھی کے آخری زینے تک پہونچنے کے ذرایع فراہم کیے۔ خون کی بزرگی کو کم کیا اور خون جگر کی عظمت بڑھائی۔ صحت و دوا اور تفریح کے لاتعداد راستے کھولے۔ شہروں میں تفریح گاہیں قائم کیں۔ فلم، ریڈیو، ناول، اخبار اور رسالوں کے ذریعے تہذیبی قدروں کو عام کیا۔ فردوں کے لیے تعطیل، ان کے لئے تفریح گاہیں، پارک کھیل کے میدان، سمندر کے کنارے کیمپ، موٹروں اور سائیکلوں کی آسانیاں۔ یہ سب سرمایہ داری کی نعمتیں نہیں تو کیا ہیں۔

لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کیا جاسکے۔ چونکہ سرمایہ دار اجرت پر کام لیتا ہے اور اسے دوسرے سرمایہ داروں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ کم سے کم خرچہ ہو اور زیادہ سے زیادہ نتیجہ نکلے۔ شروع شروع میں وہ اچھی مزدوری دیتا ہے جس کی وجہ سے لوگ زراعت کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رفتہ رفتہ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے اور مزدوری کی شرح کم۔ پہلے جو مزدوری کبھی کبھی یا فرصت کا مشغلہ تھی، وہ اب زندگی کا پیشہ بن جاتی ہے کیونکہ اکا دکا مصنوعات یا گھریلو دست کاریاں مشین کی بنی ہوئی چیزوں سے سستی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ بڑی تعداد میں تیار ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ داری فتح انسان یا مزدور کی شکست ہے۔ دوسری طرف ایک قدرتی قانون کے مطابق چھوٹے سرمایہ داروں کو بڑے سرمایہ دار نگلنے لگتے ہیں۔ اس طرح اجارہ داری کا آغاز ہوتا ہے۔ ابتدائی دور میں سرمایہ دار کا تعلق اپنے کارخانے سے ایک براہ راست رشتے کی شکل میں ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ایسے سرمایہ دار وجود میں آتے ہیں جو محض بکنگ کے فروغ کی بنا پر کارخانوں سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں جو کارخانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کا کام صرف مختلف کارخانوں کے منافعوں کا حساب رکھنا۔ نفع کے لئے نئے راستے نکالنا اور دوسرے سرمایہ داروں پر فتح حاصل کرنا رہ جاتا ہے۔ سرمایہ دار پہلے پہل ایمانداری سے کام لیتا ہے مگر بڑے پیمانے پر ہر جائز و ناجائز ذریعہ استعمال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مشین انسان سے زیادہ قیمتی شے ہے کیوں کہ مشین مہنگی ہوتی ہے اور انسان سستے۔ جاگیرداری اور شہنشاہیت کے زمانے میں خاندان، شرافت، سرفرازی اور بلندی کو روپے سے نہیں میراث سے تعلق تھا۔ تہذیب کی قیادت یہی طبقہ کرتا تھا۔ مذہبی مفاد اسی سے وابستہ تھا، اس کے پاس اتنی فرصت اور فراغت تھی کہ فنون لطیفہ کی سرپرستی کر سکے۔ اسے فنی کمالات سے مستفید ہونے کا حق تھا۔ سرمایہ داری کے دور نے یہ قدریں بدل دیں۔ شرافت کے بجائے مال کی قدر ہونے لگی۔ جو چاندی تھی وہ رانی ہو گئی اور رانی کونے میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ روپے کے زور نے تہذیبی قدریں حاصل کی جانے لگیں۔ امریکہ نسبتاً ایک نیا ملک ہے۔ وہاں جاگیرداروں کی روایات کم ہیں اسی لئے سرمایہ داروں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا ہے اور سرمایہ داری کے انتہائی عروج، اس کی نعمتوں اور لعنتوں دونوں کی تصویر وہاں ملتی ہے۔ جب مزدور زمین سے اور پیداوار کے ذرایع کی ملکیت سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ اپنی صلاحیت اور کارکردگی کو فروخت کرے اور اسکے بدلے میں روپیہ کمائے تاکہ اس روپے سے ضروریات زندگی خرید سکے۔ اسٹین بنک نے [illegible] میں سرمایہ داری کی اس چکی کی قلعی کھولی ہے جو کسانوں کو زمین سے علیحدہ کر کے انھیں پیس ڈالتی ہے۔ کسی نے آپ

کہا ہے کہ جو محنت مزدوری کرتا ہے، وہ اپنی محنت کے لئے نہیں بلکہ اپنے نطع کے لئے۔ سرمایہ داری نے حصے داری کو جنم دیا۔ یہ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ کمانے کے بعد روپیہ کو سرمایے کی شکل میں لگا دیتے ہیں اور اس کا باقاعدہ منافع وصول کرتے ہیں۔ امریکہ میں ایک کروڑ آدمی چھوٹے حصہ دار ہیں، لیکن انھیں بہت کم ملتا ہے، دس ہزار ۱۰ فیصدی کاروبار کے شریک ہیں پچھتر ہزار آدھے سے زیادہ کے شریک ہیں۔ ان پچھتر ہزار کے دو بڑے گروپ ہیں ——— ان میں سے دو سو خاندان ایسے ہیں جن کا اثر و اقتدار سارے ملک پر پھیلا ہوا ہے اور جو ملک کے کاروبار پر اپنا اثر رکھتے ہیں کہ اسے جس طرف چاہیں موڑ سکیں۔ جارج سیلڈس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "ایک ہزار امریکن ریاست ہائے متحدہ کے اصلی حکمران" اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ایک ہزار میں بھی مارگن باسٹ راک فیلر اور دو یا نٹ قریب قریب امریکہ کے بیشتر قومی سرمایے کے مالک ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے سیاسی اسباب پر اب تک بہت زور دیا جاتا رہا ہے، مگر اس کے جو اقتصادی اسباب ہیں ان کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کو اس سے خطرہ پیدا ہونے لگا تھا۔ اس جنگ میں کروڑوں جانیں ضائع ہوئیں مگر انگریزوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں سوئیڈن اور ڈنمارک کے راستے سے جرمنی تک پہونچتا رہا اور معتدد ایسے سرمایہ داروں کے نام لوگ جانتے ہیں جو دونوں طرف گولہ بارود اور بندوقیں فراہم کرتے تھے یعنی جو قومی سرحدیں اور دیواریں ملکوں کے درمیان انھوں نے بنا رکھی تھیں، ان کو خود عبور کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم نے یورپ کو ہر طرح تباہ کر دیا، مگر امریکہ اپنے جغرافیائی حالات کی وجہ سے محفوظ رہا۔ اس لئے لڑائی کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سرمایہ وارثانت بن کر آیا اور دوسری سرمایہ دار حکومتیں اس کے زیر اثر ہو گئیں۔ انگلستان کو تو اب علانیہ امریکہ کی اسچاسویں ریاست کہا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں روزویلیٹ نے جو یادداشت کانگرس کو بھیجی تھی، اس میں کہا تھا "ہمارے درمیان ذاتی مفاد کا ایک ایسا جال بچھ رہا ہے جس کی قوت کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ہے۔" ٹرومین کو بھی یہ احساس ہوا تھا۔ سرمایہ دار صرف ان شعبوں پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہے جو اس کی جیبیں کی ہوئی ہیں۔ اس کے پاس قدرتی وسائل اور صنعتی علم کا جو خزانہ ہے اس سے وہ صرف اس شعبہ پر کام لینے کے لئے تیار ہے کہ اسے اس کی مرضی کے مطابق دام دیے جائیں" اس لئے امریکہ کی پالیسی امریکہ کے عوام کی مرضی پر نہیں بلکہ ان بڑے سرمایہ داروں کی مرضی پر منحصر ہے جو وہاں کی اصلی حکومت ہیں وہاں کا سیاسی نظام ان کے خلاف کسی طرح نہیں جا سکتا۔

اب یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ سرمایہ داری اگرچہ انسانیت کی تاریخ میں بڑی ترقی اور وسعت کا باعث ہوئی ہے مگر اپنے اندرونی تضاد کی بنا پر وہ ہم کو قدرتی طور پر تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ خیریت بیکاری، جہالت کو اسی حد تک دور کرنا چاہتی ہے جس حد تک اسکا مفاد اجازت دیتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ روپے کو صرف چند پیسے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں مرکوز کر رہی ہے۔ اس کے لئے نوآبادیاں اسی طرح ضروری ہیں جیسے ایک عضلی کے لئے مرمان جنگ، اس کے لئے کاروبار کے فروغ کا دوسرا نام ہے کیونکہ اس زمانے میں من مانی قیمتیں مقرر کی جا سکتی ہیں اور منہ مانگے دام مل سکتے ہیں اور ہر قسم کی بے چینی کو دبانا حکومت کا فرض ہوتا ہے۔ سائنس اس کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ علم اپنے وسائل کی ترقی کا دوسرا نام ہے۔ تہذیب اپنے مفاد کو قائم رکھنے کا اوزار ہے۔ قومی مذہبی اور نسلی کشمکش سے وہ آزاد ہے۔ گران سے کام لینے کے لئے تیار ہے کیونکہ اس کے نام سے اس کا الو سیدھا ہو سکتا ہے، مگر ان چیزوں کے باوجود چونکہ مزدوروں کی بڑھتی ہوئی طاقت پھیلتی ہوئی تعلیم، علم و ادب کی روح اس کے مفاد کے خلاف ہوتی ہے، اس لئے وہ ان سے سراسیمہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک بے چینی، ایک روحانی خلش، ایک خوف ایک بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ وہ روپے اور شین کا غلام ہو جاتا ہے اور انسانیت کی قدریں کھو بیٹھتا ہے۔ ادھر مزدوروں کو مشین ہی کے طفیل میں ایک دوسرے کے قریب آنے اور اپنی اصلی طاقت کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی فضا اس کی

دشمن ہوجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے سماج میں ایک شکست، ایک غم، ایک بے یقینی ایک بے کیفی آجاتی ہے۔ تفریح جو نئے کام کے لئے نئے سرے سے تیار ہونے کا نام ہے ایک مقصد بن جاتی ہے۔ شراب جو غم غلط کرتی تھی خود ایک مستقل غم کا باعث بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اور زیادہ تفریح کی طرف دوڑتے ہیں اور اپنی رو میں سارے اخلاقی اور سماجی رشتوں کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ حسن مالِ تجارت بن جاتا ہے۔ جتنی مقدس چیزیں تھیں وہ کھلونا بن جاتی ہیں۔ کچھ لوگ نیک نیتی لیکن نادانی سے اس دنیا سے فرار پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ کچھ اور تن درستی سے عیش امروز میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ جب نارمل اور عام نعمتوں میں لذت نہیں ملتی تو وہیں کجی اور بے راہ روی شروع ہوتی ہے۔ پستی بلندی بن جاتی ہے اور بلندی پستی۔ حزد کا نام جنون پڑجاتا ہے اور جنون کا حزد۔ اقبال نے مغربی تہذیب پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ دراصل سرمایہ دارانہ تہذیب پر اعتراض ہیں۔ ان کی گہرائی دیکھئے۔

پیامِ مشرق میں یورپ سے خطاب کرتے ہیں۔

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

لینن پر "بالِ جبریل" میں جو نظم ہے اس میں ارشاد ہوتا ہے۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
بے کاری و عریانی و افلاس و خرابات — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

عہد حاضر کے انسان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

عشق ناپید و خرد ہی گرہ کشِ صورتِ مار — عقل کو تابِ خمِ زلفِ پریشاں نظر کر نہ سکا
ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

جو لوگ ترقی، سائنس، انسان، علم و ادب، اخلاق سے مایوس ہوگئے ہیں اگر وہ غور سے دیکھیں تو ان سب کو سرمایہ داروں نے بے کار کر دیا ہے۔ ان کی صلاحیتوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ الف لیلہ کے اس پیر تسمہ پا کی طرح ہے جو جس مسافر کا سہارا لیتا تھا اسے اپنے پنجرے کے پیروں سے گلا گھونٹ کر مار ڈالتا تھا۔ کیٹس کو شکایت یہ تھی کہ سائنس نے دھنک سے اس کا حسن چرا لیا ہے۔ ڈی۔ ایچ لارنس کہتا ہے کہ اس نے انسان سے اس کے خون کی گرمی، اس کا ولولۂ حیات، اس کی فطری صلاحیتیں چھین لی ہیں اور اسے بے روح کر دیا ہے۔ الڈس ہکسلے اپنے ناولوں میں اس کی تباہ کاریوں پر بڑی طنز کرتا ہے۔ اس نے Point Counter Point میں اپنی لڑائی کے بعد کے انسان کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں انسانوں سے نفرت اور کراہیت کی بو آتی ہے۔ یہ سب لوگ انسانوں سے مایوس نظر آتے ہیں

حالانکہ دراصل یہ سارا قصور سرمایہ داری کا ہے جس نے انسانیت سے اس کی روح چھین کر اسے روپیہ اور ذاتی مفاد کا غلام بنا دیا ہے۔ کاڈویل نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ بورژوا سٹھن نے سائنس سے اس کی پسندیدگی اور فن سے اس کی حقیقت چھین لی ہے۔ جو حقیقی ہے وہ اب اس کے اثر سے حسین نہیں ہے کیونکہ بورژوا تہذیب کے مطابق حقیقت غیر انسانی ہے حسن بھی اسی طرح اب حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ بورژوا تہذیب میں حسین ہونا خیالی چیز ہے۔ بورژوا اسی لئے آرٹ کے مقابلہ میں سائنس کا قائل ہے کہ وہ سائنس سے اپنے من مانے کام لے سکتا ہے۔ مگر آرٹ اور فن اور دوسرے فنون لطیفہ انسانیت کی روح کی آواز ہیں اور وہ اس کے غلام صرف ایک محدود پیمانے میں ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے بورژوا کو اس کی پابندیوں سے گرا کر تجارتی آرٹ کی بنیاد ڈالنا ہے۔ موسیقی کو جہاز تک محدود رکھتا ہے۔ ادب سے وہ معنی خیزی یا سنجیدہ پروپیگنڈے کا کام لیتا ہے، فلم سے وہ تفنن، خون، رنا، ڈکیتی، سماجی اکھیڑ پھاڑ کی تلقین کرتا ہے۔ ریڈیو کو وہ اپنے تجارتی اور سیاسی مفاد کے لئے کھلونا بناتا ہے۔ آرٹ کی قدریں بازار کی قدریں نہیں ہیں۔ انسانی مفاد کی قدریں ہیں۔ آرٹ سستی اور عام چیزوں کو قیمتی بناتا ہے اور رنگوں کے چند دھبوں میں روح کی تصویریں اتار سکتا ہے۔ آرٹ جام سفالین میں جام جم کی عظمت اور مٹی کے کھلونوں میں دیوتاؤں کا جلال دکھا سکتا ہے۔ اسی لئے بازار آرٹ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ بازار کا بے رحم قانون حسن کو ذبح کر دیتا ہے۔ گھریلو زندگی کی چیزیں کپڑے، مکان، سب بازار کے قانون کے شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کے بنانے والے اجتماعی مفاد کو خیال میں نہیں رکھتے بلکہ ان کی ضرورت پورا کرنے کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتے ہیں۔ یہ سلسلہ یہاں تک چلتا ہے کہ جو چیزیں انسانی زندگی کو توازن، ترتیب، معنی اور مقصد دیتی ہیں یعنی تصویریں، فلم، ناول، شاعری، موسیقی سب بازار کے قانون کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ڈھلے کی مل اس لئے نہیں بنتی کہ سستی مل بازار میں مل سکتی ہے، بنیا کا کام اس لئے نہیں ہوتا کہ ولایت سے سستی چیز یں اس کے بدلے میں مل سکتی ہیں۔ چونکہ سرمایہ دار حسن اور سماجی خیر کے رشتے کو نہیں سمجھتے اس لئے وہ اسے بھی اپنی فتوحات میں شامل کر لیتے ہیں ہمارا تجارتی آرٹ دراصل ایک قسم کی عیاشی ہے۔ بقول اقبال کے "یہ روح کو خوابیدہ اور بدن کو بیدار کرتا ہے" یہ جذبات کو ہیجان میں لاتا ہے مگر اس ہیجان سے کوئی مثبت اور حسین مقصد حاصل نہیں کرتا۔ یہ ہمیں حقیقتوں سے خوابوں کی طرف لے جا کر خوابوں کو حقیقت بنانے کا جذبہ پیدا نہیں کرتا، خواب کے بعد فوراً سلا دیتا ہے۔ یہ ایک قسم کی افیم ہے۔ یہ جس دنیا میں لے جاتا ہے اس میں صرف آسودگی ہیجان کی تسکین، ایک بے معنی سیرابی ہی سب کچھ ہے۔ انسان اور اس کے ماحول کے درمیان جو ازلی کشمکش ہے اسے نہ یہ ظاہر کرتا ہے نہ اس کے لئے کوئی حل ڈھونڈھتا ہے۔ اسی لئے یہ ایسے ناول تیار کرتا ہے جو جذبات کو بھڑکا میں، جو جسم کی آگ کو تیز کریں اور پھر ٹھنڈا کر دیں۔ جاسوسی ناول کا حیرت انگیز فروغ اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ جاسوسی ناول پرانی داستانوں کی ایک نئی شکل ہے۔ دل تو اس سے کوئی قیمتی انسانی سبق حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی کردار اور سیرت کا کوئی گہرا علم نہیں ہوتا۔ انسانی بصیرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ زندگی کے متعلق کوئی اچھا شعور نہیں بنتا، دوسرے یہ ایک نشہ بن کر علم و عمل کی دوسری صلاحیتوں کو مجروح کرتا ہے۔ جہاں مطالعہ یا ذہنی توجہ ضروری نہیں، صرف واقعیت یا سرسری نظر کافی ہے یعنی فن کار اس ایتری اور پستی سے گھبرا کر رومانی، ذاتی اور رمزی آرٹ میں پناہ لیتے ہیں جہاں فرد، ذات، شخص سب کچھ ہوتا ہے۔ جہاں سب سے اچھا نغمہ وہ ہے جس کو مغنی کے سوا کوئی نہ سنے۔ جہاں چیزوں کے من مانے نام ہیں۔ جہاں ابلاغ اور نشر کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تخیل کی یہ بے مقصد آبیاری مرض بن جاتی ہے۔ بازار کی ذہنیت سے گھبرا کر یہ ذاتی جذبات کا کھلونا بن جاتے ہیں۔ یہ دونوں سرے عدم توازن کی مثال ہیں اور دونوں بورژوا تہذیب کی بنیادوں کے اندرونی تضاد سے پیدا ہوتے ہیں

ہمارے فلموں کی بازاریت اور عامیانہ پن اور میراجی کی لذت پرست آزاد نظم دونوں کو اسی نقطۂ نظر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرائس کے شارپ برسٹ ڈی۔ ایچ لارنس۔ ہکسلے، جوائس، اور ڈورتھی سیرس ہالی وڈ کے فلم ساز اور نیم کی بکاء والے ناول اسی لئے ایک ہی مرض کے دو پہلو ہیں۔ ہکس نے اپنے ایک مشہور مضمون میں بورژوا تہذیب کی اس غارت گری کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے "بورژوا تہذیب نے انسان اور انسان کے درمیان تجارتی ذاتی مفاد کے سوا یا اجرت کے سوا دوسرا رشتہ نہیں باقی رکھا۔ اس نے ان تمام پیشوں سے، ان کا تقدس اور حسن چھین لیا ہے جو اب تک احترام اور اعزاز کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس نے ڈاکٹر، وکیل، پادری، شاعر، سائنس داں کو اپنا مزدور بنا لیا ہے۔ اس نے خاندان سے اس کا جذباتی غلاف اتار پھینکا ہے اور خاندانی رشتوں کو صرف مالی رشتہ بنا دیا ہے۔"

سطور بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کی اور ان کے بہترین افکار کی کیا حالت ہو جاتی ہے اور کیوں لوگوں کی ذہنیتیں مسخ اور ان کی روحیں مرض ہو جاتی ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ تہذیب کا ایک حقیقی مفہوم ہمارے سامنے ہو تاکہ تہذیبی دنیا میں اس کی غارت گری اور تہذیبی اور انسانی نقطۂ نظر سے اس کا زوال ہمارے نزدیک ناگزیر ہو جائے۔

تہذیب کا جو عام تصور ہے وہ دراصل بڑا ناقص اور محدود ہے۔ ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہمارا یہ تصور دراصل بعض پچھلی روایات کے طفیل ہے اور چونکہ بدلتی ہوئی زندگی میں کوئی روایت پوری طرح کارآمد نہیں رہتی، اس لئے ہمیں بھی حقیقت کو چھوڑ کر سراب کی جستجو نہیں کرنا چاہیئے۔ اب تک ہم تہذیب کو شرافت، شائستگی، متانت، نفاست، لطافت، جذبات پر قابو، ایک رچا ہوا شعور، ایک ذوق جمال یک رخ اور شیریں معقولیت سمجھتے ہیں۔ مہذب انسان وہ ہے جو علم کی برکتوں سے مالا مال ہے۔ جسے اپنے جذبات پر قابو ہے۔ جو بازار میں جھگڑا نہیں، جو عزت کی خاطر جان دے دیتا ہے۔ جو روپیہ کی زیادہ پروا نہیں کرتا، جو علم طبعی کا ماہر ہے، جو روایات و آداب سے واقف ہے۔ جو حسن و تناسب کا راز جانتا ہے۔ جو ایک ظرافت کی حس رکھتا ہے، جو اپنے اوپر بھی ہنس سکتا ہے۔ جو کسی قسم کے گرد و غبار کو آلودہ نہیں، چاہے وہ مادی ہو یا ذہنی اسی اخلاق کو بعض لوگ شیریں معقولیت (Sweet Reasonableness) کہتے ہیں۔ فاسٹ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ کلچر یا تہذیب کے لئے اخلاق کا ایک تصور ضروری ہے۔ میتھیو آرنلڈ کے نزدیک کلچر تکمیل کی سعی ہے۔ یہ تری اور روشنی کی تلاش ہے، وہ کہتا ہے کہ مہذب انسان ذہن اور روح کی ایک اندرونی خاصیت پر زور دیتا ہے۔ وہ خارجی حالات، یا بیرونی حوادث کی پروا نہیں کرتا۔" ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا بھی تصور کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ تصور سرے سے غلط نہیں ہے۔ اس میں تہذیب کی بعض قدریں آجاتی ہیں، مگر ایک خاص افتاد ذہنی پر یہ زور بلکہ ذہن پر یہ سارا زور ایک جاگیردارانہ نظام کی یادگار ہے۔ یہ اس فارغ البال طبقے کی پیداوار ہے جو مالی مشکلات کی فکر سے آزاد ہے اور جس میں شرافت اور ذاتی وجاہت کی بڑی اہمیت ہے۔ تاریخ میں یہ پہلا ہوا ہے کہ بالائی طبقے نے قدریں بنائی ہیں اور متوسط طبقہ ان کا سب سے بڑا محافظ اور علم بردار رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بالائی طبقے کو ان قدروں سے کام لینا ہوتا ہے۔ ان پر یقین رکھنے اور انھیں ماننے کی اسے ضرورت نہیں۔ مذہب، قانون، اخلاق، سب سے وہ بالاتر ہے۔ متوسط طبقہ ان پر یقین رکھتا ہے اور اس کے عمل میں یقین کی پختگی اور استواری ہوتی ہے۔ عوام صرف اس خوبصورتی کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اس تک پہونچنے کی نہ ان میں ہمت ہوتی ہے نہ فرصت۔ ہمارے شعرا میں سے اگر متوسط طبقے کے افراد تھے۔ مگر انھوں نے جن قدروں پر زور دیا ہے وہ اسی بالائی طبقے کی بنائی ہوئی اور اس کے مفاد کے مطابق تھیں مگر آصف الدولہ کو بازار میں میر سے باتیں کرنے میں عار نہ تھا۔ میر کو عار تھا۔ انھوں نے جا بجا اپنے کلام میں اشراف اور اجلاف کا ذکر کیا ہے۔

تنبیہہ الجہال میں لکھتے ہیں:۔

دخل اس فن میں نہ تھا اسلاف کو — کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازوں نے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں، ندافوں کو کیا

غالب کی فطرت کی جستجو صرف مالی فائدے کے لئے نہیں تھی۔ عزت، وقار اور تہذیب کے اس معیار کو باقی رکھنے کی جو سے بھی تھی جو انھیں عزیز تھا۔ جب وہ جیل خانے گئے تھے تو انھیں اپنی رسوائی کا غم زیادہ تھا، اپنے گناہ کا احساس نہ تھا۔ شیفتہ نے اس تبدیلی معیار سے نظیر کو پرکھا تھا کہ چونکہ ان کا کلام سوقیوں کی زبان پر ہے اس لئے انتخاب کے لائق نہیں۔ اکبر کو پردے میں ایک جاہ و تمکنت نظر آتی تھی۔ انھیں غم اس بات کا تھا۔

بدل جائے گا سیارشہ فرنگ جنم دنیا میں — زیادہ تھے جو اپنے نغم میں وہ سب سے کم ہونگے
نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے نستعلیق میں نوک — نہ نستعلیق نوک اس طرح سے زیب قلم ہونگے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکہ سے ضم ہونگے

اقبال کے ہاں روح شریعت اور نگاہ پاک و خیال بلند و ذوق لطیف کا جو ذکر ملتا ہے، وہ سب اس نقطہ نظر کا پرتو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اردو زبان کے ایک خاص اسلوب سے محبت بھی اسی تہذیبی تصور کا مظہر ہے جس میں وقت اور عادات کی تدریجی تبدیلیوں کا احساس نہیں ہے اور پچھلے فارم اور فن پر اس قدر اصرار اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس میں جاگیردارانہ نظام کی کتنی قدریں شامل ہیں۔ نفاست، نزاکت، پختگی اور ایک حد تک ہی انسان دوستی کا یہ تصور دراصل ایک محدود سماجی شعور کا نتیجہ ہے۔ تہذیب کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لئے ہمیں جدید علوم، خصوصاً علم الاقوام اور عمرانیات کی مدد لینی پڑے گی۔ ان ہی علوم نے تہذیب یا کلچر کی تعریف کی ہے اور اس کی وسعتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ان کی معلومات کے مطابق کلچر دراصل ایک اجتماعی میراث ہے۔ بدن کی ساخت اور اعضائے جسمانی کی خصوصیات کے علاوہ انسان کو یہ اجتماعی میراث دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں زبان، عادات، خیالات، عقائد تنظیم اور پس منظر سب آجاتے ہیں۔ تمدن یا سولیزیشن زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں کی ایک خاص شکل ہے۔ تہذیب میں موروثی دستکاریاں صنعتی طریقے، پیداوار کے ذرائع اور قدریں شامل ہیں۔ ان قدروں کی بنا پر جب شہری زندگی ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے اور رائے کچھ مستحکام اور روایت مل جاتی ہے تو وہ تمدن کہلاتی ہے۔

انسان زندہ رہنے کے لئے ہمیشہ اپنے ماحول سے جنگ کرتا اور اسے بدلتا رہتا ہے۔ ماحول سے جب وہ دوچار ہوتا ہے تو اس سے ہم آہنگ ہونے کے لئے ایک دوسرا مصنوعی اور ذہنی ماحول بنا لیتا ہے۔ یہ اس کی زرہ، اس کی ڈھال، اس کی تلوار ہے جس کے برتے پر وہ آگے بڑھتا ہے روزی کماتا ہے۔ اجتماعی کاموں میں شریک ہوتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ ہم نے ابتدا تک زندگی میں خیالات کو بڑی اہمیت دی تھی۔ تہذیب کو قدروں کے تعین اور اخلاق کے شعور سے پہچانا تھا حالانکہ تہذیب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بنیادی حیثیت، اقتصادی رشتوں یا پیداوار کے ذرائع کی ہے۔ اسی بنیاد پر ذیلی عمارتیں بنتی ہیں۔ ادب، فلسفہ، اخلاق، مذہب کے سربفلک میناروں کی بنیاد مادی ضروریات کی زمین پر ہے۔ ابتدائی دور میں یہ مادی ضروریات سادی، واضح اور آسانی

سے سمجھ میں آجانے والی شکل میں تھیں جوں جوں زندگی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اور یہ پیچیدگی تقسیم عمل کی وجہ سے ہے۔ زندگی ترقی کرتی جاتی ہے اور بہت سی قوتوں کے ضایع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ انسان کے اوزار، اس کی عمارتیں، اس کی کشتیاں سحر اور مذہب کے قوانین اس کی تہذیب کے مظاہر ہیں۔ اگرچہ تہذیب صرف مادّی وسائل کا نام نہیں ہے، مگر مادّی وسائل کے پورا کرنے کے لئے ہی یہ عمارت بنتی ہے۔ ان ہی وسائل کے لئے علم کی ضرورت ہے تاکہ اوزاروں اور دست کاریوں کو فراہم کیا جاسکے اور ان کی سماجی ضروریات کے مطابق تنظیم ہوسکے اس تنظیم میں ذہنی اور اخلاقی ذرایع کام کرتے ہیں۔ اشیاء پر قدرت اور ان کے استعمال سے ہی ان کی قدر و قیمت کی پہچان، اور ان کی پرکھ شروع ہوتی ہے جس کے لئے مل جل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میل ملاپ کے یہ رشتے اجتماعی نظام وجود میں لاتے ہیں اور اجتماعی شعور کا آغاز ہوتا ہے ان میں زبان کی حیثیت بہت اہم ہے۔ زبان کوئی وجدانی اور الہامی چیز نہیں ہے۔ یہ انسان کی مخصوص ضروریات کی ایجاد ہے۔ مالی نوسکی کے الفاظ میں "یہ ایک قسم کی رسم ہے" یہ تہذیب یا کلچر کا ایک لازمی جز ہے اور کوئی آلہ نہیں، اوزار نہیں، بلکہ رسموں کا ایک صوتی اظہار ہے۔ اس طرح یہ عالموں اور پنڈتوں کی جاگیر نہیں۔ عوام کی سماجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے جس کے ذریعے سے بچوں کو بہت جلد اس فضا سے مانوس کردیا جاتا ہے جو ان کے پیش رووں نے برسوں میں پیدا کی تھیں۔ اسی طرح ضمیر، مذہب اور اخلاق کے تصور کی پابندی بھی سماج یا اجتماعی روح کی ضروریات کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اسی لئے جذبات اور قدروں کی تعمیر سوسائٹی کے تہذیبی سانچے کی مرہون منت ہے۔

اب یہ سمجھنا آسان ہوگیا کہ تہذیب کی روح کو سمجھنے کے لئے مختلف نسلوں کے ذرایع پیداوار کو سمجھنا چاہیئے۔ تہذیب جو اوزار بناتی ہے وہ اسی ذریعہ پیداوار کے دائرہ اثر میں ہوتے ہیں۔ تہذیب کو تفریح کے ذرایع تک محدود کرنا غلطی ہے۔ پہلے غذا فراہم کرنے کا مسئلہ آتا ہے۔ کام کے بعد تفریح کا مسئلہ اہم ہے تاکہ کام بہتر طریقے سے انجام دیا جاسکے۔ تفریح کے ذرایع بھی کام کے ذرایع سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لئے فارغ اوقات طبقے کے ذرایع تفریح کو بھی پورے سماج کے کام کے طریقوں کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ خاندان، جنس، نشوونما اور تحفظ اور بقا کے جتنے رشتے ہیں وہ اسی پیداوار اور کام کے بنیادی رشتے کے گرد گھومتے ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے گرد جو مخصوص جذبات بن گئے ہیں، وہ پیداوار اور کام کے رشتے میں خلل انداز یا حارج ہوں۔ تناؤ یا کشمکش اس طرح وجود میں آتی ہے اور اس کشمکش کے گرد شعر و ادب اور فنون لطیفہ نے بڑے بڑے رنگ محل تیار کئے ہیں۔

تہذیب کے عمل میں اور بقا میں چار لازمی پہلو ہیں۔ اقتصادی تنظیم، قانون اور تعلیم اور آرٹ۔ تعلیم اقتصادی تنظیم میں مدد دیتی ہے اور اس طرح ایک میز ہے۔ مگر اس کے علاوہ یہ شخصیت کے جوہر کو چمکاتی ہے۔ اسے قطرے سے سمندر، ذرّے سے صحرا اور ایک فرد سے ایک پوری انجمن میں تبدیل کردیتی ہے۔ قانون اسی سماج کے رشتوں کو اس کے مفاد کے مطابق قائم رکھتا ہے اور دوسرے جذبات کو حایل یا حارج نہیں ہونے دیتا۔ فن کی حیثیت ان سب سے بلند اور مختلف ہے۔ اصل تو یہ انسانی تنظیم کی بنیادی ضروریات کو پورا کرتا ہے، یہ اسے سوسائٹی کے حقائق سے بہتر طور پر دوچار ہونے میں مدد دیتا ہے۔ پھر جب اقتصادی رشتے اور قانون کی سختیاں انسانی روح اور افراد کے رجحانات پر دباؤ ڈالنے لگتی ہیں، تو ان کے خوابوں اور خیالوں، ان کی امنگوں اور آرزوؤں کی عکاسی کر کے انھیں اس قابل بناتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ فرسودہ اقتصادی رشتوں کا مقابلہ کرسکیں یا انھیں بدل سکیں۔ اسی طرح تہذیب جو اجتماعی انسان کی تخلیق ہے، افراد کی صلاحیت کا دائرہ وسیع کرتی ہے اور اسکے عمل کی طاقت کو بڑھاتی ہے۔ وہ خیالات کی ایک ایسی گہرائی اور فکر کی ایک ایسی وسعت عطا کرتی ہے جو حیوانوں میں کبھی پائی نہ گئی۔ تہذیب افراد کو باقاعدہ جماعتوں میں منظم کرتی ہے اور انھیں ایک لامنتہا تسلسل عنایت کرتی ہے۔ انسان اپنی کوئی ضرورت اس طرح پوری نہیں کرتا جس طرح

جائز کرتا ہے، بلکہ تقسیم عمل اور مستقبل کے لئے مناسب انتظامات کرکے وہ رنگ، صورت، موسیقی، اور شاعری سے لطف اٹھاتا ہے اور تفریح کے ذریعے سے زندگی کے لئے تازہ دم ہوتا ہے۔

جس طرح سرمایہ داروں نے انسان کی طاقت اور اقتدار میں اضافہ کر دیا ہے اسی طرح اس نے تہذیب کو بھی کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اپنے نظام کے اندرونی تضاد کی وجہ سے یہ اس سانپ کی طرح ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے اسی لئے تعلیم، فن اور اخلاق کے روایتی اصولوں کو جن کے سہارے ایک زمانے میں اس نے ترقی کی تھی، یہ خود ہی کچلتا ہے۔ تعلیم سے شخصیت کو نکھارنے اور اس کے خوابیدہ جوہر کو چمکانے کے بجائے یہ محض مینر کا کام لیتا ہے۔ فن کو حقیقت آفریں خواب بنانے کے بجائے بے معنی خواب یا سستہ نشہ یا دیوانے کا خواب بنا دیتا ہے۔ سائنس سے عقلیت توازن اور سماجی شعور حاصل کرنے کے بجائے یہ صنعتی ترقی اور تباہ کاری کا کام لیتا ہے۔ اخلاق کے معیاروں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور صرف روپیہ کی پرستش کا درس دیتا ہے۔ موجودہ تہذیبی زندگی میں تعلیمی اداروں، اخباروں اور رسالوں، فلم اور ریڈیو کی جو اہمیت ہے ظاہر ہے، مگر سرمایہ داری ان کے حقیقی مقصد کی پروا نہیں کرتی۔ انھیں اپنے اغراض کی اشاعت کے لئے استعمال کرتی ہے۔ روشنی کے فرشتے سے جب تاریکی کے فرشتے کا کام لیا جائے تو نتیجہ ایک دھندلکا ہوتا ہے اور موجودہ دور کے جس بحران کی طرف تمام مفکروں، ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں نے اشارہ کیا ہے وہ اسی دھندلکے کی وجہ سے ہے۔ برٹرینڈ رسل اور کیسلے نے حال میں اپنے مضامین میں اسی پر زور دیا ہے کہ موجودہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کی غذا اس رفتار سے نہیں بڑھی جس رفتار سے اس کی آبادی بڑھی ہے۔ غذا ایک خاص حد تک بڑھ سکتی ہے۔ اس لئے آبادی کا کم ہونا ضروری ہے۔ یہ دیسی ہی بات ہے کہ ہندستان میں غذا کی کمی کی وجہ سے لوگوں کو سکھتے ہیں ایک دن کھانا چھوڑ دینا چاہیئے۔ مثبت پہلوؤں سے پہلو تہی اور منفی پہلوؤں پر یہ اصرار اس دور کے دانشوروں کی ذہنی کم مائیگی کو خوب ظاہر کرتا ہے۔ کیسلے کہتا ہے کہ سائنس نے انسانوں کو جاہل بنا دیا ہے اس لئے سائنس دانوں اور دانش وروں کا فرض ہے کہ وہ سیاست دانوں کے چنگل سے دنیا کو نجات دلائیں۔ یہ سارے خیالات محض سطحی ہیں۔ ان میں حقائق سے جان بوجھ کر چشم پوشی کی گئی ہے موجودہ بحران کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت ترقی کر چکی ہے اور وہ سرمایہ داری اور اجارہ داری اور اس کی اولاد قطعاً ئیت سے بیزار ہے مگر ابھی تک روس اور چین کے علاوہ اپنے آپ کو اس چنگل سے آزاد نہیں کرا سکی[1]۔ دنیا کی روح کی فریاد مزدوروں کی بڑی ہڑتال اور ہڑبونگ نہیں بلکہ فنکار کی چیخ ہے جو کبھی زمان کی دیواروں میں گھٹ کر رہ جاتی ہے اور کبھی ان دیواروں کو توڑ کر فضا میں سما جاتی ہے۔

امریکہ کے تعلیمی اداروں میں سائنس کے کمال پر زور دیا جاتا ہے۔ روپیہ کی فراوانی کی وجہ سے علم کی طرف بھی توجہ ہے، مگر ان تعلیمی اداروں کا سیاسی زندگی میں کوئی فیصلہ کن حصہ نہیں ہے۔ ہاں اخباروں اور رسالوں کا اثر بہت ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ امریکہ کے بڑے بڑے اخبار ان کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہیں اور عوام کو وہی درس دیتے ہیں جو ان کے مالکوں کے مقصد کو پورا کرتا ہے۔ جارج سیلڈس نے وہاں کے رسالوں کے متعلق بڑی چشم کشا معلومات مہیا کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ وہاں کا سب سے کثیر الاشاعت رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" (Readers Digest) جس کے خریدار ایک کروڑ پچاس لاکھ اور جس کے پڑھنے والے پانچ کروڑ ہیں "Digest" یا مختلف رسالوں کا مجموعہ اور آئینہ ہیں۔ اگرچہ اس پر وہاں کے سرمایہ داروں کا براہ راست قبضہ نہیں ہے۔ مگر یہ اپنے مضامین میں حکمراں طبقہ کی حمایت کرتا ہے

نوٹ:- روس اور چین کی فہرست میں مشرق اور وسطی یورپ کی عوامی جمہوریتیں مثلاً پولینڈ، چیکوسلاواکیہ، ہنگری وغیرہ بھی شامل ہیں (ادارہ)

وہاں کے انگریزی کے استادوں کی قومی کونسل نے اس سلسلے میں تحقیق کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کے رسائل یا تو اس کے اڈیٹروں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں یا اس کے اڈیٹر دوسرے رسالوں میں چھپوا کر انھیں اپنے یہاں شایع کرتے ہیں۔ یہ بددیانتی کے مرتکبوں کے حمایتیوں کے مزدوروں کے خلاف ہے، یہاں تک کہ روزہ رویت کے خلاف بھی رہا ہے۔ اس کے علاوہ Ladies Home Journal, Woman's Home Companion, Mccall's Good Home Keeping, American, Cosmopolitan, Redbook. Form journal جیسے اخبار اور Life, Saturday Evening Post, Collier's, Look, True Liberty جیسے ہفتہ وار اخبار جن میں سے سب سے کم اشاعت چھ لاکھ ہے اور سب سے زیادہ اکتالیس لاکھ ہے۔ Newsweek میگزین، ہارپرس، وارنر، لوچے (Vogue) کروویل وغیرہ کے ہیں اور میگزین ان میں سے بیشتر میں بڑا اچھا مواد ہے۔ یہ وجہ ہے کہ امریکی اخبار اور رسالے تفریحات پر اتنا زور دیتے ہیں۔ اشتہار کو اہمیتہ اہم سمجھتے ہیں کہ اسے ایک فن بنا دیا ہے۔ جسم کی پیاس کو اتنا بھڑکاتے ہیں اور روح کو اتنا تشنہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہالی وڈ کی فلمیں اگرچہ تکنیک اور ساز و سامان کے لحاظ سے اتنی شاندار ہوتی ہیں۔ مگر دنیا کے ادبی اور علمی خزانے سے روز بروز بیگانہ ہوتی جا رہی ہیں اور دہشت پسندی، فتنہ خیزی، قتل و خون، نفسیاتی الجھنوں اور آزاد محبت کے پرچار میں مصروف ہیں۔ مارشائی کے اینا کرینا کو ہالی وڈ نے فلمایا اور ایک انگریز کمپنی نے۔ انگریزوں نے ٹالسٹائی کے ساتھ زیادہ انصاف کیا۔ ہالی وڈ نے روپیہ کا لالچ دے کر بہت سے انگریز مصنفین کو اپنی طرف مائل کر لیا مگر فن کے صحت مند معیار، بلکہ تخلیق کی مسلمہ قدروں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے۔ صرف خونِ جگر کو مال تجارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ریڈیو کو تجارتی کمپنیوں کے ہاتھ میں دے کر انھوں نے عوام کے لئے وہ تفریحی غذا مہیا کی جو سرمایہ داروں کے مفاد کے مطابق ہو۔ کتابوں کے چھاپنے میں انھوں نے بازار کی مانگ کو سب سے بڑا درجہ دیا اور بازار کی مانگ کے آثار چڑھاؤ کو اپنی نگاہوں کی جنبش کا مرہونِ منت بنایا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج اچھے ادیبوں کے کارنامے کم بکتے ہیں لیکن جاسوسی کے ناول، ذہنی پستی اور جنسی بدراہی کے نمونے مرتبے زیادہ کامیاب ہیں۔ جنس بازار کی ایک شے (Commodity) بنا دی گئی ہے۔

ہندوستان میں موجودہ آزادی کے بعد جو رجحانات نمایاں ہیں وہ امریکہ کے رجحانات سے زیادہ مختلف نہیں۔ بنیادی طور پر وہی [illegible] جگہ یہاں بھی کام کر رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے شخصیت کی تربیت، اخلاق کے معیار اور انسان دوستی کی تعلیم دینے میں ہماری زندگی کی [illegible] پابندیاں عائد کرتی ہے اور تعلیمی اداروں میں جو چیزیں حسین اور نیک ہیں۔ زندگی میں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ استادوں اور شاگردوں میں ایک عجیب بے یقینی ہے۔ انھیں خود ان چیزوں پر اعتماد اور بھروسہ نہیں جو وہ بتاتے ہیں۔ علم انسانی روح کی غذا نہیں ایک ذریعہ ہے۔ روپیہ کمانے اور موجودہ زندگی کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کا۔ اور چونکہ یہ نعمتیں گراں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے لوگ روپے کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ وہ مڑ کر زندگی کی اعلیٰ قدروں کی طرف دیکھتے جاتے ہیں۔ پھر یونیورسٹیاں، کالج اور اسکول سب دفتری نظام کے پرزے بن گئے ہیں۔ یہ ہر سال بھاری لاتے ہیں اور بازار کی مانگ کے مطابق انسانی مال مہیا کرتے ہیں۔ یہ پرانی تہذیب اور سبھیتا کے ترانے گا کر موجودہ زندگی کے حقائق سے گریز سکھاتے ہیں۔ ان میں استادوں کی عزت ہوتی ہے۔ مگر ان کی ضروریات زندگی کا خیال نہیں کیا جاتا۔ اس کے لئے یہ تسلی کافی ہے کہ وہ ایک آسمانی مخلوق ہیں جو علم و ادب کی دیوی کو پوجا کرتے ہیں اور مالی منفعت سے بے نیاز ہیں۔ موجودہ نظام میں علم و ادب کی حقیقی قدر نہیں ہے صرف جلسوں میں تقریریں

میں کا اعتراف کافی ہے سائنس پر نیوٹن اسلئے نہیں کہ تجرباتی طریقہ عقلیت اور استدلال بڑی چیزیں ہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ ان سے کارخانوں کے بنانے اور حکومتوں کیلئے طاقت مہیا کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ سائنس کی تعلیم میکانکی ہے، اسے موجودہ اجتماعی علوم کی بنیاد نہیں گردانا اور ہر سائنس کے ایسے خانے بنا دیئے گئے ہیں کہ دوسرے کا گزر نہیں۔ آرٹ، شعر و ادب اسی سے ذلیل ہے کہ یا تو دھنک، باندنی اور سبزہ زار کے حسن دکھاتا ہے، یا بغاوت پھیلاتا ہے طالب علموں کے لئے طالب علم کی مدت ایک زبردستی کی قید ہے، ان کے نزدیک ڈگری کی شہزادی زیادہ اہم ہے جس کے حصول کے لئے انہیں کتابیں پروفیسروں اور درسگاہوں میں دماغ کچی کرنا پڑتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارے اب ایسے ذہنی قلعے نہیں رہے جن میں لوگ باہر کے فتنوں سے محفوظ رہیں اور گھر بلو ہنگاموں کو باہر نہ جانے دیں۔ انکی کچی دیواروں میں جو رخنے ہیں وہ موجودہ بحران کا نتیجہ ہیں۔

ہمارے اخبار اور رسالے علم و تہذیب کی کس قدر خدمت کرتے ہیں، اور ہماری معلومات میں کتنا اضافہ کرتے ہیں۔ بے شبہ بعض امریکن سیاحوں کے نزدیک دو امریکہ کے پرچوں سے زیادہ وسیع ہیں کیونکہ ہندستان ابھی امریکہ نہیں بنا ہے، مگر اتنا سرمایہ داروں کا جو شکنجہ بڑھ رہا ہے اس کے منطقے کے متعلق پیشین گوئی زیادہ مشکل نہیں ہے آج ملک کے بیشتر اخبار بڑے سرمایہ داروں کے قبضے میں یا ان کے اثر میں ہیں۔ آزاد اخباروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ رسالوں میں علمی و ادبی پہلو سے زیادہ سستی جذباتیت، چاشنی اور چٹخارا ہے۔ میں نے دہلی، کانپور لکھنؤ، بنارس، علیگڈھ کے اسٹیشن پر وہیلر بک اسٹال پر نظر ڈالی۔ اردو کے تقریباً ایک درجن رسالے دیکھے مگر ان میں "آج کل" کے علاوہ کوئی ایسا پرچہ نہ تھا جو کچھ بھی سنجیدگی کا دعویٰ کرتا ہو، اور "آج کل" بھی آپ جانتے ہیں اس سنجیدگی کا نقاب کس مقصد کے لئے اوڑھے ہوئے ہے۔

ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے ایک فلمی تہذیب وجود میں آ رہی ہے، امریکہ کے بعد ہندستان سب سے زیادہ فلمیں بناتا ہے۔ فلموں کے گانے، فلموں کے لباس، فلموں کے نقطے ہماری زندگی میں دیکھتے دیکھتے داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارے اخلاق پر فلموں کا اثر پڑ رہا ہے۔ نوجوان فلمی دنیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ لڑکیاں ستاروں کی عجائب گاہ کی طرف للچائی ہوئی نگاہیں ڈالتی ہیں۔ یہاں فلمی دنیا کے وجود، اس کی اہمیت اور اس کے مفید پہلوؤں سے بحث نہیں۔ یہاں کہنا یہ ہے کہ موجودہ فلمی دنیا کا معیار، سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ہے جس کا مقصد ہماری تفریحی ضروریات کو کھلونا بنا کر ان سے روپیہ حاصل کرنا ہے۔ فلم چاشنی اور چٹخارے اور جنسی آزادی کے راستے سے گزرتا ہوا اس منزل تک لے جاتا ہے جو پرانے سماجی رشتوں کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔ فلم کا انجام موجودہ معیاروں کو قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا آغاز موجودہ معیاروں سے بغاوت سکھاتا ہے۔ سرمایہ صرف جذبات کو بھڑکا سکتا ہے۔ وہ اس آنچ سے کوئی قیامت اٹھانا نہیں چاہتا اس لئے اس پر آخر میں نہایت ہوشیاری سے اور بھدے طریقے سے پانی ڈال دیتا ہے۔ وہ عام فہم زبان استعمال کرتا ہے، کیونکہ اسے لوگوں کے دلوں تک پہونچنا ہے۔ مگر وہ جدید تکنیک برتتا ہے کیونکہ اس سے وہ اپنے اثر کو بڑھا سکتا ہے، مگر وہ قدیم قدروں کو نہیں سمجھتا۔ اس مجہول مرکب کی وجہ سے اس نے ہماری زندگی کے تہذیبی انتشار میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ فلم ایک تلوار ہے مگر ہم اس سے ترکاری چھیلتے ہیں۔ اس سے ہم کسی مکان پر لڑنے کی بجائے محرم میں لاٹھی کی صفائی دکھانے پر قناعت کرتے ہیں۔

ریڈیو ایک سرکاری ادارہ ہے۔ سرکار، سرمایہ داروں کا اڈہ ہے۔ سرمایہ داروں کو عوام کے جذبات سے کھیلنا آتا ہے۔ اس لئے ریڈیو کی زبان چلن اور رواج کے بجائے قدامت پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی تفریح اور تعلیم میں کوئی واضح شعور اور کوئی منصوبہ نہیں ہے اس کے اپنے آرٹ، فن اور شعر و ادب کے کوئی اصول نہیں ہیں۔ وہ ایک سرکاری ادارہ زیادہ ہے، ایک تہذیبی ادارہ کم۔ اس میں تفریح کے ذرائع کی علم کے ذرائع سے زیادہ قدر ہے۔ اسی لئے سستے فلمی گانے اور عام فہم گیتوں کو وہ اچھی اور مفید تقریروں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ایک

عالم کے مقابلہ میں اس کے نزدیک ایک گویئے کی زیادہ قدر ہے اور گویئے بھی وہ جو عوام کو بہلا سکیں، انھیں بیدار نہ کریں۔

ہندستان کی تہذیب پر اب بھی جاگیرداری کا گہرا اثر ہے۔ مگر سرمایہ دار طبقہ اسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ دنیا اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے کہ ایک ملک کے عوام دوسرے ملکوں کے حالات و واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے نئی عوام دوست قوتوں کا اثر بھی اپنا کام کر رہا ہے۔ یہ تینوں اثرات ہماری موجودہ تہذیب کی کشمکش اور اس کی سراسیمگی کو ظاہر کرتے ہیں، مگر غور سے دیکھا جائے تو ایک اچھی تہذیب کا شعور، سماجی ضروریات اور عوام کی فلاح سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتا اور نہ وہ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کر سکتا ہے اسی لئے ضرورت ہے کہ تہذیب کے موجودہ محدود تصور کو وسیع کر کے اسے ذرائع پیداوار، تقسیم عمل اور اشتراک باہمی کے اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور فارغ البال طبقے کی میراث پر پچھتائی ہوئی نظریں ڈالنے کے بجائے عوام کے معیار زندگی کو بڑھانے اور کام کو مقصد اور معنی عطا کرنے۔ اور کام کرنے والوں کی قدر کرنے پر زور دیا جائے۔ اسی لئے انسان پر مشین کی حکومت سے زیادہ مشین پر انسان کی حکومت ہونا چاہیئے اور تہذیب کے تاج محل کو عوامی جد وجہد اور اجتماعی حسن کاری کا ایک روشن مینار بنانا چاہیئے۔ اسی لئے امن اور عوام کی حکومت پر اصرار کرنا چاہیئے تاکہ سارے انسان دنیا کے تہذیبی سرمایے سے یکساں طور پر فائدہ اٹھا سکیں اور ہر فرد علم و عمل کی اس بلندی اور شخصیت کی اس تکمیل تک پہنچ سکے جو اس کا حق ہے۔ کلچر کے تحفظ کے لئے مجرد اخلاقی تصورات اور موہوم انسان دوستی کے بجائے کام کا مفید، مقصدی اور اجتماعی ہونا ضروری ہے، اور کام اور تفریح میں ایک صحت مند رشتہ پایا جانا ضروری ہے۔ اس کے لئے اندھی ماضی پرستی کے بجائے ماضی و حال کا ایک صالح تصور لازمی ہے۔ اس کے لئے انسانیت پر یقین اور اس کی اچھی صلاحیتوں پر ایمان ضروری ہے۔ اچھی تہذیب چند افراد کی جاگیر نہیں ہو سکتی، وہ صرف فارغ البالی اور فرصت کا کھلونا نہیں بن سکتی۔ اس کی چمن بندی کے لئے باخبر اور روشن خیال عوام کے پسینے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ہے:-

خونِ دلِ معمار کی گرمی سے ہے قائم — میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا — روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ کے جلسے میں پڑھا گیا)

ایشیا جاگ اُٹھا

(طویل نظم)

(دوسرا ایڈیشن) قیمت بارہ آنے

اور اس کے بعد

سردار جعفری اپنی نئی نظموں کا مجموعہ

پتھر کی دیوار

پیش کرتا ہے (زیر طبع)

مکتبہ شاہراہ ۰ دہلی

جاں نثار اختر

جلال و جمال

جلال و جمال احمد ندیم قاسمی کی دس سال (۳۶ سے ۴۶ تک) کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مختلف حصوں میں سن وار مرتب کیا گیا ہے جس سے ندیم کی شاعری کے ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مجموعے کے شروع میں ندیم نے اپنے حالات زندگی اور اپنے فنی نظریات پر مفصل دیباچہ بھی سپرد قلم کیا ہے۔ اس مختصر ریویو میں میں نے ندیم کی شاعری اور ان کے فنی نظریات کے ساتھ ساتھ بحث کرنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

ندیم کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے۔ غزل کو مرور زمانہ ترقی پسند رجحانات کے منافی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں چند غلط ادبی نعرے بلند کئے گئے تھے جس میں ایک غزل کی مخالفت میں تھا لیکن جیسے جیسے ہماری تحریک اور ہمارا تنقیدی شعور استوار ہوتا گیا یہ نعرے ختم ہوتے گئے۔ آج کے ادبیات میں غزل اپنے قدیم ہیئت کے باوجود اپنے موضوع کے دائرے کو وسیع کر کے ایک ترقی یافتہ صنف شاعری بن چکی ہے اور آج غزل گوئی کے خلاف کوئی اہم آواز بلند نہیں سوائے جوشؔ کے جو آج بھی غزل کے شدید مخالف ہیں۔ لیکن جوشؔ کی رائے جذباتی ہے۔ ندیم نے غزل کے بارے میں لکھا ہے کہ

"غزل زندگی اور اس کے ماحول کی تمام خصوصیات کو اپنے اندر سمو کر ایک نہایت دل ربایانہ انداز میں ہمیشہ ہر دور میں لطیف خیال افروز اور پائیدار ادب پیدا کر سکتی ہے۔"

ندیم کے اس خیال کی قطعیت سے تو اتفاق نہیں کیا جا سکتا البتہ اس میں شبہ نہیں کہ غزل اپنی مقبولیت کی بنا پر آج بھی ایک خوش آفریں اور مفید صنف ثابت ہو رہی ہے اور ابھی ایک طویل مدت تک اپنی زندگی کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ ظاہر ہے معاشرہ میں بنیادی تبدیلیوں کے بعد ذہنیت اور مذاق میں تبدیلی لازمی ہے اور اس وقت اس کا امکان ہے کہ غزل اپنی زندگی کے تمام امکانات کھو بیٹھے۔

ندیم کی ابتدائی غزلوں میں اکثر دھیمے قدیم روایاتی رنگ ہے۔ پھر بھی ان غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں جذبے اور خلوص کی شدت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ہنگامہ برپا رہا ہے خیالوں کی بزم میں — تو نے دبی زبان میں جانے کہا ہے کیا
تاخیر کے سزاوار مجھے تو نہیں معلوم — کیوں کانپ رہے ہیں ترے ہونٹوں کے کنارے
بھلا یہ کون سی منزل ہے بے نیازی کی — کہ آج کل مرے ہونٹوں پہ ترا نام نہیں
نہ ڈالو عکسِ رخِ نازنیں میری آنکھوں پر — مجھے چراغ ہی اچھے انھیں جلاؤ نہیں
رہے نہ اب بھی طاق پہ شمعیں مگر کسی روز — نگاہِ شیر پرواں سے پروانہ بنے گا
مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری — مری موت سے نہ ہوگی مرے غم کی ترجمانی
تو میری زندگی سے بھی کترا کے چل دیا — تجھ کو تو میری موت پہ بھی اختیار تھا

یہ کلی چٹکی گلستاں میں ندیم! یا مرے احساس کی آواز ہے

آخری چند سال کی غزلوں میں مذہبی اور حکیمانہ انداز غالب نظر آتا ہے جو صاف طور پر اقبال کی غزل گوئی کا پرتو ہے۔

یہ میری بے صبری ہے کہ تیری بے خبری — مراجنوں عملی ہے، تری خرد نظری
ترے سفر کا مدعا، تیری خودی سے باوری — جم نہ سکے تری نظر، رک نہ سکے ترے قدم
بکھیرتا میں اپنے آنسوؤں کو آسمانوں پر — اگر مجھ کو تری آنکھ جنابی کی خبر ہوتی

ندیم کی ان ہی غزلوں میں ہمیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں آج کی زندگی اور موجودہ جدوجہد کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

یہ تری طفلانہ تعمیریں شکست انجام ہیں — اوس کے قطروں کو کرنوں میں پرونا چھوڑ دے
نقوش بیلیتے جلتے ہیں خونِ دہقاں کے — کہاں ہیں میرے زمانے کے مصور و بزاز
کانٹوں سے بچنے کی خاطر ہم نے اتنا وقت گنوایا — وہ ندی کس سان سے لپکی کہساروں میں راہ بنائے
بگولے رقص میں ہیں دشت کپکپاتا ہے — کس انقلاب کی اے راہرو خبر آئی ؟
انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے — سونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

اس دوسری غزل میں ہم ان مضامین کی زیادہ سے زیادہ توقع کرتے ہیں، کیوں کہ آج شاعری "الہام" پر نہیں بلکہ "شعور" پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ غزل میں حسن، عشق یا حکیمانہ خیالات کا بیان نہ ہونا چاہیے۔ حسن و عشق یقیناً غزل کا موضوع ہے اور رہے گا۔ اگرچہ ندیم کے اس خیال سے کہ "یہ موضوع انسانی زندگی کے نمایاں حادثات میں نمایاں ترین حیثیت رکھتا ہے۔" مجھے صرف اس کے "نمایاں ترین حیثیت" رکھنے سے اختلاف ہے۔ اس کے وجود اور اہمیت سے انکار نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ہمارا ذہنیت کے بجائے حسن و عشق کے بارے میں صحت مندانہ خیالات اور رجحانات کو غزل میں جگہ دیں۔ اسی طرح حکیمانہ غزلوں میں ہمیں اس حکمت سے احتراز لازم ہے جو زندگی کی رہبری کرنے کے بجائے خواب و خیال کی دنیا میں بھٹکاتی رہتی ہے۔

ندیم کی غزل ابھی پورے طور پر ترقی پسند رجحانات کی حامل نہیں ہے لیکن ندیم کا تدریجی اقدام یقیناً امید افزا ہے۔

غزل کے بعد ندیم نے غنائی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ندیم نے غنائی شاعری کو عشق و محبت کے فقروں تک محدود کر کے یہ بحث چھیڑی ہے اور اس کے برقرار رکھنے پر زور دیا ہے۔ تحریک کی ابتدا میں رومانی شاعری کو بیس پچیس سال تک انقلابی شاعری پر تمام تر توجہ صرف کرنے کا نعرہ اٹھایا گیا۔ اس سے غلط فہمی کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ درآنحالیکہ اس وقت بھی اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہمیں فی الوقت اپنے فن کو کلیتہً زندگی کی جدوجہد کے نام منسوب کر دینا چاہیے۔ ندیم نے خود بھی ایک مثال جلتے ہوئے روم میں نیرو کے بانسری بجانے کی دی ہے۔ بانسری کو سپرد آتش کر دینے کا سوال نہ اس وقت تھا نہ اس وقت ہے۔ رومانی شاعری کی اہمیت سے ترقی پسند تحریک منکر نہیں البتہ رومانی شاعری کے نام پر عشق و محبت کے مریضانہ رجحانات کے پھیلانے کی مخالفت ضرور کرتی ہے۔ ہر دور میں عشق و محبت کے اقدار بدلتے رہے ہیں گے۔ آج محبت کے بارے میں ایک بلیغ اور صحت مند نقطہ نظر کی ضرورت ہے جو ہماری رومانی شاعری کی بنیاد ہونا چاہیے۔ ایک بات اس جگہ غنائی شاعری کی اصلاح کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ غنائی شاعری کے دائرے کو عشق و رومان اور فطرت کے فقروں تک محدود سمجھا جاتا ہے جو درست معلوم نہیں ہوتا۔ زندگی کے عام مسائل اور انقلابی جدوجہد بھی غنائی شاعری کا موضوع بن سکتی ہے اور بنی ہے۔ عرف عام میں ہم جن نظموں کو انقلابی کہتے ہیں وہ بھی [illegible]

غنائی طرز پر کہی جا سکتی ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی تقسیم بنیادی طور پر صحیح نہیں۔ غنائیت کا تعلق انداز بیان سے ہے موضوع سے نہیں ندیم نے بھی غنائی شاعری کی اصلاح رومانی شاعری کے لئے ہی استعمال کی ہے لیکن رومانی شاعری ہی کہنا زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔

"جلال و جمال" کے دوسرے حصے میں ہمیں ندیم کی رومانی نظمیں ملتی ہیں۔ ندیم کی اس قسم کی ابتدائی نظموں میں گہری رومانیت ملتی ہے جس کی مثال "دعوت" ۱۹۳۷ء اور "ذرا سی بات" ۱۹۳۸ء وغیرہ ہیں جن میں شاعر اس دنیا سے دور ستاروں میں جا بسنے کی تمنا کرتا ہے۔ ان میں بہت کچھ اختر شیرانی کی رومانیت کا عکس نظر آتا ہے:۔

زندگی کی پستیوں سے بے خبر ہو جائیں ہم
نیلے نیلے اونچے اونچے کوہساروں میں رہیں
ہائے یہ سادہ، یہ گاتی ندیوں کا پیچ و خم
بجرے پھولوں کے بنائیں جو بہاروں میں رہیں
ان میں بھی جب روح اکتائے تو اے جانِ ندیم
اڑ چلیں اور آسمانوں کے ستاروں میں رہیں

(دعوت ۱۹۳۷ء)

۱۹۴۱ء کی بعض نظموں میں ندیم نے جو عشق و محبت کا تصور پیش کیا ہے وہ خالص مثالی یا افلاطونی ہے۔ مثلاً آخری سجدہ ۱۹۴۱ء جس میں محبوبہ زوالِ شباب کے بعد بھی اپنے بے وفا عاشق کو آخری سجدہ کرنے کا ارمان رکھتی ہے یا "ایک ہرجائی سے" ۱۹۴۱ء جو اگرچہ بڑے تاثرات کے ساتھ کہی گئی ہے لیکن عاشق کی بیوفا ذہنیت کی غماز ہے۔ اسی طرح "پرواز جنوں" ۱۹۴۱ء میں بھی مریضانہ عشق پایا جاتا ہے۔ محبوبہ "زرد دار و زمیندار" کے ہاتھ بک جاتی ہے اور عاشق اس اجڑے ہوئے قصر کے دیوانہ وار چکر کاٹتا رہتا ہے۔ جہاں انھوں نے پہلی بار پیمانِ وفا باندھا تھا۔ ندیم کی ایک نظم "شہر کی رانی" بھی ہے جو ۱۹۴۲ء کی کہی ہوئی ہے اور جو ان رومانی نظموں ہی میں شامل کی گئی ہے۔ ندیم اس کے حسن کے مداح ہیں لیکن اسے آوارہ سمجھتے ہیں۔ "تیری تعلیم کی بنیاد ہے آوارہ روی"۔ ندیم کا شہری تعلیم یافتہ لڑکیوں کے بارے میں یہ رویہ بڑا اقدامت گزیدہ ہے۔ انفرادی طور پر یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن اسے عمومی بنا دینا غیر قابل قبول ہی نہیں غیر مستحسن بھی ہے۔

لیکن آگے چل کر ندیم نے رومانی نظموں میں سماجی شعور کو بھی شامل کر دیا ہے اور جا بجا قدیم نظام اور اس کی کلی مشرقی روایات کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ "التماس" ۱۹۴۱ء اور "منور ظلمتیں" ۱۹۴۱ء اس کی مثال ہیں۔

کون یہ تجھ کو بتائے کہ یہ فرسودہ نظام
درحقیقت ہے ان اسلاف بداندیش کا کام
جن کا شہکار رہے تمیز شہنشاہ و غلام
حسن کو مذہب و ماحول کا مسکوم نہ کر
اپنے جلووں کو مری دید سے محروم نہ کر
عشق کے ننھے کماندار کو معصوم نہ کر

(التماس ۱۹۴۱ء)

ان رومانی نظموں کے حصے میں قابل ذکر نظمیں "منور ظلمتیں" ۱۹۴۱ء "شاہد ہرجائی" ۱۹۴۲ء "کون" ۱۹۴۳ء "جدائی کی پہلی رات" ۱۹۴۳ء اور "رات کی بات" ۱۹۴۳ء وغیرہ ہیں۔ "رات کی بات" میں تخیل کی نہایت لطیف اور حسین فسوں کاری پائی جاتی ہے۔ اس نظم کے ایک

دو بند سے ہی ندیم کی رومانی شاعری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میرے خوابوں کے دریچوں سے یہ کس نے جھانکا
نیند کی جھیل پہ یہ کس نے کنول پھیلائے
لال پوروں میں یہ آنچل کا کنارا تھامے
کس نے پائل کے دھرتال پہ دوہے گائے

سوئی سوئی سی یہ آنکھیں ہیں دھوئے سپنے
خلوتِ دل میں چھپا رکھتے ہیں جن کو فنکار
مرمریں گالوں پہ مدھم سے شفق رنگ دیئے
جو چمکتے ہیں خیالوں کی ندی کے اس پار
ان گنت نظروں سے بچتی ہوئی تو آئی ہے
اپنے شکرائے ہوئے دوست کا دل بہلانے
وہی عنوان ہیں کہانوں سی بھجوؤں میں مستور
مجھ سے جن پر ابھی لکھے نہ گئے افسانے

دھجیاں بن کے اُڑا مات کا بیراہن تار
تارے ٹکرائے خلاؤں میں، فضا چکرائی
میٹھی نیندوں کو کترتی ہوئی کرنیں لپکی
خون کا طشت لئے صبح کی دیوی آئی

ندیم کی رومانی نظموں میں فطرت نگاری کی گہری آمیزش ہے جو فطرت سے محبت (Love of Nature) کا بین ثبوت ہے ندیم کا ذہن آگہی اور اس کا حسین فطری ماحول ندیم میں فطرت سے محبت کو بیدار کرنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ ندیم نے اپنے وطن کے قدرتی مناظر کو پورے تاثر کے ساتھ دیباچہ میں سپردِ قلم کیا ہے چنانچہ ان کی شاعری میں فطرت نگاری بڑے رچے ہوئے انداز میں ملتی ہے۔ مثلاً

وہ نیلے نیلے آسماں پہ سنہری سنہری بدلیوں کے قافلے
وہ اونچی اونچی چوٹیوں پہ جنگلوں کے سلسلے ہرے بھرے
وہ سبز سبز کھیتیاں، وہ اونچے اونچے راستوں کی کروٹیں
وہ سوئی سوئی جھیل پر شعاعِ خور کی تابناک لرزشیں
وہ بکریوں کی اک قطار جا رہی ہے گھاٹیوں کی چھاؤں میں
وہ ڈھول کی صدا سنائی دے رہی ہے دور ایک گاؤں میں

(سپاہی کی واپسی ۱۹۳۹ء)

ندیم نے ایک باب اس فطرت نگاری کے لئے بھی وقف کیا ہے۔ ان کی ان نظموں میں دیہات کی زندگی کی جھلک بھی پورے طور پر موجود ہے بعض نظموں میں کسانوں اور چرواہوں کے دکھ درد کی طرف بھی اشارے کئے ہیں لیکن ان کی جدوجہد کا عکس ان میں کہیں نہیں ملتا۔

رومانی شاعری کے بعد ندیم نے انقلابی شاعری کی بحث اٹھائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی ابتدائی نظموں میں انقلاب توڑ پھوڑ اور گر جینے برسنے کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا لیکن جیسا ندیم نے خود بھی اعتراف کیا ہے "یہ جذبہ تخریب ..... یہ غم و غصہ ہماری برسوں کی محکومی کا جذباتی اور حسیاتی ردِ عمل ہے" آگے چل کر ندیم لکھتے ہیں "لیکن جب تک آئندہ کی تعمیر کا ایک منضبط لائحہ عمل ہمارے سامنے نہ ہو ہم صرف تخریب سے انسانیت کی کوئی خدمت انجام نہ دے سکیں گے" ندیم کا یہ کہنا بالکل درست ہے آج ہماری شاعری اس ابتدائی دور سے گذر چکی ہے اور جیسا ندیم نے خود لکھا ہے "نئے شعرا کا ایک پڑھا لکھا طبقہ جسے نفسیاتی، تاریخی اور جدلیاتی باریکیوں کا پورا شعور تھا آگے بڑھا اور اس کفندہ دہاں گروہ کو ایک ایسی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو گیا جو انھیں کھنڈروں سے نکال کر کھلی دنیا میں لے آئی" آج انقلاب کا سائنٹیفک تصور ہمارے ذہنوں میں ہے آج عملی جدوجہد اور طبقاتی شعور پر ہماری انقلابی شاعری اپنی بنیاد استوار کئے ہوئے ہے۔

ندیم نے اس سلسلہ میں انقلابی شاعری کی مذہب دشمنی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ مذاہب نے مختلف ادوار میں انسانیت کی بڑی عنید خدمت انجام دی ہے اور زندگی کو زندگی سے ہٹا کر انسانیت کا احترام سکھایا ہے لیکن مذہب کو بجائے ذریعے کے مقصد قرار دینا یقیناً نادانی ہے۔ انقلابی شاعری نے جو آواز بلند کی وہ حقیقت میں مذہب کو مقصد قرار دے لینے کے خلاف تھی یا مذہب کے نام پر اندھی موہوم پرستی کی مخالفت میں۔ رہا خدا سے بیر، تو یہاں بھی خدا کے اس روایتی تصور سے انحراف مقصود تھا جو کٹر ملاؤں کی ذہنی تخلیق ہے۔

ندیم نے اس بحث کو جاری رکھتے ہوئے آگے لکھا ہے کہ "مادہ کی قوت مسلم لیکن مادہ کی تکوین و تعمیر کے پس پردہ جو ایک غیر محسوس حسن کار فرما ہے اس سے ایک شاعر قطعاً منکر نہیں ہو سکتا۔" ندیم کے اس جملے میں سب سے پہلے حسن کے ساتھ غیر محسوس کی صفت کھٹکتی ہے۔ پھر اس کے باوجود یہ بات کسی طرح لازم قرار نہیں پاتی کہ اس عالم گیر حسن کو خدا کے روایتی تصور سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ ندیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ "الحاد کی گرم بازاری ہمارے ہاں صحیح فکری شاعری کی کمی کا نتیجہ ہے" لیکن مذہبی عصبیت بھی تو صحیح فکری شاعری پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اقبال نے فکری شاعری کی ابتدا کی مگر ندیم اس بات کو نظر انداز کر گئے کہ اقبال کی مذہبی عصبیت ہی نے ان کے مفکرانہ خیالات میں بہت سی خامیاں بھی پیدا کر دیں۔ انسانی ارتقا میں مذہب کا ادارہ ایک ایسے خطہ راہ کا حکم رکھتا ہے جس سے انسانیت کا قافلہ گزر رہا ہے لیکن وہ منزل کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

آیئے پہلے ندیم کی ان نظموں پر نظر ڈالیں جن میں مذہبی رنگ یا حکیمانہ انداز جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں جلال و جمال کے پہلے حصہ میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس حصہ کی ابتدائی نظموں میں اقبال کا اثر ملتے ہیں۔ مثلاً:۔

مٹا مٹا کے بنایا جسے زمانے نے — کتابِ عشق کا وہ حرفِ دلپذیر ہوں میں
تڑپ تڑپ کے چمکنے کے راز مجھ سے پوچھ — کہ آسماں کے ستاروں کا ہم سفیر ہوں میں

(مرد خود شناس ۳۸ ۶)

جسے تہذیب حاضر نے نکالا اپنی محفل سے — پھر اس جوشِ جنوں کو دین و ایماں کر دیا میں نے
غرض احساس کی قندیل کو سینے میں بھڑکا کر — پھر اس بجھتے ہوئے انساں کو انساں کر دیا میں نے
مگر باایں ہمہ اسلاف کی تاریخ کہتی ہے — کہ اپنی خانماں سوزی کا ساماں کر دیا میں نے
گناہے گناہی ۴۰ ۶

کسی کو مل نہ سکی بارگاہِ ناز تری — مگر ازل سے اسی کی تلاش جاری ہے
فقیہہ شہر کا اصرار ہے کہ یہ مستی — فقط فسردہ خیالی کی سحر کاری ہے

خدا وہ کیا ہے سمجھ لے جسے حقیر ادراک — کہاں عزو کی اڑانیں، حریم ذات کہاں
کہاں وہ زندہ و پائندہ حسن لاتحدود — مرے خیال کے دھندلے تاثرات کہاں

(تذبذب ۴۲ ۶)

یہ حکیمانہ انداز ان ہی یونانی فلسفوں کا مرہون منت ہے جو اکثر و بیشتر مذہبی عقائد سے فیصلہ شکار ہو گئے ہیں اپنی نظم "عرفان" میں ندیم جس حکمت کو پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے:۔

تجھے جہان میں جب کچھ نظر نہ آئے گا
ترا حبیب ترے دل میں مسکرائے گا

مشیت کے سامنے انسان بے بس اور مجبور ہے یہ خیال ندیم کی کئی نظموں کی بنیاد ہے۔ "وقت کا چکر" ۴۴ء اور "آخری دن" ۴۴ء میں مشیت کے روبرو شاعر سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ بعض جگہ مشیت اور ادراک کی پرانی الجھن کا شکوہ سنج ہوتا ہے۔ مثلاً "یا جناں کن یا چنیں" میں، اور اس کشمکش سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن کس طرح ؟۔۔۔

اب تمنا ہے کہ مٹ جائے تذبذب کی خلش — جی میں جو آئے وہی آخری منزل ہو جائے
امنیات سے آزاد ہو احساس لطیف — حل کچھ اس طرح مرا عقدۂ مشکل ہو جائے
یا تو اک نشہ سا چھا جائے زمانے بھر پر — زندگی وقت کے قانون سے غافل ہو جائے
یا ستاروں میں جہنم کے دریچے کھل جائیں — آسماں دہر کی تخریب پہ مائل ہو جائے

اسی طرح اپنی مختصر نظم "رازِ حیات" ۴۴ء میں شاعر بتاتا ہے کہ رازِ حیات کھل جانے سے نسلِ آدم عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔

نسلِ آدم عذاب کیوں سہتی
زندگی راز ہی اگر رہتی
زندگی راز ہی سہی ہمدم

لیکن یہ بڑی بات ہے کہ آگے چل کر ندیم نے اس قسم کی فلسفہ طرازی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اسی جبری فلسفہ کے بارے میں کہتا ہے:۔

فلسفہ میں ہے اُن روح کے ناسوروں کی — جن کو رہتا ہے سدا جبرِ مشیت کا گلا
فلسفہ ہو کہ ہے ادراک کے ان زخموں کی — فیلسوفوں سے کبھی جن کا مداوا نہ ہوا

"کوہ میں" ۴۴ء میں بھی ندیم کا چونکا ہوا شعور ہمارے سامنے آتا ہے

نہ تدبیر سے مقدر کو غرض — نہ مشیت سے مرا یارانہ
کب تک احساس کو محصور رکھے — خشک اسرار کا تانا بانا
مصلحت یہ ہے کہ تخلیق کروں — نئے سے نوش، نیا میخانا

مژدہ اے عالمِ نو کے خوابو! — مائلِ خیز ہے انساں کا شرف
دل کی دھڑکن وہ نشیبوں سے اٹھی — محوِ پرواز ہے تاروں کی طرف
گردشِ چرخ خبردار رہے — اب مرا عزم ہے تقدیر بکف

اس حصے میں "یوٹوپیا" ۴۳ء "واپسی" ۴۴ء "عزم و عمل" ۴۴ء اور "میری زمین" ۴۴ء قابلِ ذکر نظمیں ہیں جن میں فکر ملتا ہے۔ اگرچہ ان میں بعض بعض اشعار بے محل معلوم ہوتے ہیں مثلاً یوٹوپیا میں یہ شعر:۔

بھی خاکسترِ ماضی میں نہاں ہے وہ گہر ابھی دورِ زیخ کا تصور ہے وہ فردوسِ نظر

یہ ٹوپیا کا تخیل مستقبل سے وابستہ ہے، خاکسترِ ماضی میں اس کا نہاں ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ سرے سے فردوسِ نظر کہنا بھی نہیں جچتا، اور نہ وہ دورِ زیخ کا تصور ہو سکتا ہے برخلاف اس کے وہ تصورِ جنت ضرور ہے

چوتھے حصے میں سماجی مسائل اور انقلابی جد و جہد سے متعلق نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں بھی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۶ء تک کا انتخاب ہیں، جن میں چند ایک ابتدائی نظمیں بھی فکر و نظر کے اعتبار سے کمزور ہیں مثلاً "مستی" ۱۹۳۷ء میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر مستی کی رسم کو مثال قرار دے رہا ہے، جبکہ اسے ایک "دلکشا ہوا فردوس" نظر آتی ہے

"کچھ تو کر" ۱۹۴۱ء میں شاعر دعاؤں کے ذریعے عالم میں تغیر و تبدل کا خواب دیکھتا ہے اور اگر یہ خدا کو منظور نہیں ہے تو شاعر چاہتا ہے کہ اس کا احساس اس سے چھین لیا جائے:۔

یہ بھی نہیں منظور تو اے عبدالطاف احساس مرا چھین، مجھے خاک بسر کر

"تاریخ بلٹا کھائے گی" ۱۹۴۳ء میں ندیم اس شعر پر نظم ختم کرتے ہیں:۔

تاریخ بلٹا کھائے گی ماضی بنے گا حال سے

تاریخ کا یہ تصور بے معنی ہے۔ حال ماضی پر اپنی بنیاد ضرور رکھتا ہے لیکن حال سے ماضی کی تخلیق نہیں ہوا کرتی۔ تاریخ کا اپنے آپ کو دوہرانے کا تصور علمی طور پر اصولِ ارتقا کے خلاف ہے۔

"آہستہ کا موڑ" اچھی نظم ہے لیکن آخری بند میں کہاں تو شاعر یہ کہتا ہے کہ:۔

جب اپنے قصر میں اپنا دیا جلاؤں گا جب اپنے کھیت کا پھل آپ ہی اٹھاؤں گا

اور کہاں تان اس پر ٹوٹتی ہے:۔

خیال و خواب کی دنیا میں لوٹ جاؤں گا

اس حصہ میں بعض اچھی نظموں میں کہیں کہیں اظہار و بیان کی خامی نے مفہوم کو گہنا کر دیا ہے۔ مثلاً "نظامِ نو" جو اس مصرع پر ختم ہوتی ہے۔

یہ تو پہچانی ہوئی صورت نظر آنے لگی

اس سے ذہن الجھن میں پڑ جاتا ہے کہ کہیں نظامِ نو سے تجدید و قدامت کو تو نہیں کہا گیا یا نیا منصوبہ ۱۹۴۲ء میں مزدور گو نئے منصوبہ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن جب شاعر مزدور کی طرف سے کہتا ہے

اس دورِ غلامی میں آخر
کچھ کام نہیں، کیا کام کروں
دکھتے ہیں قدم مُکتے ہیں قدم
گو منزل و فرسنگ نہیں

تو معلوم نہیں ہوتا کہ اس نئے منصوبہ کی خوبی بیان کی جا رہی ہے یا عملی زندگی میں اس کی کوتاہی کا اظہار کیا جا رہا ہے

یا "نئی بغاوت" ۱۹۴۶ء کا خاتمہ شاعر کے مفہوم کی وضاحت نہیں کرتا ہے

ایک بار اور بھی لوٹے گا عناصر کا جمود　　ایک بار اور پھر آدم کو ملے گا بن باس
ایک بار اور بھی شیطان کی بغاوت ہوگی　　ایک بار اور بھی بکھرے گا رموزِ شناس

اس حصہ میں ان نظموں کے علاوہ ندیم کی بہت سی کامیاب نظمیں بھی ہیں مثلاً "نیا ساز نئی تان" ۱۹۴۶ء جس میں شاعر آوارہ اور مایوس انسان کو نئے دور کی بشارت سناتا ہے۔

لیکن اب روح زمانے کی ہے طوفاں بکنار
کٹ کے گر جائیں گے بھر دو بر پہ
اندھے بوسیدہ عقیدوں کے سر
کون کہتا ہے کہ بھرپور نہیں وقت کا وار

اپنی مایوس جوانی کی کہانی نہ سنا
یہ حزیں عہد ہے جلنے والا
اک حسیں دور ہے آنے والا
نئے ساز کی آمد ہے، نئی تان اٹھا

"نئی صبح" ۱۹۴۳ء میں شاعر اس نئے دور کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ "حریتِ فکر" ۱۹۴۳ء میں شاعر اپنی مجبوری اور اپنے سمٹے ہوئے ماحول کے رشتہ کو سمجھ لیتا ہے اور صدیوں کے دھندلکوں سے پرے جلنے کا عزم اس کے دل میں بیدار ہوتا ہے۔

روشن اذہان کی تسکین ہے مقصود اپنا　　نہ مجھے خطرۂ تاخیر نہ شوقِ تقدیم
یہ کہیں حریتِ فکر کی آواز نہ ہو　　قصرِ فردا سے مجھے کون بلاتا ہے ندیم

اپنی نظم "معاصر سے" ۱۹۴۳ء میں ندیم کا شعور بے اصل اور نمایاں طور سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بغاوت کا عزم اور انقلابی جد و جہد کا خروش پورے آہنگ سے سنائی دیتا ہے

ذہن میں منزلِ معین ہو تو جچتا ہے سفر　　ہر قدم پر دور نہ رکتی ہے تھکن کی ہے نظر
گو بہت مدہوش کن ہوتے ہیں منزل کے مزے　　زندگی کو زندگی کہتا ہے عرفانِ حیات

ہم نے ایسے وقت میں تھاما بغاوت کا علم　　جب جلا لیتا ہے قندیلِ عمل صدیوں کا غم
ہم نے ایسے وقت میں جانچے ہیں خطرے کے محل　　نوجواں جب زر کے بدلے آگ کرتے ہیں قبول
چھٹ گئی ہیں یک بیک اوہام کی دھندلاہٹیں　　آ رہی ہیں ہر طرف سے زندگی کی آہٹیں

"شکست و ریخت" ۱۹۴۴ء میں ان ہی انقلابی عزائم کی گرج سنائی دیتی ہے۔

میں کہاں، یہ نظامِ خام کہاں　　کیوں نہ رسمِ جہاں جلا ڈالوں

تیر اگر چھوٹے ہوئے ترکش میں ہیں یہ پرانی کمان بدل ڈالوں

یا ندیم کی نظم "شفق" ۱۹۴۴ء جس میں ندیم نے شہنشاہیت کے زوال اور اشتراکیت کے طلوع کو پیش کیا ہے

اک نئے دور کا پرتو ہے افق کی لالی اک نئے حسن کی خاطر یہ حنا بندی ہے
ایک ہی سطح پر اترے ہیں نشیب اور فراز اب کسی انسان کو دعوائے خداوندی ہے

یا پھر اس کی مختصر مگر حسین نظم "عقیدے" جس میں ماضی کے تاریک اوہام اور باطل عقیدوں کو ختم کر دینے کی دعوت دی گئی ہے۔

اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

کون نکلے گا کہاں نکلے گا
بیکراں رات تلے نابود
چاند ابھرا ہے کہاں ابھرا ہے
اک فسانہ ہے تجلی کی نمود
کتنے گنجان ہیں، اشجار بلند
کتنا موہوم ہے آدم کا وجود

مضمحل چال، قدم بوجھل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

مجھ کو سوجھی ہے نئی راہِ فرار
آہن و سنگ و شرر برسائیں
آؤ اشجار کی بنیادوں پر
تیشہ و تیغ و تبر برسائیں
اک تسلسل سے ہم اپنی چوٹیں
بے خطر بارِ دگر برسائیں

ذہن پر چھائے ہیں کیوں بادل سے
اپنے ماضی کے گھنے جنگل سے

نوعِ انساں کو نکلنا ہوگا
ان اندھیروں کو نکلنا ہوگا

ندیم کی ان نظموں میں ترقی پسندانہ تفکر بکھرا ہوا ملتا ہے، اور شاعر فکر و شعور کی بلندیوں تک پہونچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ندیم نے دیباچہ میں لکھا ہے "میں ممکن ہے کہ آگے چل کر جب میرے مشاہدہ و مطالعہ میں مزید وسعت پیدا ہو تو ان تغیرات میں سے اکثر کی صورت بدل جائے۔ یہ یقین کی ظاہری یا عدم اعتمادی نہیں بلکہ تیزی سے بڑھتی ہوئی زندگی کا تقاضا ہے" ندیم کا یہ احساس خام نہ تھا۔ تیزی سے

بڑھتی ہوئی زندگی نے ندیم کے نظریات کو بھی تیزی سے آگے بڑھا دیا ہے اور آج ۱۹۵۷ء میں ندیم کی شاعری جلال و جمال سے بڑھ کر ۱۹۴۶ء تک کی نظموں میں آگے بڑھ چکی ہے۔ آج اس کی شاعری میں طبقاتی شعور اور مفکرانہ بلوغیت پیدا ہو گئی ہے۔ ندیم میں اس کا احساس پہلے سے موجود تھا جس کا اظہار اپنے دیباچہ میں اس طرح کیا ہے "اس دور میں زندگی کی جدلیات کا عرفان اور تاریخی شعور نگار کے لئے از بس ضروری ہے۔ انسانی زندگی پر سیاسی اثرات اس درجہ بے پناہ ہیں کہ ان سے اغماض برتنا زندگی کی قوت و حرکت سے انکار کرنا ہے۔"

جلال و جمال کو پڑھنے کے بعد ندیم کی شاعری کی چند نمایاں خصوصیات ذہن میں ابھرتی ہیں۔ پہلی چیز موضوعات کا تنوع ہے۔ شاعری کو یقیناً اتنا ہی وسیع ہونا چاہیئے جتنی خود زندگی وسیع ہے لیکن اس کے لئے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ شاعر کا ایک وسیع اور متعین نقطہ نظر ہو، اس کے بغیر شاعری ذہنی آوارہ گردی بن کر رہ جائے گی

ندیم کا مشاہدہ بھی بہت تیز ہے جس سے انھوں نے اپنی شاعری میں پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ مشاہدہ شاعری کی بڑی اہم شرط ہے۔ نئی تشبیہیں اور استعارے اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ مشاہدہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ندیم حقیقت نگاری کے مسئلے پر آتے ہیں لکھتے ہیں۔ "ہو بہو عکاسی اور بیان کی الوہی صداقت میں بہت بڑا فرق ہے اور شاعری میں صرف عکاسی کام نہیں دیتی یہ الوہی سچائی اس عمق کی طرف اشارہ ہے جو ہر پائیدار ادب کی جان ہے۔" حقیقت نگاری ادب میں مختلف منزلیں طے کرتی آئی ہے۔ ایک دور میں حقیقت نگاری ہو بہو عکاسی ہی کے مترادف رہی ہے۔ آگے چل کر حقیقت نگاری نے تجزیہ و تحلیل کو اپنایا اور پھر ایک قدم آگے بڑھ کر انسانیت کی رہبری بھی اپنا مقصد قرار دے لیا۔ بیان کی الوہی صداقت سے ندیم کی کیا مراد ہے۔ صرف یہ کہدینے سے کہ اس عمق کی طرف اشارہ ہے جو ہر پائدار ادب کی جان ہے کچھ واضح نہیں ہوتا۔ الوہی صداقت کی اصطلاح ہمارے ذہن کو خواہ مخواہ Idealism کی طرف بھٹکاتی ہے۔ ہر صداقت اخلاقی جہد و عمل کا مادی نتیجہ ہے، اور اس سے اضافی رشتہ رکھتی ہے۔ صداقت کے ساتھ الوہی کی صفت تو بالکل غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔

ندیم کی شاعری کی ایک اور خصوصیت جمالیاتی احساس کی فراوانی ہے۔ جمالیاتی احساس بھی بڑی اہم چیز ہے۔ شاعر جب زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کو موضوع شعر بناتا ہے تو اس کا تخیل ان میں جمالیاتی عنصر کو بھی شریک کر لیتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم شعریت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ پھر حسن بیان کی بھی اہمیت ہے۔ ان دونوں عناصر کی ترکیب سے صناعت یا فن کارانہ باکمپن پیدا ہو جاتا ہے اور بقول ندیم شاعری حقیقت نہیں حقیقت کا نگار بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ندیم کے کلام میں ہمیں پوری شعریت ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات الفاظ کے انتخاب میں ندیم بے احتیاطی برت جاتے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا صوری مجروح ہو جاتا ہے مثلاً

میں نے لتھڑے ہوئے کیچڑ میں قمر دیکھے ہیں

اس ضمن میں ندیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہماری شاعری میں مشرقیت ہونا ضروری ہے لکھتے ہیں "مشرقیت سے میرا مطلب رواج پرستی اور تمدنی فرسودات کا تحفظ نہیں بلکہ مشرقی ماحول ہے۔ ترقی کرتا ہوا مشرق، قدامت کی کچلی آتا ہوا مشرق، اپنے حقوق خود اختیاری کے احترام میں مغربی قوتوں سے ٹکرا جانے والا مشرق، چونکا اور سنبھلا ہوا مشرق" ندیم کے اس خیال سے کسی کو مخالفت نہیں ہو سکتی ندیم نے موجودہ ادب میں مشرقیت کی کمی کی وجہ "تعلیمی موثرات" کو قرار دیا ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ دراصل ہم مشرقیوں کو سب سے اول مشرقی علوم کی ضرورت ہے "کچھ جذباتی معلوم ہوتا ہے۔ آج علوم کی تقسیم مشرق اور مغرب کے اعتبار سے نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ادب میں مشرقیت کی کمی کا یہ علاج ہے۔ بلکہ دراصل ہمارے نوجوان ادیب اور شاعر اپنے قدیم ادبی سرمایے سے بے خبر ہیں اور قدیم ادبی علوم

کا گہرا مطالعہ ہی ہمارے جدید ادب میں شعریت کو زندہ اور برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔

ندیم نے ایک آخری بحث مواد اور ہیئت کے بارے میں بھی اٹھائی ہے اور بہت سلجھے اور ستھرے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ادب میں مواد اور ہیئت کی تبدیلیاں ہوتی آئی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی رہی ہیں۔ ندیم نے خود بھی مصرعوں کی مختلف ترتیب سے نئی ہیئت کے تجربے کئے ہیں۔ ان کی نظمیں "ممکن" "وحدت" "احساس" "ادراک" "ماہتاب فردا" اس کی مثالیں ہیں۔ اسی سلسلے میں ندیم نے نظم آزاد اور نظم معریٰ پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ندیم نے جب کہ وہ دیباچہ میں اعتراف کیا ہے سنہ ۴۲ء سے قبل بھی نظم آزاد لکھی ہے لیکن وہ مجموعے میں شامل نہیں کی۔ آج ہمارے ادب میں یہ اصناف اپنا مقام بنا رہی ہیں۔ گو بقول ندیم "پابند شاعری کی وجہ سے ہمارے ادب میں وہ تازگی اور لہلہاہٹ ہے جو اب تک آزاد شاعری میں پیدا نہ ہو سکی لیکن جس کا امکان ضرور ہے" ندیم کا یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ ابھی تک اس میں "پچانوے فی صدی غیر شاعری کی گئی" اور اشاریت کی دھن میں ہمارے شاعر ابہام کا شکار ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشاریت کے ساتھ ساتھ ناقص ابہامی بیدار قیاس استعارات، ایجاز و اختصار کی شوخت، قدرت بیان کی کمی، یہ اور کئی اسباب آزاد شاعری میں ابہام کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بھی آج اس صنف شاعری میں اچھی نظموں کی تخلیق کی جا رہی ہے جو صلاحیت

اس صنف میں ہے نظم معریٰ میں کامیاب چیزیں پیش کی ہیں خصوصاً ان کی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" جس کا زیادہ حصہ نظم معریٰ میں ہے۔ خود ندیم نے اس صنف میں کامیاب تجربے کی ہیں جو اس مجموعہ کے بعد کی چیزیں ہیں۔ ندیم نے نظم معریٰ میں دو مصرعوں کو شعوری طور پر ہم قافیہ بھی بنایا ہے جس سے یقیناً ایک خوشگوار آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ فی الحقیقت اس کی ضرورت ہے کہ ان تمام نئے ادبی تجربات کو سامنے رکھ کر نظم آزاد اور نظم معریٰ کے بارے میں اصول مرتب و منضبط کئے جائیں تاکہ جو بے راہ روی عام ہو گئی ہے اسے عنان دی جا سکے۔

آخر میں ندیم نے جلال و جمال کے دیباچہ میں لکھا ہے "آپ کو میرے مقاصد کے واضح خطوط جگہ جگہ نظر آ جائیں گے۔ میں ان خطوط کو واضح تر اور ان مقاصد کو روشن تر اور بلند تر کرنے میں کسی قسم کے قابل سے کام نہ لوں گا۔" ان چار سال کے عرصہ میں فی الحقیقت ہم نے دیکھا کہ ندیم نے اپنی شاعری اور اپنے فن کو واضح اور مکمل بنانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ ندیم آج ہماری اردو شاعری کے صف اول کے شاعروں میں اپنا مقام بنا چکا ہے۔ ندیم کی شاعری آج جو درجہ حاصل کر چکی ہے اس کے پیش نظر جلال و جمال پر خود ندیم کا ایک مصرعہ ایک حد تک صادق آتا ہے:۔

ترے ندیم کا سایہ ہوں میں ندیم نہیں

پرکاش پنڈت کے افسانوں کے افراد متوسط طبقے کی کائیاں ہیں جنھیں یہ سلجھا ہوا افسانہ نگار متوسط طبقے کے پریشان کن سوالات حل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہر ذہین افسانہ نگار اور ادیب کی طرح پرکاش پنڈت نے اپنے سماجی تجربے، ماحول اور ذہنی کاوش سے اس سماجی شعور کو پا لیا ہے جس کے بغیر موجودہ سماج کے تکلیف دہ سوال کسی طرح حل نہیں ہو سکتے اسی لئے ان کے افسانے حیات افروز ہوتے ہیں ——— (کرشن چندر)

میراث

ایک تہذیبی امانت ———

جسے ماضی کے عوام نے اپنی جمہوری روایات سے بھرپور کیا

جسے حال کی عوامی جدوجہد نے توانائی اور چمک بخشی

اور ——— جسے پرکاش پنڈت آنے والے دور کو سونپتا ہے

قیمت تین روپے

مکتبۂ شاہراہ دہلی

سردار جعفری

تہذیب

بمبئی میں ۲۸ مارچ سے ۳۱ مارچ تک ایک عجیب و غریب کانفرنس منعقد ہوئی جس کا مقصد "تہذیب کی آزادی کے لئے جد و جہد" بیان کیا گیا لیکن اصل مقصد تھا:۔

۱۔ امریکہ کے جنگی مقاصد کے لئے فضا کو سازگار بنانا اور تیسری جنگ کا پروپیگنڈا کرنا۔

۲۔ سوویت یونین اور کمیونزم کو گالیاں دینا۔

۳۔ پنڈت نہرو کی بیرونی پالیسی اور امن کی کوششوں کی مخالفت کرنا۔

اس کانفرنس میں یہ سوال اٹھا کہ تہذیب کو اصل خطرہ کمیونزم سے ہے یا جنگ سے (ساماراج کا نام کسی نے نہیں لیا) اور فیصلہ یہ ہوا کہ اصل خطرہ کمیونزم سے ہے۔ اور بعض حضرات نے یہ بھی کہہ دیا کہ "اگر جنگ اور کمیونزم میں انتخاب کرنا ہو تو جنگ بہتر ہے"۔

پنڈت نہرو کی امن کی کوششوں کا مذاق اس حکایت کی شکل میں اڑایا گیا کہ ایک بکری ہے اور ایک بکری کا رکھوالا اور ایک بھیڑیا جو بکری کو کھا جانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لڑائی بھیڑیئے اور رکھوالے میں ہوگی۔ کیا ایسی صورت میں بکری یہ کہہ سکتی ہے کہ میں غیر جانبدار رہوں۔ گویا روس بھیڑیا ہے، امریکہ رکھوالا اور ہندوستان بکری۔

اس کانفرنس کے روحِ رواں مسانی تھے۔ افتتاح حکومتِ ہند کے وزیرِ غذا منشی نے کیا۔ حالانکہ حکومت ہند نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کوئی سرکاری ملازم اس کانفرنس میں شریک نہ ہو۔ صدارت کے فرائض جے پرکاش نرائن نے انجام دیئے کانفرنس بند کمروں میں ہوئی جہاں کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندوستانی ڈیلیگیٹ نامزد کئے گئے تھے جن میں ہندوستان کے مشہور ادیب، شاعر، فنکار، سائنس داں، فلسفی کوئی نہیں تھے۔ باہر سے آنے والوں میں ایسے لوگ تھے جو امریکہ کے ہاتھوں بک چکے ہیں اور ایٹم بم کے حامی ہیں اور جنگ کے حق میں بیانات دے چکے ہیں۔ کانفرنس کے اخراجات کے لئے روپیہ کہاں سے آیا کسی کو معلوم نہیں۔ پبلک سے کوئی اپیل نہیں کی گئی۔ کوئی چندہ نہیں جمع کیا گیا۔ بعض ذمہ دار حلقوں کا خیال ہے کہ اس کانفرنس کے اخراجات امریکہ نے برداشت کئے ہیں۔

میری یہ تمہید رہا ہیاں اس کانفرنس کے متعلق ہیں جہاں ترقی پسند ادب اور مصنفین کو بھی گالیاں دی گئیں۔

(سردار جعفری)

رُباعیاں

تہذیب کے ہیں جمع پرستار یہاں
خود بیں ہے کوئی یہاں کوئی خود سر ہے
اور جنگ کا ہو رہا ہے پرچار یہاں
تہذیب کا یہ ریچھ ہے وہ بندر ہے
اسٹیج پہ جشنوں کے قاتل دیکھو
آنند[1]، کرشن[2]، اور رمن[3] کوئی نہیں
تہذیب لٹکتی ہے سرِ دار یہاں
نے جوش[4] یہاں ہے نے اودے شنکر[5] ہے

سانپوں کی طرح سے لمبی لمبی باتیں
نظروں سے ٹپکتی ہے رعونت دیکھو
باتوں میں ہزاروں اور لاکھوں گھاتیں
چہروں پہ برس رہی ہے لعنت دیکھو
اسٹیج پہ تہذیب کا سورج تو نہیں
ہونٹوں پہ کھنچی ہوئی ہے نفرت کی لکیر
پتلون پہن کے آگئی ہیں راتیں
تہذیب کے رکھوالوں کی صورت دیکھو

تہذیب کی کانگرس ہے کمروں میں بند
یہ ہند کی تہذیب کے رکھوالے ہیں
گھس سکتا نہیں جہاں کوئی دانشمند
پھوڑوں کی طرح سڑے ہوئے چھالے ہیں
چوروں کی طرح سے سازشیں کرتے ہیں
بارود کا منہ پہ مل کے غازہ نکلے
امریکہ کی تہذیب کے جنگی فرزند
کچھ شرم نہیں ہے منہ اگر کالے ہیں

[1] ڈاکٹر ملک راج آنند۔ [2] کرشن چندر۔ [3] مشہور ہندوستانی سائنسداں۔ [4] جوش ملیح آبادی۔ [5] ہندوستان کا مشہور ناچنے والا۔

ہے روس سے ان کو کیوں گلہ کیا کہیئے
امریکہ سے ان کو کیا ملا کیا کہیئے
جیبوں میں ہیں ڈالر کے کھنکتے سکّے
تہذیب نوازی کا صلہ کیا کہیئے

گر زخم کوئی مجھ کو نظر آتا ہے
فنکار ہوں میں دل مرا بھر آتا ہے
پر راہوں میں جب بہتا ہے انساں کا لہو
تہذیب کا حُسن کچھ نکھر آتا ہے

منشی کو دعائیں دو کہ ہو عمر دراز
منشی نے کیا ہے فاش ہم پر اک راز
امریکہ سے آرہا ہے گیہوں جیسے
تہذیب کے بھی وہاں سے آئینگے جہاز

تہذیب کا آج بول بالا دیکھو
آزادی کا بن گیا شوالہ دیکھو
ہر گام پہ سامراجی فوجوں کے پڑاؤ
مشرق کے گلے میں کنٹھ مالا دیکھو

گر امن کی ہند میں حمایت ہوگی
نہرو سے مسانی کو شکایت ہوگی
گر جنگ کو تہذیب کہیں گے ہم لوگ
امریکہ کی ہم سب پہ عنایت ہوگی

ہر بستی کو پہلے بم سے برباد کرو
اُجڑے ہوئے گھر میں بھوت آباد کرو
انسان کے روح و دل کو زنجیر پنہاؤ
اس طرح سے تہذیب کو آزاد کرو

آڈن[1] نے کہا شاعر و فنکار ہیں ہم
اور حُسن کے خیر کے پرستار ہیں ہم
جلتے ہوئے کوریا کے کھنڈروں نے کہا
دیکھو ہمیں تہذیب کے شہکار ہیں ہم

آزادیٔ تہذیب کے یوں جشن منائیں
کوئل، بلبل، پپیہے سب چُپ ہوجائیں
ٹاپوں سے گدھے بجائیں طبلہ، بھینسیں
سو ناز و ادا سے ناچیں، کوّے گائیں

[1] انگریزی شاعر جو اب امریکی شاعر بن گیا ہے

جبشی کو وہ سولی پہ چڑھا دیتے ہیں
شعروں کی کتابوں کو جلا دیتے ہیں
برساتے ہیں بم اور لگاتے ہیں آگ
تہذیب کا معیار بڑھا دیتے ہیں

تہذیب کی داستان دہرانی ہے
تہذیب کی اصل ہم نے پہچانی ہے
بھوکے ہیں اگر آپ تو بھوکے رہیئے
تہذیب تو اک غذائے روحانی ہے

تہذیب کا نام لے کے بہلاتے ہیں
آئینہ بہت دُور سے دکھلاتے ہیں
تہذیب کا ذکرِ خیر کرتے کرتے
تہذیب کے معماروں کو کھا جاتے ہیں

فانوس کو پروانوں سے آزاد کرو
میخواروں کو میخانوں سے آزاد کرو
تہذیب کے رکھوالوں کا نعرہ یہ ہے
تہذیب کو انسانوں سے آزاد کرو

زخموں سے چمن بناؤ تہذیب ہے یہ
آنچل کا کفن بناؤ تہذیب ہے یہ
جنگوں نے اُجاڑ ڈالے ہیں ملک اگر
قبروں میں وطن بناؤ تہذیب ہے یہ

سکّوں میں جو بک جائے وہ تہذیب نہیں
محلوں میں جو اِترائے وہ تہذیب نہیں
میراث نہیں گِنے ہوؤں کی تہذیب
انساں سے جو کترائے وہ تہذیب نہیں

سینے پہ اگر ہیں ٹینکوں کے پہیے
تہذیب سے کام لیجے، کچھ مت کہیئے
تہذیب تو روح و دل کی آزادی ہے
تہذیب کا نام لیجے اور مر رہیئے

دھرتی کو چمن بنا دیا ہے ہم نے
سوتا جاگا دیا ہے ہم نے
تہذیب میں کچھ کہو ہمارا بھی ہے حق؟
تہذیب کا گھر سجا دیا ہے ہم نے

تہذیب سے دور رہ سکیں گے نہ عوام
تہذیب ہے انساں کی بزرگی کا نام
تہذیب کے گل چمن چمن کھلتے ہیں
تہذیب تو ہے بادِ بہاری کا پیام

تہذیب کا حسن امن کے گیت میں ہے
کھیتوں کی لہک کلوں کے سنگیت میں ہے
نفرت میں لڑائی میں نہیں ہے تہذیب
تہذیب کا راز پریم کی جیت میں ہے

روٹی بھی ہے، کپڑا بھی، کتب خانہ بھی
تصویر بھی، شاعری بھی، افسانہ بھی
انسان کی ناپ تول کرنے کے لئے
تہذیب ہے اک وزن بھی، پیمانہ بھی

چھلکے تو مے و ساغر و مینا بن کر
لپکے تو حیاتِ نو کا شعلہ بن کر
ساحل پہ رہے کوئی نہ پیاسا ہرگز
تہذیب ہے وہ بہے جو گنگا بن کر

تہذیب ہے ماں کا پیار، بچوں کی خوشی
آنچل کی حسیں بیل، کرتوں کی کلی
گیسو کی مہک ہے، ابروؤں کا جادو
تہذیب ہے انکھڑیوں کی خاموش ہنسی

فردوسی و حافظ کو پڑھیں سب انساں
وِھٹ مین کی شاعری پہ چھڑکیں ہم جاں
تہذیب یہ ہے کہ عام ہو جائے بہار
ٹیگور کے گیت گائیں تاجیک کساں

تہذیب یہ ہے کہ کوئی غمناک نہ ہو
پاکیزہ ہر ایک شے ہو ناپاک نہ ہو
پامال نہ ہو خاک کسی بستی کی
انساں کا گریبان کہیں چاک نہ ہو

آزادی سے چلتی ہے ہوا چلنے دو
تہذیب کی شاخ پھولنے پھلنے دو
بکھرا ہے [illegible] کا رنگ محفل محفل
ہر رنگ میں شمع زندگی جلنے دو

لہ امریکہ کا قومی شاعر جو انیسویں صدی میں ہوا۔

جمہور

ظہیر کاشمیری

اک نجومی نے کہا خاک نشینو! جاگو!
قبۂ ماہ سے آیا ہے پراسرار پیام
ان گنت دیوتا محراب فلک میں بیٹھے
ڈھالتے رہتے ہیں سیارۂ آدم کا نظام

اک مفکر نے کہا، جہل کے مارو! آؤ!
پا لیا میں نے خلاؤں کی حقیقت کا سُراغ
نورِ تنویر سے ہی ارض و سما روشن ہیں
اور اسی نور سے جگمگ ہیں گے ضمیروں کے چراغ

اک مجوسی نے کہا، شعلہ و ظلمت ہیں قدیم
اُن کی چمٹک ہی سے تخلیق میں ہیں شام و سحر
یہی دو صورتیں بس منظر ادراک میں ہیں
ان کے ہی عکس سے شاداب ہے ہر راہ گزر

اک پجاری نے کہا، ایک خدا نے برتر
حجلۂ نور میں مستور ہے طوبیٰ سے بلند
ذرّہ ذرّہ ہے اُسی جلوۂ یکتا کا بروز
سر جھکاؤ کہ اُسے عجز و اطاعت ہی پسند

اور ہر عہد میں تم مہر بہ لب رہے ہو
تم نے ذہنوں پہ مسلط کئے خوابی معبود
سالہا سال سٹوپوں میں رہے محو مراد
سالہا سال پگوڈوں میں رہے سربسجود
تم کو مرعوب رہے ہیکل و اکثار و صلیب
تم معابد میں بھٹکتے رہے بے مقصود
تم جہنم کے تصور سے رہے ارزیدہ
تم سمجھتے رہے جنت کو مقامِ محمود

اور اس کاہشِ بے سود کے بدلے تم کو
ایک بھی جلوۂ پائندہ نظر آ نہ سکا
تم شب و روز نجومیوں کے تعاقب میں رہے
اک بگولہ بھی مگر ٹوٹ کے لہرا نہ سکا
ہر مفسر نے، مفکر نے دیا تم کو فریب
کوئی ہادی بھی حقیقت کی خبر لا نہ سکا
تم اجڑتے رہے الہام کے فرمانوں پہ
لیکن الہام تمہیں دیکھ کے شرمانہ سکا

میں بھی ہوں صاحبِ فردا مرا پیغام سنو
آج سے بند ہے آیات و کرامات کا باب
آسمانوں پہ اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں
آسمانوں سے اترتی ہے نبوت نہ کتاب
کوئی تقدیر، کوئی خالقِ تقدیر نہیں
آدمی آپ ہے خود اپنے مقدر کا جواب

شکستِ زنداں

احمد ریاض

ساحل ساحل طوفاں طوفاں نصرت کی قندیل جلانے
وہ دیکھو! مغرور سفینہ نکلا موجوں سے ٹکرانے
ماضی کے دل کش بہلاوے، عقبیٰ کے دلچسپ دلاسے
سب دولت کے جھوٹے حیلے، ثروت کے بیکار بہانے
عزم و صداقت کے پردے میں قصر سجانے والو دیکھو
کاٹ رہے بھوکے کنگلے زندانوں کے دام پرانے
پت جھڑ تو پت جھڑ ہے آخر کون کہے پتّھر کو موتی
گلچینوں کو میرِ گلستاں کیوں تسلیم کریں دیوانے
امن کا دعویٰ کرنے والو، حفظِ جہاں پر مرنے والو
اپنی رونق مانگ رہے تم سے شہروں کے ویرانے
گرمیٔ محفل سے گھبرا کر لاکھ بجھاؤ جلتی شمعیں
اپنی ہٹ پر مرنے والے۔ جل ہی جائیں گے پروانے
کل تک زیست کو دھوکا دے کر تم نے ہر اک بازی جیتی
لیکن آج انسان اُٹھا ہے۔ اپنی قسمت آپ بنانے

دو آوازیں

احمد ظفر

(۱)

گیت، جھنکار، پیار، پھول چراغ
کس قدر زرد ہوتے جاتے ہیں
زندگی، زندگی کے ہنگامے
آہ کیوں سرد ہوتے جاتے ہیں

زندگی کے مہیب لمحوں میں
جب کوئی گیت سر اٹھاتا ہے
موت اک قہقہہ لگاتی ہے
سازِ دل کانپ کانپ جاتا ہے

ہر قدم پر ہوس پرستوں نے
جال پھیلا دیئے ہیں راہوں پر
دُور تک کون دیکھ سکتا ہے
ایک پرتو سا ہے نگاہوں پر

زندگی روشنی کی طالب ہے
ہر قدم پر گھنا اندھیرا ہے
رات کی ایک گہری سازش ہے
کون کہتا ہے یہ سویرا ہے

(۲)

زندگی سرد ہو کے رہ جائے!!
زندگی کا یہ مُدعا تو نہیں
تیرگی اپنی ابتدا ہی سہی
تیرگی اپنی انتہا تو نہیں

آج اگر پھول زرد ہیں تو کیا؟
کل یہی پھول مُسکرائیں گے!!
آج جس گیت کو ترستے ہیں
کل وہی گیت گُنگُنائیں گے!

اب یہ کہہ دو ہوس پرستوں سے
اب ہوس سے نہ کام نکلے گا!
آج اگر جام بھی اُٹھائیں گے
بس سے بھرپور جام نکلے گا!

زندگی روشنی کی طالب ہے
زندگی روشنی کو پائے گی!!
لاکھ تاریکیوں کی سازش ہو
اک نئی صبح مُسکرائے گی

انتظار اور ابھی

معصوم راہی

آج میں تم کو بتا دیتا ہوں اک راز کہ تم
میرے افسانے کا عنوان نہ بن پائی تھیں
جس سے تاریک دماغوں میں دیئے جل جاتے
تم مرے ساز کی وہ تان نہ بن پائی تھیں

حسن نے یوں تو سپر ڈالی، مگر قسمت عشق
جل گیا حسنِ چمن جیسے نشیمن بن کر
ایک سورج مرے دامن پہ اُتر آیا تھا
جل گیا تھا مرا دامن کئی دامن بن کر

میری آنکھوں میں یونہی جاگ چکی تھیں کرنیں
لرزشِ وقت سے پیمانہ بھی ٹوٹا تو کہاں
یک بیک دھوپ ہوئی ٹوٹ گیا خواب مرا
تم نے سوچا کہ یہ افسانہ بھی ٹوٹا تو کہاں

تذکرے اور بھی ہیں ذکرِ رقابت کے سوا
کچھ دھنیں اور بھی ہیں نغمۂ قامت کے سوا
جسم سے دور بھی ہے جسم سے نزدیک بھی ہے
آج اک اور جنوں بھی ہے محبت کے سوا

صبح خاموش بھی ہے شام غریباں کی طرح
زندگی شور کے آغوش میں سنسان بھی ہے

اک طرف گیت نہیں جنگ کا میدان نہیں
اک طرف گیت بھی ہے جنگ کا میدان بھی ہے

انتظار اور، کہ یہ جنگ بھی ہو لینے دو
اپنے افسانے کا عنوان بناؤں گا تمھیں
اپنی محبوب لڑائی کے درخشاں تحفے
اپنے زخموں کے نشانات دکھاؤں گا تمھیں

میری نظموں میں دمک اٹھیں گے عارض کچھ یوں
جیسے اک شیش محل میں کوئی لو جاگ اٹھے
جیسے کھل جائے کمل صبح کے چھوتے چھوتے
جیسے گنگا کی ہتھیلی پہ امیدوں کے دیے

میرے اشعار میں ہوں گے لب لعلیں کے خطوط
جیسے اک گیت کی آغوش میں فنکار کا دل
جیسے میدان میں اک سرخ پھریرا لہرائے
جیسے ساحل کا نشاں، جیسے نشانِ منزل

کل تو ان پھولوں سے تشبیہوں میں ہوگا اک حسن
آج بے رنگ ہیں پژمردہ گلابوں کی طرح
کل جو تشبیہیں بنیں زیست کا عنواں ہونگی
آج وہ سر ہیں ٹھٹھری ہوئی لاشوں کی طرح

کیسے پژمردہ گلابوں سے سجاؤں تم کو
کیسے ٹھٹھری ہوئی لاشوں سے سجاؤں تم کو
رات کے ساتھ یہ سو جائیں گے مرجھائیں گے
کیسے ان چاند ستاروں سے سجاؤں تم کو

نوٹ:۔ اس نظم میں "جنگ" کا لفظ "جدوجہد" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مجروح سلطانپوری

○

دستِ منعم مری محنت کا خریدار سہی
کوئی دن اور ہیں رسوا سرِ بازار سہی

بول کچھ بول اگر لب اظہار سہی
سرِ منبر نہیں ممکن تو سرِ دار سہی

شوق ازل ہی سے ہے رسن و دار کا میں
جبر کرتا ہوں تو اڑ جاتی ہے منزل سے نظر

میں وہی گیسوئے گیتی کا گرفتار سہی
حائل راہ کوئی اور بھی دیوار سہی

غیرتِ ننگ ہے ساقی یہ گلوئے تشنہ
تیرے پیمانے میں جو موج ہے تلوار سہی

حل تو ہونا ہے مگر مسئلہ تشنہ لبی
ساغرِ خشک ابھی عقدۂ دشوار سہی

میں نے دیکھی ہے اسی میں لبِ دلدار کی جھلک
بے خبر رنگِ جہاں سے مگہِ یار سہی

ان سے بچھڑے ہوئے مجروح زمانہ گذرا
اب بھی ہونٹوں میں وہی گرمیِ رخسار سہی

○

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قدِ گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی تابکاری بیاباں سے چمن تک ہے

دھڑکتا ہے دل اپنا اس زمیں کے ذرّے ذرّے میں
ہمارے خون کی گردش رگِ سنگِ وطن تک ہے

مگر اے ہم نفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے سا غرِ شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوائے جاوداں مجروح جب میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

دآمق جونپوری

○

ابھی تو شفق ظلمتوں میں گھری ہے طلوعِ نگارِ سحر ہو تو کیسے
ابھی تو پریشان ہے زلفِ گیتی مری داستاں مختصر ہو تو کیسے
جہاں گفتگو پر زباں کٹ رہی ہو جہاں گردنِ فن پہ تلواریں پی ہوں
دماغ اور دل پر جہاں بندشیں ہوں وہاں مشقِ فکر نظر ہو تو کیسے
زمانے میں اندھے جو ہیں ذہنیت کے انھیں فرقِ عیب و ہنر ہو تو کیسا ہو
پلے ہوں جو آغوش میں ظلمتوں کی انھیں تابِ شمس و قمر ہو تو کیسے
سکوں کے لئے اس طرف مضطرب ہم اُدھر بہرِ تخریب پیکار پیہم
اِدھر فکرِ تشکیل و تعمیرِ گلشن اُدھر یہ کہ رقصِ شرر ہو تو کیسے
یہ اندھیر نگری بہت دور تک ہے لٹیروں کی بستی بہت دور تک ہے
گزرنا اِدھر ہی سے ہے کارواں کو بغیر تصادم گزر ہو تو کیسے
غرض یہ کہ دآمق زمانے کی صورت نہیں آج تو کل بدل کر رہیگی
جو ہونا ہے وہ آج ہی ہو بھی جاتا یہ دل چاہتا ہے مگر ہو تو کیسے

مجید شاہد

○

مانا وقت بڑا نازک ہے غم کھا لیں آنسو پی لیں
چوٹ لگے دل پر تو کیونکر اُف نہ کریں لب سی لیں
ذہنوں کا اُلجھاؤ کیسا یہ بُہتان تراشی ہے
چاہو تو حالات کے بہنے دھارے کو ٹھہرا ہی لیں
ظاہر ہے بے نور اُجالوں کی رعنائی کیا ہوگی
مصنوعی ہیں سب مفروضے جھوٹی ہیں سب تاویلیں
دیکھیں اب خرمن جلتا ہے یا ماحول بدلتا ہے
تاریکی کی اوٹ میں لہرائی تو ہیں کچھ قندیلیں
جینے کا دستور بہر عنوان بدلنے والا ہے
مرنے والے اس اُمید پہ جینا چاہیں تو جی لیں
گونج اُٹھیں اطراف میں جھنکاریں بیباک تقاضوں کی
آؤ شاہد وقت کی تازہ قدروں کو اپنا ہی لیں

بارود اور چیری کے پھول

کرشن چندر

سیول جل رہا تھا

اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے لائیم نے لکی سٹرائیک کا ایک سگرٹ سلگایا۔ اور اپنی رائفل کے سہارے کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

چاروں طرف شہر کی گری ہوئی عمارتوں کے ملبے پڑے تھے کہیں کہیں کنکریٹ کی ادھ جلی عمارتیں باقی رہ گئی تھیں۔ شہر کے بیچوں بیچ ہزاروں ٹن بموں کی مار سے ہوائی جہازوں نے امریکی فوج کے لئے ایک چھوٹا سا راستہ بنایا تھا تاکہ امریکی فوج شہر کے مشرق سے مغرب تک جا سکے لیکن جب اس پر بھی سیول فتح نہ ہوا تو پھر ہزاروں ٹن کی ان گنت بمباری سے ایک دوسرا راستہ بنایا گیا۔ جو شمال سے جنوب تک رستہ صاف کرتا تھا۔ اب شہر کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کر کے گھیرے میں لے لیا گیا۔ پھر بھی قدم قدم پر لڑائی ہوئی تھی۔ یہ کمبخت کوریائی سپاہی جب تک مرتے نہیں لڑتے ہی جاتے ہیں۔

لائیم نے ایک زور کا کش اندر کھینچ کے سوچا۔ اپنے چاروں طرف دیکھا اور پھر اُسے اپنے چاروں طرف ادھ جلی عمارتیں نظر آئیں۔ چاروں طرف ملبے کے ڈھیر۔ پانی کے نل پھٹے ہوئے بجلی کے کھمبے سڑکوں پر گرے ہوئے۔ جگہ جگہ کوریائی اور امریکی سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر۔ بارود کی کاپچ بموں کے گہرے گڑھے اور جا بجا میں ٹائر پیٹ اور فاسفورس کی تیز اور کڑوی بدبو اور چاروں طرف آنکھوں کو جلانے والا سیاہ دھواں ..... یہ دھواں غبار کی طرح سارے شہر پر چھایا ہوا تھا۔ لائیم کھانسنے لگا اور پھر کھانستے کھانستے گالی بکتے ہوئے مگر اپنے ساتھی سے کہنے لگا

"بڑی مصیبت کی جنگ تھی یہ "جوس" بڑی حرامزادی، سفلی شیطانی، نکمی، خدا ماری جنگ تھی جوس!"

جوس، جس کا اصلی نام تو لائیم جوس تھا نہ آدھ بیچ جوس، نہ کوکو کولا جوس بلکہ صرف جوز تھا لیکن جب اس کے ساتھی اس سے "جوس" کہتے تھے کہ اس کا چہرہ دیکھنے میں بڑا گول مٹول، معصوم اور پلپلا سا تھا، جلد اتنی نازک کہ گمان ہوتا تھا اس میں ذرا سی سوئی چبھوئی تو ابھی رس کی دھار پھوٹ پڑے گی بالوں کی رنگت بلاٹنم کی طرح تھی اور بھویں اور پلکیں تو بالکل سفید تھیں جس میں سے اس کی چھوٹی چھوٹی ہری آنکھیں مرغی کے بچے کی طرح چمکتی تھیں، اس وقت اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا "جنگ بھی مصیبت کی تھی خون بھی بہت بہا لیکن آخر میں آج ہماری فتح ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں" لائیم نے فتح مندی کی نظروں سے سامنے کی کنکریٹ عمارت کی طرف دیکھا۔ اس عمارت کی آدھی چھت اڑ چکی تھی۔ آدھی باقی تھی۔ چھت کے اوپر امریکی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کھڑکیاں، دروازے سب ٹوٹے ہوئے تھے اور چاروں طرف شرنگہ کے اوپر گلاس کی کرچیاں ریزہ ریزہ ہو کے بکھری تھیں۔ لائیم نے سگرٹ کا دوسرا کش لیا اور اسے اتنا زور سے اندر کھینچا کہ سگریٹ جل کے آدھا ہو گیا اور اس کی راکھ اڑ کے لائیم کی آنکھوں میں جا پڑی اور وہ گالیاں دیتے ہوئے اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ "خدا غارت کرے ان سب بلڈی ایشیائیوں کو، کہاں آ کے مرے مارے ہیں، اچھا بھلا اپنے من شانتی میں انشورنس ایجنٹ تھا۔

"کون سی کمپنی کے ہو؟"

"دی گریٹ نیڈل۔ امریکن انشورنس کارپوریشن، کمارپور میٹڈ۔

.....

"اب بھی اس کے ایجنٹ ہو؟" جوس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمکا

دور سامنے کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا

"وہ دیکھو"

لائم نے دیکھا تو اُسے مخالف سمت کی دور جلی عمارت پر ڈی گریٹ فیڈرل امریکن انشورنس کارپوریشن کا نام جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ اس عمارت کے اوپر بھی امریکی جھنڈا لہرا رہا تھا اور عمارت کے باہر امریکی سپاہیوں کی آرمگیدون دسکائن دیگم ارسین کی تصویریں بھاڑتے میں مصروف تھے۔ ارے سچ مچ یہ تو وہی ہے گریری، امریکن کمپنی یہاں کیسے آگئی؟

جوس نے سر کو کے کہا "اس کے ساتھ میں اور نام بھی ہیں غور سے دیکھو"

لائم اور بھی آگے نام پڑھنے لگا کیلی فورنیا۔ جانوں گدام کمپنی ایس ..... اینڈ فلپ ..... کوریا کول اینڈ آئل ریفائن ریز لکھا پور لمیٹڈ ۔۔ نیویارک سیرلڈ ٹریڈیون ..... لائف اینڈ ٹائم ..... رائس ایکسپورٹ اینڈ کوکو کولا امپورٹ کمپنی ان گو ریورلیٹیڈ۔ لکھا گو۔

لائم خوشی سے چلایا "ارے یہ تو سب اپنے نام ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے امریکہ پہلے ہی سے کوریا میں موجود تھا"

جوس نے کہا "اس میں کیا شک ہے۔ ہم پہلے بھی موجود تھے اور یہاں آج بھی موجود ہیں اور یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے چاہے شیطان کمیونسٹ کچھ ہی کیوں نہ کہیں"

"بالکل" لائم نے بڑی مضبوطی سے کہا اور اس کے جبڑے زور سے تن گئے۔ لائم "ماڈ کی طرح لمبا امریکی تھا۔ وہ اپنی ماں کی طرف سے آدھا آئرش آدھا جرمن تھا اور باپ کی طرف سے ایک چوتھائی جنیفی دو چوتھائی میکسکی۔ ایک بٹا آٹھ جیسی اور باقی فرانسیسی تھا یعنی وہ بالکل سو فیصدی امریکی تھا جو سفید رنگ کی برتری یا جنیشیوں کی لینگ چنگ اور ٹرومین کے ایٹم بم پر ایمان رکھتا تھا۔ اوپر سے وہ جتنا لمبا تھا، اندر سے اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اوپر سے وہ جتنا بہادر تھا اندر سے اتنا ہی بزدل، کمینہ، ظالم اور بے وفا تھا۔ سخت ڈیوٹی لینے سے ہمیشہ گھبراتا تھا لیکن جب کسی مورچے پر فتح ہو جاتی تو فتح کا سہرا لینے کے لئے سب سے آگے ہوتا۔ جبھی تو اب تک زندہ تھا۔ اس کی بٹالین کے باقی نوجوان امریکی کب کے سیول کے محاذ پر ختم ہو چکے تھے۔ اب صرف جوس اور لائم باقی رہ گئے تھے۔ جوس بھی اوپر سے بڑا معصوم دکھائی دیتا تھا لیکن اندر سے بالکل لائم کی طرح تھا اس لئے لائم اور جوس دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی بلکہ انہیں ہمیشہ اکٹھے دیکھ کر ان کے دوسرے ساتھی اکثر کہا کرتے تھے "وہ دیکھو لائم جوس کی بوتل آرہی ہے۔"

یکایک سامنے کی عمارت پر پہلی منزل کے برآمدے میں دو امریکی سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا کپڑا تھا جسے انھوں نے برآمدے کے باہر لٹکا دیا تاکہ سڑک پر آتے جاتے ہر امریکی سپاہی کی نظر اس کپڑے پر پڑ سکے۔ اس نیلے کپڑے پر بڑے بڑے سفید حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

GRAND Auction SALE

(عظیم الشان نیلام)

COME And Buy

(آئیے اور خریدیے)

اور پھر برآمدے میں بہت سے امریکی سپاہیوں کی صورتیں نمودار ہوئیں۔ وہ سب لوگ پی رہے تھے۔ گا رہے تھے اور زور زور سے چلا رہے تھے "شاندار نیلام ہے۔ کھا بازار خام ہے۔ آؤ خریدو ایسا مال پھر کبھی نہیں ملے گا۔"

لائم اور جوس اسے دیکھتے ہی عمارت کے اندر بھاگے اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھ کے پہلی منزل پر پہونچ گئے۔ اندر جا کے انھوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس کے دروازے پر نصف ڈالر کا ایک ٹکٹ ملتا ہے جسے لیکے اندر جانا پڑتا ہے۔ دو ٹکٹ لے کے اندر داخل ہوئے۔ اندر ان کی طرح ہی دو تین سو امریکی سپاہی ایک اونچی اسٹیج کے ارد گرد جمع تھے۔ یہ اسٹیج ہال کے مغربی کونے میں تھی اور

ایک لانبے آدمی کے قد سے بھی بہت اونچی تھی۔ اس سٹیج کے ایک طرف دروازہ تھا اور دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا سٹیج کے اوپر رسّوں کا ایک جنگلہ باندھا گیا تھا اور سٹیج بالکل خالی پڑی تھی ہال میں چاروں طرف ہال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے چلا رہے تھے، گا رہے تھے، گا رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے اور شراب کی بوتلیں منہ سے لگائے غٹا غٹ پی رہے تھے۔

لائیم نے جوس اور جوس نے لائم کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر جوس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"یہ کیا تماشہ ہے۔ باکسنگ؟"

پستہ قد امریکی نے جس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے، سر ہلا کے کہا "نائیں" وہ بے حد پیئے ہوئے تھا۔

لائیم نے پوچھا "تو پھر کیا ہے فیسٹیول؟"

"نائیں"

"تو پھر کیا ہے ناچ؟"

"نائیں" پستہ قد امریکی نے ایک بڑی گڑیا کھلونے کی طرح بالکل پہلی سی تال اور لَے پر اپنا سر ہلا کے کہا۔

لائیم نے پستہ قد امریکی کو زور سے جھنجھوڑا، اور غصے میں اس سے پوچھا "تو پھر کیا ہے؟"

"دیکھتے نہیں ہو نیلام ہے؟ Human Auction"

"کس چیز کا نیلام ہے؟"

"مجھے کیا معلوم میں بھی تمہاری طرح نصف ڈالر خرچ کر کے اندر آیا ہوں۔ یہاں اسٹیج خالی ہے۔ مجھے تو سب بلڈی مذاق معلوم ہوتا ہے۔ سب خونی۔ خونی اسٹیج۔ خونی ادھا ڈالر۔ خونی جنگ۔ سب بلڈی خونی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔"

یکایک ہال میں ایک غلغلہ بپا ہوا۔ ایک آدمی نیلام گھر کے مینیجر کا شامی لباس پہنے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوا اور گھنٹی بجا کے بولا "ایم بم کے بیٹو! آج ہم نے سیول کے شہر پر فتح پائی ہے گویا سارے کوریا پر فتح پا لی ہے۔ اس خوشی میں یہ نیلام منعقد کیا جاتا ہے۔ ایسا نیلام آپ نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اب دیکھو اور اپنی پاکٹ خالی کر دو..... ایم بم کے بیٹو!"

اتنا کہہ کے اس نے رسّے سے گھنٹی بجائی اور اسٹیج کے مغربی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی مغربی دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے کوریائی لڑکیوں کی ایک قطار سٹیج پر داخل ہوئی، ایک لمحے کے لئے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کیونکہ لڑکیاں بالکل ننگی تھیں۔ جسم ننگے..... نگاہیں نیچی۔ بال کھلے۔ برہنہ پا۔ ہاتھ پشت پر رسّوں سے بندھے ہوئے ناکردہ کوریائی لڑکیاں کسی طرح بھی اپنی برہنگی نہ چھپا سکیں۔ نہ اپنے منہ ہاتھوں میں چھپا کر، نہ اپنے بال سینہ پر لا کر۔ آج تن ڈھانکنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے وہ گردنیں ننگی تھیں جہاں محبت نے چیری کے شگوفوں کے ہار پہنائے تھے۔ وہ چھاتیاں ننگی تھیں جہاں بے زبان بچوں نے ماتا کا رس پیا تھا، وہ کوکھ ننگی تھی جس کے اندر بیج ہوتا ہے، بیج کے اندر شگوفہ ہوتا ہے۔ شگوفہ کے اندر پھول ہوتا ہے اور پھول کے اندر پھر بیج بنتا ہے۔ ایسے خوبصورت خالق کو بہادر امریکی سپاہیوں نے فتح کر لیا تھا۔ اور یہ رسّوں سے بندھی ہوئی ایشیائی روں اپنی صدیوں کی بے حرمتی کے داغ اپنے سینے پر لئے ہوئے، جنبی فاتحوں کے درمیان گھوم رہی تھی۔ نیلام گھر آج ہی نہیں، آج سے بہت عرصہ پہلے بھی سجا تھا۔ جہاں جہاں ظلم نے ڈیرے ڈالے تھے۔ چنگیز کے خیموں میں، دمشق کے بازاروں میں، یونان کی سٹڈیوں میں۔ روم کے امفی تھیٹروں میں، جنوبی امریکہ کی پاسٹوں میں۔ ہٹلر کی جیلوں میں۔ جہاں جہاں ظلم نے ڈیرے ڈالے تھے وہاں یہ معصوم روح ننگی کی گئی تھی۔ برہنہ پا، سینہ صد چاک، خاک و خون میں غلطاں، اپنی پلکوں کے اندر عصمت و عفت کی ہزار ویرانیاں چھپائے۔ اس نے حیرت سے ان نیلام گھروں کو دیکھا تھا اور ان کی وحشی دیواروں سے پوچھا تھا، کیا انسان اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کو ننگا کرے۔ بچوں کو جلائے اور بڈھوں کے سینوں میں سنگین

گھونپے۔ یا اس لئے کہ وہ ایک پل بنائے۔ ایک کتاب لکھے، ایک گیت سُنائے اور ایک چیری کے شگوفے کو اٹھا کے اپنے محبوب کے بالوں میں ٹانک دے؟ لیکن نیلام گھر کی وحشی دیواروں نے اس محبت بھرے سوال کا جواب ہمیشہ نفرت اور حقارت سے دیا تھا، اور آج ایٹم بم کے بیٹوں نے کوریا کے بازاروں میں پھر وہی نیلام سجایا تھا۔

ہال میں ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ دوسرے لمحے ہال میں سنیکروں تالیاں چیخیں، سیٹیاں بج اٹھیں اور امریکی سپاہی وحشیانہ مسرت اور ہوس رانی کی آگ سے بھڑک گئے۔ "کم آن۔ جلدی سے بولی شروع کرو۔ ایک ڈالر۔ میں بولی دیتا ہوں" ایک امریکی سپاہی زور سے چلایا

"دو ڈالر" دوسرا بولا

"تین ڈالر" تیسرا بولا

چار ڈالر۔ ایک دو ..... ایک دو ..... پانچ ڈالر ..... ایک دو ..... ایک دو

بولی شروع ہوگئی لیکن ایک لڑکی کے لئے کوئی بیس ڈالر سے زیادہ بولی نہ دے سکتا تھا اور ڈالر کے علاوہ دوسری قیمتی چیزیں بھی بولی میں قبول کی جاتی تھیں۔ مثلاً گھڑی۔ فونٹین پن۔ "ٹائی پن ..... کسی لڑکی کی بولی ختم ہوتے ہی ..... کے ہاتھوں کی رسی کھول دی جاتی اور اُسے اسٹیج سے سنبھال کے نیچے پھینک دیا جاتا۔ جہاں بہت سی اور لڑکیاں بے قرار ہیں اس کے ننگے جسم کو دبوچ لیتیں اور اسے ہاتھوں ہی ہاتھوں اٹھا کر آخری بولی دینے والے تک پھینک دیتیں۔ جو اس کی کمر میں ہات ڈال کے یا تو وہیں ناچنے لگ جاتا اور یا اُسے اس طرح اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہال سے باہر لے جاتا۔

لائیم نے بڑے اطمینان سے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور جوس کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ جوس نے آنکھ مار کے کہا "بولی کیوں نہیں دیتے؟"

لائیم نے کہا "ابھی اپنی پسند کی کوئی لڑکی آئی نہیں۔ جب آئے گی بولی دے دیں گے۔ سب سے بڑھ کے دیں گے۔"

جوس نے کہا "تم کیسی لڑکی چاہتے ہو؟ ہنرل جیسی؟"

لائیم نے غصے میں اسے گھور کے کہا "شٹ اپ۔ ہنرل میری محبوبہ ہے اس کی بات مت کرو۔"

قریب کھڑے ہوئے پستہ قد امریکی نے اسٹیج پر کھڑی ایک ننگی کوریائی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ بھی تو ہنرل جیسی ہے۔ ارزاں بیلا ہے۔ مجھے تو اس کے اور ایک امریکی لڑکی کے جسم میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔"

لائیم نے گھونسہ تان کے کہا "چپ رہو تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟"

اس پستہ قد امریکی نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں میں کوئی نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی امریکی سپاہی ہوں۔ مگر مجھے یہ ہنگامہ پسند نہیں۔"

"پسند نہیں ہے تو یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ کسی گرجا میں جاؤ ..... یا بکری کا دودھ پی کے خدا کا شکر ادا کرو باسٹرڈ!"

پستہ قد امریکی وہاں سے ہٹ گیا اور لائیم کی توجہ کوچابک کی آواز نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ چابک نیلام کرنے والے نے اس لڑکی کے جسم پر مارا تھا جو رسّی سے بندھی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لڑکی کا رنگ تانبے کی طرح سرخ تھا۔ آنکھیں لال اور جلتی ہوئیں۔ اور بال بے حد گھنے اور لانبے۔ وہ اپنی کوریائی زبان میں بلند لہجے میں کہہ رہی تھی۔ غالباً اپنی زبان میں ان سپاہیوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ نیلام کا چابک پھر اس کے جسم پر پڑا اور ایک لمبی نیلی دھاری کا نشان اس نے تانبے کی طرح دہکتے ہوئے جسم پر چھوڑ گیا لڑکی نے پھر اپنی پوری قوت سے دانتوں کو رسّے میں گڑا کے اسے کاٹ کھایا .....

لائیم نے اسے دلچسپی سے دیکھا، اور بلند آواز میں کہا۔ "بیس ڈالر۔"

اس نے پہلے ہی سب سے بڑی بولی دی۔ بہت سے سپاہی اس کی

طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

لائیم نے کہا "ہاں ہاں کیا دیکھتے ہو۔ بولی میں نے دی ہے۔ لڑکی کو میری طرف پھینکو۔"

"بیس ڈالر اور ایک سونے کی گھڑی" سارجنٹ کارٹن پچھلی جنگ کا پیشہ ور سپاہی تھا۔ قد چھ فٹ سے اوپر نکلتا ہوا بیل کی طرح گردن، آنکھیں میلی۔ دانت میلے، دل میلا۔ روح میلی اور جیسی روح ویسے فرشتے۔

لائیم نے سارجنٹ کارٹن کی طرف دیکھ کے غصہ سے کہا "بیس ڈالر اور ایک سونے کی گھڑی۔ اور ایک فاؤنٹن پن۔"

سارجنٹ کارٹن بولا "بیس ڈالر، وایک سونے کی گھڑی ایک فونٹن پن، ایک سونے کی انگوٹھی۔"

لائیم نے فوراً کہا "بیس ڈالر سونے کی گھڑی۔ فونٹن پن سونے کی انگوٹھی اور میری پتلون کی پیٹی جس پر چاندی کا بکل لگا ہوا ہے۔ پھینکو ادھر لڑکی کو، ورنہ میں پتلون اوپر پھینکتا ہوں۔"

بہت سے لوگ ہنس پڑے اور آخری بولی لائیم ہی کی منظور کرلی گئی اور لڑکی اس کی طرف پھینک دی گئی۔ لائیم نے اس سرکش لڑکی جھنجلاتی ہوئی چیختی ہوئی لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام کر اسے دوچار تھپڑ لگا کر رام کرلیا، اور اب وہ اس لڑکی کو اٹھا کر ہال کے باہر لیجانے والا تھا کہ کہیں سے مغربی دروازے سے ایک حبشی پاہی سیٹی پر دوڑتا دوڑتا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"ساتھیو! یہ ٹھیک نہیں ہے"

"کیا ٹھیک نہیں ہے حبشی؟"

"یہ نیلام گھر ..... اسے بند کردو۔ دوستو! بہت عرصہ ہوا ہم نے جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں اسی طرح کے نیلام گھر بنائے تھے دوستو! جانتے ہو ہم نے اس نیلام گھر کی کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں کہتا ہوں ..... "Dirty Nigger" سارجنٹ کارٹن زور سے چلایا۔

"میں کہتا ہوں اس حبشی کتے کو سٹیج پر سے ہٹا دو۔ ہال میں سے ایکدم" بہت سی آوازیں آئیں۔

"میں نہیں ہٹوں گا" حبشی سپاہی نے چلا کے کہا "یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ غلط ہے۔ یہ ہماری انسانی تہذیب کے خلاف ہے!"

"تہذیب! بہت سے سپاہی زور زور سے ہنسنے لگے۔ سالا سرخا ہے۔ کمیونسٹ ہے!"

حبشی سپاہی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور اپنے سر کو اونچا کر کے کہنے لگا "ساتھیو! میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی امریکی شہری ہوں۔ میں ہارلم کا رہنے والا ہوں۔ ہارلم کی ساتویں گلی میں میری ماں رہتی ہے۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بھائی، اسی گلی کے آخری سرے پر جین کا مکان ہے۔ جین جو بے تحاشا ہنستی رہتی ہے۔ جین جو ہر وقت ہاپ کارن کھاتی رہتی ہے۔ جین جو میری منگیتر ہے۔ جین جو بالکل اپنی کوریائی لڑکیوں کی طرح ہے۔ میری منگیتر کا احترام کرو دوستو!"

"بالکل کمیونسٹ ہے" سارجنٹ کارٹن نے پستول نکال لیا اور چلا کے کہنے لگا۔ "اسے اسٹیج سے نیچے پھینکدو"

حبشی بولا "میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ میں نے مارکس نہیں پڑھا ہے۔ میں نے صرف انجیل پڑھی ہے۔ مجھے آج تک کسی کمیونسٹ سے ہاتھ ملانے کا موقع نہیں ملا۔ بھوک سے کئی مرتبہ بات ملا چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کمیونزم کیا بلا ہے۔ ہاں میرے گرجا کے سفید پادری نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ جو اچھے آدمی ہوتے ہیں وہ عورت کی عزت ضرور کرتے ہیں کیونکہ عورت ہماری ماں ہوتی ہے۔ بہن ہوتی ہے، منگیتر ہوتی ہے۔ عورت ہماری تہذیب کی عزت ہوتی ہے۔ اس سفید پادری نے مجھ سے یہی کہا تھا۔"

"بالکل کمیونسٹوں کی سی باتیں کرتا ہے" لائیم نے گھونسا تان کے کہا۔

"یہ سرخا ہے۔ اسے جلاؤ الو۔ اسٹیج سے نیچے پھینکدو۔"

حبشی سپاہی کا چوڑا چکلا سینہ اب عجیب غرور اور افتخار کے ساتھ تن گیا، اس نے آہستہ سے لیکن بڑے گہرے اعتماد کے ساتھ کہا "نہیں بھائیو!

میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ جب تک تم اس نیلام گھر کو بند نہ کر دو گے۔ مجھے تھوڑی سی امریکی تاریخ یاد ہے۔ اسے دو سال بھی نہیں گذرے، جب افریقہ کے گھنے جنگلوں والے ساحل پر سمندری کشتیاں لنگر انداز ہوئی تھیں، اور افریقہ کے سبز رنگ کے گھنے جنگلوں میں سے ہرے بھرے طوطوں والے، نیلی چڑیوں چار خانے زراوں اور خاموش بھینسوں والے افریقی ماحول میں سے میرے آباؤ اجداد کو ان کے گھروں سے زبردستی پکڑ کے ان سمندری کشتیوں کے سفید مالک انھیں امریکہ لے گئے تھے وہاں مرسی سی پی کی دریائی کشتیوں کے ڈیک پر ایسے ہی نیلام گھر لگے تھے۔ بالکل ایسا ہی مینجر تھا۔ ایسے ہی اس کے ہاتھ میں چابک تھے۔ اس چابک سے کالے جسم پر اسی طرح خون کی دھاری ابھر آتی تھی۔ دوستو! اس دھاری کی ہم نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ تین سال کی امریکی خانہ جنگی میں ہزاروں ماؤں کے لال مر گئے۔ لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں اور جنوبی اور شمالی امریکہ میں ہمیشہ کے لئے نفرت کی دیوار بندھ گئی دوستو! اب اس خطرناک تماشے کو دوبارہ نہ شروع کرو۔ میں تم سے انسانیت نہیں امریکی تاریخ کے نام پر کہتا ہوں، یہ نیلام گھر اب نہیں چل سکتا۔ یہ کوریا کا نیلام گھر مٹ جائے گا جیسے چنگیز کا نیلام گھر مٹ گیا، جیسے ہلاکو کا مٹ گیا۔ جیسے روم، یونان، دمشق برلن ایسے ہی یہ نیلام گھر بھی مٹ جائے گا۔ یہ ظلم مٹ جائے گا لیکن ایشیا کی عورت ہمیشہ زندہ رہے گی۔"

یکایک ہال میں سے تین گونیوں کے چلنے کی آواز آئی اور بھدے چوڑے چکلے حبشی سپاہی کا جسم زور سے کانپا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ دونوں طرف رسّوں کی گرفت میں آ گئے۔ اس کی گردن ایک طرف کو جھک گئی۔ جیسے آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے مسیح کی جھکی تھی۔ پھر اس کا بھاری جسم تڑپ تڑپ کے رسّوں پر جھک گیا اور وہاں سے وہ ندھا ہو کے نیچے چاہیوں پر دھڑام سے جا گرا۔ اس کے گرتے ہی ہال میں سے قہقہے کی آوازیں آئیں اور خون کی ایک دھار سٹیج کو سُرخ کرتی ہوئی نیچے تک فرش کو لال کرتی چلی گئی۔.....

چند سپاہیوں نے اس کی لاش کو اٹھا کے باہر برآمدے میں پھینک دیا، اور بولی پھر شروع ہو گئی۔

"ایک ڈالر، ایک لڑکی، ایک گھڑی، ایک لڑکی، ایک ٹائی پن ایک لڑکی، ایک چاندی کا سگریٹ کیس ایک لڑکی!"

نیلام بڑھتا گیا سٹیج خالی ہوتی گئی۔ سٹیج کے پیچھے امریکی جھنڈا سکڑتا گیا۔ جھنڈا جس پر تارے اور دھاریاں تھیں۔ تارے اور گہری نیلی زمین پر سفید دھاریاں۔ تارے اور سونے اور جسم پر نیلی دھاریاں۔ تارے اور چابکیں.....!

تھوڑی دیر کے بعد اسی عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لائیم، سارجنٹ کارٹن اور جوس تین ننگی کوریائی لڑکیوں کو اپنی رانوں پر بٹھائے تاش کھیل رہے تھے اور پی رہے تھے۔ کھیل دلچسپ تھا۔ لڑکیاں بھی اچھی تھیں۔ شراب بھی بُری نہیں تھی، اور اب تو وہ سرکش لڑکی بھی لائیم کی آغوش میں چپ چاپ بڑی متانت سے بیٹھی تھی ہاں کبھی کبھی اس کے بڑے غلافی پپوٹوں کے اندر سے ایک نظر بجلی کے کوندے کی طرح لپکتی ہوئی باہر آئی اور دوسرے لمحے میں وہ بجلی پھر کہیں اندر ہی اندر غائب ہو جاتی۔ سارجنٹ کارٹن نے یکایک تاش کے پتے میز پر پھینک کر کہا "جانے دو۔ اس کھیل میں مزہ نہیں آ رہا ہے"

"مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے" لائیم بولا

کارٹن نے کہا "میں فلاسوں کا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں جس میں غلام بیگم سے بڑا ہوتا ہے۔"

لائیم نے پوچھا "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تاش میں ہمیشہ بیگم غلام سے بڑی ہوتی ہے۔"

کارٹن نے کہا "یہ نیا کھیل ہے۔ پچھلی جنگ میں ہم نے اسے

نازی قیدی سپاہیوں سے سیکھا تھا۔ اس کھیل میں بیگم غلام سے چھوٹی ہوتی ہے۔ کیوں جوئس ؟"

جوئس نے کہا۔ ہاں مگر اس کے لئے تو چار آدمی چاہئیں اور ہم تین ہیں۔"

کارٹن نے لائیم کی آغوش میں بیٹھی ہوئی گوریائی لڑکی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کے کہا "کہنے کو تو ہم چھ ہیں مگر یہ لڑکیاں ہمارا کھیل نہیں جانتیں۔ یہی تو مصیبت ہے۔"

لائیم نے کہا " میں سمجھ گیا سارجنٹ، تم کیا چاہتے ہو؟"

"کیا ؟" سارجنٹ نے پوچھا

لائیم نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا " تم جو شئے بولی دے کو حاصل نہ کر سکے اُسے تاش کے کھیل سے جیت لینا چاہتے ہو، ٹھیک ہے نا ؟"

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا

لائیم نے آہستہ سے کہا " مجھے منظور ہے"

"مگر وہ چوتھا پارٹنر.....؟" جوئس نے پوچھا

سارجنٹ اُٹھ کر دروازے کے باہر گیا۔ باہر وہی پستہ قد سپاہی، ایک گوریائی لڑکی کو اپنا لمبا کوٹ اوڑھائے آہستہ آہستہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ سارجنٹ نے اسے آواز دی "ہے بڈی۔"

پستہ قد امریکی نے مڑ کے سارجنٹ کی جانب دیکھا۔ سارجنٹ نے اُسے اپنی جانب بلایا۔ پستہ قد امریکی اپنی گوریائی لڑکی کو لئے سارجنٹ کی جانب چلا آیا۔ سارجنٹ نے اس سے پوچھا۔ "اسے کوٹ کیوں اوڑھا رکھا ہے ؟"

"یہ کوٹ میرا ہے" پستہ قد امریکی نے جواب دیا

"مگر یہ کوٹ اس کام کے لئے نہیں ہے۔ نکالو اسے" سارجنٹ نے کہا۔ اور کہتے کہتے خود ہی اس گوریائی لڑکی کا کوٹ اتار کے اُسے پھر ننگا کر دیا۔ اتنے میں لائیم بھی دروازے پر آ گیا۔ اس نے پستہ قد امریکی کو دیکھتے ہی بڑی حقارت سے کہا " تمہیں تو یہ ہنگامہ پسند نہیں تھا پھر تم کیسے اس ننگی لڑکی کے ساتھ گھوم رہے ہو" پستہ قد امریکی مسکرایا۔ اس کے سامنے کے دو دانت غائب تھے۔ آہستہ سے بولا " میں بھی سب کے ساتھ ہوں۔"

جوئس نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا " تو اندر آ جاؤ۔ تاش کھیلیں گے....."

"کون سا کھیل ؟" پستہ قد امریکی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جس میں غلام بیگموں سے بڑے ہوتے ہیں۔"

وہ چوتھی کرسی پر اپنی گوریائی لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جوئس کے پوچھنے پر اس نے اپنا نام "سمپسن" بتایا۔

لائیم نے پوچھا "سمپسن ؟ تمہارا کہیں اس دوسرے بڈھے سمپسن کے گھرانے سے تو کوئی رشتہ نہیں ؟"

"ہے"

"کیا رشتہ ہے ؟"

"وہی غلاموں کا رشتہ ہے۔ وہ مالک ہیں۔ میں غلام ہوں ہم سب غلام ہیں۔ سب چھوٹے سمپسن بڑے سمپسنوں کے غلام ہیں اچھا آؤ۔ تاش پھینٹو۔ لاؤ میں کاٹتا ہوں۔ اچھا سارجنٹ، بتاؤ تم کس کے غلام ہو ؟"

سارجنٹ نے کہا میں "آئینٹ" کا غلام ہوں" اور پھر اس نے اپنی گود میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اور یہ میری گود میں آئینٹ کی بیگم ہے۔"

جوئس نے کہا " میں چڑیا کا غلام ہوں۔ اور یہ میری چڑیا ہے۔"

پستہ قد امریکی نے کہا " دیکھنا کہیں پھر سے اُڑ نہ جائے۔"

لائیم نے ہنس کے کہا " یہ میری بان کی بیگم ہے جس پر سارجنٹ کی نظر ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔" پھر اس نے سمپسن کی طرف مڑ کے کہا " اب تمہارے لئے تو پسند کا سوال ہی نہیں رہا۔ تم تو حکم کے غلام ہو۔"

سمپسن نے کہا۔ غلاموں کے لئے پسند کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ چاہے وہ میک ارتھر کا حکم ہو یا ٹرومین کا حکم ہو، یا اس سے کسی بڑے سیٹھ کا حکم ہو جس کا بنکوں، تیل کے چشموں اور لوہے کے کارخانوں پر قبضہ ہے۔"

کارٹن نے اپنی پیٹی ڈھیلی کرتے ہوئے کہا "اب اپنی گندی سیاست بند کرو اور کھیل شروع کرو۔"

سمپسن نے کہا "میں حاضر ہوں چلئے۔ مگر کھیل کی شرط کیا ہے؟"

کارٹن نے کہا "شرط میں یہ لڑکیاں بدی جائیں گی تم اگر حکم کے غلام ہو، اور تمہارے پاس حکم کی بیگم آتی ہے تو یہ لڑکی تمہارے پاس ہی رہتی ہے لیکن اگر یہ حکم کی بیگم لائیم کے پاس نکل آتی ہے تو یہ لڑکی تمہاری گود سے اٹھ کر لائیم کے پاس چلی جائے گی اسی طرح میں اینٹ کا غلام ہوں لیکن اگر میرے پاس پان کی بیگم نکل آتی ہے ۔ ۔ ۔

کھیلنے لگا۔ اب بات بات میں لائیم اسے طعنے دینے لگا "جانے کیا بات ہو پان کی بیگم تمھارے پاس نہیں ٹھہرتی" یہ پان کی بیگم اب تک جوس کے پاس پہنچ چکی تھی اور سمپسن کے پاس بھی، لیکن سارجنٹ کی آغوش پان کی بیگم سے خالی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ شام کا اندھیرا بڑھنے لگا۔ باہر سے گوریلا مشین گنوں کے گھڑگھڑاہٹ سے آوازیں تیز تر ہوگئی تھیں۔ مگر سارجنٹ کے پاس پان کی بیگم نہ آئی۔ اس کے تین ساتھیوں نے اسے کھیل بند کر دینے کو کہا لیکن سارجنٹ نہیں مانا۔ آخر لائیم نے اس سے کہا۔ "جاؤ سارجنٹ میں اپنی پان کی بیگم تمھیں مفت میں بخشتا ہوں" مگر سارجنٹ کو لائیم کا یہ تحقیر آمیز جملہ اور بھی کھٹکا اور وہ اور بھی مستعدی سے کھیل میں مشغول ہوگیا آخر جب شام بہت گہری ہوگئی تو سمپسن نے یکایک کہا "بھئی بہت ہو چکا اب کھیل کا آخری داؤ چلو۔ بات ختم کرو" سارجنٹ نے کہا "اچھا آخری داؤ سہی مگر پتے میں کاٹوں گا۔"

لائیم مسکرا کر تاش پھینٹ رہا تھا۔ سمپسن نے کہا "پتے پھینٹنے کی باری تمھاری ہے لیکن مجھے پھینٹنے دو۔"

"کیوں؟" لائم بولا

سمپسن نے مسکرا کر کہا۔ "آخری داؤ ہے۔ بات مان جاؤ"

لائیم نے تاش سمپسن کے حوالے کر دیا۔ سمپسن نے سارجنٹ کی طرف دیکھا۔ لائیم کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں تاش پر گڑی تھیں۔ سمپسن آہستہ سے تاش پھینٹنے لگا۔

لائیم نے کہا "شفل"

سارجنٹ بولا "ری شفل"

سمپسن نے تاش پھینٹ کر میز پر رکھ دیا۔ سارجنٹ نے کہا "میں کاٹوں گا۔"

لائیم نے سانس روک کے آہستہ سے سر ہلایا

سارجنٹ نے تاش کاٹ کے پتہ اٹھایا۔ پان کی بیگم تھی۔

لائیم کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا "یہ دھوکا ہے سمپسن تم سے مل گیا ہے۔ یہ جعل سازی ہوئی ہے۔"

اس کا کیا ثبوت ہے" سارجنٹ نے چلا کے کہا۔ اب وہ بھی کرسی سے اٹھ گیا تھا

"اس کا ثبوت یہ ہے" لائیم نے کہا "میں نے آخری داؤ سمجھ کر پان کی بیگم کا پتہ پہلے ہی نکال لیا تھا۔"

"یہ دیکھو" لائم نے اپنے ہات میں پان کی بیگم کا پتہ دکھایا۔

سمپسن بولا "مجھے معلوم تھا۔ اس لئے میں نے جعلسازی پر جعلسازی کی اور ایک دوسری پان کی بیگم سارجنٹ کے پتوں میں رکھدی..... "میں ہمیشہ جعلسازوں کے ساتھ جعل سازی کرتا ہوں..... ادھر گھر پر میرا یہی پیشہ تھا....."

لائیم نے پستول نکال لیا لیکن یکایک عین اس موقع پر دروازے پر ایک بھاری قدموں والا امریکی سپاہی، لڑکھڑا کے گر پڑا اور گرتے ہوئے بولا "گوریلا عمارت کے اندر آ چکے ہیں۔ انھوں نے نیچے کی گارد کو صفایا کر دیا ہے جلدی سے بھاگو۔"

لائیم، کارٹن، جوس، سمپسن، سبھی لڑکیاں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ مسز پس پان کی بیگم نے چلا کے کہا "ٹھہرو"

امریکی سپاہیوں نے مڑ کے دیکھا کہ پان کی بیگم کے ہات میں پستول ہے وہ ایک لمحے کے لئے بالکل جھوچکے کھڑے رہ گئے۔ پان کی بیگم نے چلا کے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "تم نے سوچا تھا کہ اس عمارت میں کوئی مرد نہیں ہے لیکن تم بھول گئے کہ پان کی بیگم کا رنگ ہمیشہ سرخ ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کے اس نے لائیم کے سینے پر پستول چلا دیا۔ عین اس وقت لائم نے بھی گولی چلائی اور جوس اور کارٹن نے بھی۔ اور اسی وقت سیڑھیوں سے بھی کسی کے گولی چلانے کی آواز آئی۔

تھوڑی دیر بعد سب طرف سناٹا چھا گیا۔ گوریلاؤں نے ساری عمارت پر پھر سے قبضہ لے لیا۔ اور جگہ جگہ مشین گنوں کے گھوسلے جا دیئے سیڑھیوں کے قریب ہی دروازے پر کارٹن، سمپسن۔ جوس اور لائیم کی لاشیں پڑی تھیں۔ اور دروازے پر ایک اور امریکی سپاہی کی لاش تھی اور اندر وہ تین کوریائی لڑکیاں بھی مردہ پڑی تھیں جنھیں ان کے امریکی خریدنے

والوں نے نیلام گھر سے نزدیک تھا۔ اس دنیا سے جاتے ہوئے ان کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ چوتھی لڑکی پان کی بیگم بھی سخت زخمی ہو گئی تھی اور اس کے اوپر ایک گوریلا جھکا ہوا تھا اور اس کے شانے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔ "منگ! منگ! ہوش میں آؤ۔ میں آگیا تمہارا ہک۔" منگ آنکھیں کھولو ایک بوسے کے لئے ....."

منگ نے آنکھیں کھول کر ہک کو کی طرف دیکھا۔ اس کے پتلے لبوں پر ایک بڑی ہی دردناک جانگسل مسکراہٹ آئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا بازو اٹھا کر ہک کو کے شانے پر رکھ دیا۔ اور بڑی نرم آواز میں بولا۔ ہک کو ..... مجھے معاف کر دو۔ میں نے آخری دم تک تمہارا کہنا نہیں مانا۔ اور گوریلا فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ مجھے اس خطرے کا پتہ نہ تھا ....."

ہک کو نے پریشان ہو کے کہا۔ "مگر تم یہاں کیسے آگئیں منگ؟"

منگ بولی "میں آئی نہیں، لائی گئی ہوں۔ زبردستی میری طرح اور بھی چار سو لڑکیاں تھیں۔"

"چار سو؟" ہک کو نے وحشت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

"ہاں ہک کو، ہم چار سو تھیں" منگ نے آہستہ سے ہک کو کے کہا۔

ہک کو نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

منگ نے کہا "وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر گھر سے باہر گھسیٹ لائے۔ پہلے میں ننگی کی گئی، پھر ایک نیلام گھر میں جانور کی طرح بیچی گئی پھر تاش کے پتوں کی طرح کھیلی گئی۔ ہک کو! کیا ہم لوگ جانور ہیں؟ تاش کے پتے ہیں؟....."

ہک کو چپ رہا اس کے سینے میں ہیجانوں کا تلاطم تھا۔ وہ مگر اس وقت بول نہ سکتا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

منگ پھر آہستہ سے بولی "مگر میں نے انتقام لے لیا ہے ہک کو۔ تمہاری منگ نے اس کے خرچنے والے کو اس کی گولی کا نشانہ بنا دیا وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میں نے بڑے آہستہ سے ایک کی پیٹھ سے ریوالور نکال لیا ..... اسے پتہ بھی نہ چلا ....."

ہک کو کے پتھریلے چہرے پر شادابی کی کرنیں دوڑ گئیں۔ اس نے منگ کو کے سر کو سہارا دے کر بڑے پیار سے کہا "منگ میں جانتا تھا کبھی نہ کبھی مجھے بھی گوریلا بننا پڑے گا۔ کاش تو پہلے ہی سے بن جاتی کتنی گہری نیندوں میں، کیچڑ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اور پہاڑوں کے غاروں میں مجھے تیری یاد آئی ہے۔ لیکن ہر بار میں نے تیری یاد کو نفرت کی گالی دے کر اپنے اندر سے باہر پھینک دیا۔ ....."

منگ جو گوریلا نہ بن سکی، منگ جو اپنے دیش کے لئے لڑ نہ سکی۔

منگ کا دوسرا ہاتھ بھی اوپر اٹھ گیا اس نے آہستہ سے کہا۔

"اب تو اپنی منگ کو معاف کر دو، وہ اس دنیا سے جا رہی ہے۔"

منگ کے ہونٹوں سے لہو بہہ نکلا۔ لہو اور لعاب جیسے ہک کو نے اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیا اور منگ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں اور وہ بڑی کمزور آواز میں بولی "یاد ہے ہک کو۔ جب تم پہلی بار ہمارے گاؤں میں آئے تھے اور میں اپنے گھر کے باہر سفیدے کے جھنڈ تلے تھیں لی تھی۔ اور تم نے امن کی اپیل کا کاغذ میرے سامنے پڑھا دیا تھا۔"

"یاد ہے" ہک کو نے کہا ..... وہ بہار کے دن تھے۔ تمہارے گاؤں میں آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہی پھول تمہارے بالوں میں بھی چمک رہے تھے!"

"اور وہ چاندنی رات بھی یاد ہے۔ منگ بولی۔ جب محبت ہمارے دلوں سے بانسری کا نغمہ بن کے پھوٹی تھی۔ تم بانسری بجا رہے تھے۔ میں تمہاری آغوش میں تھی اور ہمارے سر کے اوپر شمشاد کے پتے جھوم رہے تھے۔ وہ پتے جن کا رنگ ایک طرف سے سبز مو تا ہے، دوسری طرف سے چاندی کی طرح سفید ہوتا ہے۔ اور آنکھوں میں کبھی زرد جھلکتا ہے اور کبھی چاندی۔"

"یاد ہے" ہک کو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس وقت ہیرکی سپاہیوں نے اس گاؤں کو جلایا نہیں تھا۔ ....."

منگ نے آنکھیں کھول کر ہک کو کی طرف دیکھا اور بالکل مدھم

سرگوشی میں کہا۔ "اور اس رات ہم نے سوچا تھا کہ دنیا میں امن ہوگا اور ہم اپنا چھوٹا سا گھر بسائیں گے۔ جس کے اندر ایک چھوٹا سا بدھ ہوگا۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہوگا۔ ہمارا اپنا بچہ۔ اور انگنائی میں چیری کے شگوفے ہوں گے اور تم سیرے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھا کے دھان کے کھیتوں میں کام کرنے جاؤ گے ....."

اور ہک کو کو وہ سب کچھ یاد آیا، اور اس کی جوانی کی تصویر اس کی محبت کی تنویر۔ ایک لمبی غلام گردش میں ایک شمع کی طرح جلتی ہوئی نظر آئی۔ پھر ہوا کے ایک ہی جھونکے سے اس کی جوانی بجھ گئی، اور اس کی محبت مر گئی اور اسے یہ محسوس ہوا جیسے منگ کے ہاتھ سرد پڑ گئے ہیں اور اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ وہ آنکھیں جو ہک کو کو محبت سے اپنے چھوٹے سے گھر، شمشاد کے پودے۔ بچوں کی ہنسی اور چیری کے شگوفے کو ترستی ہوئی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور ہک کو کو محسوس ہوا جیسے اسکے اپنے گال گیلے ہو گئے ہیں۔ اور اس نے آہستہ سے اپنے کھردرے ہاتھ سے اپنے گالوں کی نمی کو دور کیا۔ آہستہ سے منگ کی آنکھیں بند کر دیں۔ آہستہ سے اس کے چہرے پر اپنی فوجی ٹوپی ڈال دی۔ آہستہ سے اپنا کوٹ اتار کے اس کے جسم پر ڈال دیا اور آہستہ آہستہ لمبے پاؤں کرے سے باہر نکل آیا۔

باہر برآمدے میں اکتوبر کی خشک رات تھی۔ ننگے آسمان پر تارے چمک رہے تھے کہیں کہیں کوئی زور کا دھماکہ ہوتا۔ کہیں کوئی دھماکہ ہوتا۔ کہیں کوئی عمارت گر جاتی اور پھر لال لال شعلے افق پر لہرانے لگتے۔ پھر دور سے اور نزدیک سے مشین گنوں کے چلنے کی مسلسل آواز آتی اور پھر ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ ایسے ہی سناٹے کے وقفے میں ہک کو نے برآمدے میں ایک لمحے کے لئے کھڑے کھڑے سوچا۔ آج منگ بہت دور چلی گئی ہے اور سیرے کو ریا کے لئے کالی اندھیری رات ہے، لیکن کیا اس کے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے یہ کبھی نہیں سوچتے ہیں کہ کس طرح آج کو ریا اپنے خون سے امن کی اپیل پر دستخط کر رہا ہے۔

ہک کو نے گھور کر رات کی تاریکی میں دیکھا۔ جیسے وہ اس کالی پھیلی ہوئی رات کی تاریکی سے اپنا جواب چاہتا ہو۔ کیا یہ رات کا سناٹا، کو ریا کی مشین گنوں کے مسلسل شور سے ٹوٹ گیا، اور جیسے ہک کو کو اپنا جواب مل گیا اور اس نے مسکرا کر اپنی گن کے جبڑے میں کارتوس کی پیٹی اچھی طرح جما دی، اور اپنے مورچے پر جم کر بیٹھ گیا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنے کارتوس کو گننا جیسے وہ سوتیوں کے دانے گن رہا ہو۔ انھیں گنتے گنتے اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور اس نے اپنے دل سے کہا۔ ہم جانور ہیں، نہ تاش کے پتے۔ ہم کو ریا کے آزاد انسان ہیں۔ دشمن ہمارے ملک کے کونے کونے پر قبضہ کر سکتا ہے لیکن ہمارے دل کا ایک کونہ بھی اسے نہیں مل سکتا۔ اور جب تک ہمارے دل آزاد ہیں ہمارا کو ریا آزاد رہے گا بے شک آج رات کالی ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں تارے بھی ہیں بے شک آج سیول جل رہا ہے لیکن آج سیول جلتے ہوئے بھی لڑ رہا ہے۔ سیول کو سامراجی کبھی نہیں جیت سکتے۔ سیول کو ریا کا دل ہے۔

دیوار کے پاس

خواجہ احمد عباس

ہم اس سڑک پر سفر کر رہے ہیں جو پاکستان کو جاتی ہے۔ یہ میں اشاراتی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں (ان معنوں میں تو ہم کئی سال سے سفر کر رہے ہیں) میری مراد اس وقت مادی سفر سے ہے۔ یہ طویل سیدھی سڑک فاصلہ کے ساتھ ساتھ دھند لاتی چلی جاتی ہے —— اور سیالکوٹ اور اس سے پرے لاہور کو جاتی ہے۔

غروبِ آفتاب سے قبل کا سحور کن وقت ہے، جب سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کے سائے طویل ہوتے ہوتے شام کے دھندلکے میں مدغم ہو جاتے ہیں —— دھندلکا جس کے دامن پر کسی سائے کا داغ معلوم نہیں ہوتا۔ اور اس وقت پرانی یادیں خود بخود دل کے کسی گوشہ میں چیخنے لگتی ہیں۔ دھرتی پہ خاموشی چھائی ہوئی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی رفتار سے دوڑتی ہوئی جیپ کار کی آواز خاموشی کے دل کی دھڑکن ہے۔ یہ لمحہ سحر و اسرار کا لمحہ ہے۔ جیگا ڈر درختوں کی چوٹیوں کو چھوڑ کر اڑ رہے ہیں، جہاں وہ لٹکے ہوئے تھے، اور انھیں کی طرح یادوں کے بھی پر لگ گئے ہیں، جو ابھی تک دل کے گوشوں میں پناہ گزیں تھیں۔

کئی سال پہلے، بالکل اسی موسم میں، اور شام کے ایسے ہی دھندلکے میں، میں نے آخری بار اس سڑک پر سفر کیا تھا۔ اس زمانہ میں یہ سڑک "پاکستان جانے والی سڑک" نہیں تھی، اگرچہ سیاسی اور نظریاتی طور پر عوام کی ایک بڑی تعداد اس سڑک پر چل رہی تھی جو پاکستان کو جاتی تھی۔ اس زمانہ میں یہ سڑک صرف "جموں سیالکوٹ روڈ" تھی۔

میں سری نگر سے صبح روانہ ہوا تھا، اور اسٹیشن ویگن نے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی بہنال سڑک کی مسافت نو گھنٹے سے پیشتر ہی طے کر لی تھی۔ وادی سے پرے بہت اونچے اونچے درختوں سے ہوتی ہوئی اننت ناگ تک، اور پھر نشیب کی پہاڑیوں سے تیزی سے گذرتی ہوئی، اور بہنال کی سخت چڑھائی کے گرد چکر لگاتی ہوئی، ٹھٹھرتی ہوئی، یہ سڑک بادلوں کی سطح سے بھی کچھ اوپر آ جاتی ہے، اور پھر درّہ سے ہوتی ہوئی وادیٔ جموں میں اُترتی ہے۔ جو نسبتاً گرم علاقہ ہے۔ یہ سڑک فاصلہ کے ساتھ ساتھ اُترتی ہی رہتی ہے اور ہر سو فٹ کے بعد اودھ پور، سوئٹر، اور پھر معسکر اُتارنا پڑتے ہیں۔ سنہرے گنبدوں والے مندروں اور گنجان آبادی کے چھوٹے سے شہر جموں سے ہوتی ہوئی یہ سڑک سیدھی سیالکوٹ آتی ہے، پھر لاہور، پھر مرت سر، انبالہ، کرنال، پانی پت، دہلی —— اور پھر آگرہ اور الہ آباد ہوتی ہوئی یہ سڑک کلکتہ جاتی ہے، اور یہاں سمندر کو چھوتی ہے۔

میں سری نگر سے آ رہا تھا۔ جہاں میں نے عوام کے انقلابی مزاج کا مشاہدہ کیا تھا، جہاں میں نے روح کو لہرا دینے والے "کشمیر کو چھوڑو" کے نعرے سُنے تھے۔ میں لاہور اُن لوگوں سے ملنے کے لئے جا رہا تھا جو کشمیر کی تحریک آزادی کے قائد تھے، اور پنجاب میں انڈر گراؤنڈ تھے۔ میں سری نگر جاتے وقت بھی ان سے ملا تھا۔ لاہور سے مجھے دہلی اور بمبئی جانا تھا تاکہ میں تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو بتاؤں کہ میں نے کشمیر میں کیسی بڑی بڑی اور عجیب باتیں دیکھی اور سُنی ہیں۔

سیالکوٹ، ۱۲ میل!

سیالکوٹ، ۱۱ میل!!

ہر ڈیڑھ منٹ کے بعد سڑک کے کنارے لگا ہوا میل اور فرلانگ بتانے والا ایک پتھر تیزی سے گذر جاتا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس آرام سے سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، اور میری نظریں مناظر کے حسن اور سکون میں کھو گئیں۔ میری نظروں کے سامنے لامتناہی اور ہموار میدان تھا جو فاصلہ میں پھیلتا چلا جارہا تھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد کسان اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور سروں پر گھاس کے بڑے بڑے گٹھر لئے بیلوں کی جوڑیوں کے پیچھے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، جو ہماری سڑک کے دونوں طرف تھے۔

آج پھر وہی طلسمی لمحہ تھا۔ وہی خاموش منظر، وہی سڑک۔ زمین اور آسمان وہی تھے اور افق میں ڈوبتا ہوا سورج کا نارنجی گیند بھی وہی تھا۔

سیالکوٹ، ۹ میل!

میرے خیالات جیپ سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے۔ سیالکوٹ! لاہور! امرتسر!! جالندھر!! انبالہ!! پانی پت!! دہلی!!!

سیالکوٹ، ۸ میل!

طویل سیدھی سڑک آگے بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ دہلی سے بھی پرے کلکتہ تک، یا بمبئی تک، یا مدراس تک۔ یہاں، ہم ہندوستان کی وسعتوں کو چیرتے ہوئے جارہے تھے۔

لیکن نہیں، نہیں!! ـــــ ایک جھٹکے کے ساتھ جیپ رُک گئی۔ سوچیت گڈھ کی چوکی پر ریاست جموں وکشمیر کی سرحد ختم ہوتی تھی اور یہاں سڑک کانٹے دار تاروں سے بند تھی۔ بائیں ہاتھ کو چند فٹ پر تار اور ٹیلیفون کے تار کٹے ہوئے تھے۔ تار کی دیوار کے دونوں طرف سڑک پر ایک لکھما تھا، لیکن ان دونوں کے درمیان کے تار کٹے ہوئے تھے ـــــ دونوں طرف کے، دھول میں اٹے ہوئے انسانوں کے رشتے منقطع ہو گئے تھے! کیا کوئی ایسا آدمی نہیں تھا؟ ـــــ کیا کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جو ان ٹوٹے ہوئے تاروں کو جوڑ دے؟؟

ریاضی کا مشہور AXIOM کہ دو نقطوں کے درمیان سب سے کم فاصلہ ایک سیدھی لکیر ہے، اب صحیح نہیں رہا۔ سڑک پر آدھے میل آگے سرحد کی حفاظت کرنے کے لئے پاکستانی فوج کا دستہ ہے، لیکن اگر وہ سوچیت گڈھ میں مقیم ہندوستانی فوج سے کوئی گفت وشنید کرنا چاہے تو اسے یہ کرنا پڑے گا کہ بذریعہ تار سگنل بھیجے، اور یہ سگنل سیالکوٹ، لاہور، امرت سر، پٹھان کوٹ اور جموں ہوتا ہوا سوچیت گڈھ آئے گا۔ جو کام صرف ایک طرف سے چیخ کر دوسری طرف اطلاع کر دینے سے ہو سکتا ہے، اس کے لئے دو سو میل کا چکر ہو گیا ہے۔

اس وقت بھی مجھے معلوم ہوا کہ اسی طرح دو سو میل کی مسافت طے کر کے سیالکوٹ کے پاکستانی کمانڈنگ بریگیڈر کا ایک پیغام ہندوستانی بریگیڈر کے پاس آیا ہوا تھا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتا ہے، یہ ملاقات دوستانہ اور تہذیبی تھی۔ اور اس طرح ایک بار کانٹے دار تاروں کی دیوار سڑک پر سے ہٹ گئی اور پاکستانی فوج کے نوجوان بریگیڈر کی جیپ ہندوستانی علاقہ میں آگئی۔ یہ دونوں بریگیڈر ایک دوسرے کے پرانے دوست نکلے۔ دونوں ملٹری اکیڈمی اور سٹاف کالج میں ساتھ ساتھ تھے، اور ایک دوسرے کو پہلے نام سے پکار رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی پیٹھ تھپتھپائی اور گلے ملے۔ پھر دونوں چائے پر گذرے دنوں کے قصے لے کر بیٹھ گئے۔ پاکستان کے بریگیڈیر نے (جو شاید بھوپال کا رہنے والا تھا) بتایا کہ اس کی بیوی حیدرآباد میں ہے اور اس فکر سے وہ پریشان ہے۔ ہندوستان کے بریگیڈر نے وعدہ کیا کہ وہ پتہ لگائے گا (اور اس نے پتہ لگایا ـــــ وہ خیریت سے تھی) پھر پاکستان کے افسر نے کہا "ہم لوگوں میں سنا جارہا ہے کہ تم لوگ حملہ کرنے والے ہو" ہندوستان کے افسر نے یقین دلایا کہ اس کا ایسا ارادہ ہے، اور نہ کوئی ایسا حکم اسے ملا ہے۔ اس کے بعد دونوں نے ہاتھ ملائے، پاکستان کی جیپ واپس چلی گئی، اور کانٹے دار تاروں کی دیوار پھر سڑک پر کھنچ گئی۔

میں نے تاروں کی اس فصیل کو دیکھا اور میرے ذہن میں یہ خیال گونجنے لگا کہ یہ فصیل ہندوستان کا مکروہ ترین منظر ہے، زنگ آلود، گندے کانٹوں دار تار خوبصورت منظر کو سفاکانہ مسخ کر رہے ہیں۔ میرا شدت سے جی چاہا کہ اس کو توڑ دوں اور ہماری جیپ سیالکوٹ جانے والی سڑک پر نہ مڑ کر سیدھی دہلی۔ کیوں نہیں؟ ـــــ ایک بار ایسا ہوا تھا ـــــ اب کیوں نہیں؟ قدرتی INSTINCTS.

ان مصنوعی حدوں سے بغاوت کر رہی تھیں جن کا تعین سیاست دانوں نے کیا تھا۔

میں نے داہنی طرف مڑ کے دیکھا میری نظروں کے سامنے سوچت گڑھ کا دیہات تھا لیکن ویرانہ تھا ان سرحدی دیہاتوں میں کئی میل تک جھونپڑیاں ہیں مگر بغیر چھپر یا کھپریل کی ـــــ کھیت ہیں مگر ان میں فصل نہیں!

میں نے بائیں طرف مڑ کے دیکھا۔ تاروں کی دیوار کے اس پار پاکستانی علاقہ میں، قریب آدھے میل پر سوچت گڑھ کا ریلوے اسٹیشن تھا ـــــ لیکن وہ بھی ہندوستانی علاقہ کے دیہات کی طرح ویران تھا، وہ ریلوے اسٹیشن نہیں تھا، صرف ریلوے اسٹیشن کا بھوت تھا۔

میں نے چند لمحوں کے لئے کنکیلے تاروں کی فصیل ہٹانے کی اجازت حاصل کر لی۔ میں، میرا دوست، اور سکھ کپتان (جو ہمیں اسکورٹ کر رہا تھا) پاکستانی علاقہ میں داخل ہو گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کوئی بین الاقوامی قانون توڑا تھا۔ ایک سال بعد، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں خود کو پاکستان میں کس طرح محسوس کروں گا۔ وہاں رہنے کے بعد (وہ چاہے میں ایک ہی لمحہ رہا ہوں) میں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہاں رہنے کے کیا تاثرات ہیں۔ **کچھ نہیں! کوئی فرق نہیں!** وہی زمین ـــــ اور وہی آسمان!!

میں نے سڑک کے پاکستانی حصہ پر کسی چیز کو متحرک دیکھا میں نے کپتان سے اس کی دوربین مانگ لی۔ ایک کسان اپنے سر پر گھاس کا گٹھر لادے جا رہا تھا، بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ طاقتور شیشوں نے اسے مجھ سے بالکل قریب کر دیا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ پھٹی ہوئی میلی چیکٹ فتوہی اور پنجابی تہبند پہنے ہے۔ میں نے گھوم کر دوسری طرف دیکھا۔ سڑک کے ہندوستانی حصہ پر بالکل اسی طرح کا ایک کسان سر پر گھاس کا گٹھر لادے جا رہا تھا۔ بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ وہ دوہرا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی پھٹی ہوئی میلی چیکٹ فتوہی اور پنجابی تہبند پہنے ہے۔

اور اس ایک لمحہ میں میں نہیں بتا سکتا تھا کہ کس طرف پاکستان ہے، اور کس طرف ہندوستان!

۱۹۴۹ء کا

آج دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک ترقی پسند تحریک لہریں لے رہی ہے اور دنیا کے تمام باشعور شاعر یک زبان ہو کر امن، اخوت اور اشتراکیت کے حق میں اپنی آواز بلند کر رہے ہیں ـــــ اور یہ آواز

دیس دیس

میں گونج رہی ہے

'دیس دیس' میں روس، چین، جاپان، امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان، چیکوسلواکیہ، ہنگری، یونان، اسپین، برما، ملایا، انڈونیشیا، ٹرکی، کابل، برازیل، ہندوستان، پاکستان، افغانستان، ایران، پولینڈ، ویت نام فلپائن، البانیہ، کاکیشیا، کوریا، تبت، فارس، اور ہر چھوٹے بڑے دیش کی منتخب نظمیں جمع کر دی گئی ہیں۔

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ (زیر طبع)

مرتبہ مترجمہ: پرکاش پنڈت

مکتبہ شاہراہ ۰ دھلی

بہترین ادب

۱۹۴۹ء ایک طوفان کا اختتامیہ تھا اور دوسرے طوفان کا دیباچہ اور اس اختتامیہ اور دیباچے کے واضح خدوخال آپکو "۴۹ء کا بہترین ادب" میں ملیں گے۔ ۴۹ء کا بہترین ادب، ایک معرکۃ الآرا انتخاب ہی نہیں ادب کے نئے موڑ کی مستند توضیح ہے۔

قیمت چار روپیہ

مکتبہ شاہراہ ۰ دھلی

ریس کورس

محمد ناشط

(ناول "آدمی اور سکے" کا ایک باب)

ریس کورس واقعی ایک بہت بڑا ہنگامہ ہے۔ اس جگہ آکر واقعی انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ سامنے گھوڑوں کے نمبر لگے ہوئے تھے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ اور ان کے نیچے مشین کی کھٹ کھٹ سے بکتے ہوئے ٹکٹوں کی تعداد بتدریج لکھی جا رہی تھی۔ جو گھوڑا سب سے مقبول ہوتا ہے یعنی جس گھوڑے کے جیتنے کی زیادہ امید ہوتی ہے اس کے ٹکٹ زیادہ بکتے ہیں۔ دائیں ہاتھ پر پلیس (Place) کے ٹکٹ بکتے ہیں۔ بائیں ہاتھ پر صرف جیتنے والوں کے لئے اسٹال بنا ہوا ہے۔ کھٹ کھٹ کھٹ ٹکٹ بکتے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے ہوش و حواس کھو کر کھڑکیوں کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ اوپر سامنے بورڈ پر گھوڑوں کا نمبر ہے۔ ان کے ساتھ جاکیوں کا نام اور ان کے ساتھ وزن اور گھوڑے کا بھاؤ۔

"گورو سنگھ جاکی بہت اچھا ہے" کوئی چلاتا ہے

"ارے یا پچھلی بار اسی سالے پر روپیہ لگایا تھا۔ کہیں نظر نہیں آیا۔" دوسرے نے جواب دیا

"ارے رام سنگھ پر لگاؤ آج ضرور جیتے گا۔"

"میاں اس پر نہ لگانا۔ کمبخت عین موقع پر گھوڑا کھینچ لیتا ہے اور دوسروں سے مل جاتا ہے۔"

"گھوڑا اگر ہے تو وائل کرو سیڈ"

"بالکل بڈھا کھوسٹ"

"راج کماری پر لگاؤ۔ جاکی نالائق ہے"

"پریم لتا کا کیا بھاؤ ہے؟"

بھائی بھاؤ بہت ہے۔ گھوڑی کام کی ہے لیکن ٹرینر Trainer اچھا نہیں۔ امید بہت کم ہے۔"

"یار پانچ روپے دینا۔ میں ابھی واپس کرتا ہوں۔"

"ابھی کتاب دکھانا"

"کون سا گھوڑا جیتے گا؟"

"صبح جب میں گھر سے باہر نکلا تو سب سے پہلی کار جو نظر آئی اس کا نمبر ۳ تھا، اسی پر لگاؤ۔"

"وہ پنڈت جی نے تو نمبر ۹ بتایا تھا۔"

"ارے یار ان پنڈتوں کو نمبر کا پتہ ہوتا تو خود سڑکوں پر مارے مارے نہ پھرتے۔"

"مجھے تو ایک جاکی نے ٹپ دیا ہے۔ وہ سالہ ٹپ کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ نمبر ۸ کالے رنگ کا گھوڑا۔ اور جاکی نے سرخ رنگ کی ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔"

"آج بدھوار ہے۔ سرخ رنگ کے لئے بہت ہی خراب دن ہے"

"اگر میرا گھوڑا جیت جائے تو اس کی قسم مہینے بھر کی شراب کا خرچ نکل آئے۔"

"شراب تو بمبئی میں بند ہو گئی ہے"

"بلیک مارکیٹ میں عام ملتی ہے۔"

"آج کھدر پوش بہت نظر آتے ہیں۔"

"آج جواہر جیتے گا۔"

"بالکل نہیں۔ ڈانوا ڈول قسم کا گھوڑا ہے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔"

لوگ باتیں کر رہے تھے۔ بورڈ دیکھ رہے تھے۔ کتاب پڑھ رہے تھے۔ عورتوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیویوں، معشوقوں کو گھوڑوں کا نمبر بتا رہے تھے۔ اِدھر آ رہے تھے اُدھر جا رہے تھے۔ ادھر کبوں کے دس پندرہ ٹال تھے۔ یہاں مالدار آدمی آکر روپے لگاتے ہیں۔ ایک سو دو سو نہیں۔ دس پانچ سو بلکہ دس ہزار، بیس ہزار۔ پچاس ہزار۔ بکی چلا رہے تھے، سامنے چھوٹے چھوٹے بورڈوں پر گھوڑوں کے نام اور ان کے بھاؤ۔ جس گھوڑے کی زیادہ جیتنے کی امید ہوتی ہے ان کا بھاؤ سب سے کم رہے گا۔ نمبر ۱ پر پانچ پر پانچ ہزار، نمبر دس پر دس ہزار۔ نمبر ۷ پر پانچ ہزار نمبر ۹ پر بیس ہزار۔ بکی کارڈ پر نمبر اور بھاؤ دیتا ہے، اور ساتھ ہی رقم اگر گھوڑا جیت گیا تو اس بھاؤ پر بکی اتنے دام دے گا۔ بس تو دس ہزار غائب بیس ہزار اور پانچ سو بکی کی جیب میں ہیں۔

اس ہل چل میں گھنٹی بجتی ہے لوگ دوڑنے لگتے ہیں۔ عورتیں بھی مرد بھی بھی پویلین (Pavillion) کی طرف دوڑتے ہیں۔ ریس شروع ہو گئی ہے، لوگ بائناکولر (Binocular) لگا کر ریس دیکھ رہے ہیں۔ ابھی تک لوگ خاموش ہیں۔ ریس کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں۔ کوئی صاف اور واضح پوزیشن معلوم نہیں ہوتی۔ گھوڑے نزدیک آنے لگتے ہیں ایک گھوڑا سب سے آگے ہے۔ ایک آدمی چلاتا ہے: "راجدھی۔"

ساتھ والا: "شٹ اپ۔ راجدھی نہیں، جواہر۔"

"ابے کو اس مت کر دو۔"

ایک شخص بنچ پر کھڑا ہو کر زور سے چلاتا ہے "پریم لتا۔"

باقی ——— "پریم لتا ——— پریم لتا۔"

اب گھوڑے نزدیک آ گئے ہیں۔ ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ پریم لتا آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے ساتھ جواہر ہے۔ "سب لوگ چلاتے ہیں۔ گردن بڑھا بڑھا کر دیکھتے ہیں۔" پریم لتا۔ پریم لتا۔ پریم لتا۔ دونوں پویلینوں میں لوگ پاگلوں کی طرح چلا رہے ہیں۔ گلا پھاڑ رہے ہیں۔

میں لوگ خاموش ہیں۔ اتنا نہیں چلاتے ہیں۔ یہ پویلین بڑے بڑے آدمیوں کا ہے۔ ٹرف کلب کے ممبروں کا ہے۔ راجاؤں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا ہے۔

گھوڑے بھاگ رہے ہیں۔ لوگ بھاگ رہے ہیں اور آخر میں کیا ہوتا ہے۔ نہ پریم لتا جیتتی ہے نہ جواہر جیتتا ہے ٹاٹا اپنی حیوانی ہنسی ہنستا ہے۔

ارے یار غضب کیا ٹاٹا نے عین وقت پر حیوانی کہاں لی کسی کو معلوم نہ تھا۔ سب سے پیچھے تھا یہ گھوڑا۔

یہ ریس سب فراڈ ہے

جاکی نے ۴۲۰ کی ہے۔

ٹرینر (Trainer) نے جان بوجھ کر یہ شکست کرائی ہے۔

جاکی نے جواہر کی لگام کو کھینچ لیا تھا۔

اور راجہ تو ہانپ کر رہ گیا۔ جاکی نے بہت مارا پیٹا لیکن باگ میں دم نہ تھا۔"

"ٹاٹا نے غضب کیا۔ کیا ریس تھا اس پر؟"

"کون سا جاکی تھا؟"

"پرانا آدم خور"

"کسی کو معلوم بھی نہ تھا۔"

"کیا بھاؤ؟"

"دس کے چار سو بیس"

"بہت کم ٹکٹ بکے ہوں گے۔"

اور جو لوگ ہار گئے تھے انھوں نے اپنے ٹکٹ پھاڑ دیے اور اپنی اپنی محبوباؤں کی طرف دیکھنے لگے۔ محبوبائیں مسکرانے لگیں کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ دوسرے گھوڑے پر۔ اب پھر ٹکٹ شروع ہو گئی تھی۔ نمبروں کا نمبر۔ لوگ کتابیں دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ

تھک ہار کر جائے پی رہے تھے۔ سوڈا لیمن پی رہے تھے۔ کچھ لوگ گھوڑوں کا نمبر دیکھ رہے تھے۔ بہت سی طوائفیں چہروں پر غازہ پوڈرل کر گاہکوں کی تلاش میں آئی ہوئی تھیں۔ کچھ منچلے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ریس کورس ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ راجہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ حمیدہ اور تیرتھ اس سے الگ ہو کر نہ معلوم کہاں چلے گئے تھے۔ اچھا اس کو جانے دو، وہ ان کے ساتھ رہ کر کیا کرے گا۔ وہ اس ریس کورس کو دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا، جو روپیوں کے لئے اتنا شور مچا رہے تھے اتنا روپیہ کہاں سے آتا ہے اور لوگ بے دریغ بغیر سوچ بوجھ کے روپے خرچ کر رہے تھے۔ بغیر کسی حیص و بیص کے۔ کسی کے چہرے پر اس وقت فکر نہ تھی۔ سبھی لوگ خوش نظر آ رہے تھے۔ یہ عجیب قسم کی تفریح تھی۔ ریس کورس میں تین پولیس (Police) ہوتے ہیں۔ تیسرا درجہ، دوسرا درجہ اور پہلا درجہ۔ وہی ریل کے ڈبوں والا حساب۔ وہی سرمایہ دارانہ نظام جو زیادہ دام دے وہ بڑے بڑے پولیس میں کھڑا ہو جائے۔ واقعی یہاں ہندو اور مسلمان کا امتیاز نہ تھا ہندو سکھ کا امتیاز نہ تھا۔ ہریجن اور برہمن کا امتیاز نہ تھا۔ یہاں طوائف اور شریف عورتوں میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ یہاں اگر کوئی رشتہ تھا تو صرف روپے کا صرف روپے کا۔ انسان بے جان تھے۔ حیوان تھے۔ بیوقوف تھے۔ اور اس جگہ گھوڑوں کی زیادہ عزت ہوتی تھی۔ لوگ گھوڑوں کو چومتے تھے۔ انکے پاؤں کی خاک کو سر پر لگاتے تھے۔ جیتنے والے جاکی کو خدا سے بہتر سمجھتے تھے۔ اس کے الفاظ کو وید اور قرآن سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور راج سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ کسی گھوڑے پر پیسہ لگا دے۔ اوما ٹریبل پول تھا (Treble pool) باکچ روپے لگائیے اور ایک لاکھ کمائیے۔ تین ریسوں میں تین گھوڑوں کے نام بتائیے یا ان کے نمبر۔ اگر آپ کے وہی تین گھوڑے آجائیں تو آپ ٹریبل پول جیت جائیں گے۔ زندگی بھر عیش کریں گے۔ ۵ روپیہ سے ایک لاکھ۔ جو۔

سستہ۔ بدمعاشی، طوائفیت سب کچھ تھا یہاں پر۔

راج اب ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ تیرتھ حمیدہ کی کمر میں بازو ڈالے ہوئے ادھر گھوم رہا تھا۔ حمیدہ اس کے ساتھ تھی محبوب کا ؟ روٹھ کر چلا گیا تھا۔ اچھا ہوا۔ اور راج اکیلا کھڑا تھا اور بورڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

"اس ریس میں کون سا گھوڑا جیتے گا۔ ؟"

اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔

لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ آنکھوں پر گاگل لگائے ہوئے تھی۔

راج کچھ گھبرا سا گیا۔

"جی۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں پہلی بار اس ریس کورس میں آیا ہوں اور پھر بتائیے کیا فائدہ۔"

"کیوں ؟"

"میں ریس کھیلنے کا عادی نہیں"

"لیکن آپ یہاں آئے کیوں"

"ریس دیکھنے کے لئے"

"اوہ۔ آپ عجیب قسم کے آدمی ہیں"

"جی۔ عجیب نہیں۔ ایک عام قسم کا آدمی ہوں۔"

"آپ چلئے پئیں گے ؟"

"آپ بہت بے تکلف نظر آتی ہیں"

"آپ ضرورت سے زیادہ شرمیلے ہیں۔ تو آیئے چلئے پی لیں"

راج لڑکی کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اسے لڑکی اچھی لگی۔ لڑکی نہ موٹی تھی نہ پتلی۔ جسم کے خدوخال میں ایک دلکشی تھی لڑکی نے ایک رومال اپنے چہرے کے گرد لگایا ہوا تھا۔ میز پر پہنچ کر لڑکی نے گاگل اتار دیا۔ وہ سیاہ آنکھیں نے اس کی طرف دیکھا اس نے اس قسم کی آنکھیں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ساتھی خوشگوار ملنے۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں کہ میں اجنبی نہیں ہوں۔ میں اجنبی نہیں ہوں۔ تم مجھے جانتے ہو۔ میں تمہیں

جانتی ہوں۔" آپ کا نام ؟" لڑکی نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
لڑکی کی آواز میں ایک رس تھا۔

"راج"

"اور آپ کا ؟"

"شیلا"

شیلا نے چائے کا آرڈر دیا۔ اس نے پھر شیلا کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ اسے شیلا کا چہرہ پسند آگیا۔ اس کی ناک پسند آئی۔ اور اس کے پتلے پتلے ہونٹ پسند آئے جو اب کھلے ہوئے تھے۔ گویا دعوت دے رہے تھے مجھے چوم لو۔ مجھے چوم لو۔

اس لڑکی کو دیکھ کر راج کو تسکین ہوئی۔ آنکھوں میں ایک بھیگی بھیگی سی چمک تھی اور بلاؤز اتنا تنگ اور پتلا پہنا ہوا تھا کہ چھاتیوں کا معمولی سا ابھار بھی صاف نظر آتا تھا۔ شیلا اس کے قریب سمٹی ہوئی تھی اور راج شیلا کے بدن کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ راج کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس لڑکی کو اپنے جسم کا خاص طور پر خیال ہے۔ اس میں ایک تربیت ہے۔ جسم کو سجانے کا خاص شوق پرورش پا رہا ہے۔ راج نے پھر شیلا کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ اگر یہ لڑکی ہنسی تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ بالکل پاگل ہو جائے گا۔ شیلا نے چائے کا آرڈر دیا۔

پیچھے سے کسی کی آواز

"ہلو شیلا !"

راج نے مڑ کر دیکھا ایک نوجوان اس کے سامنے کھڑا تھا دبلا پتلا۔ بال گھنگھریالے ہوئے۔ نہایت سادہ کپڑوں میں ملبوس۔

"آپ ہیں راج" شیلا نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "اور آپ ہیں رمیش۔ کافی باتونی"

"کیوں کچھ چھپیں ؟"

"کچھ نہیں بلکہ ہارگئی"

"اور تم ؟"

"میں تو کبھی ریس نہیں کھیلتا۔"

"تم آج یہاں کس طرح آگئے ؟"

"بھائی پہلی بار آیا ہوں اور دوبارہ کبھی نہ آؤں گا۔"

"وہ کیوں"

"عجیب بدتمیزی ہے۔ سوائے شور مچانے کے کچھ کام ہی نہیں۔ یہاں تو وہ لوگ آئیں جن کے پاس ہزاروں روپے پڑے ہوں جو ہار کر بھی چہرے پر شکن نہ لا سکیں۔ جو انسانوں کی جگر گوشوں کی عزت کریں جو بلیک مارکٹ کر کے ——————"

"دیکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ سی۔ آئی۔ ڈی۔ والے پکڑ لیں گے میں تمہیں کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ ایسی جگہوں پر ایسی باتیں نہ کیا کرو اور تم پھر اسی قسم کی گفتگو کیا کرتے ہو۔"

"اچھا بھائی میں چلا آواب"

اور رمیش چلا گیا

راج نے پوچھا کہ یہ صاحب کیا کام کرتے ہیں ؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ایک دو بار چندہ لینے آئے تھے۔ اسی سلسلہ میں گفتگو ہوئی تھی۔ کافی عرصہ کے بعد آج یہاں ملے۔"

"آپ کیا کام کرتی ہیں"

"میں ناچتی ہوں"

"فلم یا سٹیج پر"

"دونوں پر"

"کافی روپے کماتی ہوں گی"

"جی نہیں۔"

"پیٹ بھر جاتا ہے۔ چلئے چائے پیجئے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے"

"آپ نے مجھ سے کیوں بات کی۔ یعنی اس بڑے ہجوم میں مجھے ہی کیوں تاکا۔"

"سوال کافی دلچسپ ہے۔ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اکیلے کھڑے تھے۔"

"یہ کوئی معقول جواب نہیں ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"Right as rain" شیلا نے مسکرا کر کہا

"میں آپ سے ہرگز امید نہیں کرتا۔"

"آپ ضرورت سے زیادہ صاف گو نظر آتے ہیں۔"

دراصل میں اکیلی کھڑی تھی اور میرے قریب آپ اکیلے کھڑے تھے۔ اور آپ کچھ اداس سی آنکھوں میں کافی پیاس کی جھلک تھی میں اُدھر سے گذری، کافی رہے ہار گئی تھی۔ آپ کو دیکھا۔ میں نے بلا لیا۔ آپ آ گئے۔ بیسٹری کھائیے۔"

"نہیں۔ پاس روپے بہت کم ہیں۔"

"جی نہیں، مجھے روپوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ نے غلط سمجھا۔"

اور شیلا خاموش ہو گئی۔ جیسے برف کے گلشیر سے ٹکرا گئی ہو اس کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ شوخی اور شرارت ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ یہ ایک عجیب قسم کا سوال تھا جس کا کوئی جواب نہ تھا۔ شیلا نے جلدی سے چائے پینا شروع کی۔ ریستوراں میں کافی لوگ بیٹھے تھے۔ سگرٹ اور سگار پی رہے تھے۔ اور گھوڑوں، جاکی اور گھوڑوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شیلا اور راج دونوں کتنے بیٹھے رہے تھے۔ یکایک شیلا نے چائے ختم کر دی۔ بیرے کو بلایا۔ پیسے دینے لگی۔ راج نے ہاتھ بڑھا دیا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے لبوں پر آ گئی۔

شیلا کھڑی ہو گئی۔

"اچھا اجازت دیجئے گا۔ بڑی مختصر سی ملاقات ہے" وہ جانے لگی تو راج نے کہا۔

"آپ کا پتہ؟"

"میرین لائنز، حق لائن، دوسرا فلور۔"

اور وہ سیڑھیوں کے پاس کو سنبھالتی ہوئی چلی گئی۔ راج نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ریستوراں میں آ رہی تھی۔ شیلا۔ قد لمبا تھا۔ جسم متناسب تھا اور ساڑھی کو پہننے کا انداز آتا تھا۔ اب وہ چلی گئی تھی۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ راج یہیں بیٹھا رہا۔ سوچ رہا تھا کہ ابھی اچھا ہوتا کہ وہ نہ جاتی۔ اتنی جلدی کیوں چلی گئی کیا اس کی باتوں میں جاذبیت نہ تھی۔ ہاں وہ بالکل خاموش رہا۔ تھوڑی سی باتیں کیں اور وہ بھی پھیکی پھیکی۔ ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ اُسے یہ لڑکی پسند تھی لیکن کیوں؟ یہ لڑکی کیوں پسند تھی۔ ایک اور آدمی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے سگنل چائے کا آرڈر دیا۔ لڑکی جوان تھی، اس کا جسم اچھا تھا اس کے چہرے کے خدوخال خوبصورت تھے۔ اس سے پہلے بھی اس نے خوبصورت لڑکیاں دیکھی تھیں۔ لیکن یہ ان سے الگ تھی، بالکل الگ تھلگ۔ یہ ان سے زیادہ خوبصورت نہ تھی لیکن وہ اسے پسند تھی۔ شاید اس لئے کہ لڑکی نے اسے پسند کیا تھا۔ پہلے اس نے بات کی تھی۔ لڑکی اُسے ضرور پسند کرتی ہو گی۔ شیلا نے کیوں بلایا اور پھر چلے کے لئے آرڈر دیا اور وہ کتنی صحت مند تھی۔ اس میں زندگی کی چھلک تھی۔ ایک کشش تھی اور وہ اکیلا تھا۔ لڑکیاں اس سے کھل کر بات نہ کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ اکیلا اور اس وجہ غمگین محسوس کرتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی طرف اس طرح جھکا تھا۔ ان نظروں سے دیکھا تھا اور وہ کچھ کہے بغیر چلی گئی تھی۔ وہ کچھ واپس دیکھنے کی دیر سے وہ کیوں اُسے کیا معلوم۔ پہلی ملاقات میں اسے کیا کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ جب دوبارہ ملے گی تو وہ اس سے پوچھے گا کہ وہ اداس کیوں رہتی ہے۔ اُسے کس بات کا غم ہے۔ کیا وہ اس کے غم میں شریک ہو سکتا ہے۔ راج نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ جلے پی کر چلے گئے تھے ریس کی گھنٹی بج چکی تھی۔ گھوڑوں نے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی ریستوراں سے باہر نکلا۔ لوگ چلا رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ گھوڑوں کا نام لے کر اچھل رہے تھے۔ پدمنی۔ پدمنی۔ بک اپ بک اپ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لوگ چیخ رہے تھے اس انتظار میں ابھی ان کا گھوڑا جیت جائے گا اور وہ مالا مال ہو جائیں گے۔ ریس ختم ہو جاتی ہے

جھنجھنے والے جلدی سے ٹکٹ کو کیش کرانے کھڑکیوں کی طرف جاتے ہیں اور ہونے والے گھوڑے کو گالی دیتے ہیں۔ ہاکی کر گالی دیتے ہیں اور پھر اگلی ریس شروع ہو جاتی ہے اور اسی طرح دس بارہ ریس ہوتی ہے پھر آخری ریس۔ یہ سب گھاتے ہیں۔ اس خواہش سے کہ وہ جیت جائیں گے۔ بوکار تر دیں گے۔ کوٹھی بنائیں گے۔ نئی محبوبہ رکھیں گے۔ شادی کریں گے بچے ہوں گے۔ وہ باپ کی عزت کریں گے۔ اپنے ساتھ کھانے کھائیں گے۔ اور پرانے دوستوں کو بلائیں گے اور کار کو لے کر دوستانہ کی کھڑکی کے نیچے کار کریں گے۔ اور پھر ان کو جلائیں گے۔ یہ کیا قومی کار ہے یہ کیا ہے دیکھو۔ سر دیکھو۔ اس کار کی طرف دیکھو۔ کتنا ہرن جتنے ہیں۔ تو کسی دوڑی کار کو ہارے ہوئے جواری دیکھتے ہیں اب کچھ نہ تھا۔ نہ بیوہ نہ کار نہ کوٹھی صرف اپنے چار بچے ایک بیوی ایک کھولی اور کل کے راشن کس طرح آئے گا۔ پھر اچھی قسمت کا رونا۔ یہ عجیب قسم کا کھیل ہے۔ یہ عجیب تفریح ہے۔ اس تفریح کا خیال آتے ہی ملکہ تیرتھا اور نصیدہ کو خیال آیا۔ وہ کہاں ہوں گے۔ یہیں کہیں ہوں گے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہ انھیں کہاں ملے۔ شاید وہ اب ان کو نہیں مل سکتا اتنی بھیڑ میں کہ ان نظر آئیں گے۔ اچانک مل گئے۔ رات کو مل لوں گا۔ اور اس سوچ بچار میں ریس ختم ہو گئی۔ آخری ریس ختم ہو گئی اور وہ واپس چلا آیا۔ ریس کے کورس سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے پیچھے ہوئے دیکھا۔ تو اسے تماشے اور کچھ نہیں۔ محروم چہرے، اور اس لگتا ہیں۔ لوگ گالی بکتے ہوئے سر ہلاتے ہوئے پیدل جا رہے تھے۔ آگے تھے ہنستے کھیلتے۔ جا رہے تھے رہے تو پیٹتے کچھ لوگ خوش تھے۔ شاید ان لوگوں نے دو پیسہ جیتا ہو لیکن زیادہ لوگ ہار کر آئے تھے۔ اس نے اس سارے ہجوم کو دیکھا۔ نہ اسے حمیدہ نظر آئی اور نہ شیلا کو اس نے دوبارہ دیکھنا چاہا لیکن وہ کسی نظر نہ آئی۔ وہ بھی چپکے سے باہر نکلا۔ باہر کاروں کی بھیڑ تھی ٹیکسیوں کا ایک تانتا بندھا ہوا تھا لیکن زیادہ تر ٹرنگ پیدل جا رہے تھے۔ قریب ہی اسٹیشن تھا۔ شاید گوئٹ ادھر جا رہے تھے اسٹیشن کی طرف وہ بھی اس طرف ہو لیا۔ قریب ہی سے ایک موٹر گذری۔ کسی نے ہاتھ ہلایا یا اس نے دیکھا۔ شیلا ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔ موٹر چلی گئی اور تھوڑی سی خاک ہوا میں تیرتی ہوئی نظر آئی۔ اور کی نظر کے سامنے سے دھندلی ہو گئی۔ بلڈنگیں کھڑی تھیں۔ قریب ہی ایک مل منہ اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور منہ سے دھواں نکال رہی تھیں اور یہ سوچتا گیا اور آگے بڑھتا گیا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ ایک نامعلوم سی خوشی اس کے جسم و پے میں سما رہی تھی۔ اس کی تنہا اکیلی زندگی میں ایک اور صحت ابھر رہی تھی۔ ایک انجانے جذبے سے وہ بہکا جا رہا تھا اور دور مغرب میں سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور اس کی لو اداس کر رہی تھی۔ اور پیچھے اونچے مکانوں کی چھتوں کو چوم رہی تھیں۔ ہوا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

چاندی کے تار، نئی بیماری مائی ڈارلنگ، ہوٹل، پاکستان سے ہندوستان تک، جہاں میں رہتا ہوں

مقبول فاتح افسانوں کے ان چھ مجموعوں کا مصنف ہے

اور اب ہندر فاتح اپنا اولین ناول

ادھی اور رسیلے

پیش کرتا ہے

قیمت ساڑھے تین روپے (زیر طبع)

مکتبہ شاہراہ دہلی

ہندر اپنے فن کے ارتقائی دور میں ہے۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہمہ گیر وسعتوں کا حامل ہو گیا ہے ہندر رومان پرست نہیں ہے بلکہ حقیقت نگار ہے اس وجہ سے اس کے بیان میں تلخی، شدت اور احساس ناآسودگی ہے۔ وہ انسانیت کے باب میں رومان و محبت کی ہلکی پھلکی شعاعوں سے گزر کر طبقات کے اقتصادی کس بل کو دیکھتا ہے۔ یہ نیا رجحان بہت کم افسانہ نگاروں میں پایا جاتا ہے

ممتاز حسین

پریم ناتھ پردیسی

آنسو اور چھری

رات کو ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور سڑک پر پھیلی ہوئی ریت پر بیشمار چھید سے ہو گئے تھے۔ سُرمئی سڑک کے دونوں کنارے گیلے تھے اور ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے آنکھ کے پپوٹے روتے روتے بوجھل ہو گئے ہوں۔ اور اُن پر اب تک آنسوؤں کی نمی باقی ہو۔ سڑک سے دُور جَو کے کھیتوں سے پرے ایک ندی بہتی تھی اور گرمیوں میں ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے دھوپ میں ننگی تلوار چمک رہی ہو لیکن آج سطحِ ابر آلود تھا۔ اور لوگ کہتے تھے شاید پھر بارش ہو۔ سڑک کے ایک طرف ایک گول پارہ تھا۔ اس کے بعد سوگز لمبی سڑک تھی اور اس کے سرے پر دو سرا گول پارہ۔ یہ دو مملکتوں کی سرحدیں تھیں۔ جہاں دونوں مملکتوں کے قومی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ سرحدوں کی حفاظت کے لئے دونوں طرف مسلح فوجی پہرہ دے رہے تھے۔

سرحد کے دونوں طرف کچھ خیمے تھے۔ چند ٹوٹی پھوٹی دوکانیں تھیں۔ ان کی بھٹیاں، میزیں کرسیاں اور پانی کے کنستر تھے اور ان کے سامنے لیٹی ہوئی سُرمئی سڑک گیلی، ریتیلی، خاموش اور سنسان تھی۔ اور سڑک کا ایک حصہ ایک مملکت میں تھا دوسرا حصہ دوسری مملکت میں اور درمیانی حصہ ایسی مملکت میں جسے کوئی اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور جس کی حفاظت کے لئے نہ مسلح سپاہی تھے نہ قومی جھنڈے۔ تین حصوں میں کٹنے کے باوجود بھی سڑک ایک تھی۔ اس کی وحدت برقرار تھی۔ اس پر کہیں گھاؤ کا نشان تھا نہ گڑھے کا۔ خدا جانے اس کے تین حصوں کو روندتے ہوئے دن میں کتنی لاریاں، بسیں اور کتنے آدمی گذرتے تھے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، امیر اور غریب۔ مگر دھرتی کا یہ ٹکڑا کسی سے کچھ نہ کہتا تھا۔ اس کے نزدیک مذہب، رنگ، نسل اور عمر کی کوئی تفریق نہ تھی۔ اس کی حیثیت مشترک اور جرگیر تھی۔ لوگ کہتے ہیں تین سال پہلے دھرتی کے اس ٹکڑے نے انسانی لہو سے نہایا تھا۔ بیشمار عورتوں کی لٹی ہوئی عصمتیں دیکھی تھیں۔ ہزاروں بچوں کو بے بس اور بھوکی ماؤں کی گودیں دم توڑتے دیکھا تھا۔ ناتواں بوڑھوں کو اپنے بیمار اور نحیف جسم گھسیٹتے دیکھا تھا۔ اور اس وقت بھی یہ چپ تھا۔ دونوں طرف سے ہزاروں لوگ آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کچھ دعائیں دیتے ہوئے کچھ اپنے نصیبوں کو کوستے ہوئے۔ کچھ روتے ہوئے، کچھ سسکیاں بھرتے ہوئے۔ کچھ پاپیادہ، کچھ اوروں کی پیٹھ پر، اور اس وقت بھی دھرتی کا یہ ٹکڑا خاموش تھا اور آج بھی یہ چپ ہے۔ جیسے اس میں جان نہیں۔ جذبات نہیں، خون نہیں۔

اور اسی ٹکڑے پر، ایک طرف کی گول پار سے پرے ایک نوجوان کی نظریں دُور دُور تک دوڑ رہی تھیں۔ ان کیکر کے درختوں سے بھی پرے جن کے بعد کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اور پھر پلٹ کر آجاتی تھیں۔ اسے شاید کسی کی آمد کا انتظار تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی جیب سے ایک بوسیدہ سا خط نکال کر پڑھتا اور اسے دوبارہ جیب میں رکھ دیتا۔ ہاں اُسے انتظار تھا اپنی بیوی کا جسے وہ آج سے چار سال پہلے سری نگر میں چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ آج وہی آرہی تھی اپنے بوڑھے سسر کے ساتھ۔ اور جوں جوں لمحے گذرتے جاتے تھے نوجوان کی بیقراری بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جاتی تھیں۔ اس کی رگوں میں پارہ دوڑنے لگتا تھا۔ ایک بار چلتے چلتے وہ گول پار تک بھی آگیا۔ اور پہرے پر کھڑے سپاہی نے اُسے آواز دے کر روکا۔ "کہاں جائیگا؟"

نوجوان جیسے خواب سے بیدار ہو گیا۔ اس کی آوارہ نظریں سکڑ گئیں۔ اور وہ سنہرا جال جو وہ چند لمحے پیشتر اپنے لاشعور میں بُن رہا تھا ٹوٹ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ اور سپاہی نے بندوق تان کر بڑی مضبوطی سے پوچھا۔ "کہاں جائے گا؟"

"میں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ مجھے بھاگنا نہیں ہے۔"

سپاہی کو اس کی دہشت سے شک ہو گیا۔ اس کا اس نے گریبان پکڑ لیا۔ "بھاگتا نہیں ہے تو حیراں کیا کرتا ہے۔ دوکاندار ہے؟"

"نہیں۔"

"ملازم ہو۔"

"نہیں میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"تو یہاں کیا کر رہے ہو؟" سپاہی نے اسی مضبوطی سے پوچھا۔

"میرا ایک آدمی اُدھر سے آ رہا ہے۔ اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"آدمی۔؟ کون ہے وہ؟"

"میری بیوی آ رہی ہے۔"

"بیوی کہاں سے؟"

"سری نگر سے"

سپاہی کو ہاتھ خود بخود اس کے گریبان سے چھوٹ گیا۔ "پرمٹ پر آ رہی ہے؟" سپاہی نے پھر پوچھا۔

"ہاں یہ دیکھو۔" اس نے جیب سے خط نکال کر سپاہی کو دکھایا۔

"کون اس کے ساتھ ہوگا؟" خط لیتے ہوئے سپاہی نے پوچھا۔

"میرا باپ ـــــ لیکن ادھر کی گاڑی کس وقت آتی ہے؟"

"ساڑھے دس بجے۔ اس وقت کپتان صاحب بھی آئیں گے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہی آنے والوں کے پرمٹ دیکھتے ہیں۔"

سپاہی کی گفتگو سے نوجوان کو کچھ کچھ حوصلہ مل گیا۔ بے اختیاری میں اس نے گول بار کے آہنی ڈنڈے کا سہارا لیا اور دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

سپاہی نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے پرے دھکیل دیا۔ "احمق کہیں کا"

نوجوان کی سوچیں بھٹک گئیں۔

"اس ڈنڈے کے سہارے کھڑے ہوتے ہو۔ نہیں جانتے یہ سرحد ہے۔"

دوسری طرف کے سپاہی نے پوچھا۔ "کیا ہوا۔ بھاگ رہا ہے؟"

"اس بند وقت سے بچ کر بھاگ جائے گا؟"

دونوں طرف کے سپاہی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

نوجوان خوفزدہ ہو کر دوکانوں کی طرف چلا گیا۔ آہنی ڈنڈے کے تقدس پر وہ دل ہی دل میں حیران تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ آہنی ڈنڈا نہ تھا بلکہ صدیوں کی پھری تھی۔ جس سے لاکھوں انسان چر گئے تھے۔ اور ان کا خون منجمد ہو کر زنگ کی صورت میں اب تک اس پر لگا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں طرف گہما گہمی پھیل گئی۔ لہراتے ہوئے جھنڈوں کے نزدیک بے شمار وردی پوش فوجی ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ سیز کرسیاں بچھ گئیں اور عارضی دفتر لگ گئے۔

نوجوان بیقراری کے عالم میں کبھی ادھر بھاگنے لگا اور کبھی ادھر۔ اسے دوسری طرف کے ہجوم میں نہ اپنی بیوی نظر آ رہی تھی نہ باپ۔ سب بیگانے تھے۔ اس طرف کے لوگ بھی اور اس طرف کے لوگ جو کچھ مسرت میں چلا رہے تھے۔ اور کچھ آنسو بہا رہے تھے۔ بعض منتظرین کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار تھے۔ جو وہ آنے والوں کو پہنانے کے لئے ساتھ لے آئے تھے۔ بعض کے ہمراہ بڑا سازوسامان تھا۔ اور بعض نہایت خستہ حالی میں کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح ڈول رہے تھے۔ دونوں طرف سے شور بے ہنگم برپا تھا۔ رومال لہرا رہے تھے۔ اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعرے بلند تھے۔ اور اسی ہنگامے کے نیچے تین حصوں میں کٹی ہوئی سرزمین خاموش تھی۔ البتہ اس کی بیقراری میں ایک نامحسوس قسم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسے اس کے جذبات کو ٹیس پہنچی ہو۔ اس کے پپوٹوں کی نمی اُبھر آئی تھی۔ جیسے کسی ماں نے

یکایک اپنے بچھڑے ہوئے بچے دیکھے ہوں اور وہ سارا غم بھول کر خوشی کے آنسو بہا رہی ہو۔ لیکن پھر بھی ان بچوں کے درمیان ایک بچھڑی تقدس کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ جس کی تقدیس کی حفاظت مسلح سپاہی کر رہے تھے۔

سماً ایک گاڑی کے رکتے ہی نوجوان پھڑک اُٹھا۔ اس کی بیوی آگئی تھی۔ اس کا باپ آگیا تھا۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا اور بے اختیاری کے عالم میں اس کے منھ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ دوڑا دوڑا گلوں بار کے پاس آگیا۔ "میری بیوی آگئی ہے۔ میرا باپ آگیا ہے"۔ اس نے سپاہیوں سے کہا۔ لیکن کسی نے اس کی مسرت کا اندازہ نہیں لگایا۔ اس کی روح آہنی ڈنڈے کو پھاند کر وہاں پہنچ گئی تھی جہاں اس کی بیوی اور اس کا باپ سامان کی تلاشی دے رہے تھے۔ اور اپنی شناخت کے کاغذ پیش کر رہے تھے۔

پھر ایک طرف کا آہنی ڈنڈا آہستہ آہستہ اور پھر اُٹھا اور فوجی حراست میں سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے اس کے نیچے سے گذر گئے اور دوسری سرحد کے گول بار کے نزدیک آگئے۔ ان میں اُسکی بیوی بھی تھی اور باپ بھی۔ دونوں طرف کے سپاہیوں نے گنتی شروع کی اور خدا کی مخلوق بھیڑ بکریوں کی طرح گنی جانے لگی۔ ان سے کہا گیا۔ کہ وہ جھنڈے کو سلام کریں جو گول بار کے ساتھ لہرا رہا تھا۔

پھر دوسری طرف کا آہنی ڈنڈا اوپر اُٹھا۔ لوگ ایک دوسرے کے گلے ملے کچھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کچھ مڑ مڑ کر حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے کچھ کی گردنوں میں پھولوں کے ہار پڑے۔ نوجوان کی بیوی دوسری مملکت میں داخل ہو گئی لیکن نوجوان کا باپ ڈنڈے کو عبور نہ کر سکا۔ وہ صرف بہو کو سرحد تک پہنچانے کے لئے آگیا تھا۔

بیٹا ایک مملکت میں تھا اور باپ دوسری مملکت میں اور دونوں کے درمیان ایک بچھڑی تھی جس نے آج تک لاکھوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا تھا۔ آج وہ باپ اور بیٹے کو جدا کر رہی تھی۔ فرطِ مسرت میں دونوں کے ہونٹ چند ثانیوں کے لئے بند رہے۔ صرف آنکھیں، آنکھوں کی پتلیاں اور پلکیں باتیں کرتی رہیں۔ باپ کی بڑھی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے بہہ نکلے جو لڑھکتے لڑھکتے اس کی داڑھی میں گم ہو گئے۔

"یہ خدا کی مرضی تھی" بیٹا صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"الحمد للہ میں غلامی سے آزاد ہو گیا"۔ باپ کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے یہ الفاظ پھسل گئے۔

"روکیوں رہے ہو ابا؟ تم بھی چلے آؤ نا یہیں ..... ہمارے پاس۔ مجھے پرمٹ نہیں ملتا"

باپ کی غمناک آنکھوں نے جواب دیا۔ "میں سب سمجھتا ہوں بیٹا"! پھر چند لمحوں کے بعد اس کے کانپتے ہونٹ کہہ پائے۔ "جب ہی نے اتنا بڑا کیا، اُسے کیسے چھوڑ دوں بیٹا"؟

"ہاں کا کیا حال ہے۔ سُنا ہے وہاں ....."

"ہیں زمین مل گئی ہے۔ وہی جو ہم چکدار کے لئے کاشت کر رہے تھے۔"

"سب کی سب، ——؟ بیٹے نے حیرت سے پوچھا۔

"اخروٹ کے درختوں سمیت جو ندی کے کنارے کھڑے ہیں ——"

"یہ کیسے ابا ——؟"

"ایسے ہی جیسے اللہ نے چاہا۔ خیر جانے دو۔ تم اتنے لاغر کیوں ہو۔ روٹی نہیں ملتی ——؟"

بیٹا خاموش ہو گیا۔ البتہ اس کی نگاہیں اپنے ہی جسم کا تجزیہ کرنے لگیں۔

"دیکھنا بچی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ آج تک گھر سے باہر نہیں نکلی ہے ——"

بیٹے کا سر جھک گیا۔ شرم کے مارے کچھ نہ بولا ——!

باپ کا ہاتھ جیب کی طرف گیا —— "یہ لے لو —— کام آئے گا"

بیٹے نے باپ کے ہاتھ سے سیلی سی تھیلی لے لی۔ "یہ کیا ہے؟" بیٹے نے پوچھا —— "گھر پہنچ کر دیکھ لینا —— اس سے زیادہ .....!"

باپ کچھ نہ بول سکا۔ وہ ٹکٹکی باندھے چار برس کے بچھڑے ہوئے لختِ جگر کو دیکھ رہا تھا —— باپ بیٹا آخری بار گلے ملے اور جب دونوں بچھڑ گئے تو باپ بھی رو رہا تھا اور بیٹا بھی۔ اور دونوں کے آنسو نیچے تین حصوں میں کٹی ہوئی دھرتی اپنی پلکوں سے چن رہی تھی۔ لیکن درمیان میں کھڑی زنگ آلود مگر مقدس چھری، جیسے قہقہے لگا رہی تھی —— دُور تک دونوں آنسو بہاتے ہوئے مخالف سمتوں کو چلے گئے۔ اور جہاں سڑک مڑ رہی تھی۔ وہاں دونوں نے مڑ کر دیکھا —— اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ——!!

بنجارا

میکسم گورکی کی

سمندر سے آنے والی بھیگی ہوا کے سرد جھونکے ساحل کی ریت پر خاردار جھاڑیوں کا اداس گیت پھیلاتے ہوئے چلے جاتے کبھی کبھی ہوا کے جھکڑ اپنے ساتھ پیلی پیلی مرجھائی ہوئی پتیاں لے آتے جنھیں وہ الاؤ کے ناچتے ہوئے شعلوں کے منہ میں جھونک دیتے اور خزاں کی رات کی پرچھائیاں کانپتی ہوئی پیچھے ہٹ جاتیں پھر ایک لمحے کے لئے بائیں طرف گھاس کے وسیع میدان اور دائیں طرف بے کنار سمندر اور میرے سامنے بوڑھے بنجارے کا کارچوبہ دار شکل ابھرتی جو اپنے قافلے کے گھوڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ قافلے کے ڈیرے پچاس قدم کے اندر ہی لگے ہوئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کے تیز جھونکوں نے بے نیاز بنجارے کے قفقازی لبادے کو کھول کر اس کے سینے کے بالوں پر اپنی سرد انگلیاں پھیر رہے تھے۔ وہ ایک پرتقاضا انداز سے زمین پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کا منہ میری طرف تھا اور وہ بڑے اطمینان سے اپنا پائپ پی رہا تھا اور منہ اور ناک سے دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔ اس میدان کے بھیانک اندھیرے میں وہ مجھے گھور رہا تھا اور بے تکان باتیں کئے جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ٹھنڈی ہوا کے بے رحم جھونکوں سے بچانے کے لئے ذرا سی جنبش بھی نہیں کر رہا تھا۔

"اچھا! تو تم آوارہ گردی کے لئے نکلے ہو؟ بہت خوب۔ تم نے بڑا اچھا شغل اختیار کیا ہے صاحبزادے۔ خوب گھومو۔ ساری دنیا کو دیکھ لو۔ جب تم سب کچھ دیکھ چکو اور تمہارا جی بھر جائے تو اطمینان سے مر جانا بس۔"

میں نے اس کے "اور بس" کہنے پر احتجاج کیا۔ مگر اس نے میری بات کی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا اور بدستور بولتا رہا "زندگی؟ دوسرے لوگ؟ ہوں؟ تمہیں اس کی کیا فکر؟ کیا تم زندگی نہیں ہو۔ دوسرے لوگ تمہارے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں اور تمہارے بغیر ہی زندگی گذار دیں گے۔ تم سمجھتے ہو کہ کسی کو تمہاری ضرورت ہے۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ تم نہ رونی ہو نہ ونڈا۔

"تم لمبے ہو سکتے ہو۔ تم نہیں لکھ سکتے۔ اس سے پہلے ہی تمہارے بال سفید ہو جائیں گے اور پھر کیا سکھاؤ گے؟ ہر شخص کو اپنی ضرورت معلوم ہے۔ جو زیادہ ہوشیار ہیں وہ جتنا جھپٹ سکتے ہیں جھپٹ لیتے ہیں۔ سیدھے سادوں کو کچھ نہیں ملتا۔ پھر بھی ہر شخص خود ہی سیکھ لیتا ہے۔

"اور تمہارے یہ لوگ بھی کس قدر عجیب ہیں" اس نے چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دنیا میں اتنی جگہ ہونے کے باوجود اس طرح ایک جگہ کھچ کر پڑے ہیں کہ ایک دوسرے کو پیر تلے کچلے ڈال رہے ہیں اور بس تمام وقت محنت کرتے ہیں۔ کیوں؟ کس کے لئے ——— یہ کسی کو نہیں معلوم ——— تم کسی کو ہل چلاتے ہوئے دیکھتے ہو؟ اور سوچتے ہو ——— یہ اس زمین پر اپنی تمام طاقت قطرہ قطرہ کر کے ٹپکا دیتا ہے پھر اس میں لیٹ جاتا ہے اور گل سڑ جاتا ہے اور اپنے جسد کا کچھ نہیں چھوڑتا ——— اپنے کھیت کے سوا اس نے کچھ نہیں دیکھا جیسا پیدا ہوتا ہے ویسا ہی

ہو جاتا ہے ——— احمق

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ زمین ہی کھودنے کے لئے پیدا ہوا تھا اور پھر بھی اپنی قبر تک نہ کھود سکا؟ کیا وہ جانتا ہے آزادی کیا ہے؟ کیا اس کے ذہن میں ان حسین بے پایاں چٹانوں کا تصور ہے؟ کیا ان چٹانوں کا گیت اس کے دل کو مسرت بخشتا ہے؟ وہ جس ڈھب پیدا ہوتا ہے غلام ہوتا ہے، اپنی تمام عمر غلام رہتا ہے اور بس! وہ اپنے لئے کر بھی کیا سکتا ہے سوائے اس کے اگر اس میں کچھ سمجھ ہے تو اپنے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے۔

"ذرا مجھ کو دیکھو! اٹھائیس برس کی عمر میں میں نے اتنا کچھ دیکھا ہے کہ اگر تم کاغذ پر لکھنا شروع کر دو تو تمھارے اس قبیلے جیسے ہزاروں قبیلے بھر جائیں، تم صرف مجھ سے یہ پوچھو کہ میں کون سی جگہ نہیں گیا ہوں؟ ایسی کوئی جگہ نہیں۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ میں کیسی کیسی جگہ پہنچا ہوں ——— زندگی اسی کا نام ہے ——— دنیا کا چکر لگاؤ اور یہی سب کچھ ہے! ایک جگہ یا دیرینہ ٹھہرو اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جس طرح دن اور رات، دنیا کے چاروں طرف ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں اسی طرح تم زندگی کے خیال سے بھاگتے ہو تاکہ تم اس سے آنکھ بچا ڈالو۔ ایک دفعہ تم سچا پھوڑ دو بس تم زندگی سے بھاگ جاؤ گے ——— ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے ——— ہونہہ! ہاں ایسا ہی ہوا میاں صاحبزادے۔"

"میں کہتا ہوں کہ میں زندہ ہوں ——— میں کیا کہوں اس دنیا میں زندہ ہوں؟ ——— بس میری طبیعت اکتانے لگی اور مجھ پر کچھ ہوں سا طاری ہونے لگا ——— جی ہاں تو ویسے ہی کوئی ہو لگتا ہوتی ہے۔ کافی نہیں بلکہ بہت ہو ناک ہوتی ہے صاحبزادے جب میں کھڑکی سے باہر پیڑوں کی طرف دیکھتا تھا، تو میرا دل گھبرانے لگتا تھا۔ اتنا گھبراتا تھا کہ لگتا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں پکڑ کر مسل رہا ہے۔ کون بتا سکتا ہے وہ کس لئے زندہ ہے؟ کوئی نہیں بتا سکتا صاحبزادے۔ تم اپنے آپ سے سوال کرو۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ زندہ رہو ——— اور بس ——— گھومتے رہو اور چاروں طرف دیکھتے رہو۔ تم کبھی نہیں اکتاؤ گے۔ اس وقت تو میں نے تقریباً اپنے آپ کو پیٹی سے ٹکا ہی دیا ہوتا۔ واقعی"

"ہونہہ! میں نے ایک دفعہ ایک آدمی سے بات کی وہ تمھاری طرح کا روسی تھا، کافی سنجیدہ آدمی تھا۔ اس نے کہا تم جس طرح چاہتے ہو ویسے نہیں رہ سکتے۔ تم کو خدا کے احکام کے مطابق رہنا ہوگا۔ خدا کے طاعت گزار بنو، جو تم مانگو گے ملے گا۔"

"وہ خود میلے پھٹے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا تجھے نیا سوٹ مانگو" وہ غصہ سے آگ بگولا ہو گیا اور گالیاں دے کر مجھے بھگا دیا ——— تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بتا رہا تھا کہ تمھیں اپنے بھائیوں کو معاف کر دینا چاہیئے، دوسروں سے محبت کرنی چاہیئے۔ وہ بزرگ بھی مجھے معاف کر سکتا تھا۔ اگر چہ میرا کہنا اسے برا لگا ——— ایسے ہوتے ہیں تمھارے سادھو یہ تمھیں کم تھا سکھائیں گے اور خود دن میں دس گناہ یاد کھوئیں گے۔"

اس نے آگ میں تھوکا اور خاموش ہو گیا۔ دریا پانی پھر بھرنے لگا۔ ہوا آہستہ آہستہ سرسرا رہی تھی۔ گھوڑے اندھیرے میں ہنہنا رہے تھے۔ جھینگروں کے نیم سے دھکا راگ کے مدھم دلسوز سُر فضا میں پھیل گئے۔ لاکا کی خوبصورت بیٹی نوکا گا رہی تھی۔ میں اس کی ہلکی ہلکی آواز خوب پہچانتا تھا۔ وہ کچھ عجیب سی تھی، اس میں بے چینی و وقار بھی جاسے وہ گیت گائے اور چاہے خالی سلام ہی کیوں نہ کرے۔ اس کے تمتماتے ہوئے گندمی چہرے پر ایک ملکہ کا سا تکبر تھا۔ اس کی گہری بھوری آنکھوں کی وجھیلوں میں خود اس کے بے پناہ حسن کا احساس جھلکتا اور ہر اس چیز سے حقارت جو اس میں نہ تھی۔

ناکام نے اپنا پائپ بڑھا دیا

"لو ایک کش لو ـــــ لڑکی اچھا لگتی ہے۔ وہ لڑکی ہے؟ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ ایسی لڑکی کی محبت کی خواہش ہے؟ نہیں؟ بہت ٹھیک! کبھی لڑکیوں کا یقین نہ لانا اور ہمیشہ ان سے دور ہی دور رہنا۔ مجھے پائپ پی کر جتنی مسرت ہوتی ہے لڑکیوں کو اس سے زیادہ مسرت اور خوشی پیار کرنے سے ہوتی ہے لیکن اگر ایک دفعہ تم نے پیار کیا تو بس پھر ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی کو خیرباد کہہ دو گے وہ تم کو ایسی غیر مرئی رسیوں سے جکڑے گی کہ تم اُن کو کبھی نہ توڑ سکو گے، یہاں تک کہ تم اپنی روح اس کے قدموں میں ڈالدو گے۔ یہ حقیقت ہے۔ لڑکیوں سے خبردار رہنا! یہ سب کی سب جھوٹی ہوتی ہیں؛ وہ تم سے کہیں گی کہ مجھے تم سے دنیا میں سب سے زیادہ محبت ہے۔ تم ذرا اسی پن چبھا کر دیکھو اور وہ تمہارا دل توڑ دے گی۔ میں ان کو اچھی طرح پہچانتا ہوں ـــــ سچ مچ میں جانتا ہوں۔ اچھا صاحبزادے میں تم کو ایک کہانی سناؤں ایک سچی کہانی، اس کو ہمیشہ یاد رکھنے کی کوشش کرنا اور تم تمام زندگی طائر کی طرح آزاد رہو گے۔

"ایک زمانے میں ایک جہان جیسی تھا ـــــ جوان جیسی اس کا نام تھا لوکیو زوبار۔ تمام ہنگری، بوہیمیا اور سلاوونیا اور ہندوستان کے چاروں طرف ہر شخص اس کو جانتا تھا۔ کیسا لاجواب لڑکا تھا، اس طاقت میں کوئی بھی تو ایسا جاٹوں نہ تھا جس کے کم از کم آدھی درجن باشندے اس کو جان سے مار ڈالنے کی قسم نہیں کھائے ہوئے تھے پھر بھی لوکیو زندہ رہا۔ اگر اس کی نظر کسی گھوڑے پر پڑجاتی تو چاہے سپاہیوں کا پورا دستہ ہی تعینات کیوں نہ کر دیا جائے زوبار اس گھوڑے پر سوار گھومتا ہوا نظر آتا۔ آہ۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ خوف اس کے پاس ہی نہ پھٹکتا۔ اگر شیطان کا بادشاہ بھی اپنی فوج لیکر اس کے پاس آتا تو وہ اس کے پیٹ میں ایسا چھرا بھونکتا کہ سب کو بھاگتے ہی بن پڑتی۔ تم میری بات کا یقین مانو۔

"تمام جپسی قبیلے اس کو جانتے تھے یا اس کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اگر اسے کسی چیز سے عشق تھا تو وہ گھوڑے تھے اور کسی دوسری چیز سے نہیں۔ یہ بھی بہت دیر کے لئے نہیں۔ وہ تھوڑی دیر اپنی سواری میں رکھتا اور پھر بیچ ڈالتا۔ وہ پیسہ جو اس سے مانگنا چاہے لے سکتا تھا۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا جس سے اُسے اُنس ہو۔ اگر تم اس کا دل بھی مانگتے تو وہ اپنا سینہ چیر کر تمہیں دے دیتا بشرطیکہ تم اس سے خوش ہو جاتے۔ وہ اس قسم کا انسان تھا صاحبزادے۔

"دس برس ہوئے ہم ایک قافلہ بوکووینا (Bukowina) میں گشت لگا رہا تھا۔ موسم بہار کی ایک رات میں بوڑھا سابی ڈینیلو جو کیمپ کا لڑا تھا ـــــ اور باقی سب لوگ اور روڈا۔ ڈینیلو کی بیٹی۔ ہم سب گھیرا ڈالے بیٹھے تھے۔

"تم میری بیٹی نوکا کو جانتے ہو کہ نہیں؟ کافی خوبصورت ہے لیکن وڈا سے اس کا مقابلہ بھی کرنا اس کے لئے باعث فخر ہے میرے پاس اس لڑکی روڈا کے حسن کو بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں شاید اس کا حسن و اُلمن کے تار ادا کر سکیں لیکن اگر کوئی ایسا شخص بجائے جوانس و اُلمن کو اتنا ہی جانتا ہو جتنا اپنے آپ کو۔

اس نے کتنے حسین لڑکوں کے دل توڑے تھے ـــــ ہاں ہاں کتنے ہی خوبصورت جوانوں کے۔ اور اداؤں میں ایک بہت رئیس خلیفی نے اُسے دیکھا اور بس جیسے اس پر بجلی گر گئی ہو۔ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا گھومتا رہا اور اس طرح کپکپاتا۔ جیسے اُسے رعشہ ہو گیا ہو۔ جیسی کے دن اس کی شامت جو آئی تو وہ اپنے گھوڑے پر سوار شیطان کی طرح اٹھلاتا ہوا آن پہونچا۔ وہ آفرین کی زد میں کڑیدہ کاری کا ایک کوٹ پہنے اور اپنی تلوار لٹکائے، جس پر قیمتی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جس میں سے گھوڑے کی ٹاپوں سے بجلی کی چنگاری ایسی چمک نکلتی کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتیں اور اس کی ٹوپی کی مخملی دو اینٹ ایسی تھی جیسے آسمان کا ٹکڑا ہو۔ وہ امیر بڑھاکو کوئی بہت بڑا رئیس تھا! وہ گھومتا رہا اور گھومتا رہا یہاں تک کہ اس نے روڈا سے

طرح ایک نوجوان اپنے بزرگ کا کہنا مانتا ہے اسی طرح کل تم میرا حکم بجالانا۔ کل تم تمام جپسیوں کے سامنے میرے آگے دوزانو ہو کر میرے دائیں ہاتھ پر بوسہ دینا۔ پھر میں تمھاری بیوی ہو جاؤں گی۔"

"تو وہ یہ چاہتی تھی ـــ دیوانی لڑکی! ایسا کبھی سننے میں بھی نہیں آیا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ کسی زمانہ میں مونٹے نیگریز (Montenegrins) میں یہ رواج تھا لیکن جپسیوں میں یہ کبھی نہیں سنا تھا! کیوں صاحبزادے، اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اگر تم ایک برس بھی اپنا سر دھنو تو نہیں بتا سکتے۔

"لوئیکو مارے کرب کے دوہرا ہو گیا اور ایسی دلدوز چیخ چٹانوں میں گونجی کہ جیسے کسی نے اس کے سینے کو شق کر دیا ہو۔ رڈا وزا جھکی مگر اظہار نہیں ہونے دیا۔

"اچھا تو کل تک کے لئے خدا حافظ اور کل تم میرے حکم کی تعمیل کرو گے، سن رہے ہو لوئیکو!"

"سن رہا ہوں۔ ہاں کروں گا۔ زوبار کے منہ سے ایک آہ نکلی اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور چلی گئی۔

"وہ ہوا سے اکھڑے ہوئے پیڑ کی طرح جھوما اور دھم سے زمین پر آ رہا۔ وہ کبھی ہچکیاں بھرتا، کبھی ہنستا۔

"اسی ناہنجار رڈا نے یہ حشر کیا ہے سارے کا۔ مجھے اس کو ہوش میں لانے میں کافی دقت پڑی۔

"اُف میں پوچھتا ہوں آخر لوگوں کو اسقدر دکھ کیوں بھوگنا پڑتا ہے؟ کسی کے دل کا غم درد اور آہیں کون سنتا ہے؟ تم اگر سمجھ سکتے ہو تو بتاؤ!.....

"میں نے واپس جا کر جپسیوں میں ہو چکا بوڑھے کو تمام واقعہ بتایا۔ انھوں نے سوچا چلو معاملہ سدھر گیا۔ یہ سمجھا کہ باقی جو ہوگا دیکھا جائیگا اور اب سوکیا ہوا اگلے روز جب تمام کو آگ کے گرد ہم سب جمع ہوئے تو لوئیکو بھی آن پہونچا۔ وہ بہت ہی پژمردہ تھا۔ ایک ہی رات میں اسکا چہرہ کملا کر رہ گیا تھا اور اس کی آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ ہماری طرف دیکھے بغیر نیچی نظریں کئے ہوئے ہم سے کہنے لگا۔

"ساتھیو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آج میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اس میں پہلے جیسی لاابالی زندگی کی کوئی خواہش باقی نہیں اب اس میں صرف رڈا رہتی ہے ـــ اور کچھ نہیں۔ اب حسین رڈا ایک مسکراتی ہوئی ملکہ کی طرح اس میں بسی ہوئی ہے۔ وہ اپنی آزادی کو مجھ سے زیادہ چاہتی ہے، اور میں اس کو اپنی آزادی سے زیادہ چاہتا ہوں لہذا اس کے حکم کے مطابق میں نے اپنے گھٹنے اس کے آگے ٹیک دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ سب لوگ دیکھ لیں کہ کس طرح اس کے حسن نے بہادر لوئیکو زوبار پر فتح پائی ہے۔ وہ زوبار جو اس سے پہلے لڑکیوں سے اس طرح کھیلتا تھا جیسے شاہ باز چڑیوں سے۔ اس کے بعد وہ میری بیوی بن جائے گی۔ مجھے پیار کرے گی اور میری اس طرح دلجوئی کرے گی کہ پھر مجھے گیت سنانے کی میرے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی اور نہ مجھے اپنی آزادی کھونے کا رنج ہوگا۔ ٹھیک ہے نا۔ رڈا؟ اس نے اپنی نظر اس پر گاڑ دی۔ اس نے بڑے متکبرانہ انداز میں اپنا سر ہلایا اور ہاتھ سے پیروں کی طرف اشارہ کیا ہم کچھ سمجھے بغیر دیکھتے رہے۔ بلکہ ہمارا اٹھ جانے کو دل چاہا لوئیکو کہ ہم لوئیکو زوبار کو ایک لڑکی کے قدموں پر گرتا ہوا دیکھنا نہیں گوارا کر سکتے تھے وہ لڑکی چاہے رڈا ہی کیوں نہ ہو ہمیں ایک قسم کی خجلت اور رنج محسوس ہوا۔

"رڈا نے زوبار سے کہا: اچھا تو.....!

"افوہ اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ ابھی تو بہت وقت ہے تمھارا جی بھر جائے گا....." اس نے ایک طنزیہ ادا میں ہنستے ہوئے کہا۔ اس ہنسی میں لوہے کی سی سختی تھی۔

"تو ساتھیو: مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا! اب آئندہ؟ آئندہ اس کا امتحان ہے۔ گر آیا رڈا کا دل اتنا مضبوط بھی ہے جیسا اس نے

مجھے دکھایا ہے۔ میں اس کا امتحان لوں گا۔۔۔ مجھے معاف کر دینا ساتھیو!"

"اس سے پہلے کہ ہم ان الفاظ کا مطلب سمجھ سکیں زوبار کا چاقو بتے تک اس کے سینے میں پیوست تھا اور رڈا زمین پر چت پڑی تھی ہم پر ایک دہشت طاری ہوگئی۔

"اور رڈا نے چاقو باہر کھینچ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اپنے سیاہ بالوں کی ایک لٹ اپنے زخم پر دبالی۔" خدا حافظ لوئیکو! مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کرو گے۔" یہ مسکراتے ہوئے اس نے اتنی بلند آواز سے کہا کہ سب نے سُن لیا۔ اس کے بعد وہ مرگئی۔

"اب کچھ تمہاری سمجھ میں آیا صاحبزادے۔ وہ کس قماش کی دوشیزہ تھی؟ خدا کی پناہ کیا لڑکی تھی۔ قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

"ہاں اے مغرور ملکہ! اب میں تیرے پیروں پر سر رکھ دوں گا لوئیکو کی لرزتی آواز چٹانوں میں گونجی اور اس نے اپنے ہونٹ مُردہ بے حس رڈا کے پیروں پر ثبت کر دیئے۔ ہم نے اپنی ٹوپیاں ہاتھ میں لے لیں اور احترام میں کھڑے ہوگئے۔ اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے صاحبزادے؟ ہاں بالکل یہی بالکل۔ نور نے کہا۔ ہمیں اس کی مشکلیں کس دینی چاہییں۔۔۔۔۔ لیکن کوئی ہاتھ لوئیکو زوبار کو باندھنے کے لئے نہیں اٹھا۔۔۔۔ ایک ہاتھ نہیں اٹھا۔ نور جانتا تھا وہ اپنا ہاتھ ہلا ہوا چلا گیا۔ ڈینیلو نے رڈا کا پھینکا ہوا چھرا اٹھا لیا اور دیر تک اس کو گھورتا رہا اس کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ چاقو کی تیز خمیدہ دھار اب تک رڈا کے خون سے بھیگی ہوئی تھی۔ اور پھر ڈینیلو زوبار کے نزدیک گیا اور چھرا میٹھے پراس کے دل کی طرف پیوست کر دیا۔ وہ رڈا کا باپ ٹھہرا۔ ڈینیلو بوڑھا سپاہی!

"یہ ٹھیک ہے" لوئیکو نے صاف آواز میں ڈینیلو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور وہ رڈا کے پیچھے پیچھے سدھار گیا۔

"اور ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ وہ رڈا لیٹی تھی۔ اپنے بالوں کی لٹ اپنے سینے پر دبائے ہوئے اور اس کی آنکھیں نیلے آسمان کو تک رہی تھیں۔ اس کے پیروں پر لوئیکو زوبار چادروں خانہ چت پڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس کے بالوں نے اس طرح چھپا لیا تھا کہ بالکل دکھائی نہیں پڑتا تھا۔

بوڑھا ڈینیلو خیالات میں غرق کھڑا تھا۔ اس کی مونچھیں لرز رہی تھیں۔ اس کے گھنے ابروؤں پر بل تھے۔ وہ آسمان کو گھورتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ نور۔ بوڑھا زمین پر اُلٹا لیٹ گیا اس بری طرح ہچکیاں لے رہا تھا کہ اس کے ضعیف جسم پر رعشہ طاری ہوگیا۔

"آخر بات تو رہ نے کی تھی صاحبزادے"

"..... اچھا تو اب پھر تم اپنے چکر پر چل کھڑے ہوئے ہو۔ بہت خوب اپنا راستہ لو اور کبھی اس سے نہ بھٹکنا۔ تم سیدھے چلتے جاؤ اس طرح ہی تم تباہی سے بچ سکتے ہو۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا میاں صاحبزادے!"

ماکار خاموش ہوگیا۔ اس نے پائپ تھیلی میں رکھ لیا اور کوٹ اپنے سینے پر اچھی طرح لپیٹ لیا۔ کیونکہ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی سمندر چڑھ رہا تھا اور اپنے پورے غیظ و غضب کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ گھوڑے ایک ایک کر کے بھیگتی ہوئی آگ کے پاس آکر اپنی بڑی بڑی ذہین آنکھوں سمیت ہمارے چاروں طرف گھیرا ڈال کر ساکت کھڑے ہوگئے۔

"اے۔ ہے۔ او۔ ماکار" بڑے پیار سے اس نے کہا اور اپنے پسندیدہ کالے گھوڑے کی گردن تھپ تھپاتے ہوئے میری طرف مڑ کر کہا۔

"اب سونے کا وقت ہے؟ اپنا سر کوٹ سے ڈھک کر وہیں زمین پر لمبا لمبا چپ لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں چٹانوں کی تاریکی کو گھورنے لگا، دور میری آنکھوں کے سامنے مغرور رڈا کا نقشہ تیرنے لگا۔ وہ اپنے بالوں کی لٹ اپنے سینے کے زخم پر دبائے ہوئے تھی اور اس کی نازک سانولی انگلیوں کے بیچ میں سے خون قطرہ قطرہ ہو کر رس رہا تھا۔ دہکتے ہوئے لال ستاروں کے مانند زمین پر ٹپک رہا تھا۔

اس کے پیچھے اس جیسی لڑکے لوئیکو زوبار کا چہرا تھا۔ اس کا چہرہ کالی گھنی زلفوں سے ڈھکا ہوا تھا جس کے نیچے سے موٹے موٹے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

بارش زیادہ ہوگئی اور سمندر ایک المناک نوحہ ان دو مغرور جیسی عاشقوں کی شان میں الاپ رہا تھا۔ لوئیکو زوبار اور رڈا جو بوڑھے سپاہی ڈینیلو کی بیٹی تھی وہ وہ نوا اس بھیگے بھیگے اندھیرے میں اندھیرے دھیرے پیر رہے تھے۔ نڈر لوئیکو جتنا چاہے کوشش کرے پھر بھی وہ مغرور رڈا کو نہیں پکڑ سکتا۔

(ترجمہ سلطانہ بیگم)

سیلاب

سرخ آنچل

مرتبہ پرکاش پنڈت

بارہ ممتاز افسانہ نگار خواتین —

عصمت چغتائی	قرۃ العین حیدر
رشید جہاں	ممتاز شیریں
ہاجرہ مسرور	کوشلیا اشک
خدیجہ مستور	شکیلہ اختر
سرلا دیوی	تسنیم سلیم چھتاری
صدیقہ بیگم	ناہید عالم

کے منتخب افسانوں کا مجموعہ جس میں ان کی تصاویر بھی شامل ہیں اور حالات زندگی بھی۔ ضخامت مجلد 3/12

مکتبہ شاہراہ دہلی

ایک تہذیبی امانت ——

جسے ماضی کے عوام نے اپنی جمہوری روایات سے بھر پور کیا

جسے حال کی عوامی جدوجہد نے توانائی اور چمک بخشی — اور

جسے پرکاش پنڈت آنے والے دور کو سونپتا ہے۔

میرا

پرکاش پنڈت کے ان افسانوں کا مجموعہ جن میں زندگی ہے — لطافت، بیتابی اور تھکن پر تھرکتی ہوئی خون ہنسی — اپنی غیر معمولی گمبھیرتا اور عظمت کے ساتھ ہماری سڑکوں، گلیوں، بازاروں اور محلوں کی کہانیاں جن پر پرکاش پنڈت کا قلم وقت کی نبض ثبت کرتا ہے۔

قیمت تین روپے

مکتبہ شاہراہ دہلی

نقوش زنداں

مشہور عوامی لیڈر سید سجاد ظہیر نے سنٹرل جیل لکھنؤ سے اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو خطوط لکھے

خطوط ○ جن میں حسرتوں اور تشنہ کامیاں موجزن ہیں

○ اور حسرتوں اور تشنہ کامیوں کی دیوار پھاندنے کا عزم ہے

○ اور ایک ایسے خوش آئند مستقبل کی طرف رہنمائی ہے جس میں قید اور بیوی کے درمیان جیل کی آہنی سلاخیں حائل نہ ہوسکیں گی

سید سجاد ظہیر کے ان خطوط کو کتابی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے قیمت 3/12

مکتبہ شاہراہ دہلی

جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہے۔ انھوں نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اس میں اپنے خون جگر کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کی بہترین روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

(سردار جعفری)

بیکراں

کے بعد

جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام

ستاروں سے ذروں تک

قیمت دو روپیہ بارہ آنے

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

مکتبہ شاہراہ دہلی

جاوید ایجنسیز پوسٹ بکس ۸۱۴ کراچی

ترقی پسند مصنّفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

جون
۱۹۵۱ء
قیمت بارہ آنے

سالانہ نو روپے
ششماہی پانچ روپے

مکتبۂ شاہراہ دہلی ۶

فہرست

راہ نما — پرکاش پنڈت، ۳

مقالے

نقوشِ زنداں (خطوط) — سجاد ظہیر، ۵
صبح ہوتی ہے — محمد مہدی، ۷
سوویت ادب اور تہذیبِ عالم — تیوارا مولیلینا، ۱۰

نظمیں

فیض کے نام — سرحد ارجعفری، ۲۳
آلھا — وامق جونپوری، ۲۶
ایک سوال — سلیمان اریب، ۳۰
ہم جنگ نہ ہونے دینگے — شرر فتحپوری، ۳۱
امن کی راہ پر — جمیل ملک، ۳۲

غزلیں

افضل پرویز، ۳۳
شہاب جعفری، ۳۳
ابن انشا، ۳۴
احمد ریاض، ۳۴

افسانے، خاکے، ڈرامے

مونگ کی دال — کرشن چندر، ۳۵
انتاس اور ایٹم بم — خواجہ احمد عباس، ۳۹
نیلی گٹھری — رضیہ سجاد ظہیر، ۴۶
ہڑتال — نجمہ نکہت، ۵۱

رفتار

(بین الاقوامی، ادبی انتخاب)
دو امریکی نظمیں، ۵۷

جائزے

جو مر نہ سکے (عبداللہ ملک) — دیوندر اسر، ۵۶
بیس ہزار چراغ (فکر تونسوی) — 〃 ۵۶

سالنامہ ملا ــــ

ڈاکٹر عبدالعلیم
احتشام حسین
خواجہ احمد عباس

○ پبلشر، منشی عبدالقدیر، مکتبہ شاہراہ، دہلی ۶
○ پرنٹر، گھنشیام لیتھو پریس، دہلی

راہنما

اداریہ

شاہراہ کے گذشتہ شمارے میں پاکستان کے ایک رجعت پسند رسالے کے اداریہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہ جس میں ہندو اور پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں کو دہریے، ملحد، فتنہ پسند اور غدا۔ انِ وطن کے القاب سے نوازا گیا تھا اور دونوں ملکوں کی حکومتوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ باہمی مخلصانہ تعلقات پیدا کرکے ان پر کڑا احتساب کریں اور ان کی "درونِ خانہ ریشہ دوانیوں کو ناکام و نامراد بنائیں" ہم نے اس رسالے کے مدیر محترم کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ ان کے اس نذرانے سے بہت عرصہ پہلے ہی سے دونوں حکومتیں کمال صفائی سے اپنے "فرائض" انجام دے رہی ہیں۔

دونوں ملکوں کی حکومتیں وقتاً فوقتاً اور بقدرِ ضرورت ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کو گرفتار کرتی رہتی ہیں اور ان میں سے کئی ایک نام تو ایسے ہیں جن کے لئے جیل اور گھر کی تفریق ہی مٹا دی گئی ہے۔ کسی ترقی پسند ادیب کو چاہے اس نے انگریزوں کے زمانے میں، دوسری انگریز دشمن پارٹیوں کے پلیٹ فارم سے (جو اس وقت برسرِ اقتدار ہیں) برسوں جیل کاٹی ہو، سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی اور اگر کسی سرکاری ملازم پر ترقی پسند ہونے کا شبہ ہو تو اسے فوراً برطرف کر دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان میں اردو کے مشہور شاعر مخمور جالندھری کو اسی جرم کی پاداش میں جالندھر ریڈیو سے نکال دیا گیا۔ اس سے پہلے فکر تونسوی اور حمایت علی شاعر اور دوسرے ادیب بھی اسی عتاب کا شکار ہو چکے ہیں۔

ادھر پاکستان میں بھی حامد عزیز مدنی ایسے کئی ادیبوں کی مثالیں موجود ہیں اور تو اور کسی سرکاری ملازم کو ترقی پسند مصنفین کے کسی اجلاس میں شرکت کرنے اور ان کے سرکاری آرگن میں نظم و نثر لکھنے تک کی اجازت نہیں ہے اور جب کبھی ایسا واقعہ رونما ہوتا ہے تو "شہری حقوق" کی حفاظت کے لئے دونوں حکومتوں کا فاشی بھوت ——— پبلک سیفٹی آرڈیننس حرکت میں آ جاتا ہے۔

اسی پبلک سیفٹی آرڈیننس کی مدد سے جس کے لفظی معنی قانونِ تحفظِ عامہ کے ہیں پاکستان میں دس سمئی کے دن بڑے وسیع پیمانے پر عوامی لیڈروں اور عوام کے ذہنی راہبروں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ کمیونسٹ ہیں یعنی دہریئے، ملحد، فتنہ پسند اور غدارانِ وطن ہیں اور ان کی درونِ خانہ ریشہ دوانیوں کو ناکام و نامراد بنانا ہمارا فرضِ اولیں ہے۔ ان دہریئے، ملحد، فتنہ پسند اور غدارانِ وطن میں سے جو اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہیں اور جن پر کھلی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور جنھیں اپنی صفائی کا کوئی موقع نہیں دیا جائیگا اردو کا مشہور و معروف عوامی شاعر اور ادیب اور انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کا سکریٹری احمد ندیم قاسمی ہے اور اردو ادب کا نباض اور نقاد اور انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی کا سکریٹری ممتاز حسین ہے۔ اور پاکستان کے واحد ترقی پسند رسالے سویرا (جس پر کئی بار پابندیاں عائد کی گئیں اور ضمانتیں طلب کی گئیں) کا قابل مدیر شاعر اور فلسفی ظہیر کاشمیری ہے اور اپنی خوبصورت کہانیوں سے دلوں کو مرنے والا اور عوام کے دکھ درد پر رو اٹھنے والی نوجوان افسانہ نگار حمید اختر ہے۔

یہ اس آزادی اور بھائی چارے کے چاروں علمبردار وطن کے ساتھ کون سی غداری کر رہے تھے، اس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔ خود حکومتِ پاکستان نے بھی شاید کسی مصلحت کے پیشِ نظر ان گرفتاریوں کا "ڈانڈا اس تشدد کے ذریعے حکومت کو اُلٹنے والی سازش" کے ساتھ نہیں ملایا ہے جسے ناکام و نامراد بنانے کے لئے پچھلے دنوں بڑے بڑے فوجی افسروں کے علاوہ پاکستان کے محبوب شاعر اور پاکستان ٹائمز کے بیباک ایڈیٹر فیض احمد فیض کو اور عوام کے محبوب لیڈر اور کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری سجاد ظہیر کو گرفتار کیا گیا تھا۔

ہمیں "اس تشدد کے ذریعے حکومت کو اُلٹنے والی سازش" کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہنا ہے۔ کیونکہ حکومت پاکستان کے بیان کے مطابق وہ لوگ جو اس سازش میں شریک ہیں غدارانِ وطن ہیں اور تشدد کے حامی ہیں۔ اور جب تک حکومتِ پاکستان ان پر مقدمہ چلا کر ان پر عائد کئے گئے الزام کو صحیح ثابت نہیں کر دیتی ہم اس معاملہ میں خاموش رہیں گے اگرچہ فیض احمد فیض کی گرفتاری پر پاکستان ہی کے بعض ذمہ دار حلقوں کا بیان تھا کہ دراصل فیض احمد فیض وطن کا غدار نہیں ہے وطن سے غداری خود حکومتِ پاکستان کر رہی ہے۔ جس نے امریکی اور برطانوی سامراج کے ساتھ اپنا گٹھ جوڑ قائم

کرنے کے لئے، تیسری عالمگیر جنگ کے فوجی اڈوں کی تعمیر کے لئے اپنے ملک کا ایک اہم علاقہ اس کے ہاتھ بیچ دیا ہے اور چونکہ فیض احمد فیض نے حکومت پاکستان کے اس غدارانہ فعل کو بے نقاب کرنے کے لئے پاکستان ٹائمز میں اس باہمی معاہدہ کی نقل شائع کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اس لئے حکومت پاکستان نے پیش بندی کے طور پر ان تمام وطن دوست اور سامراج دشمن لیڈروں اور افراد کو جو حکومت کے اس مذموم فعل پر اپنے غم اور غصہ کا اظہار کر رہے تھے پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس دیا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

اگر یہ متذکرہ بالا بیان صحیح ہے (جس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ دینا ابھی قبل از وقت ہے) تو ہمیں یہ کہتے ہوئے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ بانس بھی رہے گا اور بانسری بھی بجے گی اور اس زور سے بجے گی کہ اس کے وجد آور نغمے کی لے میں عالمگیر تباہی و بربادی کا سہارا لے کر چند لمحے اور جینے کی ہوس رکھنے والا کرم خوردہ نظام اور اس کے تمام سڑے بسے پبلک سیفٹی آرڈیننس خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے کیونکہ بانس کی فصل خود رو ہوتی ہے اور اُسے جتنا چھیلا اور کاٹا جاتا ہے وہ اور پھیلتی ہے اور بڑھتی ہے۔ اور اگر یہ بیان نادرست ہے تو ہم حکومت پاکستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کم از کم ان چار اداریوں پر فوراً کھلی عدالت میں مقدمہ چلائے کہ جس کے بارے میں خود اس کا اپنا بیان ہے کہ اس "تشدد کے ذریعے حکومت کو الٹنے والی سازش" کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

کچھ اپنے متعلق

شاہراہ کے جنوری ۱۹۵۱ کے شمارہ میں ہم نے اپنے قارئین اور ساتھیوں سے شاہراہ کی اشاعت بڑھانے اور اس طرح اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچانے کی اپیل کی تھی اور اس بات پر خاص طور پر زور دیا تھا کہ چونکہ شاہراہ اب تک ہزاروں روپے کا خسارہ برداشت کر چکا ہے اور کاغذ کی روز افزوں گرانی اس میں مزید گھاٹے کا باعث بن رہی ہے۔ اس لئے شاہراہ کے تمام ساتھی مل کر عوامی تحریکوں کے ہمنوا اور صالح اور صحت مند ادب اور آرٹ کے اس بیباک نقیب کے تحفظ کی ضمانت دیں۔

اس اپیل پر ہمارے چند ساتھیوں نے شاہراہ کیلئے چند نئے ساتھی بنائے اور اس سلسلے میں مزید کوششوں کا یقین دلایا۔ ہم ان کے اس خلوص کے لئے تہِ دل سے ممنون ہیں اور ان کی عوام دوستی کو سراہتے ہیں۔ لیکن آج اس بات کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے ہمیں از حد دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ان چند ساتھیوں کی پُر خلوص کوششوں کے باوجود شاہراہ کی اقتصادی حالت میں چنداں تبدیلی نہیں آئی ہے اور ہم اس بات پر غور کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں کہ ہم کب تک اس ناگفتہ بہ حالت کا مقابلہ کر سکیں گے۔

اس وقت جبکہ ہند اور پاکستان کے تمام عوامی رسالے یا تو حکومتوں کی عوام دشمن پالیسی کی نذر ہو چکے ہیں اور یا اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھوٹنے پر مجبور ہو گئے ہیں شاہراہ کا دم نہ صرف غنیمت تھا بلکہ بڑی بلند حوصلگی سے وہ اس کمی کو پورا کر رہا تھا۔ ہم حتی الامکان اسے جاری رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ابھی نا اُمید بھی نہیں ہوئے ہیں کیونکہ ہمیں اپنے ساتھیوں پر پورا بھروسہ ہے اور ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ شاہراہ کے تئیں اپنے مقدس فرض کو پہچانیں گے۔ اور کسی طرح بھی صرف اقتصادی مجبوری کے تحت اس کی آواز کو بند نہیں ہونے دینگے۔

ہم ایک بار پھر اپنے ساتھیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مہم میں اپنے اشتراک عمل کا پورا پورا ثبوت دیں اور ہر ماہ شاہراہ کے ساتھیوں میں کم از کم دو سو نئے ساتھیوں کا اضافہ کریں۔ ہر ساتھی کم از کم ایک یا دو نئے ساتھی بنائے اور ہر ساتھی اپنے شہر کے ایجنٹوں اور لائبریریوں سے شاہراہ منگوانے کی سفارش کرے۔ ہم ہندوستان اور پاکستان کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی تمام شاخوں سے خاص طور پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں بھرپور اثر و رسوخ استعمال کریں۔

سید سجاد ظہیر

نقوشِ زنداں

کنگ جارج ہسپتال۔ لکھنؤ

۳۰ر جنوری ۱۹۴۲ء

میری جان، پیاری ۔۔۔ سب کچھ، پرسوں میں نے تمھیں ایک بڑا سا خط لکھا تھا۔ اس کی معافی مانگتا ہوں اور یہ اس کی تلافی ہے ۔۔۔ پانے کے ۔۔۔ اور ایک آج ۳۰ر جنوری کا لکھا ہوا۔ تم تو ملتی رہیں مگر انتظام شاید گڑبڑ تھا۔ شاید محرم کی چھٹیوں کی وجہ سے۔ اور آج تقریباً دس گیارہ دن کے اندر اندر اور صرف یہی نہیں بلکہ خط میں خیر کسی اچھی ہے۔ دنیا کی سب خبروں سے اچھی، تو تم دراصل آ رہی ہو؟ تین خطوں میں مسلسل ذکر تھا۔ اس لئے مجھے یقین سا ہونے لگا، لیکن اگر ابھی تک باقی ہے۔ کیا عجب ہے کہ ..... بھی دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اور ایک بات اور ہے، یہ سنجیدگی سے لکھ رہا ہوں خوب غور کرنے فیصلہ کرنا اور ۔۔۔ داری فیصلے کی تمھاری ہوگی۔ اور وہ یہ کہ ۔۔۔ ہاں میری غیر موجودگی ہو، زیر سزا میں تم کو اور بچی کو تکلیف ضرور ہوگی۔ اور جو بڑھ گئی ہیں یہاں پڑے پڑے کر دوں، بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر مجھکو قابو نہیں۔ اس سے اگر تمھارا جی چاہے تو آنا کچھ دن کے لئے اور ملتوی کر دو۔ میرا خیال ہے کہ معاملات کی صورت کچھ ایسی ہو رہی ہے کہ جب تک میں کچھ دنوں کی چھوڑ دیا جاؤں اب تم اگر آؤ گی تو دونوں باتیں ہیں۔ ممکن ہے کہ وزیر سزا میں تمھیں بہت تھوڑے دن اکیلا رہنا پڑے۔ اور اس صورت میں آجانے میں کوئی حرج نہیں دوسری صورت یہ ہے کہ اگر مجھے چھٹنے میں تھوڑا ہی عرصہ ہے تو میں خود وہاں آکر تم کو یہاں لا سکتا ہوں اور پھر اس کے بعد اپنا علاج وغیرہ کر سکتا ہوں۔ اب تم جیسا مناسب سمجھو ویسا کرو۔ اگر تم اس وقت آجاتی ہو تو فوراً ہر مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔ اگر بیٹے کرتی ہو۔ خاص طور پر خرچہ کا خیال کرکے۔ کچھ دن اور نہ آؤ تو بھی مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اس میں تم ڈیڈی سے بھی رائے لے لینا۔

مجھے افسوس ہے کہ گذشتہ دو ہفتے سے تمھیں خرچ نہیں بھیجا گیا۔ ہاں اگر بابا کو ہی یہاں کا خرچہ دینا ہوا تب تو خیر۔ لیکن ابھی یہ بالکل طے نہیں ہوا۔ میں نے گورنمنٹ کو درخواست دی ہے کہ اسے میری بیماری کے اخراجات برداشت کرنے چاہئیں۔ کیونکہ ڈاکٹر ہنجی وغیرہ جب بیمار ہو کر ہسپتال آئے تھے تو گورنمنٹ ہی نے خرچ ادا کیا تھا۔ بہرحال آج کل کے اخراجات تو گورنمنٹ کو ہی برداشت کرنا ہوں گے۔ اس لئے کہ میں نے لکھ کر ان کو اطلاع دیدی ہے۔

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اب بغیر تم سے ملے دل کو چین نہیں ہے اور تم ہو کہ ٹال مٹول لگائے ہوئے ہو! آخر بات کیا ہے؟ کیا در اصل اتنے دنوں میں بھول بھال گئی ہو۔ تمھارے خط پڑھتا ہوں تب تو یقین آجاتا ہے کہ مجھکو چاہتی ہو۔ لیکن ہر وقت تو پڑھ نہیں سکتا۔ اس وقت کا کیا کروں۔ امید ہے کہ تم محرم میں یلدو ۔۔۔ دھوئی نہ ہو گی۔ اور خجستہ بیگم کی ذمہ داریوں نے تم کو "گریہ و بکا" کے فرائض سالانہ سے بچا لیا ہوگا۔ یا اس کو بھی وہی عادتیں سکھانا شروع کر دیں۔ سرچوں کی طرح! اور آپ بڑے فخر سے اس کو بیان بھی کرتی ہیں، اس کا سعدہ اور کانسٹی ٹیوشن ابھی سے خراب کر رہی ہیں۔ تاکہ اپنی طرح وہ بھی ہر روز پیٹ میں درد لے کر لیٹے۔ اور ہر ہفتہ نزلے اور بخار کا شکار ہو، کیوں؟ اچھی بات ہے خوب مرچیں کھاؤ اور کھلاؤ۔ اب تو تھوڑے ہی دن کی بات ہے پھر تو ہیں

اگر ماں بیٹی کی عادتیں درست ہی کر دوں گا۔

افوہ! پیاری یادوں کس قدر تنہائی ہے۔ اتنے بڑے مجمع اور شہر کے بیچ میں بھی قید، پابندی، رکاوٹ، مل نہیں سکتے۔ بات نہیں کر سکتے۔ ادھر نہیں آ سکتے ادھر نہیں جا سکتے۔ تین دن ہوئے نقوی صاحب آئے تھے جو سی۔ آئی۔ ڈی کے کپتان ہیں۔ (چودھری محمد علی کے داماد) مجھے اپنے گھر لے گئے۔ وہاں ہی کھانا کھا یا اور ریڈیو سنا۔ بڑی دیر تک ڈرائنگ روم پر بیٹھکر ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ عجیب قسم کا سین سیشن تھا ریڈیو کا گانا سُن کر جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی اور ڈمائنگ روم میں آگ جلا کر بیٹھنا، بہتا آزادی سے، کیسا اچھا دل خوش کُن احساس تھا۔ نقوی صاحب تو پولیس سے فوج میں چلے گئے اور تھوڑے دنوں میں بیچ کے عہدے پر فائز ہو کر ایران جا رہے ہیں۔ مجھے رشک ہوا اُن کے یہاں اعلیٰ حال میں ایک لڑکی بھی اور ہوئی ہے اس سے ان کی بیوی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بیچاری زچہ خانے میں تھیں۔ مجھے تم یاد آگئیں اور وہ زمانہ جب میں دل و جان سے پیا بہتا تھا گو تم سے نزدیک ہوں اور گورنمنٹ نے پیرول کی درخواست نامنظور کر دی تھی۔ کیسے بُرے دن تھے وہ جب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بھلی کیسا اچھا ہو اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے نیشنل گورنمنٹ قسم کا۔ اور پھر ہم سب مل کر کوئی تعمیری کام کریں، لکھیں، پڑھیں۔ اور محبت، پریم وغیرہ کی قسم کی چیزوں میں عملی ریسرچ کریں۔

یہاں کا موسم دو دن کے لئے بُرا ہو کر کل سے پھر اچھا ہو گیا۔ آسمان پر بس یونہی سے کچھ ابر کے ٹکڑے تھے دن بھر دھوپ رہی۔ گرما گرم چمکیلی دھوپ۔ میں کچھ دیر آرام کرسی پر پڑ کر اونگھا۔ تم اس پر رشک کرتی ہو؟ پھر کمرے کے اندر آ کر میز پر بیٹھ کر لکھتا رہا۔ ایک چیز لکھ رہا ہوں۔ تم آ کر دیکھنا۔ شاید تمہیں پسند آ جائے۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں۔ میں کھانا کھا کر ابھی برآمدے کے سامنے کھلے ٹریس پر نکلا۔ تو دیکھا سفید چاندنی چھٹکی ہے اور چاند بڑی شان سے دمک رہا ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہے لیکن کچھ بہار کا جادو لئے ہوئے۔ ذرا نرمی سے اور جھیما پن۔ دل کو بُری طرح مسوس گئی اور تمہاری یاد دلائی۔ دیکھیں اب کی بہار ہماری کیں گذرتی ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں پیار نہ آئے یا اگر آئے تو پھر ہم نظر انداز نہ ہوں یہ تو بڑا ظلم ہے کہ فطرت دل میں ایسے ہیجان بھی برپا کرے، ایسی خلش، ایسی بے کل، اور پھر اس کے ساتھ بے بسی، تنہائی، بے چارگی — نہ مے، نہ مطرب، نہ معشوق، خالی ہسپتال کا گلزار، اکیلے ہم اور پولیس کا پہرہ۔

ایسے متجددین بڑے ہیں یا امداد سبیاں؟ بولیئے میں اب تک امداد کو بڑا سمجھا کیا۔ تم نے مجھ سے کبھی ٹھیک بتایا کیوں نہیں اور بھئی تم مجھ سے اپنے بڑے بھائی کے متعلق خفا نہ ہو۔ میں اس سے بے حد گھبراتا ہوں یعنی تمہاری خفگی سے اور آپ سے یہ جو نیک ارادہ کیا ہے کہ مجھ سے کبھی لڑیں گی نہیں اور روٹھیں گی نہیں۔ (تم نے تو روٹھنے کے متعلق لکھا نہیں تھا مگر میں نے تمہارا منشا سمجھ کر اپنی طرف سے بڑھا دیا) تو اس نیک ارادے پر قائم رہنے کی خدا آپ کو توفیق دے۔ آمین۔ ذرا میرا سن جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے، مزاج میں تشکک کا مادّہ زیادہ اور تیقن کا کم ہوتا جا رہا ہے اور بھئی مجھے تو در اصل لڑائی سے کوفت نہیں ہوتی وہ بیویاں جو سُہاگ پھلا کر گھنی بنی بیٹھی بیٹھی کبھی کبھی ایک دو جملے کسے فقرے سنا تی ہیں ان سے اللہ ہر مرد کو نجات دے — — — مجھے بھی کیا آ رہی ہیں؟ بھئی ان کو تکلیف دیتے مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ تم میری طرف سے آداب عرض کرنا اور کہنا کہ کیوں زحمت برداشت کرتی ہیں میں خود حاضر آ جاؤں گا اور اب انشاء اللہ زیادہ دیر بھی نہ ہو گی، ہاں لیکن اگر اسی سلسلے میں بیٹوں کی نسبت ڈھونڈنا ہے تو اور بات ہے ایسے سبارک کام میں کیوں انھیں روکوں۔ بلکہ میں تو ان کی جگہ ہوتا تو جلدی جلدی معین سیاں اور معجد میاں کی شادی کر دیتا۔ اب انتظار کاہے کا ہے آخر؟ لکھ پڑھ چکے، نوکر ہو چکے شادی کی عمر ہے اور وہ خود کیا کہتے ہیں حضرت۔ جی تو چاہتا ہو گا مگر کہتے ہوئے جھینپتے ہوں گے۔ تم سے تو صاف کہتے ہی ہوں گے۔ تم سلام نہیں کیسی بہن ہو۔ ہماری نہیں تو بیاہ بھائیوں کو دیکھ کر ہی ارادہ کر لیا ہوتا۔ مگر تم شادی کے لئے مچائی رسمی تھیں کہ خدا کی پناہ! اور میری شادی میں تو بی بی سدن نے باجی کی جگہ لے لی تھی اور رات دن انھیں خطوط بھجوانے کے لئے مُصر رہتی تھیں۔ اور میری اگر مگر کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتی تھیں۔ اس وقت وہ الہ آباد میں رہتی تھیں نا؟ سدن کا بچہ بہت پیارا ہے۔ خوب موٹا تازہ مضبوط۔ آج کل لکھنؤ ہی میں ہے، ہاں نئے سیاں کے بچے کا بہت افسوس ہوا۔ میں تو تم کو خود ہی لکھنے والا تھا۔ مگر خط لکھتے وقت بھولتا تھا اور بات ہی کونسی تھی تم نے اچھا کیا کہ تو بی بی کو لکھ دیا — آج سلام نہیں کیوں لکھا یاد آ رہے ہیں اس کے معنی تو ہیں کہ ایک معنی تو ہیں جو ریلوے کے افسر ہیں اور کلکتہ میں ملازم ہیں۔ وہاں اب سردیاں اندھیری رہتی ہیں رات کو خیال کرو وہ جگمگاتی ہوئی چوڑی اور تاریک۔ سڑکوں کے کھمبے خندقیں کھدی ہیں ببول کا جنگل ہے اور اس سے بچنے کے تمام انتظامات مجھے تو سر چکّہ کی تباہی کا خیال کر کے رنج ہوتا ہے مگر کلکتہ تو ہماری محبت بھری رسیلی راتوں کی یاد کا شہر ہے خدا کرے بچ جائے۔ اور یہ کمبخت جاپانی بڑھنے نہ پائیں۔

تم اتنی پیاری کیوں ہو؟ میرے دل میں دُنیا بھر کی محبت کیوں جگا دی ہے؟ مجھے تم سے اتنی محبت کیوں ہے؟ تمہاری آنکھیں ہا۔ ہا۔ کیوں یاد آتی ہیں؟ ان سب سوالوں کے مفصل مع تمام حوالوں کے جواب

تمہارا

سبتے

صبح ہوتی ہے

(ایک جائزہ)

محمد مہدی

"صبح ہوتی ہے" ایک سفرنامہ ہے۔ ایک سیاح کی ڈائری ہے جس میں کرشن چندر نے کیرالا کی سرزمین کا حسن اور افلاس، اس کے باسیوں کی انتہائی مفلسی اور اس مفلسی کے خلاف ان کی عظیم الشان جدوجہد کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کیرالا کی سیکڑوں برس پرانی تہذیب کی دلکش تصویر ہے۔ انحطاط پذیر سامنتی نظام کی کریہہ منظر صورت بے نقاب ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ڈالر کا سخوس سایہ منڈلاتا ہوا نظر آتا ہے اور اس اندھیرے میں کرشن چندر کی عقابی نظر ان معمولی مگر باعزم انسانوں کو دیکھ لیتی ہے، جو کیرالا کو اس تاریکی سے نکال کر صبح کی آغوش میں ڈال دینا چاہتے ہیں اور وہ بہت یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ انسان ہر مشکل پر فتح پائے گا۔ وہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے بھی ختم نہ ہوگا بلکہ اپنی تقدیر کا وشوں سے ترقی کی منزل پر آگے ہی بڑھتا جائے گا۔"

چیکوسلاواکیہ کے مایۂ ناز فرزند جولیس فیوچک نے اپنے وطن کے ایک شاعر کا ذکر کرتے ہوئے ایک بہت دلچسپ بات کہی تھی کہ اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ وہ ایک اچھا صحافی بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ "صبح ہوتی ہے" میں صحافت اور ادب کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ رپورٹ اور کہانی کا سنگم ہی اس صنف ادب کو جسے ہم رپورتاژ کہتے ہیں اردو میں سب سے پہلے کرشن چندر نے دریافت کرایا۔ "پودے" کرشن چندر کا پہلا رپورتاژ ہے۔ اس سے پہلے انگریزی زبان میں چند امریکی ادیبوں اور صحافیوں نے بہت اچھے رپورتاژ لکھے ہیں۔ "ریڈ" اور اگنس اسمڈلے نے بہت خوبصورت رپورتاژ لکھے۔ مگر اس کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ صنف ادب جس طرح یکایک شروع ہوئی تھی اسی طرح ختم ہو گئی۔ لیکن سوویت یونین کے ادیبوں نے اس صنف ادب کو اپنایا۔ اور چند ایسے رپورتاژ لکھے جن کا شمار سوویت ادب کے شہ پاروں میں ہوتا ہے۔ جیسے ورشی کورکا "صاحب ضمیر انسان" جو یہ یک وقت ایک رپورٹ اور ایک خوبصورت ناول ہے یا "انڈر گراونڈ اسی کیرینآن" جس میں ایسے حقیقی کردار ملتے ہیں جو بہت سے تخیلی کرداروں کو بھی مات کر دیتے ہیں اور پھر حال ہی میں سمونوف نے چین کی سیاہ آزادی کے متعلق ایک رپورتاژ لکھا ہے۔ جو واقعات کی ڈرامائیت اور کرداروں کے ارتقار میں کسی ناول سے کم نہیں ہے۔

اس وقت بحث اس سے نہیں کہ اس صنف ادب میں کیا کیا امکانات ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ہاں افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ کرشن چندر نے "پودے" لکھ کر جس صنف ادب کو اردو داں طبقے سے روشناس کرایا تھا اسے صحیح طور پر پیش کرنے والا کوئی دوسرا ادیب سامنے نہ آیا۔ پاکستان میں دو ایک رپورتاژ لکھے گئے۔ شاہد احمد اور شہاب نے رپورتاژ لکھے۔ مگر پھیکے اور بے مزہ۔ بلکہ شہاب نے تو جس طرح اپنے موضوع کو کاغذ پر منتقل کیا۔ وہ نہ صرف بے مزہ بلکہ بدمزہ بھی ہو گیا۔

آخر رپورتاژ کا دوسرا خوبصورت نمونہ خود کرشن چندر ہی نے پیش کیا۔ میرا خیال ہے کہ جب تک ادیب کی نظر اور اس کے شعور میں وہ وسعت اور گہرائی نہ ہو۔ رپورتاژ کا فن جس کا طالب ہے اس وقت تک اچھا رپورتاژ اور خاص طور پر سفرنامہ نہیں لکھا جا سکتا ہے۔ دو رنہ بہت سے واقعات جو بظاہر مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ایک کتاب کے بکھرے ہوئے اوراق کی طرح نظر آئیں گے۔ اور قاری پورا سفرنامہ پڑھ کر کوئی ایک خیال، کوئی ایک تاثر قبول نہ کر سکے گا۔ ایسا سفرنامہ یا رپورتاژ ایک البم تو ضرور بن سکتا ہے جس میں مختلف تصویریں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہوں۔ مگر وہ ایسی فلم نہ بن سکے گا۔ جس کی ہر تصویر گزشتہ پچھلی اور آئندہ کی تصویروں سے بہت گہرا ہوا اور یہ تسلسل آپ پر ایک خاص اثر مرتب کر سکے۔

"صبح ہوتی ہے" میں کرشن چندر نے اس تسلسل کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ بہت شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ کوئی ایک تصویر جاں

الگ نہ ہونے پائے۔ کیرلا کی دلکش وادیوں اور مرغزاروں کی تصویر ہو یا دیالار اور پنیرا کے جانبازوں کی کہانیاں ادیبوں کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہو یا کوئوں کے مزدوروں کی ہڑتال کا ذکر۔ بیگم کی کہانی ہو یا تہذیبی آثار کا افسانہ، یہ سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہیں۔ جن کی چمک آنکھوں کو خیرہ اسی لئے کرتی ہے کہ وہ سب مل کر ایک خوبصورت ہار بن گئے ہیں اور سیر اخیال ہے کہ یہی ریپورتاژ کی کامیابی ہے۔

کرشن چندر نے اب تک صرف کشمیر کی منظر نگاری کی تھی، اب اس کے برش نے ایک نیا مرقع پیش کیا ہے، "صبح ہوتی ہے" میں کیرلا کی سنگلاخ سرزمین، اس کی شاداب وادیاں، اس کے گھنے جنگل، اس کی مسحور کن جھیلیں، اس کے پُرشکوہ مندر اور گرجے اس کی ملیں اور کارخانے، ساکن و جامد چیزیں نہیں ہیں کیونکہ کرشن نے اس قوت کو بھی دیکھ لیا جس نے اپنی محنت سے عناصر فطرت پر فتح حاصل کی، انھیں اپنا مطیع بنایا اور انھیں حسن بخشا۔ اسی لئے اس کو کیرلا کے قدرتی مناظر کی تصویر زندہ معصوم ہوتی ہے۔ کرشن ان قدرتی مناظر کو ایک فوٹو گرافر کی طرح نہیں دیکھتا بلکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ کیرلا کے عوام کس طرح اس قدرتی خزانے سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اور کس طرح سامنتی نظام اور ڈالر شاہی اس پر سانپ بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"صبح ہوتی ہے" میں بہت سے دلچسپ واقعات اور کردار ہیں۔ وہ کردار اور تقاکی سنزلیں بھی طے کرتے ہیں جو اس سفر میں کرشن چندر کے ساتھ ہے ان میں زیادہ تر وہ جیالے کسان اور ادیب ہیں جو کیرلا کو آزاد کرانے کے لئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں۔ کرشن چندر نے ایسے کرداروں کو بڑی محبت اور بڑے خلوص سے پیش کیا ہے۔ فلپس کا کردار ان میں سے ایک ہے اور ایسے کردار بھی ہیں جو صرف چند لمحوں کے لئے آتے ہیں لیکن ذہن پر دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے ایک شہید کسان کی وہ ماں جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دُنیا سے بہت شاکی ہے جس نے اس سے اس کا اکلوتا بیٹا چھین لیا لیکن جو بعد میں صرف یہ کہنے کے لئے آتی ہے کہ مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے وہ کیرلا کا شہید ہے۔ یا وہ بزرگ ماں جس سے مل کر کرشن چندر نے دیالار اور پنیرا کے شہیدوں کے بھی قصے بیان کئے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں پہنچ کر کرشن کے قلم نے وہ جادو بیانی دکھائی ہے جو صرف اسی کا حصہ ہے۔ سیر اخیال ہے کہ کرشن نے ان سینکڑوں گمنام شہیدوں کو بڑا حسین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان تصویروں میں اس کا خونِ جگر شامل ہے۔

یہاں میں ایک بات کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کرشن نے یہ کتاب اس زمانے میں لکھی تھی جب یہ خیال ہندوستان کے سب سے زیادہ ترقی پسند حلقوں میں بھی جڑ پکڑ چکا تھا کہ ہمارے ملک سے سامراج رخصت ہو چکا ہے اور ہماری اصلی جنگ ہندوستان کے سرمایہ دار طبقے سے ہے، زرعی مشیت کے جاگیرداری کردار کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ نظریہ حقیقت کو جھٹلاتا تھا۔

لیکن اگر ادیب حقیقت نگاری کو شعار راہ بنائے تو جھوٹے سیاسی نظریوں کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے اور حقیقت اپنی اصلی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ "صبح ہوتی ہے" پڑھ کر میرے ذہن میں کیرلا کی جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ اس طرح کی تھی کہ یہ حسین و زرخیز سرزمین سامراج اور جاگیرداری کے خونی شکنجے میں گرفتار ہے اور کیرلا کے سپوت اس ناپاک اتحاد کے خلاف بڑی دلیری اور جانفشانی سے جد وجہد کر رہے ہیں۔ کرشن چندر نے حقیقت کو ایک غلط نظریے کی خاطر مسخ نہیں کیا۔ یہ ایک حقیقت پسند اور سچے ادیب کی فتح ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں کئی جگہ غلط سیاسی تجزیہ بھی ملے گا۔ مگر ایسا کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ اصل موضوع نہیں بلکہ ضمنی باتیں ہیں۔

میرے ایک دوست کو کتاب پر یہ اعتراض ہے کہ اکثر و بیشتر جگہ کرشن چندر کی رومانیت کی وجہ سے حقیقت پسندی گھائل ہوئی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں اور قاری کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہتے ہیں۔

کرشن چندر کی اس کتاب میں بھی یقیناً رومانیت ہے مگر یہ بڑی صحت مند اور انقلابی رومانیت ہے۔ اس رومانیت میں ماضی کا علم آج کی حقیقت پسندی کی چٹان پر ہے اور یہی اس کی صحت کی علامت ہے۔ سطحی جذباتیت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ مثلاً آم کے پیڑ کا قصہ لیجئے۔ آم کا درخت جس کے نیچے پرکالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کے نام حسین تتلیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک جگہ پر دل کھدا ہوا تھا۔ جس میں ایک تیر آویزاں تھا۔ ایک جگہ پر لکھا تھا "میں وعدہ کرتی ہوں میں آؤں گی"۔ ایک جگہ پر صرف "تمہارا" ایک جگہ پر دو ہاتھ مصافحہ کر رہے تھے۔ ..... اور پھر اس پیڑ کی حفاظت کے لئے طالب علموں نے ہڑتال کی تھی۔ یہ موضوع مختلف ادیبوں کو مختلف طریقوں سے کہانی لکھنے پر اکسا سکتا ہے۔ ممکن ہے ایک نظریہ یہ بھی ہو کہ طالب علموں کا مذاق اتنا گندہ ہو گیا ہے کہ وہ درختوں پر ایسی چیزیں کندہ کرتے ہیں اور پھر ایسی لچر پوچ چیز کے لئے ہڑتال کرتے

ہیں۔ لیکن کرشن کے شعور نے اس کی مدد کی اور اس نے لکھا۔ "نوجوانی کی کتنی ہی خوشگوار یادیں۔ پیمانِ وفا کے کتنے ہی حسین لمحے، رفاقت کے کتنے ہی دلکش مرقعے، محبت کے کتنے ہی تاج محل اس درخت کے تنے میں محفوظ ہیں۔ میں نے سوچا کس قدر جیالے ہیں ہمارے ترقی پسند طالب علم جو صرف حال اور مستقبل کے لئے نہیں لڑتے وہ ماضی کے لئے بھی لڑ سکتے ہیں۔ اس کی شاندار اور خوبصورت روایات کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ وہ صرف ٹرانسپورٹ کے مزدوروں کیلئے ہی نہیں لڑتے۔ وہ ایک آم کے درخت کیلئے بھی لڑ سکتے ہیں۔ صرف وہی لوگ جو زندگی سے پیار کرتے ہیں۔ جو عوام سے پیار کرتے ہیں جو اُن کی روزمرہ کی لڑائی میں شامل ہوتے ہیں، وہی لوگ خوبصورتی کے لئے بھی لڑ سکتے ہیں ....."

یا ایک دوسری مثال لے لیجئے۔ "میرے سامنے بیس ہزار آدمی تھے۔ میرے پیچھے شیوجی کا مندر تھا۔ پیچھے ماضی تھا سامنے مستقبل اور میں ان دونوں کے بیچ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ کون سی طاقت ہے جو اتنے آدمیوں کو یہاں کھینچ لائی ہے ....."

یہ جملے ایسے ہی ادیب کے قلم سے نکل سکتے ہیں جو اپنی تہذیب کی تاریخی اہمیت سے واقف ہو۔ اس کی قدر و قیمت جانتا ہو جو شعوری طور پر یہ سمجھتا ہو کہ انسان تخلیق کا سرچشمہ اور مستقبل کے سہارے اور پھر ماضی حال اور مستقبل کے اس تسلسل کے متعلق اپنے علم کو جذبات کے سانچے میں ڈھال کر ادب کی شکل میں پیش کر سکے۔ کرشن کی دور رس نگاہ "ان بیس ہزار چہروں میں صرف آج کی "ناشاد آرزوؤں اور نارسیدہ اُمنگوں کی کہانی، ترسی ہوئی نگاہوں اور جھلسے ہوئے ہونٹوں کی کہانی صدیوں کے فاقوں کی بھوکی بوسیدہ گرسنہ کہانی" ہی نہیں دیکھتی بلکہ وہ مستقبل کی جھلک بھی دیکھ لیتا ہے۔ اور اسے دفعتاً احساس ہوتا ہے کہ "جیسے بیس ہزار چہروں سے ماضی کا غبار دھل گیا اور شام کے شفق رنگ سائے ان بیس ہزار چہروں پر ایسے جھکنے لگے جیسے آسمان پر اُڑتے ہوئے سفید بادل یکایک سورج کی کرنوں سے ٹکرا کر رنگین ہو جائیں۔ اب ہر چہرہ مسرت سے کندنی اور گلابی تھا۔ یہ سرسبز و شاداب چہرے محنت کشوں، لڑاکوں جانبازوں کے چہرے، مزدوروں کسانوں طالب علموں اور ادیبوں کے بے باک نڈر اور بے خوف چہرے۔ تم میرے لئے اجنبی نہیں ہو۔ تم ہندوستان کا مستقبل ہو۔ شمال سے جنوب تک اور شرق سے غرب تک آج ہندوستان کی تقدیر سُرخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔"

کتاب کا اختتام بھی بہت خوبصورت ہے۔ یہاں کرشن نے ایک خیالی کہانی بنائی ہے کہ کس طرح کیرلا کے بچوں کا بنایا ہوا ہار عالمی امن کانگریس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

یہاں تخیل کے پر لگ گئے ہیں اور ہمارا ذہن بھی اس خیالی کہانی کے ساتھ بلندی پر اُڑا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس خوبصورت پریوں کی کہانی کے پیچھے کرشن کا بھرپور شعور اور احساس کارفرما نظر آتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام اور سامنت شاہی کے خلاف کیرلا کے عوام کی جدوجہد دنیا کی عظیم الشان امن تحریک کا حصہ ہے۔ وائیلار کے شہیدوں نے سامنت شاہی کے خلاف لڑتے ہوئے اسی لئے قربانی پیش کی کہ کیرلا پر امن زندگی بسر کر سکے۔

"میرا خیال ہے کہ "صبح ہوتی ہے" میں کرشن چندر کی رومانیت نے زیادہ مضبوطی سے حقیقت کا دامن پکڑا ہے۔ اور اسی لئے اس کا اثر دیرپا ہے۔

دیوتا تاڑ کی ابتدا پوری کتاب سے میل نہیں کھاتی۔ اس میں کچھ مزاح برائے مزاح کی بات معلوم ہوتی ہے۔ کتاب کی سنجیدگی جس کی حامل نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اگر دو ایک فلسفیانہ مباحث کو بھی کم کر دیا جاتا تو اختصار کی خوبصورتی پیدا ہو جاتی۔ کئی جگہ بات اس قدر پھیلائے کی گئی ہے کہ ادبی حُسن ضرور مجروح ہوا ہے۔

"صبح ہوتی ہے" میں کرشن چندر نے ہندوستان کے ایک علاقہ کے دشت و جبل، تہذیب و تمدن اور اس کے انسانوں کی روح کو پیش کیا ہے "یہ روح جو بہت کہنہ قدیم اور عظیم ہے، یہ روح جو بالکل نئی اور عظیم تر ہے اور ہر لحظہ نئی ہوتی جا رہی ہے۔"

سوویت ادب اور تہذیب عالم

تیوادر امولیلینا

انیسویں صدی میں دنیا کا ادب ان مسائل سے بتدریج قریب تر ہوا جو حقیقی اور روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں بالخصوص مغربی یورپ کی کلاسکی حقیقت پسندی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ زندگی کے معمولی واقعات آہستہ آہستہ آرٹ کے لئے کار آمد مواد بن گئے جن سے خود آرٹ کی حدیں اور زیادہ پھیل گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے ادب میں روزانہ زندگی کے موضوع داخل ہونے لگے۔ جو اپنے ساتھ ساتھ سفرت رساں رجحانات کے بیج بھی لائے۔ مارکس کے اس اصول کا پرتو یعنی "رد حمانی تخلیق کی بعض اقسام، جن میں آرٹ اور فن شامل ہیں اور سرمایہ دارانہ پیداوار کے مابین دشمنی ہوتی ہے" اس رجحان میں پایا جاتا ہے۔

فلابیر پہلا شخص تھا جس نے مصنفین پر زور دیا کہ وہ روزانہ زندگی کے گھٹیا سے گھٹیا اور معمولی سے معمولی مظاہر کی تصویر کشی کو فنکارانہ نفاست کی بلند سطح تک لیجائیں۔ اس کا کہنا تھا کہ ماہر فن کا قلم اور حسن اسلوب، ہر موضوع کا جواز پیش کر سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی گرا ہوا اور خلاف اخلاق ہی کیوں نہ ہو۔

زولا نے بھی فلابیر کی طرح مصنف کا یہ فرض بتایا کہ جب انسانی برائیوں، بیماریوں، اور اخلاقی بدنمائیوں کی تصویر کشی کرنا مقصود ہو تو پڑھنے والوں کے تحمل کا لحاظ کئے بغیر مکمل تصویر کھینچی جائے اور زندگی کی انتہائی گھناؤنی چیزوں کو ایمانداری سے ان کے اصل روپ میں دکھانا چاہیئے زندگی کو فن کے ذریعہ تخئیل کی دنیا میں گھسیٹ لے جانا ایک سفرت رساں جھوٹ ہے۔

فلابیر اور زولا نے بورژوا دنیا کی سب سے زیادہ مذمت کی ہے۔ تاہم یہی دونوں حضرات نادانستہ طور پر جدید مغربی آرٹ کے انحطاط پذیر میلانات کے پیش رو گذرے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے طرز پر بورژوا زندگی کی بے رنگی کیساتھ آرٹ سے ہتھیار ڈلوائے۔

حقیقی زندگی کو عریاں حالت میں بے کم و کاست پیش کرنے پر، نظرت پسند مستقدین زور دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسرت انگیز اور بلند اگیں عنصر غائب ہو کر آرٹ ایک بیہودہ اور بے رنگ قدامت پرست زندگی کا مفصل نقال بن گیا۔ دوسری انتہا پر انحطاط پذیر مصنفین اور شاعروں نے ماحول کی بے مزگی اور گھٹیا پن سے متاثر ہو کر اپنے گرد و پیش سے منہ موڑ لیا۔ اور توہم، تصوف اور علامات میں پناہ لی۔

۱۸۸۸ء میں اناطول فرانس نے لکھا تھا: "ہمارے زمانہ کا ادب، بہیانہ، مبتذل، نظرت پسندی اور اعلیٰ تصوف کے درمیان گھڑی کے لٹکن کی طرح ڈانواڈول ہے۔ ہم یا تو دلدل میں رہتے ہیں اور یا پھر آسمان سے باتیں کرتے ہیں بیچ کی کوئی راہ نہیں۔"

نئے ادب کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں سب سے زیادہ مشکل مسئلہ مثبت کردار کی تخلیق کا ہے۔ انیسویں صدی کے مغربی ادب کی تمام تاریخ اپنے ہیرو کی گراوٹ کو نمایاں طور پر ظاہر کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہیرو بورژوا زندگی کی گراوٹوں سے گھرا ہوا ہے۔ اسٹینڈال کے "جولین سوریل" سے لیکر موپساں کے "چیرا ایمی تک" کرداروں کی پوری قطار میں اس حالت کا پرتو ملتا ہے۔

روس میں جب گورکی اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیادیں ڈال رہا تھا، تو دوسرے ممالک کے متعدد ممتاز مصنفین نے کوششیں کیں کہ کسی نہ کسی نہج سے انحطاط کے ان میلانات کا مقابلہ کریں۔ جو بورژوا دنیا کے کلچر کو بے طرح کھائے جا رہا تھا۔ انحطاط پذیر غیر حقیقت اور صوری مذاہب کے شدید مقابلہ میں، جنھوں نے کردار کو مستقبل اور وا قدار بنا دیا تھا۔ ان مصنفین نے انتہائی کوشش کی کہ آرٹ میں حقیقت پسندی کے اصول کو برقرار رکھیں۔ اور انسانی کردار میں حقیقی تصویر کشی کی تخلیق کریں۔ یہ مصنفین بالعموم اتنے اچھے ماہر فن تعمیر نہ تھے۔ جتنے کہ بہتر نقاد

ڈریزر کے "پختہ عزم کوہ پیا" گالسوردی کے "مطمئن مالدار" ہینرچ مین کے "رجعت پسند قدیم افراد" ایسے کردار ہیں جن میں حقیقت نگاری اور الزام دہی کا زور جھلکتا ہے۔ لیکن یہ بات دشوار تھی کہ ان کرداروں کے خالق بورژوا دنیا کے مالداروں کا مدمقابل ہیرو پیدا کر سکیں۔

ان میں سے بہترین لوگ تک رجعت پسند اور انحطاط پذیر فلسفوں کے اثرات کے سامنے پورے طور پر نہ ٹھیر سکے۔ سامراجی دور کے بورژوا فلسفہ کا دعویٰ تھا کہ علم اور عمل ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ایک طرف یہ فلسفہ ایسے عملی اور پختہ عزم انسان کے نصب العین کو منظرِ عام پر لایا، جو اپنے دماغ کو تصورات کے بوجھ سے بھاری نہیں کرتا بلکہ محض جبلی تقاضوں کو مانتا ہے۔ اس نصب العین کا اظہار نٹشے کے فلسفے سے ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے برگساں نے وجدانی کیفیت کو سراہا ہے جو عملی مقاصد سے عاری، انفعالی اور بجائے خود محدود تھی۔ خیال اور عمل کے درمیان اس بنیادی تضاد نے جو بورژوا انسان دوستی (Humanism) کا نچوڑ ہے۔ سامراجی دور میں مہلک اور ناقابلِ حل، عداوت کی نوعیت اختیار کر لی۔

مغربی مصنفین کے دماغوں میں یہ تضاد مختلف طریقوں سے منعکس ہوا۔ حتیٰ کہ اس کا اثر ان لوگوں کی تصنیفات پر بھی پڑا جو مغرب کی روحانی زندگی کے رجعت پسند اور انحطاطی میلانات کو پورے خلوص کے ساتھ رد کرتے تھے۔ یورپی ادب میں ایسے مفکر اور ادب لطیف لکھنے والے کا ظہور ہوا جو ذہنی قوت سے مالا مال اور زبردست کلاسیکی روایات کا حامل۔ لیکن شر کے مقابلہ میں بے بس اور جسمانی اعتبار سے عملی قدم کے لئے نااہل تھا۔ ٹامس مین نے جن فن کاروں کو پیش کیا ہے وہ اسی نوعیت کے ہیں۔

روسی کلاسکی ادب

روسی کلاسکی ادب کو اس جد وجہد سے زرخیزی حاصل ہوئی جو عوام نے اپنی آزادی کی خاطر کی تھی۔ اس ادب میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ زندگی کو انصاف کے اصولوں پر دوبارہ ڈھالا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس ادب میں درحقیقت اعلیٰ نصب العین بھی جھلک ملتی ہے۔ روسی کلاسکی ادب کے جو بھی میلانات نے زندگی کی ہوس کیوں کو بے چون و چرا تسلیم نہیں کیا۔ ان مصنفین کا اعتقاد ذات انسانی پر تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خالص اور جاذب نظر انسانی کرداروں کی طرف رجوع کیا۔

گورکی کی تصانیف میں جو انقلابی دور کا متقی تھا، نئی کردار کے نئے نقش و نگار جو اس دور کی خصوصیات تھے، پہلی مرتبہ نمودار ہوئے۔ گورکی کی ابتدائی رومانی کہانیوں میں یہ مخصوص صفات یعنی عمل کا ارادہ اور جد وجہد سے پیدا شدہ مسرت نمایاں ہیں۔

جوزف استالین نے گورکی کی نظم "دوشیزہ اور موت" (The Maid & Death) پر لکھا: "یہ تصنیف گوئٹے کے فاسٹ، (Mona Conquers Death) سے بھی زیادہ زوردار ہے۔" گورکی کی ابتدائی نظم کا دنیائے ادب کے ایک شاہکار سے موازنہ کرنا گہری اہمیت رکھتا ہے۔ اس ابتدائی تصنیف میں اشتراکی ادب کے مثبت عناصر موجود ہیں۔ اس لئے کہ یہ فلسفہ اور تخلیقی سعی کی قلمرو میں اشتراکیت سے قبل کے ادب کو چیلنج تھا۔ عمل اور جد وجہد کی پیاس جو بورژوا انسان دوستی کی شگفتہ طرزنگارش میں مضمر رہتی تھی، فاسٹ کے کردار میں نمایاں طور پر نمودار ہوئی۔ اس تصنیف کے اختتام میں ایک المناک روئی پائی جاتی ہے۔ ٹھیک جس وقت فاسٹ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے، موت آدبوچتی ہے یہ ایسا اختتام ہے جو انسانی امکانات کی حدود کی یاد دلاتا ہے۔ فاسٹ کے برعکس گورکی کی نظم کی دوشیزہ لامتناہی انسانی امکانات یعنی موت پر زندگی اور برائی کی قوتوں پر انسان کی فتحیابی کا بیباک اظہار ہے۔ اس نڈر تصنیف میں ایک ایسی صفت کا اظہار کیا گیا ہے جو دنیائے ادب میں اب تک ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ یعنی دنیا میں تغیر برپا کرنے کے لئے انسانی قابلیت کی غیر محدود پہنائیوں پر بھروسہ۔

گورکی نے روسی انقلاب سے پہلے ہر شعبہ زندگی کی تصویر کھینچی۔ ناقابل تردید سچائی کے ساتھ اس نے اعلان کیا کہ غاصب مالداروں کی آفتاب بام آچکا ہے۔ تخلیقی جد وعمل کی تشنگی جو ادنیٰ سے ادنیٰ روسی باشندے کی تمثیلی خصوصیت ہے۔ گورکی نے اپنے ہیروؤں کو اس تشنگی سے سرشار دکھایا ہے۔ کونولاف نان بائی کی ہنرمندی کی فن کارانہ تصویر کشی ہو، خواہ اس تحسین و آفرین کا اظہار جو لیرمنٹاف کے شیطان کی حکایت کو پہلی

مرتبہ پڑھکر نشرنی ناوگراڈ کے مصوروں نے محسوس کی تھی۔ اسٹینا باوچن اور ماشا خاوسہ کے گیت تیار کرنے کا بیان ہو۔ خواہ بے خانماں اور آوارہ گرد شیطان کی زبان سے یہ مقولہ "انسان ایک سفر و نام ہے" گورکی ان تمام کرداروں کو پیش کرتے ہوئے اپنے پڑھنے والوں کو ہر جگہ اور ہر مقام پر بتاتا رہتا ہے کہ معمولی انسانوں میں مواقع تخلیقی قوت کا کتنا اتھاہ مواد پوشیدہ ہے۔

بھولے بھالے اور معمولی درجے کے عوام کا کردار پیش کرتے ہوئے ان کی روحانی دولت، فطری اہلیت، اور احتجاج کی پوشیدہ قوت کا گوناگوں طریقوں پر اظہار کرتے ہوئے گورکی نے عوام کا نقشہ نہ صرف شاعرانہ انداز میں بلکہ پوری سچائی سے کھینچا ہے۔

گورکی کے محنت کش ہیروؤں میں انصاف کی تشنگی قدرتی طور پر ان کی زندگی کے حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ جد وجہد کے دوران میں وہ روحانی طور پر پختہ کار بنتے ہیں۔ اپنے کارناموں کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ گہرے طور پر سمجھتے اور بہادرانہ خصوصیات حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ غلامی کے بوجھ سے دبے ہوئے ہوں ان میں بہادری اور انسانی شرافت کی تخلیق، گورکی کی تصویروں میں شاعرانہ نوعیت پیدا کرتی ہے۔

گورکی سے پہلے دنیا کے ادب میں کوئی شخص عام آدمیوں کی روحانی زندگی کے سرمائے کی نہ تو اس طرح تصویر کشی کر سکا۔ نہ اس سے پہلے دنیاوی ماحول میں آئیڈیل کی چنگاریوں کو اس طرح بیان کر سکا۔ نہ کسی مصنف نے عام لوگوں کی ناقابل تسخیر طاقت کا جو آئیڈیل کا پرچم لے کر چلتے ہیں اس طرح ذکر کیا، اور نہ کسی نے نئے اور پرانے نظام کے درمیان پیکار، اور نئے نظام کی پرانے نظام پر لازمی فتح اس طرح بیان کی۔ انحطاط پذیر طرز زندگی کی خصوصی دشمنوں کو اتنے خلوص اور سنجیدگی سے بیان کرنے میں کوئی مصنف گورکی کا ہم پلہ نہیں۔ کوئی بھی مصنف سماج کی اتنی نیچی گہرائیوں میں نہیں اترا، اور نہ کسی نے "قدامت پرست" کے چہرے سے ایسی بیرحمی کیساتھ نقاب نوچ کر پھینکا ہے، اور نہ ہی اس کی مانند کوئی دوسرا مصنف مزدور کے جاہ وجلال، اور دنیا کی تعمیر نو میں اس کی اہلیت کی اتنی پُرزور تصویر کھینچ سکا ہے۔

وہ خصوصیات سوویت مصنفوں کی تصانیف میں اور زیادہ اجاگر ہوگئیں۔ جن کی بنا پر گورکی نے اشتراکی حقیقت پسندی کے بانی کی حیثیت سے عالمگیر اور ناقابل تردید اہمیت حاصل کی تھی۔

سوویت ادب کی پیدائش

سوویت ادب کی پیدائش اور ترقی ایک پیچیدہ عمل تھا۔ نقائص اور آزمائشیں، محاسبۂ نفس اور تجربات، اور اکثر غلطیاں اور ناکامیاں، غرضکہ بہت سی دقتیں درپیش تھیں۔ ایسے اسالیب بیان کا ڈھونڈ نکالنا جو ملک میں ابھرتے ہوئے ان معاشرتی رشتوں کے شایان شان ہوں۔ جن کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں۔ سوویت مصنفوں کے لئے بسا اوقات کوئی آسان کام نہ ہوتا تھا۔ بعض اوقات سوویت زندگی کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چلنا ادیب کے لئے مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ زندگی ہر نئے مسائل اور تازہ بہ تازہ موضوعات منظر عام پر لاتی رہی۔ وہ مسائل جن کے خلاف دنیا کا آرٹ کبھی صف آرا نہ ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ سوویت زندگی نے جو موضوع پیش کیا وہ اتنا پیچیدہ اور ملامال ہوتا تھا کہ ادیب کی قابلیت اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ اور کافی دقتوں کے بعد سوویت فن کارانہ کلچر کے خدوخال ابھرے۔

دنیا کے ادب کی تاریخ میں مشکل ہی سے ایسی مثال ملے گی کہ کسی بڑے فن کار کی تصانیف کی لوگوں نے اس کی زندگی ہی میں تعریف کی ہو۔ (میوطالسطائی کے بارے میں لینن نے جو کچھ کہا اسے یہاں دہرانا غیر مناسب نہ ہوگا۔" روس میں طالسطائی جیسے فن کار کو گنتی کے لوگ جانتے ہیں۔") دنیائے ادب میں ایسے موجد ادب کی مثالیں اور بھی کمیاب ہیں۔ جنھیں قبول عام کی سند اتنی جلد حاصل ہوئی ہو۔

بہت سے بڑے بڑے مغربی مصنفین نے اس صورت حالات کو لا بُدی خیال کیا۔ مثال کے طور پر اسٹینڈال کو لیجئے جس کی یہ رائے تھی کہ لوگ کہیں ۱۹۳۵ء میں جاکر اس کی قدر کریں گے۔ روس کے کلاسکی ادیب جن کے دلوں میں عوام کے ساتھ ذمہ داری کا احساس ان کے مغربی معاصرین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جاگزیں تھا، اکثر ملول ہو جاتے تھے کہ کلچر کے اساتذہ اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل ہے اس احساس کا پرتو ہمیں پشکن، نیکراسوف اور طالسطائی کی تصانیف میں مختلف طریقوں پر ملتا ہے۔

سوویت نظام نے اس خلیج کو پاٹ دیا۔ ابتدا ہی سے سوویت ادب نئے نئے اختراعات کا مظہر رہا ہے یعنی "نامعلوم منزل کی طرف سفر" کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ عوام سے اس کا قریبی ربط بھی قائم رہا۔ اسے عوام کی حمایت حاصل ہوئی اور لاکھوں دلوں پر اس کے قوی اثرات قائم رہے۔ اس ادب نے ملک اور عوام کے نقشِ قدم کی پیروی کی اور پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ وہ پیش قدمی کرتا رہا۔

ہم جب ان کتابوں کو دوبارہ پڑھتے ہیں جو انقلاب کے دنوں میں شائع ہو کر بہت کافی مقبول ہوئیں اور جن پر بحث مباحثہ کیا جاتا اور اکثر ان کی نقل بھی ہوتی تو ہمیں ان میں بہت سا مواد ایسا ملے گا جو سادہ لوحی اور خامکاری پر مبنی تھا اور فنی اعتبار سے بھی ان میں نقائص موجود تھے۔

تیس سال کے سوویت ادب پر اگر تبصرہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس میں باعتبار کیفیت ہم آہنگی و یکسانیت نہیں رہی ہے۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تمام سوویت تصانیف وقت کی کسوٹی پر پوری اتریں گی۔ لے ٹن اسکائز کی تصنیف "دی ویک" میں تخیلی نقش کشی، سیفولینا کی تصنیف "ویری نیا" میں نظریت کے غد و خال، گلاڈ خاف کی تصنیف "سینٹ" میں زبان کی غیر پاکیزگی کو ۱۹۴۰ء کا پڑھنے والا فوراً تاڑ لیگا بہرحال ان میں سے ہر ایک کتاب، سوویت ادب میں اپنے اپنے طریقہ پر سنگِ میل کی طرح ہے اور اس نئی صفت کے نتیجے اس میں پائے جاتے ہیں جسے سوویت مصنفین نے دنیا کے آرٹ میں شامل کیا۔

فن کار کا نیا رویہ

تنگ نظر اور بعض اوقات حریف مغربی نقادوں نے اکثر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ روسی ادب نے صرف "موضوع" کے میدان میں اختراعات کی ہیں۔ واقعہ کے اعتبار سے یہ رائے بالکل بے بنیاد ہے۔ گذشتہ ادب سے اگر مقابلہ کیا جائے تو سوویت ادب میں جدید بات، یہ ہے کہ وہ ایک ایسے نظام کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی بلکہ فن کار نے اپنے ماحول کی جانب جو جدید رویہ اختیار کیا ہے اس کا پرتو بھی اس میں پایا جاتا ہے۔ یہ سوویت سرزمین ہی تھی جہاں آرٹ اور عوام کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ تاریخ میں پہلی مرتبہ دُور ہوئی ایسے سماج میں جس کی بنیاد ٹوٹ کھسوٹ پر قائم ہو، ادیب کے لئے پیچیدہ مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ حکمران طبقہ سے وابستہ ہو جائے (جو آرٹ کے انحطاط کا باعث ہے) اور یا پھر اس طبقہ کا مدمقابل بن جائے (دوسری حالت میں چونکہ فن کار اور عوام کے مابین حقیقی رشتے نایاب ہوتے ہیں، اس لئے فن کار ہر طبقہ سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتا ہے)۔

اشتراکی زمانہ سے قبل دُنیائے ادب میں حقیقت نگاری اور ادیب کا آفاقی نقطۂ نگاہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ مصنف کی طبقاتی فریب خوردگی اور تعصبات، حقیقت نگاری کے مدمقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن سوویت ادیب نے ایسا آفاقی نقطۂ نگاہ حاصل کر لیا ہے کہ وہ آزادانہ اور بلا روک ٹوک زندگی کی سچائی کا عکس اپنی تصانیف میں دکھا سکتا ہے۔

یعنی اصول یہ ہے کہ ادب میں بولشویک روح سرایت کر جائے یعنی ایسی صفت پیدا ہونی چاہیئے جو زندگی کے ادراک پر مشتمل اور اس پر عملاً اثر انداز ہو۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جو مصنف کو عوام کی صف اوّل میں لا کر کھڑا کرتی ہے۔ اس اصول نے سوویت ادیب کے سامنے ایسی راہیں کھول دی ہیں جو دوسرے ملکوں اور دوسرے زمانوں کے مصنفوں کی عملی دسترس سے باہر تھیں۔ استالین کے اس مقولہ نے کہ ادیب "روح کے محرک" ہیں سوویت مصنفین کے ذمہ ایسا کام ڈال دیا ہے جو اس سے قبل تاریخ میں نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے سماج میں ادیب کے مرتبہ اور اس کے پیشہ کو اتنی اعلیٰ تحسین کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

روسی انقلابی جمہوریت کے کلاسکی ادیبوں نے مصنف کے پیشہ کو بڑی گہری اہمیت دی ہے۔ یہ اہمیت ادیبوں، عوام، اور ملک کے لئے بحیثیت مجموعی سب سے بڑی اہمیت ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ادیبوں کو "شاعر کا لقب" جو دیا گیا ہے، وہ نہایت اہم اور باعزت چیز ہے۔ لیکن ان میں سے خواہ بیلنسکی ہو یا نیکراسانف، یا سالٹیکوف کوئی بھی ذمہ داری کی ان بلندیوں کو محسوس نہیں کر سکا۔ جہاں تک ادب، سرزمین سوشلزم میں

پہنچا دیا گیا ہے۔

روسی ادب کی جدت پسند صفت نے دنیا کے آرٹ میں سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز یہ ظاہر کی کہ مثبت انسانی کرداروں کو ابھارا بھی دیا اور منظرِ عام پر بھی لے آئی۔

مایاکوسکی جس کی تحت الشعور عقل نے اسے بتا دیا تھا کہ بہت جلد سماجی کایا پلٹ ہونے والی ہے، انقلاب سے پہلے ہی انقلابی عوام کے پوشیدہ جمال، قوت اور دلیری کو تاڑ چکا تھا۔ عوام کی ان صفات سے زمانۂ ماضی کا آرٹ بالکل روشناس نہ تھا۔

اس شاعر نے محسوس کیا کہ ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ اور ایک نیا انسان زیرِ تعمیر ہے۔ اس کی مبالغہ آمیز اور جری سطروں میں مستقبل قریب کے ساتھ ایک اقرار تھا۔ پیشگوئی تھی۔ ایک مطالبہ تھا۔ جیسے جیسے اکتوبر انقلاب نزدیک آتا گیا یہ مطالبہ پہلے سے بھی زیادہ پُرزور اور تیز تر بن گیا:۔

اور وہ

یعنی یہ آزاد انسان

جس کے لئے میں چلا رہا ہوں

اس کا آنا

میری بات مانو

اتنا یقینی ہے

جتنی تقدیر

(صلح اور جنگ)

یہ پیشن گوئی بہت جلدی صحیح ثابت ہوئی۔ "اجرت لینے والے مزدوروں، مظلوموں، ستائے ہوئے اور مٹھی بھر لکھے پڑھے لوگوں کے طبقے نے انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ حکمران طبقہ کی حیثیت حاصل کی ہے ....." (استالین) کروڑوں جھکی ہوئی کمریں سیدھی ہو گئیں۔ یہ نہ صرف سماج میں ایک انقلاب تھا۔ بلکہ عوام کا انقلاب تھا۔ اور سوویت ادب ہی اس انقلاب کی عکاسی کرتا ہے۔ بالکل ابتدا ہی سے یہ ادب حقیقی انسان کا ادب بن گیا۔ اور اس لحاظ سے اس نے دنیائے فن میں نئی چیز پیدا کی ہے۔

ایک نئے انسان کی پیدائش

یہ عجیب و غریب خصوصیت خاص طور پر ان کتابوں میں زیادہ نمایاں ہے جن میں انقلاب کے شروع سالوں کی خانہ جنگی کا تذکرہ ہے۔ یہ سال تمام دنیا کے لئے سخت ہے۔ روسی ادب نے ان تمام آزمائشوں اور مصیبتوں کو بغیر کسی جھجک کے انتہائی جسارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لائینیٹسکی سیفولینا، اور وسیولاڈ ایوانوف، کی پہلی پختہ سغر منشورات میں جو روسی ادب ہی کی خصوصیت ہے۔ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ روسی ادب کی شاخ براہ راست گورکی سے پھوٹی ہے۔ یہ خصوصیت ہر ایک موضوع کو خواہ وہ کتنا ہی خوفناک کیوں نہ ہو، پوری بیباکی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ قحط اور بیماری، مفلسی اور موت، سپید پوشوں (White Guards) اور مداخلت کرنے والوں کے حملوں کے خلاف انقلاب کے تحفظ میں روسی عوام کی مصیبتیں اور ایثار ——— یہ وہ خصوصیات ہیں جو ان کتابوں کے صفحوں پر جھلکتی ہیں جو اس زمانہ میں لکھی گئیں۔ جب یہ واقعات رُونما ہو رہے تھے۔

دنیا کے ادب میں ان عظیم رہنماؤں کی صحیح ترجمانی بہت کم موجود ہے جنھوں نے عوامی جدوجہد کی رہبری کی۔ مغرب کے بورژوا جمہوری مصنفوں نے جہاں بھی یہ کام انجام دیا وہ صرف رومانی اسپرٹ میں اور اس میں روایتی باتوں اور اسلوب بندی کو استعمال کیا گیا ہے ——— مثلاً کی شاعر

چارلس ڈی گال کا سٹرکی "تھیٹر یونیسچل" اور گیو ویگینولی کی اسپارٹا رکس ہیں۔

تاریخ میں پہلی مرتبہ سوویت ادب ہی نے بنیادی طور پر اس عظیم شخصیت کی سچی تصویر کھینچی جو عوام میں سے اُبھری۔ اور جس نے عوام کی رہبری کی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ خانہ جنگی کے موقع پر جو بہترین کتابیں لکھی گئی ہیں وہ فوجی لیڈر اور اس کی سرگرمی کے دائرے کے روایتی انداز بیان سے ہٹ کر، پڑھنے والوں سے انتہائی بے تکلفی کا اظہار کرتی ہیں۔ سیرافیموچ کا "کوژک" اور فرمانوف کا "چپائیوف" (اور فیڈیف کا یونگ بیکن یہ بعد کی چیز ہے) تمام کردار صورت، شکل، گفتگو، اور عمل غرض ہر لحاظ سے نہایت معمولی، روزمرہ کی سیدھی سادی شخصیتیں ہیں۔ ان میں وہ روایتی خشود زوائد نہیں جو دلیری سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔ یہ کردار شکوک سے بھی دوچار ہیں اور ناکامیوں سے بھی اور اکثر لڑکھڑاتے بھی ہیں۔ ماضی کے بوجھ سے وہ مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں اور بہت سوں میں تہذیب و تمدن کی بھی کمی ہے۔ مثال کے طور پر فرمانوف بسا اوقات اس خود سرانہ دست درازی کی لہروں کو بیان کر دیتا ہے۔ جو چپائیوف کے دل میں موجزن ہوتی ہیں۔ لیکن وہ چپائیوف کو کبھی بھی گھوڑے کی سواری کرتے یا گھمسان کی لڑائی میں حصہ لیتے ہوئے پیش نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتا ہے کہ اپنے ہیرو کی سرگرمیوں کے سب سے زیادہ معمولی اور تکلفات سے بری لمحوں کو معرض بیان میں لائے اس طرز نگارش میں ہمیں سوویت مصنفوں کی جسارت نظر آتی ہے کہ انھوں نے عوام میں سے اُبھرے ہوئے ہیروؤں کی شریفانہ اور شاندار شخصیتیں پیدا کر کے انھیں نہایت خیرہ کن اور روزمرہ کے حالات میں پیش کیا ہے۔

سوویت ادب کے مثبت ہیرو کی ایک خصوصیت اور ہے یعنی ان نرالے تخلیقی اصولوں کا اظہار جو اس ادب میں مضمر ہے۔ مغرب کے تمام حالیہ ادب میں وہ نقوش ملتے ہیں جو مثبت شخصیتوں کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن سوویت ادیبوں نے جلد ہی اس خامی پر قابو پا لیا اصول کے طور پر سوویت ادب نے عوام کو الگ الگ جماعتوں میں تقسیم نہیں کیا یعنی انسانیت پسند اور جنگجو، مفکر اور عمل انسان۔ مثبت ہیرو کی اس جامعیت کا سہرا سوویت ادیبوں کی سب سے پہلی بہترین کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔ کوژک چپائیوف، اور لیونسن تیز و تند عمل انسان ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک گہری اور وسیع روحانی زندگی سے بھی کم از کم بالقوی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات حتیٰ کہ لیونسن جیسے دماغی انسان کے خیالات بھی تکلیف دہ مراقبہ کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ ان کا جنگجویانہ جوش و خروش حتیٰ کہ چپائیوف جیسے جنبہ دار لیڈر کے جوش و خروش میں سطحیت پائی جاتی ہے۔ اور جس چیز کو وہ ضروری خیال کرتے ہیں ان کی گرمجوشی اس کے ماتحت ہوتی ہے۔

مارکس مشہور تحریر "اعترافات" (Confessions) میں جو اس نے اپنی لڑکیوں کے لئے لکھی تھی، یہ سطریں شامل ہیں:۔

"خوشی کے بارے میں تمہارا تخیل کیا ہونا چاہیئے؟ جد وجہد! تمہارا مسلک کیا ہونا چاہیئے؟ انسانیت سے متعلق کوئی چیز بھی مجھ سے بیگانہ نہیں!" اگر کوئی شخص ہر رڈوا دنیا کے نقطۂ نظر سے ان خیالات کی پیمائش کرنے لگے۔ تو تصورات کے اس مجموعہ میں جو پرولتاری انقلابی کی خصوصیت ہے۔ عجیب غریب تضاد نظر آئے گا۔ ماضی کے ادب میں زندگی کے نئے طریقوں کے لئے جنگ کرنے والے کو اکثر اس شکل میں پیش کیا گیا ہے، گویا وہ ایک خشک مزاج فرض شناس ہے۔ جو کم یا بیش انسانی جذبہ سے بیگانہ ہے اور آزادی کے لئے اس کی جد وجہد کا نصب العین لازماً اس کی ذاتی خواہشات اور قلبی تعلقات سے نبرد آزما رہتا ہے۔

سوویت ادب نے جب مثبت ہیرو کو اس کے پورے قد و قامت کے ساتھ تخلیق کرنے کا کام ہاتھ میں لیا تو شخصی یا عوامی خوشحالی، یا معرکہ آرائی اور "جد بہ انسانیت" کے مابین اتحاد کے اصول نے اشتراکیت کے ماتحت انسانی ترقی کی اساس کے طور پر کہیں زیادہ مضبوط جڑیں پکڑ لیں پیوں کا چیگین جیسی شخصیت کو جو (How the Steel was tempered) "فولاد کیسے نرم کیا گیا" کا کردار ہے، اس اتحاد کے حدود میں لائے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔

جوں جوں سوویت ادب کی نشو و نما اور ترقی ہوتی رہی، اس کے عجیب غریب خدوخال زیادہ نمایاں ہوتے گئے۔ یہ بات نہ صرف ایسے انسانی کرداروں کی تخلیق میں ظاہر ہوتی ہے جن کی نظیر گذشتہ زمانہ میں نہیں ملتی۔ بلکہ ان نئی ادبی ہیئتوں سے بھی ظاہر ہے جو روایتی اسلوب کو بدل کر وضع کی گئی ہیں۔

گورکی نے اشتراکی حقیقت پسندی کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ عمل اور تخلیق کی حیثیت سے زندگی کی تعمیر ہے۔ یہ تعریف اس راہ کو سمجھنے کی کنجی ہے، جس پر سوویت ادب اشتراکی تعمیر نو کے زمانے میں گامزن رہا۔ اس زمانہ میں سوویت مصنفوں نے دنیا کے ادب کو ایسی تصنیفات سے مالامال کیا جو اسلوب، موضوع، اور مواد کے اعتبار سے غیر معمولی تھیں۔

اشتراکی مزدور تحریک اور تعمیر کے موضوع پر گلاڈکوف کی "سیمنٹ" اس سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔ سوویت ادیبوں کا مزدوروں کے مسئلہ پر توجہ کرنا ہی فی نفسہ ادب عالم کی تاریخ میں ایک نئی چیز ہے۔

سوویت یونین میں محنت کشی کو ذلت اور گرانباری سے نکال کر عزت، شان اور دلیری و بہادری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے سوویت فن کے لئے نئی نئی راہیں کھل گئیں۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں یہ پہلا موقع تھا کہ عام لوگوں کے روزمرہ کے کام کاج کا موضوع واقعی اس قابل بن گیا کہ اس کو فن کارانہ طریق پر پیش کیا جا سکے۔

اشتراکی زمانہ سے قبل کے ادب میں مزدور کی دنیا اکثر و بیشتر اس طرح پیش کی جاتی تھی، گویا وہ مزدور کے لئے دنیاوی جہنم ہے۔ یہ ایک قربانی تھی جو "زمین" اور "صنعت" کے دیوتا پر بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ گویا مزدوری انسان سے علیحدہ ایک طاقت تھی۔ اور انسان اس کا تابع تھا۔

بعض مغربی ادیب جو مزدوری کی مسرت کی تعریف بیان کرنا چاہتے بھی تھے، وہ بھی رومانی انداز میں یا تو سرمایہ دارانہ تضادوں پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے گذر گئے جیسا کہ والٹ وٹمین کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے اور یا پھر ایسا کیا کہ منظر کو ماضی بعید میں منتقل کر دیا جیسا کہ رومن رولاں نے اپنی کتاب "کولے بردنو" میں پیش کیا ہے۔ مغربی ادیبوں کے سامنے ان دو چیزوں میں سے ایک چیز رہی ہے۔ یا تو مزدور طبقہ غلام حیثیت میں سامنے رہا اور یا پھر چراگاہی حیثیت میں۔ گوئٹے کی تصنیف "ولہلم میسٹر" سے لیکر اناطول فرانس کی تصنیف "سرگا پیرے بلانشے" تک بہت سے فلسفیانہ تخیلی ناولوں میں مزدور طبقہ کا ذکر اور بیان جس طرح کیا گیا ہے اس میں مجرد تصوراتی چراگاہیت کے نقوش نمایاں ہیں۔

زندگی کی حقیقتیں یوٹوپیائی اصلاح پسندوں کے خوابوں سے زیادہ حسین و تابناک ثابت ہوئیں۔ سوویت یونین میں جب اشتراکی عمل پورے زوروں پر تھا تو مزدوروں کی زندگی کسی طرح بھی آسان نہ تھی اور نہ ہی مزدوری تفریح کی چیز سمجھی جاتی تھی۔ سوویت مصنفین ہر طرح گہری اور بہادرانہ تخلیقی کوشش کے کرخت حسن کو معلوم کرنے اور بیان کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہ چیز تھی جو ماضی کے اہل قلم کے علم و وقوف کی سرحدوں سے باہر تھی۔

تعمیر نو میں ادب کا حصہ

اتنا بین پنج سالہ منصوبوں کے مختلف دوروں میں روزمرہ کے واقعات کا اثر سوویت ادب نے جس تیزی سے قبول کیا اس کی مثال نہیں ملتی تکنیکل ترقی کی تیز رفتاری، جس نے ملک کی صنعتی پستی کو ختم کر دیا، مغربی سرمایہ دار سے رقابت پر احساس مباہات، سرزمین سوویت اور اس کے بہادر محنت کشوں کی طاقت پر فخر ــــ ان تمام چیزوں نے سوویت ادیبوں کے لئے الہام کے نئے نئے ذرائع پیدا کئے اور فی الفور اس بات پر رغبت دلائی کہ اپنی تصانیف میں ان گہری تبدیلیوں کا عکس دکھائیں جو ملک میں واقع ہو چکی تھیں۔ بہرحال یہ بات ہر ایک کو ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ان مصنفوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مشکلات تیزی سے تبدیل ہونے والے منظر اور زندگی کی برق رفتاری سے پیدا ہوئیں۔ جنھیں ادیب کو نہ صرف قلمبند کرنا بلکہ آرٹ کی زبان میں منتقل کر کے پیش کرنا تھا۔ دنیائے ادب کی تاریخ نے اس چیز کا مشاہدہ کبھی بھی نہیں کیا تھا کہ ایک ملک کے قریب قریب سارے بڑے مصنفین ایسے واقعات سے اثر پذیر ہوں جو ہنوز سانچے میں ڈھل رہے تھے اور ان واقعات کا اثر نہ صرف شعور سخن اور افسانوں کے ذریعے سے ہی ظاہر کریں، بلکہ بڑے بڑے ناولوں میں بھی انکا انعکاس موجود ہو۔ یہ واقعہ کہ سوویت ادیب وقت کی نبض بتا سکتے تھے، اس کے جوش و خروش اور مسائل کو پیش کر سکتے تھے، اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ عوام کے ساتھ ان کے کتنے قریبی اور عضوی بندھن تھے۔ سوویت مصنفین ناول کا ارتقاء بجائے خود ان تیز تر تبدیلیوں کا عکس تھا جو سوویت زندگی میں واقع ہو رہی تھیں۔ اس موضوع پر بڑے

ناول ایک یا دو سال زیادہ سے زیادہ چار سال کے وقفہ سے نکلتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک کتاب اس ملک کی ترقی کے کسی نہ کسی مرحلہ کی عکاسی کرتی تھی۔ گلاڈکوف کا ناول "سیمنٹ" اس درمیانی دور کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو خانہ جنگی نے دیہاتی کارناموں سے شروع ہو کر مزدور طبقہ کے کارناموں پر ختم ہوا۔ یہ بحالی کا عمل تھا۔ اشتراکی تعمیر نو اور اس کی خاطر ماضی کی تاریک طاقتوں کے بالمقابل جو ابتدائی معرکہ آرائیاں ہوئیں ان کے اولین نقوش لیونانف کی تصنیف "ریور سوئچ" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میراٹا شاگینان کے "ہائیڈرو سنٹرل" میں پنجسالہ منصوبوں کی ابتداء اور پورے محاذ پر اشتراکی حملہ کے آغاز کا بیان ہے۔ دی کاتایوف کے Speeds up the time میں ہر شخص صنعتی کاروبار اور منصوبوں کو وقت سے پہلے پورا کرنے کی جد و جہد کی بڑھتی ہوئی گرم جوشی محسوس کرتا ہے۔ گلاڈکوف کی "پاور" (Power) میں اشتراکی حملہ کی مزید ترقی اس کی پہلی محسوس کامیابیاں، اور عوام کی تخلیقی پیش قدمی کا ابھار دکھایا گیا ہے۔ یاکوف آئیلین کے "بگ کنویر" Big Conveyer میں ان مشکلات کو بیان کیا گیا ہے۔ جو ملک کی نوزائیدہ صنعتی قوت کی پیداواری طاقتوں کو تیار کرنے میں پیش آئیں اور آخر میں کریموف کی تصنیف "ٹینکر ڈربینٹ" اور اس کی دوسری تصنیف "انجینئر" میں پڑھنے والے نے "تحریک اسٹخانیانف" کی پیدائش کو دیکھا۔ یہ جسمانی محنت اور دماغی کام کے درمیان سے حد فاصل کو ہٹا دینے کے پہلے آثار تھے۔

جو موضوع اوپر شمار میں لائے گئے ہیں وہ اس تیز گامی کے آئینہ دار ہیں۔ جو ملک نے اس تھوڑے سے عرصہ میں دکھائی اور ان کی مختصر جانچ پڑتال یہ امر ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ سوویت کے صنعتی ناول نویسوں نے کتنے زبردست زندہ مواد کو اپنی تصنیفات میں چھوا ہے اس سے ان پیچیدہ اور بے مثال ادبی مسائل کا اچھا خاصہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جو ان مصنفوں کے سامنے تھے۔ اور جن کا حل انھوں نے پیش کیا۔

۱۹۳۲ء جیسے ابتدائی دور تک میں بھی اس زمانہ کے بہترین ناولوں میں رزمیہ تصانیف کے ابھرتی نقش و نگار کا ایک نیا نمونہ ملتا ہے جن پر سماجی واقعات کی ترقی کے اصل داستان سرائی سے دلچسپی کا مدار ہے اور افراد کی قسمت انہیں واقعات کے چاروں طرف گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر سرافیموچ کے ناول "آہنی سیلاب" میں تامن کی فوج کا پیش قدمی اصل موضوع کے انقلابی عناصر میں سے ایک سب سے اہم اور غالب واقعہ ہے۔

یہ نقوش ان ناولوں میں اور بھی نمایاں ہو گئے جو پنجسالہ منصوبوں کے دوران میں لکھے گئے۔ یہ وہ ناول تھے جن میں محنت کے طریقوں نے ہی ان کے موضوع کے لئے مواد فراہم کیا۔ تصنیف کو پیداوار کے مقررہ مقدار کے ماتحت رکھا گیا۔ اور کہانی کا خاکہ بدلتے واقعات ان مختلف مدارج کے زیر اثر ہوتا۔ جو تعمیری کام کے سلسلے میں بیان کئے جاتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ "دریائے نیپر نگا" پر برقی قوت کے اسٹیشن کی تعمیر کو ایم شاگینان کے ناول "ہائیڈرو سینٹرل" کا پلاٹ بنایا گیا۔ دریائے نیپر کے بند کا ایک حصہ جب گر پڑا تو گلاڈکوف نے اپنے ناول "پاور" کے پہلے حصے میں اس دریا کے برقی اسٹیشن کی مرمت کو کہانی کی ریڑھ کی ہڈی کے طور پر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی کردار کو پیش کرنے میں یہ طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ناولوں کے افراد کو زیادہ تر ان کی ملازمتوں پر دکھایا گیا ہے۔ اور اصل ہیرو کو ہمیشہ پیش پیش ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیکٹری یا دوسری جائے تعمیر پر مزدوروں کے جم غفیر کو کہانی کا اجتماعی ہیرو بنا دیا گیا ہے۔ تمام تصانیف اس گہری جستجو کا اظہار تھیں۔ جن پر سوویت ادیب نے قلم اٹھایا۔ ان جستجوؤں میں فن کی وہ نئی ہیئتیں معلوم کرنے کی خواہش کارفرما تھی جو اشتراکی مواد کا حامل ہونے کی اہل ہوں۔ یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ فوراً ہی ان کوششوں میں کامیابی ہوئی ہو۔ جن ناولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے بہت میں نقائص موجود ہیں۔ اور کہانی چیزیں ایسی ہیں جو کھل نہیں پائی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان کتابوں نے نہ صرف ناول کی موضوعی سرحدوں کو وسعت دی بلکہ اس کے طرز بیان کے طریقوں کو بھی پھیلا دیا

اشتراکی تعمیر نو کی کامیابیوں نے ان لوازمات کو مہیا کیا جن کی بنا پر فرد کی جانب روز افزوں توجہ کرنی ضروری ہو گئی۔ ۱۹۳۰ء کے درمیان سوویت ادب نے اس طرف زیادہ توجہ کی کہ اشتراکی نظام نے کس طرح انسان کے کردار کو مالا مال کر کے اسے پرانے بندھنوں

سے آزاد کیا۔ یہ وہ ابتدائی نکتہ تھا جس سے ادب میں تخلیقی کوششوں، خاص طور پر تعلیم کے سلسلہ اور کردار کی تشکیل نے نئی سمتوں کا رُخ کیا۔

مغرب کے کلاسکی ادب میں بیشمار مثالیں ایسی ہیں جہاں حالات کے دباؤ سے انسانی کردار کی تشکیل ہوئی۔ مثال کے طور پر ہیگل نے مندرجۂ ذیل لفظوں میں بورژوا تعلیمی (ارژہنگ) ناولوں کا مفہوم جمع کر دیا ہے۔ "..... اس درس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ موضوع اپنے کردار کی قوتوں کو مضمحل کر دیتا ہے، اس کی خواہشات اور رائیں موجودہ سماجی بستیوں میں کھپا دی جاتی ہیں۔ دنیا جس طرح پر چل رہی ہے اس کو صحیح مان لیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی اوروں کی طرح قدامت پرست بن جاتا ہے"

کلاسکی ادب پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بورژوا سوسائٹی میں فرد جوں جوں تجربہ حاصل کرتا ہے اسی قدر وہ سرد مہر اور بے حس بنتا جاتا ہے۔ اور اپنی نوجوانی کی لطیف ترین تمناؤں کو کھو دیتا ہے۔ برخلاف اس کے سوویت ادب میں آپ دیکھیں گے کہ چونکہ اس کا کردار مشترک کام میں حصہ لیتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے فرد کی اخلاقی بلندی اور روحانی نشو ونما کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میلشکن کا "Man from the Back woods" "کیشنکا کا "courage" کریموف کا "ٹینکر ڈربینٹ" اور "انجنیر" جیسے ناولوں کی جدت پسند نوعیت اسی حقیقت میں مضمر ہے۔ سوویت عوام میں جو اجتماعی تبدیلیاں ہوئیں ان مصنفوں نے انھیں پیش کرنے کی کوشش کی اور وہ ذرائع معلوم کئے جن سے سوویت زندگی نے عملی طور پر انسانی جذبات کو قیود سے آزاد کیا اور ان اوصاف کو منظر عام پر لائے جن کا گلا اس سے پہلے لوٹ کھسوٹ کے نظام نے گھونٹ دیا تھا۔ یہ چیز انتہائی خصوصیت رکھتی ہے کہ روزانہ زندگی کے مسائل، اخلاقیات، چال چلن کے نمونے۔ جنھیں کلاسکی ادب میں لوگوں کی روزانہ زندگی کے ساتھ ربط قائم رکھ کر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ انھیں سوویت ادب میں براہ راست عملی زندگی کی تصویر کشی کرکے پیش کیا گیا ہے۔ سوویت ادیبوں کی تصانیف میں، سماجی تعلیم اور اشتراکی محنت کا موضوع بہت ہی قریبی رشتہ میں منسلک ہو گئے، اس لئے کہ محنت ہی سے نئے انسان کی تنظیم ہوئی اور یہی سماجی تعلیم کا مضبوط ذریعہ تھا۔

کلاسکی ادب میں صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے۔ اگرچہ یہ کافی بڑی مثال ہے کہ ایک فن کار نے اس قسم کے طریقے اختیار کرنے کی کوشش کی ہو جس سے ایک آئیڈیل انسان کی تخلیق کی جا سکے، یعنی ایسا مثالی انسان جو مروجہ سماجی نظام کی بے انصافی اور جھوٹ کے خلاف آواز اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ جب "ایمیل" میں اس کی سماجی تنقید اپنے منتہا کو پہنچ گئی تو روسو نے دعویٰ کیا کہ موجودہ معاشرتی نظام میں بچپن ہی سے انسانی فضیلت کی تباہی شروع ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہ نظام بچے کو بعض پر حکومت کرنا اور بعض کو اطاعت کرنا سکھاتا ہے۔ روسو کے خیال کے مطابق بچے کی پرورش اس کی نشو ونما اور اوصاف صالح بالغ آدمی بنانے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ اس کو مکمل علیحدگی کی حالت میں رکھا جائے شہر، سوسائٹی رشتہ دار، سب سے بہت دور۔ تقریباً تنہا، محض استاد کی صحبت میں ایمیل کی پرورش ہوئی۔ روسو کا خیال تھا کہ اس مصنوعی علیحدگی کے بغیر انسان فی کردار کا بنانا ممکن نہ تھا جو روشن خیالی کے انسان دوست نصب العین کے شایان شان ہو۔

ٹالسٹائی کی پند و نصائح والی نظم ایک ایسی تصنیف ہے جو غالباً پند و نصائح کی تاریخ میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ روسو کی "ایمیل"۔ نظم مذکور میں مسئلہ کو بالکل ہی مختلف ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بحیثیت معلم، ٹالسٹائی کی زندگی کے عملی تجربے کی سرگذشت ہے اور یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کی طاقتیں انسان میں کیسے اوصاف پیدا کرتی ہیں۔ اس کتاب کے ہیرو وہ سابق بے خانماں افراد ہیں جنھیں گورکی کے لیبر کمیون میں لاکر پرورش کیا گیا ہے۔ یہ نوعمر بچے نہایت سخت حالات میں زندگی گذارتے ہیں اور بچپن ہی سے بہت سی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن ان مصیبتوں پر قابو پانا وہ شرکت کی کوششوں سے سیکھتے ہیں۔ ان کا استاد انھیں زندگی کی حقیقتوں سے علیحدہ نہیں لے جاتا۔ بلکہ بے خوف ہو کر زندگی کی پُر شور جد وجہد میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور تلقین کرتا ہے کہ اپنے کاموں کی ذمہ داری اپنے اوپر لیکر تمام مشکلات کا مقابلہ کریں۔ سب کی فلاح و بہبود کے لئے مل جل کر کام کرنا ہی وہ اصول تھا جس نے ان پریشان حال یتیموں کو طاقتور اور ذمہ دار شہری بنا دیا۔ نصیحت آمیز نظم (Pedagogical poem) جس نے اشتراکی تعلیم کے اصولوں کی فن کارانہ تشکیل کی، ایک ایسے ناول کے طرز پر لکھی گئی ہیں میں کوئی مخصوص ہیرو نہیں بلکہ بہت سی شخصیتیں ہیں جو سب کی سب ناول کی تالیف میں کافی اہم حصہ

لیتی ہیں۔ اس طرح مصنف یہ ظاہر کر سکا کہ کیونکر انتہائی متضاد نوعیت کے کردار، ایک ہم آہنگ مزدور جماعت میں ڈھالے گئے اور آخری تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس مزدور جماعت نے ان میں سے ہر کردار کو نئے طرز پر ڈھالا اور ان پر محاسن پیدا کئے۔ یہ مثال اس بات کی شاہد ہے کہ سوویت ناولوں کے تشکیلی خدوخال اس کی سابق ادبی روایات سے الگ رہے ہیں۔

اشتراکی حقیقت پسندی میں زمیہ ادب کی طرف جدید بات میں ایک نیا مفہوم پیدا ہوگیا۔ اگر کلاسکی ادب "تاریکی کی طرح میں روشنی کی چمک معلوم کر سکا" اور روزمرہ کی غیر دلچسپ زندگی میں محض شاعری کی چنگاریاں دیکھ سکا۔ تو اس کے مقابلہ میں سوویت ادیب ان سماجی تعلقات میں جو عوام کے اشتراکی شعور سے پیدا ہوئے تھے۔ زندگی کے حقیقی حسن کو معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہے"

سوویت زندگی میں ذاتی اور پبلک مفادات کی یگانگت، اور عوام کے اخلاقی و سیاسی اتحاد کی امنگ نے ادیبوں کو اس چیز پر آمادہ کیا کہ وہ جماعت اور فرد کے مابین جو رشتہ ہے اُسے نئے طرز پر قلمبند کریں۔ اور اس اصول نے ہمارے ادیبوں میں اس دلچسپی کو بھی فروغ دیا کہ وہ عوام کی روئیداد زمیہ انداز میں بیان کریں۔ تاریخی منظر میں جو تیز تبدیلی ہوئی اس نے ہمارے مصنفین کو اکسایا کہ وہ زندگی کی انقلاب پذیر کیفیتوں کی نمائندگی کے نئے ذرائع تلاش کریں۔ سوویت ناول نویسوں کے ناولوں میں حقیقی زندگی کا جو انوکھا پن موجود ہے، اس کا مطالعہ یہ رہا ہے کہ اشیاء میں کی ایک بڑی تعداد کو منظر عام پر لایا جائے اور موضوع کو سمیٹ کر ایک شخص واحد کے چاروں طرف اکٹھا کرنے کی بجائے بہت سے یا کم از کم چند ہیروؤں کے ارد گرد جمع کیا جائے۔ یہ بات نہ صرف ان کی نجی زندگیوں میں، بلکہ ان کی سماجی سرگرمیوں کی سطح پر دکھلائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ پلاٹ کا پھیلاؤ بڑھایا جائے جو انسانی تقدیر کی تیز گام تبدیلیوں کی عکاسی کرنے والا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ موضوع میں ایسے پیش پا خطوط کھینچے جائیں جو سبھی ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوں اور کبھی بچ کر نکل جائیں۔ لیکن ہمیشہ ان مختلف اسباب و عمل کی پیچ در پیچ گتھیوں کی عکاسی کریں جو فرد اور عوام کی قسمتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انہیں چیزوں نے ہمارے ناول نویسوں کو اس بات پر ابھارا ہے کہ وہ پیچیدہ رنگ برنگ اور وسیع پیمانے پر متنوع زمیہ افسانہ پردازی کے میدان میں تلاش و جستجو کریں۔ اگرچہ بہت سی مثالوں میں ہمیں ان کوششوں کے مختلف نتائج کو سامنے رکھنے کی بجائے نئی چیزوں کی تخلیق، سعی، جستجو اور کوششوں کی بابت کہنا پڑتا ہے، تاہم سوویت ناولوں کی جدت پسندی ان تمام لوگوں پر زیادہ سے زیادہ واضح ہوتی جا رہی ہے جو دیکھنے کے لئے آنکھ اور سننے کے لئے کان رکھتے ہیں۔

قسمت کے مالک عوام

اشتراکی رشتوں کے قائم ہونے کے معنی یہ تھے کہ سوویت سرزمین پر کل طریق زندگی زیادہ سے زیادہ محنت کشوں کی باشعور مرضی کے ماتحت بنا دیا گیا۔ اس سے سوویت ادب میں نئے قسم کا زمیہ عمل پیدا ہوا۔ اب سوویت ادیبوں کے لئے ایک وجہ بھی تھی اور اُنہیں حق بھی حاصل تھا کہ وہ محنت کش عوام اور عوامی طبقہ ہر ہر فرد کو ایسے روپ میں پیش کریں جس سے وہ اپنی تاریخی قسمت کے خود مالک ظاہر ہوں۔ اس سے پہلے طالسطائی نے عوام کو متحرک حالت میں پیش کیا تھا۔ لیکن سوویت ادب کا زمیہ اس سے مختلف تھا۔ علاوہ ازیں پچھلے ادب میں عوام کی قسمتوں اور زندگیوں کو جس طرح روایتی طرز پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جدید سوویت ادب کی راہ اس سے کلیتاً جدا گانہ ہے۔

اس اعتبار سے کسان کی زندگی کے موضوع کو سوویت ادیبوں نے جس طرح برتا ہے وہ بے انتہا قابل غور ہے۔ اس موضوع پر دنیا کے ادب میں جتنی بھی تصانیف ہیں انھوں نے کسانوں کو ساکت اور کلیتاً بے حس و حرکت تصویروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ خود موضوع ہی اس بات پر مجبور کرتا تھا کہ اس مواد کو اسی طرح پیش کیا جائے۔ عمل کا آہستہ آہستہ بڑھنا، اشخاص کی یک گونہ جبری سعت، یہ احساس کہ انسانی زندگی ایک غیر متغیر چیز ہے۔ یہ خصوصیات روسی اور مغربی ادب کی ان بیشتر مختلف النوع تصانیف میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔ جو گاؤں کی زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات زولا کی تصنیف "زمین" (Earth) سے لیکر چیخوف "تک میں پائی جاتی ہیں۔

سوویت ادب نے جب اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ کسانوں کی زندگی اور دماغوں میں اکتوبر کے اشتراکی انقلاب اور اجتماعی کھیتی باڑی کی پیدا کردہ

کثیر تبدیلیوں کی عکاسی کرے تو اس موضوع کو ایک نئے طریق کار کی ضرورت پڑی۔ اس سلسلہ میں شولوخاف نے غیر معمولی طور پر اہم حصہ لیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے کسان طبقہ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح گورکی نے پرولتاری کو پیش کیا تھا۔ شولوخاف ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ بتایا کہ ملک کے بونے اور جوتنے والوں میں جو سیدھی سادی شرافت پنہاں ہے، اس کا حقیقی اظہار عاجزی اور طویل مصیبت برداشت کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ زندگی کی اس سمر بھر کی جماعت سے ناتا توڑ کر کیا جا سکتا ہے جس پر ملکیت پر قائم کی گھٹیا اور دوالہانہ جبلتیں حاوی ہیں۔ ماضی سے اس طرح ناتا توڑنے، مضبوط اور پرانی عادتوں کو دور کرنے اور نئے طریقوں، نئے تصورات کی تلاش اور جستجو میں شولوخاف کے خاص ہیروؤں کے داخلی حسن کار راز مضمر ہے۔ کسان طبقے کی زندگی میں جو زبردست بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں وہ اس شعری موضوع کی اساس ہیں جسے تاریخ میں پہلی مرتبہ سوویت ادب منظر عام پر لایا۔

انقلاب سے جو نئی قدریں پیدا ہوئیں۔ وہ شولوخاف اپنے قارئین کو ایک ہوسکنار گاؤں میں تیز و تند طبقاتی جنگ کے ذریعے دکھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مصنف نہ صرف نئی دنیا کی تخلیق کا ذکر ہی کرتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ پرانی دنیا نے اس کا مقابلہ کیسے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف انفرادی تقدیروں کی کہانی ہی نہیں سناتا بلکہ تاریخ کی نبض پر انگلی رکھ کر عوام اور فرد کی قسمت کے درمیان جو کڑیاں ہیں ان کو بھی دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تصنیف "اور دریا بہتا رہا" (And Quiet flows the Don) اور (Virgin Soil Upturned) میں اس بات کو معلوم کر سکا کہ عظیم تاریخی تغیرات کے موقعہ پر بے انتہا مختلف طبیعت کے اشخاص چلن میں ان کی کیا کیا مختلف خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ دل نشین طریقہ پر کردار کی تصویر کشی کے ذریعے اہم سماجی تبدیلیوں کا اظہار کرنے میں وہ کامیاب ہوا۔

ادب عالم میں یہ ایک روایتی بات تھی کہ کسان اور ان لوگوں کو جو فطرت کی آغوش میں پلے بڑھے تھے سیدھے سادے انسانوں کی حیثیت میں پیش کیا جائے جنہیں زندگی کے پیچ و خم سے کوئی تعلق نہیں۔ شولوخاف وہ پہلا مصنف تھا جس نے ان لوگوں کی اندرونی زندگی کی پیچیدگیوں کا انکشاف کیا۔ جنہیں ماضی کا ادب "نوع انسانی کے ہم آہنگ قدیم دور" کے فرزندان فطرت خیال کرنے کا عادی تھا۔ موازنہ کے لئے دوکرداروں کی یاد دہانی کرنی ضروری ہے۔ ایک ٹامس ہارڈی کا "ٹس آف دی ڈابر ویلز" جو غالباً دنیائے ادب میں کسان عورت کی سب سے زیادہ نازک اور شاعرانہ تصویر کشی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ایسا کردار ہے جس میں بچکانہ پن اور غیر پختگی پائی جاتی ہے۔ دوسری طرف شولوخاف نے "بہتا دریا" کی اکسینیا ہے جس میں گہرائی اور پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شولوخاف اس چیز کو منکشف کرنے میں کامیاب ہوا ہے اس سے پہلے کوئی شخص انجام نہ دے سکا۔ یعنی یہ کہ زمین کے ایک معمولی بونے اور جوتنے والے میں ایک صحت مند اور متین ذہنیت ایک بیش بہا روحانی زندگی کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہے۔

خاص طور پر گریگوری میلیخوف کا جو کردار پیش کیا گیا ہے، اس سے ہر شخص یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ کس حد تک عوام کی زندگی کے وسیع اور ہمہ گیر زمینہ بیان کا اصول، جسے اشتراکی حقیقت پسندی کے آرٹ نے برتا ہے۔ مصنف کے امکانات کو جبکہ وہ اپنے ہیرو کی روحانی زندگی کے سکیلے پر قلم اٹھاتا ہے مالا مال کرتا ہے۔ شولوخاف نے انقلاب اور خانہ جنگی کی وسیع تصویر کھینچی تھی۔ یہ ایسی تصویر تھی جو اس جنگ کے پیچ در پیچ سماجی طاقتوں کی صف آرائی کو پیش کرتی اور تحریک آزادی کی توانائی کو ظاہر کرتی تھی جو کروڑہا انسانوں میں پھیل چکی تھی۔ یعنی پرعمل انقلاب کی طاقت۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک ایسے فرد کی قسمت کے ڈرامہ کو منکشف کرنے میں کامیاب ہوا جو عوام کی تاریخی پیش قدمی کا ساتھ نہ دے کر پیچھے رہ گیا تھا۔ جو شخص عوام کی جنگ آزادی سے بچھڑ گیا ہو۔ اس کی باطنی ویرانی کی گہرائیوں کو اتنے زور کے ساتھ پیش کرنا محض ایک اشتراکی فنکار کا ہی کام تھا یعنی ایک ایسا فن کار جو فتح مند انقلاب کی سرزمین میں عوام کے اخلاقی و سیاسی اتحاد کا پورا پورا شعور رکھتا ہو۔ ناولوں کے اختتام پر تنہا دکھ کر وہ گریگوری میلیخوف کا کردار ان حدود سے کہیں آگے بڑھ جاتا ہے جو کسی موضوع کے لئے مقرر ہیں۔ اتنی گہرائی شاذ و نادر ہی ملتی ہے نہ صرف دنیائے ادب میں اس کی کوئی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملے گی۔ غداری کی ٹریجڈی کی تصویر کشی اور تاریخ موڑ پر فرد اور عوام کے درمیان جو رشتے قائم ہوتے ہیں ان کی جیسی پیچیدہ جدلی منطق پیش کرتے ہوئے شولوخاف نے ایک ماہر فن مصور کا برش استعمال کیا ہے۔

اشتراکی حقیقت پسندی

اشتراکی حقیقت پسندی کی جڑیں یہ خواہش کارفرما ہے کہ زندگی کو اس کی متحرک حالت اور مسلسل ارتقائی صورت میں پیش کیا جائے۔ فرد اور عوام کی قسمتوں کو باہم گرہ بوط کر کے دکھایا جائے، اور زندگی کی پیش قدمی ایک ایسے پس منظر کے ساتھ پیش کی جائے جو وسیع تاریخی تصویر کا حامل ہو۔ اسی وجہ سے ماضی کے حقیقت پسندانہ احیاء کے لئے موافق حالات میسر آئے۔ یہاں بھی سوویت مصنفین نے اپنی تصانیف کی بنیاد روسی کلاسکی حقیقت پسندی کی عظیم جمہوری روایات پر رکھی۔

فلابئرٹ کے ناول سالمبو اور ٹالسٹائی کے ناول (جنگ اور صلح) کے مابین، جو ایک ہی وقت میں دنیا کے سامنے آئے، موازنہ اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے اور پچھلی صدی میں مغربی اور روسی تاریخی ناول کی ترقی اور فروغ میں جو فرق ہے اس پر رائے قائم کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ روسی کلاسکی حقیقت پسندی اس بات میں یقین رکھتی تھی کہ تاریخی ناول کے لئے ضروری ہے کہ قوموں کی زندگی کی بڑی بڑی تحریکوں کا سچائی سے احیاء کرے۔ برخلاف اس کے تازہ ترمغربی ادب کی اصرار کے ساتھ ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ تاریخ کو یا دگارانہ آرائشی پس منظر کے طور پر استعمال کریں۔ یعنی موجودہ بورژوا طبقہ کے مریض پیچیدہ جذبات کو کھینچ کر پیچھے کی طرف لے جائیں۔ اور ماضی کے روپ میں دکھلائیں۔ آج کے مسائل کو تاریخ کے واسطے سے حل کرنے کی کوشش نے ماضی کو زمانۂ حال میں تبدیل کرنے کا کلیتاً غیر معقول عمل کیا ہے۔

سوویت کے تاریخی ناول نگاروں کی رہنمائی کلیتاً متقابل اصولوں سے ہوئی ہے۔ مغرب میں رائج الوقت بورژوا تصورات "تاریخ کو ایک انتشار، الف لیلہ اور مہمل حادثات کا ایک مجموعہ" اور ایک ہی قسم کے تعصبات کا ایک مدام اعادہ خیال کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف اس میدان میں سوویت مصنفین اپنی تصنیفات کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھتے ہیں کہ تاریخی ارتقاء کے عمل کو "ایک ایسی تحریک میں سمجھنا چاہیئے جو ایک ہی دائرے میں گھومتی ہوا اور نہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو واقعات رُونما ہو چکے ہیں۔ تاریخ محض ان کا ایک اعادہ ہے، بلکہ تاریخ آگے بڑھنے والی اور بلند سطح پر لیجانیوالی تحریک ہے اور ایک ایسا تغیر ہے جو قدیم کیفیاتی حالت کو جدید کیفیاتی حالت میں تبدیل کرتا ہے ..... تاریخ کا یہ مفہوم سمجھ کر سوویت مصنفین اس قابل ہوئے کہ ماضی پر نہ تو غازہ ملیں اور نہ اسے نئے روپ میں دکھائیں بلکہ شاعرانہ انداز میں اس کا احیاء کریں۔ ان کے نزدیک۔ ماضی کی شاعری اس بات پر مشتمل نہیں ہے کہ گذشتہ واقعات کی تفصیلات کو خوش نما انداز میں بیان کریں بلکہ ایک آگے بڑھنے والی تحریک کی حیثیت سے پیش کریں جس نے نوع انسان کی تاریخی قسمت کو بنایا ہے۔ مثال کے طور پر انگزی ٹالسٹائی کی تصنیف پیٹراول کو ہی لیجئے۔ اس کتاب کا موجب و محرک عظیم تاریخی تغیرات کے طوفانی ایام تھے جو روسی تاریخ کے اہم دور میں "قدیم کیفیاتی حالت سے جدید کیفیاتی حالت میں تبدیل ہونے کے زمانے کو" ممتاز کرتے ہیں۔

سوویت کے بہترین تاریخی ناول نویسوں نے جو کام اپنے ذمہ لیا ہے اس کی وسعت اس بات سے کہیں زیادہ ہے کہ عوام نے تاریخی عوامل پر کس طرح اثر ڈالا ہے۔ محض اس کو بیان کر دیا جائے یا ملک کی ترقی کی بابت کلیدی لمحات میں جو سرگرمی رہی اس کو پیش کیا جائے۔ یہ کام توجزوی طور پر کلاسکی حقیقت پسندی انجام دے چکی تھی۔ سوویت تاریخی ناول نے ایسی تصنیفات میں جیسا کہ دی ششتی قاف کا ناول "یملیان پوگاچف" ہے۔ عوام کی شخصیت کو اس حیثیت سے منظر عام پر اُبھارا ہے گویا وہ تاریخ میں انسانی عقل و دانش کے محافظ اور تاریخی ترقی کے خالق ہیں۔ سوویت تاریخی ناول نے ترقی پذیر وجود کی شبیہہ تیار کی ہے جو حصول آزادی کے لئے عوام کی والہانہ خواہشات کی ترجمانی کرتی ہے۔

دوسری جنگ عالم نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ تمام دنیا کے لئے مادی اور اخلاقی طاقتوں کی ایک کسوٹی تھی۔ اس جانکاہ آزمائش سے سوویت ادب کامرانی کے پرچم اُڑاتا گذر گیا۔

لیو اسٹائی کی تصنیف "لیو اسٹوپون کی کہانیاں" کو پڑھ کر رنسٹ ہیمنگ وے نے اس بات پر گہرا سوچ بچار کیا کہ ہیمنگ کا تجربہ ایک مصنف کے لئے کس قدر مفید ہوتا ہے۔ گذشتہ زمانے میں مصنفین محض فرداً فرداً اس تجربہ سے استفادہ کرتے تھے۔ لیکن سوویت عوام نے

جو عظیم وطنی جنگ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک اس کے دوران میں سیکڑوں سوویت اہل قلم نے بچشم خود محاذ جنگ کے حالات کا مطالعہ کیا اور جب انھوں نے جنگ کے موضوع پر قلم اٹھایا تو ان کے وسائل تصنیف کافی واضح اور امکانات موضوع زیادہ وسیع ہو گئے۔ لیکن سوویت مصنفین کو دورانِ جنگ میں جو فائدے حاصل ہوئے، ان کا خاص ماخذ فوجی معاملات کے متعلق ذاتی علم نہ تھا بلکہ وہ قریبی روابط تھے جو عوام کے ساتھ قائم ہوئے۔ یہ روابط الہام کا ایک ایسا نہ ختم ہونے والا ذریعہ تھا جو عوام کی وطن پروری کے فن کارانہ اظہار و بیان میں ان کا معاون ہوا۔ سوویت ادب نے جنگ کے موضوع کو بیان کرنے میں جو تمام تر نیا اسلوب اختیار کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو ایک ایسے بے مثال اور بلند تر جہد و ازم کو پیش کرنا تھا جس کو پیش کرنے سے ماضی کا ادب قاصر رہا۔ سوویت ادب کو منفرد لوگوں کے کارناموں کی عکاسی منظور نہ تھی اور نہ اس دلیرانہ بغاوت کو ہی پیش کرنا تھا جو مظلوم عوام کے ارکان کی طرف سے ظاہر ہوئی بلکہ سوویت عوام کی اس باشعور، متحد اور حقیقت پسندانہ بہادری و جرأت کو دکھانا تھا، جو انھوں نے اپنے ملک کے ماؤں کی حیثیت سے معرکۂ جنگ میں دکھائی۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت مصنفین، جنگوں کے المناک واقعوں، لڑائیوں، تخلیوں، قحطوں اور محاصرے کو سچائی کے ساتھ بیان کرنے اور موضوع جنگ کے شاعرانہ انداز بیان کے نئے راہوں کو پا جانے میں کامیاب ہوئے۔

مجموعی حیثیت سے سوویت ادب کی گوناگوں اور مختلف تصانیف گذشتہ چند سالوں کے دوران میں عوامی جنگ کی ایسی شاعرانہ تصویر پیش کرتی ہیں جو دنیا کے ادب میں کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔

دُنیا کے لئے ایک نظیر

سوویت ادب کی مثال تمام ملکوں کے لئے ایک صلائے عام ہے کہ جب تک زندگی کی ہو بہو تصویر نہ کھینچی جائے اعلیٰ آرٹ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں سوویت ادب نے عملاً یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ آرٹ میں بے کھوٹ حقیقت پسندی، گھٹیا اور بے مغز نقال فطرت کی دشمن ہے موجودہ صدی کے اوائل میں ہی حقیقت پسندی کے اصول ایک حد تک بہت سے مغربی مصنفین کی نظروں سے گذر چکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ حقیقت پسندی نے فطرت کے عمل پر اپنے آپ کو وابستہ کر دیا تھا۔ فن میں زندہ صداقت کے اصول کو سوویت ادب نے از سر نو بحال کیا ہے اور اسی زندہ صداقت نے فن کے لئے نیا کیفیاتی فہم و ادراک پیدا کیا ہے۔

رومانی ذہنیوں نے جو جمہوری اور اشتراکی خیالات قائم کئے، ادب عالم کی تاریخ نے اکثر ان کو دیکھا ہے۔ اشتراکی دور سے قبل کے مصنفین نے آرٹ میں آئیڈیل کی فنکارانہ تشکیل بندی اس طرح کی کہ یہ اوقات اس میں مطلقیت (Abstractness) کی جھلک آگئی جو اکثر دفعہ عمل توہمات کی حدوں کو چھوتی ہے۔ ہر ملک کے ادب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ روسی کلاسکی ادب حقیقت پسندانہ رویوں سے ترقی پسند خیالات کو تشکیل دینے میں کامیاب ہوا۔ یہ ادب اگر اجمہوری ادب تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے قدم حقیقی زندگی کی زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔ رومانیت اور حقیقت پسندی کا امتزاج جس کی بڑی انیسویں صدی کے کلاسکی روسی ادب میں جڑ پکڑ چکی تھیں۔ سوویت ادب میں آکر بارآور ہوا۔ ترقی پسندانہ اور علمی و آفاقی معیار نظر سے سوویت مصنفین نے جن کی تصنیفات عظیم تاریخی تبدیلیوں کا شاندار عکس ہیں، دنیا کے فن کاروں کو یہ دکھلا دیا کہ کس طرح فن کے حسن اور آئیڈیل اور حقیقی زندگی کی سچائی کو ایک واحد سانچہ میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

(مترجمہ:۔ سیدہ یحییٰ)

سردار جعفری

فیض کے نام

(پاکستان کے ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض کو حکومت پاکستان نے سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ خبر یہ ہے کہ حکومت پاکستان امریکی جنگ بازوں سے سازش کر کے پاکستان کے عوام کی آزادی اور جمہوریت کو جنگ کے شعلوں میں جھونکنا چاہتی ہے اور فیض نے اس سازش کا پردہ چاک کرنے کی دھمکی دی تھی۔ پاکستانی حکومت کی کمزوری کا اندازہ صرف اس سے ہوتا ہے کہ وہ فیض پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلاتے ہوئے ڈرتی ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ فیض پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے)

کل تھا جب میں جیل میں تنہا
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تری آواز کی شبنم
کنکھنی کے لب تر کر جاتی تھی
گل کے کٹورے بھر جاتی تھی
شام کی نگہت بن کر اکثر
روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
چاندنی کا ملبوس پہن کر
آم اور املی کے پیڑوں پر
تھک کر جیسے سو جاتی تھی
اور میں تیرے نازک میٹھے
پیارے گیتوں کا گلدستہ
اپنے دھڑکتے دل سے لگائے
خوابوں کی نیلی وادی میں
آہستہ آہستہ چلتا
جیل سے باہر آ جاتا تھا
ظلم کے دل پہ چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
(کیسی ہے یہ قید کی دنیا؟
قلب و نظر کی محرومی ہے
تاریکی اور تنہائی میں
پتھر کی خاموش ہنسی ہے)

آج ہے جب تو جیل میں تنہا

میں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں نے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
یہ میری آواز ہے لیکن
صرف میری آواز نہیں ہے
جوش، فراق، آنند اور بیدی
عصمت، ساحر، کرشن اور کیفی
میری زبان سے بول رہے ہیں
ہند کے سارے لکھنے والے
ناچنے والے گانے والے
اپنی محبت کے گلدستے
تیری جانب بھیج رہے ہیں

جلتی ہوئی یہ شاخ اُٹھالے
دیکھ اس میں کیا پھول کھلے ہیں
شعلہ، بجلی، نغمہ بن کر
بچھڑے ساتھی آن ملے ہیں

دُور ہے گو لاہور کی بستی
اُونچی زنداں کی دیواریں
اک جھوٹے آئین کی سرحد
تپتا جنگل جلتا پربت
دل اور روح کے بیچ میں حائل
پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
سانس کا زیر و بم ہے یکساں
ہم آہنگ ہے چاپ قدم کی
ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
ایک ہی لیلیٰ ایک ہی محمل
ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل

میٹھا ہے راوی کا پانی
ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں
ساون بھادوں بن کر برسیں
سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
بجتی رہے بادل کی چھاگل
دل میں ہوک نہ اُٹھنے پائے
پیٹ میں بھوک نہ اُگنے پائے
گیہوں کا ہر خوشہ سر پہ
زرّیں تاج پہن کر آئے
ماؤں کے سینے دودھ سے چھلکیں
ہنستی رہیں بچوں کی پلکیں
زلفوں کے گہرے سایوں میں
رنگ برنگے آویزوں سے
ننھے ننھے جگنو چمکیں
چولھے دہکیں، روٹیاں مہکیں
شاخیں لہکیں، چڑیاں چہکیں
باہیں کھنکیں، چوڑیاں گائیں

شانوں پر آنچل لہرائیں
امن و اماں کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
اس مقصد کے آگے سارے
ظالم، دشمن، ڈاکو، قاتل
سہمے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
بستی بستی، جنگل جنگل
ظلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
زنجیروں کے کالے حلقے
ناگ ہیں، پھن پھیلائے ہوئے ہیں

ظلم سے لیکن ڈرنا کیسا
موت سے پہلے مرنا کیسا
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
"بول زباں اب تک تیری ہے"
بول کہ کس قاتل کا دامن
خونِ بہاراں سے رنگیں ہے؟
کس کی گردن میں ڈالر کے
سونے کی زنجیر پڑی ہے؟
کس نے امریکہ کے ہاتھوں
خاکِ وطن کو بیچ دیا ہے؟
بیٹی اور بہن کے آنچل
ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے؟

کون ہے جو جنگی شعلوں میں
پاکستاں کو جھونک رہا ہے؟
کون ہے جو اقبال کے دل میں
ظلم کی گیلیں ٹھونک رہا ہے؟
شاعر کی آواز کو کس کا
خونی نیزہ گھونٹ رہا ہے؟
ریشم کے رومال میں کس کے
رنگ لہو کا چھوٹ رہا ہے؟
جیلوں کی دیوار میں یہ کون
انسانوں کے دل چنتا ہے؟
کون ہے جو قانون سے اپنے
مکڑی کا جالا بنتا ہے؟
کون اُجالے سے خائف ہے؟
کون انسانوں سے ڈرتا ہے؟
سورج کی کرنوں سے ہراساں
جنتا کی نظروں سے پریشاں
کس نے عدالت کا دروازہ
سنگینوں سے روک دیا ہے؟
یہ کس نے انصاف کے منہ میں
ظلم کا کپڑا ٹھونس دیا ہے؟

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
"بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے"

وامق جونپوری

آلھا

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک

پہلا کینٹو ——— رات گئے
دوسرا کینٹو ——— مگر چاندنی
تیسرا کینٹو ——— پہلی کرن

(۱)

بھاری بندھن ٹوٹ چلے جب — ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب
ایک بھینکر آندھی آئی — کالی کالی بدلی چھائی
چم چم چم تلواریں چمکیں — دن دن دن بندوقیں چھوٹیں
لاشوں کے انبار لگے تھے — بھوتوں کے بازار کھلے تھے
خون کے فوارے چھٹتے تھے — آنکھ سے انگارے چھٹتے تھے
گھر گھر کے کرموت کا ڈنکا — کالا جادو ناچ رہا تھا

بھاری بندھن ٹوٹ چلے جب
ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب

ڈر کر ہستی بھاگ رہی تھی — سوئی نفرت جاگ رہی تھی
آگ لگانے والے چھپ کر — دیکھ رہے تھے موت کا چکر
موت بھی تھک کر ہانپ رہی تھی — دھرتی ماتا کانپ رہی تھی
انساں کو انساں ڈستا تھا — انساں پہ حیواں ہنستا تھا
تاریکی جب اور بڑھی کچھ — خون کی ندی اور چڑھی کچھ
اب دریا پایاب نہیں تھا — دیکھا تو پنجاب نہیں تھا

بھاری بندھن ٹوٹ چلے جب
ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب

بازاروں سے شعلے اٹھ کر — آنے لگے جب گھر کے اندر
گھر کا سکوں تھا درہم برہم — بدلا ہوا تھا سارا عالم
تاریکی کا پردہ لے کر — عورتیں نکلیں گھر کے باہر
بھوکے بھیڑیے پیاسے پیاسے — بچے ماں کو ڈھونڈ رہے تھے
دلہن بھی آنچل کو سنبھالے — خون میں ڈوبے کان کے بالے

سجھے ہوئے اپنے کو سہاگن — کل کی بیاہی آج ابھاگن
ڈھونڈنے نکلی تھی شوہر کو — حسرت سے تکتی تھی گھر کو
ایسوں کے ہمدرد بہت تھے — مکاری میں فرد بہت تھے
دکھیوں کا بازار لگا تھا — کوٹھوں پر بھنڈار کھلا تھا
ڈھونگ یہ پونجی پتیو کا تھا — کھیل یہ گورے بنیو کا تھا
ہندو مسلم سکھ عیسائی — کہنے کو تھے بھائی بھائی

بھاری بندھن ٹوٹ چلے جب
ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب

امن کی کوشش بھی جاری تھی — پہرے پر فوجی لاری تھی
پہیاں لاشیں روند رہی تھیں — بجلیاں ہر سو کوند رہی تھیں
بچ نکلے جو موت کے منہ سے — جان بچا کر بھاگ رہے تھے
ریلوں میں بھی بھاگنے والے — بنتے تھے حملوں کے نوالے
امن یہاں تھا اور نہ وہاں تھا — جینے پہ مرنے کا گماں تھا

بھاری بندھن ٹوٹ چلے جب
ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب

ایک طرف یہ حشر بپا تھا — دوسری جانب سمجھوتا تھا
ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر — رہ گئے حصے بخرے ہو کر
ملک کو بانٹا صوبے بانٹے — بٹ گئے کتنے گھر بے بانٹے
دریاؤں کے دھارے بانٹے — بجلی کے گیہوارے بانٹے
فوجیں بانٹیں حربے بانٹے — جنگ کے سارے نقشے بانٹے
مسجد اور مینارے بانٹے — مندر اور گوردوارے بانٹے
تمت اور ایمان کو بانٹا — آزادی کی آن کو بانٹا

جیگر = بھائی چارہ ۔ بھنڈار = لنگر خانہ ۔ پونجی پتی = سرمایہ دار

قسمت اور ایمان کو باٹا آزادی کی آن کو باٹا
زردا روں میں دولت بانٹی مفلس کو بے کاری دیدی
قحط وہ بانک بانٹ میں آئے ملک کی سر پہ لاش اُٹھائے
مختصراً کیا کچھ نہ بٹا تھا خن کاروں کا ہاتھ کٹا تھا

بھاری بند ھن ٹوٹ چلے جب
ڈاکو گھر کو لوٹ چلے جب

اس تقسیم آب و ہوا میں فرق رہا بندے نہ خدا میں
وہ بھی بے گھر یہ بھی بے گھر وہ بھی گھر گھر یہ بھی در در
بیوی بچے اس کے نہ اِنکے وہ بھی واحد یہ بھی اکیلے
اس کی عظمت چاند ستارے ان کی عظمت گرم شرارے
وہ آبادی اور ویراں میں یہ بھی سڑکوں اور میداں میں

جب ہر شے بٹتی تھی یہاں کی
کانوں میں آواز اک آئی

چاند سے تابش دُھل نہیں سکتی خون کی بندش کھل نہیں سکتی
اک دن بچھڑے مل کے رہیں گے چاک گریباں سِل کے رہیں گے
خونِ ناحق تب بولے گا قطرہ قطرہ گواہی دے گا

صبح ذرا ہو لینے تو دو
ہم کو ابھی رو لینے تو دو"

(۲)

اتنے میں کچھ توپیں چھوٹیں بے گنتی آشائیں ٹوٹیں
بدلی کچھ کچھ چھٹنے لگی تھی تاریکی بھی چھٹنے لگی تھی
ننگے جھوکے سر کو جھکائے کاندھے سے بچوں کو لگائے
ہارے ہوئے طوفان کے مارے گننے لگے آکاش کے تارے
ایک دھندلکا سا جب پھیلا کچھ کچھ اُجلا کچھ کچھ میلا
'ریڈیو' بولا آیا سویرا

ختم ہوا اب رین بسیرا

عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے گھر کو جلا کر تاپ رہے تھے
پیروں میں زنجیریں پہنے جھنڈا لے کر ناچ رہے تھے
آفس کو آزادی سمجھے
مرگھٹ کو آبادی سمجھے

سنگِ میل کو منزل جانا ساکت موج کو ساحل جانا
اِن دیسی ملاحوں نے بھی کشتی کی پتوار سنبھالی
سونے چاندی کی پتواریں جنتا کے سر پہ تلواریں
خوش ہو کر ملاح پکارے اپنی کشتی اپنے دھارے
تہ میں دھارے تیز تھے اب بھی ویسے ہی طوفاں خیز تھے اب بھی
راہ غلط ہے سمجھے نہ غافل اب بھی اتنا ہی دور تھا ساحل
طوفانوں کی ماری کشتی صدیوں کی بے چاری کشتی
ماتھا زخمی دامن زخمی بوٹوں سے تھا تن من زخمی
کوئی بھی اس کا حال نہ سمجھا دو ٹکڑے ہے پال نہ سمجھا
کشتی ہر دھارے کی رَو پر کھانے لگی گرداب میں چکر
دیو سروں پر پونجی والا ملاحوں کے ناچ رہا تھا
دیو وہ جس نے پالا تھا انکو ملاحوں میں ڈھالا تھا ان کو
وقت کی سب کو تاک لگی تھی کشتی بھر میں لوٹ مچی تھی
خلاصی بھی لوٹ رہے تھے جیسے ختم غدر پہ گورے
اشرفیوں کے پھینکنے والے کوئلوں پر تھے مہریں ڈالے
کشتی میں ہر چیز بھری تھی ہر شے لیکن جان سے ہنگی
کالی دو کان کالی دولت عصمت تھی ہر چیز کی قیمت
دیکھ کے یہ کشتی کی حالت پھیلی اہل کشتی میں وحشت

ملاحوں پر جھپٹا کوئی راکششوں سے لپٹا کوئی
کوئی چپو کو چھین رہا تھا کوئی روٹی چھین رہا تھا
کوئی باغی گیت سُناتا کوئی جنگی ناچ دکھاتا
کوئی جنتا کا گُن گاتا کوئی آشا محل بناتا
کوئی چھُپ کر خبریں لاتا کوئی خفیہ راہ بتاتا
آخر اس چھینا جھپٹی میں ہاتھوں کی زور آزمائی میں
کچھ کے ہاتھ لگیں پتواریں کچھ کو ملیں ننگی تلواریں
اب طاقت کا کام یہاں تھا طاقت میں ہر راز نہاں تھا
کشتی بھی رُخ موڑ رہی تھی گردابوں کو چھوڑ رہی تھی
ہاتھ سے کشتی جانے لگی جب اور کنارے آنے لگی جب
ملاحوں کا سر چکرایا دیو نے تب منتر یہ پڑھایا
قاعدے اب کچھ گڑھ لو ایسے جن سے سر جنتا کا نا ٹھے

آشائیں = اُمیدیں۔ آکاش = آسمان۔ گانٹھ کے پورے = دولت مند۔ مرگھٹ = قبرستان۔ پال = بادبان۔ راکشش = دیو۔ چپو = پتوار۔

منصوبوں کے بعد یہ ٹھہری — جو بولے کچھ وہ ہے باغی
جیلوں کی بھرنے لگی جھولی — جلسوں پر چلنے لگی گولی
ڈاکوؤں سے بھی ناتا جوڑا — اپنا ہر اک وعدہ توڑا
فن کاروں کو قید میں ڈالا — مزدوروں کو بات میں ٹالا
اخباروں پر چھاپا مارا — غنڈوں کو جنتا پہ اُبھارا
جھوٹی خبروں کو پھیلایا — لوگوں کو گمراہ بنایا
کس کی رہی ہے کس کی رہیگی — دنیا سچی بات کہے گی

سچ کڑوا ہوتا ہے تو کیا
کوئی خفا ہوتا ہے تو کیا

رات گئے جو آئی تھی آندھی — وہ بھی آندھی یہ بھی آندھی
لیکن وہ بے قاعدہ کچھ تھی — اور اب کی یہ سمجھی بوجھی
اُس کے جھونکے آگ بونڈر — اِس کے سب قانون کے اندر
اس میں کٹے تھے بھائی بھائی — یہ پونجی اور حق کی لڑائی
لیکن بوڑھوں کا کہنا ہے — جب تک دنیا میں رہنا ہے
جو ہے جس کے بھاگ میں لکھا — اتنا ہی تو اس کو ملے گا
اس میں کسی کا دوش نہیں ہے — خود اپنے کو ہوش نہیں ہے
پیٹ کی خاطر جو لڑتے ہیں — وہ دوزخ کا منھ بھرتے ہیں
ان کو کسی نے بھڑکایا ہے — اونچا نیچا سجھایا ہے

یہ سب ہے خطرے کی نشانی — سمجھانے پر بات نہ مانی
ننگے ہیں تو رہنے بھی دو — کہتے ہیں کچھ کہنے بھی دو
بھوکے ہیں تو اچھا ہی ہے — اک دن سب کو مرنا ہی ہے
یہ سب ہیں قسمت کی گھاتیں — یعنی سب باقاعدہ باتیں
روٹی کا یہ وقت نہیں ہے — وقت بھی کوئی سخت نہیں ہے
ذکر شکم سے لاج نہ آئی — تم سب پر ہنستی ہے خدائی
ہاتھ اٹھا کر مانگو دعائیں — بھگتی سے کٹتی ہیں بلائیں
ملاحوں کا ہاتھ بٹاؤ — چیخنے والوں کو سمجھاؤ

رات گئی اب آیا سویرا
ختم ہوا اب رین بسیرا!

لیکن بات بنے تو کیسے — ایسے ہی کتنے اور ہیں بپھرے
خطرہ اندر خطرہ باہر — خطرے میں ہے سات سمندر

دریا چڑھتا ہی جاتا ہے
خطرہ بڑھتا ہی جاتا ہے

(۳)

تیز ہوا کرتی ہے منادی — خطرے میں ہے پونجی وادی
جھل مل جھل مل رات کے تارے — بجھتے ہوں جیسے انگارے
پورب جانب سُرخی دوڑی — پانے پر بجھتی ہے کوڑی
دور افق پر سورج چمکا — اوشا کے ماتھے کا ٹیکا
میدان میں اُتریں سینائیں — گاتی ہوئی جنگی رچنائیں
ایک مہا سنگھرش پڑا ہے — آزادی کا جوش کڑا ہے
کورو سے پانڈو لپٹے ہیں — حیوان سے مانو لپٹے ہیں
کرشن کنھیا گیتا لے کر — کاٹ رہے ہیں رتھ میں چکر
مارکس بھی اپنی پستک پڑھکر — جنتا کو دیتا ہے لکچر
اس یدھ میں بھی دروپدی اک ہے — دروپدی اک اور روپ بہت ہے
دروپدی مزدوری اور کھیتی — دروپدی کپڑا دروپدی روٹی
دروپدی جیون دروپدی دولت — دروپدی فن اور حسن و محبت
پنجوں میں پونجی پتیوں کے — دروپدی ننگی ناچ رہی ہے

ایک مہا سنگھرش پڑا ہے
رن میں ہر سادھن کھڑا ہے

یہ جھگڑا جب زور پہ آیا — دو سینا میں بٹ گئی دنیا
اک میں رکشش اک میں انساں — ایک مزے میں ایک پریشاں
ایک میں خونخوار لٹیرے — ایک میں محنت کش اور بھرکے
ایک خدائی کا دلدادہ — ایک حقیقت میں اَن داتا
جنگ تو عرصہ سے ہے جاری — آج مگر ہے وہ تیاری
جس میں کسان اور مزدوروں کی — انت میں جاکر جیت رہے گی
یہ سب جنتا کی سینا ہے — اس کو اپنا بل دینا ہے
اس سینا کے لڑنے والے — کتنے بہادر کتنے جیالے
ان میں کتنے آتھا اودل — لڑنے کو ہیں اب بھی بے کل
کتنے ٹیپو کتنے شیکھر — پہنے ہوئے ہیں خونی پیکر
ان میں ہر جھانسی کی رانی — دُہرائے گی اپنی کہانی
ان میں نہ جانے کتنے نذرل — سُلجھائیں گے اُلجھی کا کل

دوش = قصور۔ جنتا = عوام۔ بھگتی = عبادت۔ پونجی وادی = سرمایہ داری۔ اوشا = صبح۔ سینا = فوج۔ جنگی رچنائیں = رجز۔ مہا سنگھرش = بڑی لڑائی۔ مانو = انسان۔
پستک = کتاب (وہ گیتا ہاں)۔ یدھ = جنگ۔ روپ = شکل۔ جیون = زندگی۔ سادھن = بہادر۔

ان میں کتنے کا ڈوال بھی مرنے کو ہوتے ہیں بھرتی
ان میں کتنی زچہ مائیں ہیں کتنی بہنیں اور مائیں ہیں
نام جو اپنا کر جائیں گی۔ گولی کھا کر مر جائیں گی
مر کر زندہ ہو جائیں گی اپنا پرچم بو جائیں گی
لاکھ بھرتی اور بھگتی سے جنتا کی یہ فوج بنی ہے
ایسی سینا کا کیا کہنا مرتے دم تک لڑتے رہنا
کس نے قابو پایا ہے اُن پر کون دبچے پا سکتا ہے اُن پر

تیز ہوا کرتی ہے منادی
خطرے میں ہے پونجی وادی

اب تک جتنے کھیت پٹے ہیں جھنڈے اس سینا کے گڑے ہیں
ان کا جہاں بھی خون بہا ہے دھرتی پر آکاش بنا ہے
لیکر ان کے خون کا چھینٹا وقت نئی تاریخ لکھے گا
لشکر بڑھتا ہی جاتا ہے دریا چڑھتا ہی جاتا ہے
یہ لشکر گذرا ہے جہاں سے سورج بھی گذرا ہے وہاں سے
دیتا اپنے خون کی لعلی بھرتا سونے سے ہر تھالی

تیز ہوا کرتی ہے منادی
جنگ ہے یہ جنگ آزادی

فوج نہیں آتی باہر سے فوج تو خود اُٹھتی ہے گھر سے
جس بھومی پر کال اُگے ہیں اس دھرتی سے لعل اُگے ہیں
جو بنیوں کو کھا لیتے ہیں ظلم سنگھاسن ڈھا دیتے ہیں
اپنا بھی اب حال بُرا ہے دیس ترا بنگال بنا ہے

لو پو پھوٹی سورج نکلا
سچ جگ کا اب ہو گا سویرا

سب کی نظر دیپ پہ پڑی ہے جنتا بھی تیار کھڑی ہے
کس مسی اک طاری ہے تن پر اک اک پل بھاری ہے من پر
وقت آتے ہی ٹوٹ پڑیں گے آگ کو بن کے لڑیں گے

تب یہ زمینداری نہ رہیگی
اور ساہوکاری نہ رہیگی

کھیت کسانوں کا تب ہو گا جینے کا سامان سب ہو گا
تگنا غلہ پیدا ہو گا گیہوں آٹا میدا ہو گا
ٹوٹ کے رہ جائیں گی مینڈیں بوئیں اور کاٹیں گی مشینیں
فصل جہاں تک کٹتی رہے گی سب میں برابر بٹتی رہے گی
جنگل میں بھی ہو گا منگل اُوسر میں بھی ہو گی ہل چل
بنجر بھی سونا اُگلے گا کنکر سے امرت نکلے گا
مفت زچا گھر مفت پڑھائی مفت دوائیں مفت صفائی
ہر بچے کا کھانا کپڑا فرض حکومت کا خود ہو گا
بے کاری کا نام نہ ہو گا کل کا خیال خام نہ ہو گا
کوئی بڑا یا چھوٹا نہ ہو گا کوئی کسی کا پرجہ نہ ہو گا
ہر گاؤں میں بجلی ہو گی جل تھل ہو گا روشنی ہو گی
گاؤں بدل کر شہر بنیں گے شہروں میں مزدور رہیں گے
مزدوروں کی ہو گی حکومت اور کسانوں کی پنچایت
مل کی مالک جنتا ہو گی یعنی مل ہو گی سرکاری
مزدوری کا غم بھی نہ ہو گا کوئی کسی سے کم بھی نہ ہو گا
ہر مزدوری کرنے والا آج کا ڈپٹی صاحب ہو گا
ٹم ٹم ہو گی موٹر ہوں گے ریڈیو پنکھے گھر گھر ہوں گے
جیل کے پھاٹک کھل جائینگے داغ دلوں کے دھل جائینگے
بچھڑے ہوئے پھر مل جائینگے چک گریباں سل جائیں گے
توپیں ساری گل جائیں گی ہل اور گھن میں ڈھل جائیں گی
ایٹم کی طاقت سے دنیا ہو گی جنت کا اک نقشہ
روز نئی ایجادیں ہوں گی دن کے ایسی راتیں ہوں گی
دق کے کیڑے مر جائینگے خوشبو سے گھر بھر جائینگے
سُرخی چہروں پر دوڑے گی سوئی قسمت جاگ اُٹھے گی
سُندرتا اور پریت بڑھے گی فن کاری کی ریت بڑھے گی
چوری جھوٹ اور چکلے خانے بھوک نہ ہو گی یہ بھی نہ ہونگے
نغمہ ہو گی دل کی دھڑکن ساز بنے گی مل کی کھڑکن

تب دنیا کو ہوش آئے گا
دھرتی کو سنتوش آئے گا
جنتا کو بڑھ لینے تو دو
رن پہ ذرا چڑھ لینے تو دو

سورج نکلا آیا سویرا ختم ہوا اب دین بسیرا

انت = اختتام۔ ہل = فریادی۔ وچ = نیچ۔ بھومی = زمین۔ سنگھاسن = تخت۔ کس مسی = لڑنے کے لئے بے چینی اور اضطراب۔ امرت = آب حیات۔ پرجہ = زیر حکومت۔ گھن = ہتھوڑا۔ سنتوش = سکون

سلیمان اریب

ایک سوال

سچ کے منہ پر کیلیں ٹھوکیں، ڈالیں بھاری تالے
سنگینوں کی نوک سے اب بھی روکے جائیں نالے
جیل میں ٹھونسے جائیں اب بھی بھارت کے رکھوالے
بولیں دیش کے نیتا بولیں یہ کیسی آزادی ؟

باقی رکھی جائیں اب بھی شاہی اور جاگیریں
اور وہاں پھیلی ہوں اب بھی فولادی زنجیریں
جنتا مانگے کھانا کپڑا، دی جائیں تعزیریں !
بولیں دیش کے نیتا بولیں یہ کیسی آزادی ؟

غنڈے، باغی سمجھے جائیں مزدور اور دہقان
بھوکے اَن داتا ہوں لیکن پیٹ بھرے دھنوان
دھرتی کی مالک ہو اب بھی اولادِ شیطان
بولیں دیش کے نیتا بولیں یہ کیسی آزادی ؟

کیوں ہے یہ فرقہ آرائی، کس کا ہے یہ کھیل
ڈائن سرمایہ داری سے ہے یہ کیسا میل؟
کس نے پائی کس نے بھگتی آزادی میں جیل ؟
بولیں دیش کے نیتا بولیں یہ کیسی آزادی ؟

(نظر بندی کے زمانے کی ایک نظم)

شہر یار فتحپوری

ہم جنگ نہ ہونے دینگے

گرد رہ، نقشِ قدم اور بھی دھندلاتی رہی
جادۂ شوق میں اُڑتا رہا درماندہ غبار
تابِ دل اپنی ہی پہنائی میں گم ہوتی رہی
آتشِ عشق پہ پڑتی رہی صدموں کی پھوار
قہقہے ہوتے رہے آہ و فغاں سے چھلنی
سازِ کے تاروں میں نغمات اُلجھتے ہی رہے
زخم کھائے ہوئے آہو کی طرح روحِ حیات
اُفتاں بھٹکتی ہی رہی دہر کے ویرانوں میں
اور خزاں اپنی سلگتی ہوئی چھاؤں کے تلے
لالہ و گل کے شراروں سے لپٹتی ہی رہی
روحِ انساں کے آنچل پہ سیہ خون کی بوند
اپنی پھیلی ہوئی وسعت میں سمٹتی ہی رہی
جادۂ زیست میں بلبوس ـــــ اجل کا پیکر
پہ بہ پہ محفلِ انساں پہ چھاتا ہی رہا
جس نے انساں کی رگ و پے سے لہو چوس لیا
اپنی افسردہ جوانی کی بقا کی خاطر
کیسے پُر ہول فضاؤں کے سیہ سایوں میں
زندگی بم کے دھماکوں سے لرز جاتی تھی
گولیاں موت کی ـــ بندوق سے در آتی ہوئیں

سینۂ زیست میں پیوست ہوئی ہیں برسوں
خونی توپوں کے دہانوں سے اُبلتی ہوئی آگ
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کو جھلس دیتی تھی
ہیروشیما کے زبوں حال مناظر سے کہو!
اپنی کھوئی ہوئی عظمت کا فسانہ دُہرائیں
اپنے ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانہ گائیں
وہ ترانہ جو لرزتی ہوئی آہوں کا نہ ہو!

آج بھی دوست! یہ چیخوں کی پکار ـــ
یہ لرزتی ہوئی آہوں کی فغاں ـــ
وال اسٹریٹ کی سازش کا پتہ دیتی ہیں
بے گناہوں کا لہو خوف سے برفایا ہے
ربِ سرمایہ کے تاریک ہوس خانوں میں
عصمتیں ڈھونڈتی ہیں اپنے تقدس کا سہاگ
کوریا اپنی تباہی کی وہ روداد لئے
امنِ عالم کے لئے چیخ رہا ہے اب تک
سامراج ایٹم و ڈالر کے لبادوں کے تلے
پھر نئی جنگ کا سامان لئے بیٹھا ہے

یہ نئی جنگ کے اُمڈے ہوئے خونی بادل
عرصۂ زیست پہ برسیں یہ کہاں ممکن ہے
اور یہ مجلسِ اقوام کے جنگی دستے
اپنی دھرتی پہ قدم رکھیں کہاں ممکن ہے
نوعِ انساں کی تباہی کے ہیولوں سے کہو!
کارخانوں کے سُلگتے ہوئے سینوں کے شرار
ذوقِ تخریب کے خرمن کو جلا ڈالیں گے
لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے اُٹھیں گے لشکر
اپنے سینے میں لئے شورشِ دوراں کا خروش
جن کے ہاتھوں کی خراشوں کے نوکیلے نشتر
چیر ڈالیں گے تمہارے سینے ـــ
کون اب ڈھالے گا بارود کے خونی گولے؟
کون پھر مینکوں کو فولاد کی چادر دے گا؟
کون بمباروں کو بخشے گا وہ پرواز کا دم؟
کون ہوگا وہ جو میداں میں لڑائی لے گا؟
ہم نے اب جنگ نہ کرنے کی قسم کھائی ہے
کسی صورت بھی نئی جنگ نہ ہونے دینگے
اپنی دھرتی کو یوں خوں رنگ نہ ہونے دینگے!

جمیل ملک

امن کی راہ پر

ساری دُنیا کا امن آج خطرے میں ہے
ساتھیو آؤ اس کی حفاظت کریں
جھوٹ سے توڑ کر اپنے رشتے سبھی
حق و انصاف کی ہم حمایت کریں

یہ جو "جمہوریت" کے "نگہبان" ہیں
ان کی "جمہورت" کیا ہے؟ جنگ اور خوں
دھمکیاں روز ایٹم کی دیتے ہیں یہ
پھر بھی کہتے ہیں لائیں گے امن وسکوں

خود تو کرتے ہیں دن رات عیاشیاں
اور سمجھتے ہیں سب لوگ خوش حال ہیں
کس قدر پوچ ہے ان کی "جمہوریت"
کس قدر بس بھرے ان کے اعمال ہیں

ہم کو ایسی ریاست نہیں چاہیئے
جس میں جمہوریت کا یہ مفہوم ہو
چند لوگوں کے امن وسکوں کے لئے
ایٹم اور جنگ دُنیا کا مقسوم ہو

دوستو! امن اپنا ہے ان سے جُدا
ساتھیو! اپنی جمہوریت اور ہے
راج ہوگا ہمارا ہی اب دہر میں
آج کا دور جمہور کا دور ہے

اپنے امن اور جمہوریت کے لئے
ساری حد بندیاں توڑنا ہیں ہمیں
یہ جو "جمہوریت" کے "نگہبان" ہیں
مل کے ان سب کو جھنجھوڑنا ہے ہمیں

(انجمن ترقی پسند مصنفین راولپنڈی میں پڑھی گئی)

افضل پرویز

○

جنت کے سے شانت نگر میں فیض کی دھارا جاری ہے
دُنیا کی جنتا کو اس کی اِک اک بُوند بھی پیاری ہے

ہم ہیں عوام اور کس میں بَل ہے ہم سے آنکھیں چار کرے
امن کی اِک للکار تمہارے سو ایٹم پر بھاری ہے

وہ کھائے جو بوئے کاٹے وہ پائے جو کام کرے
جو مشعل ہم آپ جلائیں اس کی جوت ہماری ہے

جگمگ جگمگ لال سویرا جاگ اٹھے ہیں محنت کش
کروٹ کروٹ میں جیون، بیماری سی بیداری ہے

محنت کس بَل چڑھتا سورج دولت پونجی ڈھلتی شام
مزدور اس دھرتی کا جوبن دھن والا بیماری ہے

دِین کی گھاتیں، جنگ کا ڈر، دولت کا رُعب، اخلاق کے داؤ!
تم نے تو اپنی سی کر لی۔ آج ہماری باری ہے

شہاب جعفری

○

غمِ دل سے غمِ اغیار تک آ پہنچے ہیں
وحشتی اب عظمتِ کردار تک آ پہنچے ہیں

خواب سے جذبۂ بیدار تک آ پہنچے ہیں
زندگی کے نئے معیار تک آ پہنچے ہیں

حُسن حیراں ہے کہ اب دعوتِ نظارہ پر
اہلِ غم جرأتِ انکار تک آ پہنچے ہیں

حوصلے بڑھ کے خطا وار ہوئے جاتے ہیں
دِل کے رشتے لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں

ٹوک دیتے ہیں تجھے ہر کرمِ بے جا پر
تیری محفل میں گنہگار تک آ پہنچے ہیں

جوشِ وحشت میں فراواں ہے تمنائے چمن
گُل بھی مل جائینگے جب خار تک آ پہنچے ہیں

وہ تو ساحل پہ بھی ڈوبیں گے جو واپس لوٹے
جو جیالے ہیں وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں

جانے کیا ڈھونڈ لیا ہے غمِ دوراں میں شہاب
زندگی کے لیے ہم دار تک آ پہنچے ہیں

احمد ریاض

○

ساحل ساحل طوفاں طوفاں نصرت کی قندیل جلانے
دو دیکھو مغرور سفینہ نکلا موجوں سے ٹکرانے
ماضی کے دلکش بہلاوے عقبیٰ کے دلچسپ دلاسے
سب دولت کے جھوٹے حیلے۔ ثروت کے ہیکا بہانے
کل تک زیست کو دھوکا دے کر تم نے ہر اک بازی جیتی
لیکن آج انسان اٹھا ہے اپنی قسمت آپ بنانے
عظمتِ آدم کے پردے میں قصر سجانے والو! دیکھو
کاٹ رہے ہیں بھوکے کنگلے زندانوں کے دام پرانے
امن کا دعویٰ کرنے والو۔ حفظِ جہاں پر مرنے والو
اپنی رونق مانگ رہے ہیں تم سے شہروں کے ویرانے
پت جھڑ تو پت جھڑ ہے آخر کون کہے پتھر کو موتی
گلچینوں کو میرِ گلستاں کیوں تسلیم کریں دیوانے
گرمیٔ محفل سے گھبرا کر لاکھ بجھاؤ جلتی شمعیں
اپنی ہٹ پر مرنے والے جل ہی جائیں گے پروانے

(انجمن ترقی پسند مصنفین لائل پور میں پڑھی گئی)

ابن انشا

○

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا
جھوٹے سکّوں میں بھی اُٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا کام ہوا بنجاروں کا
اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا
جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگا نگاروں کا
ایک ذرا سی لغزش تھی اور چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا
درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو عشق کا کہنا وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا
انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

مونگ کی دال

کرشن چندر

پوجیہ بونگا بھائی جی۔ وندے ماترم

بونگا ناب صوبے میں کانگرس منسٹری کو چلانا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ صوبہ کی اسمبلی میں ہر ممبر کی ایک اپنی الگ پارٹی تھی۔ اور مجھے ہر وقت یہ خطرہ درپیش تھا۔ کہیں اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت ہماری کیبنٹ کی اقلیت کو دھوکا نہ دیدے۔ ان حالات کے پیش نظر مجھے مندرجہ ذیل کام کرنے پڑے۔ وہ بھی صرف اس آدرش کو سامنے رکھ کر کہ جب تک ہمارے پرانت میں کانگرس منسٹری مضبوط نہیں ہوجاتی ہمارے پرانت میں بونگا راج قائم نہیں ہوسکتا۔ وندے ماترم۔

وزارت قائم کرنے میں سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے سوائے اسمبلی کے تمام ممبروں کو اپنے دشمنوں کی فہرست میں رکھا۔ (ہماری اسمبلی میں ۴۹ ممبر ہیں) پھر اس فہرست میں سے میں نے دس وہ نام چھانٹ لئے جو ہر موقع پر میری مخالفت کیا کرتے تھے۔ ان کو میں نے وزیر بنا لیا۔ یہ لوگ اس سے پہلے میرے بدترین مخالف تھے۔ اب میرے بہترین دوست ہیں۔ اور کانگرس منسٹری کے سب سے وفادار ملازم سمجھے جاتے ہیں۔

۴۹ میں دس گئے! باقی ۳۹ رہے۔ ان میں سے میں نے دس ممبروں کو دس وزیروں کے لئے پارلیمنٹری سکریٹری چن لیا۔ باقی رہے ۲۹ ان میں سے میں نے اپنے لئے چار پارلیمنٹری سکریٹریوں کو منتخب کیا۔ کیونکہ شمال مشرقی جنوب مغربی بونگا ناب صوبے کا وزیر اعظم ہوتے ہوئے میں اس کے چاروں کھونٹوں کا خیال نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے میں نے۔

۱۔ کرنل پرباب سنگھ کو شمالی پارلیمنٹری سکریٹری بنایا۔

۲۔ چودھری چوہارام کو جنوبی سکریٹری کے عہدے پر تعینات کیا۔

۳۔ ملک گھسیٹا مل کو مشرقی سکریٹری چنا۔

۴۔ اور کیپٹن خوش وقت رائے کو مغربی سکریٹری مقرر کیا۔

اس طرح سے تقریباً آدھے ممبروں کو اسمبلی ہی میں سے سرکاری عہدے دیدئے۔ اس کے بعد میرا کام بہت آسان ہوگیا۔ ایک اسمبلی ممبر کو میں نے چیف وہپ بنا دیا۔ دوسرے کو اس کا نائب۔ اور تیسرے کو اس کا نائب۔ بندرا کار ایم۔ ایل۔ اسے مجھے بہت پریشان کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے محکمہ اطلاعات کا سدر بنا دیا۔ سردار کھوکھا سنگھ اور سردار ڈھونڈیا کسی طرح راضی نہ ہوسکے۔ اس لئے انھیں کیبنٹ سے گرفتار کرلیا۔ وہ دونوں آج کل پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں بند ہیں۔ یہ انگریزوں کے وقت کے پرانے قانون اس وقت بہت کام آرہے ہیں۔ دراصل آج معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا نظم ونسق کتنا اچھا تھا۔

اس طرح سے گویا ۳۱ ممبر اسمبلی کے کام پر لگ گئے۔ اب اسمبلی میں میری اکثریت تھی۔ مگر پھر بھی حزب مخالف کے ۱۸ ممبر رہ گئے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں آج کل جمہوریت کے بُرے زمانے میں یہ اٹھارہ ممبر بھی بہت شور مچا سکتے ہیں۔ میں چاہتا تو ان میں سے آٹھ دس کو اور وزیر بنا سکتا تھا۔ مگر سب کے سب وزیر ہوجائیں تو اسمبلی کا کام کیسے چلے گا۔ پھر اخبار بھی شور مچائیں گے۔ اس لئے میں بہت پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے راضی کروں۔ اتنے میں حزب مخالف کے ایک رکن نے کسی معمولی سی بات پر بھوک ہڑتال شروع کردی۔ اور مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ لیکن میں کہاں دینے والا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج کل ہر قسم کی ہڑتالیں خلاف قانون قرار دی جاچکی ہیں۔ تم بھوک ہڑتال بھی نہیں کرسکتے۔ پھر اس قسم کا دباؤ ڈالنا عدم تشدد اور سچائی کے خلاف ہے۔ پھر اب بھوک ہڑتال کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کانگرس نے بونگا راج قائم کرکے بونگا استھان کے اتہاس میں ایک

ایسی مثال قائم کر دی ہے جو رہتی دنیا تک جگمگاتی رہے گی وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں میں نے اس سے کہیں۔ مگر وہ کمبخت نہیں مانا۔ اپنی بھوک ہڑتال پر ڈٹا رہا۔ آخر ایک دن میں نے اُسے علیحدہ لیجا کے کہا۔ کہ تمھیں دراصل بھوک ہڑتال کرنے کی ضرورت نہیں ہے ضرورت تمھیں اس امر کی ہے کہ تمھارے پاس ایک شاندار پرسٹ ہو جس کے ذریعے تم ولایت سے بیوک گڑیاں یہاں منگوا سکو۔ میری یہ تجویز سن کر اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ اور اس نے اسی وقت بیئر کا ایک گلاس منگا کے اپنی بھوک ہڑتال ترک کر دی۔

اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پرسٹ میں کتنی طاقت ہے۔ قوت ہے اپنی بات منوانے کی۔ اس دن سے میں اپنی دائیں جیب میں پرسٹ اور بائیں جیب میں باقی سارے ممبروں کو رکھتا ہوں (سوائے ان دو بدمعاش کیمونسٹوں کے جو جیل میں ہیں) اور اب وزارت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے چلتا ہے۔ یہی بات تو یہ ہے کہ اب ہماری اسمبلی میں کوئی حزب مخالف ہی نہیں ہے۔ اور بونگا راج میں حزب مخالف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ اگلے الیکشن کے وقت میرے آدمیوں کو بونگا ٹکٹ دیں گے تو وہ لوگ ہمیشہ آپ کے وفادار رہیں گے۔ آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ چند بددیانت بانگرس والوں نے مجھے بدچلن کہہ کر آپ کے کان بھرے ہیں۔ میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ میں قطعی بدچلن نہیں ہوں۔ گذشتہ بارہ سال سے میں اپنی بیوی سے بھی اپنی ماں اور بہن کا سا سلوک کر رہا ہوں۔ اور یہ بانگرس کی بھی ہدایات کے مطابق ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نے جنسی طور پر مکمل نروان حاصل کر لیا ہے۔ آج کل میں صرف سونگ کی دال کھاتا ہوں اور نیر پیتا ہوں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں بدچلن ہوں انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری اسمبلی میں ایک خاتون بھی ممبر نہیں ہے۔ پھر مجھ پر بدچلنی کا الزام کیسے عائد کیا جا سکتا ہے؟

پیارے بونگا بھائی۔ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ ان دشمنوں کی باتوں میں نہ آئیں۔ یہ لوگ خواہ مخواہ میرے اور آپ کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اور اب میں اپنے خط کو ایک خوشخبری پر ختم کرتا ہوں۔ آپ یہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ میں وکالت کے امتحان میں پانچ بار فیل ہو چکا ہوں۔ لیکن اب بونگا ناب یونیورسٹی (امسال کی کانووکیشن کے موقع پر مجھے ایل ایل ڈی یعنی وکالت کی سب سے اونچی ڈگری بطور اعزاز پیش کر رہے ہیں۔ ہاہاہا۔ میرا بھی قہقہے لگانے کو جی چاہتا ہے۔ زمانہ کا تغیر دیکھئے اس یونیورسٹی نے مجھے اپنے زمانہ طالب علمی میں پانچ دفعہ وکالت کے امتحان میں فیل کر دیا تھا۔ اور اب ..... ہاہاہا!

آپ کا
بہت بہت وفادار
بونگا چند

(وزیر اعظم شمال مشرقی، جنوب مغربی صوبہ بونگا ناب در مملکتِ جمہوریہ اعلیٰ بونگا استھان)

پیارے بونگا چند۔ دندے ماترم

تمھارا خط پڑھ کے مجھے بڑی خوشی محسوس ہوئی۔ جن کوششوں سے تم نے اپنے صوبے میں بانگرس منسٹری قائم کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور مہاراج کی وفات کے بعد بھی ان کی روح معجزے دکھا رہی ہے۔ مجھے تم پر پورا پورا بھروسہ ہے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگلے الیکشن میں تمھاری ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اور تمھیں پھر سے شمال مشرقی جنوب مغربی (اگر کوئی اور سمت باقی رہ گئی ہو۔ تو لکھ دینا) بونگا ناب صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔

لیکن ایک بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی۔ تم نے فنسٹری بناتے وقت بگلے کو کیوں نظر انداز کیا۔ بگلے میں جانتا ہوں ایک نہایت ہی ذلیل اور فرقہ پرست انسان ہے۔ مگر موجودہ حالات میں وہ ہمارے لئے بڑا کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ تمھارے صوبے میں اس کا بہت زور ہے۔ میرا

خیال ہے تم بنگلے کو وزارت میں لے لو۔ اور اس کے حواریوں کو یعنی بنگلہ بھگتوں کو دو چار پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدے بانٹ دو۔ پھر ہمیں کوئی اس صوبے میں سے نہیں ہلا سکے گا۔ اس بات کو کبھی نہ بھولو۔ کہ کبھی نہ کبھی ہماری ہزار کوشش کے باوجود ملک میں عام الیکشن ہوگا اس وقت ہمیں بنگلہ بھگتوں کی بڑی ضرورت پڑے گی۔

میں تمہارے اس کام سے بھی مطمئن نہیں ہوں جو تم نے اب تک ریفیوجی لوگوں کے لئے کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے صوبہ میں غذا کا مسئلہ ہے اور کھانے پینے کی گرانی ہے اس کے متعلق فوراً اپنی رپورٹ بھیجو۔ اور سونگ کی دال کھانا فوراً بند کر دو۔ سونگ کی دال کھانا اور تیسرے درجے میں سفر کرنا ان دنوں بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ جب شری حضرت مہاراج زندہ تھے۔ ان کے مرنے کے بعد اب کوئی ایسی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ اور پھر تم جس عہدے پر فائز ہو اس کی گدی پر بیٹھ کر سونگ کی دال کھانا سرکاری وقار اور دبدبے کے خلاف ہے۔ اس عادت کو فوراً ترک کر دو۔

تمہارا

بونگا بھائی۔

پوجیہ بونگا بھائی۔ وندے ماترم

آپ کا خفیہ خط مجھے ملا۔ میں نے تحقیقات کر کے مندرجہ ذیل باتوں کا فیصلہ کر لیا ہے

(۱) میں بنگلے کو وزیر چن لیتا ہوں۔ لیکن اس کے پاس کوئی محکمہ نہ ہوگا۔ کیبنٹ میں اس کا کوئی مقام نہ ہوگا۔ اور اسمبلی میں اس کی کوئی سیٹ نہ ہوگی کیونکہ وہ اسمبلی کا ممبر نہیں ہے۔ بنگلے نے اپنی طرف سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ فرقہ پرستی کو بالکل ترک کر دے گا۔ اور آئندہ سے مسلمانوں کو ہریجنوں کے برابر سمجھے گا۔ اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ بنگلے نے کہاں تک اپنی فرقہ پرستی کو ترک کر دیا ہے۔

(۲) لیکن بنگلہ بھگتوں کو پارلیمنٹری سکریٹری چننا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میں انہیں تو پارلیمنٹری سکریٹری بھی بنا سکتا ہوں۔ یا نائب وزیر بنا کے انہیں نائب سکریٹریوں کے ساتھ نگا کے عدالت تحقیقہ لمائے کی سماعت کے لئے بھی تعینات کر سکتا ہوں۔ مگر سوال تقرر کا نہیں ہے۔ سوال در اصل یہ ہے کہ بنگلا بھگت اسمبلی کے ممبر بھی نہیں ہیں۔ اس لئے زیادہ وزیر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زیادہ ممبر اسمبلی کے بنائے جائیں۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ صوبے میں زیادہ نشستیں امیدواروں کے لئے منظور کی جائیں۔ یہ کام اس طرح سے بھی ہو سکتا ہے کہ نئی نشستوں کی بجائے پرانی نشستوں ہی کو تقسیم کر کے زیادہ ٹکڑے بنا دیئے جائیں۔ لیکن محکمہ تقسیم تو مرکزی شعبہ ہے اور آپ لوگ اس کام کے ماہر بھی ہیں۔ ایک پورا برٹش تقسیم کر کے آپ نے قیمتی تجربہ بھی حاصل کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ نشستوں کی تقسیم میں آپ میری مدد اور رہنمائی کریں۔

(۳) ہمارے صوبے میں اب کوئی ریفیوجی مسئلہ نہیں رہا۔ میں نے اپنے ریفیوجی وزیر سے اس کی تحقیقات کر لی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اب ہمارے صوبے میں کوئی ریفیوجی مسئلہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے ریفیوجیوں کا مسئلہ بہت شدید صورت اختیار کر چکا تھا۔ پھر میں نے موجودہ وزیر کو جو خود ریفیوجی ہے۔ ریفیوجی وزیر بنا دیا۔ اور اب یہ مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ نہ صرف یہاں کوئی ریفیوجی مسئلہ ہے۔ بلکہ یہاں اب کوئی ریفیوجی ہی نہیں ہے۔ جو ریفیوجی تھے وہ سب کے سب یا تو کیمپوں میں اور یا جیلوں میں آباد کر دیئے گئے ہیں۔ اور جو چند گنے چنے عزت دار ریفیوجی باقی رہ گئے تھے۔ انہیں زمین۔ مکیہ پرسٹ دے کر آباد کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد اب میں کسی ریفیوجی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ہاں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو دوسری بات ہے۔

(۴) جہاں تک اشیاء کی گرانی کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا جائے۔ میری استدعا مرکز سے بھی یہی ہے کہ وہ اشیاء کی گرانی کی طرف مطلق دھیان نہ دے۔ ایسا سمجھئے گویا کہیں گرانی کا وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے بہت سی مشکلیں آپ ہی آپ حل ہو جائیں گی۔ کیونکہ جب آپ گرانی کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے تو پھر بلیک مارکیٹ کی پریشانی بھی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کل کے زمانے میں بلیک مارکیٹ کو قانونی طور پر جائز قرار دینا چاہیئے۔ کالے بازار کو قانونی طور پر جائز اور سفید بازار کو ناجائز قرار دینا چاہیئے۔ اور جو آدمی یا دوکاندار چیزیں سستی فروخت کرے

اسے کوڑوں سے پیٹنا چاہیئے۔ یا اُسے پاگل خانے میں دھکیل دینا چاہیئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو تھوڑے ہی دنوں میں آپ دیکھیں گے کہ ملک میں اشیاء کی گرانی کی کوئی شکایت باقی نہ رہے گی۔ عوام خود ہی سوکھ کر آلو کی طرح خشک ہو جائیں گے۔ اور اس کا جو لازمی نتیجہ ہوگا اس سے مکانوں کی قلت بھی دور ہو جائے گی۔ زیادہ کھلی ہوا اور کھلی جگہ سب کے لئے دستیاب ہوگی۔ اور سچے بونگا راج کی طرف ہمارا ایک قدم اور آگے بڑھ جائے گا۔

(۵) آخر میں تیسرے درجے کا سوال آتا ہے۔ مجھے اس سے بہت روحانی تکلیف ہوگی۔ لیکن آپ کے کہنے پر میں آج سے تیسرے درجے میں سفر کرنا بند کرتا ہوں۔ اور قسم کھاتا ہوں کہ آج سے کبھی ہوائی جہاز یا فرسٹ کلاس ایرکنڈیشنڈ سے کم میں سفر نہیں کروں گا۔ اس وقت میری آنکھیں پُرنم ہوئی جاتی تھیں کیونکہ میری نگاہوں کے سامنے حضور مہاراج مرحوم کی صورت گھوم رہی ہے۔ جنھوں نے ہمیں بونگا راج دلایا۔ لیکن جن کے میموریل فنڈ کی رقم ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔

لیکن بونگا بھائی! میں مونگ کی دال کھانا کیسے بند کر سکتا ہوں؟ میں بانگرس ہائی کمانڈ کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ اور وفاداری میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں کیا کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں۔ اس پر حکم دینے کا بانگرس ہائی کمانڈ کو کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ چاہے میں مونگ کی دال کھاؤں چاہے سؤر کی۔ یہ تو شخصی آزادی پر ایک ایسی کڑی پابندی ہے جسے میں کسی حالت میں منظور نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں برابر مونگ کی دال کھاتا رہوں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔

آپ کا

بہت بہت وفادار

بونگا چند

ارجنٹ ٹیلی گرام ——— بونگا بھائی سے بونگا چند کو۔

"مونگ کی دال کھانا فوراً بند کر دو۔ ورنہ ابھی استعفیٰ داخل کر دو" بونگا بھائی

ارجنٹ ٹیلی گرام ——— بونگا چند سے بونگا بھائی کو۔

"پراتما کے لئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کیجئے۔ مونگ کی دال بالکل بے ضرر شے ہے۔ ٹاپ۔ مونگ کی دال کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے ٹاپ مونگ کی دال حضور مہاراج بھی بہت پسند فرماتے تھے۔ ٹاپ۔ دیکھئے حضور مہاراج مرحوم کی کتاب "میں اور مونگ کی دال" صفحہ ۲۵۰"

بونگا چند

جوابی تار

بونگا بھائی سے بونگا چند کو۔

"بانگرس ہائی کمانڈ کا متفقہ فیصلہ ہے تم مونگ کی دال کھانا بند کر دو۔ ورنہ مستعفی ہو جاؤ"

بونگا بھائی

جوابی تار

بونگا چند سے بونگا بھائی کو۔

"مونگ کی دال بند کر دی ہے۔ ٹاپ۔ پیش ہو گئی ہے۔ ٹاپ۔ آشیرواد بھیجئے۔"

بونگا چند

بونگا استھان ٹائمز

ٹاپ پریس

بونگا پور۔ اطلاع ملی ہے کہ شری یت بونگا بھائی اور شری یت بونگا چند کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب دُور ہو چکی ہے۔ اس لئے شمال مشرقی جنب صوبہ مہاراشٹر صوبہ بونگا ناب کی وزارت میں فی الحال کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

انناس اور ایٹم بم

کردار

۱۔ راج .. .. ایک تعلیم یافتہ نوجوان ترقی پسند شاعر
۲۔ رجنی .. .. خوبصورت نوجوان لڑکی جس سے راج محبت کرتا ہے
۳۔ سیٹھ کشمی چند .. .. رجنی کا باپ۔ کھرب پتی سرمایہ دار
۴۔ سیٹھ کشمی چند کا نوکر منگو

ایک ریڈیو
ایک انناس
ایک ایٹم بم

خواجہ احمد عباس

سیٹھ لکشمی چند کا ڈرائنگ روم فرنیچر۔ آرائش کا سامان وغیرہ قیمتی ہے مگر بھدا۔ ہر چیز بدمذاقی کا نمونہ۔ دیوار پر لٹکی ہوئی تصویروں میں ہنومان جی بھی ہیں۔ دیوی لکشمی بھی گاندھی جی بھی اور کوئی پرتاپ اسٹرائے بھی۔ تجوری پر قومی جھنڈا پڑا ہوا ہے اور اس پر ایک گاندھی ٹوپی ایسے رکھی ہے جیسے تخت پر تاج رکھا ہو۔ ایک کونے میں ریڈیو رکھا ہوا ہے اس کمرے کے تین دروازے ہیں۔ ایک کھانے کے کمرے میں کھلتا ہے۔ دوسرا رسوئی میں۔ تیسرا صدر دروازہ باہر کے برآمدے میں۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو کمرہ خالی ہے۔ مگر ریڈیو بج رہا ہے۔ کوئی گانا ختم ہو رہا ہے .....

ریڈیو اناؤنسر: ابھی ابھی آپ ستی بائی سے دھرپت سن رہے تھے اب آپ پہلا نیا پرچہ دیش، اس جی سے "ناچ اگاؤ" انداز میں بھاشن نہیں لگے۔

(کھانے کے کمرے سے سیٹھ لکشمی چند کی آواز سنائی دیتی ہے)

لکشمی چند: (آواز) منگو! ارے منگو۔ کہاں مر گیا۔ کھانے کو کچھ لائے گا یا نہیں .....

(منگو کی آواز رسوئی کی طرف سے آتی ہے)

منگو: (آواز) آیا، سیٹھ جی۔ ابھی گرم گرم پوریاں تل کر لا رہا ہوں۔

(ریڈیو پر لیڈر کی آواز سنائی دیتی ہے)

لیڈر: (ریڈیو پر آواز) بھائیو اور بہنو ..... آج دیش کی جو دشا ہو رہی ہے۔ وہ آپ سے چھپی نہیں ہے۔ کتنے پراتوں میں کال پڑ رہا ہے۔ لاکھوں بھوکے مر رہے ہیں۔ کروڑوں کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ سرکار راشن کم کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔ اسلئے ہمارا فرض کیا ہے؟ جیسا کہ انگریزی بھاشا کے ایک مہاودھوان نے کہا ہے TIGHTEN YOUR BELTS ..... اپنی اپنی پتلونوں کو ... میرا مطلب ہے، اپنی اپنی دھوتیوں کو کس لیجئے۔ کھانا کم کھائیے، ہفتہ میں دن برت رکھیئے۔ کچی ترکاریاں کھائیے۔ شکر قند کھائیے TAPIOCA کی کھیر پکا کر کھائیے۔ اور کچھ نہیں تو مٹھیاں بھر کر ان کو بھون کر کھائیے مگر جہاں تک ہو اناج بچائیے۔ چپاتیاں نہ کھائیے اور پوریاں؟ پوریوں کو ہاتھ مت لگائیے ..... کبھی کبھار ایک آدھ پوری مل گئی تو کھالی بس .....

اتنی دیر میں منگو ایک تھالی میں بیس پچیس نئی تلی پوریوں کا پہاڑ لے کر کھانے کے کمرے میں جاتا ہے۔ صدر دروازہ سے رجنی داخل ہوتی ہے۔ ریڈیو کا بھاشن سن کر ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ پھر ریڈیو کی سوئی گھما کر کوئی INSTRUMENTAL MUSIC کا پروگرام لگا دیتی ہے ..... اور بڑے رومانی انداز میں کرسی پر بیٹھ جاتی ہے ... منگو کھانے کے کمرے سے خالی تھالی لے کر داخل ہوتا ہے اور رسوئی کی طرف جاتا ہے .... سنگیت سنتے سنتے رجنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ صدر دروازے کی طرف سے دبے پاؤں ادھر ادھر دیکھتا ہوا راج داخل ہوتا ہے۔ زور سے سیٹی بجاتا ہے۔ رجنی چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ راج کو دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا ہے۔ اداکارتی ہوئی راج کے پاس جاتی ہے۔ راج بازو پھیلا کر اس کا سواگت کرتا ہے۔

راج : رجنی!

رجنی : راج! تم آ گئے!

(ایک دوسرے کے گلے لگنے والے ہیں کہ کھانے کے کمرے سے سیٹھ لکشمی چند کی گرجدار آواز سنائی دیتی ہے۔

اور وہ دونوں گھبرا کر الگ ہو جاتے ہیں۔

لکشمی چند: منگو۔ ارے او منگو۔ اور پوریاں کہاں ہیں؟

منگو: کڑھائی میں ہیں سیٹھ جی .....

راج: کڑھائی میں ہیں؟ سیٹھ جی یا پوریاں؟

رجنی: پوریاں رسوئی میں تلی جا رہی ہیں۔ پتا جی کھانے کے کمرے میں بھجن کر رہے ہیں۔

راج: تو کوئی چنتا نہیں ہے

(پھر رجنی کی طرف بڑھتا ہے)

راج: (رومانی انداز میں) رجنی!

رجنی: ہاں، راج!

راج: آج میں تمہارے پتا جی سے صاف صاف بات کرنے آیا ہوں اب تمہارے بنا ایک دن گزارنا مشکل ہو گیا ہے۔

رجنی: (شرما کر) راج میرا بھی یہی حال ہے جس دن تم سے ملاقات نہیں ہوتی سارا دن پھیکا اور بے مزہ لگتا ہے۔

راج: (مذاق سے) اُونہوں تم جھوٹ بول رہی ہو؟

رجنی: (SERIOUS رومانی انداز میں) نہیں، راج میں سچ کہہ رہی ہوں تم میرے روم روم میں سما گئے ہو۔

راج: یہ تو خطرناک ہوا..... چھالا ڈوتی رامنہ سونگھ کر دلیوں کہتے ہیں جھوٹ بولنے والے کے منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔

رجنی: (منہ کھول کر) تو لو سونگھو .....

راج اسی بہانے سے رجنی کو چومنا چاہتا ہے مگر اُسی وقت رسوئی کی طرف سے منگو پوریاں لئے ہوئے آجاتا ہے اور دونوں کو اس طرح دیکھ کر کھنکھارنے لگتا ہے۔ راج اور رجنی پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ منگو جھوٹ موٹ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کھانے کے کمرے میں چلا جاتا ہے

رجنی: تم بہت شریر ہو۔

راج: میں تو بہت شریف ہوں رجنی۔ مگر کیا کروں تم بہت خوبصورت ہو

رجنی: ہٹو۔ خوشامدی کہیں کے۔

راج: اچھا یہ بتاؤ میرے بارے میں تمہارے پتا جی کا کیا موڈ ہے...

رجنی: کچھ اچھا نہیں ہے۔ تمہاری ایٹم بم والی کرتوتا کو پڑھ کر بہت بگڑ رہے تھے۔

راج: وہ سب میں سمجھ لوں گا۔ مگر مجھے تو تمہارے پتا جی سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔ ہم دونوں کے بارے میں۔ سمجھیں نا؟ اور یہاں اتنے بہت مہمان بیٹھے ہیں .....

رجنی: مہمان؟ ——— مہمان کہاں ہیں؟ پتا جی تو اکیلے کھانا کھا رہے ہیں۔

راج: اکیلے؟ ——— تو پھر یہ اتنی بہت پوریاں .... تمہارے ——— پتا ——— اکیلے۔ کھا ——— جائیں گے؟

رجنی: ہاں۔ اور کیا؟ اور یہ پوریاں ہی تھوڑی ..... پھر دہی بڑے۔ دال بھات۔ مٹھائی۔ پھل۔

منگو کھانے کے کمرے سے واپس آرہا ہے اور رسوئی میں جانا چاہتا ہے کہ سیٹھ جی کی آواز آتی ہے ——منگو رک جاؤ اور ڈرائنگ روم میں سے جواب دیتا ہے۔

لکشمی چند: (آواز) ارے او منگو —— دس بارہ پوریاں اور لے آ....

راج: (حیرانی سے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے) دس بارہ اور پوریاں؟

لکشمی چند: (آواز) اور ہاں ..... بھاگ کر بازار سے ایک انناس بھی لے آ..... ہاضمہ کے لئے اچھا ہوتا ہے ....

منگو: (تنگ آکر ——— رجنی سے) تم ہی بتا دو چھوٹی بی بی رسوئی میں پوریاں تلوں کہ کھانا پکاؤں کہ بازار سے جا کر انناس خرید کر لاؤں ——— گھر بھر میں اکیلا نوکر ہوں اس وقت۔

رجنی: کیوں اور سب کیا ہوئے؟ ———

منگو: (کونا بھوسی کرتے ہوئے) چھوٹی بی بی۔ سیٹھ جی سے مت کہنا سب کے سب وہ راج کپور ہے نا ایکٹر۔ اس کی فلم برسات دیکھنے گئے ہیں میٹنی شو میں۔

راج: راج کپور۔ آج تک یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس لونڈے میں ایسے کیا سُرخاب کے پر لگے ہیں کہ دُنیا اُسے دیکھنے کے لئے دس آنے یا ایک روپیہ چار آنے یا ڈھائی روپے کا خون کرنے کو تیار ہے .....

لکشمی چند: (آواز) منگو۔ انناس لے آیا ہو تو تھوڑی پوریاں اور تل لے؟

منگو: اب بتاؤ چھوٹی بی بی —— کروں تو کیا کروں ——

رجنی: منگو تو جا کر پوریاں تل ..... میں انناس منگواتا ہوں۔

منگو رسوئی کی طرف جاتا ہے

رجنی : راجو۔ مجھے بڑی ہی بڑھیا ترکیب سوجھی ہے۔

راج : وہ کیا؟

رجنی : وہ یہ کہ تم بھاگ کر نکڑ والی دکان سے ایک اچھا سا اناناس خرید لاؤ۔ پتاجی کو اناناس بہت بھاتا ہے۔ تم کہنا تم اُن کے لئے بھینٹ لائے ہو۔ وہ اناناس پاکر اتنے خوش ہوں گے کہ ——— کہ ——— (شرماتی ہے)

راج : کہ ہماری شادی کی اجازت دے دیں گے۔ سچ؟

(رجنی شرما کر سر ہلا کر "ہاں" کرتی ہے)

راج : تو یہ کیا مشکل کام ہے۔ میں ابھی ایک اتنا بڑا اور رس بھرا اناناس لاتا ہوں کہ سیٹھ جی بھی یاد کریں گے۔

راج دروازہ کی طرف سے باہر جاتا ہے رجنی ریڈیو کے پاس جاکر بیٹھ جاتی ہے۔ منگو پوریاں لے کر کھانے کے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر واپس چلا جاتا ہے۔ راستے میں ایک نظر رجنی پر ڈالتا ہے جو ریڈیو کے مدھر سنگیت میں اور اپنے رومان بھرے خیالات میں کھوئی ہوئی ہے۔ ایک دم سنگیت کا پروگرام رُک کر ریڈیو سٹیشن سے ایک اعلان ہوتا ہے

اناؤنسر: (آواز) تیسرے مہایُدھ کی بھیانک پرچھائیں ساری دنیا پر پڑ رہی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں پہلا ایٹم بم پھٹ پڑے اور ایٹمی لڑائی شروع ہو جائے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایک بار دنیا کے دیشوں نے ایک دوسرے پر ایٹم بم برسانے شروع کر دیئے تو پھر ہزاروں برس کی پروان چڑھائی ہوئی تہذیب و ترقی و تمدن منٹوں میں مٹی میں مل جائیں گے .... یہی نہیں ——— سارا سنسار بھسم ہو جائیگا۔ زندگی ختم ہو جائے گی .....

رجنی اس خبر سے پریشان ہو کر ریڈیو بند کر دیتی ہے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اُسی وقت لکشمی چند اندر کے دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ دکان لیتا ہوا۔ توند پر ہاتھ پھیرتا ہوا۔

رجنی : (باپ کو دیکھ کر) پتاجی غضب ہو گیا۔

لکشمی چند: کیوں کیا ہوا؟ ——— جلدی کہو ....

رجنی : کہتے ہیں شہروں پر ایٹم بم گرنے والے ہیں۔

لکشمی چند: تو نے تو مجھے گھبرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھا سونے چاندی کے بھاؤ گرنے والے ہیں۔

آرام سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے

رجنی : پر پتاجی۔ لڑائی شروع ہو گئی تو سارے سنسار کا ستیاناس ہو جائے گا۔

لکشمی چند: ارے مورکھ تجھے سارے سنسار کی کیا پڑی۔ ایٹم بم ہمارے گھر پر تھوڑا ہی گرنے والے ہیں۔ لڑائی چھڑ گئی تو تیرے باپ کا تو بھلا ہونے والا ہے۔ فوجی ٹھیکے ملیں گے۔ بازار میں ہر چیز کے بھاؤ بڑھیں گے۔ ہم ایک ایک کے دس دس بنائیں گے۔ بھگوان میں تو پیار تھنا کر رہا ہوں کہ کل کی ہوتی آج لڑائی شروع ہو جائے

رجنی منگو سے کہا اناناس کاٹ کر لے آئے۔ برف میں لگا کے ...

رجنی : منگو تو رسوئی میں ہے، پتاجی۔ کھانا بنا رہا ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ اناناس ابھی آیا جاتا ہے۔

لکشمی چند: منگو ابھی تک یہاں ہی ہے تو اناناس لانے کون گیا ہے۔

رجنی : (شرما کر) راج۔ آیا تھا۔ آپ سے کچھ بات کرنے۔ اس نے سُنا آپ کو اناناس بہت پسند ہے۔ اس لئے دوڑا ہوا بازار گیا ہے۔ آپ کے لئے اناناس لینے۔

لکشمی چند: کون؟ راج؟ وہ کنگال شاعر۔ جیب خالی پر زبان جتنی چاہے چلوا لو کویتا لکھتا ہے وہ بھی ایٹم بم پر۔ وہ کیا اناناس لائے گا۔

رجنی : نہیں، پتاجی۔ مجھے یقین ہے وہ بہت ہی اچھا اور میٹھا اناناس لائے گا۔

لکشمی چند: ارے یہ کالج کے باغی چھوکرے۔ یہ پھل پھول کی پہچان کیا جانیں .... ان کے دماغ پہ تو ایٹم بم سوار ہے ..... کہیں اناناس کے بدلے ایٹم بم نہ اٹھا لائے .....

رجنی : (مسکرا کر) اچھا جب وہ آئے گا تب دیکھ لیجئے گا۔ اناناس لایا ہے یا ایٹم بم ..... اگر اچھا اور میٹھا اناناس لایا تب تو آپ اسے ..... (دیکھتی ہے کہ باپ پیر لمبے کر کے اونگھ گیا ہے) پتاجی! کوئی جواب نہیں۔ اب لکشمی چند خراٹے لینے لگتا ہے

رجنی : ابھی تو بات کر رہے تھے! ایک پل میں سو گئے؟

پھر وہ دبے پاؤں ریڈیو کے پاس جاتی ہے اور اس کا بٹن دبا دیتی ہے۔ کوئی سنگیت کا پروگرام دھیمی آواز میں شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چپکے سے کمرے کے باہر چلی جاتی ہے۔ کھانے کے کمرے والے دروازے سے۔

اس کے جانے کے بعد منگو آتا ہے۔

منگو: سیٹھ جی۔ اناناس تو.....

دیکھتا ہے لکشمی چند سو رہا ہے۔ اس لئے بات پوری کیے بنا اُلٹے پیروں واپس چلا جاتا ہے۔

اب سٹیج کی روشنیاں دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی جاتی ہیں..... اور ہم خواب کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں..... ریڈیو پر ستار نگیت چلتا رہتا ہے..... چند سیکنڈ کے بعد دروازے پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے۔ لکشمی چند چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔

لکشمی چند: کون ہے؟ آجاؤ اندر۔

راج داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں۔ وہاں سے ڈھکی ہوئی کوئی "چیز" ہے جو اناناس بھی ہو سکتی ہے اور ایٹم بم بھی.....

لکشمی چند: کون ہے ——— راج ——— تم؟

راج: جی ——— میں.....

لکشمی چند: کہو لائے اناناس؟

راج: ("چیز" کو میز پر رکھتے ہوئے۔ بڑی احتیاط سے "چیز" ابھی تک ڈھکی ہوئی ہے) جی ہاں۔ اناناس لایا تو ہوں آپ کے لئے مگر یہ ایک بڑے انوکھے ڈھنگ کا اناناس ہے..... شاید آپ کو پسند نہ آئے؟

لکشمی چند: کپڑا ہٹاؤ۔ دیکھیں تو.....

راج ڈرامائی انداز میں دھیرے دھیرے کپڑا اٹھاتا ہے میز پر اناناس نہیں ایک ایٹم بم رکھا نظر آتا ہے۔

لکشمی چند: (حیرت سے) یہ کیا ——— بم!

راج: (بڑے اطمینان سے) معمولی بم نہیں ——— ایٹم بم!

لکشمی چند: نہیں نہیں تم مذاق کر رہے ہو؟.....

راج: مذاق تو تب ہو گا سیٹھ جی جب بم پھٹے گا..... یہ آپ کا گھر ہی نہیں سارا شہر تباہ و برباد ہو جائے گا..... شہر کے چاروں طرف دس دس میل تک برسوں کبھی کھیتی نہ ہو سکے گی..... شہر کی آبادی میں سے اوّل تو کوئی زندہ بچے گا نہیں اور اگر بچ بھی گیا تو اس کے سر کے بال جھڑ جائیں گے، داڑھی مونچھ پلکیں بھویں سب صفاچٹ۔ آپ سوچئے کتنے فائدے کی بات ہے۔ نائیوں۔ باربروں کی جھنجھٹ ہی نہ رہے گی۔ اور پھر بلیڈوں کی قیمت بھی تو آپ کی مہربانی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر طرح بچت ہی بچت ہو گی اور سُنیے جو لوگ بچیں گے ان کی اولاد کتنی ہی نسلوں تک جو پیدا ہو گی وہ یا اندھی ہو گی یا لنگڑی..... کسی کے سر سے کان نہیں تو کسی کی ناک نہیں..... کیوں سیٹھ جی۔ کتنا مزہ آئیگا؟

..... ہا — ہا — ہا — ہا ———

(بم اٹھا کر لکشمی چند کی طرف بڑھاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہوا پیچھے ہٹتا ہے)

لکشمی چند: یہ ہے کیا بلا؟ اسے دُور رکھو.....

راج: میں نے کہا نہیں یہ ایٹم بم ہے۔ آپ کا پیارا ایٹم بم.....

(ایک دم مذاق چھوڑ کر سنجیدہ ہو جاتا ہے) یہ شیطان کا ہتھیار ہے اگر دنیا نے ایک بار اس ہتھیار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تو دنیا نے ہمیشہ کے لئے پاپ کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔

لکشمی چند: تم کمیونسٹوں جیسی باتیں کہہ رہے ہو۔ میں ابھی پولیس کو بلا کر تمہیں گرفتار کرا تا ہوں۔

راج: ضرور بلایئے۔ مگر آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ میں صرف پردھان منتری پنڈت جواہر لال کی زبان سے نکلے ہوئے شبد دُہرا رہا تھا۔

لکشمی چند: (کھسیانا ہو کر) تم چاہتے کیا ہو؟

راج: میں آپ سے راج نیتی کی باتیں کرنے نہیں آیا، سیٹھ جی۔ میں خود ان باتوں کو نہیں سمجھتا۔ میں تو سیدھا سادا آدمی ہوں۔ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اور رجنی۔ یعنی رجنی اور میں مطلب یہ کہ ہم دونوں ——— ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں۔ اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔

لکشمی چند: رہو جھونپڑوں میں خواب دیکھو محلوں کے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری بیٹی کا بیاہ کسی لکھ پتی کروڑ پتی سے ہو گا۔

راج: یوں کہیئے کہ اناج، کپڑا، تیل، شکر تو آپ بلیک مارکیٹ میں بیچتے ہی تھے اب اپنی بیٹی کا بلیک مارکیٹ کرنے کا بھی ارادہ ہے..... مگر یاد رکھئے کہ رجنی کا بیاہ مجھ سے ہو گا۔

لکشمی چند: یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اپنی بیٹی کی قسمت ایک کنگال کوی کے ساتھ پھوڑ دوں ——— اس سے تو اچھا ہے میری بیٹی مر جائے...

راج: تو فکر نہ کیجئے۔ اس کا انتظام ابھی ہوا جاتا ہے۔

لکشمی چند: کیا مطلب؟

راج: (گھڑی دیکھتے ہوئے) مطلب یہ کہ دس منٹ میں یہ ایٹم بم پھٹ جائے گا۔ اسی پل نہ آپ ہوں گے، نہ آپ کی بیٹی ہوگی، نہ یہ مکان ہوگا، نہ یہ شہر ہوگا۔ نہ آپ کی دُکان ہوگی۔ نہ آپ کے مِل ہونگے نہ آپ کا بینک ہوگا، نہ شیئر بازار ہوگا۔۔۔۔ اور نہ میں ہوں گا، نہ میری کویتا ہوگی، نہ آرٹ ہوگا نہ ادب۔ سب جھگڑے مٹ جائیں گے۔ سب پریشانیاں ایک دم دُور ہو جائیں گی۔ سب قرضے ادا ہو جائیں گے ..... سودا مُنہا نہیں ہے سیٹھ جی۔ سوچ لیجئے۔

لکشمی چند: تم پاگل ہو گئے ہو ..... اپنے ساتھ دوسروں کا بھی خون کرنا چاہتے ہو۔

راج: میں پاگل نہیں ہوا سیٹھ جی، آپ کی سماج پاگل ہو گئی ہے جو روز سینکڑوں نوجوانوں کی آرزوؤں کا خون کرتی ہے۔ آپ کی دُنیا پاگل ہو گئی ہے۔ جہاں انسان روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں لوگ دودھ ڈبل روٹی کھاتے ہیں! ـــــ جہاں کوڑی اور کلاکار بھوکے مرتے ہیں اور دلال ہزاروں لاکھوں کماتے ہیں ـــــ جس دنیا میں بچوں کو دودھ دینے کو پیسہ نہ ہو، نوجوانوں کو تعلیم دینے کے لئے پیسہ نہ ہو سکول اور ہسپتال کھولنے کے لئے پیسہ نہ ہو۔ مگر دس دس کروڑ خرچ کر کے ایک ایٹم بم بنایا جاتا ہو۔ وہ دنیا پاگل نہیں تو کیا سمجھدار ہے؟ ..... یہ دنیا اسی قابل ہے کہ تباہ ہو جائے .....

اسی لئے تو میں یہ ایٹم بم کا انتاس آپ کو بھینٹ کرنے کے لئے لایا ہوں .....

لکشمی چند: (ڈر کر) نہیں نہیں ـــــ اسے یہاں سے لے جاؤ ـــــ دور لے جاؤ ـــــ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے .....

راج: (چڑانے کے انداز میں ڈراتے ہوئے) "ایٹم بم کوئی ہمارے مکان پر تھوڑا ہی گریں گے۔ لڑائی چھڑ گئی تو تیرے باپ کا تو بھلا ہونے والا ہے!" ـــــ سیٹھ جی ـــــ یہ ایٹم بم آپ کے مکان ہی پر پھٹے گا ـــــ (گھڑی دیکھ کر) ـــــ صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔

لکشمی چند: (اور ڈر کر) بس بس ـــــ مجھے شما کرو ـــــ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ میں تمہیں ہزار روپے نقد دے دوں گا ....

راج: (ہنس کر) ایک کروڑپتی کی جان کی قیمت صرف ہزار روپے۔ لکشمی چند! جو مانگو گے دیدوں گا ـــــ دس ہزار ـــــ پچاس ہزار ـــــ لاکھ ـــــ مگر اسے یہاں سے لے جاؤ ـــــ

راج: مجھے آپ کا روپیہ نہیں چاہیئے سیٹھ لکشمی چند۔ جو دولت مجھے چاہیئے وہ انمول ہے ـــــ جنی کی محبت ....

(گھڑی دیکھتا ہے) ..... افسوس اب تو صرف ایک منٹ باقی رہ گیا ہے .....

لکشمی چند: (پریشانی سے پاگل ہو کر) اچھا ..... اچھا ..... جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا ..... (بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے مگر بڑبڑاتا رہتا ہے) تم جنی سے جب چاہے بیاہ کر سکتے ہو۔ تم دونوں سکھی رہو .....

روشنیاں دھیمی ہوتے ہوتے بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے جب پھر روشنی ہوتی ہے تو نہ راج ہے نہ ایٹم بم۔ سیٹھ لکشمی چند سو رہا ہے۔

دروازے پر کھٹ کھٹ ـــــ لکشمی چند چونک کر آنکھیں کھولتا ہے مگر اس بار پہلے ہی سے اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے نشان ہیں جیسے کوئی بھیانک سپنا دیکھا ہو۔

لکشمی چند: کون ہے؟ آ جاؤ اندر؟ ـــــ

راج اندر آتا ہے

پیچھے۔ جنی ہے۔

راج کو دیکھتے ہی لکشمی چند اور بھی گھبرا جاتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں کپڑے سے ڈھکی ہوئی کوئی چیز ہے جو انتاس بھی ہو سکتی ہے اور ایٹم بم بھی

جیسے جیسے راج لکشمی چند کی طرف بڑھتا ہے وہ ڈر کے مارے پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔

لکشمی چند: تم پھر آ گئے؟

راج: (حیرانی سے) پھر؟ ..... ہاں ـــــ میں آپ کے لئے .....

جنی: پتا جی دیکھئے تو راج کتنا اچھا اور میٹھا انتاس لایا ہے۔ آپ کے لئے ....

راج: اسے چکھ کر تو دیکھئے سیٹھ جی ـــــ انتاس کیا ہے۔ انتاسوں

کا ایٹم بم ہے.....

لکشمی چند: میں جانتا ہوں ـــــ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

راج: (ذرا پریشان سا ہوکر) کیا جانتے ہیں؟

لکشمی چند: کہ یہ کس قسم کا انتاس ہے..... مگر راج۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تمہاری سب باتیں منظور ہیں..... میں تو..... دل سے چاہتا ہوں کہ تم اور رجنی ـــ یعنی رجنی اور تم ـــ مطلب یہ کہ تم دونوں.....

راج: (خوش ہوکر) تو آپ میرے آنے کا مطلب سمجھ گئے؟ اور آپ راضی ہیں؟

لکشمی چند: ہاں ہاں..... میں تو خود تمہارے پتا سے یہ بات کرنے والا تھا ـــ (رجنی سے جو خوش بھی ہے اور شرما بھی رہی ہے) ـــ کیوں رجنی تو راج کو پسند کرتی ہے نا؟

رجنی شرما کر باپ سے لپٹ جاتی ہے

رجنی: پتا جی! ـــــ آپ کتنے اچھے ہیں.....

منگو آتا ہے

لکشمی چند: کیا ہے؟

منگو سیٹھ کے کان میں کچھ کہتا ہے

لکشمی چند: اس سے کہدو کہ لکشمی چند نے بلیک مارکٹ کا دھندا چھوڑ دیا ہے.....

منگو حیرانی سے سیٹھ کو دیکھتا ہوا باہر چلا جاتا ہے

رجنی: (حیرانی سے) پتا جی ـــ کب سے؟

لکشمی چند: آج سے ـــ بیٹی ـــ اسی وقت سے۔

راج: رجنی۔ تو اس خوشی میں اور کوئی مٹھائی نہیں تو کم از کم یہ انتاس ہی کھایا جائے۔

رجنی: لاؤ مجھے دو ـــ میں ابھی کاٹ کر اور برف میں لگا کر لاتی ہوں

(میز پر سے اٹھانے لگتی ہے کہ باپ چلا کر روک لیتا ہے)

لکشمی چند: رجنی ـــ اسے ہاتھ مت لگانا۔

رجنی: کیوں ـــ کیا ہوا؟

لکشمی چند: یہ انتاس نہیں ہے ـــ ایٹم بم ہے۔

راج } ایٹم بم؟
رجنی }

رجنی: کہیں آپ سپنا تو نہیں دیکھ رہے۔ پتا جی؟

راج: تو پھر لیجئے ـــ اس ایٹم بم کے درشن تو کر ہی لیجئے۔

کپڑا ہٹا کر انتاس کو سیٹھ لکشمی چند کی طرف پھینکتا ہے جو یہ دیکھ کر کہ وہ ایٹم بم نہیں ہے۔ انتاس ہے۔ خوشی کے مارے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

رجنی: (دوڑ کر) پتا جی!

راج: (نبض دیکھ کر) بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ خوشی کی بے ہوشی ہے۔ ابھی ہوش آجائے گا۔

دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں

ایک دوسرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہیں

راج: چلو رجنی۔

رجنی: چلو ـــ مگر کہاں؟

راج: اپنا گھر بسانے۔

رجنی: اپنا گھر؟ (خوش ہوکر)

راج: ہاں ـــــ چھوٹا سا جھونپڑا ـــــ اِدھر اُدھر چھوٹا سا بغیچہ۔

رجنی: مگر ایک شرط ہے۔

راج: وہ کیا؟

رجنی: اس میں انتاس کا ایک پیڑ ضرور ہوگا۔

راج: ایک اور شرط

رجنی: وہ کیا؟

راج: وہاں ہم کسی کو ایٹم بم کے بیج کبھی نہ بونے دینگے۔

(ساتھ ساتھ وہ جاتے ہیں)

پردہ گرتا ہے.....

(یہ ڈرامہ بمبئی کی امن کمیٹی کی طرف سے سٹیج پر پیش کیا جا رہا ہے)

عاضیہ سجاد علیم

نیلی گٹھری

وہ ایک نیلے رنگ کی گٹھری تھی۔ کپڑا تو معمولی تھا۔ شاید سفید مارکین کو نیلا رنگوایا ہوگا، پر سِلی تھی بڑی نفاست سے۔ چاروں طرف سفید مارکین کی پٹی سفید ہی مارکین کے بند، ایک کونے پر چھوٹے نقطوں کو ملا کر، سفید ریشم سے ایک دائرہ کڑھا ہوا تھا اور اس کے بیچ میں سفید ہی ریشم سے کڑھا تھا ــــــ

"نمبر ۲۴" ــــــ

آنند نے گٹھری سے کپڑے نکالنے شروع کئے۔ چھ شلواریں، چار ململ کی دو ساٹن کی۔ پانچ قمیصیں، طرح طرح کے کاٹ کی۔ مختلف رنگوں کی، پھولدار، بُند کی دار، دھاری دار ــــــ ایک قمیص سفید دائل کی بھی تھی۔ جس کے گریبان کے چاروں طرف گلابی ریشم سے ایک نازک سی بیل کڑھی تھی، ایک دوپٹہ ململ کا، دو جالی کے، ایک نینون کا اور ایسے ہی کچھ اور کپڑے چادر، غلاف وغیرہ ہر ہفتے وہ گٹھری آتی۔ کپڑے کبھی ایک دو زیادہ ہوتے کبھی کم، اب اُسے ہر ہفتہ اس گٹھری کا انتظار رہنے لگا تھا۔ دیکھیں اب کے وہ انگوری رنگ کی قمیص آتی ہے یا نہیں۔ گلابی جالی کا سیاہ ریشم سے کڑھا ہوا دوپٹہ کیا اب تک اس نے نہیں اوڑھا؟ معلوم ہوتا ہے وہ دھلا کھو گیا جس کے کونے پر گلاب کی کلیاں کڑھی تھیں، ــــــ اس ہفتے بہت کم کپڑے آئے ــــــ کہیں بیمار تو نہیں ــــــ ضرور ہے۔ جبھی تو دواؤں سے یوکلپٹس کی بُو آرہی ہے۔ بے چاری! بھلا کالج میں کون اس کی دیکھ بھال کرتا ہوگا؟ آنند کا دل چاہا اُسے دیکھنے چلا جائے۔ پھر اس نے سوچا مگر کہے گا کیا؟ پھر اُسے ہیڈ مسٹرس کی آنکھیں یاد آئیں۔ جن میں ہر دم شک اور شبہ کے سائے منڈلایا کرتے تھے۔ اور ویسے بھی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ کسی کو جانیں نہ پہچانیں اور چلے جارہے ہیں مزاج پوچھنے صرف اس بنا پر کہ اس کے میلے رومالوں سے یوکلپٹس کی بُو آرہی تھی اور آپ نے اندازہ لگالیا کہ اس کو ضرور سخت نزلہ ہوگا۔ آنند کو اپنی حماقت پر خود ہنسی آنے لگی۔

اگلے ہفتے آنند نے جو گٹھری اُٹھائی تو کاغذ کا ایک پرچہ اُس میں سے گر پڑا۔ لکھا تھا۔ "منیجر صاحب کلین آل لانڈری ــــــ ان کپڑوں میں آپکو سبز رنگ کی ایک ریشمی قمیص ملے گی۔ اس پر کافی گرگئی ہے۔ مہربانی کرکے ایسا کیجئے گا کہ دھبہ بالکل چھوٹ جائے۔"

آنند نے قمیص نکالی۔ بالکل نئی تھی اور بہت ہی حسین تراش کی۔ اس نے اس پر سُرخ پنسل سے "ارجنٹ" لکھا اور سیٹ کے حوالے کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ کافی کیسے گری ہوگی؟ شاید وہ کافی ہاؤس گئی ہوگی اس قمیص کو پہن کر۔ آنند نے اس کی شکل تو دیکھی نہیں تھی پر پھر بھی وہ سوچنے لگا کہ اس کا رنگ ضرور ملیح ہوگا جبھی تو سبز رنگ اس پر اچھا لگتا تھا۔ قمیص کی ملبہان سے معلوم ہوتا تھا کہ قد درمیانہ ہے اور موٹی تو ہرگز بھی نہیں۔ ورنہ اس کاٹ کی قمیص اُسے کیسے آتی؟ تو پھر اس قمیص کو پہن کر وہ کیسی لگی ہوگی۔ کافی ہاؤس میں وہ اپنے ساتھی کے لئے کافی بناتے لگی ہوگی کہ اس کی اُنگلیاں کانپی ہوں گی اور کافی چھلک کر قمیص پر آرہی ہوگی۔ پر اس کی انگلیاں کیوں کانپی ہوں گی۔ کیا اسے اپنے ساتھی سے محبت رہی ہوگی۔ کیا اس لڑکی کی زندگی میں محبت آرہی تھی؟ آنند کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ پر بہت دن گذر گئے اور کچھ نہ ہوا۔ گلابی جالی سے شروع ہوگئے اور اس ہفتے کپڑوں میں ایک ہلکا سا گرم کوٹ بھی آیا۔ آنند نے کوٹ کو جھاڑا۔ جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب سے کاجو کے چند ٹکڑے، ایک ہیئر پن اور ایک مقامی اخبار کا تراشا نکلا۔ جو طالب علموں پر لاٹھی چارج کے متعلق تھا۔ دوسری جیب سے ایک بہت ہی چھوٹا سا پرچہ نکلا۔ بالکل مُڑا چُڑا، اور اس پر مردانے خط میں بہت ہی جلدی میں لکھا ہوا تھا۔ "ہاں ٹھیک ہے!"

آنند ہنس پڑا ــــــ حالانکہ اُسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کیا ٹھیک ہے!

تو کیا یہ اسی کا پرچہ تھا جس کے ساتھ وہ کافی ہاؤس گئی تھی۔ کیا ان دونوں نے کہیں ملاقات کا پروگرام بنایا تھا؟ کیسی ملاقات ہوگی یہ! کسی باغ میں، کسی ریسٹوران میں یا ..... اور اس کی نگاہ ایک دم سے اخبار کے تراشے پر پڑی۔ اس کے دل میں غلش سی ہونے لگی۔ کیا یہ لڑکی

سیاسی کاموں سے دلچسپی رکھتی تھی؟ تو پھر شاید کسی میٹنگ کا پروگرام طے ہوا ہوگا۔ طالب علم اکٹھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے دلوں میں اپنے ساتھیوں پر لاٹھی چارج کے خلاف غم اور غصہ رہا ہوگا؟ وہ زور زور سے بحثتے ہوں گے۔ اور بڑی بحث کے بعد ایک ریزولیوشن پاس ہوا ہوگا۔ پھر شاید کوئی جلوس نکلا ہو ــــ اس کی کہنی سے یکایک کوئی چیز ٹکرائی۔ سیٹ سے سنتی قمیص لئے کھڑا تھا۔ صاف ہو کر آگئی تھی۔ اس نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اور "گرلز کالج نمبر ۲" لکھ کر بنڈلوں کے گٹھ میں رکھ دیا۔

اگلے ہفتے گٹھری میں دو ساریاں بھی آئیں۔ ایک ہلکے نیلے وائل کی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ صرف ایک ہی مرتبہ پہنی گئی ہے۔ کیونکہ تقریباً بالکل صاف تھی اور کمر کی پلیٹوں کے نشان بھی اس میں بدستور موجود تھے۔ اس کے ایک سرے پر جو کند سے پر رہا ہوگا پن سے موٹے سرخ کاغذ کا ایک گول بیج لٹکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جلدی میں ساری اتارتے وقت وہ ساتھ ہی اُکھا چلا آیا۔ آنند نے بیج کو نکال لیا اور غور سے دیکھا ــــ اس کے اندر دو دائرے اور کھنچے ہوئے تھے، اور ان کے درمیان والی جگہ میں برش اور پانی کے رنگوں سے موٹا موٹا لکھا تھا۔ "امن کانفرنس" ــــ بیج کے چھوٹے دائرے میں لکھا تھا "والنٹیر"۔ آنند سن سے رہ گیا۔ تو واقعی یہ لڑکی کوئی سیاسی کارکن ہی تھی ــــ ارے نہیں۔ وہ کیا سیاسی کارکن ہو سکتی تھی، کافی ہاؤس جانے والی، رنگین لباس پہننے والی، محبت کرنے والی، پر امن کی تو سب کو ضرورت ہے، کافی ہاؤس کو بھی، رنگین لباسوں کو بھی، محبت کو بھی وہ خود تو سیاسی کارکن نہیں تھا۔ پر امن کی تو اُسے بھی ضرورت تھی۔ کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ساریاں اسی طرح دمکتی رہیں کہ اس کی لانڈری کی چمنی سے دھواں روز اسی طرح نکلتا رہے، امن کی تو اُسے بھی ضرورت تھی، اپنے لئے، اپنی لانڈری کے لئے۔ اس نیلی گٹھری کے لئے جس کا اسے ہر ہفتہ انتظار رہتا تھا۔ پھر اسے یکایک خیال آیا کہ ایسی ساریاں تو اس نے حال ہی میں کہیں دیکھی تھیں۔ ٹھیک ہے۔ پرسوں جب وہ کوئے کا پرمٹ ٹھیک کروانے کے لئے صدر سے گذرا تھا۔ تو ایسی بہت سی ساریاں اُسے ایک پنڈال کے آس پاس دکھائی دی تھیں، ــــ تو وہی تھی امن کانفرنس! کاش وہ اندر جا سکتا۔ ٹکٹ تو تھا نہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر ایک عورت کی آواز بہار چلائے جا رہی تھی "ہمارے گھروں کو خطرہ ہے، ہمارے بچوں کو خطرہ ہے۔ ہر شخص اس کانفرنس میں شریک ہو۔ ہر انسان اس اپیل پر دستخط کرے۔ سب مل کر امن کے لئے لڑو۔ ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے۔" شاید وہ وہی تھی۔ شاید وہ اسی کی آواز تھی، پر وہ چلا بھی جاتا تو اس اژدھام میں اسے پہچانتا کیسے۔ بیج پر نمبر ۲ تو لکھا نہیں تھا امن کے بیج پر نام کہاں! نمبر کہاں! وہ تو ہر طالب علم کے لئے ہے، ہر دستکار کے لئے ہے، ہر فن کار کے لئے ہے۔ ہر انسان کے لئے ہر سامنے میز پر ساری ڈھیری کی ہوئی رکھی تھی۔ آنند نے اس پر وہ بیج رکھ دیا اور ذرا دور ہٹ کر اُسے پھر غور سے دیکھا۔ کیسا اچھا لگتا تھا وہ جیسے صبح کے شفاف نیلے آسمان پر اُبھرتا ہوا سُرخ سورج!

اگلے ہفتے گٹھری نہیں آئی۔ آنند نے میٹ سے کئی بار پوچھا۔ پر میٹ کو کیا معلوم کہ کیوں نہیں آئی۔ اس کی بلا سے نہیں آئی تو ــــ تیسرے ہفتے آنند سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور اس نے کالج جا کر معلوم کرنے کی ٹھان ہی لی۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سائیکل باہر نکال ہی رہا تھا کہ ایک اور سائیکل سامنے سے آئی۔ دونوں کے پہیے لڑ گئے۔ اور کوئی چیز نیچے گری، آنند حیران رہ گیا۔ نیلی گٹھری زمین پر پڑی تھی ــــ سائیکل والے نے جلدی سے اُسے اُٹھایا۔ لانڈری میں پھینکا اور آناً فاناً ہوا ہو گیا۔ صرف اتنا دکھائی دے سکا کہ وہ نوعی کپڑے پہنے تھا۔ کون تھا یہ! ــــ اُونہہ ہوگا کوئی ــــ ذرا تمیز نہیں۔ اُجڈ کہیں کا۔ آنند نے استری والی میز پر گٹھری رکھدی اور جلدی جلدی کھولی۔ وہی کپڑے تھے، جانے پہچانے کپڑے۔ پر اُسے ایسا لگا جیسے کوئی بچھڑا دوست مل گیا ہو۔ کپڑوں کے بیچوں بیچ ایک کاغذ کا بنڈل تھا۔ اور اس پر لکھا تھا "صرف استری کے لئے"۔ اس نے بنڈل کھول ڈالا ــــ جھک سے خوشبو کا جھونکا آیا اور لال سانن کی شلوار کا ایک پائنچہ سرسے پھسل کر میز کے کنارے کے نیچے جھولنے لگا۔ جیسے کسی دلہن نے اٹھلا کر اپنا منہ دوسری طرف کر لیا ہو۔ اوہو ــــ یہ بات تھی! تو یہ ہو رہا تھا دوہنے سے! شلوار کے نیچے لال ہی ریشم کی قمیص تھی۔ اس پر ننھی ننھی سنہری بُندکیاں، لال جالی کا دوپٹہ جس کے کنارے پر پتلا لچکہ لگا تھا اور آنچلوں میں کرن جھلملا رہی تھی ــــ آنند نے بڑی احتیاط سے سب کپڑوں کو پیٹا اور الماری میں رکھ دیا۔

اگلے ہفتے سوموار کو جب لانڈری کھلی تو آنند کو پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ اس نے لانڈری میں قدم رکھا تو پانی کے سائیں

سائیں پکنے کی آواز اور فضا میں دوائیوں کی پھیلی ہوئی بُو سے وہ سمجھ گیا کہ میٹ آگیا ہے۔ اس نے رسیدوں کا جیڑا اٹھا لیا اور اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ اسے یہ رسید کیسی۔ یہ تو اس نے نہیں کاٹی تھی۔ کہاں سے آئی یہ؟

"سیتل ـــــ یہ رسید کس نے کاٹی؟" اس نے میٹ سے پوچھا۔

"صاحب میں نے کاٹی ہے آرجنٹ آرڈر تھا۔ صبح آئے تھے یہ کپڑے"

"پر ہمارے ہاں تو ملڑی کا ٹھیکہ نہیں ہے۔ یہ فوجی کپڑے کس گاہک کے ہیں؟"

اتنے میں میٹ نے نیلی گٹھڑی لاکے سامنے رکھدی۔ اس میں فوجی کپڑوں کا انبار اتنا بڑا تھا کہ کوئے ایک دوسرے تک پہنچ نہیں رہے تھے معلوم نہیں کس مشکل سے بندھ کر آئی ہوگی ـــــ پر نیلی گٹھڑی میں یہ فوجی کپڑے! رنگین سرسراتے آنچلوں کے ساتھ یہ خاکی کھردرا لباس! اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک جھٹکا تو اُسے دو ہفتہ پہلے بھی لگ چکا تھا۔ پر وہ سائیکل کے پہیئے کا جھٹکا تھا۔ ارے ہاں وہ سائیکل والا! تو کیا اس رنگین لباس پہننے والی نے اس اُجڈ فوجی سے شادی کر لی تھی۔ آنند تو سوچ رہا تھا کہ وہ کسی شاعر سے شادی کرے گی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ شاعر بھی کیا ہی چیز ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں محبت ہی محبت ہوتی ہے، پھولوں سے، حُسن سے، بچوں سے، زندگی سے۔ وہ حیات کی خوشیوں سے لبالب، زندگی کو آسودگی سے بھرپور دیکھنا چاہتے ہیں اور اگر دُنیا میں حُسن نہ رہے، پھول نہ رہیں، بچے نہ رہیں ـــــ آبادیاں بن ہو جائیں بستیاں ویران ہو جائیں تو شاعری کا بسیرا کہاں رہے؟ تو شاعری بھی خاک میں مل جائے، اسی لئے تو کبھی کبھی شاعر بھی خاکی لباس پہنتے ہیں کہ زندگی کی چہل پہل سلامت رہے، کہ پھول، رنگ، نغمہ، حسن اور بچے سلامت رہیں اس کی شاعری سلامت رہے! تو یہ خاکی لباس پہننے والا بھی شاید کوئی شاعر تھا! اس کھردرے لباس کے اندر شاید کوئی شاعرانہ دل دھڑکتا تھا؟ اس نے بُرش اٹھا لیا اور فوجی کپڑوں کو جھاڑنے لگا۔ خاکی خاکی غبار لانڈری کے پجدار دھوئیں سے لپٹ گیا۔ اور چھت کی طرف اُٹھنے لگا۔

چھ مہینے کے بعد ایک دن یکایک نیلی گٹھری میں خاکی اور رنگین کپڑوں کے ساتھ کچھ اور کپڑے بھی آگئے! عجیب سے کپڑے، اس نے الٹا پلٹا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پتلے کی طرح۔ ادھر ادھر بند لٹکتے ہوئے۔ دو طرف بٹن لگے ہوئے۔ یہ کیا ہے بھئی؟ اوہو! آرام کرسی کا غلاف! فیروزی زمین پر بڑے بڑے نارنجی اودے اودے پھول۔ کچھ کلیاں بکھری ہوئی۔ کچھ سبیں پھولوں اور کلیوں کو جوڑتی ہوئی۔ ادھر ادھر لٹکتی ہوئی۔ آنند نے دونوں غلافوں کو سمیٹا۔ ان کے نیچے دو نارنجی رنگ کے پردے تھے۔ جن میں اودا حاشیہ لگا ہوا تھا۔ پردوں کے نیچے ایک فیروزی ساٹن کا میز پوش جس پر اودے اور نارنجی پھول کڑھے تھے۔ سب سے نیچے گلابی ساٹن کی ایک ٹیکوزی تھی جس پر ایک کونے پر ایک منی سی سیاہ بلی اُدن سے بُنی ہوئی تھی بلی کی پیلی آنکھیں دیکھنے کے لئے آنند نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ دو موتی ٹکے تھے۔ بس! تو گویا گھر بن گیا تھا۔ چار دیواریں، دیواروں پر دو ایک تصویریں۔ ایک دیوار سے لگی کتابوں کی الماری، دو کرسیاں، ایک میز، اس پر چائے۔ گلابی ٹیکوزی کے ایک کونے سے منی سی سیاہ بلی کے پیلے دیدے جھانکتے ہوئے ـــــ اور ہاں اودے اور نارنجی پردے اور ان سرسراتے پردوں کی اوٹ میں محبت کی سرگوشیاں، زندگی کا تسلسل ـــــ کاش آنند وہ گھر دیکھ سکتا۔ شاید اگر وہ جاتا تو وہ اس سے کہتی "بیٹھئے نا۔ ایک پیالی چائے تو پیتے جایئے" پھر وہ گلابی ٹیکوزی نکل آتی۔ اس کا شوہر خاکی کپڑے پہنے ایک کرسی پر ڈٹ جاتا اور وہ سب باتیں کرنے لگتے۔ آنند انہیں بتاتا کہ راولپنڈی میں وہ بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ کہ وہ انجینیر بننا چاہتا تھا۔ کہ اُسے بھی نقشوں، تصویروں اور کتابوں سے محبت تھی ـــــ اُونہہ ـــــ اس نے میٹ کو آواز دی اور جلدی جلدی کپڑے گنوانے لگا۔

اُس دن آنند لانڈری میں داخل ہوا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ صبح صبح نوکر سے جھگڑا ہوا ـــــ اور پھر گھر سے خط آگیا کہ ماں کی طبیعت خراب ہے اور بہن کی سُسرال والے تقاضا کر رہے ہیں کہ لڑکی کو جلدی بدا کرو۔ اس نے سبزی کا تھیلا میز پر پٹکا اور دھم سے کُرسی پر گر پڑا۔ ایک کونے میں میٹ بیٹھا کچھ پھٹکڑے پھٹون رہا تھا ـــــ

"یہ کیا بے کار کام کر رہے ہو۔" وہ جھنجلا پڑا۔

"صاحب کپڑے لگ کر رہا ہوں" سیٹ نے سر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

"یہ کپڑے ہیں؟ نہ جانے کہاں سے گھر بھر کا گودڑ لا کے جمع کیا ہے۔ بے کار آدمی" وہ اور بھی جھنجلایا ——— سیٹ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ بکھرے ہوئے چیتھڑے سمیٹے، الماری کے اوپر سے نیلی گٹھری اتاری، اور سب گڈ مڈ اس میں رکھ کر جلدی جلدی باندھ دی۔

تو یہ چیتھڑے نیلی گٹھری میں آئے تھے! ادھر تو مدتوں سے اس نے گٹھری کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کیا دیکھتا! وہی خاکی، رنگین، رنگین، خاکی! پر یہ چیتھڑے کیسے؟

"دیکھیں" اس نے ہاتھ بڑھایا ——— سیٹ نے گٹھری پکڑا دی۔ آنند نے گٹھری کھولی، ارے! یہ گڈ مڈ کئے ہوئے چیتھڑے تو خوب ہی نکلے! ایک بادامی رنگ کی ننھی سی ریشمی فراک، جس کے ایک کونے میں سے چھوٹی سی جیب جھانک رہی تھی اور جیب پر ایک ننھا سا خرگوش پھدک رہا تھا۔ ایک بب جس سے دودھ کی بو آ رہی تھی۔ دو چار ململ کے کُرتے، دو چار تکونے، کھانے کے نہیں، پہننے کے۔ ایک آسمانی رنگ کا اونی سویٹر۔ ایک اجرق سی ٹوپی جس کے اوپر والے سرے پر ٹوک نکلی ہوئی تھی۔ اُسی رنگ کے چھوٹے چھوٹے موزے اور ان میں اُسی رنگ کا ریشمی ربن ——— بھی واہ! آنند کی ساری جھنجلاہٹ اُڑنچھو ہو گئی۔ اس نے ننھے سے موزے کو اُٹھایا اور اس کے ریشمی ربن پر ہاتھ پھیرنے لگا ——— پھر اسے یکایک وہ وقت یاد آیا جب اس کا سب سے چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا ——— وہ خود بیر کے درخت کے نیچے گولیاں کھیل رہا تھا کہ اس کی بڑی بہن نے آ کر چپکے سے کہا تھا "جاؤ دیکھو"

"کیا"

"ایک چھوٹا سا آدمی آیا ہے" اس کی بہن نے اپنی کہنی چھو کر بتایا تھا۔

"کہاں" تب تک وہ نہیں سمجھا تھا۔

"وہاں" اس کی بہن نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یکایک وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اور گچھے میں اپنی گولیاں چھوڑ کر بے تحاشا بھاگا تھا۔ مُنّے سے بھیّا کے گال کیسے ملائم تھے! اس کی آنکھیں تو بند تھیں پر آنند نے جب اپنی انگلی اس کے ہاتھ میں دی تھی تو اس نے کس کر پکڑ لی تھی۔ اب وہ بھائی جوان ہو گیا تھا اور اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ اگر نہیں اور نوکری نہیں ملتی تو آپ مجھے فوج میں کیوں نہیں جانے دیتے؟ کب تک آپ میری انگلی پکڑ کے چلاتے رہیں گے۔ مجھے اپنے پیروں پر خود کھڑا ہونے دیجئے بھیّا! ——— آنند نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور گٹھری کو باندھ کر میز کے ایک کونے پر رکھ دیا۔ اُسے گٹھری سے شرم سی آ رہی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو کہو! کیسی رہی؟ تم سمجھتے تھے اب میں کوئی نئی چیز لا ہی نہیں سکتی؟ مجھ سے مایوس ہو گئے تھے تم؟ ——— پر دیکھ لو ——— پہلے حُسن پھر رنگینی، پھر محبت، پھر جد و جہد، پھر گھر، پھر زندگی، ——— پھر اور حُسن، پھر اور محبت، پھر اور زندگی! ——— حیات نئے نئے رُوپ بھر کر اُبھرتی ہے، زندگی نئی نئی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور ہمیشہ چلتا رہے گا ——— اس تسلسل سے کبھی مایوس نہ ہونا ——— آیا سمجھ میں!

اس نے گٹھری کو بڑی محبت سے اٹھایا اور الماری پر رکھ ہی رہا تھا کہ اس کے کان میں شور کی آواز آنے لگی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ہزاروں آدمیوں کا ایک بڑا سا ہجوم نعرے لگاتا چلا آ رہا تھا۔ ابھی وہ لوگ ذرا دور ہی تھے۔ پر آنند کے کانوں میں ان کے نعرے صاف سُنائی دے رہے تھے۔

"ہم امن چاہتے ہیں"

"امن کی فوج زندہ باد"

"ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے"

تیسری جنگ! آنند نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ لانڈری غائب ہو گئی۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ کٹے ہوئے سر، چیختی ہوئی کھوپڑیاں۔ بکھرے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ آبلے پڑے ہوئے جسم، آندھی آنکھیں، ٹوٹتے ہوئے ہاتھ، ٹوٹتی ہوئی چوڑیاں

بین کرتی ہوئی آوازیں۔ اس کے اپنے بھائی کے کٹے ہوئے پاؤں میں آدھا جلا ہوا فوجی پتلون، وہ پاؤں جن پر اس کا بھائی خود کھڑا ہونا چاہتا تھا ان انگلیوں پر سیاہ خون جم گیا تھا۔ جنھوں نے اس کی انگلی کو برسوں گذرے، کس کے پکڑا تھا۔ اس کی ماں کے کھچڑی بالوں میں سیندور کی جگہ مٹی، اور سہتی قمیص کے سینے میں گوبیوں کے چھید، سُرخ بندکی دار قمیص پر بارود کی جمی ہوئی سیاہی جو کسی لانڈری میں چھڑائی نہیں جاسکتی تھی، ـــــ وہ تو انجیر بنانا چاہتا تھا نا! وہ تو زمین کے سینے کو پھاڑ کر انسانوں کے لئے حسین چار دیواری بنانا چاہتا تھا نا؟ پر یہ اُسے کیا دکھائی دے رہا تھا، کہ دیواریں بیٹھ رہی تھیں۔ گوا جل جل کر گر رہے تھے، تاریخی پردوں اور فیروزی سیز پوشوں کو شعلے چاٹ رہے تھے۔ سُلگتا ہوا ایک شہتیر گرا۔ گلابی ٹیکوری اس کے نیچے کچل گئی۔ بلی کے پیلے دیدے باہر کو اُبل پڑے۔ ایک باریک سی چیخ سُنائی دی ـــــ کیا بلی میں جان پڑ گئی تھی ـــــ نہیں ـــــ شہتیر کے نیچے سے دو ننھی ننھی مٹھیاں پل بھر کے لئے ہوا میں کانپیں، باریک چیخ ایک کھنچتی ہوئی کراہ میں بدلتی ہوئی رک گئی ـــــ اب وہ مٹھیاں کسی انگلی کو کس کر نہیں پکڑ سکتی تھیں۔ کیونکہ احمق سی ٹوپی کا پھندنا جل چکا تھا۔ دودھ سے بھری ہوئی سب خون میں ڈوب چکی تھی۔ اور سُتی سی جیب پر پھدکتا ہوا خرگوش سُلگتے ہوئے شہتیر کے نیچے سسک سسک کر دم توڑ چکا تھا ـــــ تیسری جنگ!

جلوس لانڈری کے سامنے آگیا تھا۔ آنند نے چونک کر سر اُٹھایا۔ جلوس نے زور کا ایک نعرہ لگایا ـــــ "ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے"۔ مجمع سے ایک دُبلی پتلی لڑکی نکلی اور گود کے بچے کو سنبھالتی ہوئی اس طرح آنند کے پاس آگئی جیسے وہ ہمیشہ سے اُسے جانتی تھی ـــــ اس نے ایک کاغذ آنند کی طرف بڑھایا "اس پر دستخط کیجئے ـــــ یہ امن کی اپیل ہے"۔

"آپ ـــــ آپ کون ہیں"؟ آنند کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"میں؟" لڑکی مسکرائی۔ "میں ایک عورت ہوں، ایک ماں ہوں، ایک انسان ہوں" ـــــ پھر اس کے چہرے کی رنگت یکایک بدل گئی خوف کی زردی اور غصّے کی سُرخی ـــــ دونوں رنگ اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔ "میرے ماں باپ ہیں۔ میرے بھائی بہن ہیں، میرا ایک شوہر ہے۔ میرا ایک بچہ ہے، میرا ایک گھر ہے ـــــ آپ بتائیے کیا ہمیں زندہ رہنے کا حق نہیں"۔

"ہے۔ ضرور ہے"۔ آنند کے لب جذبات کی شدت سے کانپنے لگے "میرے بھی ماں باپ ہیں، میرے بھی بھائی بہن ہیں ـــــ تمہارا گھر ہے اور میرا گھر ہوگا ـــــ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوگا اس کے لئے ہمیں زندہ رہنے کا حق ہے"۔

"تو کیجئے اس پر دستخط ـــــ امن کی عالمگیر آواز میں اپنی آواز بھی ملا دیجئے"۔

آنند نے قلم نکالا۔ وہی قلم جس سے وہ ہمیشہ نیلی گھڑی کے کپڑے لکھا کرتا تھا ـــــ بچے نے ہاتھ بڑھایا اور اپنی ننھی انگلیوں کی مٹھی میں قلم کو کس کے مضبوط پکڑ لیا۔ جیسے اس کی زندگی کا رشتہ اس قلم ہی سے بندھا ہو۔

آنند مسکرایا ـــــ اور بچے کے مُٹھے سے ہاتھ پر اپنا بڑا سا ہاتھ رکھ کر قلم کو کاغذ پر کھسکا دیا ـــــ

جیل میں رہ کر سردار نے اپنا اور سماجی حالات کا کڑی نگاہ سے سماجی تنقیدی تجزیہ کیا اور ایشیا کی خوبصورت سچائی ان پر موثر ہوئی اور انھوں نے اپنی طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" لکھی۔ جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور حماسیہ بھی جس میں ایک کی شاعرانہ اور غنائی سندرتا ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا بھول رُوپ سمٹ کر سما گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سن بلوغ کو پہنچتی ہے۔ جوان ہوتی ہے۔ اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان سربلندیوں کو چھو لیتی ہے جہاں سے غفلت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں

(کرشن چندر)

ایشیا جاگ اُٹھا دوسرا ایڈیشن

(طویل نظم) قیمت بارہ آنے **مکتبہ شاہراہ دہلی**

ہڑتال

نجمہ نکہت

گوپی کی اداس آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور ماتھے پہ ایک نیلی رگ اُبھر آئی تھی۔ پچیس سال میں صرف دو بار وہ رویا تھا۔ بچپن میں نہ معلوم کتنی بار پھوٹ پھوٹ آنسو بہائے تھے۔ کتنی بار بلک بلک کے رویا تھا مگر وہ لمحے اب اُسے یاد نہیں تھے ——— اس کی تازہ یادداشت میں تو صرف دو بار بہائے ہوئے آنسو محفوظ تھے ——— پہلی بار تو وہ اس وقت رویا تھا جب اس کی ماں مر گئی تھی اور دوسری بار اب جبکہ اس کو خود اپنے رونے کی وجہ معلوم نہیں تھی۔

سیلے طاق پہ پڑے ہوئے ٹوٹے آئینے میں اُس نے اپنے عکس کو گھور کر دیکھا اور اپنے آپ سے بولا: "یہ آنکھوں کی اُداسی، یہ خشک ہونٹ اور یہ اُلجھے بال ——— کیا میں عمر بھر میں صرف دو بار رویا ہوں؟ ——— پھر یہ اُداسی۔ یہ وحشت کیوں؟ ——— نہیں نہیں میں ہزار دفعہ رویا ہوں۔ کیا ہوا جو آنسو نہیں ٹپکے، کیا ہوا جو کسی نے میرے آنسو نہیں پونچھے مگر میں رویا ضرور ہوں ——— میں اپنے آپ کو صرف سمجھا کے بہلا لیتا ہوں کہ میں کبھی نہیں روتا۔ میں تو قہقہے لگاتا ہوں، ہنستا ہوں، دوسروں کو ہنساتا ہوں اور ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔ میں آج تک اپنے آپ کو دھوکہ دیتا آیا ہوں ———"

اُس نے اپنی میلی آستین میں گرم آنسو خشک کر لئے اور زبردستی ہونٹ پھیلا کر مسکرانے لگا بالکل یوں جیسے کوئی بچہ پٹنے کے بعد مکر جانے پر ہنسنے لگے۔ مسکرانے کی بعد کی ہنسی کتنی عجیب ہوتی ہے ——— آنسوؤں میں گھلی تلخ ہنسی ——— اپنی موٹی کھردری انگلیوں سے اس نے اُلجھے ہوئے تشت بالوں میں کنگھی کی اور دیکھنے والوں پر زبان پھیری مگر اس کے ہونٹوں کی خشکی دُور نہ ہوئی ——— اُس کی روح میں ایک عجیب سی تشنگی بس گئی تھی جو کسی طرح دُور ہی نہ ہوتی تھی بلکہ ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی آنسوؤں کی یہ دو بوندیں کیا پیاس بجھا سکتی تھیں۔ اس کا جی چاہتا تھا خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے ——— اندر ہی اندر جیسے پھوٹ رہا تھا۔ جیسے دُھواں اٹھ رہا ہو ——— اس کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے گھبرا کر میل سے آٹے ہوئے چیکٹ کُرتے کو اپنا سر ڈال دیا اور تھکے ہوئے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔

اس کی کوٹھری میں ساری دنیا کی اُداسی سمٹ آئی تھی۔ نا امیدی، بے چینی، اُلجھن ——— جس نے اس کے دماغ میں اس قدر کشمکش پیدا کر دی تھی کہ پیشانیوں میں درد ہونے لگا۔ ایک نہ مٹنے والا اضطراب اس کے چہرے پہ پھیل گیا۔ اس کے پٹڑائے ہونٹ کانپ گئے ——— ہر دھڑکن ایک آہنی ہتھوڑا بن کر اس کا سینہ توڑ رہی تھی ——— دھک دھک ——— کھٹ کھٹ ——— گویا مسلسل ضربیں سارا بدن دھلائے دے رہی تھیں۔ میٹھے پسینہ ریگ رہا تھا۔ پسینے کے گرم قطرے ٹھنڈی ہوا سے جو کہ کی چھوٹی چھوٹی ڈلیوں کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اس نے پھر بیری کی اور تکیہ کے نیچے سے کہانیوں کی ایک پرسیدہ کتاب نکال کر مٹی کے کچے فرش پہ پھینک دی۔ جیسے وہ کتاب ہی قصوروار ہو۔

ذلیل کہیں کے ——— وہ بڑبڑایا۔ یہ ادیب جب کہانیاں لکھتے ہیں تو سالوں کو صرف جارجٹ کی ساری میں لپٹی ہوئی عورت کے سوا دنیا میں اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ جیسے دل و دماغ پر صرف ایک ہی تصویر ہے، عورت! انگڑائی لیتی ہوئی عورت، ناچتی ہوئی عورت، اٹھلاتی چلتی ہوئی عورت، مسکراتی ہوئی عورت اور وہ بھی زیوروں سے لدی ہوئی، بنارسی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی ——— جس کو نئے نئے انداز سے کاغذ پر اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم غریب انسان شاید دنیا میں رہتے ہی نہیں، اُلو کے پٹھے کہیں کے ———

فرصت کے وقت گوپی منشی کے پاس گھسا بیٹھا رہتا تھا اور یہ منشی کی صحبت کا فیض تھا کہ اس کو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا آ گیا تھا اور اب وہ نہ معلوم کہاں کی گھسی پٹی کتابیں منشی سے لے کے رات کو چھوٹا سا دیا سرہانے رکھے انھیں پڑھا کرتا اور شہزادیوں کے ٹھاٹ پڑھ پڑھ کے اس کا جی جلا کرتا۔ چنانچہ کتاب پھینک کے اس نے الف لیلیٰ کے مصنف کے ساتھ ساتھ سارے ادیبوں کو گالیاں دیں اور جسم ڈھیلا کر کے چپ چاپ لیٹ گیا۔ مگر سارے جتن کر کے بھی وہ بے چین رہا۔ آنکھیں بند کر کے اُس نے گھڑی بھر کو سانس روک لی تاکہ دھن دھن کی بھاری آواز سے کان بچ جائیں۔ مگر دوسرے لمحہ پھر کوئی سینہ کوٹنے لگا ـــــ پسینے کے ٹھنڈے تھرے ریلے کی صورت میں گردن سے بچھ کر مٹھے پہ بہنے لگے ـــــ اور جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا۔ روزانہ آٹھ گھنٹے کام کر کے بھی اس کو اتنی تھکن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ سوچنے لگا آج تو صبح سے بیکار ہوں پھر یہ تھکن کیسی ـــــ؟ کیا ہو گیا ہے مجھے آخر ـــــ؟

ایک بار پھر اس نے سر اُٹھا کر نگاہیں مٹی کے فرش پہ پڑی ہوئی ضخیم کتاب پہ دوڑائیں ـــــ

ایک عجیب سا کرب اس کے چہرے پہ پھیلا ہوا تھا ـــــ اور آنکھوں سے دنیا جہان کا درد جھانک رہا تھا ـــــ اس نے حقارت سے کتاب کو دیکھا جیسے اس نے کتاب نہیں پھینکی تھی بلکہ اس میں چھپی ہوئی گویا جیسی عورت کو زمین پہ دے مارا تھا ـــــ اور پھر منہ موڑ کر وہ اپنے بستر کی شکنیں صاف کرنے لگا۔ مانو یہ شکنیں اس کے بستر پہ نہیں اس کی زندگی میں پڑ گئی تھیں۔

دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں مل کے اُس نے کروٹ بدلی۔ مگر میں درد ہونے لگا ـــــ ایک شدید خواہش اس کے دل میں جاگی۔ کاش کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھا دے۔ بیٹھ تک چلتا آئے اور پیٹھ سے پھر کمر تک ـــــ مگر کون اس کی خواہش پوری کرتا، کون وقت خراب کر کے میلے کچیلے انسان کی کراہتا ـــــ اس کا بس چلا تو رام بھروسے کی لڑکی کو بلا لائے۔ مگر کمبخت تھی بڑی سور۔ اس طرح شرارت کرتی کہ اس سے پناہ مانگتے ہی بنتی ـــــ اور پھر وہ تو وہ ہاتھ کی زبان لئے پھرتی۔ وہ کیا نام تھا خدا بخش کی ننھی ـــــ

ننھی تو خیر کیا تھی وہ تو خیر خدا بخش کی محبت تھی جو اپنی بیٹی کا اچھا خاصا تندرست ڈیل ڈول ہو جانے کے بعد بھی ننھی پکارتا۔ اُس سے کمر دبانے کو کہنا اچھا بڑا دنگا مول لینا تھا ـــــ اول تو گوپی کا فرقہ اور پھر لمبا چوڑا تگڑا جوان۔ جو خدا بخش کی ننھی سے کمر دبوانے کا کسی صورت میں حق نہ رکھتا تھا۔ اگر وہ مذاق ہی میں ننھی سے یہ کہہ بیٹھے تو خدا بخش اس کی بوٹیاں نوچ لے ـــــ خدا بخش کو گوپی کی بوٹیاں نوچنے میں اس لئے بھی آسانی تھی کہ وہ مل میں منیجر تھا۔ لہٰذا گوپی نے ننھی سے کمر دبوانے کا خیال دل سے نکال دیا اور اوندھا لیٹ کے پیروں کی ایڑیاں کمر سے لگا لیں۔

کھڑاک سے کھڑکی کھلی اور پڑوسن کا چوڑا بھدا چہرہ کھڑکی سے جھانکنے لگا۔
پھر سی گلے موٹے موٹے ہونٹ ہلے اور ساتھ ہی کٹے ہوئے ہونٹ پہ نتھ کا بڑا موتی چمکا۔
"ارے گوپی ـــــ کام پہ نہیں گیا آج ـــــ جی تو اچھا ہے؟"
"ہاں سٹھانی بھگوان کی دیا سے اچھا ہی ہوں، آج مل میں ہڑتال ہے" وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا۔
"ارے میری مٹیا ـــــ روز روز ہڑتال ہوتی رہے گی تو پیٹ کا دوزخ کیسے بھرے گا ـــــ"
سٹھانی کلے میں پان دبا کر بولی اور آنکھیں جھکا کر نتھ کا موتی دیکھنے لگی۔
"اب کب بھرتا ہے سٹھانی؟" وہ ذرا ترشی سے بولا "اور کیا ہم اپنا حق بھی نہ مانگیں۔ تم ہی کہو دن بھر پسینہ ٹپکا کر بھی کب تک بھوکے مرتے رہیں ـــــ؟" اس نے اپنے پچکے گال سہلا کر سٹھانی کو گھورا۔
"ایسے ہے کام نہیں کرو گے تو نگوڑی زندگی کیسے کٹے گی ـــــ؟"
سٹھانی طعن سے بولی۔ گوپی نے جھلا کر غصیلی نظروں سے اُسے دیکھا۔ یوں کہہ رہی ہے بدذات جیسے اس کا سیٹھ کام کر کر کے مرا تو جاتا ہے

دن بھر ـــــ دوکان پر بیٹھا بیٹھا تو تھیلا ہوگیا ہے ـــــ پھر بھی پھولتا جا رہا ہے۔ اس کو شدت سے اپنے بچے گالوں کا احساس ہونے لگا ـــــ اس کے ہونٹ کھلے، وہ چاہتا تھا جس قدر گالیاں یاد ہوں وہ آج اس سٹھانی پر ختم کردے۔ اور اپنے ہاتھ سے وہ زناٹے دار تھپڑ مارے کہ دوسرا ہونٹ بھی پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے ـــــ مگر پھر اس نے ہونٹوں سے زبان کو سی لیا ـــــ اور تنا ہوا ہاتھ بے جان ہو کر گود میں گر پڑا ـــــ کچھ ہوٹر وسن ہے اور پھر گوپی نے دو دو روپے اپنا پیٹ کاٹ کر تنخواہ میں سے اس کے پاس جمع کروائے تھے تاکہ گوپی کی شادی پر کام آئیں۔ اگر کچھ سخت سُست کہہ دے تو یہ پونجی بھی چلی جائے گی اور وہ خبیث سیٹھ بھلا کاہے کو اتنی ہمدردی کرے گا کہ ایمانداری سے پیسہ واپس کر دے سیٹھ کے خیال ہی سے اس کا جسم کمزور پڑ گیا ـــــ ہوٹر وسن کھڑکی بند کر کے چلی گئی تھی۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کچی نیند سے جاگی ہوئی آنکھوں کی طرح جل رہی تھیں اور پپوٹے وزنی ہو گئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے سیٹھ کے متعلق سوچنے لگا ـــــ

سیٹھ واقعی تھا بڑا موذی۔ اس سے سارے محلّے والے ڈرتے تھے۔ اس کے تین بڑے بیٹے اور ایک لڑکی ـــــ دو لاکھ کی شاندار دکان اور ایک بیڑی کا کارخانہ ـــــ اب بھلا زندگی اور کیا مانگتی ـــــ بڑا لڑکا کانگریسی تھا اور رات دیر گئے لڑکھڑاتا ہوا مغلظات بکتا گھر میں داخل ہوتا۔ ہاں صبح اشنان کر کے کھادی کا موٹا کرتا اور گاندھی ٹوپی پہن کے ناشتہ پر دودھ، مکھن اور پوریاں کھا کے ملک کی غذائی صورتِ حال پر گھنٹوں سیٹھ کے ساتھ بحث کرتا۔ دوپہر تک تو سوتا رہتا پھر موٹر آ کے لے جاتی۔ قابل بھی معلوم ہوتا تھا صورت سے ـــــ

منجھلا لڑکا سوشلسٹ تھا۔ کسانوں کو سُرخ ٹوپیاں پہنا کر اپنی موٹر میں لئے لئے پھرتا۔ روزانہ شام کے کھانے پر بڑے بھائی سے جھڑپ ہو جاتی تھی۔ بڑا بھائی اس کو یہ کہہ کر لڑائی کے میدان میں پچھاڑ دیتا کہ "بڑے قتل و خون کے مخالف بنے پھرتے ہو۔ پچھلے سال تم نے دیہات کی جوان لڑکی کو گلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ وہ تو میں آڑے آ گیا ورنہ ....."

اور منجھلا کھانا چھوڑ کے باہر نکل جاتا۔

اور چھوٹا لڑکا ـــــ؟ پتہ نہیں چھوٹا کیا کرتا تھا۔ وہ گھر میں نظر ہی نہ آتا۔ شاید کہیں روٹھ کے چلا گیا تھا۔ اکثر سٹھانی اس کا ذکر اس انداز سے کرتی جیسے کوئی کتے بلی کا ذکر کرتا ہو۔ اس کی چندھی آنکھیں حقارت سے بھر جاتیں اور وہ مٹی پر اپنا چیا یا ہوا پان یوں تھوکتی جانو چھوٹا بیٹا اس چبائے ہوئے پان سے زیادہ بے ضرورت ہے ـــــ گوپی سوچتا "کیا کوئی ماں ایسی بھی ہوتی ہے جس کی ممتا مر جاتی ہے؟" مگر وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکتا۔ ایک اس کی ماں بھی تھی جو سگریٹ کے ڈبے بنایا کرتی تھی۔ فیکٹری میں گھنے نیم کے نیچے گوپی بیٹھا مٹی سے کھیلتا رہتا۔ موٹے موٹے کھارے کنکر منہ میں رولتا رہتا ـــــ اس کی ماں کو اتنی اجازت بھی نہ ملتی تھی کہ وہ اپنے بچے کو گھڑی بھر کے لئے دیکھ لے ـــــ شام تک وہ تھک کے چور چور ہو جاتی تب کہیں منشی اس کو چوٹی پکڑا دیتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ اس کے حصّہ کی چوٹی سے منشی سنیما دیکھنے چل دیتا اور وہ بسورتی ہوئی گھر آجاتی مگر اس کے باوجود بھی اس کی مجال نہ تھی جو منشی کی شکایت کر دے۔ منشی فیکٹری کے مالک کا سالا تھا۔ اور اس کی شکایت کر کے گوپی کی ماں بھوکوں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ رات کو اس کے سینکڑوں سے لپٹے ہوئے گداز جسم میں گھس کر لیٹنے سے گوپی کو بڑا آرام ملتا تھا۔ خاص کر جاڑوں کی ٹھنڈی راتوں میں تو گوپی کو یوں محسوس ہوتا جیسے ماں کے جسم میں انگیٹھیاں سلگ رہی ہیں۔ اچھا خاصا سات سال کا ہونے کے بعد بھی وہ ماں کے پیٹ سے لگ کر سوتا تھا۔ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ مگر یہ سٹھانی چار بچوں کی ماں بن کے بھی ماں نہیں تھی۔ بھگوان جانے کیا تھی۔ اس کو اپنے بازوبند اور کڑے سے جتنی محبت تھی اتنی کسی انسان سے نہیں تھی۔ شاید سونے کی چمک آنکھیں جھوڑ دیتی ہے۔

گوپی بیکار لیٹے لیٹے دنیا بھر کی باتیں سوچ رہا تھا۔ اس کی کمر کا درد دوگنا بڑھ گیا تھا اور ٹخنے کی اُبھری ہوئی ہڈی پر ایک پکا ہوا پھوڑا جل رہا تھا۔ یہ بھی کیسی عجیب بات تھی۔ آرام سے پڑے رہنے میں آج ہزاروں تکلیفیں نکل آئی تھیں۔ حالانکہ روزانہ صبح سے شام تک جُتے ہوئے کام کرنا پڑتا تھا مگر کمر کے درد اور ٹخنے کے پھوڑے کا آج احساس پیدا ہو رہا تھا۔ ماں کی یاد بھی کچھ زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

رات کو کسی نے کھانے کے لئے نہ پوچھا اور پوچھتا بھی کون ــــ ؟ کون تھا جو اس کا درد بانٹ لیتا۔ صبح سے وہ بھوکا تھا اور ایک کوڑی بھی اس کے پاس نہ تھی۔ اوپر سے تکلیفیں الگ۔ اس نے پوچھا رام بھروسے کے پاس کیوں نہ روٹی کھائی جائے۔ پھر فوراً خیال آگیا کہ اس کی بیوی تو جاڑے بخار سے پڑی ہے۔ آنتیں اینٹھ رہی تھیں اور پیٹ میں جیسے گرم پانی اُبل رہا تھا۔ سٹھانی تو سرِ شام ہی پڑ کے سو رہی تھی۔ بھلا لوٹا بھر دودھ پی کے بھی نیند نہ آتی تو اور کیا ہوتا۔

مگر وہ رات بھر بے چین ڈھیلے بان کے کھٹولے پر کروٹیں بدلتا رہا۔ پیٹ کی آگ کو بھول کر وہ سوچتا رہا شاید کل کے دن تھوڑے ہیں بس کچھ دن کا اور عذاب ہے۔ کل ہڑتالیوں کا جلسہ ہوگا۔ پرسوں مل مالک کی کوٹھی کے سامنے مظاہرے ہوں گے اور پھر ہڑتالیوں کا جلوس بھی تو نکلے گا۔ بڑا شاندار جلوس جیسے وائسرائے کا نکلتا تھا تو سڑک پر تل پھینکنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ نہیں بلکہ اس سے بھی لمبا جلوس اور جھک مار کر مالک کو تنخواہیں بڑھانا پڑیں گی۔ ورنہ ..... اس نے مسرت سے مغلوب ہو کر ہلکی سی چیخ ماری اور لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس کی تنخواہ بڑھ جائے گی۔ بونس کا اضافہ اور ــــــ

اور صبح وہ کھڑکی پر کھڑا سٹھانی کو آوازیں دیتا رہا ــــ سٹھانی ــــ او سٹھانی جی ــــ ذرا اِدھر آنا۔ مگر سٹھانی نے کھڑکی کھولنا تو ایک طرف آواز تک نہ دی۔ تھک کر اس نے کواڑ پیٹے۔

دھڑ ــــ دھڑ ــــ دھڑ ــــ دھڑاک ــــــ

"کیوں شور مچاتے ہو جی، آدمی ہو کہ جانور ــــــ ؟"

سٹھانی کی جوان لڑکی نے گجے میں چاندی کی ہنسلی گھما کر غصہ سے گوپی کو گھورا وہ بوکھلا گیا۔ ٹین کے بٹن میں کاج اُلجھا کر اس نے کرتے کا گلا بند کیا اور حواس ٹھیک کر کے لجاجت سے بولا۔

"وہ ــــ وہ ذرا سٹھانی کو ادھر بلا دو۔ بڑا ضروری کام ہے"

"وہ ــ وہ کیا کر رہے ہو۔ ٹھیک سے کہتے کیوں نہیں کیا کام ہے؟ ان کے سر میں درد ہے سمجھے ــــ ؟" وہ نفرت سے جھڑک کر بولی۔

گوپی نے سوچا بیچ کے اعتبار سے تو یہ بالکل سٹھانی ہے۔ پھر سنبھل کر نرمی سے بولا۔

"بات یہ ہے جی۔ ان کے پاس میرے پیسے ہیں۔ آج ہڑتال کا دن ہے۔ ان سے کہنا کہ ....."

"ہیں۔ لینے کو اتنا غل مچایا ہے، منحوس خور کہیں کا" لڑکی پیر پٹکتی۔ جھانجن بجاتی چلی گئی۔

وہ سکتہ میں آگیا۔ تو وہ بھکاری ہے؟ آخر اس نے محنت کر کے۔ خون پسینہ ایک کر کے یونین جمع کی ہے۔ کیا اپنی چیز واپس لینا بھیک مانگنے کے برابر ہے۔ کیا ..... اس سے قبل کہ وہ اور کڑھتا۔ بیچ و تاب کھاتا سٹھانی دندناتی ہوئی اس کے سر پر آگئی۔

"اے ہے کلمو بھکشو بے صبرا کہیں کا۔ ارے میں تیرے باپ کی قرض دار ہوں؟ کیا لینا اور کیا دینا۔ تو نے کھولی کا کرایہ دیا تک! رہتا ہے تو ہاتھ کے ٹھاٹ سے ــــ نگوڑا دو کوڑی کا مزدور اور دماغ دیکھو کیسے کا۔ مجھ پر تیرا ایک پیسہ باقی نہیں ہے۔ ذرا کھڑکی سے میٹھی بات کر لی تو سر چڑھ گیا بے ایمان ــــ آج ہی خالی کر دیجو ہماری کھولی ــــ ورنہ سیٹھ سے کہہ کر نکلوا دوں گی ــــ"

سٹھانی نے زور سے کھڑکی بند کر لی اور اس کو یوں لگا ساری دنیا کے دروازے اس پر بند ہو گئے۔ وہ گھبرا کر کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا زمین اس کے پیروں کے تلے سے بھاگی جا رہی ہے۔ بڑی دیر تک اس کے دماغ میں کھڑکی کے پٹ دھڑ دھڑاتے رہے۔ ممکن تھا دوسری بار آنسو بہاتا مگر خشک آنکھیں جل کر رہ گئیں۔ آنسو نہیں بہہ رہے تھے مگر وہ رو رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس کے گرد ہر چیز گھوم رہی تھی۔ آدمی، چھوٹی موٹی دکانیں، ٹوٹا ہوا ٹین کا ٹکڑا، میلی دھوتی، بان کا کھٹولا اور بیڑی کے ادھ جلے ٹکڑے۔ سب اس کے گرد ناچ رہے تھے۔ چکر کاٹ رہے تھے اور وہ مبہوت بنا ان کے درمیان حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا تھا ــــ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور کمزور ہاتھ پاؤں کانپ

رہے تھے۔ ایک دم وہ ناتواں ہو گیا تھا۔ اس مریض کی طرح جس کو ڈاکٹر نے لاعلاج بتا دیا ہو۔

وہ پھر کھڑکی کے بند پٹوں سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دنیا میں کسی کو بھی تو اس کا خیال نہ تھا۔ دنوں بال مٹی میں اٹے رہیں۔ ہفتوں غلیظ کپڑوں میں سڑتا رہے یا گھنٹوں بھوکا مرے۔ کوئی جو ذرا بھی پرواہ کر جائے۔ اور رات بھر بھوکا رہنے کے بعد بھی اس کو پیٹ بھرنے کی کوئی امید نہیں تھی کوئی اس کی آنتوں کو مسلے ڈال رہا تھا۔ کلیجہ کھنچ کے مُنہ کو آ رہا تھا۔ اندرونی کشمکش وہ کس کو جا کر دکھاتا۔ رہنے کو اب تو قبر جیسی کھولی بھی اس کی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں نہ دکھائی دینے والے آنسو مچل رہے تھے۔ نہ معلوم کس جرم کی پاداش میں وہ اس قدر بے بسی سے مٹی کے فرش سے منہ لگائے سسک رہا تھا۔ قصور سیٹھانی کا نہ تھا، قصور کارخانہ کے مالک کا نہ تھا، قصور حکومت کا نہ تھا۔ قصور تو گوپی کا تھا نہ وہ دو کوڑی کا ذلیل مزدور ہوتا نہ یہ وقت آتا۔

ساری عمر کا سرمایہ سیٹھانی نے لوٹ لیا اور کھولی سے نکال باہر کیا جیسے گنے کا رس چوس لینے کے بعد گنا بیکار ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی گوپی سیٹھانی کے لئے ناکارہ ہو گیا تھا۔ وہ رات اس نے سوامی کے جھونپڑے کی ننگی دہلیز پر تڑپتے گذار دی۔

دوسرے دن سوامی سے اکنی اُدھار مانگ کر اس نے چنے کھائے۔ ہڑتال برابر جاری تھی۔ روزانہ مل مالک دھمکیاں دیتا۔ کام سے الگ کر دینے کا اعلان کرتا مگر ہڑتالی مزدور مزے سے بھوکے بیٹھے مستقبل کے سپنے دیکھتے ـــــ ان کے پیٹ جلتے رہیں۔ وہ خود ننگے بھوکے رہیں پرواہ نہیں۔ مگر اپنے بچوں کو بھوک سے روتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سردی میں ان کے جسموں کو اکڑتا دیکھنے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ ظلم کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کہاں تک بے زبان جانوروں کی طرح چپ رہیں۔ کب تک صبر کریں۔ بڑھتے ہوئے بوجھ کو کب تک ڈھوتے پھریں۔ وہ سوچتے تھے خواہ کچھ ہو جائے ایک بار پوری قوت سے ہر تکلیف کو سہہ کے بڑی ہڑتال کریں گے۔ چاہے جان جائے یا رہے۔ بلا سے روز روز مرنا تو نہیں پڑے گا۔ اور سُرخ جھنڈے والے ان کی ہمت بڑھاتے، ان کو تسلی دیتے، ان کے زخموں پر پھاہا رکھتے اور مستقبل کی خوشگوار زندگی کا خاکہ دکھا کر ان کا عزم مضبوط کرتے جاتے۔

گوپی سب سے پیش پیش تھا۔ وہ ہڑتال کر کے، مطالبات منوا کے سیٹھانی سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ گھنٹوں سوچتا کہ ہڑتال سے سیٹھانی کو کیا تعلق! مگر اس کا دل کہتا نہیں سیٹھانی سے انتقام لینے کے لئے ہڑتال ضروری ہے اور وہ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ہر جلسہ میں وہ برابر شریک ہوتا۔ صراحی گلاس لئے مزدوروں کو پانی پلاتا پھرتا۔ اور جب جلسہ ختم ہو جاتا تو ہڑتالیوں کے درمیان بیٹھ کے جلسہ کی تقریروں پر پُرجوش انداز سے بحث کرتا۔ انہی باتوں سے خوش ہو کر سوامی اور رام بھرو سے اس کو تین تین پیسے روز دیا کرتے تھے اور اکنی اس کا پیٹ پال رہی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ چنے لینا بھی بھول جاتا اور شام تک اکنی اس کی جیب میں پڑی رہتی۔

وہ دن بھی آیا جب ہڑتالیوں کا لمبا جلوس بڑی آن سے نکلا۔ گوپی کو سب سے آگے رکھا گیا تھا اور احمریں پرچم اس کے سر پہ لہرا رہا تھا۔ جیسے جیسے پرچم ہوا میں ہلکورے لیتا ویسے ویسے مزدوروں کے چہروں پر خوشی کا رنگ لہریں مارتا۔

سڑک کے موڑ پر پہونچ کر گوپی نے سیٹھ کی دوکان کے پاس سے گذرتے ہوئے اکڑا کر سیٹھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ جب گوپی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیٹھ مخبوط الحواس، دوکان بند کر کے تالا لگا رہا تھا ـــــ خوشی کی ایک لہر گوپی کے جسم میں سر سے پیر تک دوڑ گئی۔ حوصلے سمجھا سمجھا کر قدم بڑھا رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا اب تنخواہ بڑھتے کیا دیر لگتی ہے۔ سیٹھانی نے بے ایمانی کی تو کیا ہوا۔ وہ پھر اپنی شادی کے لئے پیسہ اکٹھا کرے گا۔ اس کو ایک ساتھی کی بڑی شدید ضرورت تھی جو بڑی رات تک اس کا انتظار کرے، اس کے اُلجھے بالوں میں ٹھنڈی پتلی انگلیاں پھیرے اس کے دُکھ درد میں آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اس کو دلاسا دے، آس بندھائے۔ اور یہ سوچ سوچ کر اس کی بھوک مٹ گئی۔ قدم جم کر پڑنے لگے۔ اس نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں کو مسکرا کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "تیز تیز قدموں سے بڑھے چلو ـــــ دیکھتے نہیں اس شاہراہ کے آخری سرے پر کتنی حسین دُلہنیں مچھی ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ آؤ آؤ، بڑھے چلو۔ کیا روشن مستقبل کے لئے تم تیز قدم بھی نہیں ڈال سکتے۔ کب تک تین کوڑی کے مزدور بن کر سیٹھانیوں کے ہاتھ بکتے رہو گے" اور اس کے ساتھی تیز قدموں سے چلنے لگے ـــــ سیٹھ تالا لگا کر ایک ہاتھ سے باریک دھوتی کا ندیں صاف کرتے تالو پر گلابی پگڑی چپکائے کھڑا تھا ـــــ اور جلوس بڑھ رہا تھا۔

جلوس کے سامنے پولیس کے دستے آگئے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹ پڑا۔ گوپی نے گھبرا کر ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اور جھنڈے کو پوری طاقت سے بھینچ کر پیچھے ہٹا ــــ

"ہٹ جاؤ" پولیس ایک خوفناک شیر کی طرح دہاڑ رہی تھی۔

"ہم نہیں ہٹیں گے" جلوس بپھر گیا۔

وہ سب اپنا حق مانگ رہے تھے مگر حق و انصاف اشک آور گیس اور لاٹھیوں سے دُور نہ معلوم کہاں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ وہ کارخانہ کے مالک سے انصاف ہی تو چاہتے تھے۔ وہ اپنی حکومت سے زندہ رہنے کا حق مانگ رہے تھے۔ جینے کی آزادی ــــ ظلم کے خلاف ایک بھرپور نعرہ ہی تو تھا یہ جلوس ــــ گوپی سمجھتا تھا کہ یہاں تو ظلم کے خلاف زبان بھی ہلانے کی اجازت نہیں ہے۔ ظلم کی لاٹھی ہر وقت عوام کے سر پر سوار ہو کے حکومت کرتی ہے۔

سنسناتی ہوئی گولی اس کے سینے میں دھنس گئی اور لڑکھڑاتا ہوا گوپی زمین پر لیٹ گیا۔ سوامی ہیبت زدہ ہو کے اس پر جھک گیا۔ دم توڑتے ہوئے انسان کو سوامی بھگوان کی یاد دلا رہا تھا "رام رام کرو بھیا"

"رام ..... آں ..... ہاں" شاہراہ کا آخری سہارا اس کو اشارے کرنے لگا ــــ اس کے تصور میں جھلکتی ہوئی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے ہونٹ اُبھرے اور ڈوب گئے۔ گوپی کے خون سے تربتر جھنڈا اس کے پہلو میں پڑا تھا۔ اس نے ایک نظر سوامی پر ڈالی اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

رام بھروسے نے بڑھ کر گوپی کی لاش کو کندھے پر ڈال لیا اور سوامی نے جھنڈا تھام لیا جس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ رام بھروسے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے دوش پر اپنا جنازہ اٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ گوپی کے ساتھ اور چار لاشیں اُٹھیں۔ سامنے پولیس کا آدمی اپنی دونالی پر تاؤ دے رہا تھا اور خاکی وردی غرور سے تن گئی تھی۔

دوسرے روز بہت سے کھادی پوش مزدوروں کو بہلا پھسلا رہے تھے۔ ان میں سیٹھ کا منجھلا لڑکا بھی شریک تھا اور مزدوروں کو مشورہ دے رہا تھا کہ ہڑتال ختم کر دیں۔ تاریخی ہڑتال کا افسوسناک طریقہ پر خاتمہ ہو گیا۔ مزدوروں کے نام نہاد لیڈروں نے خود بڑھ کے ان کا گلا دبا دیا۔

سوامی سوچنے لگا نہ معلوم کب تک ہمارے غصب شدہ حقوق واپس نہیں دیئے جائیں گے۔ کب تک بچے بھوکے مریں گے۔ کب تک پہاڑ کے سینے کو آہنی گولیاں توڑتی رہیں گی۔ کب تک طوفان کے آگے خاکی وردیوں کا بند ٹھیر سکے گا ــــ ؟ کب تک گولیوں سے انسانیت کو چپ کرایا جائیگا ــــ ؟

سیٹھ کا چھوٹا بیٹا سوامی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

"تم دیکھ لینا سوامی! شہیدوں کے سُرخ لہو سے نئی زندگی پیدا ہو گی۔ ہماری زندگی کچلی نہیں جا سکتی۔ ہم کو روندا نہیں جا سکتا۔"

اور سوامی سنسناتی گولیوں سے لاپرواہ ہو کر مضبوط لہجے میں بولا ــــ

"ہم اپنا حق ضرور منوائیں گے ــــ ہم پھر بڑی ہڑتال کریں گے ــــ ہڑتال!"

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

دو امریکی نظمیں

(مندرجہ ذیل دونوں نظمیں امریکہ کے دو حبشی شاعروں کی تخلیقات ہیں)

فرانسس ای ہاڈیم

حکمران طبقے کی عورتوں سے خطاب

ارمنی خاتون کی غمگین آنکھوں کے لئے
اپنے ویرانے گھر میں جو بے اشکبار
آہیں بھر سکتی ہو تم!

ہاں مگر یہ تو سنو
درد کی سرگوشیاں
غم میں ڈوبی ہچکیاں
اٹھ رہی ہیں جو ہماری سرزمیں ہی کے جنوبی خطے سے
دل شکستہ عورتوں کی آہ وزاری بھی سنو
رو رہی ہیں جو کہ اپنے زخمیوں کے واسطے
ان اقارب کے لئے
جسم ہیں جن کے اذیت سے نڈھال
ان عزیزوں کے لئے
خونِ ناحق سے زمیں جن کے ہوئی ہے لالہ فام!

اے مری بہنو ـــــ مراعت یافتہ بہنو سنو
کیا تم اس ظلم و تشدد پر بیاں دینے کے قابل بھی نہیں؟
کر نہیں سکتی ہو کیا تم اس جبر پر، انصاف کی غارتگری پر احتجاج؟
کیا تمہارے پاس اک آنسو کا قطرہ بھی نہیں
ایسی ماؤں کے لئے
زندگی جن کی اجیرن ہو گئی
کرب و نفرت، خوف کے سایوں تلے؟

اے مری اچھی طرح محفوظ بہنو آہ وزاری مت کرو
حبشیوں ہی کے لئے صرف آہ وزاری مت کرو
بلکہ رو تم اپنے بیٹوں کے لئے!
آج جو زہر اور کانٹے بو رہے ہیں ان کے باپ
کل تمہارے بیٹے کاٹیں گے اسی کی فصل
پک جانے کے بعد!!

جیمس میڈیسن بل

آزادی

یہ جادو ـــــ یہ کتنا بڑا سحر اے حریت ہے
تری اک چمکتی ہوئی مسکراہٹ
بدل سکتی ہے غم سے چور اور پژمردہ حلقہ بگوشوں کی قسمت
اور ان کی بھنویں جگمگا سکتی ہے تو
امیدوں سے، اور غیر فانی مقدس اُمیدوں کی ضوباریوں سے
اور ان کی جوانی جو کفنائی ہوتی ہے تاریکیوں میں
اور افسردگی کے کفن میں
تری آمد اُس میں نئی روح اور اک نئی زندگی پھونکتی ہے
نئے عزم سے اس کو سرشار کرتی ہے تاکہ
ترے آتے ہی نوچ کر پھینکدے اپنی بے کیفیوں کا لبادہ
غلامی کی ہر ایک زنجیر سے خود کو آزاد کرلے!

کوئی قوتِ جابرانہ
کچل ہی نہیں سکتی اس روح کی عظمتوں کو
جسے تیری وجد آفریں اور نوخیز کرنوں نے روشن کیا ہو
ذلیل اقتداروں کی ابلیسیت لمحہ دم ہوتی ہے آمد پہ تیری
کہ جس طرح تاریکیٔ شب سحر کو!

یونہی اور آگے ـــــ یونہی اور آگے
مری ملکۂ بے نظیر و عدیم المثال اور آگے بڑھی چل
صداقت اور انصاف کے ساتھ آگے بڑھی چل
یونہی قطب تا قطب سورج سے سورج تلک
نہ تو اس جنوبی زمین پہ ٹھہر جو
ہمارا وطن ہے۔
بدن جس کا ناسور ہے، اور زخموں سے ہے چور اتنا
کہ دریا رواں ہیں لہو کے
نہ تو ہو سکونت پذیر ایک ہی قوم کی یا قبیلہ کی حد بندیوں میں
سفر جاری رکھ اپنا اور یوں ہی آگے بڑھی چل
ہے منزل تری آدمیت
کہ مرکز ترا آدمی ہے
کہ مقصد ترا آدمی ہے

وہ چاہے کسی ملک کا ہو
کسی رنگ کا ہو
وہ جو بھی زباں بولتا ہو
وہ چاہے کسی نسل کا ہو
کسی قوم کا ہو
ہر اک آدمی جو کہ اس چرخ کی نیلگوں وسعتوں کے تلے رہ رہا ہے
اسے اپنی نوخیز اور جگمگاتی ہوئی مسکراہٹ سے سرشار کردے
بغلگیر کرے
گلے سے لگالے
یہاں تک ـــــ
نہ باقی رہے اس جہاں میں
کوئی بھی غلام اور مظلوم انساں!!

مترجمہ: کمال احمد صدیقی

جائزے

دیوندر اسر

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

"جو مرنہ سکے" عبداللہ ملک ۔ ضخامت ۱۹۶ ۔ ۳۰×۲۰ کے ۱۶۰ صفحے ۔ قیمت دو روپے ۔ ناشر الحمید لاہور

"جو مرنہ سکے" دنیا کے چند نامور ترقی پسند شہید ادیبوں کی زندگی کے خاکے ہیں جنھیں ترقی پسند ادیب عبداللہ ملک نے سپرد قلم کیا ہے ۔ ترقی پسند نظریہ اور عمل کی یگانگت میں ترقی پسند فن اور ادب کی قوت اور پائندگی کا راز مضمر ہے ۔ "جو مرنہ سکے" اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے ۔ "ادب اور سیاست" کے باہمی رشتے کی بحثیں بہت طویل ہیں اور بعض اوقات خشک بھی ۔ لیکن ترقی پسند دانشوروں نے انسانی سماج کو بہتر اور خوش حال بنانے کے لئے ہنستے ہنستے اپنی زندگی قربان کرکے اس رشتے کو اتنا استوار کر دیا ہے کہ ادب اور سیاست کو دو علیحدہ خانوں میں رکھنے کی تمام کوششیں بے کار اور فضول دکھائی دیتی ہیں ۔ اس نظریاتی تناظر کے مدنظر "جو مرنہ سکے" کی اہمیت اور بھی اہم ہو جاتی ہے ۔ جیولس فیوچک ۔ رالف فاکس ۔ آنری پیری ۔ ڈیوڈ گیٹ جیسے عظیم فن کاروں کی زندگیاں ترقی پسند ادب کی تخلیق ۔ نئی انسانی سماج کی تعمیر اور اعلیٰ وارفع اقدار کی اشاعت کی خاطر فاشسٹ درندوں کی نذر ہو گئیں ۔ "جو مرنہ سکے" ان ہی ادیبوں کی زندگی کی جاندار تصویریں ہیں ۔ جنھیں عبداللہ ملک نے کمال صداقت اور فن کارانہ جانکدستی سے پیش کیا ہے ۔ عبداللہ ملک کا انداز تحریر ان سوانحی خاکوں میں بہت نکھر گیا ہے ۔ فیوچک فاکس ۔ گیٹ ۔ پیری اندچین کے ترقی پسند ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی مختصر سوانح حیات اور ان کی ادبی تخلیقات کا تذکرہ پیش کرکے عبداللہ ملک نے ان سوانحی تصانیف کی پستی کو بے نقاب کر دیا ہے ۔ جو چند چٹپٹی باتوں کو بیان کرکے مارکیٹ میں لائی جاتی ہیں ۔ "جو مرنہ سکے" ان ادیبوں کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے جو جمہوریت اور امن کے تحفظ کے لئے اپنے خون سے ایک ایسی لافانی تحریر لکھ گئے ہیں جو انسانی عظمت کی لازوال دستاویز ہے ۔ زیر نظر کتاب نہ صرف عظیم انسانوں کے سوانحی خاکے ہیں بلکہ ان کروڑوں انسانوں کے لئے انسپریشن کا منبع ہیں جو ان باشعور انسانوں کی مانند عظیم ہیں ۔ "جو مرنہ سکے" ایک فرد ۔ ہیرو اور تاریخ کے رشتے سے مارکسی نظریہ کی زندہ تعبیر ہے ۔ جس کا مطالعہ ہر ایماندار قاری کو لازوال عظمت کی جانب ایک قدم اور آگے لے جائیگا ۔

○

"بیس ہزار چراغ" رپورتاژ ۔ فکر تونسوی ۔ ضخامت ۱۶۰ ۔ ۳۰×۲۰ کے ۸۰ صفحات ۔ قیمت نو آنے ۔ ناشر ہمالہ پبلشرز ۔ رینک بازار ۔ جالندھر

"بیس ہزار چراغ" فکر تونسوی کا تحریر کردہ رپورتاژ ہے جس میں فکر تونسوی نے ان بیس ہزار مزدوروں کی عظیم محنت کی داستان بیان کی ہے جو ملک کی تعمیری سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں لیکن اس تعمیر کے ثمرے خود فیضیاب نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقے کے افراد اور ان کے ایجنٹ ان مزدوروں کے استحصال پر اپنے ایوان تعمیر کر رہے ہیں ۔ رپورتاژ موجودہ طبقاتی سماج کے معاشی رشتوں کو بے نقاب کرتا ہے ۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ مزدوروں کی کاہلی اور سستی کو کوسنے والے انجینیر اور ٹھیکیدار کس طرح قومی دولت کو ہڑپ کر رہے ہیں ۔ اور تعمیر کی جانب نہیں بلکہ تخریب کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ کیوں مزدوروں میں وہ INCENTIVE نہیں جس کے لئے بورژوا ماہر معاشیات دن رات چیخ رہے ہیں ۔ یہ INCENTIVE صرف اشتراکی سماج میں ہی ممکن ہے جبکہ وہ شعوری طور پر ملک کی تعمیر میں حصہ لیں گے اور خود ہی اس کے ثمرے خوشحال زندگی بسر کریں گے ۔ جہاں تک موجودہ سماجی رشتوں کے اندر لوٹ کھسوٹ کے بے نقاب کرنے کا تعلق ہے فکر اس میں کامیاب رہے ہیں ۔ لیکن خارجی رشتوں کے علاوہ ان رشتوں سے پروردہ نفسیات کو اور زیادہ گہرائی سے پیش کیا جاتا تو رپورتاژ کے تاثر میں اضافہ ہو جاتا ۔ رپورتاژ کو دلچسپ بنانے کی کوشش بھی کم کی گئی ہے اور ڈرامائی انداز کا فقدان ہے ۔ واقعات کے انتخاب میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت تھی ۔ رپورتاژ میں یہ خامیاں اگر دور کی جاتیں تو مواد کے ساتھ ساتھ رپورتاژ فن کے لحاظ سے اور زیادہ بلند ہوتا ۔

فکر نے نو آنہ والی سستی کتابوں کا سلسلہ شروع کرکے عوامی ادب کے اقتصادی پہلو کو حل کرنے کی کوشش کا مفید تجربہ کیا ہے ۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کتاب ہے ۔

سالنامہ ملا

آپ کے سالنامے کے بارے میں اپنی رائے نہ لکھ سکا تفصیلی رائے لکھنے کی فرصت نہ ملی اور محض رسمی ستائش سے کوئی فائدہ نہیں۔ بہرکیف اتنا تو ضرور کہوں گا کہ آج کل جب ترقی پسند پرچوں کا قحط ہے آپ شاہراہ کے ذریعے ہماری تحریک کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ یہ خود اتنی بڑی خدمت ہے کہ جس طرح بھی ہو اسکو جاری رکھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم (علیگڈھ)

شاہراہ کا سالنامہ تمام و کمال پڑھ ڈالا۔ پسند آیا۔ اس کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔ سجاد ظہیر کا مضمون ایک بڑی اہم ضرورت پوری کرتا ہے، مجھے خاص طور سے اس لئے پسند آیا کہ میں بھی اسی نقطۂ نظر کا حامی رہا ہوں۔ جب تک ماضی کی تہذیبی زندگی کے متعلق ہمارا رویہ درست نہ ہوگا مستقبل کی تعمیر ٹھیک نہ ہوگی ماضی کی پرکھ تنقید کا بڑا اہم مسئلہ ہے جس کی طرف سے بڑا غفلت برتی گئی ہے۔ اس سے کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ترقی پسندوں کو ماضی سے نفرت ہے۔ بہرحال ابھی وقت نہیں گیا ہے۔ اگر سجاد ظہیر کا مضمون غور سے پڑھا گیا تو نقاد اپنی سہل انکاری چھوڑ کر ادب کی بنیادوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور ادبی تنقید کی سائنٹفک بنیادیں مضبوط ہوں گی۔

ممتاز حسین کا مقالہ نیا ادبی فن اُن کے دوسرے مضامین کی طرح بلند پایہ ہے۔ ادھر انھوں نے جو نظریاتی مضامین لکھے ہیں اُن میں کئی جگہ باتیں دہرادی گئی ہیں لیکن وہ اتنی مفید ہیں کہ اُن کا دُہرایا جانا قابلِ اعتراض نہیں۔ یہ مضمون بہت واضح، سلجھا ہوا اور غور طلب ہے۔ کاش اُردو میں چند نقاد ایسے ہی اور ہوتے۔

محمد حسن نے جدید اُردو شاعری کا جائزہ مختصر جگہ میں چابکدستی سے لیا ہے اور جدید شاعروں کی برسرِ پیکار نظریاتی الجھنوں کو بے نقاب کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ موضوع تفصیل کا مطالبہ کرتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک اہم ناول کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے اس کی بعض خوبیوں کو بھی دیکھا ہے ورنہ بعض نقادوں نے تو اُسے اُن کے افسانوں کی طرح تخیلی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔

نظموں اور غزلوں میں اچھی اور معمولی سبھی چیزیں ہیں بعض اچھے اور مشہور شاعروں کی معمولی اور بعض اُبھرتے ہوئے شاعروں کی اچھی۔ مگر مجموعی حیثیت سے یہ حصہ بھی سالنامہ کے شایانِ شان ہے۔

کئی افسانے بہت اچھے ہیں اور اس دفعہ بھی کرشن چندر کا افسانہ "گل سرسبد" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جتنا رنگین ہے اتنا ہی پُراثر، کوئی معمولی افسانہ نگار بمبئی کی پھول بیچنے والی چینی لڑکی کو کودیا بھیجتا تو بات نہ بنتی۔ لیکن کرشن نے آہستہ آہستہ کہانی میں وہ فضا تیار کرلی جس میں یہ بات کھپ جاتی ہے۔ مجھے انور، جوگندر پال، شوکت صدیقی، حمید اختر اور پریم ناتھ پنڈت کے افسانے بھی پسند آئے۔ ہر ایک میں زندگی کو کہانی کے روپ میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

بین الاقوامی ادبی انتخاب کا سلسلہ شاہراہ کی ایسی خصوصیت ہے جس کو میں نے ہمیشہ پسند کیا ہے۔ اگر کبھی کبھی ان شعراء کے متعلق دس پندرہ سطروں میں متعارف بھی کرا دیا جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

کمال صدیقی کے تبصرے مناسب اور موزوں ہیں۔ اب شاید کوئی پوچھے کہ پھر اس سالنامے میں کوئی کمی بھی ہے، تو میں کہوں گا کہ ہاں اس سے بہتر چیزیں منتخب کی جاسکتی تھیں لیکن اس وقت کہ جب بہت سے ادیب اور شاعر لکھنے سے جان چرا رہے ہیں (اور میں اس سے مستثنیٰ نہیں ہوں) اتنے اچھے مضامین اکٹھا کر لینا بہت بڑی بات ہے۔

احتشام حسین (لکھنؤ)

سالنامہ خوب نکلا۔ سجاد ظہیر اور احمد ندیم قاسمی کے مقالات بہت پسند آئے۔ شکریہ کہ بھٹکے ہوئے ساتھی برادرانہ سمجھوتے کی "شاہراہ" پر پھر واپس آرہے ہیں..... آپ اب تک دہلی سے اُردو کا اتنا اچھا ماہنامہ نکالتے ہیں۔ کمال ہے۔ اس خدمت کے لئے اُردو آپ کا احسان کبھی نہ بھولے گی ایک ماہنامے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ آپ کو کون کون سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ پھر بھی آپ مردانہ وار ان کا سامنا کئے جا رہے ہیں۔ آپ کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ شاہراہ زندہ باد۔

خواجہ احمد عباس (بمبئی)

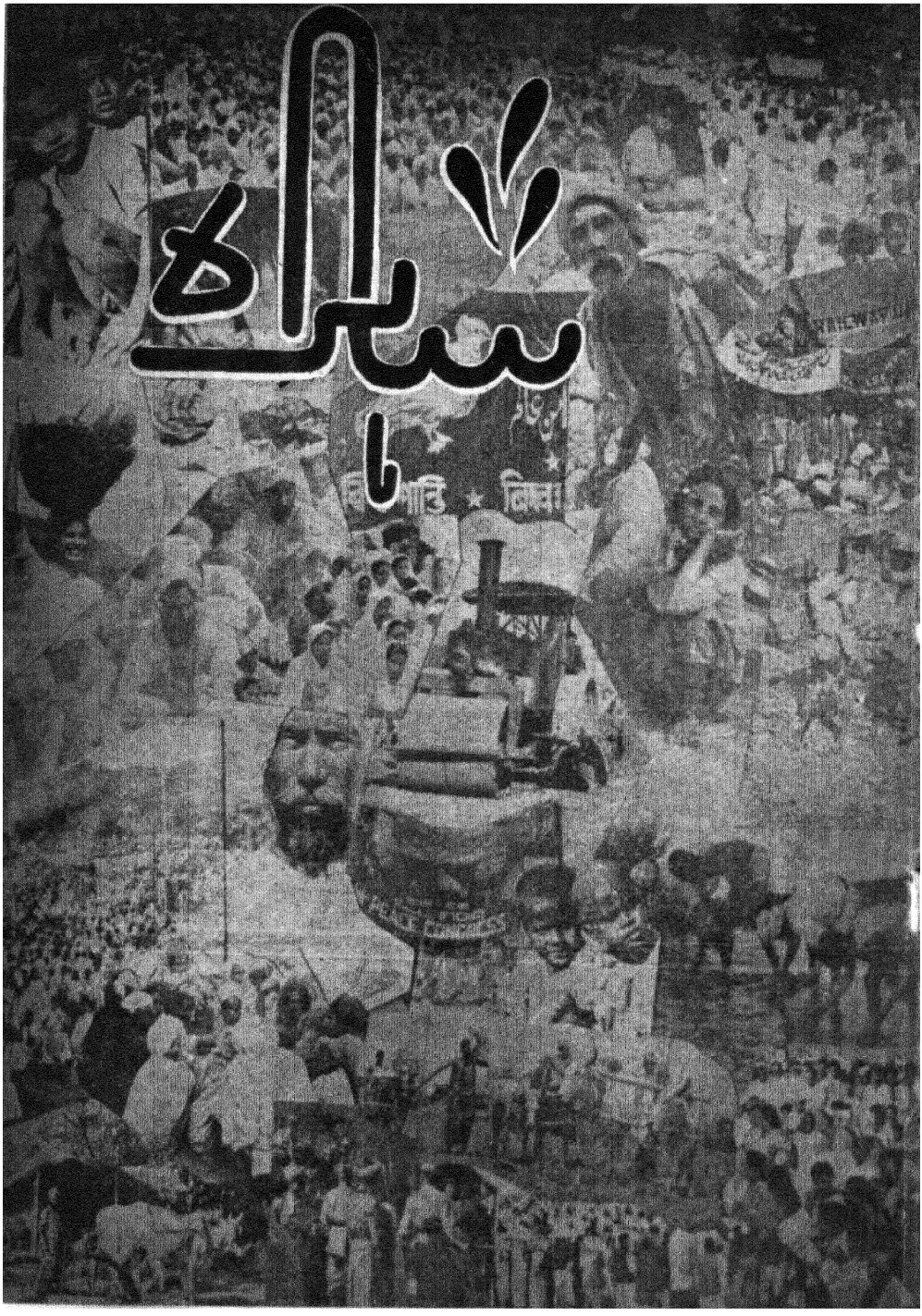
سلاک
ما

آپکے محبوب فن کاروں کی کتابیں - - - - - افسانہ - ناول - نظم

طلسم خیال	کرشن چندر دو روپے	ماں	میکسم گورکی ساتھ روپے
کشمیر کی کہانیاں	" تین روپے	قلی	ملک راج آنند چھ روپے آٹھ آنے
ٹوٹے ہوئے تارے	" دو روپے		ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ
زندگی کے موڑ پر	" دو روپے		آر۔ ایل۔ سٹونسن ایک روپے
ہوائی قلعے	" دو روپے چار آنے	سیب کا درخت	گالزوردی ایک روپیہ
تین غنڈے	" دو روپے آٹھ آنے	چغد	سعادت حسن منٹو تین روپے چار آنے
سمندر دور ہے	" دو روپے بارہ آنے	کلنک	سرلا دیوی دو روپے بارہ آنے
شکست	" تین روپے	دھانی بانکیں	عصمت چغتائی ایک روپیہ
نئے زاویے جلد دوم	" چھ روپے	چوٹیں	" تین روپے
ایک گرجا ایک خندق	" تین روپے آٹھ آنے	کلیاں	" تین روپے آٹھ آنے
صبح ہونے تک	" دو روپے چار آنے	امن کا ستارہ	سردار جعفری ایک روپیہ چار آنے
میں کون ہوں	خواجہ احمد عباس تین روپے	خون کی لکیر	" تین روپے آٹھ آنے
سنگ و خشت	کنہیا لال کپور دو روپے	نئی دنیا کو سلام	" تین روپے
نوک نشتر	" دو روپے آٹھ آنے	تلخیاں	ساحر لدھیانوی تین روپے آٹھ آنے
شیشہ و تیشہ	" دو روپے	تلاطم	مخمور جالندھری دو روپے آٹھ آنے
چنگ و رباب	" دو روپے آٹھ آنے	گنجینہ	یگانہ تین روپے آٹھ آنے
مادام بوری	فلابیئر چھ روپے	ساز لرزاں	غلام ربانی تاباں دو روپے آٹھ آنے
تارو پود	بلونت سنگھ تین روپے	دستک	نریش کمار شاد دو روپے
سہرا دیس	" چار روپے	جنون و حکمت	جوش ملیح آبادی ایک روپیہ
آخری سلام	کرسٹفر اشروڈ چار روپے آٹھ آنے	فکر و نشاط	" دو روپے آٹھ آنے
ایسی بلندی ایسی پستی		روح ادب	" دو روپے
	عزیز احمد چار روپے	نقش و نگار	" تین روپے آٹھ آنے
گریز	" چار روپے آٹھ آنے	عرش و فرش	" چار روپے
رقص ناتمام	" تین روپے آٹھ آنے	حسین اور انقلاب	" ایک روپیہ

مکتبہ شاہراہ - اردو بازار - دہلی

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

جولائی
۱۹۵۱
قیمت بارہ آنے

سالانہ نو روپے
ششماہی پانچ روپے

مکتبہ شاہراہ ○ دہلی ۶

فہرست

راہ نما — ادارہ، ۳

امن کنونشن کی رپورٹ — خواجہ احمد عباس، ۵

مقالے

غزل اور نظم — ڈاکٹر اعجاز حسین، ۷

وجود پرستی کا مسئلہ اور اسکا طبقاتی مفہوم — ندیم مشہدی، ۱۲

نظمیں

آوازِ آدم — سلمیٰ ردھیانوی، ۱۹

پاکستانی ادیبوں کی گرفتاری پر — غلام ربانی تاباں، ۲۰

امن کی راہ پر — نیاز حیدر، ۲۱

چاند کے راہی سے — فارغ بخاری، ۲۵

صبح ہونے پر — بلراج کومل، ۲۶

دل بہلتا ہی نہیں — راشد حیدرآبادی، ۲۷

غزلیں، گیت

مجروح سلطانپوری، ۲۸

ظہور نظر، ۲۹

عابد حشری، ۲۹

مسعود حسین، ۳۰

افسانے خاکے

آسمانی تلوار — خواجہ احمد عباس، ۳۱

کمین — سنتوکھ سنگھ دھیر، ۳۶

مانگتے ہیں روٹی دیتے ہیں گولیاں — نویتیج، ۴۰

سٹ ہیڈی — زکی انور، ۴۲

کہاسہ — بلاراج بخشی داس بخشی، ۵۱

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک تلنگی نظم، ۵۷

جائزے

۵۰ کا بہترین ادب (سمپادک جنہی) پرکاش پنڈت — فکر تونسوی، ۵۸

ماہنامہ پائیل دہلی — فکر تونسوی، ۵۹

حکومت ہند سے امن کنونشن کا مطالبہ، ۶۰

○ پبلشر، منشی عبدالقدیر، مکتبہ شاہراہ دہلی

○ پرنٹر، کھنہ پیٹو پریس، دہلی

راہنما

ادارہ

"بنیادی حقوق سے متعلق دفعہ کا کوئی بھی حصہ چاہو قانون پر حاوی نہ ہوگا۔ اگر یہ چاہو قانون ملک کی حفاظت، پبلک امن اور غیر ملکوں کے ساتھ تعلقات کے پیش نظر کسی پر کوئی پابندی عائد کرے۔ خاص طور سے یہ قانون، اگر جرم کی ترغیب دینے کے سلسلہ میں کسی پر پابندی لگاتا ہے تو بنیادی حقوق والی دفعہ اس پر عائد نہ ہوگی۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جو پچھلے دنوں حکومت ہند کے وزیر آئین شری امبیدکر نے نئے دستور میں ترمیم کے طور پر کہے اور پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے نئے دستور میں دیئے گئے بنیادی حقوق کی رو سے سیفٹی ایکٹ اور پریس ایکٹ ایسے قوانین کو مفلوج کر دیا ہے چنانچہ یہ ترمیم ان قوانین کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے عمل میں لائی جا رہی ہے۔

ان قوانین کو از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہے، اس بات پر غور کرنے سے پہلے اگر ہم ان ایام پر نگاہ ڈالیں جب گذشتہ برس ماہ جنوری میں ہندوستان کو ایک جمہوری ملک کہا گیا اور نیا دستور بنایا گیا اور کچھ بنیادی حقوق دینے کا اعلان کیا گیا اور عوام کو اس پر پھولے نہ سمانے کی تلقین کی گئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ نئے دستور میں دیئے گئے وہ بنیادی حقوق یا تو دھوکہ محض تھے یا نیم بیداری کی حالت میں دستور میں شامل کر لئے گئے تھے۔

سب سے اہم بنیادی حق گذر بسر کے لئے کام اور خوراک کی گارنٹی کا تو خیر نئے دستور میں ذکر تک ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن جنوری ۱۹۵۰ء کے بعد کے واقعات سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ تحریر و تقریر کی آزادی کا جو ذکر نئے دستور میں موجود ہے وہ ذکر تک ہی محدود ہے اور اس کا بین ثبوت وہ عتاب ہے جو اس دوران میں سچی بات کہنے اور لکھنے والوں پر نازل ہوا۔ اور بیسیوں آزادی پسند اور امن دوست ادیب پکڑ پکڑ جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے اور پریس کے گلے پر پہلے ہی کی طرح چھری لٹکتی رہی۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد جب لوگوں نے اس نئے دستور کا خورد بینی سے مطالعہ کیا اور دیکھا کہ دستور میں اس طرح کی لٹھ بازی کی کچھ کم ہی گنجائش ہے تو ان میں سے چند ایک نے جو حکومت کے اس عتاب کا شکار ہو چکے تھے اور خود کو بے دست و پا محسوس کر رہے تھے کسی طرح بڑے بڑے اخراجات برداشت کئے اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نتیجہ کے طور پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کو ان کے حق میں فیصلے دینے پڑے۔

پندرہ ماہ تک یہ کالے قانون ایک طرح سے بے کار رہے اور حکومت اپنے کئے پر پچھتاتی رہی اور پیچ و تاب کھاتی رہی اور آخرکار پنڈت جواہر لال نہرو کے ذریعے تمام کیبنٹ کے منظور کردہ دستور میں ترمیم کا بل پیش ہوگیا اور شیام پرشاد مکرجی اور آچاریہ کرپلانی کی مخالفت پر چیں بہ جبیں ہو کر پنڈت جی گرجے:۔

"آپ غلط ہیں ـــــ میں آپ کو للکارتا ہوں۔ میں ہر کسی کو للکارتا ہوں اور بار بار دہراتا ہوں کہ جو کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم اس ترمیم کے ذریعے پریس کی آزادی کم کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹ کہتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ کہتا ہے" اور بل پاس ہوگیا اور سارا ملک اور سارا پریس جھوٹوں کی قطار میں کھڑا ہوگیا نیشنل ہیرلڈ، ٹائمز، ہندوستان ٹائمز، بمبئی کرانیکل، فری پریس جنرل، یہ سب جھوٹ بولنے لگے اور سب سے زیادہ جھوٹ پارلیمنٹ کے ممبر اور ایڈیٹروں کی کل ہند انجمن کے صدر لالہ دیش بندھو گپتا بولے "یہ بل پریس کی آزادی

کے بنیادی حقوق کو، جن کی گارنٹی نئے دستور نے دی تھی، بالکل ملیامیٹ کر دیتا ہے۔"

جنوری ۱۹۵۰ء کے منظور کردہ دستور کے مطابق پریس کی آزادی کے سلسلہ میں صرف تشدد کی ترغیب و تلقین ہی ممنوع تھی۔ لفظ تشدد ایک واضح اور محدود کیفیت کا حامل ہے اور آسانی سے اس کی پرکھ کی جا سکتی ہے۔ لفظ تشدد کی جگہ 'جرم' اور اور "ملکی حفاظت" کی جگہ "پبلک امن" کی ترمیم کر کے ہندوستان کے عوام پر تمام بنیادی حقوق کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ کون سا عمل اور فعل جرم اور جرم کی ترغیب کے زمرے میں آتا ہے اور حکومت کے خیال میں "پبلک امن" کس مفہوم کا حامل ہے یہ سمجھنا ہمیشہ ناممکن رہے گا اور غیر ملکی حکومتوں کے ساتھ دوستانہ مراسم میں دخل اندازی کا ہوّا ہر باشعور باشندے کی جان کا عذاب بنا رہے گا۔

پس ثابت ہوا کہ بنیادی حقوق ایسی چڑیا کا بسیرا اس حکومت میں ممکن نہیں اور نہ ہی کبھی حکومت کا یہ منشا رہا ہے کہ اس کے گھونسلے کے لئے تنکے اکٹھا کرے۔ پریس ایکٹ اور سیفٹی ایکٹ بدستور جاری رہیں گے۔ بلکہ اب تو ان کا احاطہ اور بھی وسیع ہو گیا ہے ـــــ پنڈت جی کے الفاظ میں۔

"حق کی تمام باتیں چالو قانون کے ماتحت رہیں گی کیونکہ ہمیں پریس ایکٹ اور سیفٹی ایکٹ ایسے قانونوں کو بیکار نہیں کرنا ہے۔"

اور انھوں نے یہ بھی منظور کروالیا ہے کہ یہ قانون پندرہ ماہ کے اس زمانہ میں بھی جاری ملنے جائیں گے جس زمانہ میں کسی وجہ سے یہ عمل میں نہ آسکے یعنی گزشتہ پندرہ ماہ کے دوران میں کئے گئے 'جرموں' کی بھی سزا دی جا سکے گی۔

اس ترمیم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بعض ذمہ دار حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ ترمیم ترتیب ترآتے ہوئے انتخابات کی پیش بندی کے طور پر عمل میں لائی گئی ہے تاکہ موجودہ حکومت کو انتخابات جیتنے میں آسانیاں حاصل ہوں اور چونکہ کانگرس اور سرکاری حلقوں میں روز بروز کھینچا تانی بڑھ رہی ہے اور بائیں بازو کی بعض تحریکوں نے بھی انتخابات لڑنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس لئے دستور میں کی گئی ترمیم موجودہ حکومت کو برسر اقتدار رہنے میں بہت سہولت بہم پہنچائے گی۔

وجہ کچھ بھی ہو عوام اسے اپنے بنیادی حقوق پر شدید حملہ تصور کرتے ہیں اور اپنے آپ کو پولیس راج کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے خلاف اپنی مقدس نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جب کبھی برسر اقتدار طبقوں کا مفاد خطرہ میں پڑ جاتا ہے وہ اسی طرح نئے قوانین گھڑ کر یا پرانے قوانین میں ترمیمیں کر کے اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کے قوانین اور ترمیمیں وقتی طور سے چاہے ان کے تمام حقوق سلب کر لیں لیکن مستقبل انھیں کا ہے اور مستقبل اپنے ہاتھوں ایک نیا قانون وضع کر رہا ہے جس میں کوئی ایسا قانون زندہ نہ رہ سکے گا جو عوام کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کا حوصلہ کر سکے۔

"شاہراہ" آپ کا اپنا پرچہ ہے

اپنے پرچے کا ایک نیا ساتھی بنا کر شاہراہ کے تحفظ کی ضمانت دیجئے۔

خواجہ احمد عباس

امن کنونشن

(ایک رپورٹ)

امن پسندوں کا یہ تاریخی اجتماع ہماری جنگِ آزادی کی روایتوں کا علمبردار تھا

سُندر بائی ہال میں کمیونسٹ بھی تھے، فارورڈ بلاک کے اراکین بھی، رجعت پسند بھی تھے اور باشعور بھی، انقلابی بھی نظر آرہے تھے اور کانگریسی بھی

مرقطہ طور پر یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ سی۔ آئی۔ ڈی کا ایجنٹ تھا لیکن اپنی شکل وصورت اور اپنی ہیئت کذائی سے وہ محکمۂ خفیہ پولیس کا ملازم دکھائی دے رہا تھا۔ میں امن کنونشن کے افتتاحی اجلاس میں شریک ہونے کے لئے سُندر بائی ہال کی سیڑھیاں طے کرکے اندر داخل ہو رہا تھا کہ ایک "گم رو" آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس نے غالباً دو روز سے شیو نہیں کیا تھا ——————

چار سو مندوبین

"کیا آپ مجھے ان لوگوں کے نام بتائیں گے جو اس کنونشن میں شریک ہوئے ہیں؟" —— چار سو مندوبین کے نام گنوانا کوئی آسان کام نہیں، اس لئے میں نے ایک ذرا سی ترشی کے ساتھ اسے بتایا کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ میرے اس جواب پر، اس نے اپنے سوال میں تھوڑی سی ترمیم کرلی۔ "کم از کم مجھے ان لوگوں کے نام بتا دیجئے جو کمیونسٹ نہ ہونے کے باوجود اس کنونشن میں شریک ہوئے ہیں۔" جواب میں، میں نے اسے صرف اپنا نام بتایا اور باقی لوگوں کے ناموں کی فہرست کی ترتیب کا کام اس پر چھوڑ کر ہال کے اندر داخل ہو گیا۔

ٹیگور۔ انل بسواس۔ پرتھوی راج

پہلے کی کارروائی ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ اور شرکائے جلسہ خاموشی سے بیٹھے کوی ٹیگور کا گیت سن رہے تھے۔ مشہور میوزک ڈائرکٹر انل بسواس کی آواز سارے ہال میں گونج رہی تھی۔ میں نے اپنے آس پاس کے لوگوں پر نظر ڈالی۔ لیجئے وہاں تو میرا عزیز دوست پرتھوی راج کپور بھی موجود تھا اس نے سر سے پاؤں تک دودھ کی سی سفید کھادی پہن رکھی تھی۔ اور اپنے اس لباس میں وہ یونانیوں کا دیوتا دکھائی دے رہا تھا۔ پرتھوی راج کے علاوہ انڈین اسکرین کا لاثانی کامیڈین ڈیوڈ، ابراہام۔ پروڈیوسر بال چھیبا۔ ڈاکٹر فانی مجمدار، فلم اسٹار رکے۔ این سنگھ اور مایا بینرجی بھی موجود تھے۔

ایک ہی صف میں

ڈائس پر پیسو کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکریٹری اور دوسرے ممتاز کانگریسی بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک کمیونسٹ ایک پادری کے شانے سے شانہ ملائے بیٹھا تھا۔ ایک نیم برہنہ سادھو، ہندوستان کے ایک ممتاز سائنسدان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جنوبی ہندوستان کی ایک مشہور شاعرہ شمالی ہندوستان کے ایک ہندی جریدے کے ایڈیٹر سے تبادلۂ خیال کر رہی تھی۔

بہرحال سُندر بائی ہال آج مختلف اور متضاد قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ امن کے اس جلسے میں کمیونسٹ بھی تھے۔ فارورڈ بلاک کے اراکین بھی رجعت پسند بھی تھے اور باشعور بھی۔ انقلابی —— پی سی جوشی کے ماننے والے، رندیوے کے پیرو، غرض ہر قماش کے لوگ موجود تھے۔ امن

کے مقصد کی خاطر انھوں نے اپنے سارے اختلافات بھلا دیئے تھے۔ مارواڑی ٹریڈ یونین کے کارکن، انتہائی شمال کے خوبصورت کاشمیری، ٹامل ناڈ اور انتہائی جنوب کے کیرلے پیلے لوگ، سبھی ایک صف میں نظر آ رہے تھے۔

امن کی تحریک اور ہمارا شاندار ماضی

اس اجتماع کو دیکھ کر ہندوستان کی تحریک آزادی کی روایات کی یاد تازہ ہوگئی۔ اگر بسواس کا راگ سننے والوں کی آنکھوں میں ہمالوی ٹیگور کی من موہنی صورت پھرنے لگی۔ امرت رائے اپنی اور باپ پریم چند کی نمائندگی کر رہے تھے۔ بابا سوہن سنگھ بھکنا کی سفید ڈاڑھی اور جھکی ہوئی کمر نے امن کی تحریک کا دامن، غدر پارٹی کو مخالف سامراج جدوجہد سے باندھ رکھا تھا۔ کوساسی، ہندوستانی سائنسدانوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ تو ملک راج آنند، ہندوستانی ادیبوں کی۔ ایک طرف کشمیر کا نام، شیخ عبداللہ کی ہمدردیوں کا یقین دلا رہا تھا تو دوسری طرف ـــــ کرنل جی۔ بیس ڈھلن کا پیام خیرسگالی، نیتاجی کے آشیرواد سے کم نہیں تھا۔

جے سوریہ سے سُندرلال تک

اگر ڈاکٹر این جے سوریہ نے اپنی ماتا، سروجنی دیوی کی وسیع القلبی اور انسان دوستی سے امن تحریک کو مالا مال کر دیا ہے تو ڈاکٹر انل کی موجودگی سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وزیراعظم نہرو بھی اس تحریک سے دلی تعلق رکھتے ہیں۔ مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو دیکھ کر۔ جلیانوالہ باغ کے نقوش اُبھرنے لگتے ہیں۔ اور اس تحریک میں انصاری، اجمل خاں اور مظہرالحق کی روح کارفرما نظر آتی ہے ـــــ دبلے پتلے عینک چڑھائے پنڈت سندرلال کی آواز تو سندر باغ ہال پر کالی خاموشی چھا گئی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہم سب باپو کے آگے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ سندرلال کانگرس کے موجودہ رجعت پسند دور میں باپو کی جلائی ہوئی شمع آزادی کو مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچاتا۔ گرتا پڑتا، اتحاد و ترقی کے راستے پر چلا جا رہا ہے۔ سندرلال ہمارے ماضی قریب کا واحد نمائندہ ہے۔

کرشن چندر

اگر اس موقع پر میں اس ہفتے کی شخصیت کرشن چندر کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔ یہ گنجم ہندوستانی ادیب جو کل ہند امن کانگریس کا جنرل سیکریٹری ہے۔ ملک راج آنند اور اپنے چند ساتھیوں کے اشتراک و تعاون سے امن تحریک کو ایک کل جماعتی تحریک بنانے میں کامیاب ہوسکا ہے۔ اسی کی کوششوں سے اس تحریک کو مخلص اور دیانتدار کانگریسیوں کی تائید حاصل ہوئی۔ دس سال کی مدت میں کرشن چندر، رومانی افسانہ نگاروں کی صف سے نکل کر ہندوستان کی ترقی پسند ادب کی تحریک کا لیڈر بن گیا۔ اور وہ آج ملک کے کئی بائیں بازو کے اداروں سے وابستہ اور منسلک ہے۔ کل تک یہ کشمیر کی دلفریبیوں کا ذکر کرکے، زندگی کی تلخ حقیقتوں پر پردہ ڈالا کرتا تھا۔ لیکن آج اس نے تورپا کی جنگ اور اسپین کے مجاہدانِ آزادی کو اپنا موضوع فکر بنایا ہے۔ اس کے باوجود اس کا دل اب بھی رومان سے بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے تو آج ہماری مانگوں کو بڑے پُراثر انداز میں اپنی تحریروں کے ذریعے آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن بعض موقعوں پر وہ ناانصافی کے خلاف احتجاج کرنے میں ادبی قدروں کا بھی پاس نہیں کرتا۔ اس وقت اس کا چہرہ، غصّے سے لال ہو جاتا ہے۔ اب تک اس کی کہانیوں کے بیس مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ وہ اس وقت اردو کا بہت بڑا اسکیچک ہے ـــــ اور اپنے قلم کے ذریعے عوام کو امن کے محاذ پر جمع کر رہا ہے۔

غزل اور نظم

ڈاکٹر اعجاز حسین

ڈاکٹر صاحب نے ایک اہم مسئلہ پر قلم اُٹھایا ہے ہم اس مضمون کو خاص طور سے اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ اس موضوع پر مزید بحث ہو۔ (ادارہ)

اگر غزل میں سیاسی و سماجی عناصر کا غلبہ ہو جائے تو غزل غزل رہے گی یا نظم ہو جائے گی! یہ تھا میرے ایک شاعر دوست کا سوال جس نے مجھے سوچنے اور مضمون لکھنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے دوست نے درحقیقت ایک مخصوص طبقہ کی ذہنی کشمکش کی بے باکی سے ترجمانی کر دی ہے۔ ایک طرف تو یہ مطالبہ ہے کہ غزل کو اگر زندہ رہنا ہے تو اسے اپنا چولا بدلنا پڑے گا۔ رومانیت پسندی کو ترک کر کے سیاسی و اقتصادی شعور کو نمایاں کرنا ہوگا دوسری طرف یہ شور ہے کہ غزل ایام پریت کی نشانی ہے اس مہذب دور میں اس کو مٹا دینا ہی اچھا ہے۔ اگر اس کو قائم رہنا ہے تو نظموں میں اسے پناہ لینی پڑے گی کیونکہ غزل موجودہ ضروریات و رجحانات سے ہم آہنگ نہیں اور اپنے زمانے سے الگ ہو کر چلنا دریا کے دھارے کی مخالفت کرنا ہے اور مخالفت کو خسارہ سمجھ کر محفل سے دُور کر دینا ہی بہتر ہے۔

ان باتوں پر غور کرنے سے ذہن پھر اسی مرکز پر پہنچتا ہے کہ غزل کو بدلنا ضروری ہے اور مصالحت کے لئے اس کی ہیئت کو قائم رکھتے ہوئے مواد کو بدل دیا جائے یعنی خارجی پہلو باقی رہے لیکن داخلی عنصر کو بالکل تبدیل کر دیا جائے اس میں آج کی ضروریات و محسوسات کو زیادہ سے زیادہ پیش کیا جائے اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد پھر وہی اصلی سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو نظم و غزل میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اس ذہنی کشمکش کو دور کرنے کے لئے ہم کو اس سوال پر غور کرنا پڑے گا کہ غزل کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کے بغیر غزل غزل نہیں ہو سکتی اور اس رد و بدل میں اس کو اپنا رکھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر باقی رکھا جا سکتا ہے تو غزل اور نظم کا فرق بھی سمجھ لینا دشوار نہ ہوگا۔

اگر یہ کلیہ ہے کہ کسی صنفِ شاعری کے لئے دو چیزیں ہیئت و مواد ضروری ہیں ان کے بغیر صنفِ سخن کو مخصوص نام نہیں دیا جا سکتا تو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ہیئت و مواد میں زیادہ اہمیت کس عنصر کو حاصل ہے۔ اس بحث کو چھوڑ کر کہ حقیقت کیا ہے اور دوسری زبانوں میں کس عنصر کو فوقیت حاصل ہے۔ ہم کو فی الحال اردو کے اصنافِ سخن پر غور کرنا ہے۔ جہاں تک سمجھ میں آتا ہے اس سے فیصلہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ یہاں مواد سے ہیئت کو اہمیت دی گئی ہے اور اسی بنا پر صنفِ سخن کو مخصوص نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر صنفِ سخن کو ایک خاص مواد سے تعلق رہا ہے مثلاً غزل میں حُسن و عشق کی داستان کا غلبہ رہا ہے۔ مثنوی میں قصہ کہانی کا زور، قصیدہ میں مدح یا ہجو پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی گئی اور رباعی میں اخلاقیات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ لیکن اس نظریہ کو ایسی عمومیت کبھی نصیب نہیں ہوئی جو ہمہ گیر ہو سکتی مواد سے حد بندی ضرور کی گئی لیکن بہت سختی سے اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ جا بجا سے حدیں شکست ہوتی نظر آتی ہیں۔ قطعہ میں جو مضمون نظم کیا جا سکتا ہے وہ رباعی میں بھی پیش کیا گیا۔ رباعی کا مواد قطعہ میں کھپایا جا سکتا ہے۔ غزل کے مضامین قصیدے میں بھی آ سکتے ہیں اور قصیدے کے مضامین غزل میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ مستزاد۔ مخمس۔ مربع۔ مثلث یہ سب اصناف تو صرف ہیئت کے بل بوتے پر قائم ہیں۔ ان کے موضوعات مشترک ہیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوتے رہے ہیں۔ بجز ہیئت کے مواد کی کوئی حد بندی نظر نہیں آتی اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُردو میں ہیئت کو کم از کم اس سلسلہ میں مواد پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اب اگر ہم غزل کی اہمیت پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہاں بھی ہیئت اس کی تشکیل میں زیادہ کارفرما ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مواد اس کے لئے غیر اہم چیز تھی۔ میرے نزدیک اگر کسی صنفِ سخن میں مواد پر خاص توجہ

کی گئی ہے تو غزل اس لحاظ سے سب سے آگے ہے۔

اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کہ غزل کو بدلے ہوئے حالات میں پیش کرنے کے بعد نظم اور غزل میں کیا فرق رہ جائے گا ہم کو غزل کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ ہیئت و مواد پر ساتھ ہی ساتھ نظر ڈالنی پڑے گی۔ ابتدائے آفرینش سے غزل کی ٹکنیک میں بہت کم تبدیلی نظر آتی ہے۔ مواد کا بھی یہی حال ہے۔ ہیئت اس کی روز ازل سے آج تک کم و بیش وہی ہے جو کبھی تھی۔ تسلسل یا عدم تسلسل کو اگر آپ ٹکنیک کا اختلاف کہنا چاہتے ہیں تو ضرور تھا۔ قدیم شعرا کے یہاں تسلسل مقدار میں نسبتاً زیادہ تھا۔ متاخرین کے یہاں کچھ کم اور اب تو قریب قریب نہ ہونے کے برابر ہے۔ کم و زیادہ کی بحث کو نظر انداز کرنے کے بعد غزل کی ہیئت کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ تسلسل کسی دور میں غزل کا رجحان نہیں بن سکا یہاں تک تسلسل کو پیش کرنے وقت شاعر کو کہنا پڑتا تھا کہ یہ اشعار قطعہ بند ہیں خواہ لکھ کر خواہ زبان سے بیان کر کے قارئین و سامعین کو آگاہ کرنا پڑتا تھا کہ یہ چند اشعار مسلسل سمجھے جائیں۔ اس اظہار کی تہہ میں یہ راز تھا کہ غزل کا فطری لگاؤ تسلسل سے نہ تھا۔ پڑھنے والے اور سننے والے دونوں غزل سنتے وقت یہ تصور زیادہ سے زیادہ ذہن میں رکھتے تھے کہ یہاں شعر ایک دوسرے سے الگ ہوں گے۔ ہر شعر اپنی جگہ پر خیال و بیان کے لحاظ سے مکمل ہوگا۔ اس تصور کا اتنا غلبہ تھا کہ شاعر کو اعلان کرنا پڑتا تھا کہ وہ اب سے یہاں تھوڑا سا میں ہٹ گیا ہوں۔ آپ اپنے ذہن کو تھوڑی دیر کے لئے شاہراہ غزل سے ہٹا کر نظم کی طرف موڑ دیجئے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ غالب خصوصیت ہر شعر کا جداگانہ طور پر پیش کرنا تھا۔ اس نکتہ سے صاف واضح ہے کہ غزل میں تسلسل کی گنجائش نہیں ہو سکتی یا اگر ہو سکتی ہے تو بہ تکلف اور بہت کم۔ اس نتیجہ سے اگر آپ متفق ہیں تو یہ کہنے دیجئے کہ غزل نظم کا ایک نمایاں فرق تسلسل و عدم تسلسل تھا اور ہے۔ بایں ہمہ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے وہ اس ایک بات سے حل نہیں ہوتا اس لئے کہ اکثر نظمیں بھی غزل کے انداز میں ایسی ملتی ہیں جو باوجود نظم ہونے کے تسلسل خیال سے عاری ہیں۔ ان کا بھی ہر شعر دوسرے شعر سے الگ ہے پھر اس لحاظ سے ایسی نظموں کو غزل سے کیوں علیحدہ کیا جائے۔ اور اگر نہ علیحدہ کیا جائے تو کیا ادب اس بات کی اجازت دے سکتا ہے کہ غزلوں کو بھی نظم کہا جائے۔ غالباً جواب نفی میں ہوگا اور اس نفی میں اُلجھن اپنی جگہ پر باقی رہ جائے گی۔ اسے دور کرنے کے لئے موضوع و مواد کا سہارا لینا پڑے گا۔ آیئے اب اس کا جائزہ لے لیا جائے۔

غزل اپنے موضوع کے لحاظ سے تو حسن و عشق کے علاوہ اور بہت سے موضوع قلم بند کرنے کی اجازت دیتی رہی ہے مذہب اخلاقیات۔ سیاسیات، معاشرت سب ہی کو حصہ رسدی حق ملتا رہا ہے لیکن زیادہ مقدار میں حسن و عشق کی داستان اور انفرادی محسوسات کو جگہ ملی ہے اس کا غالب رجحان محبت ہے۔ کبھی کبھی ضمناً دوسرے موضوعات کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غزل صحیح معنوں میں روداد محبت کا دوسرا استعارانہ نام ہے اور اس کا یہ رجحان اس کی دوسری حیات بن گیا ہے۔ غزل کی نشو و نما اور مقبولیت کا ناقدانہ جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ غزل اسی وقت مقبول عام ہو سکی ہے جب اس نے عاشقانہ جذبات کی اپنے انداز میں ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ اور شعرا کو چھوڑ کر اگر آپ صرف غالب سے میرے اس خیال کی تائید چاہیں گے تو آسانی سے مل جائے گا۔ ان کی وہی غزلیں زیادہ مقبول و زبان زد ہیں جن میں روداد محبت کو مرزا نے بیان کیا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ان کے وہ اشعار یا غزلیات قابل قدر نہیں جن میں عاشقانہ جذبات نہیں بلکہ کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ جن غزلوں یا اشعار میں محبت کا عنصر ایک خاص اسلوب کے ساتھ شامل ہے وہ نسبتاً لوگوں کو زیادہ پسند ہیں۔ اس کے ثبوت میں دیوان غالب سے غزلیات و اشعار پیش کرنا بڑی طوالت کا باعث ہوگا اور بھی اختلاف باقی رہ جائیگا بحث تشنہ و ناتمام رہے گی۔ اس کے لئے تو مستقل الگ سے ایک مضمون کی ضرورت ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں لیکن یہ یقین ہے کہ اگر کوئی شخص بے لوث ہو کر ان کی غزلوں پر نظر ڈالے گا تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔

ایسے اشعار میں جو محبت کی ترجمانی کرتے ہیں علاوہ اور وجوہ کے چونکہ داخلیت زیادہ ہوتی ہے اس لئے بھی گہرائی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے اور ایسے اشعار جن میں حقائق و معارف یا فلسفہ وغیرہ کا عنصر شامل ہو ان میں ایک حد تک خارجیت و تعقل کا آجانا ضروری ہوتا ہے اس لئے باوجود گرانقدر ہونے کے ان سے دلچسپی لینا ہر شخص کا کام نہیں ایک مخصوص طبقہ تک ان کا اثر محدود رہتا ہے اور چونکہ غزل جذباتی و داخلی پہلو لے کر شروع سے سامنے آتی ہے اس لئے اس کے وجود کا تصور زیادہ تر یہ رہا ہے کہ وہ روداد محبت کا ایسا نمونہ ہوگا جس میں زیادہ تر ذاتی و انفرادی سرگذشت کی جھلک پائی جائے گی مگر اس ذہنی وابستگی نے اس کو ایک ایسی خصوصیت عطا کر دی ہے جو مزاج کے لحاظ سے غزل کو نظم سے علیحدہ کر دیتی ہے اور ایسی

حالت میں ہیئت کا غزل و نظم میں مشترک ہونا قریب نظر ہو سکتا ہے لیکن غزل کو نظم اور نظم کو غزل نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ غزل کے اشعار زیادہ تر دل پر اثر کرتے ہیں اور نظم کے اشعار کا تعلق زیادہ تر عقل و دماغ سے ہے۔

مواد کے لحاظ سے غزل اور نظم میں ایک اور فرق نظر آتا ہے۔ جی چاہے تو لگے ہاتھ اس پر بھی نظر ڈالتے چلئے۔ جس طرح غزل کے لئے عموماً (ہمیشہ نہیں) یہ ضروری سا ہو گیا ہے کہ وہ انفرادی جذبات و واقعات پیش کرے اسی طرح نظم سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ اس میں اجتماعی محسوسات عالمگیر حالات، فلسفۂ حیات، طبقاتی کش مکش، دل کش مناظر زیادہ ہوں گے۔ بہ نسبت انفرادی روداد کے۔ اس لئے غزل اور نظم کے مزاج میں یہ پہلو بھی ایسا فرق پیدا کر دیتا ہے جو موضوع کے اعتبار سے بھی ان دونوں کو ایک معقول فاصلہ پر رکھتا ہے۔ اور اگر اسی ضمن میں یہ نازک فرق بھی شامل کر لیا جائے کہ موضوع ہی کے لحاظ سے غزل کے مزاج میں زیادہ اختصار پسندی اور جامعیت ہے اور نظم کے خمیر میں طوالت پسندی وصاف گوئی ہے۔ وہ اشارہ کنایہ کا اتنا سہارا نہیں لیتی جتنا غزل کو چاہیئے۔ ہر بات کو آخری حد تک پہنچا دینے کی فکر کرتی ہے تو غزل اور نظم کے فرق کو سمجھنے میں کافی مدد مل جائے گی۔ چاہے ہیئت کے لحاظ سے دونوں کی ساخت یکساں ہو مگر معنوی خصوصیات دونوں کو الگ کر دیتی ہے۔

میں اس خصوصیت کو بھی غزل کی داخلیت کا جزو سمجھ کر یہ سوچتا ہوں کہ یہ پہلو انفرادی حالات اور روداد محبت کے بیان کو غزل گو اور نظم کہنے والے کے طرز تخیل کو الگ کر دیتا ہے۔ غزل گو آپ بیتی بیان کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے۔ وہ غم دوراں کے ہوتے ہوئے بھی غم جاناں کو پیش پیش رکھنا چاہتا ہے اور اپنے فن کو زیادہ سے زیادہ کام میں لا کر موضوع کو پُر درد بنا دینا چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے نظم کہنے والا ایک زمانے سے اپنے کو ہم آہنگ و ہم خیال پا کر اپنی فنکاری کا سہارا لے کر موضوع کو پُر تاثیر بنانے کی فکر کرتا ہے۔ غزل انفرادی و شخصی تجربات و محسوسات کے ساتھ آتی ہے۔ غزل گو یوں بھی کسی کو اپنا شریک غم نہیں پاتا اور بات بھی صیغۂ راز میں رکھنا چاہتا ہے اسی لئے وہ کم سے کم الفاظ میں اپنے مطالب واضح کرتا ہے لیکن نظم کہنے والا ایک لحاظ سے جگ بیتی قلم بند کرتا ہے یا ایسے محسوسات بیان کرتا ہے جس میں دوسروں کے بھی تجربات شامل ہیں۔ وہ ایک بڑے طبقہ کا ترجمان اپنے کو سمجھ کر یہ بانگ دہل سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے لہجے میں تین فرق نظر آتا ہے جو غور کرنے پر غزل اور نظم کا ایک فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک کامیاب غزل گو اور ایک کامیاب نظم گو کی ذہنیت میں ایک ایسا بُعد ہو جاتا ہے جو ایک کو دوسرے کے حلقہ میں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ کیونکہ غزل کا تعلق علاوہ اسلوب بیان کے زیادہ تر وجدان سے ہے اور نظم کا تعلق (ہمیشہ نہیں مگر زیادہ تر) تعقل و خارجی عناصر سے ہے۔

اس فرق کو بتانا غالباً تحصیل حاصل سے کم نہ ہوگا کہ ہیئت کے لحاظ سے غزل اور نظم میں یہ بھی فرق ہے کہ غزل کی ہیئت صرف ایک ہی ہے یا ذرا سی تبدیلی مستزاد کی صورت میں ہو جاتی ہے اور نظم کسی ایک شکل تک محدود نہیں۔ وہ کسی بھی ہیئت میں آ سکتی ہے۔ یہ وہ فرق ہے جس کو ہر شخص جانتا ہے۔ میری بحث تو یہاں زیادہ تر اس صورت سے ہے جو غزل اختیار کر چکی ہے۔ اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ اگر نظم کو غزل نہیں بنایا جا سکتا تو غزل کو نظم کیوں نہ بنایا جائے؟ یا اس میں سماجی و سیاسی خیالات کو کیوں نہ غلبہ حاصل ہو۔ غم دوراں کے ہوتے ہوئے غم جاناں سے کیوں نہ گریز کیا جائے۔ ذاتی و انفرادی غم کو بھول کر ایسے غموں سے کیوں نہ دلچسپی لی جائے جس میں اپنا غم بھی آ جائے اور دوسروں کا غم بھی بیان ہو جائے؟ بات بظاہر معقول ہوتی ہے لیکن یہ اتنی بڑی بات ہے کہ ہر شاعر حتیٰ کہ کامیاب شاعر بھی مشکل سے عمل کر سکتا ہے۔ پہلی شق کا جواب تو ایک طرح سے میں دے چکا ہوں کہ غزل کا غالب رجحان ہمیشہ سے غم جاناں رہا ہے اور آج بھی وہی ہے۔ اور جب تک غالباً غزل باقی رہے گی یہ چیز باقی رہے گی۔ لیکن اس کو اگر آپ فرسودہ روایت کہہ کر نظر انداز بھی کرنا چاہیں تو ایک سوال کا جواب آپ کو بھی دینا ہوگا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ غم جاناں کو بھول کر ہر شخص غم دوراں کا ماتم کرے؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انفرادی غم فطری بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ اشتمالیت اگر اپنے پورے شباب پر بھی آ جائے تو بھی یہ منفرد غم اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔ عزیز و اقارب، احباب کا غم نہ بھی رہے تو اپنا غم ضرور کسی نہ کسی دل میں محسوس ہوگا۔ جنسی مادہ یونہی رہے گا، حُسن و عشق کے واقعات پیش آتے رہیں گے۔ کیونکہ کوئی عالم ہو، کوئی نظام حکومت ہو حُسن کو اس بات پر نہیں مجبور کر سکتا کہ چاہے اسے اجتناب ہو لیکن وہ عشق اور مخصوص فرد کے عشق سے وابستگی

پیدا کرے۔ اور جب یہ ممکن نہیں تو عشق کی بیگانگی کو ستم سمجھ کر عشق ضرور دل میں ایک کسک محسوس کرے گا۔ محبوب کو محبوب کے نہ ملنے کا غم ہوگا۔ خواہ اس انداز سے نہ ہو جو آج سے پہلے تھا یا آج ہے مگر ہوگا ضرور۔ ایسی صورت میں ان جذبات کا قلم بند کرنا بھی شاعر کے لئے ناگزیر ہو جائے گا۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ غم جاناں کو بھول کر غم دوراں ہی کو سب کچھ بنا لیا جائے۔ اس نظریہ کو عام کرنا یا لوگوں کو اس پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنا اس سے زیادہ بُرا ہوگا کہ جب غیر عشقی محسوسات کے رسمی طور پر شعراء عاشقی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ کہنا پڑے گا کہ اگر آپ میں شاعرانہ صلاحیت ہے تو آپ اپنی کسک کو نہ کہئے غم دوراں کے لئے اسے وقف کر دیجئے خواہ آپ کو غم دوراں ہو یا نہ ہو۔ آپ دنیا کا ماتم ضرور کیجئے چاہے دکھانے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک کوئی ایسا سیاسی شعور یا احتساب نہیں ہو سکتا جس میں ذاتی محبت اور جنسی تعلقات کو ختم کیا جا سکے اس لئے کہ یہ فطری جذبہ ہے یہ ظہور پذیر ہوتا رہے گا اور اپنے اپنے محسوسات کو بھی شاعری میں جگہ ملتی رہے گی کیونکہ جنسی محبت زندگی میں موجود ہے اس کا عکس ادب میں بھی ضرور آئے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے گرد و پیش کے حالات اور عالمگیر واقعات سے روگردانی کر کے صرف غم جاناں ہی کو اپنا وظیفہ بنا لیں اور اس نظریہ کو اپنی تنگ نظری کا جواز سمجھ لیں۔ افضل تو یہی ہے کہ ہم ساری دنیا کا درد اپنے دل میں محسوس کریں لیکن اگر کسی کو ذاتی غم زیادہ محسوس ہو تو اسے بھی پورا حق ہونا چاہیئے کہ وہ آزادی سے اپنے انفرادی واقعات اور روداد محبت کو اشعار میں نمایاں کر سکے۔ میں سجاد ظہیر صاحب سے بالکل متفق ہوں کہ آج کے بعض شعرا کا محبت یا عورت سے گریز کر کے اپنے کو زبردستی سیاسیات کا بندہ دکھانا اور محبت کے جذبات کو چند دنوں کے لئے ملتوی کر کے اُس پار جانا زیادہ تر نمائش کے لئے ہے جس میں صاف صاف فراریت غالب ہے جس کو قول فعل سے بہت کم واسطہ ہے۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا ضرور ہے کہ ایسے جذبات کے اظہار کے لئے غزل ہی کا میدان یا غزل ہی کی ٹکنیک مخصوص رہے۔ یا عزیز اعتراض نہیں بن سکتا مشورہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب ادب کا فیض عام ہے تو کسی صنف شاعری کو کیوں ترک کیا جائے۔ لیکن اگر جوش ملیح آبادی کے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ اس میں ربط نہیں ہوتا۔ ایک ہی سانس میں آپ ایک بات کہہ کر اس کی تردید کر دیتے ہیں۔ ایک شعر میں پھر کا شکوہ کرتے ہیں اور اس کے بعد ہی دوسرے شعر میں وصل کی مسرت کا اظہار فرماتے ہیں۔ ایک شعر میں مرنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور فوراً اس کے بعد ہی زندگی اور دنیا کی گوناگوں رنگ رلیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ غرض کہ متضاد باتیں کہا کرتے ہیں تو ذرا تھم کر حقیقت پر غور کرنا پڑے گا قول تو یہ سمجھنا ہی غلط ہے کہ غزل کے جملہ اشعار ایک ہی وقت کے تجربات بیان کرتے ہیں۔ یا یہ سوچنا کہ پوری غزل، روداد محبت کے ایک اسی وقت کا تجربہ ہے سراسر مضحک ہے۔ اس میں مختلف اوقات کے تجربات ہیں، کبھی شاعر خوش ہوا، کبھی رنجیدہ، کبھی فلسفی ہو گیا، کبھی رند کبھی دنیا کا بہت بڑا آدمی اپنے کو سمجھا کبھی حقیر ترین ہستی کا اپنے اوپر دھوکا ہوا۔ اس قسم کے سیکڑوں محسوسات وہ مختلف اوقات میں محسوس کرتا رہا۔ ان کو ایک وقت میں یاد کر کے قلم بند کرتا ہے اور ایک خاص صورت یعنی غزل میں اس کو پیش کرتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ وہ بیک وقت ایک ہی سانس میں افسردگی، مسرت، رندی و پارسائی وغیرہ کے متضاد تجربات سے متاثر ہوا ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شکل میں بے ربط باتوں کا پیش کرنا کیا ضرور ہے۔ اگر تسلسل کے ساتھ کوئی بات نہ کہنا ہو تو کسی طریقے سے کیوں نہ کہی جائے اور اچھا تو یہ ہے کہ ایسی باتیں کہی نہ جائیں۔ مگر یہ اعتراض کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ہر روز مرہ کی زندگی میں ہر وقت مسلسل موضوعات پر بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی موسم کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی ارزانی و گرانی کا تذکرہ کرتے ہیں، کبھی بیماری و صحت پر گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی کسی کے مرنے کا ماتم کرتے ہیں کبھی کسی کی شادی میں شرکت کے احساس سے خوش ہو لیتے ہیں۔ اگر یہ باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں اور ان کو فطری ضروری سمجھا جاتا ہے تو شعر میں ایسے ہی مواد کو پیش کرنا کیوں نہ مستحسن سمجھا جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ ایک ہی شکل میں مختلف باتوں کو کیوں پیش کیا جائے۔ اس کے لئے یہ سوچنا پڑے گا کہ کیا ہر شخص ہر وقت نئے انداز میں باتیں کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے لہجہ بدل جاتا ہے۔ الفاظ نرم و گرم آتے ہیں۔ مگر کہنے کا طریقہ ہر وقت نہیں بدلا کرتا۔ جب محسوسات زیادہ تر ایک ہی طرح کے ہوں۔ دائرہ خیال وسیع نہ ہو تو انداز گفتگو میں یکسانیت کا آ جانا لازمی ہے۔ ایسی حالت میں تجربات کی یک رنگی اور زیادہ نظر فریب ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ایسی باتیں کہنے والے ہمیشہ ایک ہی قسم کی باتیں کہا کرتے ہیں۔ سب کے سب ایک ہی انداز میں ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہمیشہ

ایسا نہیں ہوتا۔

اس گفتگو سے یہ مطلب نہیں کہ غزلوں میں جو مواد پیش کیا گیا اور جس طریقہ سے پیش کیا گیا وہ سب مستحسن اور قابل قدر ہے۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ غزل میں زیادہ حصہ قلم زد کر دینے کا سزاوار ہے۔ طرز تخئیل بھی اکثر ناپسندیدہ ہے اور محسوسات کو بھی تجربات کا سہارا بہت کم ملا ہے رسمی و تقلیدی مواد بہت زیادہ ہے۔ غزل گو شعرا نے بڑی کوتاہیاں کی ہیں۔ خود غرضی کا ثبوت ہر جگہ دیا ہے۔ اپنے غم کے سوا کائنات کے غم کی ترجمانی انھوں نے بہت کم کی ہے۔ زیادہ تر اپنے دردِ دل کا اعلان و علاج کرتے رہے۔ دوسروں کی مصیبت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اور یہ کوتاہی ایسی ہے جو ہم کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ایسے لوگ یا تو خود غرض تھے یا دیوانے۔ بہر حال میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ غزل کا سارا مواد، تخئیل سراہنے کے لائق ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غزل اپنی ہیئت اور غالب مواد یعنی حسن و عشق کی داستان کی وجہ سے ایسا کارنامہ نہیں جس کو جرم سمجھ کر صفحۂ قرطاس سے مٹا دیا جائے بلکہ اس کے ہیئت و مواد دونوں فطری ہیں اور جو لوگ اپنا انفرادی درد بیان کرنا چاہتے ہیں ان کو حق ہونا چاہیئے کہ آزادی کے ساتھ وہ اپنے جذبات کا بھی اظہار کر سکیں۔

بات بڑھتے بڑھتے کہاں پہنچ گئی۔ ختم کرنے کے لئے آخری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ غزل میں نئے یا بہتر سیاسی، معاشرتی مسائل کو سمونا چاہیئے حسن و عشق کی روداد کو خارج کر دینا چاہیئے۔ ان کو یہ سوچنا چاہیئے کہ تھوڑے سے کی محنت سے غزل نے جو اپنی نرم و نازک فضا تیار کی ہے کیا وہ اس کی تحمل ہو سکے گی کہ وہ بھاری بھرکم مسائل کا بوجھ اٹھائے اور یہ مسائل غزل کے اشعار میں دلکشی کے ساتھ بیان بھی ہو سکیں گے۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ غزل اشارے کنائے کی چیز ہے۔ ہر شعر کا ایک دوسرے سے جدا ہونا اس کا خاص جوہر ہے اور یہ ایسی انفرادیت ہے جس کے ختم ہوتے ہی غزل بھی ختم ہو جائے گی اور سیاسی و سماجی مسائل بھی اس ہیئت میں تشنہ ہی رہ جائیں گے۔ وہ بغیر تسلسل کے پوری طرح بیان نہیں ہو سکتے۔ یہ تبدیلی ایک حرکت نہ ہو بھی نظر آئے گی۔ نہ غزل غزل رہ جائے گی نہ نظم نظم اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کو اپنی جگہ پر قائم رکھا جائے کسی خاص تبدیلی کا نتیجہ خوشگوار نہ ہوگا۔ دونوں اصناف کے موضوعات الگ ہیں۔ ان کے غالب رجحانات اپنی جداگانہ تشکیل چاہتے ہیں۔ ان کو اپنی اپنی جگہ رہنے دیجئے۔ غزل کے داخلی پہلو میں تبدیلی تیزی سے ہو بھی ہے وہ ہوتی جائے گی۔ زمانہ خود اس کے نظریۂ حسن و عشق کو اپنی موجودہ قدروں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ وہ اپنی اہمیت و حقیقت روز بروز غزل سے بھی تسلیم کرا رہا ہے۔ مذاق حسن و عشق کو حقیقت نگاری و زمانہ شناسی پر مجبور کر دے گا۔ بشرطیکہ آپکی تنقید آمریت کا پہلو نہ اختیار کرے۔

نٹ ہیمسن ——— نوبل پرائز یافتہ مصنف

کا

شاہکار ناول

بھوک

- جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے۔
- جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بنا لیتا ہے۔
- جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مزموم اثر کی داستان ہے۔
- جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو مکرر تیار کرتا ہے۔

ترجمہ: مخمور جالندھری

(زیر طبع)

مکتبۂ شاہراہ۔ دہلی ۶

وجود پرستی کا فلسفہ اور اس کا طبقاتی مفہوم

بدیع مشہدی

میکسم گورکی نے ایک امریکی نامہ نگار کو جواب دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"آج بورژوا فلسفہ آہستہ آہستہ قرونِ وسطیٰ کے تاریک ترین دور کی طرف لوٹ رہا ہے جہاں اس کی حیثیت دینیات کی ایک کنیز سے زیادہ نہ تھی۔"

گورکی نے یہ الفاظ ۱۹۳۲ء میں لکھے تھے۔ آج بورژوا فلسفہ اپنا یہ سفر ختم کر کے اس منزل پر پہنچ چکا ہے جس کی طرف گورکی نے اشارہ کیا تھا۔ آج بورژوا فلسفہ، ادب، دانشور ان تمام مادی قدروں اور سائنسی صداقتوں کو جھٹلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جن کی حمایت خود انھوں نے ایک خاص عہد میں بہت ہی پُرزور طریقہ پر کی تھی۔ جب سرمایہ داری ایک ترقی پسند طاقت کی حیثیت سے سماج کو ایک نیا رنگ و روپ عطا کر رہی تھی اور مٹی ہوئی جاگیرداری سماجی انقلاب کی اس رو کو روکنے کے لئے قنوطیت، احیا پرستی، ابہام پرستی اور عینیت پرستی کی کمین گاہوں سے حملے کر رہی تھی۔ اس وقت سرمایہ دارانہ طبقہ نے اپنے ادب، فلسفے اور تصورات کو فروغ دیا جن کی بنیاد عقلیت اور سائنسی تجزیے پر رکھی گئی تھی۔ وسائل قدرت کو قبضہ میں لانے اور پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کے لئے اس نے سائنس کو پیدا کیا۔ تصورات کی دنیا میں بھی اس نے انسانیت کو دورازفہم اشاریت اور ذہن کے گوشوں کو تاریک کر دینے والی حزنیت سے جو جاگیردارانہ ادب اور فلسفے میں سمٹ آئی تھی آزاد کرایا اور ایسے فنون لطیفہ، ادب، تہذیب، تمدن اور فلسفے کو جنم دیا جنھوں نے سماجی ترقی کی لہر کو تیز تر کیا۔ اور جاگیردارانہ تمدن کے سڑے گلے عناصر کی بیخ کنی میں نمایاں حصہ لیا۔ لیکن سرمایہ داری کا وہ ترقی پسند اور تاریخی رول آج ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ سماجی ترقی کے ایک ایسے زینے پر پہنچ چکی ہے جہاں ذرائع ترقی اور طریق پیداوار پر قدرت قائم رکھنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔

سماج کے مادی اور سماجی وسائل کی مزید ترقی اب اشتراکی سماج ہی میں ہو سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ طبقہ کو بھی اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ اس کی "عمر طبعی" اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر لمحہ نزدیک تر ہوتی ہوئی موت کا خوف دہرا اس اُسے ایسے تصورات و خیالات کے رواج دینے پر مجبور کر رہا ہے۔ جن میں ابہام، دورازقیاس اشاریت، بے مقصدیت اور عینیت پرستی کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ تمام سرمایہ دارانہ ممالک میں ایسے رجحانات کی ترویج و تبلیغ کی جا رہی ہے جن سے عوام کے دلوں میں مایوسی، شکست خوردگی، اور قنوطیت کے جذبات پیدا ہوں۔ وہاں ایسا ادب اور آرٹ پیدا کیا جا رہا ہے جس میں انسانی فطرت کو حیوانی فطرت سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ اور انسانی مستقبل کو ایسے بھیانک روپ میں پیش کیا جا رہا ہے جسے دیکھ کر انسان کے دل میں خوف اور نفرت کا احساس پیدا ہو۔ ان خیالات کو کبھی کھلے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں لیکن ہر حال میں ان کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ سرریلزم، دادازم، فرائیڈازم، اور ایگزسٹینشلزم (Existentialism) جیسے رجعت پسند نظریات کا پرچار بہت ہی شدّ و مد سے کیا جا رہا ہے۔

اس مضمون میں صرف (Existentialism) یعنی وجود پرستی کے نظریے کی تفصیلات اور اس کے رجعت پرست پہلوؤں سے بحث کی جائے گی۔

وجود پرستی کی تحریک کو سمجھنا اور اس کے طبقاتی مفاد کو پہچاننا ہمارے لئے اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اردو ادب میں بھی بعض گوشوں سے اس کی حمایت شروع ہو گئی ہے۔ حسن عسکری نے تو یورپ کے تمام انحطاط پسند اور رجعت پرست ادیبوں کی طرف سے علمبرداری

ہی لے لیا ہے۔ ممتاز شیریں نے جو نسبتاً کچھ نرم اور دھیما لب و لہجہ رکھتی ہیں۔ "نیا دور" کے ایک شمارے میں جس طور سے سارتر کے دیانتداری خلوص اور صداقت پسندی کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ وجود پرستی کے نظریئے کو ادب و ادب میں بھی مستقل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

فرانس میں اس نظریئے کی تبلیغ جس تیزی سے کی جارہی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ آزادی کے بعد سے فرانسیسی ریڈیو پر وجود پرستوں کے انٹرویو، مباحثے اور قصے متواتر نشر کئے جارہے ہیں۔ ژاں پال سارتر جو اس تحریک کا امام ہے، اس کے چند وفادار مخلص دوست ہمیشہ فرانسیسی حکومت کے شعبۂ نشر و اشاعت میں شامل رہے ہیں۔ "ایرون" جو خود بھی اس تحریک کا ایک ممتاز رکن ہے۔ ارتو کی وزارت میں چیف سیکریٹری رہ چکا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نظریئے کی نشر و اشاعت بہت ہی منظم ڈھنگ سے ہی کی جارہی ہے۔

جہاں تک اس نظریئے کی بنیاد پر کی گئی تخلیقات کا سوال ہے۔ ہم انھیں آسانی کے ساتھ دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو خالصتاً فلسفیانہ ہیں اور جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ مثال کے طور پر سارتر کی کتاب "L'Etreet-le-ne'ant" سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

Let us examine the possibility of the metaphysical question more closely. What appears first of all is that being for others represents the third "ek-stasy" of being for oneself. The first "ek-stasy" is, in effect, the three dimensional projection of being for one-self towards a being that has to be after the mode of not-being. It represent the first fissure, the negation by which being for oneself becomes itself, the tearing away of being for one self from all that it is, in so for as this tearing away is constitutive of its being.

The second "ek-stasy"..... is an uprooting from this same tearing away.

This reflexive "scissiparity" corresponds to a vain effort to take a point of view on the negation which the being for one self has to be....."

سارتر کی یہ کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور شروع سے آخر تک آپ کو ان ہی خرافات کی بھرمار نظر آئے گی۔ اس کتاب میں جس قدر دور از فہم اللہ بیداز ادراک باتیں لکھی گئی ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ خود سارتر کے شاگرد اور اس سے عقیدت رکھنے والے چند افراد بھی اسے پڑھنے اور سمجھ لینے میں ناکام رہے۔ اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود وہ اس کتاب کا کوئی حصّہ

اپنے ذہن میں منتقل نہ کر سکے۔ یہ محض استاد سے بے پناہ عقیدت اور احترام کا جذبہ تھا جس نے انھیں اس کتاب کے پڑھ لینے کی مہم میں بھی ثابت قدم رکھا اور جس نے اس کٹھن آزمائش کے بعد بھی انھیں اُستاد کا وفادار رہنے دیا۔

وجود پرستوں کی تخلیقات کی دوسری قسم ناولوں کی ہے جن میں اس نظریے کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ کوشش نسبتاً زیادہ کامیاب ہے۔ جہاں فلسفیانہ کتابوں کی اشاعت اس تحریک کے لئے کوئی خاص افادی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہاں ناولوں نے ایک حد تک اس تحریک کی خاطر خواہ خدمت کی ہے۔ سارترے اپنے ناولوں میں "مائونت سارترے" کی راتوں، "مائونت پارناسے" کے کلبوں، "کوت دی" کی رقص گاہوں، گمراہ، آوارہ حال انسانوں کی عادتوں اور عشق و محبت کے حادثات کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ ان تصویروں کو وہ کسی بھی تفصیل کے رنگ سے محروم نہیں رکھتا۔ لیکن یہاں بھی سارترے کو وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی جس کی اسے اُمید تھی۔ اس کے فلسفیانہ ناولوں کو پڑھنے کے لئے قاری کو اپنے ذہن پر کافی زور دینا پڑتا ہے اور اس عمل سے گذرتے ہوئے اس کا سر چکرا جاتا لازمی ہے۔ ایک ہی پیراگراف میں تین یا چار آدمیوں کے عمل اور خیالات کا بیان ہوتا ہے ان میں سے ایک پیراگ میں ہے تو دوسرا "جوان لے پنس" میں، تیسرا پیرس میں ہے تو چوتھا میونک میں۔ اکثر جملوں کا سلسلہ اتنا مبہم اور غیر واضح ہوتا ہے کہ پڑھنے والا "پراگ"۔ جوان لے پنس"۔ پیرس اور میونک کے درمیان کھو کر رہ جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی واضح مفہوم اُبھرنے نہیں پاتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سارترے اور دوسرے وجود پرست ادیبوں کے ناولوں کی بعض خصوصیتوں کو خود بورژوا طبقہ بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ان ناولوں میں خاندان اور شادی کے خلاف شدید نفرت اور بیزاری کا احساس پایا جاتا ہے۔ ان میں ایسے آزاد طریق حیات کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے جس میں سماجی، جنسی، معاشرتی ــــ کسی قسم کی بھی پابندی اور روک ٹوک نہ ہو۔ ایسے طریق حیات کی تبلیغ نوجوانوں کے اخلاق پر بُرے سے اثر انداز ہو سکتی ہے اور انہیں ایسی راہ پر ڈال سکتی ہے جو خود بورژوا طبقہ کے مفاد کے منافی ہو۔ بورژوا طبقہ [illegible] اور سماج میں اس حد تک بے راہ روی اور نراج کو شائد پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے اس کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا [illegible] ہے۔ اس کا مقصد ایک مثالی خوش حال خاندان کی تعمیر تو ہرگز نہیں لیکن وہ اس کے اوپری ڈھانچہ اور سماجی و معاشرتی ڈھانچہ کو ایک خاص حد تک برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یہ حد بندی اس کے لئے ناگزیر ہے۔ کیونکہ ذاتی ملکیت کے [illegible] کے لئے یہ جواز کا کام دیتی ہے۔

فرانس کی آزادی کے فوراً بعد وجود پرستی مدافعتی تحریک (Resistance Movement) کا ایک حصہ بن کر سامنے آئی دراصل بہت سارے وجود پرست مدافعتی حلقوں میں رہ چکے تھے۔ خود سارترے [illegible] اس کے دوسرے ساتھیوں نے "قومی محاذ" کی حمایت کی تھی۔ ان کے ترجمان [illegible] Les Temps Modernes [illegible] وطن جلاوطنوں کی سرگذشت اور ان کی یادوں کو کافی اہمیت دی ــــ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا یہ اچھا طریقہ تھا۔ وجود پرستوں نے اپنا تعارف فاشزم کے خلاف اور جمہوری دوست کی حیثیت سے بھی کرایا۔ ان کے ناول میں ہمیں اپنی جمہور پسند دوں کے کارناموں کا بھی عکس ملتا ہے۔ سارترے نے اپنے ناول (Les Mains Sales) میں 'میونک' کی سازشوں کی مذمت اور ان کے خلاف نفرت و ملامت کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ بظاہر فرانسیسی بورژوازی کی بزدلی کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ Les Temps Modernes کے ایک شمارے میں ہند چین کی جنگ کے خلاف احتجاج بھی کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر موقعوں پر وجود پرستوں نے مارکسزم اور سوویت یونین سے بھی اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اور ساتھ ہی لاندہیت کے علمبردار ہونے کا بھی اعلان کیا ہے۔ لیکن ان ساری باتوں سے ان کا مقصد محض اتنا تھا کہ [illegible] گردوں اور مریدوں کا ایک گروہ اکٹھا ہو۔ جسے وجود پرستی کے سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ نوجوان فرانسیسی ادیبوں اور مفکروں کو اپنے حلقۂ اثر میں لانے کے لئے وجود پرستی ایک انسان دوست فلسفے کے لباس میں بھی آتی ہے۔

"انسان ایک قدر مطلق ہے۔ انسان لائق تعظیم ہے کیونکہ وہ آزاد ہے اور اس کی آزادی کو چھین لینے کی کوئی بھی کوشش، ظلم کی کوئی بھی شکل ایک سنگین جرم ہے۔"

وجود پرستی ان تمام باتوں کا یقین دلاتی نظر آتی ہے۔ سارتر نے اپنے ناولوں میں پرولتاری کرداروں کو بھی بہت ہی احتیاط اور ہشیاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بے شمار انگیزوں اور حرفتی کارگروں کے پہلو بہ پہلو اس نے مزدوروں اور کسان عورتوں کی زندگی کی عکاسی کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اب یہ بات سمجھ میں آنے لگتی ہے کہ بعض نوجوانوں نے وجود پرستی کے نظریئے کو ایک ترقی پسند اور بائیں بازو کی تحریک سمجھ کر کس طرح قبول کر لیا ہے۔ وجود پرست نوجوان دانشوروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ زندگی کے منصوبوں کی تعمیر و تشکیل میں یا کسی بھی چیز کے انتخاب کے سلسلہ میں مکمل طور سے آزاد ہیں۔ ان کی عظمت کا راز اس میں پوشیدہ ہے کہ وہ خاندان کے مضبوط شکنجوں سے، تمام سماجی بندھنوں اور مصیبتوں سے آزادی حاصل کر کے اپنی شخصیت کی تعمیر کریں۔ اس طرح ان کی خود پسندی کے جذبے کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ان کے ذہنی انتشار اور پراگندگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں "نجات" کا بھی یقین دلایا جاتا ہے۔

انسانی قدروں اور جمہوری اصولوں سے جس سطحی اور جھوٹی ہمدردی کا اظہار یہ وجود پرست کرتے ہیں ان کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ لوگوں تک اپنے رجعت پرست رجحانات اور ذہنی اور انحطاط پسند تصورات کو پہنچانے کے لئے مناسب فضا آفرینی کی جا سکے۔ انھیں اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ آج انقلابی اور ترقی پسند تصورات عوام کے دلوں میں بہت ہی گہرے طور پر رَس بَس گئے ہیں اور کوئی بھی انحطاط پسند تصور کھلے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسے عوام فوراً مسترد کر دیں گے۔ رجعت پرست تصورات کو پیش کرنے کے لئے بھی نام نہاد ترقی پسندی کا سہارا ضروری ہو گیا ہے ورنہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے عوام کو گمراہ کیا اور انہیں اپنی ریشہ دوانیوں کا شکار بنایا جا سکتا ہے۔ وجود پرستی کا نظریہ بھی بنیادی طور سے جمہور دشمن اور رجعت پرست ہونے کے باوجود جا بجا تام نہاد ترقی پسند تصورات کی چھاپ لئے ہوئے ہے۔ وجود پرست ادیبوں کی تخلیقات میں پہلے جو چیز ترقی پسند اور جمہور دوست نظر آتی ہے، کچھ ہی دُور جا کر وہ اس کی مذمت بن جاتی ہے۔

اب آیئے ہم دیکھیں کہ وجود پرستی کے نظریئے کی تشکیل میں کون کون سے عناصر کارفرما رہے ہیں؟ وجود پرستی کے فلسفے میں کوئی بھی تصور ایسا نہیں ہے جسے نیا پن کا حامل کہا جا سکے۔ پُرانے مختلف خیالات و تصورات کو از سر نو زندہ کرنے اور بیچا کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی حیثیت کباڑیئے کی دوکان کی سی ہے۔ جہاں "افلاطون"۔ "اپی کیورس"۔ "ڈیکارٹے"۔ "کانت"۔ "ہیگل"۔ "مین دی بیران" "مارکس" اور "ہسرل" کے خیالات کو توڑ مروڑ کر کسی صورت سے جمع کر دیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک بنیادی تصورات اور بیشتر خیالات کا تعلق ہے۔ انھیں وجود پرستی کے فلسفے سے اصلی بانی "کیرک گارڈ" اور "ہیڈیگر" کے بیان سے لیا گیا ہے۔ دونوں صحیح معنوں میں اس نئے فلسفے کے پیش رو تھے۔ "کیرک گارڈ" نے یہ بات بتائی کہ ناقابل فہم اور نامعلوم ہستی کا خوف ہی انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

"ہیڈیگر" کی رائے میں انسانی زندگی کا جوہر اس ہولناک کرب ہی میں محسوس کیا جا سکتا ہے جو موت سے پہلے انسان پر گذرتا ہے۔ حقیقی وجود اس تگ و دو میں ہے جو حصول موت کے لئے کی جاتی ہے۔

"ہیڈیگر" کے ان رجعت پرست خیالات کا منطقی نتیجہ اس مطالبہ کی صورت میں ظاہر ہوا ہے کہ فاشزم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں۔ اور بلا سوچے سمجھے خود کو اس بربریت کا نشانہ بننے دیا جائے۔ ان خیالات نے فاشزم کی سحر آفرین طاقت پر یقین کرنے اور اعتماد پیدا کرنے میں بہت کافی مدد کی۔ جس طرح نیٹشے، کے نظریۂ "فوق البشر" نے ہٹلر کی آمرانہ شخصیت پیدا کی۔ اُسی طرح "ہیڈیگر" کے ان تصورات نے عوام کے ذہن میں ایسے اثرات کو جنم دیا جن کی وجہ سے فاشزم ان کے لئے قابل قبول ہو سکی۔

وجود پرستی دراصل دوسرے مابعد الطبیعاتی فلسفوں سے کوئی مختلف فلسفہ نہیں۔ یہ فلسفہ "حقیقت کُلی" کی تلاش کرنے اور اسے حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تمام مابعد الطبیعاتی فلسفوں کی طرح وجود پرستی بھی حقیقت کی دنیا سے جسے محسوس کیا جا چکا ہے اور

جس کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاچکا ہے۔ پرے جانا چاہتی ہے اور "وجدان" کے ذریعے کسی ایسی حقیقت کا کھوج لگانا چاہتی ہے جو اس موجودہ حقیقت کی دنیا سے زیادہ گہری، عمیق اور زیادہ صداقت کی حامل ہو۔ یہ "ہستی" (Being) اور "وجود" (Existence) کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیتی ہے۔ "اس حقیقت کلی" کو پالینے کے لئے جو دراصل "وجود" یا "آزادی" ہے۔ انسان کو "ہستی" کی بندش سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس کی "ہستی" کا برشتہ گرد و پیش سے بالکل ختم ہوجانا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں "ہستی" کی بندش سے آزادی حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خود کو دنیا سے، سماج سے، اپنے ماضی سے غرض ان تمام چیزوں سے جو واضح اور قطعی طور پر اس کے سامنے موجود ہیں، نوچ کر علیحدہ کرلینا چاہیئے اور تب اُسے "وجود" اپنی اصلی، آزاد شکل میں بے نقاب نظر آئے گا۔ لیکن کیا انسان سماج، دنیا اور گرد و پیش کی ان تمام چیزوں سے علیحدہ ہوکر جو ایک مادی بنیاد رکھتی ہیں، اپنا وجود برقرار رکھ سکتا ہے؟ وجود پرستی کا فلسفہ دراصل نفیٔ حیات، خودکشی اور موت کا فلسفہ ہے۔

سارترے نے لکھا ہے کہ "انسان کو آغاز داخلیت سے کرنا چاہیئے۔ اس کے خیال میں مادہ اور خیال، مادہ اور شعور۔ دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔

سارترے نے مادے کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

"مادے کی خصوصیت اس کا جمود ہے۔"

مادے کی حرکت اور اس کی تخلیقی قوت سے انکار کرکے سارترے نے نہ صرف خود بورژوا سائنس دانوں کے خیالات کی تردید کی ہے۔ بلکہ انسانوں کو مجہول ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مادے کو متحرک مان کر وہ انسانوں کو مجہول ثابت نہیں کرسکتا تھا۔

وجود پرستوں کی عینیت پرستی سائنس سے نفرت اور سائنسی تصورات کو جھٹلانے کی شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ سارترے کے خیال میں "سائنس ایک مجرد علم ہے۔ یہ مجرد اجزا کے اُتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتا ہے ـــــ اصلی اسباب کا نہیں"۔ وہ کہتا ہے کہ سائنس کا اگر کچھ مطلب ہے اور یہ انسانی آزادی کی صداقت کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے۔ تو اسے خارجی حقیقت کے حاصل کرنے کا فریب نہیں دینا چاہیئے۔ اسے تمام عملی تجربات سے کنارہ کش ہوجانا چاہیئے۔

وجود پرست شینی ترقی، ٹکنیک اور سائنس کی لائی ہوئی تمام نعمتوں کے مخالف ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان کی وجہ سے انسانی زندگی زیادہ اذیت دہ ہوتی جارہی ہے۔

"سائمن دی بوویر" کے الفاظ میں "آج یہ ثابت کرنے میں کچھ دقت نہیں رہ گئی ہے کہ ہوائی جہاز، مشین، ٹیلیفون اور ریڈیو نے آج کے انسان کو ماضی کے مقابلہ میں ذرا بھی مسرور نہیں بنایا ہے"۔

بورژوا طبقے کے یہ معذرت خواہ آج ان تمام چیزوں کی مذمت اور مخالفت پر اُتر آئے ہیں جن سے انسانی زندگی بہتر بن سکتی ہو اور جو اسے سماجی ارتقا کی راہ میں آگے لے جاتی ہوں۔

ایک زمانہ تھا جب بورژوازی نے بہت ہی بہادری اور کامیابی کے ساتھ ان حملوں کا جواب دیا تھا جو کلیسا کی طرف سے سائنس کی آزادی پر ہو رہے تھے۔ اس وقت پیداواری قوتوں کی ترقی کے لئے سائنس ناگزیر تھی اور سرمایہ دار طبقہ اس ترقی کا خواہاں تھا۔ آج پیداواری قوتوں کی مزید ترقی میں بورژوا طبقہ کو اپنا وجود مجسم ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تمام بورژوا دانشور، ادیب اور فلسفی سائنس کو بیکار، فضول اور انسانی زندگی کے لئے مُضرِ علم کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ میکسم گورکی نے بورژوا طبقہ کے ایک معذرت خواہ "کیلوکس" کے بارے میں، جس نے سائنس پر روک لگا دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"وہ سائنس پر روک لگانے کی سفارش کرتے وقت بھول جاتا ہے کہ محنت کی دنیا پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے اس نے اس طبقے کو کس قدر قوت بخشی ہے"

امریکی جریدہ (ٹائم) کے ایک مضمون میں کہا گیا تھا کہ فرانس میں نظریاتی محاذ پر سارتر سے مارکسزم کا خاص دشمن تھا۔ چنانچہ امریکی یونیورسٹیوں نے جب بہت ہی پُرجوش طریقہ پر اور حد درجہ عزت اور احترام کے ساتھ سارتر کا استقبال کیا تو انھوں نے کسی قطعی کا اظہار نہیں کیا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امریکی سامراجیوں نے وجود پرستی کے طبقاتی مفہوم اور اس کے سیاسی مقاصد کو بہت ہی صاف اور واضح طور پر سمجھا ہے۔ دوسرے عیّنت پرست فلسفوں کی طرح اس فلسفے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انقلابی اور ترقی پسند قوتوں کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں اور مادیت کے اثرات کو ختم کیا جائے۔

سارتر نے اپنی کتاب (L" Existentialisme est un Humanisme) میں مادیت کے خلاف ایک پٹا پٹایا حربہ استعمال کیا ہے۔

"مادیت انسانوں سے اس طرح سلوک کرتی ہے جیسے کہ وہ میز یا پتھر ہوں ـــــ ایسی چیزیں جو محض خارجی قوتوں کے عمل کی زد میں رہتی ہوں۔"

وہ اپنے نصب العین کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"ہم ایک انسانی ملکت کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں قدروں کا اجتماع ہو سکے اور جو مادی مملکت سے مختلف ہو۔"

سارتر کی بددیانتی یہاں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ "والیٹر"۔ "ڈیڈیروٹ"، "ہیلوٹیس"، "ملکس" اور انگلز نے اشیاء اور انسانوں کے امتیاز کو تسلیم کیا تھا اور انسانی قدروں کی تعمیر و تشکیل کے لئے انھوں نے انتھک جدوجہد کی تھی۔

وجود پرستوں کو سماجی علوم کی افادیت سے بھی انکار ہے۔ طبیعاتی علوم کی طرح ان میں بھی انھیں انسانی زندگی کے لئے کوئی مفید عنصر نظر نہیں آتا۔ مثال کے طور پر سارتر کے خیال میں تاریخ اتفاقی حادثات کا مجموعہ ہے اور سارتر کا یہ خیال بھی نیا نہیں اس سے بہت پہلے فرانس ہی کے ایک شاعر اور بورژوا مفکر "پال ویلری" نے تاریخ کے متعلق کچھ اس طرح کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب "موجودہ دُنیا کا جائزہ" میں تاریخ کو بھوں جانے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خیال میں قوموں کے مصائب کا سبب تاریخ ہی ہے۔ ماضی کے واقعات کی یاد دلا کر تاریخ فضول اور بے کار خوابوں کو انسانوں کے ذہن میں جنم دیتی ہے۔ اور عوام سے ان کا سکون اور شانتی چھین لیتی ہے۔ عوام سے یہاں "پال ویلری" کی مُراد سرمایہ دار طبقہ ہے کیونکہ یہ سرمایہ دار طبقہ ہی ہے جسے اپنی موت تاریخ میں لکھی نظر آ رہی ہے۔

"تاریخ ہمارے ذہن کی کیمیائی تجربہ گاہ میں پیدا کی گئی چیزوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے" ویلری یہ فیصلہ صادر کرتے وقت اس احساس سے خائف ہے کہ تاریخ کا سائنٹیفک مطالعہ سماجی ارتقا کے عمل کو واضح طور پر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ بورژوازی کی موت کا بھی اعلان کر سکتا ہے۔ سارتر کی تاریخ دشمنی کی تہہ میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہے۔

سارتر نے حد درجہ سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ مستقبل کے فرانس اور یورپ کا تصور کر سکتا ہے۔ جب یہ فاشسٹ ہو جائیں گے کون جانتا ہے کل کیا ہوگا؟ اور اس کی اہمیت ہی کیا ہے؟ "انسان ہمیشہ ایک سا رہے گا" جنگل اور غاروں میں زندگی بسر کرنے والے انسان اور آج کے انسان میں کوئی فرق محسوس کرنے سے سارتر قاصر ہے۔

وجود پرستوں کا یہ دعویٰ ہے کہ پارٹی اور سیاسی معاملات سے انھیں کوئی تعلق نہیں۔ ان کی بلند و برتر شخصیت اس تنگ نظری کا شکار نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو کمیونسٹوں کے خلاف رکیک حملوں اور اختراع پردازی کی بہتات نظر آئیگی۔ سارتر کے ایک ناول کا ہیرو "میتھیو" نوجوانی میں پارٹی میں شامل ہونے کا خیال رکھتا تھا۔ اس کے لئے یہ خیال "اتنا ہی پرکشش تھا جتنی کہ نیند۔" لیکن ٹھیک وقت پر اُسے ہوش آ گیا۔ اس کے کمیونسٹ دوست تھے۔ ان کی کیا حالت ہے؟ "برینٹ" "پارٹی انٹیلی کچوئل نے" اپنی آزادی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔" اسے ایک بھرتی کرنے والے سارجنٹ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اس کا کام پارٹی کے لئے نئے ممبروں کی بھرتی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ ایک خیال پرست ہو کر رہ گیا ہے اور "اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب ہر چیز کا تختہ الٹ دیا جائے گا۔" وہ خود

کو مزدوروں سے کنارہ کش محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اس ڈھنگ سے نہیں سوچ سکتا جس طور سے مزدور سوچتے ہیں۔

سارترے کا مقصد ہے کہ دانشوروں اور محنت کش طبقے کے درمیان ایک ایسی خلیج دکھائی جائے جو ناقابل عبور ہے۔ ان کے اختلافات اتنے شدید اور گہرے ہیں کہ یہ کبھی ایک نقطے پر جمع ہی نہیں ہو سکتے۔ وجود پرست ادیبوں کا یہ خاص موضوع ہے جسے وہ اپنے ناولوں میں مختلف طریقوں سے پیش کرتے ہیں۔

اپنی کتاب (Morale' del' Ambiquite) میں "بوویر" نے لکھا ہے کہ پارٹی "اب دانشوروں کی طرف سے محتاط ہو چکی ہے"۔

"برنیٹ" کے علاوہ سارترے کے ایک اور ناول میں "گومے" کا کردار کم و بیش یہی مقصد پورا کرتا ہے۔

"گومے" ایک کمیونسٹ ہے جو بین الاقوامی دستہ میں شامل ہو کر اسپین لڑنے گیا ہوا ہے۔ سارترے شروع میں اس کردار سے اپنی ہمدردی بلکہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس کا زہر میں بجھا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگ سکے۔

"یورپ فاشسٹ ہو جائیگا۔ کمیونزم کے لئے یہ بُری تیاری نہیں..... جنگ کتنی عمدہ چیز ہے"۔

اسی ناول میں "گومے" سے یہ الفاظ کہلوائے گئے ہیں۔

اس طرح کمیونسٹوں کو خیال پرست اور خون کا پیاسا۔ دونوں ہی دکھایا جاتا ہے۔

وجود پرستوں کی کوشش یہ رہی ہے کہ فاشزم اور کمیونزم کو ہم پلہ بنا کر پیش کیا جائے اور کمیونزم کو ایک ایسے سیاسی جنون کی شکل دیجائے جو سیاست کو تمام انسانی قدروں سے محروم کر دیتا ہے اور جو ریاست کو افراد کے سروں پر ان کے مفاد کیلئے نہیں بلکہ ان کے خلاف استعمال کئے جانے کے لئے مسلط کر دیتا ہے۔

کوسلر کی کھلی کمیونسٹ مخالف تحریروں اور وجود پرستی کے مقاصد میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کوسلر نے بورژوا طبقہ کا زیادہ کھلے طور پر ساتھ دیا ہے اور کمیونسٹ دشمنی کا علم دلیری کے ساتھ لہرایا ہے۔ وجود پرستوں نے تمام محاذوں کو ایک ہی جہت میں حاصل کر لینے کی کوشش میں سبھوں کو کھو دیا ہے۔

وجود پرست اب بھی یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ فاشسٹ دشمن ہیں اور مدافعتی تحریک کی انھوں نے حمائت کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سارترے کی بعض تخلیقات میں بظاہر مدافعتی تحریک کی عظمت کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور Mathieu کی ہیرو ازم کو سراہا گیا ہے۔ لیکن انہیں ہم بنظر غائر دیکھیں تو یہ بات بہت جلد واضح ہو جائیگی کہ سارترے نے جس طور سے مدافعتی تحریک کی تعریف کی ہے، وہ دراصل اس تحریک کی روح سے غداری ہے۔

Nazis sans Sapultare کے جانبدار اذیتوں کو خاموشی سے اس لئے نہیں سہہ رہے ہیں کہ دوسرے ذمہ دار رفیقوں کی اپنی خاموشی سے بچائیں وہ اس لئے نہیں مر رہے ہیں کہ فرانس زندہ رہے، وہ اپنی نوجوانی کی قربانی اس لئے نہیں پیش کر رہے ہیں کہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر ہو سکے۔ ان کی موت کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں کہ یہ ان کی انفرادی آزادی کا ایک اعلان ہے وہ خاموش رہنا چاہتے ہیں تاکہ تلخ انجام تک وہ "ایک مصروفیت" قائم رکھ سکیں۔ اس کے علاوہ اذیت سہتے وقت ان کی خاموشی اور کوئی مطلب نہیں رکھتی۔

وجود پرستوں کے ناولوں میں ہمیں ایسے کردار ملتے ہیں جو ایسی عورتوں سے خود کو شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں جن سے انھیں نہ تو محبت ہے اور نہ ہوگی۔ وہ ان عورتوں سے شادی کرنے سے انکار کر دیتے ہیں جن سے انہیں سچ مچ محبت ہے وہ بلاسی سنانع کے چوربن جاتے ہیں وہ ان تمام چیزوں کو جن سے انہیں بے انتہا محبت ہے تباہ و برباد کرنے میں ایک عجیب مسرت محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہوئے وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے انفرادی آزادی کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

"ایم کیمس" نے جس کی حیثیت ایک ممتاز وجود پرست کی ہے، بیانگ کہہ دیا ہے کہ "درحقیقت سنجیدہ فلسفیانہ مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ خودکشی کا ہے"۔ عوام کی اجتماعی کوششوں اور ذمہ داریوں سے محبت اور پیار، سائنس اور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر یقین، مابعد الطبیعاتی آزادی نہیں بلکہ کام کرنے، پڑھنے، سوچنے اور فرصت کی آزادی حاصل کرنیکا جذبہ — وجود پرستی ان تمام قدروں کی جو جمہوری فرانس کی تعمیر میں حصہ لینے والے نوجوانوں کے لئے ضروری ہیں، منکر ہیں۔ لیکن فرانس کے نوجوان وجود پرستی کے طبقاتی مفہوم اور اس کے سیاسی مقاصد کو پہچان چکے ہیں۔ وہ خود کو کبھی بھی اس خودکشی اور موت کے فلسفہ کا شکار نہیں بننے دیں گے۔

ساحر لدھیانوی

آوازِ آدم

(پاکستان میں ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی سرزنش پر)
—— فیض کی نظم "سرِ مقتل" کے تتبع میں ——

دبے گی کب تلک آوازِ آدم، ہم بھی دیکھیں گے
رُکیں گے کب تلک جذباتِ برہم، ہم بھی دیکھیں گے

چلو یونہی سہی یہ جورِ پیہم، ہم بھی دیکھیں گے
درِ زنداں سے دیکھیں، یا عروجِ دار سے دیکھیں

تمہیں رسوا سرِ بازارِ عالم، ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو، مآلِ شوکتِ جم، ہم بھی دیکھیں گے

بہ زعمِ قوتِ فولادِ و آہن، دیکھ لو تم بھی
بہ فیضِ جذبۂ ایمانِ محکم، ہم بھی دیکھیں گے

جبینِ کجکلاہی خاک پر خم، ہم بھی دیکھیں گے
مکافاتِ عمل، تاریخ کہنہ کی روایت ہے

کرو گے کب تلک ناوک فراہم، ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم، ہم بھی دیکھیں گے

یہ ہنگامِ وداعِ شب ہے، اے ظلمت کے فرزندو
سحر کے دوش پر گلنار پرچم، ہم بھی دیکھیں گے

تمہیں بھی دیکھنا ہوگا یہ عالم، ہم بھی دیکھیں گے

غلام ربانی تاباں

پاکستانی ادیبوں کی گرفتاری پر

ساتھیو جن کی سیاست کے تم شکار ہوئے
سمجھ لیں وہ کہ سیاست بدل بھی جاتی ہے

نشے میں آج حکومت کے چور ہیں جو لوگ
وہ جان لیں کہ حکومت بدل بھی جاتی ہے

مذاقِ جہد و طلب قید ہو نہیں سکتا
جنون طوق و سلاسل سے اور بڑھتا ہے

گذشتہ دور کی تاریخ اس کی شاہد ہے
یہ دھارا بند لگانے سے اور چڑھتا ہے

تمہارے پاؤں میں زنجیر ڈالنے والے
بدلتے وقت کو بیڑی پنہائیں گے کیسے

یہ ظلمتوں کے نمائندے رات کے بیٹے
طلوعِ صبح پہ بندش لگائیں گے کیسے

مرے عزیزو! مرے ساتھیو!! نہ گھبراؤ
قدم بڑھاؤ کہ منزل قریب ہے اب تو

جلالِ موج و تلاطم سے کھیلنے والو
دیارِ شوق کا ساحل قریب ہے اب تو

نیاز حیدر

امن کی راہ پر

قسم اُٹھاؤ کہ ایشیا میں، کبھی غلامی نہ رہ سکے گی
پنپ سکے گا نہ کوئی فتنہ، نظر میں خامی نہ رہ سکے گی
شکستگی کی سڑی ریاست، بدانتظامی نہ رہ سکے گی
ہم اس کو باقی نہ رہنے دینگے جو شے عوامی نہ رہ سکے گی
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

صدائیں آتی ہیں دشت و در سے کہ توڑ دو کاسۂ گدائی
نہ کرنے پائے گی موت اب سے تباہ کاری کی رہنمائی
پسند ہے جس حیات دشمن کو ایٹمی بم کی یہ لڑائی
عوام کے سامنے اُسے لاؤ چیانگ ہو یا ہو باؤ وائی
کہ بدمعاشوں کی عمر کا لمحہ تیزی سے گل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

بجھے ہوئے بیوگی کے گیتوں کو آج "آتش جمال" کر دو
ہر ایک پیاسے کو زندگی کی شراب دے کر نہال کر دو
حریفِ انجام بن کے اُٹھو وجودِ غربت محال کر دو
اگر کہیں پھن اُٹھائے موذی اُسے وہیں پائمال کر دو
چلی جدھر شانتی کی سینا اُدھر کو سنسار چل رہا ہے

بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

پہن کے وردی نہ بننے پائے زمیں کی دشمن کوئی جوانی
بچالے اے بوڑھی مامتا منتوں مرادوں کی شادمانی
تری لرزتی دعا پہ ہنستی ہے جنگ بازوں کی حکمرانی
مگر تری لازوال آنکھوں میں ہے وہی تابِ پاسبانی
نہ سونپ اس کو فنا کے ہاتھوں جو تیری آنکھوں میں پل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

صنم گروں، شاعروں کی جے ہو، تمدن و ارتقا کی جے ہو
شبابِ نو آفتابِ نو کی، سحر کی، بادِ صبا کی جے ہو
روایتوں، معبدوں، ہر اک ابتدا ہر اک انتہا کی جے ہو
انہی بدلتے ہوئے سروں سے خوشی کا نغمہ اُبل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

سلامتی ہچھا نجھنوں دفوں کی، ستار، وینا، پکھاوجوں کی
سلامتی ہبیندیوں، تلک، راکھیوں کی، سرشار ہولیوں کی
سلامتی ہ پائلوں دوپٹوں نقابوں، محجوب گھونگھٹوں کی
سلامتی ہ چاندنی کی ٹھنڈک سے جلنے والے جوان دلوں کی
سلامتی ہ اس خیال کی جو زمیں کے سینے میں ڈھل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

سلامتی چلنوں، جھروکوں، دریچوں، دیواروں اور شنوں کی
سلامتی! انتظار کی آنچ میں گھلتی ہوئی شبوں کی
سلامتی اے عزیز بچو! حسیں کھلونوں کی، پالنوں کی
تھپکتے جھولا جھلاتے ہاتھوں، سہانی رس دار لوریوں کی
سلام اُس پر جو گولیوں میں، بمک رہا ہے مچل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

سلام ہو کامناؤں، اچھاؤں، آرزوؤں، ضرورتوں پر
سلام روٹی پہ اشتہا پر، تمام فطری مطالبوں پر
بیان و اظہار کے تقاضوں کی جیت پر اور مقصدوں پر
سلام ہو بے پناہ افکار پر، خود آگاہ جذبوں پر
سلام اُس پر جو آپ ہی آپ گرتے گرتے سنبھل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

بچاؤ اُن خلوتوں کو جو اکتساب و رومان کے لئے ہیں
بچاؤ اُن نکہتوں کو جو گیسوؤں کی پہچان کے لئے ہیں
بچاؤ اُن راحتوں کو جو بے قرار انسان کے لئے ہیں
مٹاؤ اُن بے حیاؤں کو جو خراج و تاوان کے لئے ہیں
اُسے نہ چھوڑو جو خون جنتا کا پی کے سنکٹ اُگل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

حسین ہے وہ کلام جس سے لہک اُٹھیں امن کے ترانے

عظیم ہے وہ پیام جس سے اُبل پڑیں زیست کے خزانے
ذلیل ہے وہ نظام جس میں اسیر ہوں گیت اور فسانے
نہ جن کو ہم نے بدل دیا ہو، گنا ؤ ایسے بھی کچھ زمانے
ہمارے ہی دم قدم سے تو زندگی کا دستور چل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

وہ چاہتے ہیں کہ حق و باطل میں کوئی تمیز رہ نہ جائے
وہ چاہتے ہیں کہ بندھنوں کے سوا کوئی چیز رہ نہ جائے
وہ چاہتے ہیں کہ سائبان اور گھر کی دہلیز رہ نہ جائے
ہمارا فرمان ہے کہ بربادیوں کی بنجر یز رہ نہ جائے
ہمارا فرمان اُن کو اپنی اجل سے بھی بڑھ کے کھل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے

اسی ٹرومن کی طرح خونی، ایک اور پروردۂ اجل تھا
زمین مقتل بنی ہوئی تھی، وبال جاں ایک ایک پل تھا
مگر وہ لینن کے لال جن کا بچن کھرا، فیصلہ اٹل تھا
یہ کوریا کیا وہی نہیں ہے، جو ایستالن گراڈ کل تھا
جہاں سے میکارتھر کی اُمید کا جنازہ نکل رہا ہے
بلند ہے زندگی کا پرچم، جہاں کا نقشہ بدل رہا ہے
وہ جنگ کی تُند و تیز آندھی میں امن کا دیپ جل رہا ہے
اُٹھاؤ بیڑا کہ ایشیا میں کبھی غلامی نہ رہ سکے گی

فارغ بخاری

چاند کے راہی سے.....

ذہنِ انسان ابھی محوِ غمِ دوش میں ہے
زندگانی ابھی آلام کے آغوش میں ہے
مئے نہیں زہر ابھی ساغرِ مینوش میں ہے
ابھی آرائشِ گلزارِ زمیں باقی ہے

ابھی ہر چہرے پہ نکبت کا دھواں ہوتا ہے
ابنِ آدم ابھی شعلوں میں جواں ہوتا ہے
ابھی دُنیا پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے
ابھی آرائشِ گلزارِ زمیں باقی ہے

ابھی آزار ہی آزار یہاں بستے ہیں
ابھی کٹیاؤں پہ محلوں کے کلس ہنستے ہیں
قہقہے نالہ گزاروں کو ابھی ڈستے ہیں
ابھی آرائشِ گلزارِ زمیں باقی ہے

ابھی سرمایہ کا افسوں یہاں طاری ہے
ابھی مزدور کی قسمت میں وہی خواری ہے
جس طرف دیکھئے افلاس کی بیماری ہے
ابھی آرائشِ گلزارِ زمیں باقی ہے

مہ و انجم پہ جھپٹنے کا ابھی وقت نہیں
عرش والوں سے نپٹنے کا ابھی وقت نہیں
اپنے ماحول سے کٹنے کا ابھی وقت نہیں
ابھی آرائشِ گلزارِ زمیں باقی ہے

بلراج کومل

صبح ہونے پر

نصف شب کی برستی آنکھوں میں تنہا بیٹھا میں جھانکا کرتا ہوں
ناچ اُٹھتا ہوں صبح ہونے پر
دُکھ بھری ایک رات کھونے پر
چیختی خامشی کے سایوں سے جانے کیوں کر اُلجھتا رہتا ہوں
سوچتا ہوں تو سوچے جاتا ہوں
آپ ہی آپ مسکراتا ہوں
تیرتی ڈولتی حسیں یادیں انگلیوں کی لذیذ نرمی سے
دِل کی دھڑکن کو گدگداتی ہیں
سازِ تخئیل چھیڑ جاتی ہیں
اور پھر سوچتا ہوں گاؤں میں یوں کہوں میرے جاگتے نغمو!
تھرتھراؤ میرے ہونٹوں پر
پھیل جاؤ فضا میں لہرا کر

(۲)

لیکن اس سوچ کی نگاہوں میں ان گنت حادثات کے قطرے
ایک دم جھلملانے لگتے ہیں
رنگ اپنے دکھانے لگتے ہیں
صبح ہوتے ہی ہونٹ کہتے ہیں ایسے نغموں سے دل نہ بہلے گا
آؤ جینے کی بات سوچیں ہم
آؤ جینے کی بات سوچیں ہم

راشد حیدرآبادی

دِل بہلتا ہی نہیں

کھیلتا ہوں تیرے عارض سے کبھی شعلوں سے
دل کسی طرح مگر ہائے بہلتا ہی نہیں

یوں بھی راتیں تیری آنکھوں میں بسر کی میں نے
مجھ کو معلوم نہیں کیسے سحر کی میں نے

چاند تاروں کی ضیا سے بھی خبردار نہ تھے
جیسے فطرت کی اداؤں کے خریدار نہ تھے

یوں مرے جذبۂ پرشوق نے گایا اکثر
گرمیٔ شورشِ دوراں نے جگایا اکثر

میرے خوابوں کے حسیں راز بکھر جاتے ہیں
ڈھلکے عزم پہ پرواز میں لہراتے ہیں

کتنی ہی بار یہ پیمانِ وفا ٹوٹ گئے
دفعتہً ہاتھ سے جامِ گُلِ تر چھوٹ گئے

پیار اک کربِ مسلسل نظر آیا اکثر
یوں بھی جذبات نے آئینہ دکھایا اکثر

ہر حقیقت بھی مجھے خام نظر آتی ہے
زندگی لرزہ بر اندام نظر آتی ہے

شوق پھر یوں مئے احساس کو چھلکاتا ہے
حُسن کے ساز پہ اک نغمۂ نو گاتا ہے

یوں بھی انداز محبت کے اُبل آتے ہیں
نغمے طوفان میں تبدیل ہوئے جاتے ہیں

جو کئی بار کئے خاک غمِ انساں کو
اپنی للکار سے دھلائے درِ زنداں کو

خوں میں لتھڑے ہوئے نغموں کی ہے رفتار وہی
ظلم کی چھاؤں میں ہے عظمتِ کردار وہی

زندگی موت کے پنجے میں مگر زندہ ہے
جس کا ایقان اجل کو بھی کہ پائندہ ہے

ہاں اسی ایک تمنا میں جئے جاتا ہوں
زہر کے جام بھی لہرا کے پئے جاتا ہوں

کھو کے دیکھا ہے تیرے حُسن کے نظاروں میں
تپ کے دیکھا ہے دہکتے ہوئے انگاروں میں

کھیلتا ہوں کبھی عارض سے کبھی شعلوں سے
دل کسی طرح مگر ہائے بہلتا ہی نہیں

مجروح سلطانپوری

○

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرمِ سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقشِ پا کہ چراغِ راہگذر نہ ہو

رُخِ تیغ سے جو نہ ہو کبھی سحر ایسی کوئی نہیں مری
نہیں ایسی ایک بھی شام جو تہِ زلفِ دار بسر نہ ہو

میں ہزار شکل بدل چکا چمنِ جہاں میں سُن اے صبا
کہ جو پھول ہے ترے ہاتھ میں یہ مرا ہی لختِ جگر نہ ہو

نہیں خار کوئی کہ گُل نہ ہو قدمِ عمل میں جو دیکھئے
کفِ دستِ شوق میں ایک بھی وہ خزف نہیں کہ گہر نہ ہو

ترا سر فلک پہ جھکا جھکا ترے بازیں پہ رُکے رُکے
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

جنھیں سب سمجھتے ہیں مہر و مہ نہ ہوں صرف چہرہ نقوشِ پا
جسے کہتے ہیں کرۂ زمیں فقط ایک سنگِ سفر نہ ہو

○

ظہور نظر

○

ہائے یہ رنگِ شفق یہ شام سنولائی ہوئی
کاش ہوتی یہ فضا ہم کو بھی راس آئی ہوئی

مل گیا غازہ تو صبح اور کھو گیا غازہ تو شام
زندگی بھی تیرے رخساروں کی رعنائی ہوئی

داستانِ کوہکن دُہرا رہا ہے آج کون
دیکھتا ہوں عظمتِ پرویز تھرّائی ہوئی

میکشو! مژدہ کہ اب ہو کر رہے گا کچھ نہ کچھ
تشنگی ہے ساغر و ساقی سے ٹکرائی ہوئی

میں بہ اندازِ دگر صحنِ چمن میں آ گیا
اب نہ رہ پائے گی کوئی شاخ مرجھائی ہوئی

وقت کے سینے پہ صبحِ نَو نے بکھرا دی ہے زلف
زندگی اب خندہ لب ہے موت گھبرائی ہوئی

جنگ کے جلتے بگولے اب نہ اُٹھیں گے نظرؔ
امن کی ٹھنڈی گھٹا ہے جھوم کر آئی ہوئی

عابد حشری

○

ماحول کی دھندلی صورت کے یوں نقش اُبھارا کرتے ہیں
ہم ظلمتِ شب سے صبحِ طرب کے رنگ نکھارا کرتے ہیں

یہ اہلِ خرد کیا سمجھیں گے بے باک عزائم کی عظمت
طوفاں سے اُلجھنے والے ہی ساحل سے کنارا کرتے ہیں

تم ظلمتِ شب کے پروردہ ہم خالقِ رنگ و نورِ سحر
تم نقش مٹایا کرتے ہو ہم نقش اُبھارا کرتے ہیں

اس بندشِ لب سے بڑھتا ہے کچھ اور تلاطم سینوں کا
موجوں کی خموشی کے تیور طوفاں کو اشارا کرتے ہیں

حشریؔ مجھے فکرِ منزل کیا منزل ہے مرا اک نقشِ قدم
میں وہ ہوں مجھے روشن جادے ٹھوکر سے پکارا کرتے ہیں

مسعود حسین

گیت

درد بڑھے اور تو نہیں آئے!
دُوری، دُوری کتنی دُوری!
بن گئی دُوری اک مجبوری
کس سے کہوں مجبوری ہائے!
درد بڑھے اور تو نہیں آئے!

۱

لو تم میرے لئے مت آؤ
کھیل رہا ہے وہ آنگن میں
آپ اکیلا، کون کھلائے؟
درد بڑھے اور تو نہیں آئے!

ٹھیر گئے ہیں شاید یہ پل!
ہو گئیں سانسیں پھر کیوں بوجھل
اٹل سمئے جلدی جلدی چل
جی گھبرائے! جی گھبرائے!!
درد بڑھے اور تو نہیں آئے!

(لندن سے)

آسمانی تلوار

خواجہ احمد عباس

آؤ بیٹا آؤ! باہر بارش میں کیوں کھڑے ہو؟ اندر آجاؤ۔ نہیں تو سردی لگ کر بخار ہو جائیگا۔ جب تک پانی پڑ رہا ہے تم غریب بڑھیا کی جھونپڑی میں آرام کرو، پھر چلے جانا..... بھگوان کی لیلا نیاری ہے بیٹا! جس بارش سے دھرتی میں زندگی پڑتی ہے، بیج کونپل بنتا ہے اور کونپل پودا بنتی ہے۔ وہی بارش سیلاب بن کر ہزاروں کی جان لے لیتی ہے۔ جب گنگا مائی بپھر جاتی ہے تو پورے پورے گاؤں بہا کر لے جاتی ہے۔ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے۔ اور کیا؟ جیسا بوؤ گے ویسا ہی کاٹو گے۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ سب دیکھتی رہتی ہے اور جب پاپ اور ظلم حد سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو وہ آنکھ ایک ہی نظر میں سب کو بھسم کر ڈالتی ہے۔

یوں تو بھگوان کے لاکھوں ہتھیار ہیں۔ ایک سے ایک انوکھے! اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب کسی پر پڑتی ہے تو پتہ بھی نہیں چلتا اور اپنا کام کر جاتی ہے۔ لیکن سب سے زبردست ہتھیار بھگوان نے اندر دیوتا کو سونپ رکھا ہے، اور ہونا بھی یہی چاہیئے۔ سارے دیوی دیوتاؤں کے وہ راجہ جو ٹھہرے دیولوک میں ان کا ہی تو حکم چلتا ہے۔ سچائی کی فوج کو لے کر راکھشسوں سے بھی انھیں ہی تو لڑنا ہوتا ہے۔ تو ایسے خطرناک دشمنوں کا سامنا کرنے کے لئے ہتھیار بھی خطرناک ہونا چاہیئے۔

یہ بجلی جو تم بادلوں میں چمکتے ہوئے دیکھتے ہو بیٹا! یہی اندر دیوتا کی دو دھاری تلوار ہے۔ اس کی چمک اور کڑک بڑے بڑوں کا دل دہلا دیتی ہے۔ پلک جھپکتے میں اپنا کام کر کے پھر آسمان پر اندر دیوتا کے پاس پہنچ جاتی ہے جبھی تو بادلوں کی گرج سنتے ہی پاپی کانپنے لگتے ہیں۔ اندر دیوتا کی یہ تلوار لوہے فولاد کی بنی ہوئی نہیں بیٹا! لوہے کی تلوار کو تو زنگ بھی لگ جاتا ہے۔ دھار بھی کھنڈی ہو جاتی ہے۔ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ لیکن نرالا ہتھیار تو ایک انوکھی ہی دھات کا بنا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بڑے پہنچے ہوئے رشی نے بھگوان کی اتنی بھگتی اور تپسیا کی کہ ان کے جسم کا سارا گوشت جھڑ گیا بس سوکھی ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا۔ ان متبرک ہڈیوں سے جو ہیرے کی طرح سخت اور تیز اور چمکیلی تھیں، بھگوان نے ایک تلوار بنائی اور وہ اندر دیوتا کو سونپ دی کہ جہاں کہیں پاپ اور ظلم کو بڑھتا ہوا دیکھیں اس آسمانی تلوار سے اس کو ختم کر دیں۔

یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا بیٹا! کہ بجلی کالے سانپ پر گرتی ہے۔ بھلا کیوں؟ اس لئے کہ زہریلے ناگ پچھلے جنم میں پاپی اور ظالم تھے جنھوں نے دوسروں کو ڈس کر دکھ پہنچایا اور دنیا میں زہر پھیلایا۔ اسی کی تو یہ سزا ہے کہ اس بار بھگوان نے انھیں سانپ کے روپ میں پیدا کیا۔ لیکن بجلی صرف سانپوں پر ہی نہیں، بے ایمان، گندے اور زہر بھرے انسانوں پر بھی گرتی ہے۔ بھگوان شو کی آنکھ اُجلے کپڑوں، اونچی پگڑیوں اور امیری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھاتی۔ وہ دل کے اندر کی ساری میل اور کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے۔ اور جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہنچتی ہے۔

تم لوگ پڑھے لکھے ہو بیٹا! ایک پاگل بڑھیا کی بات کیوں مانو گے لیکن میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں سب سچ ہے۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کتنے برس کی بات ہے شاید بیس پچیس تیس برس ہوئے ہوں گے۔ اب بھی بہتیرے لوگ اس گاؤں میں ہوں گے جنھیں یہ بات یاد ہوگی۔ اور اگر اپنی آنکھوں دیکھا ثبوت چاہتے ہو تو تالاب کے پرے کھیتوں کے بیچ میں جو نیم کے پیڑ کا ٹھنٹھ کھڑا ہے جا کر اُسے دیکھ لو۔ کسی زمانے میں یہ اتنا بڑا اور گھنا پیڑ تھا کہ بیس آدمی بھی نیچے کھڑے ہو جائیں تو ان پر ایک بوند بارش کی نہ گرے۔ لیکن اس دن سے آج تک اس کی ٹہنیوں میں کبھی ہریالی نہیں آئی۔ یوں ہی جلا بھنا کھڑا ہے اور آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھائے اس دن کی یاد دلا رہا ہے.....

وہ بارش مجھے آج تک یاد ہے۔ اس برس سے بھی کہیں زیادہ پانی برسا تھا۔ یہ کچی سڑک جو آگرہ والی پکی سڑک سے ہمارے

گاؤں تک آتی ہے پوری پانی میں ڈوب گئی تھی اور آنے جانے والے کھیتوں کھیتوں پگڈنڈیوں پر سے آتے جاتے تھے۔ ہم اچھوتوں کی جو بستی گاؤں کے باہر ہے یہاں کتے ہی جھونپڑوں کی کچی اینٹوں کی دیوار گر پڑی تھی۔ ایک ننھا سا بیس بائیس دن کا بچہ بھی مر گیا تھا۔ . . . .

مجھ بڑھیا کو معاف کرنا بیٹا! میری آنکھیں دُکھتی ہیں تو پانی نکلتا ہی رہتا ہے۔ ہاں تو اس برسات میں ایک دن کی بات ہے کہ رات بھر کی موسلا دھار بارش کے بعد صبح سویرے پانی ذرا رُکا تو بہت سے گاؤں والے جو کئی دن سے اپنے گھروں میں بند بیکار بیٹھے تھے کام کاج کو نکل پڑے۔ کوئی کھیتوں میں نلائی کرنے نکل گیا کسی کو پاس کے قصبے میں کوئی کام یاد آگیا۔ سوموار کا دن تھا۔ شاید اس دن سامنے والے گاؤں راجپوتوں میں بازار لگتا تھا۔ کئی ایک وہاں چلے گئے۔ مگر آسمان پر بادل تب بھی چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی ٹھکانا نہیں بیٹا، کون جانے کب پھر جھڑی لگ جائے۔ اور ہوا بھی یہی۔ دو چار گھنٹے تو گھلا رہا پھر وہ گھٹا ٹوپ چھایا کہ دن میں رات جیسا اندھیرا ہو گیا۔ ساتھ میں گھڑی گھڑی بجلی ایسی چمکنے لگی جیسے اندھیرے میں کوئی تلوار چلا رہا ہو۔ پھر ایک دم موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بالکل ایسی جیسے آج ہو رہی ہے۔

گاؤں کے کتنے ہی آدمی باہر نکلے ہوئے تھے۔ جو کہیں پاس ہی تھے وہ تو بھیگتے بھاگتے گاؤں کی طرف بھاگے۔ جو دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے وہ وہیں رُک گئے۔ لیکن چار آدمی ایسے تھے جو نکلے تو تھے الگ الگ مگر ایک ایک کر کے اسی نیم کے نیچے پہنچ گئے۔ یا یوں کہو کہ ان کی قسمت انھیں وہاں کھینچ کر لے آئی . . . . .

ان چاروں میں سے تم نے کسی کو تو کیا دیکھا ہو گا، بیٹا! ان دنوں تم تو شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ پھر بھی شاید ان میں سے ایک کا نام تو سُنا ہو گا۔ یہ جو آج کل ہمارے زمیندار ہیں نا، ان کا بڑا بھائی ٹھاکر ہرنام سنگھ۔ بڑا تگڑا اور رنگیلا نوجوان تھا۔ یہ چوڑی چھاتی بڑی بڑی بارعب مونچھیں۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ آس پاس کے ٹھاکروں کی کتنی ہی بیٹیاں اس کے نام پر کنواری بیٹھی تھیں۔ گاؤں میں کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جاتا تو لڑکیاں اسے کیواڑوں کے پیچھے چھپ کر جھانکتیں۔ زبان کا بھی بڑا میٹھا تھا۔ بولتا تھا ایسا کہ سننے والے پر بس جادو ہی ہو جائے . . . . .

آج نہ جانے میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا! بہے ہی جا رہی ہیں . . . . .

ہاں تو وہ تھا زمیندار کا بیٹا، مگر پرجا سے ہمیشہ میٹھا بول ہی بولتا تھا۔ انعام و اکرام بھی بہت دیتا تھا۔ گاؤں بھر میں سب اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ کہتے کہ زمیندار ہو تو ہرنام سنگھ جیسا ہو۔ شکار کا بہت شوق تھا اُسے۔ اس دن بھی گھوڑے پر سوار ہو کر مرغابیوں کے شکار کو نکلا تھا لیکن جھیل تک پہنچا نہیں تھا کہ بادلوں کی کڑک سے گھوڑا ایسا بدکا کہ بھاگتا بھاگتا دلدل میں جا گرا۔ ٹھاکر مرتے مرتے بچا۔ مگر گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ بے زبان جانور کو درد سے چلاتے دیکھا تو ٹھاکر سے نہ رہا گیا اور اُسے گولی مار دی۔ میں نے کہا نا کہ وہ تھا بڑا رحمدل اِدھر سے پیدل اپنی کوٹھی کو واپس جا رہا تھا کہ ایک دم زور کی بارش آگئی اور بھاگ کر نیم کے پیڑ کے نیچے پناہ لینا پڑی۔ جہاں اس کے تین جاننے والے پہلے ہی سے وہاں کھڑے تھے۔

ان میں سے ایک تو پنڈت دھرم داس تھا۔ دُبلا پتلا سوکھا سا برہمن۔ گلے میں جنیو، ماتھے پر پیلا چندن کا ٹیکا۔ سارے گاؤں میں وہی سب سے زیادہ پڑھا لکھا عقلمند شخص تھا۔ کہتے تھے اُسے سارے وید شاستر زبانی یاد تھے۔ ہر وقت اُسے دھرم اور سماج کی رکشا ہی کی فکر رہتی تھی۔ یہ اُسی کا دم تھا کہ ہمارے گاؤں میں ادھرمی اور ناستک خیالات کبھی نہ پھیل سکے۔ ایک بار کہیں سے ایک سدھارک آگیا اور لگا کہنے کہ ہندوؤں کو ذات پات چھوڑ کر اچھوتوں کو اپنا بھائی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن دھرم داس نے ناستک اور ادھرمی کہہ کر اُسے فوراً گاؤں سے نکلوا دیا۔ دھرم داس خود تو غیر شادی شدہ تھا لیکن اُسے گاؤں کی عزت و آبرو کا بہت خیال رہتا تھا۔ گاؤں کے کسی لڑکے یا لڑکی کو کبھی ایسی ویسی بات کرتے دیکھ لیتا تو آگ بگولا ہو جاتا اور پنچایت سے ایسی کڑی سزا دلواتا کہ پھر کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ وہ پاپ کے راستے پر قدم بھی رکھ سکے۔ ہاں ایک لڑکی تھی مولو رام سُنار کی ابھاگن بیٹی چندا۔ وہ نہ جانے کیسے پاپ کے گڑھے میں گر پڑی۔ اس کلنکنی نے جوان بیاہی ہو کر بچہ جنا تھا۔ ماں باپ نے اُسے کتنا ہی پیٹا اور پنچوں نے کتنا ہی سمجھایا، دھمکایا لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ بچے کا باپ کون ہے۔

یہی کہتی رہی کہ میں نے باپ کیا ہے جو ہزار دیتا ہے مجھے دیدو۔ اس لئے پنڈت دھرم داس کے کہنے پر چندا کو اس کے باپ کی نشانی سمیت گاؤں سے باہر نکال دیا گیا۔ پھر گاؤں والوں نے سُنا کہ اسے گاؤں کے باہر اچھوتوں کی بستی میں پناہ مل گئی ہے اور یہ سُنکر پنڈت جی نے کہا کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کیونکہ بھگوان کی نظر میں پاپی اور اچھوت برابر ہی ہیں۔

دوسرا، وہاں پیڑ کے نیچے، ساہو کار مولچند تھا جو رہتا تو تھا راجپور میں لیکن جس سے لین دین ہمارے گاؤں والوں کا بھی بہت چلتا رہتا تھا۔ جب بھی ضرورت پڑے اس کے پاس چلے جاؤ۔ روپے کا انتظام کر ہی دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بیاج کڑا لیتا تھا۔ اور پہلے برس کا بیاج تو رقم میں سے پہلے ہی نکال لیتا تھا۔ لیکن سب کہتے۔ یہ تو ساہو کاری کا اصول ہے، اس کا کیا رونا۔ مولچند بات تو بڑی حلیمی سے کرتا ہے اور آڑے وقت میں کام بھی آتا ہے.....

وہ دین دھرم کے کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا۔ کتھا ہو، پوجا ہو، پاٹھ ہو، کیرتن ہو، ہون ہو۔ ہر بات میں سب سے بڑی رقم چندہ کی اس سے ملتی تھی۔ دان دھرم کا اسے بہت خیال رہتا تھا۔ مولو رام سُنار کی بیٹی چندا کو جب گاؤں والوں نے نکال دیا تو مولچند مہاجن نے پنڈت جی کو بہت شاباش دی اور کہا "پنڈت جی، تم نے پھر بھی نرمی برتی۔ ہمارے گاؤں کی کوئی چھوکری ایسا کرتی تو ٹانگیں توڑ دیتے ہم اس کی ٹانگیں"۔ ایک اور بات مول چند کی یہ تھی کہ وہ کپڑے ہمیشہ بڑے اُجلے پہنتا تھا۔ جیسے ابھی دھوبی کے گھر سے دُھل کر آئے ہوں۔ مہین مَل کا بیل لگا ہوا کرتہ، آستینوں پر چنٹ پڑی ہوئیں اور سفید چمکتی دھوتی۔ عطر بھی بہت لگتا تھا۔ دُور ہی سے پتہ چل جاتا کہ مہاجن آرہا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے کہ اس کا پسینہ بڑا بدبودار ہے اسی لئے اتنا سارا عطر لگاتا ہے۔ ایک دن کسی نے اس سے کہا "مہاجن، یہ تمہارے کپڑے ہر وقت اتنے اُجلے کس طرح رہتے ہیں؟ دن میں دو تین بار بدلتے ہو گے؟" اس پر وہ ہنس کر بولا "یہ دھوبی کی دھلائی کی بات نہیں ہے بھیّا۔ یہ من کی صفائی ہے۔ اور تم جانو من اُجلا سو تن اُجلا۔ تن اُجلا سو من اُجلا"۔

تیسرا وہاں رحمت خاں پٹواری تھا بیٹا! اب تو پٹواریوں نمبرداروں کی وہ پرانی بات رہی نہیں لیکن ان دنوں تو یوں سمجھو کہ رحمت خاں ہمارے گاؤں کا بادشاہ جارج پنجم، وائسرائے، چھوٹا لاٹ اور کلکٹر صاحب، سب کچھ ہی تھا۔ زمینوں کا ناپنا، داخل خارج، سب کام اسی کے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ گاؤں والے ٹھہرے اَن پڑھ، جیسے ساہو کار کے کہنے پر اس کے کاغذ پہ انگوٹھا لگا دیتے تھے ویسے ہی پٹواری کے کہنے سے سٹامپوں اور سرکاری کاغذوں پر انگوٹھا لگا دیتے تھے۔ زمینوں کے بارے میں جو کام بھی ہوتا وہ رحمت خاں خوشی سے کر دیتا اور کام ہو جانے پر وہ بھی اُسے خوش کر دیتے تھے۔ اب اسے چاہے رشوت سمجھ لو یا کچھ اور سمجھ لو۔ لیکن ویسے بڑا شاندار آدمی تھا۔ لمبی داڑھی تھی روزے نماز کا بڑا پابند تھا۔ گاؤں کی مسجد میں پانچوں وقت حاضری دیتا تھا۔ ایک بار حج بھی کر آیا تھا اور اس سال پھر حج کو جانے کی بات کر رہا تھا اور اسی لئے اُسے خوش کرنے کے لئے اب کسانوں کو ذرا زیادہ رقم دینی پڑتی تھی۔ وہ بیویاں تھیں۔ اور دونوں سے وہ بڑا کڑا پردہ کرواتا تھا۔ خاص کر چھوٹی سے جو شکل سے بیس بائیس برس کی ہو گی اور عمر میں اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ ذات کا پٹھان تھا اس لئے دماغ ذرا گرم تھا۔ ویسے بھی نگڑا تو تھا ہی۔ ایک دن تاؤ میں آکر نور بخش جولاہے کے تھپڑ مار دیا تھا کیونکہ اس نے اچھی طرح خوش نہیں کیا تھا۔ تو وہ تین دن کھاٹ پر پڑا رہا۔ ایسے ہی ایک دن چھدو چمار پر غصّہ آگیا تو اُسے زمین پر دے مارا۔ لیکن ایسا غصّہ وہ نیچ ذات والوں کے ساتھ ہی برتتا تھا۔ زمیندار صاحب سے، پنڈت جی سے، ساہو کار سے وہ بڑے ادب سے بات کرتا تھا۔ اور گاؤں میں تحصیلدار۔ نائب تحصیلدار، تھانے دار یا کوئی دوسرا افسر دورے پر آنکلتا تو ان کے خیر مقدم میں وہ اتنی دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ سب کہتے "اپنا پٹواری ہے بڑا دل والا اور اس کی پہنچ بھی دیکھو کتنے بڑے بڑے افسروں تک ہے....."

ہاں تو یہ چاروں پیڑ تلے کھڑے بھگوان سے پرارتھنا کر رہے تھے کہ بارش رُک جائے۔ اس دن گرج چمک بھی بہت زوروں پر تھی ایک بار بجلی زور سے چمکی تو وہ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے پگڈنڈی پر رلدو چمار اور وہ سُنار کی لونڈیا چندا جسے انھوں نے گاؤں نکالا دے رکھا تھا۔ دونوں پانی میں شرابور اس پیڑ کی طرف چلے آرہے ہیں۔

ہاں بیٹا! یہ بتانا تو میں بھول ہی گئی تھی کہ بڈھا رلدو چمار تھا تو ذات کا اچھوت لیکن چونکہ گاؤں والے اُسی سے جوتے بنواتے تھے اسلئے گاؤں کے سارے بچے اسے رلدو کا کا۔ رلدو کا کا کہتے تھے جس دن چندا کو گاؤں سے نکالا گیا وہ اچھوتوں کی بستی میں سے اپنے بچے کو لئے۔ وقی ہوئی جارہی تھی۔ رلدو نے دیکھا تو کہا "بیٹی اس حالت میں تو کہاں جائے گی جب تک تیرے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو، تو میرے ہاں ٹھہر جا" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ سو چندا رلدو چمار کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہنے لگی۔ اُس کے باپ نے جب یہ سُنا تو اس نے بھی کہا "چنوا اچھا ہی ہوا۔ رلدو ہے تو چمار لیکن اپنی جان پہچان والا ہے اور ویسے آدمی بھی اچھا ہے۔ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے سے تو یہی اچھا ہے کہ چندا اسی کے ہاں رہے" لیکن بہت سے اونچی ذات والے ایسے بھی تھے جو کہنے لگے کہ اچھوت کے ہاں رہنے سے تو اچھا تھا کہ چندا جھیل میں ڈوب کر جان دیدیتی۔ اور اگر بگڑے دل نوجوانوں کا بس چلتا تو وہ رلدو کا جھونپڑا جلا کر راکھ کر ڈالتے۔ وہ تو بڑے بوڑھوں نے انھیں روک لیا اور پھر بارش بھی اتنے زور سے ہو رہی تھی کہ کسی کا باہر نکلنا بھی محال تھا۔ جب آسمان پھاڑ کر اتنا پانی برس رہا ہو تو آگ کہاں لگ سکتی ہے؟

میں نے کہا نا، بیٹا، یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ بارش نے رلدو چمار کے جھونپڑے کو جلنے سے تو بچا لیا لیکن اسی بارش نے اس کی کچی اینٹوں کی دیواروں کو ڈھا دیا۔ اس وقت رلدو تو اپنی دوکان میں بیٹھا جوتے بنا رہا تھا اور چندا کے بچے کو سردی لگ کر بخار آرہا تھا اس لئے وہ ٹوپس کی چادر کے ہاں کوئی دوا مانگنے گئی ہوئی تھی۔ جھونپڑے میں بس اس کا بچہ ہی تنہا تھا۔ اتنے میں اڑا اڑا دھم پچھواڑے کی دیوار ڈھ کر پھر پیچھے آرہا۔ رلدو اور چندا دونوں بھاگے آئے۔ مگر اس وقت تک بچہ مر چکا تھا۔ ننھا مرادنھی سی جان۔ اُس نے ایک چیخ بھی تو نہ ماری۔ بس چپکے سے جان دیدی، بیٹا، میں سوچتی ہوں چندا کا بچہ اس دن مرا نہ ہوتا تو آج تمہاری عمر کا ہوتا.....

اپنے مردہ بچے کو دیکھ کر چندا کی آنکھ سے ایک بھی آنسو نہ نکلا۔ ایسی ہوگئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے اپنے بچے کے مرنے پر رو کر دل کی بھڑاس نہیں نکالی اس لئے اس کا داغ بھر گیا اور وہ پاگل ہوگئی۔

نہ جانے آج میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے بیٹا، پانی سمجھے اور تم سے ہو سکے تو بازار میں وحید جی کی جو دوکان ہے وہاں سے دوا لا دینا.... میں بھی کہاں سے کہاں بہک جاتی ہوں۔ ہاں تو رلدو چمار اور کلنکنی چندا کو اس پیڑ کی طرف آتے دیکھ کر ان چاروں کا ماتھا ٹھنکا۔

پنڈت دھرم داس نے چلا کر کہا ــــ "رلدو، کہاں منہ اُٹھائے چلا آرہا ہے۔ وہیں ٹھہر"

رلدو ٹھٹھکا، پھر دُور سے ہاتھ جوڑ کر اُس نے کہا "پنڈت جی، دیا کرو۔ طوفان بڑا بھیانک ہے۔ ہم دونوں ایک طرف کھڑے ہو جائینگے"

یہ کہہ کر رلدو آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ دھرم داس نے پھر للکارا "بس بس، ایک ذرا سا پیڑ ہی تو ہے، یہاں کون سا محل کھڑا ہے جا ایک کونے میں تم بھی کھڑے ہو جاؤ گے؟"

اور پھر اُس نے ٹھاکر ہرنام سنگھ سے کہا "ٹھاکر صاحب! انھیں یہاں نہ آنے دینا چاہیئے، نہیں تو ہم سب مارے جائیں گے"

اس پر پٹواری رحمت علی خاں بولا "کیوں پنڈت جی، کیا خطرہ ہے؟"

پنڈت بولا "تم نہیں جانتے خاں صاحب! دھرم شاستروں میں لکھا ہے کہ بجلی پاپی اور نیچ لوگوں پر گرتی ہے۔ ان میں ایک اچھوت ہے۔ دوسری کلنکنی۔ اگر یہ یہاں آگئے تو سمجھ لو ساتھ میں ہماری بھی موت آگئی"

پٹواری بولا "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو..... پنڈت جی ایسا ہے تو انھیں پاس بھی نہ پھٹکنے دینا چاہیئے"

"ہاں اور کیا" ساجن جلدی سے بولا "جان تھوڑے ہی دینا ہے ان کے لئے"

چندا جو کملی باندھے پاگلوں کی طرح ٹھاکر ہرنام سنگھ کو گھورے جا رہی تھی۔ اب مارے سردی کے کانپنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رلدو نے ایک بار پھر منت کی "سرکار، لونڈیا کو کپکپی چھوٹ رہی ہے۔ نمونیا ہو کر مر جائیگی۔ اس کا بچہ تو پہلے ہی جھونپڑے کی دیوار کے نیچے دب کر مر چکا ہے"

چندا اب بھی ٹھاکر کو گھورے جا رہی تھی۔ مگر اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور اپنی بندوق کھول کر اس کی نال میں جھانکنے لگا۔

جیسے اس بات چیت سے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ اور بیٹا تھا بھی ٹھیک، وہ ٹھہرا زمیندار، اسے ان نیچ لوگوں کے مرنے جینے سے کیا؟"

چندا کے بچے کے مرنے کا سُن کر دھرم داس نے کہا: "چلو اچھا ہوا باپ کی نشانی ختم ہوئی۔"

رلدو بولا: "ہاں پنڈت جی، جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ میں تو اسی لئے چندا کو اس کے باپ کے پاس لے جا رہا تھا کہ جس وجہ سے اس بیچاری کو گھر سے نکالا تھا وہ بچہ ہی نہیں رہا تو اب تو پرائشچت کرا کے اسے گھر میں رکھ لیں۔"

لیکن مہاجن نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی میٹھی زبان سے کام نکالنا چاہا۔ کہنے لگا: "وہ سب بعد میں دیکھا جائیگا، رلدو، مگر اب تم جاؤ کوئی اور پیڑ تلاش کرو۔ اس پیڑ کے نیچے اب کوئی جگہ نہیں ہے۔"

رلدو نے کہا: "ساہو کار جی، تم تو جانو ہو، یہاں دُور دُور کوئی دوسرا پیڑ نہیں ہے۔"

اور مہاجن نے اُسے بات سمجھانے کے لئے کہا: "رلدو، ذرا سوچ سمجھ کر بات کر، دھرم شاستر کے لکھے کا تو خیال کر۔ تم دونوں پر بجلی گرنے کا ڈر ہے۔ اپنے ساتھ کیوں ہمارا بھی خون کرواتے ہو؟ مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ مگر دیکھو تو، ٹھاکر صاحب ہیں، یہاں کے پنڈت جی ہیں، پٹواری جی ہیں....

اتنے میں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ابھاگن چندا سردی سے کانپتی، کیچڑ میں پھسلتی ان کی طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے اور اس کے پیچھے رلدو۔ چندا بیٹی کیا کر رہی ہے؟ چندا بیٹی کیا کر رہی ہے؟" کہتا ہوا۔ اور اسی وقت اُن کے سامنے کے بادلوں میں بجلی زور سے چمکی اور اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ زمین کانپ اٹھی۔

پنڈت زور سے چلایا: "ٹھاکر صاحب! بندوق سنبھالئے نہیں تو غضب ہو جائے گا۔ ہم سب مر جائیں گے۔"

ٹھاکر نے بندوق اٹھا کر کندھے سے لگائی۔ لیکن اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اپنی طرف بندوق کا منہ دیکھ کر چندا تو جیسے بالکل ہی پاگل ہو گئی۔ چلائی: "تم تو مجھے پہلے ہی مار چکے ہو ٹھاکر! اب بندوق چلانا چاہتے ہو تو یہ شوق بھی پورا کر لو۔ میں بھی اپنے بچے کے پاس پہنچ جاؤں۔" اور پھر مری ہوئی آواز میں اس نے کہا: "تمہارے بچے کے پاس۔"

اس کی یہ عجیب باتیں سُن کر سب کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ دو رادوں میں، ایک بار پھر گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ جیسے بجلی گرنے کی تیاری ہو۔ چندا کو ایک قدم اور بڑھتے دیکھ کر مہاجن چلایا: "سرکار کیا دیکھتے ہیں؟ چلائیے گولی نہیں تو یہ پگلی اپنے ساتھ ہمیں بھی لے مرے گی۔"

لیکن بیٹا ٹھاکر کی بندوق نہیں چلی۔ اس سے پہلے بھگوان کی تلوار چل گئی۔ ابھی وہ بندوق کا گھوڑا دبانے والا ہی تھا کہ ایسی بھیانک چمک ہوئی جیسے سورج ایوتا دھرتی پر آ گئے ہوں۔ رلدو اور چندا نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک دھماکہ اتنے زور کا: دھماکہ، بیٹا جیسے سینکڑوں توپیں ایک دم چلی ہوں، دھرتی کانپ اٹھی اور رلدو اور چندا زمین پر آ رہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ بجلی ان پر گری ہے.....

مگر بیٹا جسے بھگوان رکھے اُسے کون چکھے۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ وہ نیم کا پیڑ جو اُن سے دیکھ تک بجلی سے جلا ہوا ہے اور اس کے نیچے چار لاشیں جھلسی پڑی ہیں۔ ٹھاکر کی بندوق اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی لیکن اس کی نال پر بجلی گری تھی اور وہ گل کر اس طرح ٹیڑھی ہو گئی تھی جیسے موم کی بنی ہو.....

ہاں بیٹا، میں کہتی ہوں اندر دیوتا کی آسمانی تلوار کا ہم انسانوں کی تلواروں، بندوقوں بھلا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں؟ یہ سب ہمارے کرموں کا پھل ہے اور کیا ویسا ہی بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ یہ تھوڑا ہی ہے کہ بیج تو ڈالو جوار کے اور فصل کاٹو دھان کی۔ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بھگوان شو کی آنکھ وہ سب دیکھتی رہتی ہے۔ وہ اُجلے کپڑوں اونچی پگڑیوں یا میری ٹھاٹ باٹ سے دھوکہ نہیں کھا سکتی، دل کے اندر کی ساری میل اور سارے کھوٹ کو دیکھ سکتی ہے اور اس لئے جب اندر دیوتا کی تلوار کا وار پڑتا ہے تو وہ اونچے اونچے درختوں کی چھاتی چیرتی ہوئی پاپیوں کی گردن تک جا پہنچتی ہے..... میں نے جو کچھ کہا ہے تم اُسے ایک پگلی بڑھیا کی بڑ سمجھ رہے ہو نا بیٹا، تم سوچتے ہو کہ جب وہ سب وہیں کے وہیں مر گئے تو پھر مجھے یہ سب حال کیسے معلوم ہوا؟ لیکن میں نے جو کچھ کہا: وہ جھوٹ نہیں ہے بیٹا.....

لو، بارش بھی کم ہو گئی، اب باہر جاؤ تو بازار میں وَیدجی کی دوکان پر ہوتے جانا۔ اُن سے کہنا آج میری آنکھ سے پھر پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی دوا دیدیں۔ کہنا تمہیں پگلی چندا نے بھیجا ہے.....

لیکن تم تو پہلے ہی چلے گئے، میری اوٹ پٹانگ باتوں سے کترا کر اور آخر تم نے بھی میری کہانی نہیں سُنی۔ کوئی میری کہانی نہیں سُنتا۔ میں پگلی جو ہوں.....

..... بارش تھمنے تک تو ٹھہر جاتے، بیٹا!

کمین

سنتوکھ سنگھ دھیر

تیسرا پہر شام کے سرہانے پر وں تلے سُکڑ گیا۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے کرتا توسی لیا مگر کالج اور ٹبّوں پر آ کر اس کا دل اُکتا رہا تھا۔ ضعیف نگاہوں کو تو بھری دوپہر میں بھی دھندلا دُھندلا دکھائی دیتا ہے اور پھر تنکے ایسی سوکھی کھُردری انگلیوں میں سوئی کی باریکی محسوس ہی کیسے ہو سکتی ہے۔ نہ جانے پُرانے لہو میں ابھی کونسی حرارت باقی تھی کہ سوئی کا جوں کے کناروں پر زنجیر چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔

بے حس انگلیاں بے قرار سی ہو کر کانپنے سی لگ جاتیں ـــــ طبیعت کی روانی رُک جاتی ـــــ جب بھٹکتی ہوئی سوئی کی چُبھ تیلی نوک کو ٹبّوں کے مہین سوراخ نہ ملتے۔

شام مٹیالی ہو رہی تھی۔ اِکّا دُکّا دو کانیں بند ہو گئیں۔ کوئی کوئی دوکاندار چبوترے پر بچھا ہوا ٹاٹ اٹھا کر دوکان سنبھال رہا تھا۔ پڑوس کے تھڑوں پر سے تمام درزی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ سندر سنگھ کو بھی گاہک کو یہ قمیص دیکر اپنے گاؤں جانا تھا۔

اس کا گاؤں ریل کی لائن کے اُس پار، پہاڑ کی جانب، شمال مشرقی گوشہ میں کوس بھر کے فاصلہ پر واقع ہے جہاں وہ پینسٹھ ایک برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ اور یہ گوبند گڑھ کی منڈی، جس کی ایک دوکان کے تھڑے پر نصف صدی سے وہ مشین چلا رہا ہے۔ پچاس ایک برس پہلے اس کی آنکھوں کے سامنے تعمیر ہوئی تھی۔

آج اس کے پوتوں کے ہم عمر اس منڈی کے چودھری ہیں۔ مگر اس نے اس خیال کو کبھی ذہن میں نہیں آنے دیا۔ وہ رضا اور تقدیر کے لکھے کو صحیح مانتا ہے اس لئے اس کا یقین ہے کہ چودھری تو عموماً بڑے آدمی ہی ہوا کرتے ہیں۔

اُس نے اپنے آپ کو کبھی بڑا آدمی نہیں سمجھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمانے والا کیسے بڑا آدمی ہو سکتا ہے؟ بڑے آدمی تو وہ ہوتے ہیں جو گدّیوں پہ بے کار بیٹھے دولت کی نگرانی کریں یا دن بھر پلنگ پر لیٹے رہیں اور شام کو سفید کپڑے پہن کر کھیتوں میں چکر لگا آئیں۔ وہ بڑا آدمی کیسے ہو سکتا ہے جسے دن بھر جان توڑ کر مشین چلانی ہو۔ اور جس روز مشین رُک جائے گھر میں چولہا نہ جل سکے۔ اور پھر وہ تو ہوش سنبھالنے ہی سے دیکھ رہا ہے ـــــ کیا اس کا گاؤں، کیا منڈی اور کیا جہاں کہیں وہ گیا، کام کرنے والوں کو سب کمین ہی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تو اس کے پوتوں پڑوتوں کے ہم عمر چودھریوں کے بیٹے اس کو اور اس کی پینسٹھ برس کی بوڑھی گھر والی کو اس کا نام لے کر پکارتے ہیں ـــــ جن کی بیویوں کو بھی وہ مائی کہتا ہے۔

فصلوں سے اس نے گاؤں بھر کو کپڑے سی سی کر پہنائے تھے۔ جن کے عوض ہر ششماہی اُسے مکئی یا گیہوں کا ایک بھار بطور حق ملتا تھا۔

اب بھی جب صبح اسے منڈی آنا ہوتا ہے اس کے دروازے پر کوئی نہ کوئی سوالی آ ٹپکتا ہے۔

"ارے سُندر ـــــ اے میرے تہمد میں سلائی ....." کوئی جاہل کسان کہتا ہے۔

"باوا ـــــ میرا ڈوریئے کا جمپر ....." کوئی مٹیار شہری لڑکیوں کی نقل کرتی ہوئی بولتی ہے۔

"اے .... جی .... ! میرے لہنگے کی لاؤن ...." کوئی کسان عورت چکی میں آدھے کھونٹ کی کنارہ پکڑ کر کہتی ہے۔

جو اپنی غرض کے لئے اسے اپنا جیٹھ فرض کر لیتی ہے۔ وہ اتنی سی بڑائی پا کر ہر کسی کے کام سنوارتا ہے نسلوں سے گاؤں بھر کے کپڑے سی سی کر۔

مگر اس کے اپنے گلے میں صرف ایک چیتھڑے ایسی میلی کچیلی جائکٹ ہوتی ہے جس کی ہمیشہ دھجیاں اڑتی رہتی ہیں۔ کمر میں ایک بوسیدہ سا کچھا جس میں پیوند پہ پیوند لگے چلے جاتے ہیں۔ جہاں سے یہ کچھا گھس کر پھٹ جاتا ہے وہاں وہ سفید کپڑے کا ایک ٹکڑا اور جڑ لیتا ہے۔ سر پہ مختصر سی میلی پگڑی جو اس کی گھسیلی جٹاؤں کو بمشکل سنبھالتی ہے۔ چوٹی اس نے کبھی ڈھانپی نہیں۔ اگر ڈھانپتا ہے تو پگڑی کا پلّہ چھد جاتا ہے۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی جو روز دو کوس، گاؤں اور منڈی کے درمیان آوارہ پگڈنڈیوں پہ اس کے پاؤں میں "پھڑ پھڑ" کرتی پنڈلیوں تک دھول کی تہہ جما دیتی ہیں۔

چائے میں بھگو بھگو کر صبح دو روٹیاں گھونٹ گھونٹ نگل کے وہ منڈی چلا آتا ہے۔ دو روٹیوں پہ سارا دن گذارتا ہے ـــــ دو روٹیوں پہ بارہ گھنٹے مشین چلتی ہے ـــــ دو روٹیوں پہ جان کو ٹکائے رکھتا ہے ـــــ دو روٹیاں اس کے خواب ہیں ـــــ دو روٹیاں اس کی ہنسی ہے ـــــ دو روٹیاں ـــــ دو روٹیاں ـــــ

اس کا مزاج یا بہت نرم ہے یا بہت گرم ـــــ دو روٹیاں کھانے والا آدمی یا بہت نرم ہو سکتا ہے یا بہت گرم۔

کئی بار وہ اپنے گاہکوں کو جھڑک دیتا ہے "سنبھال ری اپنا دری کا جوڑا۔ اپنے سے نہیں یہ جھنجھٹ ہوتے" اس لڑکی سے کہتا ہے۔ جو اپنا بسنتی جمپر سلائی ہوئی بے کار کی نقطہ چینی کرنے لگتی ہے۔

"اٹھالے اپنے شگن کے دو پٹے کو ـــــ دینے تین آنے حجت سو کی" کسی جوان کو جھاڑ دیتا ہے۔ اور اگر گاہک ذرا دب جائے تو وہ فخر سے اتنا مہربان ہو جاتا ہے کہ پھر اس کا ایک ایک ٹانکہ گاہک کو خوش کر دیتا ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ وہ نئے فیشنوں کو ایک ٹنٹا سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں نئے فیشن سب انگریزی فیشن ہیں۔ اور انگریزیت سے اسے سخت نفرت ہے۔

انگریزی پڑھے ہوؤں کو وہ گرمی سے پاگل ہوئے سمجھتا ہے۔ اگر کوئی پتلون پہن کر اس کے سامنے بازار میں سے گزرتا ہے تو وہ آنکھیں مٹکاتا ہوا طنز سے کہتا ہے "انگریز کا تخم گیا نہیں ابھی اپنے ملک سے"

روح اس کی کھلی فضاؤں میں کھیلتی ہے۔ زندگی بھر اس نے کھلے کپڑے سیئے ہیں۔ قدآور جاٹوں مستی بھری لوہارنوں اور زندگی سے بھرپور کسان عورتوں کے۔

آزادی سے پہلے وہ گاندھی ٹوپی اور نہرو جاکٹ کو بڑے شوق سے سیا کرتا تھا۔ گاندھی ٹوپی کی تو ایک ساتھ دو تین کپڑے سلانے والے سے وہ سلائی بھی نہ لیا کرتا تھا۔ گاندھی ٹوپی کو وہ ایک ناؤ خیال کرتا تھا جسے اس کے وطن کو غلامی کی بھیانک منجدھار سے نکال کر آزادی کے ساحل پہ لگانا تھا۔ بس ساحل پہ پہنچ کر اس کا پیوند لگا کچھا، دھجیاں اڑی جاکٹ، اور گھسی ہوئی میلی چکیٹ پگڑی جو دھریوں ایسی سفید پوشاک میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اور جہاں کوئی داروغہ ہر تیسرے ماہ مشین چلانے کا ٹیکس مانگنے اس کے سر پہ نہیں آدھمکے گا۔ جہاں دو روٹیوں کے لئے نصف صدی پرانی ہڈیاں نہیں توڑنی پڑیں گی۔ جہاں کنبے کے پیٹ بھرنے کی فکر مٹ جائے گی۔ جہاں کڑوی کسیلی چائے کی جگہ دودھ کی نہریں بہیں گی۔ جس دودھ کو اب وہ کبھی کبھار حکیم کے کہنے سے ہی پی سکتا ہے۔

مگر اب جبکہ آزادی ملے بھی کئی برس ہو چکے ہیں اس کے تمام تر خواب بے جان ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے وہی پھٹے پرانے میلے چکیٹ کپڑے ہیں، وہی ٹوٹی جوتی، وہی کڑوی کسیلی چائے اور سوکھی روٹیاں اور ٹیکس مانگنے والا وہی داروغہ آ کر لال لال آنکھیں دکھا جاتا ہے۔

کئی بار جب کام کچھ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وہ دکھے دل سے کہتا ہے:۔

"سرکار، سرکار، ارے سرکار ہے کون سی؟ ـــــ نہ کام کار نہ روزگار، چیزیں دن بدن مہنگی۔ فاقوں مرنا پڑ رہا ہے بال بچے دار کو ـــــ وہ سرکار سرکار ہی کیا جس میں لوگ روٹی کپڑے کے لئے بھی ریں ریں کرتے پھریں ـــــ اگر کوئی سرکار ہو تو اس طرح اندھیر نہ پڑے"

اور اب گاندھی ٹوپی سینے کے لئے بھی اس کے دل میں وہ چاؤ نہیں رہا۔ اب گاندھی ٹوپی اور انگریزی ٹوپی دونوں اس کے لئے ایک ہیں۔

زبان کا بے شک وہ بڑبولا ہے مگر دل کا کھوٹا نہیں۔ نہ وہ کسی کو غیر سمجھتا ہے۔ کبھی کبھار اگر اس کا کوئی ہم عمر گاہک کپڑے سلاتا ہوا باتوں میں لگ جائے "کیوں دادا، کوئی اپنا کنبہ قبیلہ؟" تو اُسے ہمدرد جان کر اپنے گزشتہ اور موجودہ حالات کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے۔

"کافی رنگ لگے ہوئے ہیں خیر سے ـــ لڑکا ہے ایک، دو لڑکیاں اپنے گھر بار۔ چار پوتے۔ پانچ پوتیاں اور دو ننھے بڑے پوتے کے۔"

"تب تو واقعی تم اچھے نصیب والے ہو۔ اب تم کام چھوڑ دو۔ یہ مشین چلانے کی عمر نہیں تمہاری۔ تمہیں تو اب راج کرنا چاہیئے۔ خیر سے لڑکے ..... پوتے ....."

"اونہہ ـــ لڑکے ـــ پوتے ـــ" وہ طنز کے ساتھ چھوٹی سی ہنسی ہنسا۔ جس ہنسی میں ہنسی نہیں تھوڑے ایسے دل کا درد چھپا ہوتا ہے "لڑکے وڑکے کاہے کے ہیں۔ سب نکمّے" وہ ذاتی راز کھولنے لگ جاتا ہے "اگر مشین چلانا چھوڑ دوں تو شام کو پندرہ جی بھوکے مر جائیں لڑکا بوڑھا ہونے کو آگیا۔ مگر کیا مجال جو کبھی دو پیسے کما کر میرے ہاتھ پر رکھے ہوں" وہ اس انداز سے کہتا ہے جیسے ہر باپ کہا کرتا ہے ..... "اور جب سے بہو مری ہے ..." وہ کپڑا سینا چھوڑ کر آہ بھرتے ہوئے کہتا "وہ گھر میں نہیں ٹکتا۔ کوئی بھوکا رہے۔ کوئی ننگا۔ بچے دس میرے ذمّے" گویا اس کا مطلب تھا کہ ہم بچے پیدا کرتے وقت ان کو پالنے کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔

"..... اور بڑے پوتے کا دس گیارہ جماعتیں پڑھ کر مزاج بگڑ گیا ہے۔ وہ بالکل ہی اس کام کے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ کہ ہماری شان میں فرق آتا ہے۔ پھرتا ہے دفتروں میں دھکے کھاتا۔ جب کبھی گاؤں آتا ہے بس کپڑے اُجلے اور جیبیں خالی۔ بلکہ چھوٹے لڑکے بھی بگاڑ دیئے اور کہے کہ ان کو بھی پڑھانا ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ کبھی وہ کام نہیں کرواتے۔ جیسا خود پڑھ کر ڈاکدار (ڈاکٹر) بن گیا ان کو بھی بنا دے گا۔ سسرے مانگتے پھریں گے در بدر" اور کہتے کہتے وہ اس طرح غصّہ میں آکر زور زور سے مشین چلانے لگتا جیسے کام ہی دنیا میں وہ ایک کر رہا اور ہر کسی کو اس کی طرح کرنا چاہیئے گاہک مُرید سا بنا اُس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملاتا رہتا اور وہ اسے اپنے ذاتی معاملات کا ایک اچھا خاصہ صلاح کار مان لیتا اور پھر کہتا:۔

"اب تم ہی بتاؤ مشین چھوڑ کر میرا ایک پل بھی کٹ سکتا ہے؟ مشین تو اب شمشان میں جا کر شاید ہی چھوٹ سکے" اس کی مجبوری بول پڑتی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بہت مشکل ہے بھائی فیصلہ دار کے لئے" گاہک سچے دل سے ہاں میں ہاں ملاتا۔ اور جتنی دیر گاہک کا کام ختم نہ ہوتا وہ بات کو جاری رکھنا چاہتا۔ اور پھر کہنا شروع کر دیتا۔

"میں تو اب اسی لئے یہ جھنجھٹ کرتا ہوں کہ یہ گرہستی کسی نہ کسی طرح نپٹ جائے۔ لڑکیاں گھر سے وداع ہو جائیں۔ بہوئیں گھر آجائیں پھر چاہے میں آنکھیں موند لوں"

"ہاں۔ ہاں ـــ گاہک کہتا ہے "جو کام ہو جائے وہی اچھا ہے"

"مگر بڑا لڑکا بڑی حجتیں کرتا ہے"

"بنّا تمہارا بیٹا؟"

"نہیں پوتا"

"کیا کہتا ہے؟"

"کانون (قانون) چھانٹتا ہے بے کار ـــ کہتے ہے کہ چھوٹی عمر میں شادی نہیں کرتے، ابھی نابالغ ہیں۔ بولتا ہی بڑا ٹیڑھا ہے"

"ہی۔ ہی۔ ہی" گاہک نئی نسل کی نقل دیکھ کر ہنس دیتا۔ اور پھر اپنے ہم عصر سے متفق ہو جاتا "سسرا جمانا ہی بدل گیا بھائی جی!"

"کہاں بدل گیا جمانا؟ بے کار لونڈوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ دھرتی پہ راج تو بہت بدلے۔ مگر لوگ کبھی نہ بدلے۔ دنیا وہاں کی وہاں"

اس بات کی تہ میں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میری یا میرے ایسے محنت کشوں کی حالت نہ بدلی۔ جس کی بنا پر وہ دنیا کو بھی بدلی ہوئی نہ مانتا تھا۔ ہر کسی کی دنیا اس کے اپنے ایسے لوگ ہی تو ہوتے ہیں۔ اور پھر جدّت پسندی کو پچھاڑنے کے لئے اسے قدامت پسندی کی ایک ذاتی مثال سوجھ پڑتی۔

"سات برس کا تھا میں جب شادی ہو گئی۔ اور آٹھویں دن باپ نے مشین رکھ دی ـــ لے بیٹا، پال دیا، بیاہ دیا۔ اب کماؤ۔ کھاؤ اور ہمیں کھلاؤ۔ جب سے اب تک دیکھ لو۔ ایک زمانہ ہے پورا۔ میں نے مشین نہیں چھوڑی ـــ باپ کی گرہستی، باپ کا قرضہ، اپنی گرہستی اور اب اولاد کی ....."

"یہ جنجال ختم ہونے کے نہیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے" گاہک جانے کے لئے تیار ہوتے ہوئے دردمندانہ انداز سے کہتا۔
"ہاں جی" اور وہ کپڑے کو ہوا میں پھٹک کر دھاگے جھاڑتا، تہہ لگاتا اور گاہک کے حوالے کر کے اسے وداع کر دیتا۔

شام رات کے سیاہ پروں تلے سو گئی۔
اسے اب داڑھی اور ٹانگوں کے بالوں میں اُلجھے ہوئے دھاگے بھی نہ دکھائی دیتے تھے۔ مگر کسی نہ کسی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کاج بٹن اس نے ختم کر ہی لئے۔ اور گاہک کو چلتا کیا۔ بزاز کی دوکان میں مشین رکھ دی۔ جو دیر سے کام سنبھالنے کے لئے اس کے سر پر کھڑا پاؤں مل مل کر جلدی مچا رہا تھا۔ ٹاٹ اُٹھایا۔ کندھے پر انگوچھا رکھا۔ ٹوٹی جوتی پہنی اور چل پڑا۔
دوکانوں میں مٹی کے چراغ جل چکے تھے، کہیں لیمپ اور لالٹینیں بھی روشن تھیں۔ مگر چوک کے موڑ پر چودھریوں کی دوکان کے سامنے ایک بڑا سا گیس جگمگا رہا تھا جس کی دودھیا روشنی میں اُجلے لباس والے سیٹھ ساہوکاروں کی چار یاری لگی ہوئی تھی۔ ہلکا ہلکا ریڈیو بج رہا تھا۔ سنڈیوں کے بھاؤ۔ نفعے، قہقہے، خوشیاں اور چاؤ.....
تھکاوٹ اس کی ہڈیوں میں رینگنے لگی۔ ضعیف العمر کو اپنی قدرتی بزرگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے دل میں سوچا "بچے چودھریوں کے.. پیدا پیچھے ہوئے ـــــ چودھری پہلے ـــــ یہ لاکھ ماں کے چودھری سہی، میرے تو ہاتھوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ سنڈی میری آنکھوں کے سامنے بنی ہے" اور اس وقت وہ ان کو اپنے پوتوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر جوں جوں اس کے قدم گیس کی امیر روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے شام کے میلے مٹیالے پردے میں وہ ننگا ہو رہا تھا ـــــ گیس کی روشنی میں برف ایسے سفید کپڑے ـــــ اور اس کے میلے چیکٹ کپڑے کہاں دھرتی، کہاں آسمان ـــــ اُسے لگا جیسے وہ کوئی نیچ ہوتا ہے۔
اور جب وہ چودھریوں کی دوکان کے عین سامنے پہنچا تو گیس کی سفید روشنی میں وہ میلا ہی میلا دکھائی دینے لگا۔ اس کے دل، ذہن اور احساسات میں سے میل اُبل پڑی۔
"رام رام شاہ جی"
اُس نے سر جھکایا۔ قہقہے، خوشیاں اور چاؤ..... اس کی طرف کسی نے نہ دیکھا۔ اور وہ ذلیل سا ہو کر چل پڑا۔ اس کے سینے میں غم اور غصے کی آگ بھڑک اٹھی۔ زور سے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر وہ چلتا گیا ـــــ جلی روشنی سے دُور ہٹتا ـــــ بازار کا پھاٹک چھوڑتا ٹوٹی جوتی پھڑپھڑاتا۔ اندھیرے راستوں پہ چنگاریاں بکھیرتا۔ گاؤں کی طرف ـــــ اپنی منزل کی جانب چلتا گیا ـــــ جو ہر روز گھور اندھیروں میں چھپی رہتی تھی ـــــ ہر روز گھور اندھیروں میں.....

"شاہراہ" میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

نویتیج

مانگتے ہیں روٹی، دیتے ہیں گولیاں

بیساکھ مہینے کے دس دن گذر چکے تھے۔ گیہوں کی فصل پر ابھی ابھی دانتی پڑی تھی۔ سامنے دور تک گیہوں کے خوشوں کا ایک بھورا سا سیلاب تھا اور بیچ میں کہیں کہیں سرخرو ہو چکی کھیتیوں کا خالی پن کٹی ہوئی فصل کے گٹھوں سے آباد تھا۔

میری کھڑکی پر کی بیل، ایسا معلوم ہوتا تھا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے حسین سُرخ پھولوں سے لد گئی تھی۔ اور جیسے نئی رت کی آمد کی خبر سننے کے لئے اس بیل کے پھول ان گنت کانوں کی مانند کھڑے ہو گئے تھے۔ دور کسی آم کے پیڑ پر سے کوئل کی پہلی کوک سُنائی دی۔

اچانک ہی میری بیوی میرے پاس آ گئی اور جیسے کوئل کی پہلی کوک نے یا آموں کے بور اور شہریں کی ملی جلی خوشبو نے اس کے اندر کسی شے کو بیدار کر دیا۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ "آپ کو کون زیادہ اچھا لگے گا ــــ لڑکا یا لڑکی؟..... اس کا نام کیا رکھیں گے؟ کو کو کیسا نام ہے؟" اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک پھوٹے سے تکیے کا غلاف کاڑھتی رہی۔ "غلاف کا کپڑا کافی ملائم ہے نا؟ اس پر کون سے رنگ کے دھاگے سے پھول کاڑھوں؟"

مجھے محسوس ہوا جیسے کھڑکی کی اس بیل نے بھی ہم دونوں کے اس راز کو جان لیا ہو۔ مجھے اپنی بیوی سے ایک ایسی انوکھی سی خوشبو آئی جیسی اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ ہر تخلیق کی اپنی ایک خاص خوشبو ہوتی ہے ــــ آموں سے پہلے بور کی خوشبو، پکنے سے پہلے گیہوں کے خوشوں کی خوشبو، ہر پھل سے پہلے پھولوں کی خوشبو..... اور تخلیق کا پیغام دیتی ہوئی ایسی ہی ایک خوشبو مجھے اس کے پاس سے آتی رہی۔

جیسے اس بھینی بھینی خوشبو پر ایک دم ایک بھیانک سڑاند دھاوا بول دے ــ کوئی مجھے آج کا اخبار دے گیا ــ ۲۲ اپریل کا اخبار، ۲۱ اپریل، کوچ بہار کی خبر تھی۔ روٹی مانگتے ہوئے جلوس پر گولی! کوچ بہار میں چاول کا بھاؤ ستر روپے من تک جا پہنچا تھا۔ لوگوں نے مل کر کنٹرول کے بھاؤ پر چاول مانگے تھے۔ اور حاکموں نے ان پر گولی چلا دی تھی۔ اس خبر کے ساتھ ہی ایک اور خبر بھی شائع ہوئی تھی ــــ جلیانوالہ باغ میں شاندار یادگار قائم کرنے کے لئے ٹرسٹ! جس ماہ ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں لوگوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ اسی ماہ آج کے ڈائر کوچ بہار میں جلیانوالہ کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ کوچ بہار میں ایک سات برس کے لڑکے کے گولی لگی تھی۔ پندرہ اور سولہ برس کی دو لڑکیوں کے گولی لگی تھی۔ پندرہ برس کے ایک لڑکے کے گولی لگی تھی۔ اور بیس اور بائیس برس کے دو نوجوانوں کے گولی لگی تھی۔

میری کھڑکی پر کی بیل کے ان گنت کانوں نے اس خبر کو سُن لیا اور میرے گلے سے لگی کانپتی ہوئی میری بیوی نے بھی اس خبر کو سن لیا۔ اور شہریں کی خوشبو میں بدبو کی سڑاند گھل مل گئی۔ فاقہ زدوں کے خون نے سامنے کے گیہوں کے بھورے سیلاب کے رنگ کو تبدیل کر دیا۔

سرشتہ تعلقات! تو نے ابھی اپنی معصوم زندگی کی بھوک سے ستائی ہوئی صرف سات بہاریں دیکھی تھیں! آنکھ مچولی، کانچ کی گولیاں گلی ڈنڈا۔ جب بھوک نے اس قدر جلد مسرت کے ان خزانوں کے دروازے تم پر بند کر دیئے تو تم اپنے شہر کی بڑی سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو کر چاول مانگنے نکل آئے۔ اور انھوں نے تمہاری چھاتی پر گولی داغ دی۔ تمہاری ماں پیار سے تمہیں کون سے نام سے یاد کرتی تھی۔ کیا یہ سڑک تمہارے سرکے لئے سوزوں تکیہ ہے جس کے سلیٹی رنگ کے خلاف کو آج ڈائر نے لڑکے لڑکیوں کے خون کے رنگ سے کاڑھا ہے؟

کبیتا باسو! میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن تمہاری عمر میری سب سے چھوٹی بہن انو اتنی ہے۔ تمہارے بال بھی ضرور اس کے بالوں کی طرح گہرے سیاہ اور لمبے ہوں گے۔ تم بھی اس کی طرح اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں کاجل ڈالتی ہو گی۔ کچھ برس پہلے تم نے بھی اپنی کسی سہیلی کے گڑے کے ساتھ اپنی گڑیا کا بیاہ رچایا ہو گا۔ کچھ عرصہ سے تم بھی اس کی طرح شادی کے نام پر شرمانے لگی ہو گی۔ کبیتا! بدبو کے لگنے پر تم

نے اپنی ماں سے کچھ کھانے کے لئے مانگا جس طرح آج ہماری ماں سے مانگا کرتی ہے اور تمہاری ماں کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے۔ باہر سڑک پر تم نے لوگوں کے نعروں کی آواز سُنی۔ "چاول دو" "گدی چھوڑ دو" اور تم اور تمہاری ماں ان لوگوں میں جا شامل ہوئیں۔ اور انھوں نے تمھیں گولی ماردی۔ میری بہن کی طرح کے، تیرے سیاہ اور لمبے بالوں میں سے خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ لیکن پھر بھی تمہارے اندر زندگی کا پھول پوری طرح مسلا نہ گیا۔ اور انھوں نے تمہارے جسم میں سنگینیں گھونپ دیں۔ کمبتا! تم نے آگے بڑھ کر اس سنگین کا وار اپنے جسم پر سہا ہے جو آج پورے اور ہماری سب بہنوں کی طرف لپک رہی ہے اگر ہم سب مل کر ان بدمستوں کی مشکیں نہ کسیں گے تو بھوک ہم سب کی بہنوں کو گڑیوں کے سنڈیپ سے گھسیٹ کر سڑکوں پر لے آئے گی۔ اور ہماری مائیں، جنھیں ہماری بہنوں کے بیاہ کی فکر ہے۔ صرف بیٹیوں کے خاک و خون میں لت پت سیاہ اور لمبے بال ہی دیکھ سکیں گی۔

بیٹھے بیٹھے سولہ برس کی عمر والی بدنا تعلقدار! تم نے ابھی ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اور اس دہلیز کے اندر انسانی زندگی کے سب سے سہانے لمحے تمہاری گرفت میں آنے والے تھے اور ان لمحوں کو گولی ماردی گئی۔ شاعر ٹیگور کے گیت میں ڈھلے ہوئے ہاتھوں کے احساس کو گولی ماردی گئی۔ پیار بھری نگاہوں کو اور پریمی کی ملاقاتوں کو گولی ماردی گئی۔

سیتش دیب ناتھ! تمہاری سولہویں سالگرہ آنے والی تھی اور تمہارے ملک کے مالکوں نے تمھیں بھوک کا تحفہ دیا، بندوق کی ایک گولی تمہاری نذر کی۔ بھوک امریکہ سے آئی تھی۔ اور وہ گولی بھی اور گندم ابھی تک وہاں سے نہیں آئی.....

بادل بسواس، ہربیر کانجی لال ـــــ بیس اور بائیس برس کے ساتھیو! تم یہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ تم ان قاتلوں کے خد و خال سے واقف تھے۔ اور انھوں نے تمھیں رات کی تاریکی میں نہیں، کسی جنگل بیابان میں نہیں بلکہ اُجلے دن کی روشنی میں تمہارے شہر کی سب سے بڑی سڑک پر نہیں مروایا ہے۔ اخباروں کے نامہ نگاروں اور فوٹو گرافروں کے سامنے مروایا ہے۔ تم چھ کو مار کر ان میں سے کوئی بھاگا نہیں، چھپا نہیں۔ فرار نہیں ہوا۔ بلکہ اپنا یہ کارنامہ ملک کی سب سے بڑی پارلیمنٹ میں بیان کیا گیا ہے۔

بتایا گیا ہے کہ جہاں تم چھ جان سے مارے گئے تھے وہاں کچھ پولیس والوں اور سرکاری افسروں کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ تم نے "چاول دو گدی چھوڑ دو" ایسے باغیانہ نعرے لگائے تھے۔ تم نے اپنے ملک اور کوریا کے سب سے بڑے مہربان امریکہ کی شان کے خلاف زبان ہلائی تھی تم نے روس اور چین کی طرف سے پیش کئے گئے اناج کو سنگوانے پر زور دیا تھا۔ تم نے اور گہرے سیاہ اور لمبے بالوں والی کمبتا اور سات برس کے سریش نے مل کر سینکڑوں بندوقوں والوں پر حملہ کر دیا تھا۔ اس لئے اس کے تحفظ کی خاطر، وزیروں کی گدی کے تحفظ کی خاطر اور اس مہربان کے تحفظ کی خاطر جس نے صرف بازدہی تھمایا ہے دھی گیہوں نہیں ـــــ مجبور ہو کر تم پر گولی چلانا پڑی۔

اور اتنا سا بتا کر تمہارے ملک کے وزیر داخلہ تمھیں بھول جانا چاہتے ہیں۔ انتخابات قریب آرہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھیں کئی جوڑ توڑ کرنے کے لئے جانا ہے۔ انھیں اچھوت ادھار یا دودھ دہ پر کہانی لکھنا ہے۔ (وہ صرف لوگوں کو جیلوں میں ہی نہیں ٹھونستے اور صرف گولیاں ہی نہیں چلاتے، بلکہ کہانیاں بھی لکھتے ہیں۔)

اور وزیر خذابی تمھیں بھول جانا چاہتے ہیں۔ انہیں امریکی سفیر کے یہاں چائے کی دعوت پر جانا ہے۔ اور سوسائٹی کے سندر کی تعمیر کے لئے آج کے غزنیوں سے روپے جمع کرنے ہیں۔ اور پھر رات گھر آکر پراچین مہابھارت کی مہان تہذیب پر کوئی ناول تحریر فرمانا ہے۔ (یہ بھی مشہور و معروف لیکھک ہیں۔)

لیکن ہمارا ملک ان دو لیکھکوں ـــــ جنھوں نے قلم کے بجائے بندوق سے لکھنا شروع کر دیا ہے ـــــ اور ان کے حواریوں کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ ہمارے ملک میں عظیم عوام بستے ہیں۔ انسانی قلموں سے لکھنے والے، چھوٹے بڑے ادیب بستے ہیں۔ ماں باپ، بہن بھائی، محبوب اور محبوبائیں بستی ہیں۔ کھیتوں کارخانوں میں سے آتی ہوئی تخلیق کی خوشبو بستی ہے، حاملاؤں کی مہک بستی ہے۔ آموں کا بور اور کوئیلوں کی کوک بستی ہے۔ اور آج ہم سب تم چھ کو اپنے گلے سے لگاتے ہیں۔ تمہارے معصوم اور

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

سبٹ ہیڈی

زکی انور

فن ٹس (Fanatics) فوجیوں کے لئے وقف کر دیا گیا تھا۔ ان فوجیوں کے لئے جو جنرل میک آرتھر کے نشریے اور تحریری بیانات کے جو جب دکھنی کوریا کے بے بس اور مظلوم عوام کو ظالم کمیونسٹوں کے خونی پنجوں سے بچانے والی امریکی فوج کی کمک کے طور پر بھیجے جا رہے تھے۔

فن ٹس میں بارھویں بٹالین کے فوجی، جو پرسوں اس نیک کام کے لئے امریکہ کے ساحل پر کھڑی اپنی محبوباؤں کو الوداع کہنے والے تھے، بھرے تھے۔ ان کی محبوبائیں تھیں۔ اور چند وہ مرد اور عورتیں بھی جنھیں پہلے ہی سے کوریا بھیجے گئے اپنے کسی عزیز کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا یا انھیں کوئی پیغام بھیجنا تھا۔

فن ٹس میں بڑی گہما گہمی تھی۔ اور یہ آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ دوسری جنگ عالم کے بعد سے یہ ہوٹل پھر کبھی اتنا بارونق نہیں ہوا تھا جتنا اس دن تھا۔ ویسے بھی وہ حکمراں طبقہ اور امرا کا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ اور وہاں مینو کے اوپر بے ضرورت ڈسٹر پھیرتے رہنے والی لڑکیاں بھی اتنی حسین اور قیمتی لباس پہننے والی تھیں کہ اکثر ہوٹل میں یہ لطیفہ ہوا تھا کہ کسی امیر زادے نے بہت زیادہ پی چکنے کے بعد اسی ملازم لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر چاشر وغ کر دیا تھا۔ اسی لطیفے کے ساتھ ساتھ یہ ٹریجڈی بھی ہوتی رہی تھی کہ جب امیر زادے کا نشہ ٹوٹتا تھا اور اس کی محبوبہ یا اس کے دوست اسے بتاتے تھے کہ وہ مینو صاف کرنے والی لڑکی کے ساتھ ناچ چکا ہے تو وہ لڑکی حراست میں لے لی جاتی تھی۔ اور اسے کسی خاص دفعہ کے تحت چھ مہینے کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔

فن ٹس میں آئے پڑے فوجیوں کو خوب اچھی اچھی شرابیں پلائی جا رہی تھیں۔ ان کی میزوں پر ڈشوں میں امرا کے کھانے چنے ہوئے تھے اور بے شک انھیں ایسی شراب پلائی جا رہی تھی اور ایسی غذا کھلائی جا رہی تھی جو وہ لاکھ برس کوشش کرنے کے باوجود بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے مگر یہ کہنا ذرا عجیب سی بات ہے کہ کم سے کم فوجیوں کو کمیونسٹوں کا شکر گذار ہونا چاہیئے تھا کہ انھیں فن ٹس کی جنت میں رنگ رلیاں منانے کا موقع ملا تھا ـــــ لیکن صرف فوجیوں ہی کو کیوں؟ اگر امریکہ کے حکمران طبقے کے دل کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو وہاں بھی کمیونسٹوں کے لئے شکریہ ہی شکریہ ہوگا۔ کیونکہ اگر کمیونسٹ اپنی حب الوطنی کے لئے کچھ نہ کرتے تو امریکہ کے حکمران طبقے کو خواہ مخواہ دکھنی کوریا کے عوام سے بے مطلب ہمدردی جتا کر ان پر اپنا قبضہ جمانے کا موقع کب ملتا؟

اور فن ٹس میں سارے فوجی حد سے زیادہ خوش تھے۔ سچ مچ خوش تھے یا نہیں اس کا اندازہ تو کوئی دل کا حال جاننے والا ہی لگا سکتا ہے۔ مگر کم سے کم باہر سے وہ اتنے ہی خوش خوش نظر آ رہے تھے۔ جتنا قدیم روم میں اس آدمی کو ہر طرح سے خوش کر دیا جاتا تھا جسے آدھی رات کے وقت جنگ کے دیوتا پر قربان کرنا ہوتا تھا۔

فن ٹس میں کیا نہیں تھا؟ ـــــ اچھی اچھی شرابیں تھیں، اچھی اچھی غذائیں تھیں۔ لال پیلی محبوبائیں تھیں۔ اور بنی سنوری لڑکیاں تھیں۔ جو اُن لنڈوروں کے لئے کرائے پر منگا لی گئی تھیں۔ جنھوں نے اپنے لئے کوئی محبوبہ بچنے سے پہلے جنگ میں بھرتی کے فارم پر دستخط کر دیئے تھے۔ ان کے علاوہ وہاں کچھ اور بھی تھا۔ وہاں جنرل میک آرتھر کے نشریے یا تحریری بیانات تھے جسے اس نے بارھویں بٹالین کے نام پیغام کے طور پر بھیجا تھا۔ جس میں اس نے بتایا تھا کہ فتح ہماری ہے۔ ستھی بھر کمیونسٹ لٹیرے ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے سپاہی نئے نئے جنگی آلات سے لیس ہیں۔ ہمارے پاس ڈالر ہیں ـــ ہمارے پاس طاقت ہے ـــ ہم بڑھ رہے ہیں ـــ ہم جیت رہے ہیں ـــ اور اسی لئے نئی کمک کے طور پر بارھویں بٹالین بھیجی جا رہی تھی ـــ جنرل میک آرتھر کے بیانات کے علاوہ وہاں بارھویں بٹالین کے کمانڈر کی تقریریں تھیں جو ہر ایک گھنٹہ پر بہترین سے بہترین آرکسٹرا اچھے سے اچھا ناچ بند کر کے فوجیوں کے کانوں میں ٹھونسی جاتی تھیں تقریب تقریب

زبردستی، کیونکہ ایک ہی طرح کی بات سنتے سنتے کون وہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی ہے جو اکتا نہ جائے۔ ہر بار بس کمانڈر یہی کہتا تھا کہ "کمیونسٹ ظالم ہیں۔ وہ دکھنی کوریا کے بے بس عوام پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ غریبوں کی سیوا ہر اچھے آدمی کا فرض ہے اس لئے ہم دکھنی کوریا پہنچ کر وہاں کے مظلوم لوگوں کو موت کے منہ سے نکال لیں گے ....."

ابھی ابھی بارھویں بٹالین کے کمانڈر نے جنرل سیک آرتھر کا تازہ ترین نشریہ پڑھ کر سنایا تھا جس میں دکھنی کوریا میں امریکی سپاہیوں کی فتح اور کیمونسٹوں کی پسپائی کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کمانڈر نے اپنی طرف سے بھی بڑی لمبی تقریر کی تھی۔ یہاں تک کہ زیادہ تر سپاہی صاف طور پر اکتائے اکتائے سے نظر آنے لگے تھے۔

اور جیسے ہی کمانڈر نے اپنی تقریر ختم کی ویسے ہی آرکسٹرا کی دلگداز آواز فضا کے بڑے اور شاندار ہال میں گونجنے لگی۔ فوجی سپاہی اٹھے انھوں نے اپنی اپنی محبوباؤں کی کمر میں باہیں ڈالیں اور ناچنے لگے۔ جن کی کوئی محبوبہ نہیں تھی انھوں نے بنی سنوری لڑکیوں میں سے اپنی پسند کے مطابق ایک ایک لڑکی کو آنکھوں کے اشارے سے اٹھایا اور ان کے ساتھ ناچنے لگے۔ یہ لڑکیاں جانباز سپاہیوں کے ساتھ ناچنے میں بہت فخر محسوس کر رہی تھیں۔ یہ بات ان کے چہروں سے صاف ظاہر تھی۔

ایک نا ٹے قد کا ہوا باز ہوٹل کے ہال کے کونے میں بیٹھی ہوئی نیلی آنکھوں والی لڑکی کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کر اس کا جائزہ لینے لگا ــــ وہ کرائے پر منگائی ہوئی ناچنے والی لڑکی ہے یا کسی کی محبوبہ؟ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ کرائے پر منگائی ہوئی لڑکی نہیں ہے تو اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام سٹ ہیڈی ہے۔" لڑکی نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"اوہ سٹ ہیڈی!ــــ" ہوا باز بدتمیزی سے ہنسا ــــ "مجھے افسوس ہے کہ تمہارا محبوب ضرورت سے زیادہ کاہل ہے کہ وہ اب تک یہاں نہیں پہنچ سکا۔ اُسے سوچنا چاہیئے تھا کہ آج وہ تمہارے ساتھ آخری بار ناچے گا۔ کیوں کہ کل کا سارا دن تو عزیز و اقربا سے ملنے جلنے میں ختم ہو جائے گا ــــ کیوں نہ تم میرے ساتھ ناچنا پسند کرو؟"

"ہو سکتا ہے ــــ" ہیڈی نے جواب دیا۔ "لیکن میرا محبوب کاہل نہیں۔ وہ تم لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ ــــ" ہوا باز ذرا سا مسکرایا پھر یکلخت سنجیدہ ہو کر بولا ــــ "کیا تم اس کے ساتھ جی بھر کے ناچ چکنے کے بعد یہاں آئی ہو؟ ــــ"

"نہیں ــــ" سٹ ہیڈی نے گردن جھکالی اور رک رک کر بولی۔ "میں تو ایک حرصے سے اس کے ساتھ ناچنے سے محروم ہوں۔"

"پھر وہ کیسے ہم سے زیادہ خوش نصیب ہے؟" ہوا باز کی آنکھیں گول گول ہو گئیں ــــ "بلکہ تم بھی بدنصیب ہو ــــ ان کرائے پر منگائی ہوئی لڑکیوں سے بھی زیادہ بدنصیب، کیونکہ بلا سے ان کا کوئی محبوب نہیں مگر ان کے چہروں کی طرف دیکھو وہ ہمارے ساتھ ناچنے میں فخر محسوس کر رہی ہیں ــــ"

"نہیں یہ بات نہیں ــــ" سٹ ہیڈی جلدی سے بولی ــــ "میں بدنصیب نہیں ہوں۔"

"تو پھر کیا بات ہے؟ ــــ" ہوا باز واقعتاً حیران نظر آیا ــــ "خوش نصیب تو یہ لڑکیاں ہیں جو آج خوب جی بھر کے اپنے محبوب کے ساتھ ناچیں گی۔ کل دن بھر ان کے ساتھ گھومیں گی۔ اور پرسوں صبح سویرے ساحل پر کھڑی ہو کر اپنے محبوب کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہیں گی ــــ اور جب جہاز بحرِ اوقیانوس کے نیلے پانیوں میں سر کنے لگے گا تو ان کی آنکھوں میں بھی ایک دو سرا بحرِ اوقیانوس اُمڈ آئے گا۔ اور تب وہ دل سے دعا کریں گی کہ ان کا محبوب دکھنی کوریا کے بے بس اور مظلوم عوام کو ظالم کمیونسٹوں سے بچانے میں کام آئے ....."

یقین تھا کہ ہوا باز کچھ اور کہتا ــــ مگر سٹ ہیڈی کچھ اس طرح، اوپیرا میں کام کرنے والی کا سیڈین لڑکیوں کی طرح ہنسنے لگی۔

کہ ہوا باز غیر ارادی طور پر خاموش ہو گیا۔ اور سٹ ہیڈی بولی ——

"میں یہ سب کچھ آج سے بہت پہلے ہی کر چکی ہوں میرے دوست!"

"اوہ ——" ہوا باز کے چہرے پر ایسے نقوش ابھر آئے جیسے اس لڑکے کے چہرے پر ابھرتے ہیں جو تین بار حساب کا سوال غلط حل کر چکنے کے بعد تیسری مرتبہ صحیح حل کر دیتا ہے۔ وہ بولا —— "شاید تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دکھنی کوریا میں کمیونسٹوں کو کچل رہا ہے؟"

"ایک حد تک تم نے درست سمجھا ——" سٹ ہیڈی نے اپنے لب ذرا بھینچے —— "لیکن اب وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا۔ جنگ میں اس کا بایاں ہاتھ کٹ گیا ہے۔ اس کی داہنی ٹانگ بیکار ہو گئی ہے اور اس کا منہ جھلس گیا ہے۔ وہ کمیونسٹوں کو کچل نہیں سکتا۔ بلکہ وہ کمیونسٹوں کے ٹائیجون کے ہسپتال میں پڑا ہے۔"

"اوہ ——" جیسے ہوا باز کو واقعی چوٹ سی لگی —— "تب تو تم واقعی بدنصیب ہو ہیڈی! میں تمہیں ناچنے پر مجبور نہیں کروں گا —— کاش تمہارا محبوب تمہیں واپس مل جائے ——" اور اس کے بعد ہوا باز نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"پھر بھی وہ میرے ساتھ ناچ نہیں سکے گا ——" سٹ ہیڈی اس طرح بولی جیسے وہ رو دے گی ——" لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ضرور بچ جائے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو ہیڈی ——" ہوا باز نے کہا —— "لیکن جنگ پر گئے ہوئے جانبازوں کے بارے میں سو فیصدی یقین کے ساتھ ایسی باتیں کہنا اگر غلطی نہیں تو ناموزوں ضرور ہے۔"

سٹ ہیڈی کو ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا باز نے اسے دلاسے کے لئے ایسا کہا ہو کہ وہ اپنے محبوب کی یاد چھوڑ کر اس کے ساتھ اپنی خوشی سے ناچنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن سٹ ہیڈی نے ہوا باز کے جملے سے دوسرا ہی مصرف لیا۔ اور جلدی سے اور حد درجہ حیرانی کے انداز میں بولی ——

"کیا تم ایسا سوچتے ہو؟ —— تم جو کہ ہر سوں صبح سویرے دکھنی کوریا جانے اور اپنی آنے والی تباہی کا غم بھلانے کے لئے خس ٹس میں پی کھا رہے ہو؟"

"کیوں نہیں؟ ——" ہوا باز نے کہا —— "کون نہیں کہہ سکتا کہ جنگ پر جانے سے پہلے سپاہی اپنے آپ کو مردہ تصور کرنے لگ جاتا ہے۔"

"تو پھر تم کیوں جنگ پر جا رہے ہو؟ ——" سٹ ہیڈی انتہائی جذباتی انداز میں بڑبڑانے لگی —— "کیا تمہاری کوئی محبوبہ نہیں؟ کیا تمہاری ماں اور بہنیں نہیں؟ باپ اور بھائی نہیں —— میرے محبوب کو تو اس کا پیارا گھوڑا بھی یاد آ آ کر وہاں ستا رہا ہے —— شاید تمہارا کوئی نہیں جب ہی تو تم خود بخود موت کے منہ میں جا رہے ہو، اگر تمہارا کوئی ہوتا، تو تم؛ جو کہ یہ کہتے ہو کہ جنگ پر جانے سے پہلے سپاہی اپنے آپ کو مردہ تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ ہرگز ہرگز نہ جاتے، اپنے عزیزوں کو غم دے کر کون عقل مند خود بخود بے سطلب کی جنگ میں جا سکتا ہے؟"

ہوا باز بڑی حیرانی سے سٹ ہیڈی کا منہ تکنے لگا۔ اس نے اس کا سر سے پاؤں تک دو تین بار جائزہ لیا۔ شاید وہ یہ پتہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا سیاہ دست سٹ ہیڈی کوئی کوریائی جاسوس تو نہیں؟ مگر نہیں وہ تو ہر اعتبار سے ایک امریکی شہری تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کا رنگ بہت گورا نہیں تھا بلکہ وہ سُرخ تھی۔ اس کے ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اور اس کے بالوں میں قدرتی طور پر سونے جیسی چمک تھی۔ کچھ پیلی کچھ بھوری چمک اور اس کا لباس بھی تو خالصتاً اونچے گھرانوں کی امریکی لڑکیوں جیسا تھا۔ ہوا باز نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ہوا باز؟ ——" سٹ ہیڈی پھر کہنے لگی —— "بولو تم دیدہ و دانستہ کیوں ایسی موت مرنا چاہتے ہو جس کا کوئی حاصل نہیں، یہاں تک کہ تمہاری محبوبہ تمہاری قبر پر محبت کے دو پھول اور حسرت کے دو آنسو تک نہیں چڑھا سکتی؟"

"مجھے اپنی زندگی بہت پیاری ہے سٹ ہیڈی ——" ہوا باز ذرا جذباتی انداز میں کہنے لگا —— "آگسٹا میں میری ایک محبوبہ ہے وہ کپڑا بننے کے کارخانے میں کام کرتی ہے۔ اس کا نام اوگا ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ پیاری ہے۔ مگر میری زندگی مجھے اس سے بھی زیادہ پیاری

ہے۔ کیونکہ میری زندگی کے ساتھ میرے اس بوڑھے باپ کی زندگی ہے جس کا ہاتھ زخمی ہونے کی وجہ سے کاٹ دیا گیا ہے۔ اور میرے ساتھ میری اس بہن کی زندگی ہے جو ہوٹل ڈی لکس میں گاہکوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے اور ان کی پلیٹوں میں لیمو نچوڑنے پر ملازم تھی۔ مگر اب وہ بے کار ہو کیونکہ وہ کمیونسٹ ہونے کے الزام میں ہوٹل کی ملازمت سے برطرف کر دی گئی ہے ——"

"میرا خیال ہے تم سیلی کینتھ کے بارے میں کہہ رہے ہو ——" سٹ ہیڈی جلدی سے بولی —— "مجھے یاد آتا ہے اسی قسم کے نام کی لڑکی کے بارے میں میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ وہ کمیونسٹ ہونے کے الزام میں ہوٹل ڈی لکس سے نکال دی گئی ہے اور اس پر تیس پونڈ جرمانہ بھی ہوا ہے ——"

"ہاں ہاں ——" ہوا باز جیسے اچھل کر بولا —— "سیلی کینتھ نہیں بلکہ ہیلن کینتھ، ہاں واقعی اس پر تیس پونڈ جرمانہ بھی ہوا تھا۔ جو میں نے بڑی مشکل سے ادا کیا تھا۔ اور میرا نام مائیکل کینتھ ہے —— مگر سچی بات یہ ہے ہیڈی کہ وہ قطعی طور پر کمیونسٹ نہیں۔ البتہ وہ ہوٹل میں گئے ہوئے ایک کمیونسٹ سے دوسرے گاہکوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اور اس کی پلیٹ میں لیموں نچوڑ رہی تھی۔ اور اگر میں یہ کہہ دوں تو ممکن ہے ہیلن کے لئے جو تمہارے دل میں ہمدردی ہے وہ کم ہو جائے یا بالکل ختم ہو جائے کہ اسے کمیونسٹ تحریک سے ایک حد تک نفرت ہے ——"

"کچھ بھی ہو وہ قابل رحم ہے ——" سٹ ہیڈی بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو کہ میں کمیونسٹ ہوں —— مگر مائیکل! تم بالکل غیر سنجیدہ بن کر بے تحاشا ہنستے ہوئے چیخی —— "کیا یہ تمہارے ہی خاندان کا واقعہ ہے ——" اس کی ہنسی سارے ہوٹل میں گونج گئی۔ وہ اتنی زور سے ہنسی تھی کہ شاید آرکسٹرا کی تیز آواز بھی دب گئی تھی۔ اور ناچتے ہوئے جوڑے پل بھر کے لئے سٹ ہیڈی اور ہوا باز کی طرف دیکھنے لگے تھے اور جب سٹ ہیڈی کی ہنسی رکی تو ہوا باز پریشانی سے بولا۔

"تم ہنسیں کیوں سٹ ہیڈی؟"

لیکن اس نے ہوا باز کے اس سوال کا جواب نہیں دیا اس نے صرف ہوا باز کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اس کا ہاتھ زور سے دبا کر بہت آہستہ سے بولی

"ہمیں ہوٹل کیسانا دا چلنا چاہیئے ——"

"کیسانا دا کیوں ——؟" ہوا باز جلدی سے مگر بڑی حیرانی سے بولا۔ "کیا تم میرے فوجی دوست کو دغا دینا چاہتی ہو۔ کیا تم اس کے ساتھ بیوفائی کرو گی جو تمہاری یاد میں ناخنوں کے ہسپتال میں تڑپ رہا ہے —— تم بہت بری ہو ہیڈی! ——"

"مائیکل —— سٹ ہیڈی بڑے پیار سے بولی ——" میں یقیناً وہ نہیں جو تم نے ابھی ابھی خیال کیا۔ نوجوانوں کو پھانسنے والی پیشہ کار لڑکیوں کے ہاتھ میں تم ہمیشہ دو بیگ دیکھو گے ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ اور ان کے گلے میں جو ہار ہوگا اس کے نیچے ایک چھوٹا سا صلیب ہوگا جو عموماً پیٹھ پر رہے گا، سینے پر ہرگز نہ ہوگا۔ یہ میں نے تمہیں بڑے گُر کی بات بتائی، سمجھے؟"

"تو پھر کیسانا دا جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یہیں مزے میں باتیں کر رہے ہیں" ہوا باز نے کہا۔

"میں نے اس لئے کیسانا دا جانے کا ارادہ ظاہر کیا کہ ——" سٹ ہیڈی کہنے لگی —— "جس طرح تم مزا نہیں چاہتے ویسے ہی میں بھی مزا نہیں چاہتی۔ لیکن یہاں بیٹھ کر باتیں کرنے میں میں ڈرتی ہوں کہ کوئی ہیں گولی نہ مار دے"

"وہ کیوں؟ ہم تو اچھی باتیں کر رہے ہیں ——" ہوا باز خوف اور تعجب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولا۔

"وہ اس لئے کہ ہم لاکھ اچھی باتیں کر رہے ہیں ——" سٹ ہیڈی کہنے لگی —— "لیکن ہماری باتیں جنگ کے خلاف ہیں۔ اور امریکہ کا حکمران طبقہ جنگ کا ساتھی ہے۔ امن کا دشمن ہے"

وہ اب تک ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ہوا باز نے سٹ ہیڈی کا ہاتھ دبایا اور کہا ——

"اچھا تو پھر ہمیں چلنا چاہیئے۔ لیکن کیا تم ایسا سوچتی ہو کہ وہاں ہم اطمینان سے باتیں کر سکیں گے؟"

"ہاں ——" سٹ ہیڈی مسکرائی ——" وہ ہوٹل اتنا شاندار نہیں۔ وہ تو نزدیک کے دفتروں میں کام کرنے والے کلرکوں کا ہوٹل

ہے۔ اور کلرک امن کے ساتھی ہیں، جنگ کے دشمن ——"

اب کے دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ دبایا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جب وہ ہوٹل سے نکل رہے تھے تو ایک دوسرا ہوا باز جو کرنٹے میں مست ہو کر ناچنے تک سے لاچار تھا۔ کوچ پر پڑا پڑا انھیں دیکھ دیکھ کر کسی بازاری سائنیٹ کا ایک شعر زور زور سے گانے لگا۔

"بے شک وہ حسین ہے اور تمھارا بس چلے تو
جنگ پر جانے سے پہلے اس کے دل میں اپنی محبت سمو دو ——"

"ایسا تو ہو ہی چکا ہے ——" سٹ ہیڈی ہوٹل سے نکلتے نکلتے بولی۔

اب کے ہوا باز پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے بوکھلاہٹ سے ہیڈی کے بیگ اور اس کے ننگے سینے پر ڈولتے ہوئے صلیب کی طرف دیکھا۔ نہ تو اس کے پاس دو بیگ تھے اور نہ اس کے ہار کا صلیب پیچھے پیٹھ پر تھا —— پھر بھی ہوا باز کی تسلی نہیں ہوئی اور اس نے جلدی سے کہا۔

"مسٹ ہیڈی ..... ہیڈی ....." آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ مگر مسٹ ہیڈی بہت کچھ سمجھ کر بولی ——

"کوئی بات نہیں مائیکل! کیا تم میرے حسن سے انکار کر سکتے ہو؟ اور کیا تمھیں اس کا احساس بھی نہیں کہ تمھاری محبت میرے دل میں سما چکی ہے؟ ——"

"کیسی محبت؟ —— کس قسم کی محبت؟" وہ پریشانی سے چیخا۔

"بس بس ——" سٹ ہیڈی مسکرا کر بولی —— "تمھارا یہ سوال ہی تمھارے سوال کا جواب بھی ہے۔ پھر بھی میں تمھاری مزید تسلی کے لئے اتنا اور کہہ دینا چاہتی ہوں کہ میرا محبوب ٹام جون میں کیلیفورنیا کے ہسپتال میں زندہ ہے۔ آج یا کل وہ مجھے مل بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر مجھے کوئی چیز بڑی سے بڑی قیمت دینے کے بعد بھی نہیں مل سکتی تو وہ میرے مرحوم بھائی ڈیوڈ کی محبت ہے ——"

"ہیڈی ——" ہوا باز حد سے زیادہ جذباتی انداز میں چیخا —— "ہیڈی ——"

اور سٹ ہیڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہوٹل کیسانا واپہنچ کر وہ دونوں ایک کنارے کی میز کے گرد بچھی ہوئی گدے دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"تمھیں کیا پینا چاہیئے؟" ہوا باز نے میرے کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھ کر، سٹ ہیڈی سے پوچھا ——

"ان ظالم جنگ پسندوں کا خون جنھوں نے میرے محبوب ترین ہاورڈ ٹیلر کو مسخ کر دیا ہے کہ وہ اب میرے ساتھ ناچ بھی نہیں سکتا، کہ وہ اب ..... ہیڈی کو گلا بیٹھ گیا۔ اور اب یہ کہنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ نس نس میں وہ بمشکل تمام اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھی۔ اور اب کینا ڈا میں اس کی آنکھیں صاف بھیگی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"سٹ ہیڈی ——" ہوا باز سٹ ہیڈی کے جذبات کو رد کرنے کے خیال سے جلدی سے بولا —— "ہم کافی ہی کیوں نہ پی لیں؟"

"منگوا لو ——" سٹ ہیڈی بجھے بے دلی سے بولی۔

ہوا باز نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ پھر بولا ——

"فس نس میں تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

"میں بہت کچھ کہہ چکی مائیکل! ——" سٹ ہیڈی بولی۔

"لیکن پھر بھی تم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں ——" ہوا باز بولا —— "اسی لئے تو تم نے فس نس سے بھاگنا چاہا تھا ——" وہ ذرا رکا، پھر جلدی سے بولا۔ "ہاں ہاں! مجھے ٹھیک یاد آیا۔ تم اس بات پر ہنس رہی تھیں اور مجھ پر طنز کر رہی تھیں کہ باوجود یکہ میں جو کہ میری سگی بہن ہے محض کمیونسٹ ہونے کے الزام میں ملازمت سے برطرف کر دی گئی تھی اور اسے تین پونڈ جرمانہ دینا پڑا تھا۔ پھر بھی میں بارھویں بٹالین کے کمک میں

شریک ہو کر لڑنے کے لئے دکھنی کوریا جا رہا ہوں ——"

"ہنسنے کی بات ہی ہے ——" سٹ ہیڈی پھر ہنسنے لگی۔ "ہوا باز اسے گھورنے لگا اور سٹ ہیڈی کہنے لگی —— "جس کی بہن محض کمیونسٹ ہونے کے غلط الزام میں روزی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہو۔ اور جس کی محبوبہ اکسٹا کے کپڑا بننے کے کارخانے میں کام کرتی ہو وہ کمیونسٹوں کی مخالفت میں جنگ کرنے جائے؟ اور وہ بھی ایسی جنگ جو سراسر ظلم ہو، بے انصافی ہو اور صرف ہوسِ ملک گیری کے تحت لڑی جا رہی ہو۔ تو پھر آدمی، تم جیسے آدمی کے حال پر ہنسے نہیں تو اور کیا کرے؟"

"ہیڈی ——" ہوا باز بڑے خلوص سے بولا —— "مگر تمہیں دکھنی کوریا کے صحیح حالات معلوم نہیں۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہاں کے عوام کمیونسٹوں کے ظلم و تشدد سے کتنے نالاں ہیں! مگر وہ بے چارے بے بس ہیں، مجبور ہیں۔ کمزور ہیں، بے یار و مددگار ہیں۔ خدا نے ہمیں طاقت دی ہے۔ ہماری نوجیں نئے نئے جنگی آلات سے لیس ہیں۔ ہمارے پاس ڈالر ہیں۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان بے چاروں کی مدد کریں اور دکھنی کوریا کے مظلوموں کو وحشی اور درندے کمیونسٹوں کے پنجے سے بچائیں، اور ....."

وہ کچھ اور کہتا، مگر ہیڈی نے جیسے اکتا کر میز پر ہاتھ پٹخا ——

"خیر و ——" وہ بولی —— "میں مان گئی کہ دن میں آٹھ دس بار جنرل میک آرتھر کا بلیٹن پڑھتے پڑھتے، اس کا نشریہ سنتے سنتے اور اپنے کمانڈر کا لکچر پیتے پیتے تمہیں ان کی کہی ہوئی ساری باتیں زبانی یاد ہو چکی ہیں۔ لیکن مجھے کہہ لینے دو کہ تم بھی حقیقت سے اتنی ہی دور ہو جتنی دور میرا محبوب فادر ٹیلر تھا۔ یا جتنی دور تمہارے وہ ساتھی ہیں جنہیں ہم ابھی فن لٹس میں چھوڑ کر آ رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہیں حقیقت سے بہت دور رکھا جاتا ہے۔ ہیبت ناک حقیقتوں پر خوبصورت غلاف چڑھا دیا جاتا ہے اور تم بے چارے غلاف کے اندر کی باتیں نہیں جان سکتے!"

"ہیڈی ——" ہوا باز چیخنے کے انداز میں بولا۔ لیکن سٹ ہیڈی نے جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو وہ بدستور کہتی رہی۔

"تم لوگ بھی ویسے ہی قابلِ رحم نظر آتے ہو۔ جیسے قدیم روم میں قربان کئے جانے والے نوعمر بچے ہوا کرتے تھے۔ جنہیں اچھے اچھے کپڑے پہنانے کے بعد یہ کہا جاتا تھا کہ چلو جینس دیوتا تمہیں بہت سی مٹھائیاں دے گا اور تمہیں اپنے آگے اور پیچھے دونوں طرف کے چہروں سے دیکھے گا۔ اور تمہیں چومے گا —— یا پھر وہ بے چارے پہلوان کی طرح قابلِ رحم نظر آتے ہیں۔ جسے شیر کے پنجرے میں ڈالنے سے پہلے کہا جاتا تھا —— تمہارے بازو گوشت پوست کے نہیں لوہے اور پتھر کے ہیں۔ تمہارے جسم میں تو جیسے سیسہ ہے۔ تم تو روم کے بہترین پہلوان ہو۔ تم بہادر ہو، فتح یقینی طور پر تمہاری ہے۔ تم بے شک شیر کو دے مارو گے۔ اور اس طرح تم روم کی آدھی سلطنت کے مالک بن جاؤ گے ——"

ہوا باز ہیڈی کے چہرے کی طرف عجیب انداز سے گھور رہا تھا۔ وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ ہیڈی یہ سب کچھ کیا کہہ رہی ہے۔ اور آخر کار اس نے رہ سہہ کر پوچھ ہی لیا ——

"تمہارا مطلب کیا ہے ہیڈی؟ ——"

"مطلب؟ ——" ہیڈی زور سے ہنسی —— "ہاں، میں جانتی ہوں کہ تمہارا دماغ ماؤف کر دیا گیا ہے۔ اسے محدود کر دیا گیا ہے کہ اس میں صرف جنرل میک آرتھر کی تقریر اور بارھویں بٹالین کے کمانڈر کی پھسلانے والی باتیں ہی سما سکیں ——"

"ہیڈی ——" ہوا باز پھر جذباتی انداز میں بولا —— "میں اتنا بے کار ہرگز نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو؟"

"تو پھر مجھے یہ کہہ لینے دو ——" سٹ ہیڈی کہنے لگی —— "کہ تم دکھنی کوریا کے بارے میں، وہاں کے عوام کے بارے میں اور اپنی امریکی فوجوں کے بارے میں تقریباً کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہیں ان آنکھوں کا پتہ نہیں ہے جو امریکی فوجوں کو دیکھ کر نفرت اور غصے کے ملے جلے احساس سے سرخ ہو جاتی ہیں۔ تمہیں دکھنی کوریا کے ان معصوم بچوں کے بارے میں ذرا بھی معلوم نہیں۔ جنہیں تمہاری فوجیں محض اس لئے یتیم بنا ڈالتی ہیں کہ ان کے باپ اپنے وطن کے ساتھ غداری کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تمہیں ان دوشیزاؤں کا پتہ نہیں جنہیں آتا جنہیں جنم بھر کا روگ محض اس لئے

دیا گیا کہ ان کے منگیتروں کو وطن سے محبت تھی۔ تمہیں ان ماؤں کی خالی خولی، سونی سونی گود اور بے نور آنکھیں نظر نہیں آتیں جن بدنصیب ماؤں کے لالوں نے غلامی کی روٹی کو عزت کی موت پر ترجیح دے کر تمہارے نئے نئے آلات جنگ اور تمہارے ڈالر سے ٹکر لی اور ہنستے ہنستے مر گئے۔ اور میں سچ کہتی ہوں مائیکل تمہاری آنکھوں نے دکھنی کوریا والوں کی وہ بے انتہا خوشی نہیں دیکھی ہے۔ تمہارے کانوں نے دکھنی کوریا والوں کے وہ خوش آمدید کے نعرے نہیں سنے ہیں جو انھوں نے اس وقت لگائے تھے جب ان کے اپنے لوگوں نے ٹائیگون سے لیا تھا۔ وہ خوشی جو اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنے بھائیوں کو ٹائیگون کا فاتح دیکھ رہے تھے ـــــ کاش تم کمیونسٹ فاتحوں کا وہ شاندار جلوس دیکھ سکتے جو ٹائیگون کے لوگوں نے اپنی کمیونسٹ فوج کا خیر مقدم کرتے ہوئے نکالا تھا۔"

"ہیڈی ـــــ" ہوا باز اس سے آگے پھر کچھ نہیں کہہ سکا۔

"اکتا دیا نہیں مائیکل ـــــ" سٹ ہیڈی کہنے لگی ـــــ "مجھے کچھ اور کہہ لینے دو۔ میرے محبوب ہاورڈ نے تم لوگوں کے نام جو پیغام بھیجا ہے اُسے میں تم لوگوں تک پہنچا دینا چاہتی ہوں تاکہ اگر خدانخواستہ میرا محبوب مر بھی گیا تو اس کی روح کو تسکین پہنچے گی۔"

"ایسا نہ کہو ہیڈی ـــــ" ہوا باز جلدی سے بولا۔

"نہیں مائیکل ـــــ" ہیڈی کہنے لگی ـــــ "خدا نہ کرے ایسا ہو اور اب اس کا خطرہ بھی کچھ کم ہی ہے۔ کیونکہ اب میرا ہاورڈ کمیونسٹوں کے ہسپتال میں ہے۔ جہاں کا ڈاکٹر وہ سانگ اسے اور دوسرے امریکی زخمیوں بیٹوں کی طرح پیارا رکھتی ہے ـــــ لیکن اب اس کو کیا کیا جائے مائیکل خود ہماری امریکی فوجیں ہی ان ہسپتالوں پر بم برسا تی ہیں جہاں ان کے بھائی پڑے کراہ رہے ہیں ـــــ امریکہ کے حکمران طبقے کو دیکھو مائیکل۔ کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ انھیں اپنے آپ کو مہذب کہتے ہوئے شرم کیوں نہیں آتی؟ ایک طرف وہ کمیونسٹ ہیں جنھیں تم ظالم کہتے ہو کہ وہ اپنے زخمی دشمنوں کو اٹھا کر ہسپتال لے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹے اور بھائی کا سا سلوک کرتے ہیں۔ دوسری طرف تمہارے مہذب امریکی ہیں کہ بھائیوں ہی پر بم برساتے ہیں، بھائیوں پر اور ننھے ننھے بچے زخمیوں پر ـــــ کچھ سمجھ میں آتی ہے مائیکل ـــــ"

ہیڈی ـــــ" وہ اور بھی جذباتی انداز میں بولا۔ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا ـــــ

"ہاں مائیکل۔ لگتا ہے اس وقت تم مجھے کمیونسٹ جاسوس یا پانچویں کالم کی لڑکی سمجھ رہے ہو ـــــ"

"نہیں ہیڈی نہیں ـــــ" وہ جلدی سے بولا ـــــ "ایسی بات ہرگز نہیں۔ میں تمہارے دل کی ایک ایک دھڑکن سن رہا ہوں تم جو کچھ بھی کہہ رہی ہو، میں بھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ کامل خلوص کے ساتھ کہہ رہی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ سب کچھ درست کہہ رہی ہو۔"

"پھر بھی میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ـــــ" ہیڈی پھر کہنے لگی۔ "کہ نہ تو میں کمیونسٹ جاسوس ہوں نہ ہی میرا تعلق پانچویں کالم سے ہے بلکہ مجھے امریکہ، اپنا پیارا وطن امریکہ، تم سے اور اپنے محبوب ہاورڈ سے کچھ کم پیارا نہیں۔ اور محبت کے اسی جذبے سے بے تاب ہو کر تو میں اپنے محبوب کا پیغام تم تک پہنچا رہی ہوں مائیکل! سچ کہتی ہوں مائیکل اپنا وطن مجھے بہت عزیز ہے۔ اور میں یہ سن کر کتنی دکھی ہوتی ہوں۔ تمہیں بتا نہیں سکتی جب لوگ ہمارے وطن کو ایک لٹیرا ملک، ایک وحشی ملک ایک ظالم ملک کہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی مائیکل کہ ہمارا وطن یہ سب کچھ کہلائے۔"

"میں محسوس کر رہا ہوں ہیڈی تمہاری باتوں میں خلوص ہے۔ ٹھیک ہے اور وطن کے لئے کچھ محبت ہے ـــــ" مائیکل ایک ہی سانس میں کہہ گیا مگر ہیڈی جذبات سے کچھ اس طرح مغلوب ہو چکی تھی کہ وہ بدستور کہتی رہی۔

"..... یہاں کے ذرے ذرے سے مجھے پیار ہے مائیکل! یہاں کی مائیں مجھے عزیز ہیں۔ یہاں کی دوشیزاؤں سے مجھے محبت ہے یہاں کے نوجوانوں سے مجھے محبت ہے اور یہاں کے بچوں پر میں جان چھڑکتی ہوں ـــــ میں نہیں چاہتی کہ تم دکھنی کوریا کی بھٹی میں جھلس کر یہاں کی ماؤں کی گودیاں خالی خولی اور سونی سونی اور ان کی آنکھیں بے نور کر ڈالو۔ میرے لئے یہ ناقابل برداشت بات ہے کہ میں یہاں کی روشیزاد کا محبت بھرا دل چور چور اور بچھلی چھلنی دیکھوں ـــــ اُف میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ یہاں کے بچے، میرے اپنے بچے باپ کے لئے ترسیں!

ـــــ نہیں مائیکل ـــــ نہیں، تمہیں دکھنی کوریا کا ارادہ بھی نہیں کرنا چاہیئے ـــــ تمہارے پاس لاکھ نئے جنگی آلات ہیں۔ تمہارے پاس لاکھ ڈالر ہیں ـــــ مگر یہ نئے جنگی آلات اور یہ ڈالر حب الوطنی کے سچے جذبے کے نزدیک بیکار ہیں ـــــ مائیکل یہ سب کچھ کام نہ آئیں گے۔ دکھنی کوریا کے عوام اپنے ملک کو بچانے کے لئے کیا کچھ نہ کر ڈالیں گے مائیکل ـــــ مائیکل ـــــ" سٹ ہیڈی جیسے نڈھال سی ہوگئی تھی۔ وہ چپ ہوگئی۔ ہواباز نے پھر کہا ـــــ

"میں محسوس کرتا ہوں ہیڈی، تمہاری باتوں میں خلوص ہے، نیک نیتی ہے اور وطن کے لئے سچی محبت ہے۔"

"نہ بھی محسوس کرو ـــــ" سٹ ہیڈی نے پھر کہنا شروع کیا ـــــ "اگر خدانخواستہ تم پرسوں صبح سویرے یا رعویں بٹالین میں شریک ہوکر دکھنی کوریا کے لئے روانہ بھی ہوگئے۔ تو تمہیں میری باتوں کی صداقت کا احساس اس وقت ہوگا جب تمہارا جہاز پوسان کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوگا۔ اور تم دیکھو گے کہ تمہارے استقبال کے لئے دکھنی کوریا کا ایک بچہ تک نہیں آئے گا۔ بلکہ جب تم وہاں کے بازاروں اور گلیوں سے گذرو گے تو تم یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکو گے کہ وہاں کا ایک ایک مزدور، ایک ایک طالب علم، ایک ایک کسان، ایک ایک عورت اور ایک ایک بچہ تمہیں نہ صرف حقارت بھری نظروں سے دیکھے گا۔ بلکہ تم ان نظروں میں یہ بات آسانی سے پڑھ لوگے کہ وہ تمہیں بس چلنے پر کچا چبا جانے کے سے انداز میں دیکھ رہے ہوں گے۔ حتیٰ کہ خود دکھنی کوریا کے سپاہی، اپنے دشمن کے غدار سپاہی بھی تمہیں نفرت ہی کی نظر سے دیکھیں گے اور جنگ کے وقت تمہیں یہ دیکھ کر بے شک حیرانی ہوگی کہ وہ انتہائی بے دلی سے لڑیں گے، جیسے کھیے پر تھپر رکھ کر لڑ رہے ہوں۔ یا جیسے کسی بڑے بھاری بوجھ سے دب کر لڑ رہے ہوں ـــــ تم جانتے ہو مائیکل یہ بوجھ کونسا ہے؟ ـــــ یہ بوجھ امریکہ کا حکمران طبقہ ہے جو محض اپنی دیگچی اور اپنے مفاد کے لئے شیراز اور پیلوان کو لڑا رہا ہے ـــــ"

"ہیڈی! تم فرشتہ ہو ـــــ" ہواباز حد سے زیادہ بھونڈے انداز میں بولا۔

"نہیں مائیکل ـــــ" سٹ ہیڈی بولی ـــــ "میں تمہاری ہی طرح ایک انسان ہوں۔ اور صرف انسان ہی رہنا چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں بس اتنا فرق ہے کہ تمہارے دل اور دماغ پر امریکہ کے حکمران طبقے، جنرل سیک آرتھر اور اپنی بارہویں بٹالین کے کمانڈر کا قبضہ ہے اور میرے دل اور دماغ پر امریکہ کے معصوم عوام، دکھنی کوریا کے مظلوم انسان اور اپنے محبوب فادر ڈیلر کی حکومت ہے ـــ تم جنگ کی باتیں سوچتے ہو اور میں امن کی ـــــ بس اور تو کوئی فرق نہیں ـــــ"

"نہیں ہیڈی نہیں ـــــ" ہواباز جلدی سے بولا ـــــ "میں مانتا ہوں کبھی میرے دل اور دماغ ویسے تھے۔ لیکن اب ..... کہتے کہتے وہ بہت جذباتی ہوگیا۔ اس کے چہرے پر ایک نئی قسم کی چمک نمودار ہوگئی۔ اور وہ چپ ہوگیا ـــــ اور سٹ ہیڈی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

ٹھیک اسی وقت انہوں نے دیکھا کہ پولیس کے دو سپاہی ان کی طرف بڑھے آرہے ہیں۔ سٹ ہیڈی نے جلدی سے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا بیگ نکال لیا۔ اور جلدی سے اپنے گلے کے ہار کا صلیب پیچھے پیٹھ پر گھما کر رکھ لیا۔ ہواباز سٹ ہیڈی کو مسکراتے ہوئے دیکھنے لگا۔

پولیس کے ایک سپاہی نے سامنے آکر کہا۔

"میں نے آپ لوگوں کو فرض شن میں باغیانہ باتیں کرتے سنا تھا ـــــ"

دونوں سپاہیوں نے ان کی کلائیاں تھام لیں۔

"پاگل تو نہیں ہوگئے ہو ـــــ سٹ ہیڈی حد سے زیادہ چیخ کر بولی ـــــ اور پھر اپنے بیگ کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگی ـــ تم دیکھتے نہیں، میرے گلے میں دو بیگ ہیں اور میرے گلے کے ہار کا صلیب پیٹھ پر ہے ـــــ تم خاک پولیس کے سپاہی ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں نوجوانوں کو چاہنے والی پیشہ کا۔ لڑکی ہوں ـــــ"

پولیس کے سپاہی اور ہوا باز تینوں ہی سٹ ہیڈی کے بیگ اور چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ پھر چیخ کر بولی ــــ
"چھوڑ دو ہماری کلائیاں۔ تم دونوں نے تو سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اب میرا محبوب، میرا شکار مجھ سے روٹھ کر بھاگ جائے گا۔"
اپنے شک کے مطابق پولیس کے سپاہیوں نے ان کی تلاشیاں لے ڈالیں اور اُن کے پاس ایک بھی مشتبہ چیز نہ پاکر سر جھکائے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

سٹ ہیڈی نے ہوا باز سے ہنس کر پوچھا ــــ
"پر اب تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو مائیکل؟ ــــ"
"انسان صرف ایک بار پچھاڑا اور سمجھا جاتا ہے ہیڈی، بار بار نہیں۔" اور اس نے سٹ ہیڈی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
"اب ہمیں چلنا چاہیئے مائیکل۔" سٹ ہیڈی اُٹھتے ہوئے بولی۔
"کہاں چلو گی؟" ــــ ہوا باز نے پوچھا۔
"فن لس ہی چلنا چاہیئے ــــ۔" سٹ ہیڈی نے جواب دیا۔
"پھر وہاں؟ ــــ" مائیکل نے تعجب سے پوچھا "ــــ کس لئے؟"
"کیوں نہیں؟ ــــ" سٹ ہیڈی کہنے لگی ــــ "ابھی تو میں اپنے محبوب کا پیغام صرف تم ہی تک پہنچا سکی ہوں۔ مجھے تو یہ پیغام بارہویں بٹالین کے روانہ ہونے سے پہلے پہلے زیادہ سے زیادہ ساتھیوں تک پہنچا دینا ہے۔"
"ہیڈی! ــــ" ہوا باز نے کہا ــــ "اب میں بھی تمہارے کام میں تمہاری مدد کروں گا۔"
"شکریہ! ــــ" سٹ ہیڈی نے آہستہ سے کہا۔
اچانک ہوا باز کی نظر کافی کی پیالیوں کی طرف گئی جو میز پر پڑی تھیں۔ ہوا باز نے ایک پیالی میں انگلی ڈالی۔ پھر ہنس کر بولا ــــ
"ارے یہ تو بالکل ٹھنڈی ہوگئی، ہم نے پی ہی نہیں۔"
"ٹھیک ہے ــــ" سٹ ہیڈی نے کہا ــــ "یہ اس بات کا نیک شگون ہے کہ ہماری خلوص نیتی جنگ کی آگ کو بھی ٹھنڈا کردیگی" اور دونوں مسکرانے لگے۔
اور پھر ہوا باز نے میز پر رکھے ہوئے بل پر دس پنس کے سکے رکھ دیئے۔

○

"میراث" کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ہمارے یہاں بہت کم کسی نے اتنے اچھے افسانے لکھے ہوں گے جتنے پرکاش پنڈت نے لکھے ہیں ــــ پرکاش پنڈت کے بیشتر افسانے چیخوف کے رنگ کے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ بڑی کامیابی کے ساتھ انھوں نے اس رنگ کو نبھایا ہے ــــــــــــــــــــ (نیاز فتحپوری)

میراث (پرکاش پنڈت کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ)
قیمت صرف تین روپے

مکتبہ شاہراہ دہلی

ایک بنگالی کہانی

کہاسہ

بملا رنجن داس بخشی

اسکول سے واپسی کے بعد بیرو نے نامناسب مطالبات اور کچھ کچھ کرنا تقریباً روزانہ کا معمول تھا۔ جب کھانے کو روٹیاں ہوتیں تو وہ بات مانگتا جب بات ہوتا تو وہ "بھونا" مانگتا اور جب گھر میں کچھ نہ ہوتا تو اسے روٹی مانگنا اچھا لگتا۔ یہ بالکل ہی مشکوک بات ہے کہ اس کی خواہش کم سے کم مہینہ میں ایک بار پوری ہوتی تھی تاہم اس کی عادت ایسی ہی تھی۔

ایک دن اس کا بے جا مطالبہ معمول کے مطالبات سے بھی زیادہ بے جا تھا۔ اسے کئی بار پھسلانے کے بعد اس کی ماں نے تقریباً بے بس ہو کر مینو کو پکارا۔ کیونکہ اگر کسی کا کچھ اثر بیرو پر تھا تو وہ مینو ہی کا تھا۔ مینو گرچہ بیرو سے دو سال چھوٹی تھی مگر وہ بھی بیرو سے صرف ایک درجہ نیچے تیسرے درجہ میں پڑھتی تھی۔ لیکن گھر کا ہر ایک آدمی سنتی کہ خود مینو بھی اور بیرو بھی مینو ہی کو دونوں سے بڑا خیال کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مینو بیرو کو نام لے کر پکارا کرتی تھی اور اس پر حکم جتایا کرتی تھی۔ جب اسکول کا وقت ہوتا وہ اسے نہلاتی اسے قمیض اور جانگیہ پہننے میں مدد دیتی اور اسکے بالوں میں کنگھی بھی کر دیتی۔

اس وقت مینو ورزا ہی اسکول سے واپس آئی تھی چند ہی لمحوں میں اس نے اسکول کی کتابیں کوٹھڑی میں پھینکیں اور باورچی خانے میں آتے ہوئے اکسانے کے انداز میں بولی۔

"جلدی کھاؤ بیرو ہم لوگ آج ایک نفیس کھیل کھیلیں گے۔"

جیسے ہی ماں ہٹی تھی بیرو نے ٹوکری سے دو آلو نکالے تھے اور ان سے آپ ہی آپ گولی کھیل رہا تھا۔ جب اس نے مینو کے نفیس کھیل کا سنا تو اس نے مستعد ہو کر پوچھا۔

"وہ کون سا کھیل ہے ــــ مینو؟" ــــ اور اس نے دونوں آلوؤں کو ٹوکری میں واپس ڈال دیا۔

مینو نے کہا۔

"پھر تی سے کھا کر آؤ تب میں تمہیں بتاؤں گی۔"

چند لمحے چپ رہنے کے بعد بیرو نے کہا۔

"میں ابھی نہیں کھاؤں گا ــــ چلو ہم کھیلیں۔"

اور وہ اُٹھ کر جانے لگا تب مینو سخت ہو کر بولی۔

"نہیں، کھا کر آؤ ورنہ تم بیچ کھیل میں اُٹھ کر چلے آؤ گے اور کھیل خراب ہو جائے گا۔"

مینو کی منطق کو منظور کرتے ہوئے وہ بولا۔

"تو پھر آؤ، جلدی سے کھا لیں۔"

اور جلدی میں وہ ننگے ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ مینو جلدی سے اپنے دونوں کے لئے چھپی ہوئی رکابیوں میں کھانا لے آئی۔ جیسے ہی رکابیاں اس کے آگے رکھی گئیں وہ کھانا نگلنے لگا۔ مینو نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

"اتنی جلدی مت کھاؤ بیرو۔ پیٹ میں درد ہو جائے گا۔"

بیرو ہمیشہ مینو کی نصیحتوں کی عزت کرتا تھا۔ کیونکہ اسے بیشک مستقل طور پر مینو کی عظمت کا خیال تھا۔ اس کے نزدیک مینو بہت تجربہ کار تھی اس کا خیال تھا مینو جو کچھ کہتی ہے وہ قابل قدر بات ہوتی ہے۔ اور وہ بات جس سے مینو ناواقف ہے وہ دنیا بھر میں صرف چند دانشوروں کے

علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا ہے۔ اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ آہستہ آہستہ چباتے ہوئے سفارشانہ انداز میں بولا۔

"مہربانی کر کے یہ بتاؤ مینو کہ وہ کس قسم کا کھیل ہے؟"

مینو نے اپنی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"یہ راشن کا کھیل ہے۔"

"یہ راشن کا کھیل ہے۔"

یہ سوچنے میں ناکام ہوتے ہوئے کہ اس کھیل کا آغاز کس طرح ہوگا اور انجام کیا ہوگا بیرو نے اچنبھے سے پوچھا۔

"یہ راشن کا کھیل سچ مچ ہے کیا؟"

مینو نے کھانا، دکا اور شکایت اور رحم کے ملے جلے آواز میں کہنے لگی۔

"تم حد درجہ قابل رحم ہو ——— کیا تمھیں نہیں معلوم ہے کہ تمھارے پاس راشن کی ایک دوکان ہوگی۔ بے بی اور ہم تمھارے یہاں سے ہی راشن لیں گے۔ تم لکھو گے، وزن کرو گے اور مجھ سے باتیں کرو گے ——— کیا یہ ایک کھیل نہیں ہوگا؟"

بیرو نے مینو کی باتیں سننے کیلئے کھانے سے بالقدر رک دیا تھا جیسے ہی مینو نے بات ختم کی۔ وہ زمین سے اچھل پڑا کھڑا ہوگیا اور پھر اور بھی جلدی جلدی کھانے لگا۔ کھانے کے دوران میں اس نے کھیل کے بارے میں سوچا۔ اچانک اس نے کچھ باتیں سوچیں اور بولا۔

"مینو میں اکیلا آدمی ہوں۔ مجھکو لکھنا ہوگا۔ باتیں کرنی ہونگی اور علاوہ قسم کرنا ہوگا! تنے سارے کام میں کسطرح کر پاؤنگا۔ ایک سچی دوکان میں تو تین چار آدمی ہوا کرتے ہیں؟"

مینو نے بھی اس بات کو نہیں سوچا تھا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ اور کوئی صورت نکالنے لگی۔ بیرو بھی بیکار بیٹھا نہیں تھا۔ وہ اتنے اچھے کھیل کبھی تباہ ہوتے نہیں دیکھے گا۔ لیکن اسے اعتماد تھا کہ بہرحال مینو کوئی صورت نکال لے گی۔

بیرو کا عقیدہ درست تھا۔ مینو نے کہا۔

"سنو بیرو پہلے بے بی میرے ساتھ رہے گی۔ اس کے بعد جب تم لکھ چکو گے تو وہ جا کر وزن کرے گی۔"

ایسا لگا جیسے یہ ترکیب بیرو کو قابل قبول تھی۔

بیرو نے جیسے ہی کھانا ختم کیا وہ ضروری چیزوں کو تھیلا کرنے لگا اور مینو بے بی کو بلانے چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں بیرو تیار تھا۔ مینو بے بی کو لائی اور دوکان میں کھڑی ہوگئی۔ دونوں ایک ایک پھٹے کپڑے کا تھیلا اور ایک ایک کاغذ کا ٹکڑا لئے ہوئے تھیں۔ بیرو نے ذرا گمبھیر ہو کر کہا۔

"راشن کارڈ بڑھاؤ ——— کن چیزوں کی تم کو ضرورت ہے۔"

اس کے گمبھیر چہرے کو دیکھ کر مینو اپنی ہنسی کو دیر تک ضبط نہ کر سکی۔ بیرو مینو کی ہنسی کو دیکھکر غصہ ہوگیا اور رنجیدہ آواز میں بولا۔

"تم ہمیشہ ہر بات پر ہنستی ہو مینو! اگر تم اس طرح کروگی تو میں نہیں کھیلوں گا۔"

مینو کی ہنسی یک لخت رک گئی۔ اور وہ پریشان ہو کر بولی۔

"مہربانی کر کے مت جاؤ بیرو اب میں نہیں ہنسوں گی۔"

بیرو مان گیا۔ اس نے مینو سے کاغذ کا ٹکڑا لیا اور کہا۔

"تم کیا چیز چاہتی ہو؟"

مینو نے کہا ——— "بابو مجھے آٹا اور چاول دیجئے۔"

بیرو نے پھر سنجیدگی کو نمایاں کرتے ہوئے کہا۔

"تم کو صرف آٹا نہیں لے گا، بلکہ تم کو میدا بھی لینا ہوگا۔ یہ گورنر کا حکم ہے۔"

مینو اس بارے میں چند لمحوں تک سوچنے کے بعد مسکرا کر کہنے لگی۔
"مہربانی کر کے مجھے آٹا اور روٹی کے کوپن دے دیجئے۔"
کوپن کی بات نے بیرو کو خوش کیا۔ اور وہ بولا۔
"ٹھیک ہے! تمہیں دس روپے دینے ہوں گے۔"
چونکہ کھیل شروع ہوتے وقت کسی نے کوپن کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس لئے کاغذ بھی نہیں لایا گیا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے مینو سے کہا۔
"مینو! ہم لوگ کوپن کس کا بنائیں۔؟"
مینو بھاگی اور سرخ رنگ کے ایک ٹکڑے کے ساتھ واپس آتے ہوئے بولی۔
"اس سے نہیں کوپن بنیں گے۔ ہے کہ نہیں بیرو؟"
بیرو لال کاغذ کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔
"مینو یہ کاغذ تم کہاں سے اٹھا لائیں؟" اس نے کہا۔ "یہ تو بالکل اصلی کوپن جیسا لگے گا۔ ہے کہ نہیں۔"
اور اس نے لال کاغذ کے ٹکڑے کی طرف روشن آنکھوں سے گھورا۔ اور پھر اس کا ایک ٹکڑا مینو کو دیتے ہوئے بولا۔
"یہ لو ـــــ دس پونڈ روٹی کا کوپن ہے۔"
تب اس نے بے بی سے کہا
"تم اس طرف آؤ اور اس کا وزن کرو"
جب بے بی بیرو کے نزدیک آئی تو وہ زور سے بولا۔
"دس سیر چاول اور پندرہ سیر آٹا"
مینو آگے بڑھی اور اپنے پھٹے ہوئے تھیلے کو کھول کر بولی۔
"اس میں آٹا اور چاول دے دو بے بی"
بے بی نے اپنے خالی ہاتھ کو تھیلے میں ڈالا اور کہا۔
"یہ لو آٹا اور یہ لو چاول۔"
بیرو نے مینو سے کہا ـــ "بے بی بالکل بچی ہے۔ مگر وہ بہت اچھی طرح کھیل رہی ہے۔ ہے کہ نہیں مینو؟"
اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مینو باہر چلی گئی۔ اور فوراً ہی بے بی کے پیچھے آکر کھڑی ہو گئی۔
دو تین بار یہ کھیل کھیلنے کے بعد بیرو نے کہا۔
"آج کے لئے اتنا کافی ہے مینو۔ ہم لوگ یہ کھیل کل پھر کھیلیں گے۔" اور آج کے کھیل کو ختم کر دیا گیا۔
دوسرے دن سویرے بیرو پڑھنے بیٹھ گیا۔ لیکن شروع سے آخر تک ایک خیال اس کے دماغ کو اس طرح جکڑے رہا کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکا۔ اس نے رات اپنے دادا (بڑے بھائی) اور بابا کی گفتگو سن کر ایک نیا کھیل ایجاد کیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اس کے بارے میں مینو سے نہیں کہہ سکا تھا اس لئے اب اپنے اس دولے کی زیادتی بڑی مشکل سے روک رہا تھا۔ بیتی رات جب اس نے کھیل کو ایجاد کیا تھا اس وقت مینو سو چکی تھی اور آج بیرو بڑی الجھن میں تھا کیونکہ قبل اس کے کہ وہ جاگتا، مینو اپنی ایک ہم جماعت کے مکان پر حساب کے سوال حل کرنے چلی گئی تھی۔ جسے بیرو کچھ دیر تک کتاب کی ورق گردانی کرنے کے بعد کچھ لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن جب وہ کچھ لکھنے میں بھی دماغ نہیں لگا سکا تو وہ سلیٹ پر ڈرائنگ بنانے لگا۔
جب بیرو نے بہت ہی غور سے ڈرائنگ بنانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت مینو دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔
"آؤ بیرو کل والا کھیل کھیلیں ـــــ ارے تم نے اب تک اپنا کام نہیں ختم کیا ہے؟"

مینو کو دیکھتے ہی اس نے ڈرائنگ بنانا ختم کر دیا۔ اور کتابوں کو اکٹھا کرتے ہوئے اس نے کہا۔
"اوہ! کب آئیں میں نے اپنا کام ختم کر دیا۔" وہ پھر بولا۔ "ہم کل کا کھیل نہیں کھیلیں گے۔ مینو میں نے ایک نیا کھیل ایجاد کیا ہے۔ جلدی سے بے بی کو بلاؤ۔"
اپنے راشن کے کھیل کو ایک ہی دن میں پرانا ہوتے ہوئے دیکھ کر مینو گھٹے ہوئے لہجے میں بولی۔
"یہ نیا کھیل کون سا ہے! ——— راشن کا کھیل تو کتنا اچھا تھا۔"
مینو کی ناراضگی کو سمجھنے میں ناکام رہ کر ہیرو نے بڑے تپاک سے کہنا شروع کیا۔
"سنو تم اور بے بی مل کر ایک جلوس نکالو گی اور ایک پولیس کے آدمی کی طرح میں تم لوگوں پر گولی چلاؤں گا۔ پھر تم دونوں مر جاؤ گی ———"
اس وقت بھی جب مینو نے نئے کھیل کے بارے میں نہیں سنا تھا، کھیلنے پر رضامند تھی اور اب کھیل کی تفصیل سن چکنے کے بعد کراہیت آمیز لہجے میں پوچھا۔
"کیا تم نے کسی ایسی جگہ کے بارے میں سنا ہے جہاں عورتوں پر گولی چلائی گئی ہو؟"
اس میں شک نہیں کہ وہ کسی بھی دوسری بات میں عورت اور مرد میں کوئی تمیز نہیں رکھتی تھی لیکن وہ اپنی مستقل منطق کے ساتھ محض ہیرو کے کھیل کو تباہ کرنے کے لئے چپٹی رہی۔
کھیل کو قبول کرنے میں مینو کی شدید ناراضگی کی وجہ سے ہیرو نے بہت ہی خفیف سی افسردگی کے ساتھ کہا۔
"واہ! اسے پوچھو نا ——— کہ پولیس کے آدمیوں نے باغ بازار یا بو بازار کے نزدیک کسی جگہ عورتوں پر گولی چلائی ہے۔ ان میں چار عورتیں بھی تھیں۔"
اس پر بھی مینو نے اس بیان پر اعتبار نہیں کیا۔ جب واوا نے کہا تھا وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ آخر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے تب ہم لوگ یہ کھیل کھیلیں گے۔"
اور چند قدم آگے جانے کے بعد اس نے حکم دیا۔
"تم تمام سامان کو جمع کرنا شروع کرو۔ میں جا کر بے بی کو بلاتی ہوں۔"
وہ بے بی کی تلاش میں چلی گئی۔ اور ہیرو سپاہیوں کی سی وردی پہن کر ضروری چیزیں تلاش کرنے لگا۔ ایک رائفل اور ایک پگڑی۔ چھتری پر نظر پڑتے ہی اس نے سوچا کہ یہ رائفل کی جگہ اچھا کام کرے گی۔ اور پگڑی کے لئے لال کپڑا حاصل کرنے میں ناکام رہنے پر اسے اپنے سر پر تولیہ باندھنا پڑا۔ اس نے اپنی قمیض کو اپنے جانگیہ کے اندر ٹھونس لیا اور ٹھیک بندوق کی طرح چھتری کو کاندھے پر رکھ لیا۔
جب مینو بے بی کے ساتھ واپس آئی اور ہیرو کا سپاہیانہ لباس دیکھا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ جھٹ سے ہیرو نے اپنے کندھے پر کی چھتری پر ایک نگاہ ڈال کر غرور سے کہا۔
"کیا ٹھیک نہیں ہے مینو۔" اور پھر اس نے کہا۔ "اچھا اب تم لوگ ایک جلوس کی شکل میں آگے بڑھنا شروع کرو۔"
مینو اور بے بی ایک ساتھ کھڑی ہو گئیں اچانک مینو کچھ سوچ کر دوڑی ہوئی ہیرو کی طرف آئی۔ "لیکن ہیرو ہمیں کونسا نعرہ لگانا چاہیئے؟"
اور پھر وہ سوچنے لگی اور پھر اس نے کہا ——— "سنو ہیرو کیا ہم لوگوں کو بندے ماترم اور جے ہند پکارنا چاہیئے؟"
ہیرو نے اسے روک دیا۔
"کیا آجکل، کوئی آدمی یہ نعرے لگاتا ہے؟ ——— تم انقلاب زندہ باد پکارو۔ میں نے بھی اسے بہت مرتبہ جلوس میں پکارا ہے۔"
مینو قدرے خوفزدہ ہو گئی۔ وہ سنسنائی ——— "کیا تم بھی ان جلوسوں میں گئے ہو ہیرو؟"
وہ ہمیشہ سے نہایت ہوشیاری سے اپنے جلوس میں شریک ہونے کے بارے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اچانک ہیرو کپڑا گیا۔ اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔
"نہیں مینو میں جلوسوں میں نہیں جاتا ہوں۔ وہ لوگ سڑک سے ایسے نعرے لگاتے ہوئے گذرتے ہیں۔ میں نے ان کو صرف سنا ہے۔"
مینو کا ڈر مٹ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بہت بدھو ہے۔ وہ کبھی کس طرح جلوسوں میں گیا ہوگا۔ تب اس نے بے بی سے کہا۔
"سنو بے بی جب میں کہوں گی "انقلاب" تب تم چلانا "زندہ باد" اور تم میرے پیچھے پیچھے چلتی رہنا۔"
وہ اور بے بی چلنے لگیں۔ چند قدم جانے کے بعد مینو نے کہا۔

"انقلاب"

بے بی ہنستی ہوئی بولی ـــــ "زندہ باد" ـــــ "زندہ باد"

مینو نے پھر کہا ـــــ "انقلاب"

بے بی نے تالی بجاتے ہوئے جوش سے کہا ـــــ "زندہ باد" ـــــ "اسے پھر کہہ ریدی"

بیرو نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

"بے بی اتنا مت بولو ـــــ جو کچھ مینو کہے وہ کہو۔"

پھر وہ اچانک زور سے چلّایا ـــــ

"ٹھائیں"

لیکن مینو برابر آگے بڑھتی رہی۔

بیرو پھر دوبارہ ویسے ہی چلّایا ـــــ

"ٹھائیں ـــــ ٹھائیں"

مینو کو اب تک بڑھتے دیکھ کر بیرو خفا ہو کر بولا۔

"تم اب تک کیوں چل رہی ہو مینو۔ کیا میں نے تم دونوں کو گولی نہیں ماردی ہے؟"

اب مینو بات کو سمجھ گئی۔ اس نے پہلے بے بی کو لٹا دیا اور پھر خود بھی لیٹ گئی۔

بیرو بہت خوش تھا۔ تب اس نے کہا۔

"اُٹھ جاؤ مینو بس اتنا ہی بہت ہے۔ پھر جلوس بڑھاؤ۔"

تھوڑی دیر کے بعد اس نے مینو کو چتاؤنی دی ـــــ

"لیکن اس دفعہ میں جیسے ہی گولی چلاؤں گا تم لوگوں کو مرجانا ہوگا ـــــ"

اس طرح کئی دفعہ کھیلنے کے بعد مینو نے کہا۔

"اب ہم لوگوں کو چلنا چاہیئے اور نہا لینا چاہیئے اسکول کا وقت ہوگیا ہے۔ ہم لوگ شام کے وقت دوبارہ کھیلیں گے۔"

چونکہ اسکول میں ہڑتال تھی اس لئے مینو جلدی ہی گھر لوٹ آئی۔ لیکن اسکول نہ رہنے کی ساری خوشی ختم ہوگئی۔ کیونکہ بیرو اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ایک مرتبہ اسے شک گذرا کہ بیرو کا اسکول بھی بند ہوگیا ہوگا۔ وہ اس خیال سے قدرے اداس ہوگئی۔ وہ سارا دن کس طرح گذارے گی اس سوچ میں اُلجھی ہوئی وہ گیٹ تک گئی۔ اور کافی دیر تک گیٹ پر بیرو کا انتظار کرتی رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ بیرو نہیں آرہا ہے تو وہ بیرو کے اسکول کے لڑکوں سے ملی۔ اس نے سوچا کہ یہ سب بھی بیرو جیسے ہی بدھو ہیں۔ لڑکیوں نے بھی ہڑتال کر رکھی ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکے۔

جب اس نے اسکول کے طالبعلموں کا ایک جلوس سڑک سے گذرتے دیکھا تو مینو کی بے چینی اور بھی بڑھ گئی۔ اور تب اس نے خیال کیا کہ آج بیرو کے واپس آنے پر وہ کچھ سخت باتیں کہے گی۔

اس کے بعد بھی جب بیرو نہیں آیا تو وہ اپنی کوٹھڑی میں واپس آئی۔ اور کچھ دیر کے بعد بیٹھ گئی اور گڑیوں سے کھیلنے لگی۔ کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

گڈے کو لباس پہناتے وقت اس نے سوچا ـــــ

"کتنے دن گذر گئے۔ جب میں نے اپنی لڑکی کی بیرو کے لڑکے سے شادی کی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی شادی نہیں ہوئی۔ آج جب بیرو واپس آئے گا تب میں اس کی لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی کردوں گی۔ اور وہ دلہن کو سنوارنے لگی۔

دُلہن سنوار دی گئی ۔ مگر ہمیں تسلی بخش نہیں تھا ۔ وہ پھر ننگی کر دی گئی ۔ پھر سنواری گئی ۔ اور پھر ننگی کر دی گئی ۔ آخر کار مینو جھنجلا اُٹھی اور گڑیا کو بکس میں رکھتے ہوئے وہ فرش پر لیٹ گئی ۔

جب مینو نیند سے جاگی تو کافی اندھیرا چھا چکا تھا ۔ لیکن آنکھیں ملنے اور چاروں طرف دیکھنے کے بعد بھی اسے پتا نہ لگ سکا کہ آیا یہ شام ہے یا بھور ۔ سارا گھر ناقابل برداشت حد تک سنسان ہو چکا تھا ۔ وہاں قطعی طور پر کوئی آواز نہیں تھی ۔ جب مینو نے کھڑکی سے سڑک کی طرف دیکھا تو اسے پتہ لگا کہ شام ہو سکتی ہے ۔ اچانک بیروکا یاد آتے ہی وہ نیچے اتر گئی ۔ لیکن جب اس نے ماں کو اندھیری کوٹھڑی میں پڑے اور بہن کو پاس ہی بیٹھے دیکھا تو وہ پریشان ہو گئی ۔ وہ بیرو کے بارے میں پوچھنے کے لئے اپنی بڑی بہن کے پاس گئی ۔ لیکن جب اس نے ماں کی شکل دیکھی تو خوفزدہ ہو گئی ۔ اچانک اُسے اپنے حلق میں ڈھیلا پھنستا ہوا محسوس ہوا ۔ اس نے چیخنا چاہا ۔ بوکھلاہٹ میں وہاں دیر تک کھڑی رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف گئی ۔ سڑک پر چلنے والے لاتعداد لوگوں میں سے اس نے ہر ایک کو نہایت ہی غور سے دیکھا ۔ لیکن ایک دفعہ کے لئے بھی اسے بیرو کی وہ مخصوص چال نظر نہ آئی ۔

وہاں پر دیر تک کھڑی رہنے کے بعد مینو پریشان ہو کر فٹ پاتھ پر چلی گئی ۔ اور آہستہ آہستہ وہ اس جگہ جا پہنچی جہاں سے بیرو روزانہ سڑک پار کیا کرتا تھا ۔ وہاں پر وہ اچانک کھڑی ہو گئی ۔ پھر جب اس نے سڑک کی سیاہ کولتار پر خون کا کوئی دھبہ نہیں دیکھا تو اسے اطمینان ہو گیا ۔ اس نے سوچا کہ وہ اس پان کی دوکان کے مالک سے پوچھے آیا آج کوئی آدمی کار سے دبا ہے ۔ اس طرح سوچتی ہوئی آئی اور دوکان کے سامنے کھڑی ہو گئی ۔ لیکن اسے یہ سوال دریافت کرنے میں کچھ شرم سی محسوس ہوئی ۔ اور وہ وہاں کچھ دیر تک کھڑی رہنے کے بعد ۔ اچانک ۔ کچھ سوچ کر گھر کی طرف لوٹ گئی ۔

اس نے سنا تھا کہ شہر میں کچھ بٹیا آیا ہوا ہے ۔ ایسا سوچتے ہی مینو کا خون سوکھ گیا ۔ اس نے سُنا تھا کہ کچھ سادھوؤں کے چیلے کچھ بٹیا تھے ۔ اور پوجا ختم کرنے کے بعد وہ لڑکوں کو قربان کر دیتے تھے ۔ مینو درد سے چلا اُٹھی اور وہ کچھ سوچ نہ سکی ۔

کچھ دیر خاموش کھڑی رہنے کے بعد اس نے کچھ سوچا اور پھر گیٹ کے پاس چلی گئی ۔ اس وقت کافی دیر تک اس نے سڑک پر کے لوگوں کو دیکھا ۔ آخر جب وہ تھک گئی ۔ اس لئے پھر وہ کوٹھڑی میں واپس چلی گئی اور نیچے فرش پر لیٹ گئی ۔

بس صبح کو کسی کی آواز نے مینو کی نیند توڑ دی ۔ اسے تو ننڈک محسوس ہوئی ۔ اور رات کے کمرے کو دیکھ کر اندر سے وحشت سی رینگتی محسوس ہوئی ۔ اور اس نے نیچے کسی کی دبی دبی سسکیوں کی آواز سُنی ۔ مینو دل میں خوف سے نیچے گئی ۔ جب اس نے وہاں بھی کسی کو نہ دیکھا تو اس کا چیخنے کو جی چاہا ۔ مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی ۔

اس کا حلق قطعی طور پر سوکھ گیا تھا ۔ دیر تک وہاں کھڑے رہنے کے بعد مینو نے سڑک پر کچھ شور سُنا ۔ جیسے ہی اس نے باہر قدم رکھا اسے کچھ بٹیا کے بارے میں یاد آگیا ۔ اس کا جسم کانپ اُٹھا اور وہ مایوسی کے ساتھ آخری طور پر گیٹ کی طرف گئی ۔

وہ گیٹ کے پاس پہنچ کر کھڑی ہو گئی ۔ اور جیسے اس پر بجلی گر گئی ۔

اس نے بیرو کے اکڑے ہوئے سرد جسم کو فٹ پاتھ پر پڑے دیکھا ۔ اس کی ماں اس کے پاس بدحواس کھڑی تھی ۔ اور چاروں طرف بے شمار لوگ خاموشی کے ساتھ کھڑے تھے ۔ کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد اور لوگوں کی باتیں سن کر اسے پتہ چلا کہ بیرو کی موت کل کے جلوس میں پولیس کی گولی سے ہوئی ہے ۔

اچانک مینو کو کل کے کھیل کی یاد آگئی ۔ اس وقت مینو نے بیرو کے بتانے کے باوجود اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا ۔ مگر آج سارا کہانہ صاف ہو رہا تھا ——

(مترجمہ:- مہدی شاعر)

○

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک تلگو نظم

رنتالا گوپالا کرشنا

جگمگاتے تارے

آسمان کی وسعتوں کے کناروں پر
یہ جگمگاتے تارے
بھوک سے بیتاب، کچلی ہوئی زندگیوں کے
آنسو ہیں پلکوں سے ٹپکے ہوئے!

جنگی راکھشسوں کو زندہ کرنے والی
مرتی ہوئی فاشسٹ حکومتیں
دو کیفیتوں کے درمیان مسل رہی ہیں
ہزاروں انسانی زندگیاں!
اور انسان پر انسانی مظالم روا رکھنے کی خاطر
مورکھ، مذہبی نفاق
رشک و حسد کی آگ میں ایندھن کی طرح
جلا رہا ہے ہزاروں نوجوان زندگیوں کو!!

لیکن ہل کے پھالے کے ذریعہ اپنے تازہ خون سے،
زمین کو سینچنے والے کسان
بھوک سے تلملا کر بغاوت پر آمادہ،
ہڑتال کرنے والے مزدور۔
جیل کے گھپ اندھیرے میں،
ہمت نہ ہارنے والے نوجوانوں کا سُرخ نور
نئی دنیا کی داغ بیل ڈالنے میں .....
دے رہے ہیں مکمل قربانیاں!
یہ تمام مجاہد —— دلیر ہستیاں!!

ترجمہ: ڈاکٹر اوم بھارتی

فکر تونسوی

جائزے

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

۱۹۵۰ء کا بہترین ادب

پبلشر ——— مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی
ترتیب دینے والے ——— سردار جعفری ۔ پرکاش پنڈت
صفحات ——— ۳۶۸ ——— قیمت ——— پانچ روپے آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ نے سال گذشتہ کی طرح اب کے بھی سال کا بہترین ادب کتابی صورت میں پیش کیا ہے یہ ایک صالح اور زندہ روایت ہے جسے قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے اردو ادب کی تاریخ مکتبہ شاہراہ کی ممنون احسان رہے گی۔

ایسے مجموعے ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی بہم پہنچاتے ہیں کہ کسی خاص دور میں سماجی مسائل کی نوعیت کیا تھی اور ان مسائل کو ادب کے نمائندے کس زاویہ سے دیکھ رہے تھے۔ کیا اس زاویہ سے دیکھنے کے نتیجے میں ادب، عوام کی خدمت کرنے والا ادب بن سکا تھا۔ یا اس میں ابھی ایسی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں تھیں جنہیں دور کرنے کے لئے ادبی جد وجہد جاری تھی۔

موجودہ دور میں جبکہ ادب اور فن صرف قومی حدود کا احاطہ کرنے والی چیز نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی مسائل کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے کندھوں پر اٹھالی ہے اس صورت میں ان مجموعوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اور مرتبین کو انتخاب کرتے وقت نہایت چوکسی اور گہرائی سے کام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ آج بین الاقوامیت کے سماجی اور ادبی مسائل ایک شدید ترین تصادم کی زد پر ہیں۔ اس لئے قومی معاملوں پر بھی اس تصادم کا اثر لازماً پڑتا ہے۔

زیر نظر انتخابی مجموعہ میں پانچ مقالے، سترہ نظمیں، بارہ غزلیں اور گیارہ کہانیاں اور خاکے ہیں اور یہ ہر قابل اطمینان ہے کہ ان میں سے قریب قریب سبھی تخلیقیں کسی نہ کسی سماجی اور ادبی مسئلے کو صحت مند نقطۂ نگاہ سے پیش کرتی ہیں اور پوری کتاب کا مجموعی تاثر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اردو کا ترقی پسند ادب سال گذشتہ میں اپنی رہنما اور نمائندہ پوزیشن کے ساتھ آگے بڑھا ہے۔ خاص طور پر کہانیوں کے حصہ میں یہ نمائندگی بھرپور دکھائی دیتی ہے اس حصہ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادیبوں نے سال گذشتہ کے اہم عوامی مسئلوں کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس سال میں عوام کے سامنے جو سب سے بڑا سوال آیا وہ آزادی کا تھا اور جیوں کی یہ تخلیقیں ظاہر کرتی ہیں کہ عوامی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی بات تک میں بھی آزادی ایک نام نہاد ڈھونگ کی شکل میں جھلکتی رہی، عوام کی امیدیں ٹوٹیں، انھوں نے اس آزادی کے سائے میں ظلم وستم سہے، ان کے خلاف احتجاج کیا، ان کے مقابلے کیلئے منظم ہوئے اور عوام کا ایک بہت بڑا حصہ بھی جمہوری آزادی کے لئے سینہ سپر بھی ہو گیا۔

مقالوں میں سب سے اہم مضمون "صورت ومعنی کے رشتہ" پر ممتاز حسین نے لکھا ہے۔ یہ ادبی مسئلہ گذشتہ کئی سالوں سے ہمارے لئے زیر بحث رہا ہے ممتاز حسین نے اس مسئلہ کو اور بھی نکھارا اور نکھارا ہے علیم اور تخلیقی فن پیدا کرنے کے لئے اس مسئلے کی وضاحت اور صحت کی جتنی ضرورت آج ہمارے ادیبوں کو ہے، اتنی شاید پچھلے کسی دور میں نہیں تھی۔ ممتاز حسین نے اس ضرورت میں بہت بڑا ہاتھ بٹایا ہے ——— مقالوں میں دو چیزوں کی کمی کھٹکتی ہے یعنی نہ تو حالگیر امن تحریک پر کوئی تنقیدی مضمون شامل ہے اور نہ ادیبوں کے شعور محاذ کے بارے میں حالانکہ یہ دونوں مسئلے آج ہماری قومی آزادی کی عوامی تحریک میں بڑے بنیادی مسئلے ہیں معلوم ہوتا ہے ۱۹۵۰ء میں ہمارے ادیبوں نے ان دونوں کی تاریخی اہمیت کا سنجیدگی سے احساس نہیں کیا۔ ورنہ زیر نظر مجموعہ ان سے خالی نہ رہتا۔

البتہ نظم کے حصے میں خاص طور پر امن تحریک کی نمائندگی پیش پیش دکھائی دیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شعراء کے ذہنوں کو امن کے شدید جذبے نے چھین لیا تھا اور انھوں نے اس موضوع کو زیادہ سے زیادہ جذباتی ہم آہنگی عطا کی۔ کہانیوں میں یہ جھلک صرف سنوکہ سنگھ دھیر کی کہانی میں ملتی ہے۔

ہیئتی تجربوں کے اعتبار سے یہ مجموعہ ظاہر کرتا ہے کہ ہمارے ادیبوں کی تجرباتی کوششوں میں کامیابی کم ہے ادبی اور عوامی حلقوں میں سے بار بار یہ تقاضا ابھرتا رہا ہے کہ عوام کے اور قریب پہنچنے کیلئے اور اس رقبہ کو اور وسیع کرنے کے لئے ہمارے ادیبوں کو ہیئتی تجربوں میں ایک انقلابی تبدیلی پر دھیان دینا چاہیئے ہیئت کی کلاسیکل

روایات، موضوع کے نئے پن اور نئی روایتوں کو پیش کرنے کے ڈھنگ میں ایک ایسا انقلابی تال میل ہونا چاہیے جس کے توسط سے ہم زیادہ سے زیادہ عوام تک اپنی ترقی پسندانہ آواز پہنچا سکیں۔ خاص طور پر فن اور پراپیگنڈہ کا جو الزام مخالف حلقوں کی طرف سے لگایا جاتا ہے اور اب بھی لگایا جاتا ہے اس کا عملی طور سے جواب دیا جا سکے۔ مرتبین نے کہا ہے کہ یہ جواب اس مجموعہ کی تخلیقوں میں موجود ہے مگر میرا خیال ہے کہ اس جواب کو ابھی اور ٹھوس اور گمبھیر بنانے کی ضرورت ہے۔

کہا جا سکتا ہے، کہ کیا ہم اس مجموعے کو اس حد تک نمائندہ حیثیت دے سکتے ہیں کہ "بہترین ادب" کہلانے والی کوئی تخلیق اس مجموعے کے صفحات سے باہر نہ ہو گئی ہو، یا یہ کہ جس قدر بھی چیزیں شامل کی گئی ہیں وہ بہترین ہی ہیں ——— ؟ مرتبین نے اعتراف کیا ہے کہ ایسا دعویٰ بہت مشکل ہے۔ لیکن جیسا کہ مرتبین نے خود بھی کہا ہے کہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ بہترین چیزوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ مرتبین کا یہ اعتراف صحیح ہے، مقالوں، نظموں اور کہانیوں یعنی ہر حصے میں مزید بہترین تخلیقات کے شامل کرنے کے امکانات بھی موجود تھے۔ اور جو چیزیں شامل کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کو "بہترین" کہا بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ سال بھر کے ادبی رجحانات اور رفتار کا کوئی نمائندہ معیار بنایا جا سکے اس کے لئے یہ مجموعہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

ماہنامہ "پائل" دہلی اس نام کا ایک ادبی ماہنامہ دہلی سے چند ادیبوں نے مل کر نکالا ہے۔ ترتیب دینے والوں میں چار نام نظر آتے ہیں۔ جاوید، وشسٹ، عشرت کرت پوری، اختر آزری، اور ظفر ہاشمی ———۔

اردو رسائل کے اس امید شکن قحط کے زمانے میں "پائل" کا اجرا ہمارے حوصلے بڑھا دیتا ہے۔ یہ حوصلہ اور بھی بڑھ جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ پرچہ کا مجموعی رجحان صحت مند ہے اور ہندوستان و پاکستان کے عوام اپنی سچی جمہوری زندگی کے حقوق حاصل کرنے کے لئے جن طاقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں اور جس طریقہ پر کر رہے ہیں۔ یہ پرچہ ان کی نمائندگی کرنے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہے۔

پہلے دو شماروں میں جس قدر مواد پیش کیا گیا ہے اُسے معیاری اور تسلی بخش تو نہیں کہا جا سکتا۔ چند ایک مطبوعہ چیزیں بھی کھٹکتی ہیں لیکن ادارہ اچھی چیزوں کے حصول اور تعاون کے لئے اپنی پوری جد و جہد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ادیب اس پرچے کی بھرپور امداد کریں۔

اس پرچہ میں ایک مستقل فلمی حصہ بھی شامل کیا گیا ہے یہ حصہ جہاں ضروری ہے وہاں اسے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور معیاری بنانے پر بھی توجہ دینا لازمی ہے۔

۵۶ صفحات کی قیمت آٹھ آنے نہایت مناسب قیمت ہے ——— ملنے کا پتہ۔ ۱۳۴۰ - فراش خانہ دہلی۔

بغیر ہتھیار کے ۔۔ مانگتے ہیں روٹی، دیتے ہیں گولیاں

نیک ہمسوں کو سوت بھی سخت نہیں کر سکی۔

ہم ان سب کو بے نقاب کریں گے جنھوں نے ہمارے ملک کی پوری تخلیق کو اُجاڑنے کے لئے برسوں سے کئی طرح کے "ٹڈی دل" پال رکھے ہیں۔ ہم سب مل کر ان قاتل ہاتھوں پر تمہارے خون کو اجاگر کریں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی انھیں معاف نہیں کرے گا۔ اب کوئی بھی انھیں بنگلوں میں گیہوں بو کر تصویروں کے ذریعے بھوک دور کرنے کے ڈھونگ نہیں رچانے دے گا۔ ہم تمہارے چوتھے پر انہیں امریکی سفیر کے ساتھ چائے پینے نہیں جانے دیں گے۔ اب وہ گیہوں کے دلاسوں اور پُرغرور دھمکیوں کے عوض سارے ملک کی آن کو کسی کے پاس گروی نہیں رکھ سکیں گے۔ اب وہ کوریا کے ہتیاروں کو ہمارے ملک کی کانوں میں سے ایٹم بم بنانے والی دھاتیں بھی نہ دے سکیں گے ———"

سریش، کبیتا اور بندنا ستیش، باول اور دھابیر! کوچ بہار کی سڑکوں پر بہائے گئے تمہارے خون کو لاکھوں کروڑوں انسانوں کی آمد و رفت بھی نہ مٹا سکے گی۔ اور جب تک تمہارے خون میں سے بھرے پورے آزادی اور امن کے پھول نہیں اُگ آتے تب تک ہم تمہاری یاد کو ایک مستقل پہرے دار کی طرح ہر جگہ لاکر کھڑا کر دیا کریں گے۔

(مترجمہ ۔ پرکاش مینڈت)

حکومتِ ہند سے امن کنونشن کا مطالبہ

کل ہند امن کنونشن نے اپنے سالانہ اجلاس میں متعدد قرار دادیں منظور کیں۔ نیچے بعض اہم قرار دادوں کا متن شائع کیا جا رہا ہے جس سے ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے، جو اس تحریک کے بارے میں پیدا کی گئی تھیں

۱۔ ایک قرار داد میں، امن تحریک کے متعلق حکومت ہند کی اختیار کردہ حکمت عملی کی مذمت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ تحریک ایک غیر جماعتی تحریک ہے جو لوگوں میں عالمی امن کی سچی خواہش پیدا کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے۔ اس کے باوجود ہندوستان کے بعض حصوں میں اس تحریک کے علمبرداروں پر نت نئی پابندیاں لگائی جا رہی ہیں اور مختلف طریقوں سے انہیں ستایا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں دوسری امن کانگرس کے دہلی میں انعقاد اور دوسرے ملکوں کے نمائندوں کی شرکت پر امتناع عاید کر کے حکومت ہند نے ساری دنیا کے امن پسندوں کو مایوس کیا ہے۔

دوسری طرف بعض اجنبیوں کو ہندوستان میں داخل ہونے اور ہندوستان کے عوام کی مرضی کے خلاف کھلے بندوں جنگ بازوں کا پروپیگنڈا کرنے کی اجازت دی گئی۔ حالات کے اس پس منظر میں امن کی تحریک کے لئے میں حکومت ہند کی اختیار کردہ حکمت عملی اور بھی کھٹکنے لگی ہے اس سے پہلے بھی حکومت ہند نے وارسا پیس کانگرس میں شریک ہونے کے آرزومند متعدد ہندوستانی مندوبین کو پاسپورٹ نہیں دیئے تھے۔ بعض صوبوں میں امن کے جلسوں پر پابندی لگائی جا چکی ہے اور اس تحریک کے علمبرداروں اور کارکنوں کو گرفتار بھی کیا جا رہا ہے۔ سرکاری ملازمین کو اس تحریک سے الگ رہنے کی ہدایتیں دی گئی ہیں ان ساری باتوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امن کے بارے میں حکومت ہند نے اپنی جس حکمت عملی کا اعلان کیا تھا ارباب مقتدر خود اسی کی مخالفت کر رہے ہیں۔

بنا بریں امن کنونشن، مرکزی سرکار، اور صوبائی سرکاروں سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ امن تحریک کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار نہ کریں اور امن تحریک کے کارکنوں کو امن کے پرچار کی پوری پوری آزادی دیں۔

۲۔ آل انڈیا پیس کنونشن عالمی جنگ کے بڑھتے ہوئے امکانات پر گہری تشویش کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کنونشن کی رائے میں ہندوستانی عوام عالمی امن کی بحالی کے سلسلے میں اہم حصہ لے سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کے حالات میں وہ ایک کافی اہم موقف کے حامل بن گئے ہیں۔ امن پسندی ان کی تہذیبی روایتوں کا اہم جزو ہے اسی لئے وہ جنگ کو روکنے اور ٹالنے کی کوششوں میں خیر سگالی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے ہیں ہندوستانی عوام کا یقین کہ جنگ ناگزیر نہیں ان کی اس رائے میں اگر دنیا کے امن پسند عوام متحد ہو کر امن کی بحالی کا عزم کر لیں، تو جنگ باز اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان ساری باتوں کے پیش نظر ہندوستان کے امن پسندوں کا یہ کنونشن بڑی طاقتوں کے مابین سمجھوتے کی اپیل پر عوام کے دستخط حاصل کرنے کی مہم کی پوری پوری تائید کرتا ہے اور عالمی امن کونسل کی اس تجویز کو کہ ان کے جہاد کا ایک لازمی حصہ قرار دیتا ہے۔ یہ کنونشن ہندوستان کے وزیر اعظم اور حکومت ہند سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس پیش کی عمل آوری میں دلچسپی لیں اور پانچ بڑی طاقتوں یعنی امریکہ، سوویت یونین، عوامی چین، برطانیہ اور فرانس کے نمائندوں کی ایک کانفرنس دہلی میں بلانے کا انتظام کریں جو ان طاقتوں کے مابین سمجھوتہ امن کی تکمیل کے مسئلے پر غور کریں گے۔ کنونشن وزیر اعظم ہند اور حکومت ہند پر اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہے کہ اس مطالبہ کو عالمی دنیا کے عوام کی تائید حاصل ہے۔ کنونشن ہندوستانی عوام سے بھی اپیل کرتا ہے کہ وہ اس تجویز کی اہمیت کے بھرپور احساس کے ساتھ عالمی امن کونسل کی اپیل پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دستخط لیں۔

۳۔ امن کنونشن بھارت پارلیمان سے ایسے قوانین کی منظوری کا مطالبہ کرتا ہے جس کے ذریعے جنگ کا پروپیگنڈا ایک تعزیری جرم قرار دیا جائے اس کے ساتھ ساتھ وہ بھارت پارلیمان سے اس امر کی ضمانت چاہتا ہے کہ امن تحریک کو پھلنے پھولنے کے تمام مواقع دیئے جائیں گے۔

۴۔ امن کنونشن بھارت پارلیمان سے اس امر کا عہد لینا چاہتا ہے کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے اختلافی مسائل کو دوستانہ انداز میں حل کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گی اور بہت جلد حکومت پاکستان کے ساتھ امن کا معاہدہ کرے گی۔ اسے اس بات کا اعلان کرنا چاہیئے کہ کشمیر کے اختلافی مسئلے کو وہ کسی صورت میں بھی سامراجی ریشہ دوانیوں کا ذریعہ نہ بننے دے گی

گرمی بلاشبہ شدید ہے
لیکن.....

روح افزا

ٹھنڈا اور تسکین دہ ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

{مشہور طبی دوماہی رسالہ "ہمدرد صحت" کا نمونہ مفت طلب فرمائیں}

Hamdard PRODUCT

کامنی ہیر آئل

کامنی ہیر آئل بالوں کو بڑھاتا ہے۔ پیچ و خم دیتا ہوا خوب خوش نما بناتا ہے۔ بالوں کو گرنے نہیں دیتا جڑوں کو مضبوط، بالوں کو نرم اور چمکدار بناتا ہے گنجے پن دُور کرتا ہے اور نئے بال پیدا کرتا ہے۔ اس کے قدرتی اجزا۔ بالوں کو سیاہ بنائے رکھتے ہیں سفید بالوں کو رفتہ رفتہ سیاہ کر دیتا ہے۔ بیحد مقوی دماغ ہے نزلہ ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ پیکنگ اور خوبصورتی میں ولایتی تیلوں کا مقابلہ ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو میں کبھی بیلا، کبھی نرگس، کبھی رات کی رانی کی مہک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی معلوم ہوتی ہے۔ پاس سے گذرنے والا خوشبو سے مسحور ہو کر گھوم کر دیکھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ گویا باغ کے تمام مشہور اور دل پسند پھولوں کا ایک نادر و نایاب مجموعہ ہے جو "کامنی ھیر آئل" میں آپ کو ملے گا

قیمت فی شیشی عہ ر (ایک روپیہ آٹھ آنہ)۔ دو شیشیاں یا اس سے زیادہ منگانے پر محصول ڈاک میں کفایت رہیگی تھوک کا کام کرنیوالے حضرات ایجنسی کا معاملہ خط و کتابت سے طے کریں

بھارت آئرنل کمپنی نئی سڑک دہلی

اچھا ادیب پہلے انسان ہوتا ہے بعد میں کچھ اور۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا ذہن مسموم ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تلجو (سامی) کا ذہن مسموم نہیں ہے بچے بچے طوفانوں اور حادثوں نے انکی انسانیت دوستی کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

(احتشام حسین)

تقسیم ہند کے طوفانوں اور حادثوں کی داستان

جب بندھن ٹوٹے

جسے تاجور سامری نے اپنے آتشیں قلم سے لکھا

قیمت صرف تین روپے (۳/۰/۰)

مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا اور قاضی عبدالغفار خاں کی کتاب لیلیٰ کے خطوط اُردو میں لازوال شہرت رکھتے ہیں اور اب جناب اس اختر نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے

انسو

غنڈوں کے چنگل سے چھڑائی ہوئی ایک لڑکی کی داستانِ غم، سچائی اور افسانے کا دلچسپ امتزاج۔ اس ناول کے بیشتر نام و مقام حقیقی ہیں۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ

مصنف کی دو سری کتابیں

آگ قیمت ۱/۱۲ ۔ پردہ فروش ۱/۱۲

زندگی کا یہ قوی اور جری احساس سازِ لرزاں نہیں بلکہ ایک مضبوط آہنگ کا پتہ دیتا ہے۔ اُردو کی ترقی پسند شاعری نے تاباں سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ (کرشن چندر)

سازِ لرزاں

غلام ربانی تاباں کا مجموعۂ کلام

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے

تاریخ زبانِ اُردو

ڈاکٹر مسعود حسین استاد شعبہ اردو علی گڈھ یونیورسٹی کی معرکۃ الآرا علمی پیش کش۔ جو نہ صرف تاریخ زبان اُردو پر پہلی مستقل تصنیف ہے بلکہ اس میں اُردو زبان کے ماخذ اور اس کی ابتدا سے متعلق نظریات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے: "میری رائے میں یہ علم اللسان میں ایک اضافہ ہے" (ڈاکٹر سید سلیمان ندوی)۔ "اردو زبان کی تاریخ پر یہ پہلی مستقل تصنیف ہے" (عبدالقادر سروری)۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

پریم چند

پریم چند ہندی اور اردو ادب کے سب سے بڑے سامراج شکن ادیب تھے انھوں نے ہندوستان کے عوام کو نوآبادیاتی نظام سے نفرت کرنا اور اسے ہٹانے کے لئے جدوجہد کرنا سکھایا۔ ہنس راج دھنبر نے بڑی محنت سے ان پر یہ کتاب لکھی جو ہندی اُردو کے ادیبوں اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو پریم چند کی ہر دلعزیز کہانیوں اور ناولوں کا صحیح مقام تعین کرنے میں مدد دے گی۔ (ڈاکٹر رام بلاس شرما)

قیمت تین روپے بارہ آنے

کہسیابی	بھگت رام	۲/۰
جب کشمیر جل رہا تھا	کشمیری لال ذاکر	۲/۰
بیکراں	جگن ناتھ آزاد	۲/۸
شیرول اور ونا		۱/۸
شام اودھ	محمد احسن فاروقی	۵/۰
سوتیا جاہ	شوکت تھانوی	۲/۸
سرگزشت غالب	میرزا محمد بشیر	۱۲/۰-
مکمل شرح غالب	مولوی عبدالباری آسی	۳/۸
آتش خاموش	احسان دانش	۲/۰
خدو خال	فکر تونسوی	۳/۸

۱۹۴۹ء کا

بہترین ادب

۱۹۴۹ء ایک طوفان کا اختتامیہ تھا اور دوسرے طوفان کا دیباچہ اور اس اختتامیہ اور دیباچہ کے واضح خدوخال آپکے ۱۹۴۹ء کا بہترین ادب میں ملیں گے۔ ۱۹۴۹ء کا بہترین ادب ایک معرکۃ الآرا انتخاب ہی نہیں۔ ادب کے نئے موڑ کی مستند تاریخ ہے۔ قیمت چار روپے (للعہ)

میری بھابی

"میری بھابی" ایک ایسا رومانی اور سماجی ناول ہے جسے پڑھنے میں آپ بسا اوقات فرطِ مسرت سے جھوم اٹھیں گے اور بسا اوقات آپکی آنکھوں سے ازخود آنسو نکل آئیں گے مسرت اور آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے ایک ایک لفظ کو پروفیسر مجھ جلیل نے اس چابکدستی سے ایک لڑی میں پرویا ہے کہ آپ ان کے فن کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے۔ دو سو آٹھ صفحات کے اس ناول کی قیمت صرف دو روپے آٹھ آنہ

مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری

دغا کا پتلہ ۳/۰ ۔ ڈاکٹر گولا ۴/۰ ۔ خوفناک جزیرہ ۳/۸ ۔ ناذک کٹار ۴/۰ ۔ دیمان محل ۳/۸ ۔ اسیر یا ۳/۰

سانپ کی چوری ۳/۸ ۔ کرنی کا پھل ۴/۰ ۔ کالی نقاب ۳/۸ ۔ مقدس جوتا ۳/۰ ۔ لعل شب چراغ ۳/۸

مکتبہ شاہراہ دہلی ۶

سماج کا ارتقاء

(از کلیم اللہ)

انسان کس طرح پیدا ہوا۔ اپنے ابتدائی دور میں وہ غذا کس طرح حاصل کرتا تھا۔ شادی بیاہ اور رہائش کا کیا طریقہ تھا۔ وہ حیوان سے انسان کس طرح بنا۔ فنون لطیفہ اور ادب کو کس طرح ترقی دی۔ مذہب اور ریاست اور دوسرے سماجی ادارے کس طرح وجود میں آئے اور انھوں نے ترقی کی مختلف منزلیں کس طرح طے کیں۔ ان سب کا تفصیلی جواب اس کتاب میں ملیگا

پوری کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں عہد وحشت، عہد بربریت اور عہد جاگیرداری کی معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں سرمایہ داری یا اشتراکی نظاموں اور ان کے متعلق مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن پھینے کے چھ مہینے کے اندر ختم ہو گیا۔

حصہ اول کی قیمت ایک روپیہ ہے اور حصہ دوم کی قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

ملنے کا پتہ:- پیپلز پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ ۱۹۰ کھیت واڑی مین روڈ۔ بمبئی ۴

برانچ

دہلی بک سینٹر ۲۶۹ اردن روڈ۔ نئی دہلی

ہندوستان اور پاکستان کی ہر کتاب — نئی اور پرانی

آپ مکتبہ شاہراہ سے طلب فرما سکتے ہیں

متفرق

اردو ہندی ہندوستانی	سید سجاد ظہیر	۱/-	الجھے تار	مس رضیہ نزہت	۱/۸
ماؤسے تنگ	فکر تونسوی	۶۹/-	ماوا	فرقت بی اے	۴/-
نیا ہندوستان	رجنی پام دت	۴/-	شہاب کی سرگزشت	نیاز فتحپوری	۲/۸
انسانیت موت کے دہانے پر		۳/-	ناروا	غلام احمد فرقت	۲/-
سرمایہ		۱/۸	سمن زار	شاکر اورنگ آبادی	۲/-
نقد حیات	ممتاز حسین	۲/۸	دام خیال	ضیا الاسلام	۲/-
امریکی سفارت خانے	اینا بیلے بوکر	۷/۸	ریزہ وینا	شاہد احمد	۵/-
ادب اور سماج	احتشام حسین	۲/۱۲	بربط	جی الیس عالم	۲/-
قفس	اپندر ناتھ اشک	۲/-	ساز نو	مجاز	۲/۸
ضدی	عصمت چغتائی	۲/-	مائی ڈارلنگ ہوٹل	مہندر ناتھ	۲/۱۲
خاتم	عظیم بیگ چغتائی	۴/-	ہندوستان میں ابھی راج	پنڈت سندر لال مون	۳/-
جانے	شمشیر سنگھ نرولا	۲/-	سقراط	مخدوم محمد اجمل	۱/۸
اکیلا	تاجور سامری	۲/-	موت کا جشن	محمود ہاشمی	۱/۸
انقلابی شرارے	چمیل داس	۲/۸	ہندوستان کا مستقبل	پنڈت سندر لال مون	۱/۸
چنگاریاں	"	۱/۸	بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	۲/۸
نظر بند	"	۱/۸	بھرے بازار میں	حیات اللہ انصاری	۳/-
ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	۲/۸	بیت المقدس	منشی عبد القدیر	۵/-
کھوکھلے انبار	۱۰، م راجندر	۲/-	کیا خوب دی تھا	انتخاب	۱/۸

بادباں	کمال احمد صدیقی	۱/۸	
صنیعہ میوسلطان مکمل	محمود بنگلوری	۸/-	
عورت کا گناہ	فارغ بخاری	۲/-	
پلکوں میں آنسو	صدیقہ بیگم	۳/-	
ہچکیاں	"	۲/۱۲	
زاس میں آس	صالحہ عابد حسین	۲/۱۲	
گونگے معمار	خورشید حیات انیز	۱/-	
آغوش	منظر سلیم	۲/۸	
تاریخ جرم و سزا	امداد صابری	۳۲/-	
عورت مرد اور دنیا	خلیق ابراہیم	۱/۴	
پھولوں کی ڈالی	مجنوں گورکھپوری	۳/-	
تاریخ جمالیات	"	۲/-	
انتخاب حالی	سفارش حسین	۲/۴	
فانی	پروفیسر عبد الشکور	۲/-	
امن کا راستہ (فسادات کا پوسٹمارٹم)		۳/-	
پردۂ غفلت	سید عابد حسین	۱/-	
نقش آخر	اشتیاق حسین قریشی	۱/-	
قاتل کی بیٹی (مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری)		۴/-	

مکتبہ شاہراہ ۰ دہلی

یہ منتخب کتابیں

مادام بواری

۱۸۵۷ء میں ادھر غدر کا زمانہ تھا ادھر مادام بواری شائع ہوئی اور ادب میں ایک غدر سا مچ گیا۔ اس کے مصنف گستاؤ فلابیر کو نام نہاد طہارت پسند طبقہ نے ملعون و مطعون قرار دیا۔ مذہب اور اخلاق کے نام پر اس کو عدالت میں گھسیٹا گیا لیکن بالآخر فرانس کے اس عظیم ناول نگار کی عظمت کو تسلیم کر لیا گیا۔

مادام بواری کو کلاسیکی ناولوں میں بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

مترجمہ محمد حسن عسکری — قیمت پانچ روپے

نئے زاویے

(جلد دوم)

مرتبہ ——— کرشن چندر

اس مجموعہ کی ترتیب میں جدید مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مختلف اہل قلم نے حصہ لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اردو کے بہترین اذہان کی بہترین پیداوار ہے۔ مضامین، افسانوں، ڈراموں، نظموں، غزلوں اور گیتوں کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت چھ روپے۔

کامیابی

یہ ایک ایسی کتاب ہے جو آپکو زندگی کے ہر شعبے میں کامیاب ہونے میں مدد دیگی۔ مصنف نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اس کتاب میں سمو دیا ہے۔ بڑا سائز کپڑے کی جلد۔ قیمت تین روپے

صنعت میں دولت

اس کتاب میں ایسے ایسے نسخے اور تجارتی فارمولے درج کئے گئے ہیں جو سو فیصدی کامیاب ہوئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اشتہار کو مارکیٹ میں لانے انکے پیکنگ اور اشتہار بازی کے ایسے اہم راز بیان کئے گئے ہیں جنھیں جان کر یقینی طور پر آپ مارکیٹ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ قیمت فی جلد پانچ روپے۔

ماں

'ماں' گورکی کا شاہکار ہے۔ اس کے متعلق سوویت روس کے بانی لینن نے کہا تھا "یہ کتاب وقت ہے"۔

'ماں' اس زمانے کی داستان ہے جب جنگِ آزادی کی تڑپ روس کے ہر نوجوان کے قلب کو گرمائے ہوئے تھی۔ اس خونچکاں کہانی میں ملتِ احمر کے اس نابغہ نازِ مفکر گورکی نے اس جدوجہد کو اس کامیابی سے پیش کیا ہے کہ عام واقعات آنکھوں کے سامنے رقص کرتے نظر آتے ہیں۔

جس کا سلیس و رفتہ ترجمہ مخمور جالندھری نے کیا ہے قیمت سات روپے

آخری سلام

کرسٹفر اشروڈ پچھلے بیس سال کا سب سے نمایاں ناول نگار ہے اور یہ اسکی بہترین تصنیف ہے۔ اشروڈ کی ساری انسانی ہمدردی، طنز، تمسخر، انسانیت، ترحم، افسردگی، انسان کے متعلق غم آمیز تفکر سب اس کتاب میں کھنچ آیا ہے۔ اس کے کردار مضحکہ خیز بھی ہیں اور المناک بھی۔

'آخری سلام' کا انگریز مصنف اس دور کے افسانہ نگاروں میں بہت مقتدر حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے بیس برس میں شاید ہی کوئی افسانوی کتاب شائع ہوئی ہو جو حقائق نگاری میں آخری سلام پر فوقیت رکھتی ہو۔

مترجمہ: محمد حسن عسکری — ساڑھے چار روپے

شامِ اودھ

اردو میں ناولوں کی بہت کمی ہے اور ہر اعتبار سے کامیاب ناولوں کا تو قریب قریب فقدان ہی ہے۔ محمد احسن فاروقی اردو میں ناولوں کی کمی کا اعتراف کرتے ہیں لیکن فقدان کے قائل نہیں ہیں اور اس کے ثبوت کے طور پر اپنا نام "شامِ اودھ" پیش کرتے ہیں شام اس مرتے ہوئے طبقے کی حقیقی عکاسی پیش کرتا ہے۔ جو صدیوں تک ہماری روح کا عذاب بنا رہا۔ قیمت پانچ روپے

مکمل شرح کلام غالب

مرزا غالب کے دیوان کی کئی شرح ہو چکی ہیں لیکن مولوی عبدالباری صاحب آسی الدنی کی یہ شرح اپنی طرز کی واحد شرح ہے اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مرزا کے تمام مطبوعہ کلام کی شرح موجود ہے۔ طالبعلموں کے لئے یہ کتاب خاص طور سے مفید ہے قیمت ۳/۸

مکتبۂ شاہراہ دہلی

جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی ہے لیکن وہ اس میراث پر قانع نہیں رہے انھوں نے خود اپنی کاوش سے شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے اور اس میں اپنے خون جگر کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی کی بہترین روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں۔

(سردار جعفری)

بیکراں

کے بعد

جگن ناتھ آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام

ستاروں سے ذروں تک

قیمت دو روپیہ بارہ آنے

مکتبہ شاہراہ - دہلی

سرخ آنچل

مرتبہ پرکاش پنڈت

بارہ ممتاز افسانہ نگار خواتین —

عصمت چغتائی — قرۃ العین حیدر

رشید جہاں — ممتاز شیریں

ہاجرہ مسرور — کوشلیا اشک

خدیجہ مستور — شکیلہ اختر

سرلا دیوی — نسیم سلیم چغتائی

صدیقہ بیگم — ناہید عالم

کے منتخب افسانوں کا مجموعہ جس میں ان کی تصاویر بھی شامل ہیں اور حالات زندگی بھی۔ جنت مجلد 3/12

مکتبہ شاہراہ دہلی

۱۹۵۰ کے خاتمہ کے ساتھ تاریخی ارتقا میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا

اور اسی کے ساتھ

اُردو ادب میں بھی ایک اور تاریخی دستاویز کا اضافہ ہوا

۱۹۵۰ء کا بہترین ادب

مُرتبہ

سردار جعفری — پرکاش پنڈت

قیمت 7/8

مکتبہ شاہراہ - دہلی

انہیں — دلفریب غازے کھانے کو

دلکش جھونپڑیاں رہنے کو

دلنواز چیتھڑے پہننے کو — ملتے ہیں

اور فکر تونسوی نے ان آزاد غلاموں کی داستانیں لکھیں

ساتواں شاستر

فکر تونسوی کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ

وہ زہر — جو مسکراہٹ، تبسم اور قہقہے کے روپ میں نکلا ہے۔ قیمت 2/12

مکتبہ شاہراہ - دہلی

مکتبہ شاہراہ دہلی

انقوش قزلباش

سجاد ظہیر

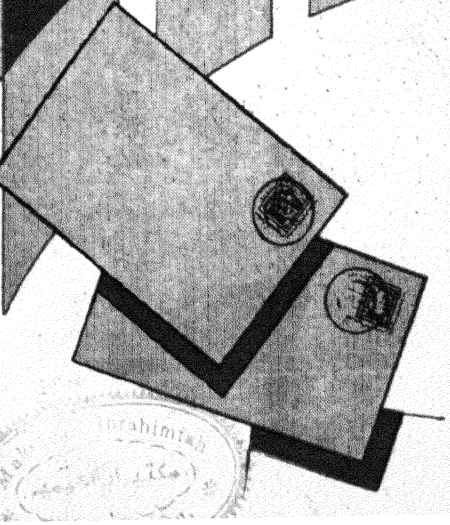

سجاد ظہیر

مکتبۂ شاہراہ دہلی

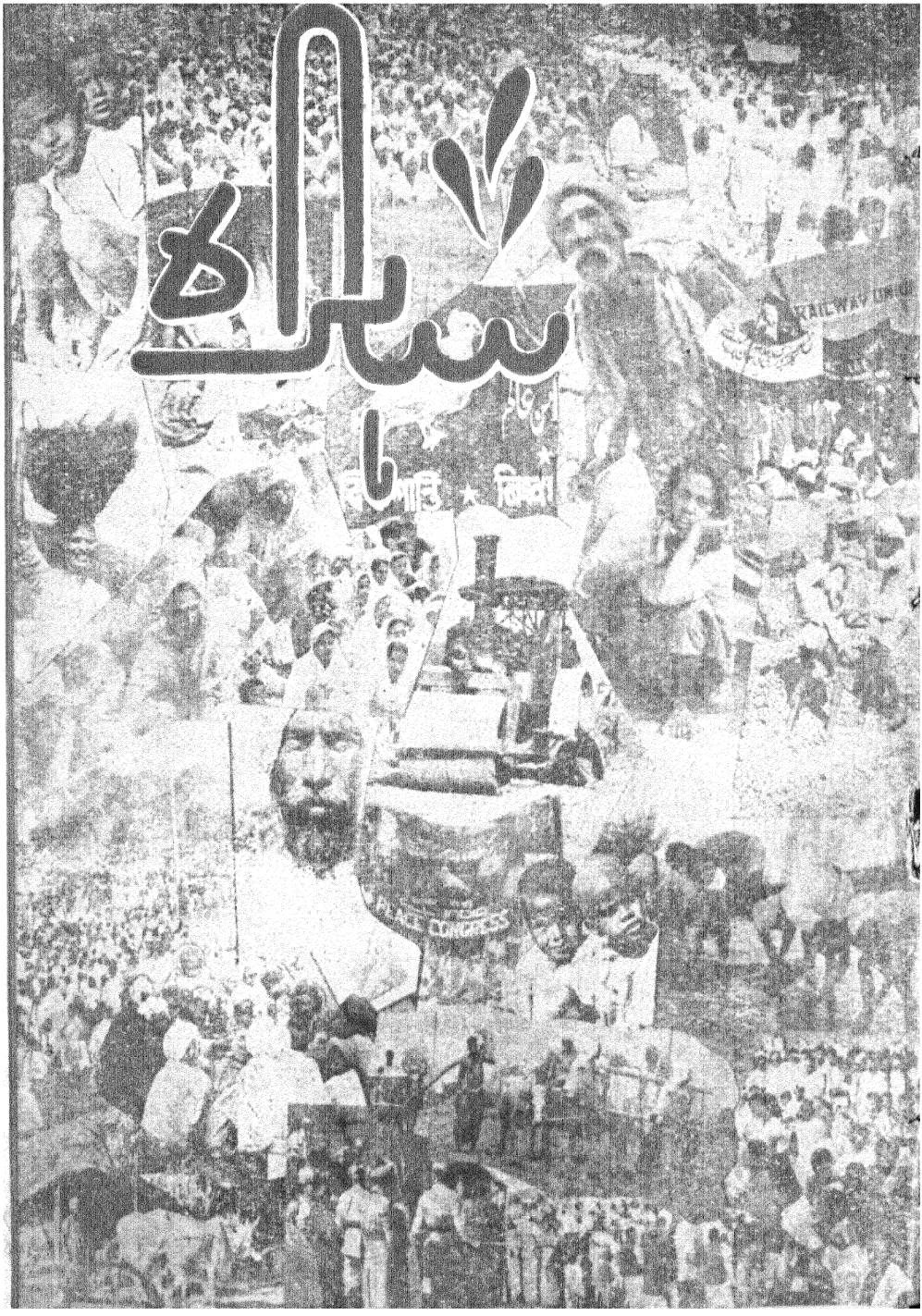
RAILWAY UNION
PEACE CONGRESS

آپکے محبوب فن‌کاروں کی کتابیں - - - - - افسانہ - ناول - نظم

طلسم خیال	کرشن چندر	دو روپے	
کشمیر کی کہانیاں	،،	تین روپے	
ٹوٹے ہوئے تارے	،،	دو روپے	
زندگی کے موڑ پر	،،	دو روپے	
ہوائی قلعے	،،	دوروپے چار آنے	
تین غنڈے	،،	دو روپے آٹھ آنے	
سمندر دور ہے	،،	دو روپے بارہ آنے	
شکست	،،	تین روپے	
نئے زاویے جلددوم	،،	چھ روپے	
ایک گرجا ایک خندق	،،	تین‌روپے آٹھ آنے	
صبح ہوتی ہے	،،	دو روپے چار آنے	
میں کون ہوں	خواجہ‌احمد عباس	تین‌روپے	
سنگ و خشت	کنہیا لال کپور	دوروپے	
نوک نشتر	،،	دوروپے آٹھ آنے	
شیشہ و تیشہ	،،	دو روپے	
چنگ و رباب	،،	دو روپے آٹھ آنے	
مادام بوری	فلابیئر	چھ روپے	
نارو بود	بلونت سنگھ	تین روپے	
سنہرا دیس	،،	چار روپے	
آخری سلام	کرسٹفر اشروڈ	چار روپے آٹھ آنے	
ایسی بلندی ایسی پستی	عزیز احمد	چار روپے	
گریز	،،	چار روپے آٹھ آنے	
رقص ناتمام	،،	تین روپے آٹھ آنے	
ماں	میکسم گورکی	سات‌روپے	
قلی	ملک راج آنند	چھ روپے آٹھ آنے	
ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ	آر۔ ایل۔ سٹیونسن	ایک روپے	
سیب کا درخت	کازورومی	ایک روپیہ	
چند	سعادت حسن منٹو	تین‌روپے چار آنے	
کلنک	سرلا دیوی	دو روپے بارہ آنے	
دھانی بانکیں	عصمت چغتائی	ایک روپیہ	
چوٹیں	،،	تین روپے	
کلیاں	،،	تین روپے آٹھ آنے	
امن کا ستارہ	سردار جعفری	ایک‌روپیہ‌چار‌آنے	
خون کی لکیر	،،	تین روپے آٹھ آنے	
نئی دنیا کو سلام	،،	تین روپے	
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	تین روپے آٹھ آنے	
تلاطم	مخمور جالندھری	دوروپے آٹھ آنے	
گنجینہ	یگانہ	تین روپے آٹھ آنے	
ساز ارزاں	غلام ربانی تاباں	دو روپے آٹھ آنے	
دستک	نریش کمار شاد	دو روپے	
جنون و حکمت	جوش‌ملیح آبادی	ایک روپیہ	
فکر و نشاط	،،	دو روپے آٹھ آنے	
روح ادب	،،	دو روپے	
نقش و نگار	،،	تین‌روپے آٹھ آنے	
فرش و فروش	،،	چار روپے	
حسین اور انقلاب	،،	ایک روپیہ	

مکتبہ شاہراہ - اردو بازار - دہلی

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

سالانہ نو روپے
ششماہی پانچ روپے

اگست
۱۹۵۱ء
قیمت بارہ آنے

مکتبہ شاہراہ ○ دہلی ۶

فنون

راہ نما

مقالے

انداز بیان کے بارے میں — محمد حسن، ۳

حشیش پنا عری عہد ماضی — ہنس راج رہبر، ۱۰

نظمیں

امرکی بنجارہ نامہ — فراق گورکھپوری، ۱۹

تاجروں کے دیس میں — قتیل شفائی، ۲۴

امن — حسن اعرابی، ۲۶

اشتہار — جگن ناتھ آزاد، ۲۸

میں شاعر نہیں — سید فیضی، ۲۹

غزلیں

مجروح سلطانپوری، ۳۱

امین راحت چغتائی، ۳۲

احمد ریاضی، ۳۲

افسانے، خاکے

ایک خفیہ سرکل — فکر تونسوی، ۳۲

خونیوں کے سائے — سنتوکھ سنگھ دھیر، ۳۷

جو اماں ملی تو کہاں ملی — عزیز اثری، ۴۲

ڈورتی جون سین — غیاث احمد گدی، ۴۹

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

دو امرکی نظمیں

سپاہی کی لاش — نکول سنگولین، ۵۵

تین پرندتاری — لوئی منوز مارین، ۵۵

ایک ہسپتو نظم

باغی دہقان — سید رسول رضا، ۵۶

جائزے

نوشتہ زنداں (سید سجاد ظہیر) دیوندر اسر، ۵۷

آزادی کے بعد (ناولٹ فاسٹ) فکر تونسوی، ۵۷

○ پبلشر: مفتی عبداللہ۔ مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

○ پرنٹر: محمد یعقوب پریس۔ دہلی

راہ نما

اداریہ

جابر حکومتوں کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ جب وہ اپنی رجعت پرست حکمت عملی کے بھیانک نتائج، یعنی عوام کا معاشی اور اقتصادی دیوالیہ پن ہوتا ہے اور ملک کے عوام اس کی کالی کرتوتوں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان کا ملک ان وقت کے حاکموں کے پنجۂ استبداد سے نکل آئے اور وہ اس کے لئے جد و جہد کرنے لگتے ہیں تو وہ حکومت اپنے تحفظ کی خاطر سب سے پہلے عوام کے ذہنی راہبروں پر اپنا عتاب نازل کرتی ہے۔ طرح طرح کے جھوٹے اور بے بنیاد الزامات عائد کر کے ملک کے عوامی ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور دانشوروں کو جیلوں میں ٹھونس دیتی ہے۔ اپنی بد دیانتی اور عوام کے خوف کی وجہ سے ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ نہیں چلاتی اور اس طرح اپنی صفائی کا اب موقع دیئے بغیر انہیں مجرم قرار دیدیتی ہے اور سزائیں تجویز کر دیتی ہے ـــــ بیس برس، تیس برس، عمر قید اور پھانسی۔

آج سے چودہ برس پہلے ترکی کی سامراج دوست حکومت نے اپنے ملک کے سب سے محبوب شاعر ناظم حکمت پر بے معنی اور بے بنیاد الزامات لگا کر اور اسے اپنی صفائی کا موقع دیئے بغیر ۲۸ برس کی قید کی سزا دیدی تھی۔

چین کی چیانگ کائی شیک حکومت نے بھی وہاں کے مقبول ترین شاعر یانگ سو کو بیس برس کے لئے جیل کی سلاخوں میں بند کر دینے کا فرمان جاری کر دیا تھا۔

اور ساری دنیا جانتی ہے کہ کس طرح فاشسٹ درندوں نے جولیس فیوچک، رالف فاکس، گیبریل پیری اور ڈیوڈ گیٹ ایسے عظیم فنکاروں کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا

ان تمام ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنے وطن سے محبت کرتے تھے۔ انہیں اپنے عوام سے محبت تھی اور وہ انہیں امن، آزادی اور سچی جمہوریت کا درس دیتے تھے اور ان عوام دشمن لیکن وقت کے حاکموں کی خونیں سازشوں کو بے نقاب کرتے تھے۔

ایسا ہی ایک واقعہ پچھلے دنوں پاکستان میں رونما ہوا ہے۔ حکومت پاکستان نے قانونِ تحفظِ عامہ کے ماتحت ملک کے درجنوں شاعروں، ادیبوں اور جرنلسٹوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا ہے۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں پاکستان کا سب سے محبوب شاعر فیض احمد فیض ہے جو پاکستان کے سرکردہ اخبار "پاکستان ٹائمز" کا ایڈیٹر اور پاکستان کی تحریک امن کا لیڈر اور عالمگیر امن کونسل کا ایک رکن بھی ہے۔ ان میں بٹوارے سے پہلے کے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا بانی اور نامور نگار اور نقاد اور کمیونسٹ پارٹی پاکستان کا جنرل سکریٹری سید سجاد ظہیر ہے۔ ان میں سبط حسن ایسا مشہور و معروف جرنلسٹ اور نقاد ہے جو دو برس پہلے امریکہ میں اپنی ہندوستان دوستی کی وجہ سے سزا پا چکا ہے۔ عوام کے ان تمام ذہنی راہبروں پر حکومت پاکستان نے الزام لگایا ہے کہ وہ میجر جنرل اکبر خاں اور دوسرے بڑے بڑے فوجی افسروں سے مل کر حکومت پاکستان کو الٹنے کی سازش کر رہے تھے۔ اور پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کہتے ہیں کہ ان کے کئی دوستوں نے انہیں خطوط لکھے ہیں کہ ان مجرموں کو کسی تفتیش یا مقدمہ سے پہلے ہی فوراً گولی مار دی جائے ـــــ حکومت پاکستان نے انہیں ابھی گولی نہیں ماری ہے۔ ابھی حیدر آباد سندھ کی ایک جیل میں سپیشل ٹریبونل کے ماتحت ان پر خفیہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ مقدمہ کی کارروائی کے ایک ایک لفظ پر شدید پہرے ہیں۔ پریس کے کسی نمائندے کو اس "عدالت" کے قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں۔ جرم ثابت ہونے سے پہلے ہی "مجرم" گردان دیئے گئے ان لوگوں کو اپنے دفاع کے لئے بھی جب منشاء وکیل رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور بعض ذمہ دار حلقوں کا بیان ہے کہ سرکاری وکلاء نے عدالت کے حکم سے ان کے لئے موت کا

کا مطالبہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ممتاز حسین، حمید اختر، احمد علی، ظہیر بابر، انیس ہاشمی وغیرہ کو اسی رسوائے عالم پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت بغیر ان کا جرم بتائے جیلوں میں نظر بند کر رکھا ہے اور کئی دوسرے ادیبوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر کے انھیں روپوش ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

اس بیسویں صدی اور اس جمہوریت کے دور میں ایسے فاشسٹ احکام اور قوانین کی کہاں تک گنجائش ہے، آج صرف پاکستان کے عوام ہی کو نہیں، صرف ہندوستان کے عوام ہی کو نہیں، دنیا بھر کے عوام کو حکومت پاکستان کے اس جارحانہ اقدام کے خلاف تاروں اور خطوں کے ذریعے پُرزور احتجاج کرنا ہے تاکہ حکومت پاکستان ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے یا انھیں رہا کرنے پر مجبور ہو جائے۔

O

پیارے ساتھی!

امید ہے کہ آپ 'شاہراہ' کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہے ہوں گے اور کسی طرح بھی گوارا نہ کرتے ہوں گے کہ عوامی تحریکوں کے ہمنوا اور صالح اور صحت مند ادب اور آرٹ کے اس بیباک نقیب کی آواز ہمیشہ کے لئے دب کر رہ جائے جس نے ہند اور پاکستان کے ہزاروں عوام میں سچی آزادی، دائمی امن اور اخوت کی روح پھونکی ہے اور کڑے سے کڑے حالات میں بھی عوام دشمن طاقتوں سے نبرد آزما رہا ہے۔

اس وقت جبکہ ترقی پسند خیالات کی نشر و اشاعت شجر ممنوع کی حیثیت رکھتی ہے اور سچی بات کہنے والا گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے اور جبکہ ہند اور پاکستان کے تقریباً تمام عوام دوست رسالے حکومتوں کی عوام دشمن پالیسی کی نذر ہو چکے ہیں، شاہراہ کا دم نہ صرف غنیمت تھا بلکہ بڑی بلند حوصلگی سے وہ اس کمی کو پورا کر رہا تھا۔ اس ضمن میں ہم اپنے ادیب ساتھیوں اور ادب دوستوں کے پُرخلوص تعاون کی سراہنا کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ 'شاہراہ' کو جاری و ساری رکھنے اور اس میں اور زیادہ نکھار پیدا کرنے میں ان کی کوششوں کا بہت بڑا دخل ہے لیکن آج اس بات کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں انتہائی دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ صرف اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر ہم اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

لیکن کسی قطعی فیصلے سے پیشتر ہم آپ پر اپنی پوزیشن واضح کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ 'شاہراہ' پر کسی فرد واحد کی اجارہ داری نہیں ہے۔ 'شاہراہ' ہم سب کا رسالہ ہے اور ہم سب اسے زندہ رکھنے اور اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچانے میں کوشاں رہے ہیں۔

جیسا کہ آپ کو علم ہوگا 'شاہراہ' کی اقتصادی حالت تشویشناک حد تک بگڑ چکی ہے اور اب تک ہم کئی ہزار کا خسارہ برداشت کر چکے ہیں اور کاغذ کی روز افزوں گرانی اس میں مزید گھاٹے کا باعث بن رہی ہے اور ہم اس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس مسئلہ کو آپ ساتھیوں کے سامنے پیش کر کے آپ کے مشوروں کی روشنی میں اسے جاری رکھنے یا بند کرنے کے فیصلہ پر عمل کیا جاوے۔

ہمیں آپ پر پورا بھروسہ ہے اور ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ 'شاہراہ' کے تئیں آپ اپنے مقدس فرض کو پہچانیں گے اور کسی طرح بھی صرف اقتصادی مجبوریوں کے تحت اس کی آواز کو بند نہیں ہونے دیں گے۔

اگر آپ فوری طور سے 'شاہراہ' کا ایک بھی نیا ساتھی بنا سکیں تو شاہراہ آپ کو اپنے چھ ماہ کے مزید تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

O

انداز بیان کے بارے میں

محمد حسن

ادب میں انداز بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی ادب اور دوسری تمام تر تحریرات میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ انداز بیان، تکنیک، فارم، زبان اور بیان کی تمام تر شکلوں پر حاوی ہے۔ اس کی ابتدا اس لمحے سے ہوتی ہے جب ہم کسی خاص شے سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اختتام اس وقت ہوتا ہے جب مصنف اپنے شہ کار کو پڑھنے والے کے سامنے پیش کرتا ہے۔

انداز بیان کا دائرہ نہایت وسیع ہے اس میں موضوع کا انتخاب، احساس کی شدت، ادبی خلوص، طرز فکر اور تاثیر سب ہی منزلیں آتی ہیں تاثیر سے لے کر اظہار تک، ان میں سے کسی ایک کو علیحدہ کر دیجئے اور انداز بیان کی نشوونما اور ترتیب کا شیرازہ بکھر جائے گا یہی موضوع اور طرز بیان نفس مضمون اور اسٹائل کا سنگم ہے۔ ادبی تنقید کی سب سے بڑی غلطیاں ان دونوں کو جدا کرنے ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

انداز بیان کے بارے میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اسے موضوع اور نفس مضمون سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر موضوع کے پیچھے احساس کی شدت اور خلوص ہے تو اس کے نشان انداز بیان کی تابناکی اور شادابی میں بھی ملیں گے۔ اگر جذبہ بے روح اور خیال باسی ہے تو وہی تھکن انداز بیان میں بھی پائی جائے گی۔ لہذا انداز بیان کی شادابی اور شگفتگی کی سب سے بڑی ضمانت خود احساس کی جواں سالی ہے۔ اگر نفس مضمون نے فن کار کو گرمایا ہے۔ اس کے ذہن اور دل کو یکساں متاثر کیا ہے تو یقیناً اس کا انداز بیان بھی جاندار اور دل نشیں ہوگا۔

گرفن کار اور فن کار میں فرق ہے۔ کچھ کو بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے اور کچھ اپنے خلوص کے باوجود وہ آگ پیدا نہیں کر سکتے جو دلوں کو گرما سکے۔ یہی بات دراصل ایک بڑے شاعر اور متشاعر کے درمیان بنیادی فرق قائم کرتی ہے۔ بڑا فن کار وہ ہے جو اپنے سینے کی آگ کو نہ صرف مترنم لفظوں اور موثر بیان میں ڈھال سکے بلکہ اسے دوسروں کے سینوں میں بھی اس طرح روشن کر سکے۔ ایک شمع سے دوسری شمع جلانا اور انفرادی خبروں سے انسانی وجود کی تصویریں کھینچنا ہی آرٹ کا فریضہ ہے۔

اس فریضے کو ادا کرنے کے بھی مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں ادبی تنقید کو اس بات کا حقدار نہیں سمجھتا کہ وہ اس کا ایک طریقہ متعین کرے زندگی بڑی رنگا رنگ ہے اور اس کی حقیقتیں ہزاروں روپ بدلتی ہیں کبھی انفرادی زندگی کی چھن، انشاء، درد، ناکامی اور تڑپ ہی اہم اور گہری ہوتی ہیں تو کبھی سماجی گھٹن، تشنج، جنگ اور راگ رنگ ہیں۔ کسی سمت سے شروع کیجئے۔ انسانی وجود کی پہیلیوں تک ہم ہر حالت میں پہنچتے ہیں۔ کسی آئینے میں دیکھئے ہماری تصویریں نظر آتی ہیں یہیں اجتماعی اور انفرادی آرٹ کی تفریق مٹ جاتی ہے اسی منزل پر ہم ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں نظریوں کو سمو لیتے ہیں۔

فن کار کے سامنے زندگی کا پورا پس منظر پھیلا ہوا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی ہی نہیں بلکہ نسل، زمان اور رنگ کے قیود سے آزاد۔ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ زندگی کے کسی منظر پر لکھے، کسی دور کسی زمانے کے کسی جز و کا بیان کرے۔ تنقید اس کی کامیابی یا ناکامی کا صرف اس بات سے اندازہ لگاتی ہے کہ وہ سماجی طور پر ایک اہم Significant حقیقت کو اہم Significant اسلوب کے ساتھ پیش کر سکا ہے یا نہیں۔ عظیم ادب کا یہی معیار ہے۔

یہاں "اہم" سے میری کیا مراد ہے۔ سماجی طور پر ہر حقیقت اہم نہیں ہوتی۔ چائے کی وہ پیالی جو مجھے بے حد عزیز تھی۔ میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ میرے لئے بڑا دردناک ہو لیکن سماجی پس منظر میں یہ اس وقت تک ایک اہم حقیقت نہیں ہے جب تک ہم اس کو عام انسانی قدروں اور دوامی جذبات سے متعلق نہیں کرتے۔ اسے اس طرح پیش نہیں کرتے کہ میری اپنی تکلیف میں انسانی وجود کے مسائل کا عکس نظر آنے لگے۔

"عام انسانی قدریں" اور "دوامی جذبات" دونوں اصطلاحات بڑی مبہم ہیں۔ آفرینش سے لے کر اس وقت تک کچھ جذبات نے انسانیت کو برابر متاثر کیا ہے۔ فطرت اور انسان کی جنگ ہر قدم پر لڑی جاتی رہی ہے۔ مشیت اور تدبیر، اتفاقات اور عمل ہمیشہ برسرپیکار رہے ہیں۔ جنس، محبت، نفرت، ترقی اور دنیاوی حسیت، بھوک اور اس قسم کے نہ جانے کتنے جذبوں نے ہر منزل میں انسان پر اپنا تسلط جمایا ہے۔ ان جذبات کی شکلیں ہر سماجی ترتیب کے ساتھ بدل سکتی ہیں لیکن ذات کی ابدیت اور دوام ختم ہو سکتا ہے اور نہ ان کی عمومیت۔ ہر عہد میں ہر طبقے کے انسان نے ان کا تجربہ کیا ہے۔

کسی انفرادی یا اجتماعی حادثے کی گہرائیاں ان دوامی جذبات اور عام انسانی قدروں سے اندازہ بیان ہی ملاتا ہے۔ نپولین نے روس پر حملہ کیا۔ اس حملے کے کارنامے جارحانہ اور مدافعانہ کارروائیاں دونوں لحاظ سے یہ ایک عظیم تاریخی حادثہ تھا اسے مورخوں نے بھی لکھا، صافیوں نے بھی بیان کیا اور ٹالسٹائی کے جادو نگار قلم نے بھی اس کے اور گرد اپنے شہد ناول "امن اور جنگ" کا تانا بانا بنا۔ موضوع ایک ہے۔ لیکن تینوں کے انداز نظر اور اسلوب بیان میں فرق ہے۔ مورخ نے اسے گذرتے ہوئے وقت کی آنکھ سے دیکھا۔ صافی نے اسے عام انسان کی حیرت پسند عینک سے پڑھا اور ٹالسٹائی نے اس میں وقت کے دائرے میں اسیر بے قرار انسانی وجود کی پرچھائیاں دیکھیں وہ کبھی پیئر Pierre کی شکل میں منزل منزل بھٹکتا ہے کبھی پرنس اینڈریو زRudrewsi Prince کی صورت میں عظمت کے رنگ محل بناتا اور بگاڑتا ہے کبھی ناتاشا Natasha کی طرح درد و نشاط کا تماشائی بنتا ہے یعنی جیسا سیاست داں اگر اسے تاریخی دستاویز کی طرح پڑھتا ہے تو مناسب ہے۔ مگر ہمارے ادیبوں کے لئے اس کی اہمیت کسی دوسری نہج سے ہونی چاہئے انہیں اس میں عظیم تر انسانی قدروں کی تلاش کرنی چاہئے۔

انسانی اور سیاسی قدروں میں امتیاز پیدا کرنے سے میری کیا مراد ہے۔ سیاست عام انسانی تقاضوں کو پیدا کرنے کے لئے مناسب ترین نظام کی کوشش کرتی ہے۔ وہ ہر دور میں یہ جائزہ لیتی ہے کہ انسانی ضروریات کس حد تک پوری ہو رہی ہیں۔ اور سماجی ترتیب میں ذرائع پیداوار کے اختیار میں کیسی تبدیلیاں کی جائیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے فائدہ مند ہو سکیں۔ اس طرح سیاست کی قدریں ان دوامی جذبات کے وقتی مظاہر سے تعلق ہیں۔ وہ ہر دور کے سماجی تقاضوں کے باہمی فرق پر زور دیتی ہیں۔ ان کی وحدت پر نہیں۔ وہ ٹھوس عصری مسائل کو سامنے رکھتی ہیں۔ دوامی جذبات کی فلسفیانہ اہمیت پر نہیں۔ آرٹ اس کے برعکس ان ادوار کی وحدت پر نظر رکھتا ہے۔ وہ اس بدلتے پس منظر میں ان قدروں کو دیکھتا ہے۔ جو ہر دور میں بدلتی ہیں مگر ہر عہد میں زندہ رہتی ہیں۔ سیاست روپ میں الجھتی ہے۔ ادب روح تک رسائی رکھتا ہے۔

یہی انسانی نقطۂ نظر ادب کو صحافت اور تاریخ سے جدا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے تاریخ اپنی منزلوں سے آگے بڑھ کر کبھی کبھی ادب کی سرحدوں کو چھوئے صحافت اپنے ہنگامی لمحات میں ادب کی حدوں تک پہنچ سکے لیکن ایسی نظیروں سے ہمیں توازن نہ کھونا چاہئے۔ یہ استثنائی نظیریں ہیں۔ اصول نہیں۔

جدید اردو تنقید نے اور خصوصاً ترقی پسند تنقید نے انداز بیان کو پوری اہمیت نہیں دی۔ قدیم تنقید اور اس کے بعد جمالیاتی تنقید کے ردعمل کے طور پر جدید تنقاد کی توجہ نفس مضمون پر یکسوئی کے ساتھ رہی۔ ہماری تنقیدیں ہیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اگر نفس مضمون ایک ہو تو کون شاعر عظیم ہے اور کون محض نقال اور متشاعر۔ آخر وہ کون سا جمالیاتی قلم ہے جو شاعر کی بات میں رنگ بھرتا ہے۔ ہماری تنقید کا سارا زور بیان شاعر اور ادیب کے سماجی پس منظر کے تجزیے میں صرف ہو رہا ہے۔ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ اس کا پیغام کیا ہے اور اس پیغام کے معنی طبقہ واری تقسیم کے لحاظ سے کیا ہوں گے۔ فن کو جس قدر بیگانگی کی طور پر پچھلے دنوں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ شاید ہی پہلے کبھی کیا گیا ہو۔ ہماری تنقید شعر و ادب پر ایک سائنٹفک تجزیہ کی طرح حاوی ہو رہی ہے اور سائنس کے دوسرے شعبوں کے معیار سے جانچ کر اس پر حکم لگانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔

ہمارے تنقید نگاروں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ادب پہلے آرٹ ہے اور بعد کو کچھ اور، اس پر فن کے اصولوں کا اطلاق ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے مطالعے میں آپ دوسرے سماجی علوم اور سائنس سے مدد لیں۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ غالب کے شعر۔

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

یا قانی کے شعر۔

مرکز ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

یا اقبالؔ کے شعر:۔

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل

کے تانے کا راز کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اشعار کے ساتھ ذہن فوراً ہی اس دور کی سماجی ترتیب کی طرف منتقل ہو جائے اور ہم اس زمانے کے حسن و عشق کے تصورات، سماجی نظام اور سیاسی حالت پر غور کرنے لگیں پھر یہ نتیجہ نکالیں کہ غالبؔ اور غالبؔ نے اس حد میں کن خیالات کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے ماورا بھی ان اشعار کی ایک قدر ہے۔ وہ ان کا خوبصورت انداز بیان ہے۔ ان کا فنی حسن ہے۔

اس خوبصورتی کا راز کیا ہے؟ اس کا تجزیہ ناممکن ہے لیکن تنقید اگر اس ناممکن کو کسی نہ کسی حد تک حل نہ کرے تو اس کا کام ادھورا ہی رہے گا۔ ہر شاعر کے سامنے خیالات کے مادی اور بے روح ماڈل تو پیش کر سکے گی۔ لیکن ان کے لئے جمالیات کی وہ گرہیں نہ کھول سکے گی جو چار افنی روشنی، اقبالؔ کے اس شعر کے جمالیاتی تاثر کو لیجئے:۔

یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل

اس تشبیہ میں فنی خوبصورتی کی ایک پوری داستان پوشیدہ ہے۔ اگر ہم نقاد اس طلسم کا تجزیہ نہیں کرتا۔ اس طرف اشارہ نہیں کرتا کہ اس مکمل تصویر کے بنانے میں روایت، محاکات، اور جمالیاتی شعور کا کس قدر رچاؤ ہے تو میرے نزدیک اس کا کام پورا نہیں ہوتا۔

انداز بیان وہ اصل شاعری کی داخلی اور خارجی قدروں کا سنگم ہے۔ اس کا پیشتہ ایک طرف تو فنکار کی ذہنی ساخت، انفرادی شخصیت، اور اس کے فنکارانہ شعور سے منسلک ہے اور دوسری طرف فن کی اجتماعی قدروں اور روایات سے۔ اسی لئے ہر ایک عظیم فنکار کا اپنا انداز بیان ہوتا ہے جسے کالرائل نے فنکار کے لباس سے اور ایک دوسرے نقاد نے اس کی جلد سے تعبیر کیا ہے جو اس کی اپنی ہے اور جسے وہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس میں اس کی اپنی شخصیت، اپنے دکھ درد، اپنے فکر و نظر اور اپنے بیان و زبان کا رنگ نظر آتا ہے۔

یہاں ادب میں انفرادیت اور شخصیت کی نوعیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک ادیب کی انفرادیت ہی سب کچھ ہے اس کو سماجی شعور تو درکنار، خود اپنے شعور اور لاشعور سے بے نیاز ہو کر تخلیق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ ان کی علامتیں ذاتی ہیں اور ان کا تاثر پر اسرار۔ میراجی ہمارے ادب میں اس کی کامیاب ترین مثال ہیں۔

دوسری طرف وہ گروہ ہے جو ادب میں انفرادیت کا منکر ہے۔ یہ لوگ ادب پر سماجی تقاضوں اور سیاسی ضرورتوں کا بوجھ ڈالتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کو اس خطرناک رجحان سے آگاہ رہنا چاہئے۔ کسی واقعے سے شاعر متاثر ہوتا ہے۔ کسی سے نہیں۔ وہ زندگی کے کسی جزو کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ کسی خاص واقعے سے ضرور متاثر ہو ادب اور تاریخ دونوں کے میکانکی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ پھر ایک دور کے شاعروں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب کسی ایک واقعہ سے متاثر ہوں یا کسی ایک موضوع پر لکھیں، بڑی نادانی کی بات ہوگی۔ بنگال کا قحط ہو یا امن کی تحریک، فاشزم یا فیکشن ہمیں ادیبوں سے یہ مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ وہ ان ہی میں سے کسی موضوع پر لکھیں۔ مجھے علم ہے کہ ادبی اور سماجی زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب ایک لمحہ زندہ رہنے والے ادب کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس بحرانی دور سے عام ادبی تنقید کے اصول نہیں ڈھالے جا سکتے۔ کوئی ادبی تحریک بھی ادیب کے طرز فکر، رجحان، اور بنیادی نقطے پر تنقید کرنے کا حق رکھتی ہے لیکن وہ ادیب کے لئے موضوعات کا انتخاب کرنے یا اس کی تاخت پذیری کا عمل طے کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ یہیں سے ادیب کی انفرادی شخصیت کا دائرہ شروع ہوتا ہے۔

جدید شاعری سے انفرادیت کا سوز اور شخصیت کا احساس بالکل زائل ہو گیا ہے۔ ہمارے ادیب گروہ یا ایک ہجوم میں گم ہو گئے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کی نگاہ شاعت کا دائرہ محدود ہو گیا ہے۔ ہمارا فکر زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہونا چاہئے۔ ہمارے [illegible] بوجھ کی بجائے وسیع تر تہذیبی قدروں کا آہنگ ہونا چاہئے۔

بہار کے بارے میں میر اور فانی کے دو شعر ہیں دونوں یاس پرست شاعر ہیں لیکن ان دونوں شعروں کی فضا کس درجہ مختلف ہے۔

(۱) اک موج ہوا پیچاں لے تیر نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

(۲) فصلِ گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے　　یا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

دونوں اشعار میں فصل گل کے بارے میں ایک ہی طریقے کی بے یقینی اور کم اعتباری ملتی ہے بہار کے مظاہر دونوں جگہ انتہائی یاس انگیز ہیں ایک جگہ زنجیر اس کی علامت ہے دوسری جگہ در زنداں۔ اس ظاہری مشابہت کے باوجود طرز بیان جداگانہ ہے۔ میر نے اس ساری فضا میں پوری شخصیت کے درد اور سپردگی کو جذب کیا ہے اور فانی نے خود کو ایک مایوس علیحدگی کی حالت میں پیش کیا ہے ایک پر گذری ہے دوسرے نے ایک کونے میں بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچا ہے۔ ایک کے پہنانے کے لئے زنجیر لائی جا رہی ہے اور دوسرا در زنداں کو کھلتا دیکھ کر دوسروں کے بارے میں کچھ سوچ رہا ہے۔ ایک درد آشنا ہے اور دوسرا غم پرست۔ یہ دو شاعروں کے مزاج کا فرق ہے۔ انداز بیان کا فرق ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور فنی شعور کا فرق ہے۔

ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہر عظیم شاعر اپنی شخصیت کے ایسے جوہر رکھتا ہے جس کی مثال وہ خود ہی فراہم کر سکتا ہے۔ اس انفرادی عنصر کو تخلیق اور تنقید نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ یہ انداز بیان کا داخلی اور انفرادی پہلو ہے۔

اسی کے ساتھ انداز بیان کی توام تر قدروں کا اجتماعی ہونا ضروری ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامیابی کا انحصار تاثیر اور اظہار کی کامیابی پر ہے اور یہ کامیابی صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب فن کار ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرے جو پڑھنے والے کے ذہن میں بھی کم و بیش وہی تصور بیدار کر سکیں جو خود شاعر کے ذہن میں موجود ہے۔ اس کے لئے ایسے الفاظ، تلمیحوں اور تشبیہوں کا ہونا لازمی ہے۔ جن کے معنی اجتماعی طور پر یا تو متعین ہو چکے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

یہاں فن میں روایت اور بغاوت کا مسئلہ سامنے آتا ہے کوئی شعبۂ ادب بھی ان تلمیحات اور الفاظ سے کام لئے بغیر زیادہ دور تک نہیں جا سکتا۔ جن کے ساتھ روایت نے مخصوص سماجی تصویریں اور تصورات منسلک کر دیئے ہیں۔ میر کے شعر میں اگر روایت ہمیں یہ نہ بتا سکے کہ بہار میں جنوں کا زور ہونا ثابت ہے، پاگلوں کو زنجیر میں باندھنے کا رواج ہے اور اس طرح بہار اور زنجیر کا روایتی رشتہ ہے تو شاید ہمارا ذوق شعر کی پوری لطافت اور معنی کو سمجھ ہی نہ سکے۔

غیر شعور اور تحت الشعور پر زور دینے والے نقاد اور فن کار بھی انداز بیان کے اس سماجی پس منظر سے پوری طرح انکار نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک ہر ایک انفرادی اور لاشعوری شے کے بھی سماجی رابطے اور رابطے ہوتے ہیں گو ان کے باہمی رشتے ایک دوسرے سے پیچھے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو فن کو لاشعور کے حوالے کر کے اسے ایک پہیلی بنا دیں۔ جب تک فن کار جان بوجھ کر اپنے مطالب کے لئے الفاظ نہیں چنتا اور ایسے الفاظ اور ترکیبیں نہیں چنتا جو پڑھنے والے کے ذہن میں وہی تصویریں پیدا نہ کریں۔ وہ انداز بیان میں شادابی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کی اپیل لوگوں کے دلوں کی جگہ ان کے دماغوں سے ہوگی۔ نفسیات کے مردہ اور سخت فارمولوں سے ہوگی اور یہ فن کی خامی ہے کمال نہیں۔

اس طرح ہر دور کے فن کار کو اپنے انداز بیان کے لئے ماضی کی روایات کا پورا ذخیرہ ملتا ہے وہ الفاظ اور تراکیب کے ایک عظیم ورثہ کا مالک ہے لیکن وہ اس ورثے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ ہر دور کے مظاہر اور مطالب یکساں نہیں ہوتے۔ ہر عہد کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں اور مسائل شعر اور ادراک نت نئے تقاضے پیش کرتے ہیں۔ جو ہر لمحہ نئے اسالیب، نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہر عظیم فن کار اس دشواری کو دو سمتوں میں حل کرتا ہے۔ ایک تو پرانی روایتی قدروں کو نیا جامہ پہنا کر جیسے اقبال نے فکر و نظر، خودی اور جذب و جنوں وغیرہ الفاظ کو نئے مطالب بخشے اور دوسرے نئی اصطلاحات اور ترکیبیں ڈھال کر۔

نئی تلمیحات ڈھالنے کے بارے میں ایک ضروری بات مجھے عرض کرنا ہے۔ نئی تلمیحات دراصل اس نئے مفہوم کے ساتھ آتی ہیں جو برسوں پہلے ہمارے شعور کا جزو بن جاتے ہیں۔ ایسے مطالب جو ابھی تک ہمارے لئے الفاظ نہیں پاتے ایک ہی مرتبہ ہمارے شاعرانہ ذہن میں گونج اٹھتے ہیں۔ اس قسم کی تلمیحات ڈھالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ایک تو ایسے مطالب جو ہمارے سماجی وجود میں ابھی طرح نہ پک گئے ہوں دوسرے ان میں ہمارے ادبی مزاج سے منافرت نہ پائی جائے۔ ن۔م۔ راشد نے اس میں بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔

ادب اور ادبی روایات کو خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ ادبی روایت کا دائرہ ہمیشہ محدود ہوتا ہے۔ اور اگر ہر دور کا ادب اسی دائرہ میں چکر لگاتا رہتا تو شاید ادب کی ترقی یونانی دور سے آگے نہ بڑھتی لیکن ادبی مزاج اس سے کہیں زیادہ مستحکم اور دیرپا ہے۔ اس کا تعلق ایک ساتھ شاعرانہ روایت اور قومی کردار سے ہے وہ کچھ چیزیں قبول کرتا ہے کچھ چیزیں رد۔ اس میں تبدیلی لاشعوری پر اور بہت تدریجی ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی تمدنی قدروں کی تبدیلی کے ساتھ ہوتی ہے اور جو تمدنی قدروں کی تبدیلی میں [illegible] بھی عمل نہیں دیکھ پاتے وہ تمدن اور سماجی تبدیلی کے قانون کو نہیں سمجھتے۔

ہر قسم کی شاعری اور ادب کیلئے ضروری ہے کہ وہ اور کچھ بھی ہونے سے پہلے اعلیٰ شاعری اور اعلیٰ ادب ہو شاعری اور ادب محض پیغام رسانی کے ذریعے نہیں ہیں وہ کلام کے خوبصورت [illegible] ذریعے بھی ہیں ادب محض ایک مضمون یا مطلب نہیں۔ ایک جمالیاتی تاثر بھی ہے۔ جب تک وہ جمالیاتی تاثر پوری طرح روشن اور تابناک نہیں فنکار کا کام ادھورا ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے فن کے اس پہلو کو بہت تشنہ چھوڑا ہے۔

میں ایک خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اکثر اوقات فکر کے فقدان اور موضوع کے پسپھسے پن کو خوبصورت انداز بیان اور سجیلے الفاظ کا لباس پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب ہمارے فنکار کے پاس یا تو سرے سے کوئی فلسفۂ فکر ہوتا ہی نہیں یا اس قدر فرسودہ اور ناکارہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی بات کو مختلف پیرایوں اور طرح طرح کی آرائشوں کے ساتھ دہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ادبی جمود کی سب سے واضح پہچان ہے۔

اس منزل پر پہنچ کر انداز بیان شاعری اور ادب کی صحت مندی کا نشان ہونے کی بجائے اس کا آماس بن جاتا ہے اور شاعری انہی لفظی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔ اس کی سب سے واضح نظیر لکھنؤ کے دبستان نے پیش کی جہاں بات کو اس قدر سنوار کر اور سجا کر کہنے کا دستور ہوا کہ خود مطلب خبط ہو گیا۔ "گلزار نسیم" اور "فسانۂ عجائب" کے خوبصورت طلسم کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ جب شاعر بات کو ذہن میں رکھ کر اس کے لئے سجا ہوا انداز بیان تلاش کرنے لگے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے شاعر کا ذہن تھک چکا ہے اس کی نظر کی وسعت تنگ ہو گئی ہے اور اس کا ادبی خلوص مائل بہ زوال ہے اور ادبی جمود پھر کسی نئے بانی کا منتظر ہے۔

آج کی اُردو شاعری پر بھی اسی قسم کا ایک خطرہ منڈلا رہا ہے۔ ہمارا ادب پھر ایک فکری جمود سے گذر رہا ہے۔ اس میں تھکن اور بیزاری کے آثار ہیں۔ یہ تھکن اپنے کو چند گنے چنے الفاظ کی حد بندی کی شکل میں ظاہر ہونے لگی ہے۔ آج کل شاعری ایک موہوم طرز بیان کی شاعری ہے۔ اس کے پاس چند موضوعات کی فہرست اور چند تراکیب کا یہی کھاتہ ہے۔ اس حالت کو فکری ہم آہنگی کی خطداری نہیں کہا جا سکتا۔ یہ فکر کے غلط اور میکانکی تصور کا نتیجہ ہے۔

ہمارے ادیب بظاہر موضوع کو پہلی اور آخری شے قرار دے رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ موضوع جیسی چیز سے ناآشنا ہیں جو پوری شدت اور قوت سے ان کے دلوں کو گرما سکے اور دلوں میں وہ تڑپ پیدا کر سکے جو اظہار کے لئے بیتاب کرتی ہے۔ ہمارے فنکاروں کو غیر ضروری سجاوٹ اور پسپھسی طلسم بندی سے بھی ہوشیار رہنا چاہئے اور شاپ پن اور بے نمکی سے بھی۔ سادگی اور اکی چاشنی آج ہمارے ادب کے لئے جس قدر ضروری ہے اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ ضروری ہے کہ ہمارے فنکار اقبال کی رومانوی رنگ آمیزی، غالب کی رنگینی اور میر کی سادہ پرکاری کے بنیادی عناصر کو دیکھ سکیں۔ ان کی روح کو سمجھیں اور ان کے پیدا شدہ غلط طمطراق اور بے جان تقلید سے دامن بچالیں۔

ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا فرض ہے کہ انداز بیان اور ادبی فن پارے کے جمالیاتی تاثر کی طرف پوری توجہ کریں۔ شاعری کا کوئی بھی موضوع اور مقصد کیوں نہ ہو اُسے سب سے پہلے اعلیٰ ادب پارہ ہونا چاہئے اگر کوئی شاعری اس معیار پر پوری نہیں اُترتی تو وہ کتنی ہی کامیاب اور کارآمد کیوں نہ ہو، ادب کی جگہ نہیں پا سکتی۔ اس جمالیاتی تاثر کی تکمیل صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہمیں اپنی ادبی روایتوں پر پورا عبور ہو۔ ہم ان فنی قدروں کو سمجھنا اور پرکھنا سیکھیں جو ہمارے شاعروں اور فنکاروں نے اپنا عندیہ ظاہر کرنے کے لئے استعمال کی ہیں اور ان کی روشنی میں نئے سانچے ڈھال سکیں۔

عشقیہ شاعری اور ہمارا ماضی

ہنس راج رہبر

(سجاد ظہیر کے نام ایک خط)

بنے بھائی! آپ ہمارے رہنما اور رفیق ہیں اور ہم آپ کو محبت اور احترام کے ساتھ اس نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان دو سحر آفریں الفاظ سے ہمیں اپنے محبوب رہنما سے روحانی قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ کی یہ عظمت اور بڑائی ہے کہ آپ سے ملکر کوئی بھی اس روحانی قرب سے محروم نہیں رہتا۔ آپ شروع ہی سے ہمارے دیس کی سیاست اور ادب کی ترقی پسند تحریک کے رہنما ہیں اور ہر نئے موڑ پر آپ نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ میں بھی اس تحریک کا ایک ادنیٰ رکن ہوں اور اسی ناتے ایک عرصہ سے آپ کی ذات سے وابستہ رہا ہوں۔ آخر اس وابستگی کے کارن مجھے آپ سے دو چار ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل ہوا۔ ہماری پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں لاہور میں اور آخری ملاقات ۱۹۴۸ء میں دہلی میں ہوئی۔ چونکہ دیس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے اس لئے پھر ملنا ممکن نہیں ہو سکا۔ جس رجعت پسند اور عوام دشمن سیاست کے باعث ہمارے درمیان ایک فرضی دیوار حائل ہوئی۔ اسی سیاست نے آپ کو عوام سے الگ کر کے جیل میں بند کر دیا ہے اور جس عدالت کے سامنے اب آپ کا مقدمہ پیش ہے اس سے انصاف کی چنداں توقع نہیں کیونکہ اس عدالت کو وجود میں لانے والا حکمراں طبقہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کمیونسٹ جس عوامی جمہوریت کے قیام کیلئے کام کر رہے ہیں، کسی بھی فوجی یا شخصی سازش کو اس کے منافی سمجھتے ہیں پھر بھی انھوں نے آپکو گرفتار کیا ہے۔

میں نے پہلی ہی ملاقات میں آپ کی عظمت کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کسی زیر بحث مسئلہ پر آپ جس متانت اور سنجیدگی سے تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ دوسرے کی رائے کا احترام کر کے آپ واقعی اس کے دل کو موہ لیتے ہیں۔ مجھ پر سب ملاقاتوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ آپ کا نام پڑھتے ہی آپ کا متین اور پر وقار چہرہ سامنے آجاتا ہے اور آپ سے واقعی روحانی قرب حاصل ہونے لگتا ہے۔

"شاہراہ" کے سالنامہ میں چند ماہ پہلے میں نے آپ کا مضمون 'غلط رجحان' پڑھا تھا۔ ان دنوں میں بہت مصروف تھا۔ اس لئے "شاہراہ" کے آئندہ شمارہ میں اپنی رائے یوں ظاہر کی تھی کہ آپ نے ہماری توجہ واقعی ایک اہم بات کی طرف مبذول کرائی ہے۔ میں نے مرزا شوق کی کوئی مثنوی نہیں پڑھی خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پڑھ کر مجھ پر جو اثر ہوا۔ میری یہ رائے اسی کا ردعمل ہے۔ اپنی پہلی فرصت میں مرزا شوق کی مثنویاں پڑھکر ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار تفصیل سے پھر کروں گا۔ چنانچہ اب میں اس اہل ہوں کہ مرزا شوق کی شاعری کے متعلق مفصل لکھ سکوں اور آپ کے مضمون سے اختلاف یا اتفاق کر سکوں۔

مرزا شوق "بہار عشق" اور زہر عشق" کے علاوہ دو اور مثنویوں "فریب عشق" اور "لذت عشق" کے بھی مصنف ہیں۔ بیشتر نقاد انھیں صرف "بہار عشق" اور "زہر عشق" کے مصنف مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باقی دو مثنویوں کو ان کے نام سے غلط منسوب کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ رائے درست ہو اس لئے میں بھی انھیں صرف "بہار عشق" اور "زہر عشق" کا مصنف مان لیتا ہوں۔ خواجہ احمد فاروقی کی جس کتاب پر میں نے تبصرہ کیا تھا۔ ان میں بھی صرف ان ہی دو مثنویوں کا ذکر ہے اور آپ نے تو صرف "زہر عشق" پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔

بہتر ہوتا کہ آپ کو "بہار عشق" اور خواجہ احمد فاروقی کی زیر بحث کتاب بھی پڑھنے کا موقع ملا ہوتا۔ میرے تبصرے کے یہ الفاظ، جو آپ نے اپنے مضمون میں نقل کئے ہیں: "مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے۔ اسے بلند نہیں کیا۔ کیا ان کی پستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟" میرے اپنے نہیں، خواجہ احمد فاروقی کے ہیں اور انھوں نے یہ الفاظ "بہار عشق" کی بابت لکھے ہیں۔ چونکہ اس مثنویوں کی فحاشی اور عفونت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے فاروقی صاحب اسے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے سوالات کا جواب یوں دیتے ہیں۔

"یہ قصہ جانِ عالم واجد علی شاہ کے اس لکھنو سے متعلق ہے جہاں فیضِ نسیم اور جلوۂ گل کی کمی نہیں تھی۔ ہر منظر جنتِ نگاہ اور ہر گوشہ بساط، دامانِ باغباں بنا ہوا تھا۔ نظارۂ جمال بھی تھا اور شوقِ وصال بھی۔ رہس کے سوانگ، اندر سبھا کی پریوں کے مجمعے درگاہ حضرت عباسؑ اور قیصر باغ کے میلے اور شعر و سخن کی عام صحبتوں نے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا ہے اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں قایم ہو کر رہ گئی ہیں۔

ٹ و دامش و رنگ و بو کی یہ فیض بخشیاں صرف "آفتاب سپہر جاہ و حشم" ہی کے لئے مخصوص نہیں تھیں۔ جن کے اختیارات کم ہوتے ہوتے محل تک محدود ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر غریب و امیر اسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام کے آگے اسی طرح ایک نہ ایک جامِ سرشاری رکھا ہوا تھا۔ زہرۂ صبح بھی تھی اور جام بلور بھی۔ صہبائی مے ناب بھی تھی۔ اور سفینۂ غزل بھی۔ لوگ ماضی و مستقبل کو حال کی مستیوں اور رنگینیوں میں بھلا چکے تھے اور دست افشانی اور پاکوبی کا مفہوم صرف یہ رہ گیا تھا کہ:۔

بیا تا یک امشب تماشا کنیم　　چو فردا شود سنگِ فردا کنیم

بہارِ عشق کے قصہ کی ابتداء اور انتہا اسی حسن بیز اور عشق خیز سرزمین میں ہوتی ہے"

خواجہ احمد فاروقی کے اس استدلال کا مطلب یہ ہوا کہ اس مثنوی کی فحاشی اور عفونت" ماضی و مستقبل کو حال کی مستیوں اور رنگینیوں میں بھلا" دینے کی کوشش کا نتیجہ ہے اور مرزا شوق نے حسن بیز اور عشق خیز سرزمین کی حقیقتوں کو قلمبند کیا ہے۔

"بہارِ عشق" کا قصہ یہ ہے کہ ہیرو نوابی گھرانے کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو عشق و عاشقی سے مطلق ناواقف ہے۔ ایک روز جب وہ سیر کو جا رہا تھا اتفاقاً ایک کافر ادا کو اپنے گھر کی چھت پر دیکھ لیا اور پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا۔ بس پھر کیا تھا۔ عاشق کا بُرا حال ہے۔ درد اور کسک سے آہیں بھر رہا ہے۔ غش پر غش آ رہے ہیں۔ دوست و احباب جمع ہوتے ہیں۔ حال پوچھتے ہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے۔ عشق کا راز کھلتا ہے اور کافر ادا کے گھر کا پتہ لگایا جاتا ہے اور پھر ہیرو کا ایک چالاک دوست ہیروئن سے مل کر اسے چکمہ دیتا ہے کہ نوجوان نے تمہارے عشق میں انیون کھالی ہے اگر تم میں ذرا بھی انسانیت ہے تو اس بے چارے کی جان بچاؤ۔ پہلے تو لڑکی ناراض ہوتی ہے۔ لیکن آخر اسے عاشق زار پر رحم آجاتا ہے اور وہ اس کے گھر آنا منظور کر لیتی ہے کیونکہ اسے دیکھے بغیر عاشق کے بچنے کی اور کوئی صورت نہیں۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی ہیرو کے دوست لڑکی کو باغ میں پہنچا دیتے ہیں۔ اب ہیرو اور وہ تنہا ہیں۔ نوجوان لڑکی کی بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی عصمت دری کرتا ہے اور آخر والدین بھی یہ سوچ کر کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ لڑکی کی شادی نوجوان سے کر دیتے ہیں"

مثنوی پڑھنے سے یقیناً پست قسم کے فحش جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ صرف لڑکی کی کافرادائوں ہی کا نہیں اس کی ماما کے حسن اور چٹک مٹک کو بھی چٹخارے لے کر بیان کیا گیا ہے اور باغ میں لڑکی سے زبردستی اور ہاتھا پائی کا جو منظر بیان کیا گیا ہے وہ تو ایک دم بھیانک اور وحشت ناک ہے۔ خواجہ احمد فاروقی رقمطراز ہیں۔ "میر مثنوی کو اس ظلم، اس حیوانیت، حسن و عشق کی اس توہین کے لئے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا"

لیکن ان کا یہ عتاب میر مثنوی پر ہے مرزا شوق سے انھیں کوئی گلہ نہیں ان کی شاعری اور حسن بیان کی وہ تعریف کرتے ہیں۔ لڑکی کا چکمہ دے کر باغ میں بلانے کے متعلق پہلے لکھ چکے ہیں۔

"کاش یہ دھوکا کبھی نہیں دیا جاتا"

اس کے بعد اختلاط اور وصل کی داستان ہے چاروں طرف بے حیائی اور بے شرمی چھا جاتی ہے اور خوب دل کھول کر دادِ عیش دی جاتی ہے قیامت یہ ہے کہ جتنی یہ داستان عریاں اور غیر مہذب ہے اتنی ہی اس کی زبان شستہ و رفتہ، سادہ اور بے تکلف ہے۔ روانی اور صفائی کا یہ عالم ہے۔ جیسے شفاف پانی کا چشمہ پہاڑ کے دامن سے اُبل رہا ہو۔ جو بندش ہے، وہ چست، جو محاورہ ہے وہ درست۔ جو لفظ ہے وہ برمحل!

ہمارے پند آموز نقادوں نے ساری بحث اخلاق ہی پر آکر ختم کر دی۔ انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ شاعری اچھی بُری نہیں ہوتی۔ شاعر اچھے بُرے ہوتے ہیں اور شاعری کی اخلاقیت (Morality) اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اظہار و اسلوب میں مکمل ہو۔ انھوں نے اخلاقی نکات تو ڈھونڈ لئے لیکن جذبات نگاری کی قوت، بیان کی سلاست، زبان کی صحت اور روزمرہ کی قدرت پر غور نہیں کیا۔ یہ عریانی تو اس زمانے

کے فیشن میں داخل تھی۔ خود "صاحب عالم" اور "سلطان عالم" اقراری مجرم تھے اور ان داستانوں کو مزے لے لے کر نظم کرتے تھے اور عوام کے سامنے بے حجابانہ پیش کرتے تھے۔ جب اس بارگاہِ سلطانی سے خوشنودی حاصل ہو جائے اور چشم یار بھی شہ دینے کے لئے موجود ہو، پھر ایک آدمی، معمولی گوشت و پوشت کا آدمی اپنی نظر پر اور اپنے قلم پر کس طرح قابو رکھ سکتا ہے۔"

شاعری اور فن اور بندش اور محاورہ کی چستی اور درستی کے نام پر بے حیائی اور بے شرمی کو جائز قرار دینے کی یہ پہلی کوشش نہیں۔ بدقسمتی سے اردو ادب کی ایک عرصہ تک یہ روایت رہ چکی ہے کہ زبان کی نوک پلک سنوارنا، بندش چست، محاورہ درست اور روزمرہ کا مناسب استعمال ہی فن کا سب سے بڑا مقصد رہ گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان عام فہم اور سہل ہو گئی اور اس میں باریک سے باریک خیال کو ادا کرنے کی قدرت پیدا ہوئی لیکن اس سے ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ موضوع کو الفاظ کی صنعت گری پر قربان کر دیا گیا اور فن برائے فن کے رجحت پرست نظریہ کو تقویت ملی۔ خواجہ احمد فاروقی نے شاعری کی جس اخلاقیت کو مرزا شوق کی تائید میں پیش کیا ہے وہ بھی اس نظریہ کی پیداوار ہے، میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی شاعری کی اس اخلاقیت سے متفق نہیں ہوں گے۔ اس لئے میں نے اگر اس نظریہ کو فحاشی اور عفونت کی دلیل نہ سمجھتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے کہ انھوں نے گوبر سے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے" تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

یہ بات میں نے اپنی بریت میں کہی ہے اور اب کچھ باتیں میں آپ کے مضمون کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ مرزا شوق کی دونوں مثنویاں پڑھنے اور اس وقت کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنے کے بعد ان کی شخصیت اور شاعری کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ نے مرزا شوق کی صرف ایک مثنوی زہرِ عشق پڑھی ہے اور اس کی تعریف میں یہ الفاظ تحریر کئے ہیں:-

"مرزا شوق کی یہ مثنوی تاثر، سلاست، شیریں بیانی، حقیقت نگاری اور گہری المناکی کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے: جسے جاگیری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔"

اس کے بعد آپ نے جنسی محبت کے ارتقاء کا جو فلسفہ بیان کیا ہے اس سے میں حرف بہ حرف متفق ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ جنسی محبت کا جذبہ ایک عظیم تہذیبی قوت ہے" اور اس کا اظہار صرف بالغ مرد اور عورت کے مخصوص تعلقات اور افزائش نسل کی شکل میں ہی نہیں بلکہ تمام فنون لطیفہ کی تخلیق اور اس سے آگے بڑھکر والدین اور ان کی اولاد بھائی بہن، بھائی بھائی، دوستوں اور رفیقوں میں باہمی التفات، ہر انسان میں ہمدردی اور انسانیت، ترحم، مدارات اور شائستگی پیدا کرنے میں بھی اس کا بہت بڑا حصہ ہے" گورکی نے بھی تہذیب کے متعلق اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ انسانی تعلقات کو بہتر اور خوشگوار بنانے میں محبت نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

لیکن اس فلسفہ کے مطابق آپ مرزا شوق کی مثنوی "زہرِ عشق" کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ میں کوشش کے باوجود بھی اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکا۔ گو "بہارِ عشق" اور "زہرِ عشق" میں نمایاں فرق یہ ہے کہ مرزا شوق نے اس مثنوی میں بہارِ عشق کی طرح "عشق بازی" کے نسخے بیان نہیں کئے۔ اس میں ہیروئن سے کسی قسم کا دھوکا اور زبردستی بھی روا نہیں رکھی گئی۔ ہیروئن بھی اپنی مرضی سے عشق کا اظہار کرتی ہے، بلکہ اس کا عشق ہیرو سے زیادہ شدید ہے۔ یہاں تک کہ وہ جان دے دیتی ہے لیکن اس سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی۔ صرف چند اشعار کے علاوہ اس مثنوی سے عریانی اور فحاشی کا پہلو نہیں نکلتا۔ مگر یہ مثنوی بھی جیسا کہ اس وقت کی درباری اور سامنتی زندگی کا خاصہ تھا بہارِ عشق کی طرح مبالغہ اور تصنع سے بھری ہوئی ہے۔ بنیادی حقیقتوں کو زبان اور بیان کی خوبیوں پر بُری طرح قربان کیا گیا ہے۔ سامنتی روایت کے مطابق مثنوی خدا کی حمد سے شروع ہوتی ہے ؎

لکھ قلم پہلے حمدِ رب ودود — کہ ہر ایک جا پہ ہے وہی موجود
ذاتِ معبود حمد داں ہے — باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے
ہمسر اس کا نہیں نہ ہم نہیں — سب میں حادث کوئی قدیم نہیں

مرزا شوق سے مجھے یہ شکایت ہرگز نہیں کہ انھوں نے خدا کی حمد کیوں لکھی؟ شکایت یہ ہے کہ وہ مذہب کی پرانی روایت کے پابند ہیں اور جو شاعر مذہبی طور پر قدامت پسند ہے۔ اس سے محبت میں جاگیری روایت توڑنے کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ چنانچہ وہ "بیان عشق" میں بھی اسی قدامت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہے بنا جب سے گلشن ایجاد ۔۔۔ ہوئی ہر شے ہر ایک کو امداد
عشق سے کون ہے بشر خالی ۔۔۔ کر دیئے جس نے گھر کے گھر خالی
پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے ۔۔۔ ڈالتا ہے جگر میں یہ چھالے
جو کہ واقف تھے سب زمینوں سے ۔۔۔ خاک چھنوائی ان حسینوں سے
منہ سے کرنے نہ دو افغاں اس نے ۔۔۔ ماں چن چن کے نوجواں اس نے
مار ڈالا تماشبینوں کو ۔۔۔ زہر کھلوا دیا حسینوں کو

گویا جب سے دنیا بنی ہے۔ بادشاہ عشق کو تباہی اور بربادی برپا کرنے کا حق ملا ہوا۔ جو بے حرکت فلسفہ اور مبالغہ اس بیان میں نظر آتا ہے وہ ساری مثنوی میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق کی خانہ خرابیاں بیان کرنے کے لئے ہی یہ داستان گھڑی گئی ہے۔

جس طرح یہاں عشق کی مدح میں یہ اشعار لکھے گئے ہیں بہار عشق میں بادشاہ وقت کی مدح اس طرح کی گئی ہے۔

نوبت مدح شاہ آئی ہے ۔۔۔ اے قلم وقت جبہ سائی ہے
کر رقم اب دعائے شاہ زماں ۔۔۔ کہ ہے وہ ملک ہند کا سلطاں
آفتاب سپہر جاہ و حشم ۔۔۔ شاہ واجد علی شہ عالم

جناب عبدالماجد دریا آبادی نے اس مدح پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"یہ "شاہ زماں اور سلطان ہند اور شہ عالم اور آفتاب سپہر جاہ و حشم" کے خطابات اس وقت عطا ہو رہے ہیں۔ جب حکومت اور بادشاہت کے سارے اختیارات قیصر باغ کے حدود تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور اس چہار دیواری کے اندر بھی مجال نہ تھی کہ صاحب عالی شان (ریذیڈنٹ بہادر) کے حکم کے خلاف کوئی انگلی تک ہلا سکے۔"

آدمی کا جو طرز زندگی اور ماحول ہوتا ہے اسی کے مطابق اس کا شعور بنتا ہے۔ اس لئے مرزا شوق کے بارے میں بھی یہ معلوم کرنا مفید ہوگا کہ وہ کس قسم کے انسان تھے اور ان کا ماحول کیا تھا۔ شاہان اودھ سے ان کا خاندانی رشتہ تھا اور اس سلسلے میں ان کے نواسے احسن لکھنوی لکھتے ہیں:-

"چونکہ حکیم نواب مرزا صاحب بہت خوش باش، عیش پسند، اور رنگین مزاج تھے اس لئے حکیم مسیح الدولہ بہادر (چچازاد بھائی) نے انھیں دربار سے ہمیشہ علیحدہ رکھا اور معاملات کا علاج ان سے کبھی متعلق نہ کیا لیکن جب اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نواب مرزا صاحب کی رسائی دربار میں پورے طور پر ہوگئی۔ نواب واجد علی شاہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ۵۰۰ روپیہ ماہوار ان کا مشاہرہ مقرر تھا اور انعام و اکرام کی کوئی حد نہ تھی۔"

اس وقت کی نوابی زندگی کیا تھی۔ اس طبقہ کے لوگ کس طرح رنگ رلیوں اور کھیل تماشوں میں دن گذار رہے تھے اور دشمن کے ہاتھوں بے جان مہروں کی طرح پٹ رہے تھے۔ پریم چند نے اپنی کہانی "شطرنج کے کھلاڑی" میں اس کی بہت اچھی تصویر پیش کی ہے۔ چونکہ تدریجی انحطاط سے یہ طبقہ مر رہا تھا۔ اس لئے جس طرح بیمار آدمی کے لئے دودھ بھی زہر بن جاتا ہے عشق بھی اس طبقہ کے لئے زہر بن چکا تھا۔ چنانچہ مثنوی "زہر عشق" اسی زہر آلود عشق کی داستان ہے۔ اس میں عشق کا والہانہ جذبہ نہیں بلکہ مرزا نے اس داستان کے ذریعہ بگڑتے ہوئے طبقہ کی فرسودہ روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ بہار عشق کی طرح ہیرو کو پہلی نظر میں ہیروئن سے عشق ہو جاتا ہے۔ پھر [illegible]

ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ چھپ چھپ کے ہوتے ہیں اور لڑکی کا سوداگر باپ رسوائی کے ڈر سے ہیروئن کو بنارس بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ لڑکی اپنے عاشق کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ بنارس جانے کی بجائے مرجانے کا عہد کر لیتی ہے اور اپنے عاشق سے رخصتی ملاقات میں کہتی ہے۔ ؎

ہم اگر جان دیدیں کھا کے قسم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہچکولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پہ چلے آنا

مرجبین کی اس دردمندی کا جواب ہیرو یوں دیتا ہے۔ ؎

جان دے دو گی تم جو کھا کے قسم — میں بھی مرجاؤں گا خدا کی قسم
جو یہ دیکھے گا خوب روئے گا — آگے پیچھے جنازہ ہوئے گا

صرف یہی نہیں کہ بقول نیاز فتحپوری اس جواب سے صنعت، ظاہرداری، بے تاثری ظاہر ہو رہی ہے بلکہ ہیرو عاشق سے ناصح بن کر لڑکی کو سمجھاتا ہے کہ اگر ماں باپ تمہیں مجھ سے ملنے نہیں دیتے، یا وہ تمہیں بنارس بھیج رہے ہیں تو تم اس کا ملال نہ کرو کیونکہ والدین کا اولاد پر بڑا حق ہے۔

ہوں جو ناراض یہ قیامت ہے — ان کے قدموں کے نیچے جنت ہے
تم تو نام خدا سے ہو دانا — اس پہ رتبہ نہ ان کا پہچانا
غور سے کیجئے جو دل میں خیال — ان کا غصہ نہیں ہے جائے ملال

لڑکی اسی رات زہر کھا کر مرجاتی ہے اور پھر معشوقہ کے جنازے اور بعد ازاں عاشق کے زہر کھانے کا بیان اسی طرح مزے لے لے کر کیا گیا ہے جس طرح پہلی نظر میں عشق ہو جانے کا کیا گیا تھا۔ وہی صنعت اور ظاہرداری ہے۔ صرف بندش اور محاورے ہی کا خیال رکھا گیا ہے۔ مثلاً عاشق کے زہر کھانے پر لڑکی خواب میں آکر کہتی ہے۔ ؎

سُن تو رے تو نے زہر کیوں کھایا — کچھ وصیت کا بھی نہ پاس آیا
دل سے میرے بھلا دیا کہنا — ہاں یہی چاہئے تھا کیا کہنا

معشوقہ کا خواب میں آنا عاشق کے حق میں تریاق ہو گیا۔ ؎

زہر کا پھر نہ کچھ اثر پایا — اک تعب سا مجھ کو یہ آیا
آشنا دوست سب کا تھا یہ بیاں — مردے جی اُٹھے لو خدا کی شاں
ہو گیا والدین کو یہ سرور — بڑھ گیا دل کا چین چشم کا نور
اقربا سُن کے سب ہوئے دل شاد — آئے دینے لگے مبارکباد

گویا عشق کرنا اور زہر کھانا محض ایک سوانگ ہو، مدعا ایسی داستانوں سے دل بہلانا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میرزا شوق کی آپ بیتی ہے اور ان کے نواسے احسن لکھنوی کہتے ہیں کہ اس کی بنیاد ستارہ کا عشق تھا جسے اس کے خاوند نے گروی رکھ دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ بحث لاحاصل ہے خواہ اس کی بنیاد سچائی پر ہو۔ شاعر نے جس ڈھنگ سے یہ قصہ پیش کیا ہے اس سے وہ فرضی اور بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔ بلاشبہ زبان سادہ، چست اور رواں ہے لیکن میں شاعری اور کسی بھی صنعتِ فن کی سادگی یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں حقیقت کو سیدھے سادے ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہو، اس میں مبالغہ اور صنعت نہ ہو لیکن اس مختصر مثنوی میں مبالغہ اور تصنع کی بھرمار ہے، لڑکی، نوجوان اور اس کی ماں کا کردار اور واقعات غیر فطری ہیں۔ موت اور زیست کی چند باقی گھڑیوں میں معشوقہ جو تماشا ہر کرتی ہے وہ بالکل ناموزوں ہے اور اسی سے اس انحطاط پذیر طبقہ کی بے حسی کا پتہ چلتا ہے۔ جوں جوں موت کے سائے گہرے ہو رہے ہیں۔ یہ طبقہ زیادہ سے زیادہ عیش کوشیوں میں غلطاں ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو معشوقہ اپنے مرنے، عاشق کے زہر نہ کھانے اور جنازہ میں احباب کے جمع ہو جانے

کے بعد آنے کی بات کہہ رہی ہے اور دونوں غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اور پھر یکایک منظر بدلتا ہے ۔ ؎

چپ رہو عبث ہی روتے ہو — مفت کا ہے کو جان کھوتے ہو
سمجھو اس کو شب برات کی رات — ہم ہیں مہماں تمہارے رات کی رات
دل میں باقی رہے نہ کچھ ارماں — خوب مل لو گلے سے میں قرباں
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں — ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
گود میں اپنی پھر بٹھا لو جان — پھر گلے سے ہمیں لگا لو جان
پھر مرے سر پہ رکھ دو سر اپنا — گال پر رکھ دو گال پھر اپنا

کیا انسانی جذبات اس قدر میکانکی ہوتے ہیں؟ کیا یہاں پست قسم کے فحش جذبات برانگیختہ نہیں ہوتے؟ میں نہیں سمجھ سکا کہ مثنوی کس پہلو سے زندگی کو مہذب بناتی ہے؟

چنانچہ آپ نے جو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "مثنوی زہر عشق میں محبت کے گہرے جذبات کا اظہار، سچائی، درد اور بڑی انسانیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں ایسی محبت کے گہرے المیہ کا بڑی سادگی اور ہمدردی کے ساتھ اظہار کیا گیا ہے جس کے بارآور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا" میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ جہاں تک ماضی کی زندگی اور انسانیت سے بھرپور عشقیہ شاعری کو پسند کرنے کا سوال ہے۔ میں اسے پسند کرتا ہوں اور اپنی صلاحیت اور بساط کے مطابق اس سے متاثر اور مستفید بھی ہوتا ہوں۔ مثلاً "پنج تنتر" پر میرا مضمون آپ کی نظر سے گذرا ہوگا جبکہ اختر حسین رائے پوری نے اس کتاب کو اس لئے نکما کہا تھا کہ اس میں راجاؤں کے متعلق کہانیاں ہیں اور ہندوستان کے ۹۵ فی صدی کسانوں کا ذکر نہیں ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کی تاریخی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ اور اسی طرح میر تقی میر میرا بھی محبوب شاعر ہے۔ میں نے ۱۹۴۵ء میں کلیات میر کا مطالعہ بڑے شوق سے کیا تھا۔ اور بہت سے اشعار زبانی یاد ہو گئے تھے اور میں آپ سے اس بات پر متفق ہوں کہ ان کی شاعری کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ گہرے انسانی جذبات کا سچا اور حسین اظہار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ میر کو پڑھ کر انسان کی بلندی اور عظمت کا احساس مضبوط ہوتا ہے۔ لیکن شوق کو میر کی سطح پر رکھنا میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ کیونکہ شوق کا عشق انحطاط پذیر طبقہ کے بیمار رجحانات کا حامل ہے اور اس کی شاعری میں فحاشی، عریانی، عفونت اور قدامت پسندی کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ انسان کو بہتر بنانے کی بجائے بے حس بناتی ہے اور اس کی شاعری کی سمت ہماری بہترین ادبی روایات سے بالکل مختلف ہے۔

آپ نے جس اہم نکتہ کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے وہ واقعی بہت اہم ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ماضی کے ادیبوں، فن کاروں اور ان کی تخلیقات کی طرف ترقی پسند تحریک کا رویہ غلط رہا ہے۔ ہم انھیں جاگیری عہد کی پیداوار سمجھ کر مسترد کرتے رہے ہیں اور ابھی تک یہ غلط رجحان قائم ہے لیکن رجحان کو ختم کرنے کا یہ طریقہ میں درست نہیں سمجھتا کہ ماضی میں جس قدر ادبی تخلیقات ہوئی ہیں ہم انھیں اپنا بہترین تہذیبی سرمایہ مان لیں اور کہیں کہ اس میں کچھ بھی مسترد کرنے کے لائق نہیں ہے اور اس کا جائزہ لیتے وقت یہ ڈھنگ اختیار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا کہ محبت تہذیب اور فلسفہ کے ارتقاء کے مارکسی نظریہ کو الگ سے بیان کر دیا جائے اور پھر کسی ایک شاعر یا ادیب کو لے کر کہہ دیا جائے کہ وہ اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے اس لئے اس کی تہذیبی تخلیقات ہمارا بہترین تہذیبی سرمایہ ہے۔ اس میکانکی ڈھنگ سے ہم نے سیاست اور ادب میں اکثر غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اصولِ ارتقاء کو ذہن میں رکھیں پھر اپنے ماضی پر نظر ڈالیں اور شروع سے لے کر اب تک کے اپنے تاریخی، تہذیبی، اور ادبی سرمایہ کا جائزہ لیں تبھی ہم اس کی بہترین روایات اور غلط رجحانات کو سمجھنے سمجھانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ تبھی ہم وثوق کے ساتھ اسے قبول یا رد کر سکیں گے۔

بدقسمتی سے اب تک ایک غلطی یہ ہوتی آئی ہے اور ہو رہی ہے کہ اردو ادب کے نقاد اپنے جائزہ کو صرف اردو ادب تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ سنسکرت اور ہندی کے ذریعہ ہماری جو تہذیبی روایات قائم ہوئی ہیں انھیں اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی

دور کے مورخین ہمارے ملک کی تاریخ کی ابتدا مسلمانوں کی آمد سے سمجھ بیٹھے ہیں اور ماضی کی تاریخی روایات سے اس کا رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے جس کے باعث ہندو مسلم معاشرت الگ الگ رہی اور فرقہ پرستی کو پنپنے کا موقع ملا۔

"کہنے سے پیشتر کہ" مثنوی زہر عشق میں ایسی محبت کے گہرے المیہ کا اظہار کیا گیا ہے جس کے بار آور ہونے کی جاگیری سماج اجازت نہیں دیتا تھا" ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ جاگیری سماج اس وقت تاریخ کے کس دور میں پہنچ چکا تھا اور اس سماج سے انسان نے محبت اور اس کے اظہار کا حق کہاں تک منوا لیا تھا۔

اس سلسلے میں مجھے ایک بات تو یہ کہنی ہے کہ جاگیری سماج میں محبت اور اس کے اظہار کا ڈھنگ ایک نہیں رہا۔ جاگیری سماج نے اپنے تاریخی دور میں بہت سی منزلیں طے کی ہیں اور ہر منزل کے بعد جاگیرداری کا اپنا روپ بدلتا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی محبت اور اس کے اظہار کا ڈھنگ بھی بدلتا رہا ہے۔ دوسرے ہمارے دیس میں جاگیری سماج مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس نے قبائلی یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی جاگیرداری کی بجائے مرکزی شہنشاہیت کا کردار حاصل کر لیا تھا اور سارے ہندوستان میں ایک مرکزی شہنشاہیت قائم کرنے کی کوششیں جاری تھیں جسے صدیوں کی بے سود خونریزی کے بعد اکبر نے عملی جامہ پہنایا اور ہماری تاریخ میں ایک بار پھر ترقی اور خوشحالی کا دور شروع ہوا۔ تیسرے ہندوستان میں جاگیرداری کا کردار شروع ہی سے برطانیہ۔ فرانس اور دوسرے یورپین ممالک کی جاگیرداری سے مختلف رہا ہے۔ یورپ نے سولھویں سترھویں صدی کے اپنے نشاط ثانیہ میں جس قدیم یونانی تہذیب سے استفادہ کیا یونان کی اس ترقی کے زمانہ میں ہندوستان خود ایک ترقی یافتہ ملک رہا ہے اور اس کی اپنی تہذیب یونان کی تہذیب سے کسی طرح پچھڑی ہوئی نہیں تھی۔ یہ درست ہے کہ وسطی سماج کے ایک طبقہ تک محدود تھی لیکن اس تہذیب نے عورت کو سوئمبر کا حق دیا تھا اور محبت کا اظہار لگ بھگ کسی دور میں بھی ممنوع نہیں رہا۔ رامائن اور مہابھارت گو نہ میہ داستانیں ہیں لیکن ان میں محبت اور رومان کی کہانی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ان دونوں منظوم داستانوں میں زمانہ کا جو فرق ہے وہ محبت کے ضمن میں بھی نمایاں ہے۔ رامائن کی عورت اپنے خاوند کو دیوتا سمجھتی ہے اور صرف اس سے محبت کر سکتی ہے۔ لیکن مہابھارت کی عورت کسی بھی شخص سے محبت کرنے میں آزاد ہے۔ دراوتھا ایک ت ہے لیکن اسے اپنا خاوند پسند نہیں وہ کرشن سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ کالی داس نے محبت کو اور ہی انداز سے پیش ہوں کہ اس نے وشنیت (اور اس طرح پورے جاگیردار طبقہ) کی بے حسی اور عورت کو کھلونا بنا کر استعمال کرنے کے رجحان پر ٹھی کھوگئی تھی لیکن شکنتلا نے اپنا حسن اور نسائیت تو نہیں کھو دی تھی پھر اسے نہ پہچاننے کے کیا معنی؟ پھر سچ مچ دوت ہے والہانہ عشق کا قصہ کیا انسان کو محبت کے اظہار کا حق نہیں دیتا؟ کالی داس کے زمانہ میں بڑی حد تک مضبوط ہیت قائم ہو چکی تھی۔ 'مہابھارت' اگرچہ کچھ عرصہ بعد لکھی گئی لیکن اس دور میں زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کا بنیادی موضوع یت ہے اور اسی مقصد کے لئے کورکشیتر کی خونریز جنگ لڑی گئی تھی اور یہ کوشش انسان کا ترقی کی سمت قدم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گپتا دور میں ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کی بے حد ترقی ہوئی اور کالی داس جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا۔

مرکزی شہنشاہیت میں جاگیرداری اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے اور اس کا داخلی تضاد سرمایہ بھی تیزی سے بڑھتا ہے اور ہندوستان میں تجارتی سرمایہ (MERCHANT CAPITAL) مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی بہت ترقی کر چکا تھا۔ تجارتی سرمایہ کے ساتھ جو فلسفہ پیدا ہوتا ہے وہ تقدیر پرستی اور قدامت پسندی کے پرانے نظریات کو توڑتا ہے اور انسان میں عمل اور جہد کو ابھارتا ہے۔ مذہبی رواداری اور آزادی خیال کو سہارا دیتا ہے۔ اس فلسفہ کی نشوونما کے ساتھ محبت اور رومان کا روپ بھی بدلتا ہے۔ محبت کا یہ بدلا ہوا روپ ہمیں کالی داس کے ہاں ملتا ہے۔ اس لئے اس کی تخلیقات کو کلاسیکل حیثیت حاصل ہے۔

پھر بیرونی حملوں کے باعث تجارتی سرمایہ کی ترقی اور اسی لئے فلسفہ اور ادب کی ترقی رُک گئی اور قدامت پسندی اور وحشت نے اپنا سکہ جما لیا۔ لیکن یہ حالت ہمیشہ رہنے والی نہیں تھی۔ انسانیت کو خواہ کتنا ہی کچلا جائے اس کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی

تمنا ابدی اور لافانی ہے اسے کبھی کچلا یا مٹایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ہندوستان کے عوام نے جو صدیوں کی بے سود خونریزی سے عاجز آ چکے تھے اپنے اس جذبہ کا اظہار بھگتی یا صوفی تحریک میں کیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے اور دونوں ہی امن، خوشحالی اور رواداری کے متمنی تھے۔ چنانچہ بھگتی تحریک کے سنت کویوں اور صوفی شاعروں نے ہماری ادبی اور تہذیبی روایات کو آگے بڑھایا۔ تمام مغلیہ عہد میں ان ہی کویوں کے دم سے یہ روایات آگے بڑھتی رہیں۔ اکبر کا دین الٰہی بھی اس بھگتی تحریک کا ایک دوسرا روپ تھا۔ گو یہ مذہب تو قائم نہیں رہ سکا لیکن اس کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا یعنی لوگوں کو مذہبی برابری اور خوشحالی کا حق مل گیا۔ اور اس دور میں ادب، آرٹ اور فنون لطیفہ کی بے حد ترقی ہوئی۔ اس دور میں تلسی اور سور پیدا ہوئے رام اور کرشن کو ہیرو بنا کر محبت اور عشق کے قصے نئے ڈھنگ سے دہرائے گئے۔

اورنگ زیب کے زمانہ سے مغلیہ سامنت شاہی کا زوال شروع ہوا اور یہ زوال اس لئے شروع ہوا کہ ہندوستان کی تاریخ اپنے سامنتی دور سے گذر کر سرمایہ داری کے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ تجارتی سرمایہ صنعتی سرمایہ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ سامنتی مرکزیت کے نیچے دبی ہوئی قومیں ابھر رہی تھیں اور ان کا اپنا ادب اور آرٹ ترقی کر رہا تھا۔ مثلاً وارث شاہ نے ہیر رانجھا کی رومانی داستان میں پوری پنجابی قومیت کے کردار کو سمو دیا ہے اور شاعر نے اس قومیت کی نشو و نما میں حائل جاگیری قدروں پر بھرپور چوٹ کی ہے اسی لئے تقسیم کے باوجود ہیر وارث شاہ پنجاب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جھوم جھوم کر پڑھی جاتی ہے اور پنجاب کے عوام میں اس کی مقبولیت ہمیشہ بنی رہے گی بلکہ جوں جوں ان کا تہذیبی معیار بلند ہوگا۔ اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس عبوری دور میں ہماری تاریخی اور ادبی روایت یہ تھی کہ سامنت شاہی کے مقابلہ میں قومیتیں ابھر رہی تھیں سنت تکارام اور ودیاپتی وغیرہ میں بھی یہی کردار نمایاں ہیں اس لئے وہ مقبول ہیں لیکن اس عبوری دور میں فرانسیسی اور انگریز تاجروں کو یہ موقع ملا کہ وہ ملک کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر یہاں اپنا اقتدار قائم کریں۔ مرزا شوق کے زمانہ میں انگریز ملک گیر بہت بڑے حصہ پر اپنا اقتدار قائم کر چکے تھے اور اودھ کی نوابی ان کے سایۂ عاطفت میں زندہ تھی۔ وہ تو خود محتاج اور بے بس تھی۔ اس میں اتنی سکت کہاں تھی کہ انسان سے محبت کے اظہار کا حق چھین سکے۔ وہ تو خود اپنی بقا کے لئے قدامت پسندی میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی اور بہت ہی مصنوعی اور غیر حقیقی زندگی بسر کر رہی تھی۔ شوق بھی اسی طبقہ کے ایک فرد تھے اور انھوں نے اسی طبقہ کے غیر حقیقی اور مصنوعی عشق کی داستانیں بیان کی ہیں۔

شوق کی شاعری کو میں اس لئے اپنا تہذیبی سرمایہ قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ وہ عشق کے معاملہ میں بھی، انسان جس حد تک آگے بڑھ چکا تھا، اسے پیچھے لے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سلیم کے نور جہاں سے عشق کی بات لیجئے۔ وہ اس پہلی ہی نظر میں فریفتہ نہیں ہو گیا تھا بلکہ جب اس نے دوسرا کبوتر اڑا کر کہا تھا کہ پہلا کبوتر یوں اڑ گیا تب شہزادہ سلیم کو اس کے حسن میں ملاحت، کشش اور جاذبیت نظر آئی تھی یعنی وہ اس کے رنگ و روپ پر نہیں اس کی ادا اور بے باکی پر فریفتہ ہوا تھا۔ بعض تاریخ دانوں نے نور جہاں سے سلیم کی محبت کے قصہ کو سرے سے غلط بتایا ہے۔ لیکن خواہ یہ قصہ درست نہ ہو لیکن اس سے محبت کی روایت تو قائم ہوتی ہے اور رومان کے معاملہ میں انسان کے نئے شعور کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس مرزا شوق کا ہیرو دل ہتھیلی پر لئے گھومتا ہے اور کسی حسینہ کو محض ایک نظر دیکھ کر اس پر مرمٹتا ہے، آہیں بھرتا ہے غش پر غش آتے ہیں اور فحاشی اور عریانی کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ شریف زادیوں کو پھانسنا اور ان کے ساتھ زبردستی یا سنت ساجت سے اختلاط کرنا اس وقت کے نوابوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس وقت کے لکھنؤ میں مرزا شوق کی مثنوی مقبول رہی ہو۔ عوام میں بعض اوقات غلط رجحان بھی مقبول ہو جاتے ہیں لیکن ان کا اثر سنیما کے گانوں کی مانند دیرپا نہیں ہوتا اور اگر بعد ازاں برطانوی سامراجی اور لکھنؤ کے نوابین نے مرزا شوق کی مثنویوں کی طباعت اور اشاعت کو ممنوع قرار دیدیا تو بھی وہ ہمارا تہذیبی سرمایہ نہیں بن جاتیں کیونکہ کسی بھی حکمراں طبقہ کا ہر ایک فعل قابل مذمت اور عوام دشمن نہیں ہوتا۔ "لحاف" اور "کالی شلوار" کہانیوں پر انگریزی حکومت نے

فحاشی کا الزام لگایا تھا اور ان کے مضمون پر مقدمے چلائے تھے۔ آج ہم خود اس الزام کو درست سمجھتے ہیں۔ ہم سعادت حسن منٹو کی کہانی "ٹھنڈا گوشت" کو اس لئے اچھا نہیں کہیں گے کہ پاکستان کی حکومت نے اس پر مقدمہ چلایا ہے۔

بنے بھائی! چونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ دوسرے کی بات نہایت سنجیدگی اور متانت سے سنتے ہیں اور اس پر غور کرتے ہیں اس لئے ماضی کے تہذیبی سرمایہ اور شوق کی شاعری کے متعلق میں نے اپنے خیالات تفصیل سے بیان کرنے کی جرأت کی ہے جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن آپ اختلاف رائے کو گستاخی یا گناہ سمجھنے کی بجائے اسے انسان کا حق مانتے ہیں اس لئے میں توقع رکھتا ہوں کہ جب بھی آپ کو موقع ملا آپ میرے اس مضمون کو پوری توجہ سے پڑھیں گے اور اگر اس میں میری غلطی دیکھیں گے تو مجھے سمجھانے کے لئے پھر لکھیں گے۔

مشہور عوامی لیڈر سجاد ظہیر آج پاکستان کی جیل میں ہیں
اور آج سے اس سال پہلے
وہ ہندوستان کی جیل میں تھے
وہیں سینٹرل جیل لکھنؤ سے انھوں نے
اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو پیار بھرے خطوط لکھے

خطوط
- جن میں حسرتیں اور تشنہ کامیاں موجزن ہیں
- اور حسرتوں و تشنہ کامیوں کی دیوار پھاندنے کا عزم ہے
- اور ایک پُرجوش آئندہ مستقبل کی بھرپور ترجمانی ہے جس میں کسی خاوند اور بیوی کے درمیان جیل کی آہنی سلاخیں حائل نہ ہو سکیں گی۔

سجاد ظہیر کے وہ خطوط اب کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔

نقوشِ زندان

قیمت تین روپے بارہ آنے

ناروے کے نوبل پرائز یافتہ مصنف

نٹ ھیمسن

کا

سب سے مشہور ناول

بھوک

- جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے
- جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے
- جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بناتا ہے
- جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو کمربستہ کرتا ہے
- جس کا دنیا بھر کی چیدہ چیدہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے

مترجمہ: مخمور جالندھری
قیمت تین روپے

مکتبہ شاہراہ دہلی

فراق گورکھپوری

امریکی بنجارہ نامہ

مسدس ترکیب بند

(۱)

او امریکہ کے بنجارے کیوں دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا لشکر بڑا اسمرن کیا طیارہ کیا غبارا
کیا توپ ٹینک زہریلے گیس گرینیڈ دھواں انگارا
بجتا ہے موت کا نقارہ ہوتا ہے ترا وارا نیارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲)

کیوں موت کے ان ہتھیاروں کو اپنا بیوپار بناتا ہے
یہ منڈی منڈی دوکاں دوکاں کیوں توآگ بچھاتا ہے
کیوں خون سے سارے عالم کے تو اپنا دیا جلاتا ہے
خود گھر کے چراغ سے بنجارے سنتے ہیں کہ گھر پھنک جاتا ہے
یہ ایٹم بم ہائیڈروجن بم کر دیں گے تیرا بنٹارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۳)

یہ دنیا بھر میں کیسا تانا بانا پھیلا رکھا ہے
کس حق سے دنیا بھر میں اپنا حصہ بخرا کر رکھا ہے
کیوں دیش دیش کے کاروبار میں ساجھا باجھا رکھا ہے
ان چالوں سے کیا بچ جائیگا ان باتوں میں کیا رکھا ہے
بس دو دن کا یہ لینا دینا لیکھا جوکھا ہے سارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۴)

ہٹلر مسولینی ٹوجو کا جو حشر ہوا وہ دیکھ لیا
انگلینڈ میں ہو یا فرانس میں ہو مغرب ہو کہ مشرق کا خطا
اب اونچے سروں میں سرمائے کا راگ سنائی نہیں دیتا
اس ساز پہ ایسی چوٹ پڑی جس سے پھٹ جائے ہر پردا
پونجی کا پیانو[1] ٹوٹ چکا اب ہاتھ میں رہ گئے اکتارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

[1] پرنسپل بڈنٹ ٹرومین کو پیانو سے بڑا شغف ہے۔ فراق

(۵)

یہ موٹر جیپ رنگٹن پارکر بلیڈ جہازوں سروساماں
یہ لوہا لنگر ٹین ربڑ پیٹرول کروسن گیس دھواں
بجلی کے کھلونے گڑیا گڈے باجے لٹو اور ٹوپیاں
جب موت بڑھائیگی تیری دکاں کچھ بھی پلے نہ پڑیگا میاں
سب مال دھرا رہ جائے گا جب پیکِ اجل نے للکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۶)

یہ لپسٹک[1] پاوڈر ساس پکل یہ پشمینے یہ قیمتی فر
ننگی تصویروں کے البم زہریلا جنسی لٹریچر
اور ہالی وڈ کی فلموں کا وہ گندہ سڑا گلا کلچر
امریکی طرز زندگی کا یہ ٹیم ٹام یہ کرّ و فر
ہر گنہگار کا موت کے ہاتھوں ہو جاتا ہے نستارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۷)

کیا کوکا کولا مارگرین کیا اگ پوڈر کیا چاٹ چسک
کیا نائٹ کلب کیا نارکٹک افیوں کا دھواں کوکین مدک
کیا ٹرٹل سوپ، پکل، کافی کیا بیکن پورک شراب گزک
کیا تہذیب ایسی چٹوری بھی کیا تڑک بھڑک کیا چٹک مٹک
بے موت تجھے اس اگرم بگرم کھانے پینے نے مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

[1] LIPSTICK

(۸)

سوزاک آتشک گھیگا چیچک ہیضہ پلیگ مہاکاری
کوڑھ کنٹھ مالا سرطان جنوں لقوہ سوکھاری
ہر قوم تری ان سوغاتوں سے ہے اب جینے سے عاری
لے تیرے بھی دن آپہونچے ہشیار او موت کے بیوپاری
اب بپھری ہوئی دنیا کا برابر چڑھتا جاتا ہے پارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۹)

دنیا میں حشر اٹھا رکھا ہے ظالم تیری سیاست نے
دنیا کو سرے سے لوٹ رکھا ہے ظالم تیری تجارت نے
دنیا کو بھوکا مار رکھا ہے ظالم تیری کفالت نے
دنیا کو ذلیل بنا رکھا ہے ظالم تیری ذلالت نے
اک دن دنیا کو ٹھگنے کا مٹ جائے گا تیرا بیوپارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۰)

یہ نیگرو[2] بیٹنگ اور لنچنگ[3] ترے کردار میں شامل ہیں
ماؤں بہنوں بچوں کے لہو اس کاروبار میں شامل ہیں
یہ قتل و غارت ڈاکہ زنی تیرے بیوپار میں شامل ہیں
شیطان بھی جن پاپوں سے ڈرتے تیرے اطوار میں شامل ہیں
اب موت کی دیوی لینے والی ہے تیرے لہو کا چٹخارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

[2] NEGRO BAITING. [3] LYNCHING.

(۱۱)

کیا روس ہے ایسا بنجارہ؟ سامان تو اسکے پاس بھی ہے
کیا چین ہے ایسا بنجارہ؟ اس سے دنیا کو آس بھی ہے
صنعت حرفت دولت عزت نوجن[1] نسلوں کو راس بھی ہے
کس بل دیسوں میں ہے مگر کیا ان سے کسی کو ہراس بھی ہے
اک روز اجل کے ہاتھوں ترا کھل جائے نہ بھید بھرم سارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۲)

سُن او امریکی بنجارے؟ سنسار تری دوکان نہیں
روسی چینی بھی تاجر ہیں انسان ہیں وہ شیطان نہیں
ہے جن سے ان کا کاروبار جانیں ان کی ہلکان نہیں
یہ تیری سمجھ میں آجائے کیا اس کا کوئی امکان نہیں
ڈاکے سے کوئی دنیا میں پھلا؟ چوری سے کسی کو ہوا وارا؟
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۳)

تو ہندوستان اور پاکستان کو نرک بنا کر چھوڑ یگا
چل جائیں اگر تیری چالیں دونوں کو مٹا کر چھوڑ یگا
دونوں کو اجاڑ کے چھوڑ یگا ویران بنا کر چھوڑ یگا
دونوں کو چبا کر چھوڑے گا دونوں کو کھا کر چھوڑ یگا
لیکن یہ نوالے بن جائیں گے تیرے لئے سنگِ خارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۴)

جن قوموں کا تو مددگار بنتا ہے کیا تو ان کے یہاں
بھاری بھاری فیکٹریوں کے بننے کا دل سے ہے خواہاں
جن ملکوں کا تو ٹھیکیدار بنتا ہے اے دلال جہاں
ان میں بھی دولت برس پڑے اس بات کی تجھکو فکر کہاں
اے اپنے دوستوں کے دشمن لے موت نے وہ پھندا مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۵)

قتال کو ریا یاد رہے جب فیصلے کا وقت آئیگا
تاریخ کا سب سے بڑا مجرم انصاف تجھے ٹھہرائیگا
انسان بیک آواز تجھے پھانسی کا حکم سُنائے گا
وہ وقت اب آپہونچا ہے کہ تو خود اپنے لہو میں نہائیگا
جو موت کے مُنہ پہ چڑھ جائے اس کا بھی کسی میں ہے یارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۶)

جاپان کو ریا چین ملایا انڈونیشیا اور برما
یونان مصر کشمیر اور تبت یوگوسلیو یا آسٹریلیا
فلسطین موسول سیریا یورپ ایشیا افریقا
کس کس پر آنکھیں ہیں تری کچھ لالچ کی حد ہے بابا
دو گز ہی کفن ہاتھ آئے گا گو دنیا دنیا سر مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

[1] نوجن نسلوں۔ (NEW DEMOCRACIES) یورپ کی نئی اشتراکی جمہوریتیں

(۱۷)

دن رات وہی ڈالر ڈالر کب تک اس دھن میں مرو بابا
کب تک اس غم میں گھلو بابا کب تک یہ دھیان دھرو بابا
کچھ سوچو کچھ غور کرو کچھ اپنے جی میں ڈرو بابا
"اب موت نتارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا"
اٹھ جانا ہے تم کو دنیا سے دولت کا چھوڑ کے پشتارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۸)

بنجارے مشرق مغرب کو اپنا ہی دکھ کیا تھوڑا ہے
رجھے ڈالس آئرن ہا دران غنڈوں کو ان پر چھوڑا ہے
کیا دنیا بھر کو لوٹ کے اب بھی تجھے پیسوں کا توڑا ہے
کچھ روز اسے کر زہر مار دنیا کا لہو جو نچوڑا ہے
جمہور جہاں ان غنڈوں کو کر کے چھوڑیں گے ناکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۱۹)

یہ یو۔ان۔او میں عیاری یہ پھوٹ پھانس یہ دغل فصل
یہ حفظ امن کے پاکیزہ راضی نامے میں ردوبدل
یہ بین الاقوامی سازش یہ تاناشاہی چھل بل کل
یہ آگ دھواں یہ چنگاری یہ تیسری جنگ کے دل دل
پیغام اجل ہے تیرے لئے بجتا ہوا امن کا نقارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۰)

یہ ماڈرن ایڈیہ پیسیفک ایڈیہ لین دین رشتہ ناتا
بین الاقوامی بینک کا وہ شیطان کی آنت بھی کھاتا
یہ ڈالر سامراج کا احساں اتنو اٹھایا نہیں جاتا
دنیا کو اس کے حال پہ چھوڑ اب او دنیا کے اَن داتا
تجھ کو بھی اک دن لے ڈوبے گی قرض کی یہ بڑھتی دھارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۱)

اُلٹیں گی تیری سب تدبیریں پلٹیں گی جہاں کی تقدیریں
کیا تھام سکیں گی تعزیریں کیا روک سکیں گی زنجیریں
ٹوٹے گا یہ موت کا سناٹا جب بول اٹھیں گی تصویریں
اک دن چھن جائیں گی تجھ سے تیری سنگینیں شمشیریں
بھوکی اور ننگی جنتا کو وہ دیکھ اجل نے للکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۲)

دی طرح بہت دُنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں نے
کی تیری بدعتوں پر حیرت دیوانوں نے فرزانوں نے
گھائل سینوں میں زور بھرا پھر خون شدہ ارمانوں نے
او پنیترے باز اب دیکھے گا کڑیل بگڑیل جوانوں نے
دنیا کے اکھاڑے میں تجھ کو اک روز اٹھا کر دے مارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۳)

دنیا کو بنام آزادی تو دیتا ہے غنچے پر غنچے
دنیا بھر سے آزادی کے وعدے ہیں تیرے جھوٹے سچے
جو باتوں میں تیری آجائیں کچھ ایسے نہیں ہم بھی کچے
کیا قتلِ کوریا آزادی ہے او آزادی کے بچے
خود قیدِ زندگی سے تجھ کو دنیا دے گی اب چھٹکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۴)

جو بات بنائی تھی تو نے وہ بات بگڑنے والی ہے
جو بزم جمائی تھی تو نے وہ بزم اکھڑنے والی ہے
اب لٹے ہوئے ہاتھوں کی بغاوت زور پکڑنے والی ہے
بنجارے سر کی خیر منا بے بھاؤ کی پڑنے والی ہے
تارے نظر آئیں گے دن کو جب سر پہ بجے گا نقارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۵)

ایٹم بم چین پہ پھینکو گے بڑھ بڑھ کے بولنا کیوں بیٹا
امنِ عالم کے پیالے میں یہ زہر گھولنا کیوں بیٹا
بازارِ حیات میں موت کی یہ دوکان کھولنا کیوں بیٹا
تہذیب کی پھول سی قدروں کو کانٹوں میں تولنا کیوں بیٹا
ڈالر کی کرجا ندنی دو دن پھر اندھیارا پکھوارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۶)

بازارِ جہاں میں دیکھیں کب تک مچی رہے یہ لیو دیو
کب تک دنیا کے گلے کا پھندا تیرے قرضے کی جنیو[1]
دنیا کو مٹانے کی دھمکی یہ دیا بھاؤ یہ مہاسیو[2]
تیرا ہی ایٹم بم کرڈے گا سر پہ ترے بم مہادیو
وہ دن لدگئے کہ جپے اینڈتا دنیا بھر کا ہتیارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۷)

وہ دیکھ کہ اب دُنیا بھر میں مزدوروں کے دل سجتے ہیں
وہ سُن کہ ترے مظلوم کہیں شیروں کی طرح گرجتے ہیں
غصّے سے وہ چہرے دمکتے شعلوں سے وہ سینے سنجتے ہیں
وہ باغیوں کے لشکر میں کہیں اب کوچ کے ڈنکے بجتے ہیں
وہ اُڑے شرر و انقلاب کے کالے ناگ نے پھنکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

(۲۸)

میں وال اسٹریٹ کے سٹے بازوں کا اصلی روپ دکھاتا ہوں
اس حکمراں طبقے کے رُخ سے آج نقاب اٹھاتا ہوں
دنیا بھر میں اس پھیلے ہوئے خطرے سے تمہیں چوکاتا ہوں
امریکی بنجارہ نامہ گا گا کے فراق سُناتا ہوں
سب مل کے لگاؤ ان کے لئے اب مردہ باد کا اک نعرہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

---

[1] جنیو یا زنار کے تین سوت تین فرضوں کی نشانیاں ہیں۔ [2] مہاسیو = خدمت عظیم۔ [3] یہاں اس قافیہ کو میں نے جائز رکھا ہے۔ فراق

قتیل شفائی

تاجروں کے دیس میں

ایک خط کا جواب

ماں! ترے افلاس کے سب واہمے بیہودہ ہیں
میری پلکوں پر تیرے آنسو ابھی موجود ہیں

میرے سینے میں تری ہی بے بسی کا درد ہے
تیرے چہرے کی طرح میرا بھی چہرہ زرد ہے

چھین لایا ہوں اگر میں تجھ سے اپنے آپ کو
ٹوک سکتی ہے تری ممتا مرے اس پاپ کو

لیکن اے بھوکے بڑھاپے کی مقدس رازدار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار

دن ڈھلے رکھتا ہوں جب پہلا قدم دہلیز پر
تیر جاتی ہے نظر کی مردنی ہر چیز پر

رُخ پہ اطمینان کا بہروپ بھر لیتا ہوں میں
سو بہانے اپنی مجبوری سے کر لیتا ہوں

ماں۔ تری افسردگی ڈھلتی ہے جب تحریر میں
چیختی ہے زندگی اک بے صدا زنجیر میں

تو کچھ اَن دیکھے محلکوں سے بلاتی ہے مجھے
پھر بھی تیری خود فریبی ڈھونڈ لاتی ہے مجھے

بے مروّت فکر کی ہر بات سُن لیتی ہے تو
موتیوں کے نام پر کنکر بھی چُن لیتی ہے تو

تو سمجھتی ہے کہ میں اک شاعرِ مشہور ہوں
کون سمجھائے تجھے میں کس قدر مجبور ہوں

میرے بس میں ہو تو شہرت کی جوانی بیچ دوں
بھوک ہے عنوان جس کا وہ کہانی بیچ دوں

کون اس فن کو کرے گا جذب اپنی ذات میں
جو لگائے درد کے پیوند احساسات میں

ماں۔ اگر افلاس ہی وجہ کدورت ہے تجھے
تیری ہی مانند روٹی کی ضرورت ہے مجھے

تو نے پایا ہے اگر مجھ میں امارت کا سُراغ
تیری اس تحقیق سے لَو دے اُٹھے ہیں دل کے داغ

میری ہستی میں ازل سے پیار ہے شامل ترا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے ابھی تک دل ترا

تیرے خوں سے آج بھی رگ رگ مری سیراب ہے
جس کی میں تعبیر ہوں تو وہ منوّر خواب ہے

لیکن اے بھوکے بڑھاپے کی مقدّس راز دار
گھر پہ فاقے آج بھی کرتے ہیں میرا انتظار

دُور۔ کوسوں دُور تجھ سے علم و فن کے بھیس میں
بِک رہی ہے بھوک میری تاجروں کے دیس میں

ماں۔ ترے نزدیک جس نعمت کا شہرت نام ہے
تاجروں کے دیس میں وہ ایک جنسِ خام ہے

رات بھر جب ذہن میں بوتا ہوں فن پارہ کوئی
کاٹتا ہوں صبح دم ٹوٹا ہوا تارا کوئی

شام تک ہر روز جب کنگال ہو جاتا ہوں میں
آپ اپنے مال کا دلّال ہو جاتا ہوں میں

کوڑیوں کے مول بِک جاتے ہیں فن پارے مرے
بارہا پھینکے گئے کیچڑ پہ انگارے مرے

فن کے حُسنِ دلنشیں کو عام کر دیتا ہوں میں
پیٹ کی خاطر اسے نیلام کر دیتا ہوں میں

کون کہتا ہے مری تخلیق میرے ساتھ ہے
تاجروں کے ہاتھ میں شعر و ادب کا ہاتھ ہے

حسن اعرافی

امن

امن۔ شاداب وادی، ندّی کا ترنّم، مچلتی کرن
مہکی مہکی ہوا، لہکے لہکے سے بن، بہکے بہکے ہرن
پھیلی پھیلی چراگاہ، بھیڑوں کے ریوڑ، گڈریوں کے گیت
تیرے تیرے فضا میں کلنگوں کے نغمے، بیپیہوں کے گیت

امن۔ انسان کی محنت انہار میں جھلملاتی ہوئی
باغ سیراب ہوتے ہوئے، کھیتیاں لہلہاتی ہوئی
ڈالی ڈالی پھلوں سے لدی، کوٹلیں چہچہاتی ہوئی
بالیاں ٹمٹماتی ہوئی، زندگی مسکراتی ہوئی

امن۔ پنگھٹ پہ شامیں سویرے بہم، کنکناتی اُمنگ
جھجھکھاتی ہوئی گاگریں۔ جھنجھناتا ہوا جل ترنگ
ابروؤں کا تقاضا کہ شعلے کی مانند، گوری ملو!
گھونگھٹوں کا اشارا کہ بھولے صنم، چوری چوری ملو!

امن۔ بھیگی ہوئی رات، چھٹکی ہوئی چاندنی، نرم تسبیح
دو سلگتے شراروں سے ہوتی ہوئی دم بدم گرم سبیح
اور شبانہ کے ساغر کی گردش سے ملتا صبوحی کا دور
کپکپاتے لبوں پر یہی التجا: "ساقیا! اور، اور"!!

امن۔ ہیروں سی ہیروں کانیوں کی چھتری کے نیچے ہجوم
چوڑیوں کی کھنک، گھنگروؤں کی چھنک، چرخے چرخی کی دھم
پونی تکلے سے ٹکرائے، اکلا اُسے تار میں ڈھال دے
کاتنے والیوں کے بے آہنگ سپنوں کو سُر تال دے

امن۔ کرگہ، جلاہا جہاں نقرئی جال بُنتا رہے
رات دن آدمی کے بدن کیلئے ڈھال بُنتا رہے
آندھیوں کے جھولے میں جھولے اُمیدوں کے سپنے بُنے
اس کے من کی کلی مسکرائے، نویدوں کے سپنے بُنے

امن۔ کچا گھروندا، جہاں ہل بنے، ہل کا پھالا ڈھلے
فصل پھولے پھلے، کوٹھی کوٹھی بھرے، ہل چلے جگ پلے
اور چرسے پہ دوہے کی تانیں۔ کسانوں کے دل کا دھواں!
"جوڑیاں جگ نے وچ تھوڑیاں ہیلیا، جوڑیاں تھوڑیاں"

امن۔ دیہات و قصبات کی یہ تمنا کہ آگے بڑھیں!
برق رفتار شہروں کے شانوں سے شانے ملا کے بڑھیں
کھیت مزدور جاگیرداری کے بھس میں شرارے بھریں
کھیت پھیلائیں دامن کہ ان میں مشینیں طرارے بھریں

امن۔ چوپال کی دوپہر، غم لپکتی ہوئی شام کا
ہالیوں کے مشقت بھرے دن میں اک وقفۂ آرام کا
اک طرف دل کے شیشے کو دنیا کے غم چور کرتے ہوئے
اک طرف وارث و فضل جینے پہ مجبور کرتے ہوئے

امن۔ محنت کشوں کی تمنا کہ تہذیب پھولے پھلے
کارخانوں میں دنیائے نو کا اچھوتا سویرا ڈھلے
ذرّے ذرّے کے سینے میں جوشِ نمو کسمسانے لگے
زندگانی عروسِ نوی کی طرح مسکرانے لگے

امن۔ بھریوں سے دانے لپکتے ہوئے، دل اُچھلتے ہوئے
شام ہوتے ہی الغوزے بجتے ہوئے، گیت اُبلتے ہوئے
اور ڈھولک کی تھاپوں پہ دھرتی کی چھاتی دھڑکتی ہوئی
چاند کو دیکھ کر دل گرفتہ چکوریں پھڑکتی ہوئی!

امن۔ جمہور کا حقِ تحریک و تنظیم پیشہ وراں
ایک ایکا کہ غاصب پہ برسے ہزیمت کی برقِ تپاں
مفت خوروں کے حیلوں سے زحمت کشوں کو خلاصی ملے
وہ دکھائے کرامت جماعت کہ صحرا میں گلشن کھلے

امن۔ غلّے کے انبار، قند و شکر اور روئی کے ڈھیر
اللہ اللہ وہ بہتات، ہر شے ملے لال پیلے کی سیر
دودھ کی نہریں اور شہد لی ندیاں رقص کرتی ہوئی
زندگانی کی تصویر میں نت نئے رنگ بھرتی ہوئی

امن۔ کیا امن ہی سے یہ غدّاریاں امن کے نام پر؟
تیسری جنگ عالم کی تیاریاں امن کے نام پر؟
"دکھ کے ساتھی" سے اچھی وفاداریاں امن کے نام پر!
چاروں جانب سے دھاوے کی تیاریاں امن کے نام پر!!

امن خود امن کا جنگ سازوں کی چھاتی پہ چڑھ بیٹھنا
فاختاؤں کا خونخوار بازوں کی چھاتی پہ چڑھ بیٹھنا
تاجداروں کی مغرور کلغی کو قدموں تلے روندنا
ٹوپی ٹوپی میں مستور کلغی کو قدموں تلے روندنا

جگن ناتھ آزاد

اشعار

تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں

تری محفل سے جو ارمان و حسرت لے کے نکلا تھا
وہ حسرت لے کے آیا ہوں وہ ارماں لے کے آیا ہوں

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں

نگاہوں میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن
تفکّر میں جمالِ صبحِ تاباں لے کے آیا ہوں

اب اس کے ماسوا آزاد میرا بس کہاں تک ہے
اندھیری رات میں ذکرِ چراغاں لے کے آیا ہوں

لاہور (فروری ۱۹۵۱ء)

سید فیضی

میں شاعر نہیں!

فکر و احساس کا مارا ہوا اک انساں ہوں مگر
جس کے ٹوٹے ہوئے معصوم سے نازک دل پر
آج بھی ثبت ہیں اُبھری ہوئی چوٹوں کے نشاں!
اور لوگ ——
میرے آئینہ ہستی کی ضیا تابی میں
دیکھ کر عکس خود اپنا یہ سمجھ لیتے ہیں فنکار ہوں میں
کیا اسے ندرت تخیل کا اعجاز کہوں؟
یا گرانبارئ ذہن ——!!
سینکڑوں نغمے گھٹا بن کے برس پڑتے ہیں
نغمے —— ہنستے ہوئے، روتے ہوئے، مغموم، اداس!!

زندگی ایک ادا پر مفتوں!
کائنات ایک تبسم پہ نثار!!
نکہتیں بھی مری شاداب نگاہی کا فسوں
جیسے موجوں میں لرزتا ہوا پندارِ سکوں
جیسے بازیگرِ فطرت کا طلسمی ہیجان
پھیلتی راہوں میں دیوار سی حائل کر دے
جیسے خوابوں میں کوئی رنگ حقیقت بھر دے
کالی چادر پہ چمکتے ہوئے موتی —— اور میں

بکھری بکھری ہوئی زلفوں کے گھنے سایوں میں
لرزشِ موجۂ انوار سے تابندہ ہوں
مضمحل ہے یہ پُر اسرار خموشی —— لیکن
ایک ہنگامۂ محشر ہے بپا
کہیں ہنسنے کہیں رونے کی صدا ——
کتنی صدیوں سے مرے ذہن کی شورش کا مزاج
ان مسائل سے اُلجھتا ہی رہا!

قہقہے میرے ہیں اور بھیگے ہوئے یہ آنسو
غم کے ماتھے سے جو ٹپکے ہیں پسینہ بن کر
میرے ہیں۔ اور یہ فضائیں کہ جہاں
پھول کے ساتھ ہی کانٹے بھی لگے رہتے ہیں
جہاں طوفان بھی چشموں کی طرح بہتے ہیں
زخمۂ شوق سے چھڑتا ہے جہاں دل کا رباب
سسکیاں بن کے پگھلتا ہے جہاں عہدِ شباب
برق پاروں سے اُلجھتی ہے جہاں طبعِ رواں
چاند بھی اپنی جوانی کو لٹاتا ہے جہاں
اور مظلوم کی فریاد اُگلتی ہے دھواں
سب کے سب میرے ہیں۔ میں خالقِ رعنائی ہوں ——

مری آنکھوں میں دہکتی ہوئی زیبائی ہے
میں خدا ہوں۔ مری تخلیق میں پیدائی ہے
مرے ماحول نے فطرت سے جلا پائی ہے
مری جو بات ہے اعجازِ مسیحائی ہے
میرا ہر شعر وہ روتا ہوا نغمہ ہے۔ جسے
خلشِ خار سے بے وقت ہنسی آئی ہے
سسکیاں بھی مری چیخوں کا اثر رکھتی ہیں
اور یہ میرا تبسّم تو خدا جانے کیا ——

وقت بدلے کہ تڑپتا رہے فرسودہ نظام
اس چمکتے ہوئے سورج کی قسم!
میری قسمت ہے۔ سر افگندہ، خموش
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے طوفان لئے
اور ہاتھوں میں بغاوت کے نشاں
میں بھی منہ کھولے ہوئے غار کی جانب ہوں رواں!!

دیکھ یہ حلقۂ گرداب ہے یا موجیں ہیں
روز اُٹھتا ہے یہ طوفان مرے سینے میں
میں سمندر ہوں۔ سمندر تو مگر
گھٹتے بڑھتے ہوئے آسودۂ ساحل ہی رہا
اور میں؟

جانے کیا بات مری فطرتِ فن کار میں ہے
میں اگر چاہوں تو کانٹوں سے گذارا کر لوں
یہ بھی ممکن ہے سویرا ہو جائے
فرشِ مخمل پہ مجھے کروٹیں لیتے لیتے ——

مری آنکھیں نہیں۔ میں پیکرِ بینائی ہوں
راہ چلتے ہوئے۔ بڑھتے ہوئے لاکھوں منظر
(جن میں نیلام بھی شامل ہے مرے گیتوں کا)
چھوڑتے جاتے ہیں میرے لئے قدموں کے نشاں

مری آواز میں رس ہے۔ مری آہوں میں اثر
میں گنہگار نہیں ——
وہ شرر ہوں کہ مرے ذوقِ تپش کو پا کر
اک زمانہ مری مانند جلا کرتا ہے
میری ہر بات کو اپنی ہی کہا کرتا ہے
کون ہے جو مری پرواز کو محدود کہے
اور میں نے تو محبت کی ہے!!

مجروح سلطانپوری

○

ہوں، جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے

دیکھ ابرِ جنگ کے دامن کو اُلجھائے ہوئے
پیچ کھاتے ہیں فضا میں ہاتھ جھنجھلائے ہوئے

ق

خبط ہے اے ہمنشیں عقلِ حریفانِ بہار
ہے خزاں اِن کی، انہیں آئینہ دکھلائے ہوئے

کیا ہے ذکرِ آتش و اٹیم کہ غدّارانِ گل
مارتے ہیں ہاتھ انگاروں پہ گھبرائے ہوئے

کانپ کر سر سے زمیں پر گر پڑا خسرو کا تاج
بڑھ رہا ہے تیشہ زن کوہِ گراں ڈھائے ہوئے

زندگی کی قدر سیکھی شکریہ تیغِ ستم
ہاں ہمی تھے کل تلک جینے سے اُکتائے ہوئے

سیرِ ساحل کر چکے اے موجِ ساحل سر نہ مار
تجھ سے کیا بہلیں گے طوفانوں کے بہلائے ہوئے

ق

ہے یہی اک کاروبارِ نغمہ و مستی کہ ہم
یا زمیں پہ یا سرِ افلاک ہیں چھائے ہوئے

ساز اُٹھایا جب تو گراتے پھرے ذرّوں کے دل
جام ہاتھ آیا تو مہر و مہ کے ہمسائے ہوئے

دشت و در بننے کو ہیں مجروحؔ میدانِ بہار
آ رہی ہے فصلِ گل پرچم کو لہرائے ہوئے

امیں راحت چغتائی

○

جن کی کوشش سے تم ہوئے محبوب
وہی درویش آج ہیں معتوب

تیرا ہر کفر ضامنِ ایماں
میرا ایماں بھی کفر سے منسوب

دیکھتے ہی تمہیں نہ جانے کیوں
لوگ چُپ چاپ ہو گئے مجذوب

کون اظہارِ آرزو کرتا
گیت اُبھرتے ہی ہو گیا معتوب

زندگی لے رہی تھی انگڑائی
نخوتِ حُسن ہو گئی مغلوب

ابھی احساس میں کمی سی ہے
التفات اور کچھ غمِ محبوب!

راحتؔ اپنے وطن کی بات نہ پوچھ
پھول تو پھول، خار بھی مرغوب

احمد راہی

○

ویراں نگاہیوں کا یہاں کیا شمار ہے
ہر دل ستم کشِ غمِ لیل و نہار ہے

وہ موج جس نے بڑھ کے سفینہ ڈبو دیا
موجِ نگاہِ یار کی آئینہ دار ہے

میرا خلوص ایک تکلف سہی، مگر
تیرے کرم پہ بھی تو جہاں کا مدار ہے

جب صحنِ گلستاں کا یہ عالم ہے ہمنشیں
کیوں باغباں کو دعویٔ فصلِ بہار ہے

یہ اہلِ دل کے حالِ پریشاں سے پوچھئے
کیفِ وصال ہے کہ غمِ انتظار ہے

لُٹ کر بھی مطمئن سے ہیں کیوں اہلِ کارواں
کیا اب بھی رہنما پہ انھیں اعتبار ہے

سارے چمن کے خون سے سینچا گیا جسے
وہ ایک پھول میری نگاہوں میں خار ہے

راہیؔ یہ دامِ مرگ کوئی حادثہ نہیں
اک دستِ غیب برسوں سے مصروفِ کار ہے

ایک خفیہ سرکلر

فکر تونسوی

"کل ملک بدیشی سبھا" نے اپنی چھوٹی چھوٹی سبھاؤں کے پرنڈینٹوں اور سکریٹریوں کے نام ایک خفیہ سرکلر جاری کیا ہے۔ سرکلر میں سب سے اوپر یہ تُرّہ سُرخ سیاسی سے لکھا گیا ہے کہ

"یہ سرکلر سبھا کے کسی بھی عام ممبر کو نہ دکھایا جائے۔ کیونکہ عام ممبر عام فہم دماغ کے ہوتے ہیں اور ان پر بھروسہ کرنا سبھا کو تباہی کے گڑھے میں دھکیلنا ہے ــــــ"

لیکن وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ سرکلر ایک عام ممبر کے ہتے چڑھ گیا اور اس نے سبھا کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دیا یعنی اسے شائع کر دیا۔ اشاعت کے جرم میں پریس سیفٹی ایکٹ کے تحت اس عام ممبر کو نظر بند کر دیا گیا ہے (جو چوری کی سزا سے اس کی)

ہم وہ سرکلر من وعن نقل کر رہے ہیں :-

سبھا کے وفادارو!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ملک میں نئی حکومت چننے کے لئے انتخابات ہمارے سر پر آ پہنچے ہیں اور ان کو بھگتانے کے لئے چار و ناچار ہمیں اپنا "چناؤ نامہ" بھی شائع کرنا پڑا ہے۔ اگرچہ ہم نے اپنی طرف سے اڑچن چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ یہ طوفان ٹل جائے لیکن جب ٹلتا دکھائی نہیں دیا تو ہمیں بھی وہ "چناؤ نامہ" شائع کرنا پڑا جو آپ سے مشورہ کئے بغیر تیار کیا گیا تھا اور جو ملک کے اخبار دار نے چھاپ کر سبھا کے سامنے یہ مشکل پیدا کر دی کہ اب عام لوگوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ سبھا کے جس رہنما نے یہ چناؤ نامہ تیار کیا تھا اس کا بیان ہے کہ اس چناؤ نامہ کا ایک ایک لفظ اس کے تن بدن میں آگ لگاتا رہا ہے۔ الفاظ کی آنچ اتنی تیز تھی کہ لیڈر موصوف کا ایک ایک مسام گویا اُبلتا ہوا کڑھاؤ بنا ہوا تھا (اس کڑھاؤ پر چائے تیار ہو سکتی تھی لیکن لیڈر موصوف کے پاس اس امر کے ثبوت موجود تھے کہ وہ چند سالوں سے چائے کی بجائے رم پینے کی عادت پیدا کر چکا ہے)

خیر، جوں توں کر کے اس نے یہ چناؤ نامہ تیار کرایا۔ اسے اخباروں میں بھیجنے کے فوراً بعد سبھا کے چند بڑے رہنماؤں نے فوراً ایک ہنگامی میٹنگ بلا لی۔ اس میٹنگ کی کیفیت یہ تھی کہ ہر رہنما کے ہاتھ میں "چناؤ نامہ" کی ایک ایک کاپی تھی جو بید مجنوں کی طرح لرز رہی تھی، ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ساری محفل پت جھڑ کا درخت معلوم ہوتی تھی۔ بھٹی بھٹی آنکھوں سے ہر لیڈر دوسرے لیڈر کا چہرہ یوں تک رہا تھا جیسے ماتم پرسی کے لئے آیا ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ چناؤ نامہ نہیں ہے بلکہ ایک طوطا ہے جو ہاتھوں سے اُڑ گیا ہے

بارے اس غم واندوہ سے چور چور فضا کو اس لیڈر نے توڑا، جس نے یہ چناؤ نامہ تیار کیا تھا۔

"دوستو! پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں نے اس چناؤ نامہ کا توڑ بھی تلاش کر لیا ہے"

"توڑ پھوڑ کے سر میں خاک ڈالو۔ یہ چناؤ نامہ تیار کر کے تم نے اپنے دماغی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے" ایک ممبر چیخ اٹھا۔ اسکے گلے میں بلا کی طمانیت تھی۔

"تم لائق گردن زدنی ہو۔۔۔۔" دوسرے ممبر کے پہلو میں پستول لٹک رہا تھا۔

"لوگ ہمارا اٹیا پانچ کر دیں گے، جب ہم یہ وعدے پورے نہیں کریں گے" تیسرا ممبر رونے لگا۔

"ہاں ہاں، چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں" چوتھا ممبر صرف لنگوٹی پہنے ہوئے تھا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو میرے روتے چیختے دوستو! اپنے الفاظ واپس لو۔ کیونکہ میں نے جو توڑ تلاش کیا ہے، اسے سننے کے بعد ہمارے

چہرے پر ویسی ہی رونق آجائے گی جیسی کسی ایسے دوکاندار کے چہرے پر اس وقت آجاتی ہے جب وہ ویسی گھی میں بنا سپتی گھی ملا چکتا ہے ــــ" چنانچہ نامہ تیار کرنے والے لیڈر نے غصہ میں آکر کہا۔

چنانچہ اے سبھا کے وفادار دوستو!

ہم اس سرکلر کے ذریعہ آپ کو وہ توڑ بھیج رہے ہیں۔ یہ کچھ خاص ہدایتیں ہیں جو چناؤ نامہ کے خوفناک نتائج سے بچنے کے لئے ہم نے تیار کی ہیں۔ ان کی تیاری میں ہمیں امریکہ کی ایک موٹر کمپنی کے جنرل منیجر مسٹر..... (نام جان بوجھ کر نہیں لکھا جارہا) نے جو امداد دی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اُسے کوئی تحفہ بھیجنا چاہتے تھے لیکن پھر ہمارے معزز لیڈروں نے سوچا کہ اتنے بڑے آدمی کو تحفہ بھجوانے کی کیا ضرورت ہے، جو ہمارے ملک کو ایک موٹر سمجھ کر خرید سکتا ہے۔

ان ہدایتوں کو حرزِ جان بنا لیجئے، یعنی تعویذ کی طرح ہر وقت گردن میں لٹکائے پھریئے۔ بغل میں رکھئے تو زیادہ ڈپلومیٹک رہے گا کیونکہ جب "چناؤ نامہ" کی رام نام مالا جپی جارہی ہوگی اس نازک لمحہ میں ان ہدایات کی چھری کا بغل میں موجود رہنا ضروری ہو جائیگا۔ اگرچہ چھری اور رام نام کا بیک وقت حرکت میں رہنا اخلاقی طور پر نہایت قبیح اور گروہ فعل ہے۔ مگر انیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر کارل مارکس نے کہا تھا کہ اخلاق کی قدریں ذرائع پیداوار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ آپ کی اطلاع کے لئے ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس سال ذرائع پیداوار تبدیل ہوگئے ہیں یعنی اس سال ہمارے بڑے لیڈ نے بینک آف نیشن کے علاوہ بینک آف ڈیموکریسی کے حصے خرید لئے ہیں۔

اور اب لیجئے یہ ہدایات!

(۱) جو چناؤ نامہ پریس کے ذریعہ پبلک کے سامنے آچکا ہے، اُسے پبلک ہی کے پاس رہنے دیجئے۔ سبھا کے کسی ممبر کے پاس اس کی موجودگی ممنوع قرار دیدیجئے۔ ویسے پبلک سے بھی جس قدر کاپیاں حاصل کی جاسکیں کرلی جائیں۔ خرید کر، چُرا کر، پھسلا کر، ردی کاغذ کے بھیری والے تھیلیوں میں بھیج بھیج کر، کسی بھی ممکن اور نا ممکن ذریعہ سے حاصل کر کے انھیں نذرِ آتش کر دیا جائے تاکہ چند فی صدی تو خس کم جہاں پاک ہو جائیں۔

(۲) چناؤ کے مقاصد کو اسٹیجوں سے یوں پیش کیجئے جیسے ایک بڑی بلی نے چوہوں کے ایک بل پر جاکر صدا دی تھی کہ اب تم بلا کھٹکے بلوں کے باہر نکل آؤ۔ کیونکہ بلیوں اور چوہوں کے لیڈروں میں باہمی سمجھوتہ ہو گیا ہے جس کی رو سے کوئی بلی کسی چوہے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی (موسی بلی کو ہر جلسے میں اپنے ساتھ لے جاؤ)

(۳) آپ لوگ جب لوگوں کے سامنے اسٹیجوں اور جلسوں پر نمایاں ہوں گے، تو لوگ مارے حیرت کے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں گے کہ ہم ایک دم سے کہاں ٹپک پڑے، ہو سکتا ہے کہ کنڈیریوں کے سوکھے چھلکے، پھٹے پُرانے چیتھڑے، بیماریوں کے جراثیم، انسانی ہڈیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور اسی قسم کی دوسری جنگلی چیزیں اچھال اچھال کر پھینکیں اور کہیں کہ "کل ملک بدیشی سبھا" کو مارے شرم کے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ لیکن سبھا کے مقرروں اور ایڈیٹروں کو سمجھا دیجئے کہ وہ شرم دلانے والی ان حرکتوں کی مطلق پروا نہ کریں۔ بلکہ بڑے ڈھیٹ پنے کے ساتھ اپنی تقریریں جاری رکھیں۔ کیونکہ کامیابی کے لئے بنیادی چیزیں یہ تقریریں نہیں ہوں گی۔ تقریریں تو صرف دکھاوے والے دانت ہوں گے، کھانے والے دانت اپنا کام الگ جاری رکھیں گے۔ وفادار دوستو! افسوس کا مقام ہے جمہوریت کی روایتیں ہی کچھ اس ہے ڈھب طریقے پر وجود میں آتی رہیں کہ ہماری سبھا کے ہاتھیوں کو بھی تقریریں سیکھنا پڑیں۔

(۴) بہت سے لوگ جنھیں عام طور پر نزلہ اور زکام کا عارضہ رہتا ہے۔ سبھا کا نام سنتے ہی ناک بھوں چڑھائیں گے۔ اور کہیں گے کہ گئے برسوں میں ہماری حکومت نے کسی بھی عارضے کا علاج نہیں کیا۔ اُن کی ناک توڑنے کے لئے آپ مکّہ استعمال مت کیجئے گا (مکّہ چناؤ کے بعد استعمال کیا جائے گا) بلکہ نرم نرم انگلیوں سے مالش کیجئے اور ساتھ ہی ساتھ یہ منتر پڑھتے جایئے ــــ "سبھا الگ چیز ہے اور حکومت، الگ چیز۔ سبھا الگ چیز ہے اور حکومت الگ چیز"

(۵) بہت سے لوگ ہمیں عجیب عجیب مشورے دیں گے۔ چناؤ نامہ کی کئی خامیوں کو دُور کرنے کی تجویزیں بتائیں گے۔ آپ انھیں

بلاخوف وخطر قبول کرتے جائیے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کہیں کہ دریاؤں کا پانی خشک کر دیا جائے تو بھی بلیک کہہ دیجئے، اور اگر وہ تجویز کریں کہ فضلو نانبائی کو پریس الاٹ کر دیا جائے، تو بھی مان جائیے کیونکہ تسلیم و رضا ہمارا بنیادی اصول رہا ہے۔ اس سے لوگوں میں قناعت کا جذبہ مضبوط ہوتا ہے اور ہماری سبھا کو وہ طاقت مل جاتی ہے جس سے بعد میں ان شوروں اور تجویزوں کو چٹکی کا دودھ یا دودھ دلایا جا سکتا ہے۔

(۶) آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری سبھا پر آنے والے مصائب کو مدنظر رکھتے ہوئے، ہمارے ایک بہت بڑے رہنما نے حکومت سے ایک قانون پاس کروا لیا تھا، جس میں شہری آزادی کا ٹینٹوا دبا دیا گیا تھا۔ یہ قانون تم سب کے لئے اسم اعظم ثابت ہوگا۔ اس لئے سبھا کا ہر ممبر اپنے آپ کو نان آفیشل سی۔ آئی۔ ڈی کا نمائندہ تصور کر لے، اخبار کے ہر جلسے اور میٹنگ میں، ہر تھانہ میں، ہر کچہری میں، ہر اخبار کے دفتر میں وہ خدا کی طرح حاضر و ناظر بننا اپنا فرض ٹھہرائے۔ اخبار مان کی آسانی کے لئے ایسے مواقع بار بار بہم پہنچائیں گے، جن سے دو رپورٹیں تیار کر کے تھانوں میں بھجوا سکیں، یہ بات ذہن نشین رکھئے کہ اس قانون کے متعلق اخبار ہمیشہ یہی کہتے رہیں گے کہ یہ چنا ڈسٹنٹ ہے۔ اور آپ کا کمال یہی ہوگا کہ آپ اسے سٹنٹ تسلیم کر لینے کی کمزوری نہ دکھائیں۔ اور اگر آپ کا کوئی ممبر بل بھر کے لئے بھی شہری آزادی کے تصور کی لپیٹ میں آگیا تو آپ کی سبھا کو معطل کر دیا جائیگا اور اس کا سارا نظم و نسق مرکزی سبھا کا پردھان اپنے ہاتھوں میں لے لے گا۔ صحیح حد تک غلط بات کو تسلیم کر لینے کی سزا اس سے کم نہیں دیا جا سکتی۔

(۷) آپ کے علاقے میں سے ہماری سبھا کی طرف سے کس کو نمائندہ کھڑا کیا جائیگا؟ یہ سوال اتنا اہم ہے، جتنا کسی دکان کے لئے سیلز مین رکھنے کا سوال اہم ہوتا ہے۔ بہت سی چھوٹی سبھائیں اس معاملہ میں پھر جمہوریت، آزادی اور مساوی حقوق کا غچہ کھا جائیں گی۔ اور وہ ہماری سبھا کا کانسٹی ٹیوشن غچہ دیتے میں پہلے پردھے کا کام کرے گا (یہ بھلا کہاں کا کانسٹی ٹیوشن ہے دوستو) اسی لئے ہم نیچے چند ایسے خصائص درج کر رہے ہیں، جن کی روشنی میں آپ کو نمائندہ کھڑا کرنے میں آسانی رہے گی:-

(ا) وہ لاکھوں میں ایک ہو۔ ایسے آدمی آپ کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں، راجوں اور شہزادوں میں ہی مل سکیں گے اور کہیں تلاش کرنا وقت اور آدرش کو ضائع کرنا ہے۔

(ب) اس نے کم از کم دو ہفتے پہلے گاؤں کے جولاہے کا بُنا ہوا کھدر کا لباس استعمال کرنا برداشت کر لیا ہو۔ اس خوشی میں سارے جولاہے اُسے اپنے اپنے ووٹ دیں گے اور سکھ کا سانس لیں گے۔

(ج) غلامی کے دور میں اپنا زیادہ تر وقت حکمرانوں کے ساتھ شکار کھیلنے میں بسر کرتا رہا ہو اور اب بھی ایسا کرنے کے لئے انکار نہ کرے اس سے تصدیق کرا لیجئے کہ وہ شکار کھیلنے میں صرف پرندوں اور جانوروں کی قید تو نہیں لگانا چاہے گا، سمجھا ایسے آدمیوں کو مشکوک سمجھتی ہے جو شکار میں انسانوں ایسے لذیذ شکار کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(د) شطرنج کھیلنا، بٹیر پالنا، کبوتر اُڑانا، عصمتیں اور فصلیں لوٹنا، چوروں کو پناہ دینا، پانی میں لہو ملا کر پینا، اور پہلوانی کے اکھاڑے کھلوانا۔ یہ اس کے محبوب اور نسلی شغل ہونے چاہئیں۔ آخری شغل اس لئے ضروری ہے، کیونکہ سبھا اپنے ملک کے نوجوانوں کو پہلوان بنا کر غیر ممالک سے چند سو دے کرنا چاہتی ہے۔

(س) ہو سکتا ہے، کہ ایسے آدمی چنا ڈوالے دن لندن، نیویارک یا پیرس کے کسی ڈانسنگ کلب میں جمہوری عشرت کی داد دے رہے ہوں، لیکن اس بات پہ گھبرانے یا لوگوں کے بھڑے میں آجانے کی ضرورت نہیں بلکہ انھیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے نمائندہ کی حیثیت بین الاقوامی ہے۔

(ص) ایسے آدمیوں کے پاس کتوں کا اسٹاک ضرور ہونا چاہیئے، اگر کتے تعداد میں کم ہوں، تو اُسے کہہ کر فوراً خرید لئے جائیں۔ کتوں کا بھونکنا نمائندہ کی آواز کو دُور دُور تک پہنچا دیگا۔ کبھی کبھی یہ کتے کاٹ کھانے کو بھی دوڑیں گے۔ ان کے لگائے ہوئے ایک ایک زخم کو ایک ایک ووٹ سمجھئے۔

(ل) وہ چند امور کے ساتھ دشمنی رکھنے میں ید طولیٰ رکھتا ہو، مثلاً تقریر کرنا، شراب میں سوڈا ملا کر پینا، ایک بیوی پر قناعت کرنا، ڈیلی

اخبار پڑھنا، سوویت یونین کا ریڈیو سننا وغیرہ وغیرہ وغیرہ۔

(د) قومی ترانے کا کم از کم پہلا لفظ اُسے ضرور یاد ہو۔

(ہ) نظموں کا ایک دیوان [illegible] کا ایک مجموعہ، انٹرنیشنل سیاست پر کوئی کتاب اس کے نام سے ضرور چھپی ہوئی موجود ہو۔ کسی روزانہ اخبار کا سپورٹنگ ایڈیٹر، کسی فلم کمپنی کا پروڈیوسر ڈائرکٹر اور کسی دھارمک انجمن کا صدر ضرور ہو۔ یہی تہذیبی اعتبار سے اس کے نام کا ڈنکا بج رہا ہو تاکہ ہم اسے اپنے ملکی کلچر کی نمائندگی کے لئے بین الاقوامی فنکشنوں میں بلا کھٹکے بھیج سکیں۔ آپ ٹھہرا کر سوچیں گے کہ یہ آخری شرط بڑی کڑوی ہے اور ہم کہیں گے، یہ شرط ہی سب سے آسان ہے۔ دوستو! کلچر، سگریٹ کا ایک کش ہے۔ جیب سے ایک آنہ نکالو اور کہیں سے بھی سگریٹ خرید لو۔

(۸) اخبار اور پولیس ــــ دوستو! ان دونوں چیزوں کو الہ دین کے دو چراغ سمجھو۔ ہم الہ دین کے بے حد احسان مند ہیں کہ وہ ہمارا ملک چھوڑتے وقت یہ دونوں چراغ ہماری سبھا کو دے گیا تھا۔ جن سے ہماری آنکھوں میں نور اور دماغوں میں غرور اور غلیظتوں میں فتور آگیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مارکیٹ میں چند نئے چراغ جلتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ ان میں سے بہت سے چراغ بجھا دیں۔ کئی ایک میں اپنی طرف سے تیل ڈال دیں۔ کئی ایک چراغ جو بظاہر ہمارے جنم کے بیری نظر آئیں گے، انھیں مت چھیڑیئے۔ اور چند ایک جو پکے رہبر انھیں جلتا ہی رہنے دیں۔ چند چنچے ہمارا بھاڑ نہیں پھوڑ لیں گے۔

(۹) ہمارے ملک میں بھانت بھانت کے لوگ رہتے ہیں، جن کی دم میں پچھلے سال سے ووٹ کا جھلا لگ گیا ہے۔ ان بھانت بھانت کے لوگوں کے پاس بھانت بھانت کے بہروپ بنا کر جانا پڑے گا۔ مثال کے طور پر ریڑھی والے سے کہو کہ تمہاری ریڑھی کے پہیے چاندی کے بنائے جائیں گے اور چاندی سونے کے جوہری سے کہو کہ ہم تمہیں ریڑھی پہ لگی ہوئی چاندی چھین کر لا دیں گے۔ اسی طرح مرغی کو باز سے بچانے کے لئے کہو کہ باز کو اڈے سیلائی کرنے والا ٹھیکیدار بنا دو۔ کسی درمیانے درجے کے کسان کی لڑکی کے خاوند کو کسی سیٹھ کے قرضی کی ادائیگی کے سلسلہ میں گرفتار کرا دو۔ اور گرفتار شدہ خاوند کے وکیل کو فیس کے روپے پیسے دے کر اپیل کرا دو۔ اور یوں سبھی دھڑوں کو چاروں طرف سے گھیر گھار کر سب کے نمائندہ کے گرد اکٹھا کر دو اور اس طرح ایک وسیع متحدہ محاذ بنا کر نئے چین کی مثال قائم کرو۔ کیونکہ سُنا ہے نئے چین والوں کو اپنے وسیع متحدہ محاذ پہ بڑا ناز ہے۔ ہمیں یہ ناز توڑنا ہے کامریڈ سبھا جیو!

(۱۰) خرید، خرید ــــ چناؤ کے دن۔ ان میں یہ ہمارا بنیادی نعرہ ہوگا۔ یہاں جس ملک کے ساتھ ہمارا واسطہ پڑ رہا ہے۔ وہ بڑے بوڑھوں کی برکت سے ابھی تک اپنے لئے فرد ختنی کی ایک منڈی بنا ہوا ہے۔ اور چناؤ میں تو ان استعمار کی فرد ختنی نگاہ میں ایک دلفریب التجا پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے پاس اللہ پرماتما کے فضل سے گذشتہ کئی سالوں کی دولت موجود ہے جو تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر حاصل کی۔ تو دوستو! اس دولت کو کچھ دنوں کیلئے لوٹنے پر کمربستہ ہو جاؤ۔ یہ تاریخ کا نازک ترین وقت ہے۔ اخبار کی نیت نیک دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے دم سادھ کر آدھا دھن بانٹ دیجئے، ورنہ سارا دھن جائے گا۔ اور ہمارے باپ دادا کی روحیں الگ نوحہ خواں ہوں گی۔ خریدو! ہر قیمت پہ، ہر داؤ پہ اور ہر ڈھنگ سے خریدو کہ یہاں خریدار ہی قسمت ہوگیں۔ کوڑا کرکٹ خریدو۔ سڑی بسی سبزیاں خریدو۔ اُترے ہوئے بوسیدہ جوتے خریدو۔ میلے کچیلے چیتھڑے خریدو۔ سفید دھوتیاں ڈھیلے پاجامے، لٹھے کی شلواریں اور بیش قیمت قالین خریدو۔ ہر چیز کی قیمت الگ الگ دو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ تجارت کا بنیادی اصول ہے منڈی میں بھاؤ دیکھ کر بولو دو۔ رنگ پچھانو، ہونٹوں کی لپکی پہچانو، بینٹ چھوڑ دو، ہوا میں رچی ہوئی خوشبو سونگھو، اور پھر اپنے سکے کی وہ چوٹ لگاؤ کہ وہ ٹبلاتا ہوا تمہارے قدموں پر آگرے۔ ہر نکڑ پر، ہر راستے پر ہر حربہ، ہر پکڑ سے ہوشیار رہو۔ روپے کی ایک ایسی خیرہ کن اور مستحکم دیوار بن جاؤ جسے کوئی لانگھ نہ سکے۔ روپیہ تمہارا مانی ہے، روپیہ تمہارا حال ہے اور مستقبل بھی تمہارے لئے جو چیز گھڑ رہا ہے وہ روپیہ ہی ہے اے دوستو!

تو اے وفادار سبھائی دوستو!

ہماری ہدایتیں تو ختم ہوئیں۔ اور اگر اس سرکلر کے پہنچنے تک آپ کی وفا میں دم باقی ہو اور آپ لوگوں سے ڈر کر سبھا کا دفتر چھوڑ کر بھاگ

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ ہو)

خوشوں کے سائے

سنتوکھ سنگھ دھیر

گیہوں کی چنی ہوئی زرد بالیوں کو بھانو نے ایک کونے میں لا کر ڈھیر کر دیا۔

آنگن میں بیٹھے جوتے بناتے ہوئے بچن نے ایک نظر اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ بیساکھ کی تپتی ہوئی دوپہر نے اس کے نرم و نازک جسم کو جھلس کے رکھ دیا تھا۔ گیہوں کے کٹے ہوئے کھیتوں کی سی اُداسی اس کی آنکھوں میں چھائی ہوئی تھی۔ بھانو ماسے ستم کے سکڑتی جا رہی تھی۔ اس کے گالوں پر نیلے نیلے داغ نمایاں ہو رہے تھے۔ اور قمیص کے جیتھڑوں میں سے اس کی چھاتیوں پر ناخنوں کی خراشیں جھانک رہی تھیں۔

تلے کی سلائی جڑتے ہوئے بچن نے زور سے ٹانکا کھینچا۔ مضبوط رسّی ٹوٹ گئی اور اس نے جوتے کو ہاتھ سے پرے پھینک دیا۔

"جلدی آ جایا کر بھانو ....." بچن صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"میں بھیا بالیاں چننے نہیں جایا کروں گی ....." بھانو پھوٹ پڑی اور گرم گرم آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"اے چھوکری ۔ بھانو، بالیوں کو اندر بیٹھ کر اوکھلی میں کوٹ لے ۔ سمجھ میں کر جون چلانا ہے" ماں نے کہا۔ وہ بات کو ٹالنا چاہتی تھی۔ ایسی ذرا ذرا سی باتوں کو مردوں کے کانوں تک کاہے کو پہنچانا۔ اچھوتوں کے ساتھ تو قدیم ہی سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

بھانو اندر کوٹھڑی میں چلی گئی۔

بچن پتھر کی طرح خاموش، زہر آلود نگاہوں سے خلا میں گھورتا رہا ۔۔۔ اس کے گھرانے کی پسماندہ زندگی کی کئی اندھیری صدیاں، بھانو کی شکل میں، اس کی آنکھوں میں سے گزر گئیں۔ اس نے تخیل میں دیکھا۔ کیسے یہ وسیع دھرتیاں فصلوں میں چھپ جاتی ہونگی اور پھر کٹائی شروع ہوتی ہوگی۔ پُر رکھے کمین جن کرانِ پر مزدوریاں کرتے ہوں گے۔ مسلّے چننے والی کتنی لڑکیاں، بھانو کی طرح رزق کا ایک ایک دانہ ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ جہاں جٹ بھی کام کرتے ہوں گے۔ مگر جاٹ جاٹ ہیں اور کمین کمین

برلی ہوا میں کوؤں کی گلی کی طرف سے کپوان پکنے کی خوشبو آئی اور نئی فصل کے کھیتوں کی آواز۔

بچن نے کونے میں پڑی ہوئی سِلّے کی زرد بالیوں کی طرف دیکھا ۔ پرائے کھیتوں میں سے کٹواری بہن کو عصمت کے بدلے نصیب ہوئی بالیاں۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ بالیوں کو جلا ڈالے ..... مگر بالیوں کے بوجھ میں ایک جون کے دانے تھے۔

بچن اوڑے پر سے اُٹھا۔ آنگن میں چلتا ہوا دروازے تک پہنچا اور بند ہو رہے کواڑ کو کھول کر زور سے دروازے کے پہلو پر دے مارا اور دہلیز پار کر کے گلی گلی چل پڑا۔

بچن کے اندر بھوس میں چھپی ہوئی چنگاری کی طرح غیرت جاگ پڑی۔ غیرت! جو کبھی اس کے دادا میں جاگی تھی۔ جب گاؤں میں جاندوں کی بیماری پھیلنے سے اس نے بیگار میں مردار اُٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور جاٹوں کے لڑکوں نے چوپال میں بلا کر اس کی گردن پہ گھونسے رسید کئے تھے "کتے، چمار۔ پر دہت لگ رہا ہے تو ہمارا ...؟ فصل (فصل گاؤں سے لاگ نہیں توڑتا۔ اتو کے تخم .....!"

اور غیرت جو پھر اس کے باپ میں جاگی تھی۔ گاؤں میں قلعہ والے سردار نے کہیں شادی میں شریک ہونا تھا اور اس نے بچن کے باپ کو ایک زری دار مخملیں جوتا بنانے کو کہا تھا لیکن عین وقت پہ اس کی ماں مر گئی اور جوتا نہ بن سکا۔ اور وقت پہ جوتا تیار نہ پا کر سردار کے جیسے آگ لگ گئی۔ "حرامی نے مزا ہی کر کرا کر دیا" اور اس نے اسی جوتے کا تلا زور سے اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

وہی غیرت آج بچن میں جاگ اُٹھی تھی۔

گاؤں کے پرلے سرے بڑھئی کے کارخانے کے پاس بلبیر کھڑا تھا۔ بلبیر اس کے گاؤں کا لڑکا تھا۔ اور لدھیانہ میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا جسے بڑھی ہوئی فیسوں کے خلاف ہڑتال کرانے کے جرم میں کالج سے نکال دیا گیا تھا۔ بلبیر کے ساتھ بچن کا پہلے سے بھی اٹھنا بیٹھنا تھا۔ گو رکھی کی کتنی نئی نئی کتابیں اور پرچے وہ اسے پڑھنے کے لئے دیا کرتا تھا اور خود بھی امیری، غریبی اور اونچ نیچ کی تمام وجوہات اسے سمجھایا کرتا تھا۔ بچن کو بلبیر اس وقت سے بہت اچھا لگتا تھا جب ایک روز گاؤں میں سے وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے جھومتے ہوئے گذر رہے تھے اور چودھری نے چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا: "بلبیر سنگھ، تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیئے۔ جاٹ کا لڑکا ہو کر بھنگی چماروں کے ساتھ ....." اور بلبیر نے ایک دم غصہ میں آ کر کہا تھا: "بک نہ بے۔ بڑا آیا چودھری۔ خبردار جو آئندہ میرے ساتھ اس طرح سے کلام کیا"

بچن چپ چاپ بلبیر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بلبیر نے بچن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر پُراسرار نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر آہستہ سے پوچھا:

"کیوں بھئی بچن کیسے ہو آج .....؟"

بچن خاموش رہا۔

"بات کیا ہے .....؟" بلبیر نے پھر پوچھا۔

بچن پھر بھی نہ بولا۔ بلبیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بچن کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ وہاں سے چل پڑے۔

"سُنا ہے کل کوئی جلسہ ولسہ ہے گاؤں میں ....؟" ہل کی ہتھی بنوانے کے لئے آئے ہوئے کسان نے دُور جاتے ہوئے بلبیر اور بچن کی پیٹھوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"ایں ..... ہیں۔ لوگوں سے ٹکا نہیں جاتا۔ ہر کوئی ایرا غیرا دُم اکڑائے پھر رہا ہے" سوراخ میں ہتھی ٹھونستے ہوئے بڈھے مستری نے بسولا چلاتے ہوئے کہا:

"چودھری کوئی کسی کو کھاتے پیتے دیکھ کر خوش نہیں ....." کارخانے کے کنوئیں پر نہاتے ہوئے پھوکھتری نے کان اُٹھائے گاؤں بھر میں جس کی ساہوکاری چل رہی تھی "..... بھلا کبھی پانچوں انگلیاں برابر ہوئی ہیں؟ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ اور پھر یہ تو قدیم سے ریت چلی آتی ہے۔ امیر امیر ہے، غریب غریب" اور وہ دھوتی نچوڑ کر دامن سے منہ پونچھنے لگا۔

کسان نے اس کی بات پر تھوڑا سا سر ہلا دیا۔

پھلاہیوں والے کنوئیں پر، گاؤں سے میل بھر دُور پہنچ کر بچن اور بلبیر رک گئے۔ وہ جوان پہلے سے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔

"ہم کب سے انتظار کر رہے ہیں" ایک نوجوان نے مکا بنا کر بازو پھیلاتے ہوئے ملاقات کی خوشی کا اظہار کیا۔ اتنے میں تین چار اور ساتھی چاروں طرف کی پگ ڈنڈیوں اور کھیتوں میں سے آ نکلے۔

دن ڈوب گیا۔

کسان اور چرواہے کھیتوں اور چراگاہوں میں سے گیاؤں کی جانب چل پڑے۔

فصلوں کو درانتی لگے ابھی دو ایک روز ہی ہوئے تھے۔ کنوئیں کے چاروں طرف گیہوں کے پکے ہوئے کھیت دیواروں کی طرح کھڑے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا میں خوشے سرسرا رہے تھے۔

"ہمارا ایک اور بہترین ساتھی بچن سنگھ" بلبیر نے بچن کا سب سے تعارف کروایا۔ نئے واقف کاروں نے اسے اپنے بیچ میں آیا دیکھ کر طاقت محسوس کی۔ کنوئیں کی پیڑھی کے ساتھ اُگی ہوئی سبز گھاس پہ سب جنے اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کبھی کبھی کوئی ایک کھڑا ہو کر فصلوں کی اتھاہ چھاتی پہ سے چاروں طرف کو جھانک لیتا۔

"کل ہماری کامیابی کچھ مشکل نظر آ رہی ہے ....." بلبیر نے دھیمی آواز میں بات شروع کی ....." گاؤں میں مخالف دھڑا بڑی کمینی

حرکتوں پر اُتر آیا ہے ....."

"تو کیا ہم کانفرنس نہ کریں گے ....؟" کامریڈ گھن سنگھ ذرا جوش میں آکر بولا۔

"میرا مطلب یہ نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ ہمیں نہایت سوچ سمجھ کر، منظم طریقہ سے قدم اٹھانا چاہیئے۔"

"بلبیر کا خیال درست ہے" ساتھی ستیہ پال نے تائید کی "کیونکہ پولیس بڑی تیاری کے ساتھ کافی تعداد میں پہنچ رہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی سازش بناکر آئے" ستیہ پال پولیس کے پروگرام کا پورا پورا بھید نے کرا بھی لدھیانہ سے آرہا تھا۔

"تو پھر ہم نے کون سی چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟" ساتھی مدن جیت بھڑک اُٹھا۔

"نہیں ساتھی، ہمیں جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہیئے" ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے بلبیر نے سنجیدگی سے کہا۔

سب نے اس کی بات کو مناسب جان کر حامی بھر دی۔

"گاؤں کے سب لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ سوائے چند ایک بڑے زمینداروں اور قلعہ والے سرداروں کے۔ لوگوں نے کسان کانفرنس کے نام پہ خوش ہوکر دانے دیئے ہیں" بلبیر نے بتایا۔

بچن نے ان باتوں سے دل ہی دل میں سمجھ لیا کہ کیوں بڑے زمیندار اور قلعہ والے سردار لوگوں سے کٹے ہوئے ہیں۔ اور کیوں وہ کانفرنس میں گڑبڑ مچانا چاہتے ہیں۔

"اور سویرے سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ان نعروں سے کارروائی شروع کرنی چاہیئے" زمین کے مالک ۔ ہل چلانے والے۔ جاگیرداری مردہ باد" ایک ساتھی کی طرف سے تجویز پیش ہوئی اور سب نے اس تجویز کو منظور کیا۔

"زمین کے مالک ہل چلانے والے"

پھولوں کی طرح یہ بول بچن کے من میں کھلنے لگے۔ اس کے آباؤ اجداد زندگی بھر سرداروں کی زمین پر ہل چلاتے رہے تھے۔ اور اس نے بھی کئی بار ہل چلایا تھا۔ مگر وہ کبھی اپنے ہل سے کھینچی ہوئی ایک ریڑ کا بھی مالک نہ بن سکے تھے۔ کتنا عظیم نعرہ" اسے محسوس ہوا جس کی تعمیل سے ایک نیا دور آئے گا ـــــ جہاں اس کی کنواری بہن اپنی عصمت بچا بچا کر پرائے کھیتوں میں سے سلہ چننے یا ساگ توڑنے نہیں جایا کرے گی ـــــ اس کابے کس و ناتواں باپ اپنے بھوکے بچوں کے لئے دو بھٹے یا گنے اکھاڑ لینے کے جرم میں کھیت کی مینڈھ پر ہی گنوار جاٹوں سے گھونسے کھانے کی ذلت نہیں اٹھائے گا ـــــ گندم۔ چری اور باجرے کے وہ خوشے اس کے اپنے ہوں گے جنھیں مہ توں سے وہ کمین پن میں عمریں گنوا کر شاندار کٹھار دیتے رہے ـــــ مگر جن کی گھنی چھاؤں ان کی ماؤں اور بہنوں کی عصمت لوٹنے کے لئے رات بن جاتی رہی تھی!

"اور جھنڈا اٹھاتے وقت لوگوں کی جیت کا گیت گایا جائے ....." بچن نے شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر کہا۔

اور پھر دیر تک ستاروں کے سائے میں مشورے ہوتے رہے۔

کافی رات گئے بچن گھر لوٹا۔ آنگن میں چارپائی پر اس کا باپ اس کے انتظار میں ابھی سویا نہیں تھا۔ بچن کو دیکھتے ہی خوشی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا:

"کل سرداروں کی فصل کاٹنے جانا ہے بچن ۔ ان کا آدمی کہہ گیا ہے۔ تڑکے ہی جاکے درانتی لگا دیں گے۔ ذرا جلدی جاگ اٹھنا!"

"باپو، میں لاوی کرنے نہیں جاؤں گا ـــــ اور نہ بھانو بالیں چننے جائے گی ....!" دل کو تھام کر بچن باپ کے سامنے بول اُٹھا۔

"چھوکرے، اتنے پاؤں نہ پھیلا۔ تو کوئی جاگیرداروں کا صاحبزادہ نہیں ....." باپ نے بیٹے کے سامنے اپنی ساری ہستی بکھیری۔

"دیکھو باپو ....." بچن باپ کی عزت رکھتے ہوئے بولا ....."میں کام سے نہیں گھبراتا۔ جوتے بنا سکتا ہوں۔ کھالیں رنگوا لو۔ کوئی عیب نہیں ہے۔ مگر میں دوسروں کے کھیتوں میں کمین بن کر نہیں جاؤں گا"

"ارے کمین نہیں تو اب کیا تو سردار بنے گا؟"

"ہاں میں سردار بنوں گا ....." اور وہ وہاں سے کھسک کر لکڑی کی سیڑھی چڑھتا ہوا کوٹھے پر بچھی ہوئی چارپائی پر جا کر دراز ہو گیا۔ پو پھوٹ رہی تھی۔

گاؤں کی گلیوں میں سے کوئی 'دھپ دھپ' کرکے چل رہا تھا۔ چمیاری کے کھلے آنگن میں ایک للکار سنائی دی۔

"خبردار اے چارو! اگر کوئی جلسہ میں شریک ہوا۔ ہم ٹانگیں توڑ ڈالیں گے۔"

بچن بوکھلا کر اٹھا۔ سیڑھی کے ڈنڈے پھلانگتا ہوا وہ نیچے اترا۔ اور آنگن عبور کرکے وہ دروازہ میں آ گیا۔

چمیاری کے کھلے آنگن میں لال سنگھ بپھرا کھڑا تھا۔ لال سنگھ گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار۔ گاؤں کی نصف زمین جس کی اپنی ہے اور باقی نصف سارے کسانوں کی۔ جو کئی طریقوں سے زیادہ اسی کے پاس رہن پڑی ہوئی تھی ـــــ جس کی دھرتیوں پر اس کے بزرگ مزدوری کرتے چلے آئے تھے۔ اور جس کے کھیتوں میں اس کی بہن کل سلہ چننے گئی تھی۔

"دشمن ....." بچن کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔

"ہم سب جائیں گے جلسے میں۔ دیکھ لیں گے کون روکتا ہے ....." بچن نے دھرتی پر پاؤں جما کر کہا۔

"بہت منہ کھل گیا ہے بے چارو ـــــ کیوں تیرا دماغ آسمان پر چڑھ رہا ہے ....."

"منہ سنبھال کر بول بے سردار ـــــ چارو گنوار نہ سمجھ لینا"

سب چارو گھروں سے باہر نکل آئے۔

سردار کچھ جھینپ گیا "اچھا، اچھا، نپٹ لیں گے تجھے۔ جانا تم وہاں ....." اور وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا چلا گیا۔

گاؤں سے باہر!

گرد و نواح کے دیہاتوں کی مشترکہ حد میں لوگ ہاڑی کی کٹائی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ پیپل، شیشم، کیکروں اور بیریوں کی چھاؤں میں ہجوم جمع ہو رہا تھا۔ جہاں پاس ہی چھوٹے سے ریہٹ کا کتا ٹک ٹک کر رہا تھا اور گنے کے مولسٹی چر رہے تھے۔

سب ساتھی جلسے میں پہنچ گئے۔ اور بچن بھی اپنی پتی کے کتنے سارے لوگوں کو اکٹھا کرکے آگے آگے چلتا ہوا جلسہ میں آ گیا۔

پولیس کی گڈ بھری ہوئی لاریاں ذرا دور آکر رک گئیں۔ جیسے صاف فضا میں سڑے ہوئے دھوئیں کی بدبو پھیل گئی۔ اور لال سنگھ اپنے غنڈوں کو لے کر لاریوں کے قریب جا کھڑا ہوا۔

لوگ کھچا کھچ بیٹھے تھے۔ لاؤڈ سپیکر پر ایک گیت شروع ہوا ـــــ گیت کے ختم ہونے پر ایک آواز آئی:

"اب عوام کا جھنڈا لہرایا جائے گا۔"

"ہم نہیں ..... جھنڈا ونڈا لہرانے دیں گے ..... سالے کوم نشٹوں کا ....." لاریوں کے قریب سے ایک غنڈے کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔

"ہیں - ہیں - ہیں" چنڈال کی طرح لال سنگھ دانت نکال کر ہنہنایا۔

"زمین کے مالک!"

"ہل چلانے والے"

"جاگیر داری"

"مردہ باد"

لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

لاری میں سے اتر کر ایک تھانیدار سٹیج کی طرف ہنٹر گھماتا ہوا آیا اور بولا:

"ایک دم منتشر ہو جاؤ۔ جلسہ کرنا غیر قانونی ہے۔ اور جھنڈا لہرانا ....."

"سٹیج سے دُور ہٹ جاؤ۔ یہ جلسہ مزدوروں اور کسانوں کا ہے۔ جاگیردار غنڈوں کا نہیں۔" سٹیج پہ جھنڈے کو بلند کرتے ہوئے بچن شیر کی طرح گرجا۔

"بکواس بند کرو اور ایک منٹ میں منتشر ہو جاؤ۔ صرف ایک منٹ ....."

لیکن کوئی منتشر نہ ہوا۔ تمام لوگ غصّے سے بپھر گئے۔

"پولیس راج!"

"مردہ باد"

نعرے پھر بلند ہونے لگے سیلاب کی موجوں کی طرح۔

"ہم ابھی گولی چلا دیں گے۔" اپنی سرکار کے حکم کا نمائندہ افسر نے ہوا میں لہرایا۔

نعرے اور بھی زور سے گونجنے لگے۔

اور بندوقیں لوگوں کی طرف تن گئیں۔

"تڑاخ۔ تڑاخ۔ تڑاخ"

ولایتی گولیاں عوام کے سیلاب میں بجھنے لگیں۔ مینا روں کی طرح تنے ہوئے مضبوط جسم زمین پہ گرنے لگے۔ دھرتی پہ لہو بہنے لگا ـــــ اور گولیاں ختم ہو گئیں۔ اور سرکاری لوگ گھر گھر کرتی اور بدبو پھیلاتی غبار کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔

بچن کے چہرے پہ سے ساتھی لہو کی دھاریوں پونچھ رہے تھے۔ اس کے ماتھے پہ ایک گہرا زخم تھا۔ اور اس کا بایاں بازو کہنی سے ٹوٹ کر لٹک رہا تھا۔

بچن کے سرد ہوتے جسم میں کوئی کوئی سانس چل رہا تھا۔ اُس نے آنکھ جھپکی۔ اور دانتوں میں ہونٹ دبا کر تکلیف کی شدت کو برداشت کیا۔ اس کے گرد آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکوں کا گھیرا تھا۔ اور گولی چلی سُن کر اور لوگ بھی بھیڑ میں آ آ کر شامل ہو رہے تھے۔

دُور ـــــ کٹے ہوئے کھیتوں میں سے دوڑتی، ہانپتی ہوئی بھانو آ رہی تھی۔ جسے صبح سے ماں نے سِلّہ چننے کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ بھانو مجمع کو چیر کر آگے آ گئی۔ بچن نے آنکھ کھولی۔ گندم کی چُنی ہوئی بالیاں بھانو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھیں۔

بھانو کی چیخ نکل گئی۔

"اے بھیا ....."

اور بھانو پھڑپھڑاتی ہوئی انتڑیوں اور بھیگی ہوئی پلکوں سے بچن کے اُوپر جُھک گئی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خوشوں کا سایہ بچن کے چہرے پہ پھیل گیا۔

بچن کے نیلے پڑے ہوئے ہونٹوں میں ہلکی سی جان آ گئی ـــــ جیسے بہت دُور ـــــ زندگی کی انتہائی بلندی پر سے وہ بول رہا ہو:

"رو نہ ..... میری بہن ..... میں تمہیں سِلّہ نہیں چننے دوں گا ....."

جو اماں ملی تو کہاں ملی

عزیز اثری

معاً کتوں نے زور زور سے بھونکنا بند کر دیا۔ اس نے اپنی دونوں مٹھیاں، جن میں لئے ہوئے روٹی کے ٹکڑے وہ باہر کتوں کو ڈال چکا تھا زور سے کس لیں اور دل کڑا کر کے کھڑکی کو ٹٹولا۔ کھڑکی اندر سے بند نہ ہونے کی وجہ سے فوراً ہی کھل گئی۔ وہ پورا اندر لگا کر اوپر کی طرف اچھلا۔ ٹارچ جلا کر کمرے کا جائزہ لیا اور اندر کود گیا۔

فرش کے ساتھ پاؤں لگتے ہی اس کا ایک ہاتھ جو کھڑکی کی چوکھٹ سے ہٹ رہا تھا کسی چیز سے ٹکرایا اور شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے اس کے سارے اعصاب میں خوف تھرتھرا دیا۔ اس کا جسم سُن ہو گیا۔ معاً کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں اس نے اپنی مدافعت اور مقابلے کی تمام قوت جمع کر لی۔

"اوہو تو یہ آپ ہیں۔ دخل اندازی کے لئے معاف کرنا بھائی لیکن تم نے ناحق اتنی تکلیف اٹھائی مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری خاطر خواہ خدمت نہیں کر سکوں گا۔" اس نے سفید بنیان اور پاجامے میں ایک دبلے سے لمبے نوجوان کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اپنی ٹارچ میز پر رکھ کر جلدی سے اپنی نیکر کی جیب سے آہنی پنجہ نکالنے لگا۔ لیکن وہ دبلا نوجوان اس کی پرواہ کئے بغیر مسکرا کر اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں سخت ہو گئیں۔ اس کے مضبوط بازوؤں کی پھلیاں تڑپنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ درمیان میں پڑے ہوئے میز پر سے کود کر نوجوان کو پچھاڑنے کے بعد کام شروع کر دے۔

"گھبراؤ نہیں دوست! میں تم پر حملہ کرنے یا تمہیں حملہ آور ہونے کی ترغیب دینے نہیں آیا ہوں۔" یہ کہکر دبلا نوجوان اس کے پاس سے گزر کر بڑے آرام سے کھڑکی کی طرف بڑھ گیا اور وہاں سے ہنس کر کہنے لگا ـــــ "میرا خیال ہے کہ کھڑکی جو مجھ سے کھلی رہ گئی تھی اب بند کر دینی چاہئے ورنہ ہمارے مہمان کو جس نے صرف ایک بنیان اور نیکر پہن رکھی ہے۔ سردی لگ جائے گی۔"

مہمان! نیکر کی جیب میں پنجے کو ٹٹولتا ہوا اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ عجیب آدمی ہے جو بغیر کسی خوف یا جھجک کے مسکرا مسکرا کر چور کی طرف بڑھ رہا ہے اور اُسے مہمان سمجھ رہا ہے۔ اس نے اس کے پتلے چہرہ پر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما کر جھنجھلا کر کہا ـــــ

"میں مہمان نہیں ہوں ـــــ میں چور ہوں ـــــ چور۔"

"چور؟ ـــــ ذرا آہستہ بولو میرے دوست! باہر کوئی سُن لے گا۔ مگر تم کیسے چور ہو تم نے ابھی تک کوئی چیز نہیں چرائی؟"

"میں چرانے کے لئے ہی آیا ہوں؟" اس نے آہستہ مگر زور دار لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ میری بدقسمتی سمجھو کہ یہاں کوئی چیز تمہیں اپنے قابل نہیں مل سکیگی۔ میری کل دولت یہ چند کتابیں ہیں جو وہاں شیلف اور یہاں میز پر بکھری پڑی ....."

"اور وہاں اس بکس میں جسے تالا لگا رکھا ہے کیا ہے؟" اس نے دبلے نوجوان کا فقرہ کاٹ کر پوچھا۔

"اس میں صرف کاغذ ہیں ان دونوں بکسوں میں کچھ کپڑے ہیں ان میں پھٹے ہوئے زیادہ اور سالم دو جوڑ ہیں۔ یہ بڑا میز اور آٹھ دس کرسیاں ہیں۔ ہاں اس کمرے میں ایک چیز ضرور قیمتی تھی جسے تم نے چرایا نہیں نقصان ضرور پہنچایا ہے۔ یہ تصویر کا خوبصورت فریم تھا۔ جو یہاں چکنا چور پڑا ہے۔ اس تصویر کو پہچان سکتے ہو؟" ـــــ دبلے نوجوان نے فرش پر جھک کر ٹوٹے ہوئے فریم کو الگ کیا اور اپنی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھا دی ـــــ "ان سے ملو یہ رشید صاحب ہیں۔ یعنی ان کی تصویر ہے۔ یہ تصویر رات کی تاریکی میں آنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے اور ان سے باتیں کرتی ہے۔"

"تصویر کبھی باتیں نہیں کیا کرتی۔" ـــــ اس نے تالے والے بکس سے نظریں ہٹا کر اپنے موٹے لہجے میں اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اُسے اب اپنی ناکامی اور مایوسی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس عجیب سے نوجوان کی باتیں اس کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔

"تصویریں باتیں کرتی ہیں ــــ بولتی ہیں میرے دوست!" دبلا نوجوان کہنے لگا ــ "تم جو ایک آدھ جملے میں اپنی بات ختم کر دیتے ہو ایک تصویر ہو ــــ اپنے تلخ حالات کی تصویر! اور میں جو اتنی باتیں کر رہا ہوں میں بھی اس ماحول کی ایک تصویر ہوں۔ لیکن دونوں تصویریں ــــ نہیں ان کے صرف فریم مختلف ہیں۔ میں تمہارے ماتھے پر پڑی ہوئی ان شکنوں کے باوجود تمہاری روح کی معصومیت اور فطرت کی سادگی کو دیکھ سکتا ہوں۔ میں تمہاری ان آنکھوں میں جو بار بار تالے والے بکس کو گھور رہی ہیں تمہاری ذہانت اور اضطراب کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ یہ سب کچھ ان بگڑے ہوئے حالات کا عکس ہے۔ جس کی ہم اور تم دونوں تصویریں ہیں۔" اس کے ماتھے پر پڑی ہوئی شکنیں آپ ہی آپ معدوم ہو گئیں۔ اس نے گھڑا کر بکس پر سے نظریں ہٹا لیں اور اس نوجوان کے چہرے کو پہلی بار بھرپور نظروں سے دیکھا جو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دبلے نوجوان نے اب اس کا نگا بازو پکڑ لیا اور بولا۔

"آؤ بھائی یہاں بیٹھ جائیں۔ تمہارے بگڑے ہوئے فریم کے اندر سے میں تمہاری تصویر کو دیکھ اور پڑھ سکتا ہوں۔ تم چور نہیں ہو ــ نادان ضرور ہو تم نے ان لوگوں کو جو انسانوں کو چور بناتے ہیں سمجھا نہیں ہے۔ تم نے اپنے تلخ اور بگڑے ہوئے حالات میں خود کو بھی بگاڑ لیا ہے۔" نوجوان اس کا بازو چھوڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دبلے نوجوان کی باتوں کے پیدا کئے ہوئے سحر سے جو اس کے چور کے کردار کو متزلزل کرنا چاہتا تھا۔ آزاد ہونے کے لئے اپنے آپ کو جھنجھوڑ دینا چاہا لیکن وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کی باتیں سننے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو دبلے نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

"میری تصویر کے فریم کو تم نے توڑ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس معزز پیشے کو اختیار کئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔"

"صرف آٹھ ماہ ہوئے ہیں" ــــ وہ بولا۔

"ٹھہرو ــــ سگریٹ پیو گے؟" ــــ نوجوان اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے سمیٹ کر اٹھا اور میز کی دراز سے سگریٹ اور ماچس نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ سگریٹ سلگا کر کش لے چکا تو آہستہ مگر بے دلی سے بولا۔

"مجھے چور بنے صرف آٹھ ماہ ہوئے ہیں۔ میں ــــ (شہر کا نام) کا رہنے والا ہوں وہاں ہماری جوتوں کی اچھی خاصی دوکان تھی۔ میں نے میٹرک بھی پاس کیا تھا۔ شادی بھی کی۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم بناہ گیر ہو گئے لیکن پناہ کہیں نہیں ملی میری بیوی اور ننھا بچہ مسلسل مصیبتوں اور فاقوں سے پناہ ڈھونڈنے کے لئے دوسرے جہان میں چلے گئے۔ میں جب دکھوں میں گھرا ہوا تنہا رہ گیا تو میرے دل میں اس دنیا کے خلاف نفرت بھڑک اٹھی۔ ایک رات جب میں تین روز کے فاقے سے خودکشی کرنے کا عزم کئے شہر سے دور ایک ویران جگہ پر پھر رہا تھا تو ایک گروہ نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پہلی بار جب میں نے ان لوگوں کے ساتھ مل کر ایک کوٹھی میں نقب زنی کی اور اس کے بعد ہم نے مال آپس میں بانٹا تو میں خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ آج تیسرا واقعہ تھا لیکن یہاں سوائے تمہاری موٹی موٹی کتابوں اور باتوں کے اور کچھ نہیں ملا۔ اچھا اب میں جاؤں گا" ــــ وہ کرسی سے اٹھ کر ہاتھ میں لئے ہوئے سگریٹ کو یوں گھورنے لگا جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے ختم ہونے میں اور کتنی دیر لگے گی۔

"کبھی جیل یاترا بھی کی ہے؟" دبلے نوجوان نے جو خود بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"جیل یاترا؟ جیل جانے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے۔ میں کئی بار پچھتاتا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی اور بچے کی زندگی ہی میں یہ کام کیوں نہ شروع کر دیا۔ کتنے آرام اور مزے سے وہ لوگ بھی زندہ رہتے۔ میں جس گروہ میں تھا اس میں کئی لوگ دس دس پندرہ پندرہ سال سے جیل کاٹے بغیر مزے سے زندگی گزار رہے ہیں۔"

دبلے آدمی نے ایک دبلے میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر پر نظر ڈال کر کچھ سوچا پھر کہا ــــ "اچھا اب تم جانا چاہتے ہو۔ لیکن ــــ وہ رک گیا ــ "سنو اس وقت پہرہ داروں کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہو رہی ہیں۔ تم پکڑے جاؤ گے۔"

"ہمیں کون پکڑتا ہے صاحب!" وہ سینہ تان کر بولا اور میز پر سے اپنی ٹارچ اٹھانے لگا۔

"پھر بھی خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم یہیں سو رہو صبح اٹھ کر چلے جانا۔ سونے کے کمرے میں تو ایک ہی چارپائی ہے۔ اگر تم چاہو تو یہاں میز پر سو سکتے ہو۔"

"ہاں کوئی حرج نہیں ــــ" اس نے دوبارہ ٹارچ میز پر رکھ دی ــــ "میں یہاں بڑے مزے سے سو سکتا ہوں۔ لیکن آج کی رات

خالی گئی۔ تمہاری کھڑکی سے کودتے ہی تمہاری تصویر کا فریم ٹوٹ گیا۔ یہ بہت بُرا شگون ہوا ہے۔ آج کی رات میں اور کہیں بھی نہیں جا سکتا۔ یہ بہت بُرا شگون ہوا ہے۔"

دبلے نوجوان نے کمرے سے باہر جا کر [illegible] لئے سرہانہ اور کمبل لا کر میز پر ڈال دیا اور بولا۔

"اچھا اب میں سونے کے لئے جا رہا ہوں۔ سوتے وقت بجلی بجھا دینا۔ یہ دروازے کے پاس سوئچ ہے اور ہاں صبح کو پچھلی طرف کی کھڑکی سے نہیں کودنا۔ اس دروازے سے جانا۔" وہ دروازے میں کھڑا ہو کر ہنسا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

اس نے سوچا کہ اب وہ اس عجیب نوجوان کی مسکراتی، چبھتی ہوئی نظروں اور اس کی شخصیت کے طلسم سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کا پوری دلچسپی کے ساتھ تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی نگاہیں تالے والے بکس پر جا کر اٹک گئیں۔ اس میں صرف کاغذات نہیں ہوں گے۔ اس میں ضرور نقدی ہوگی۔ ورنہ اسے تالا کیوں لگا ہوا ہے؟ اس میں نقدی نہیں ہوگی ورنہ وہ مجھے یہاں کبھی نہ سلاتا۔ یہ کیسا عجیب، کتنا دلیر شخص ہے۔ اس نے کس طرح اپنے پہلے ہی حملے سے اسے بے بس اور مایوس کر دیا تھا لیکن تالے والا بکس! اس کی نظریں بدستور اُسے گھور رہی تھیں، ٹٹول رہی تھیں، اس میں نقدی ہوگی ــــ نہیں کاغذات ہوں گے۔ اس شخص نے جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔ اس کے ذہن میں کش مکش ہونے لگی۔ اس نے اس کش مکش پر قابو پانے کے لئے اُٹھ کر بجلی بجھا دی اور میز پر آ کر لیٹ گیا۔ لیکن کش مکش اور بھی شدید ہو گئی۔ آخر وہ چپکے سے اٹھا، اپنی ٹارچ سنبھالی اور نہایت چابکدستی سے بکس کا کنڈا مروڑ کر اسے بند تالے سمیت ایک طرف ڈال دیا۔ بکس کا ڈھکنا احتیاط سے اٹھا کر اس نے اندر ٹارچ کی روشنی پھینکی۔

بکس میں کئی چھوٹی موٹی کتابیں اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ امید اور ناامیدی کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ وہ جلدی جلدی کاغذات اور کتابیں اٹھا کر باہر پھینکنے اور ان کی تہیں کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے دانتوں میں ٹارچ کا کنڈا دبا لیا اور دونوں ہاتھوں سے ان کی تلاشی لینے اور اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ پھر اس نے مایوس ہو کر زیر لب ایک بڑی غلیظ گالی اگلی اور کاغذوں کے پلندوں اور کتابوں کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر بکس میں پھینک دیا۔ ڈھکنا بند کرنے سے پہلے اس کی نظریں ایک کتاب پر ٹک گئیں ــــ "ملک میں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو سزا دو" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دوسری کتاب ــــ "سب کے لئے روٹی، سب کے لئے خوشحالی" اس نے یہ کتابیں اٹھائیں، ٹارچ کی روشنی میں ان کے ورق الٹ الٹ کر دیکھے ان کے ساتھ دو اور کتابیں اٹھائیں، ڈھکنا بند کیا اور ٹارچ اور کتابوں کو لے کر کھڑکی سے باہر کود گیا۔

کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں جب وہ بڑی احتیاط سے تاریکی میں قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا تو وہ خود کو مایوس اور اداس محسوس کر رہا تھا۔ نہ جانے اسے اس وقت اپنی مرحوم بیوی اور اپنا بچہ کیوں یاد آ گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس نے اس نوجوان کی کتابیں چرا کر ٹھیک نہیں کیا۔ ان کتابوں کے نام بھی اس آدمی ہی کی طرح عجیب سے ہیں۔ اس نے ان کو تالے میں کیوں بند کر رکھا تھا۔ اسی بات نے تو اُسے بکس توڑنے پر آمادہ کیا تھا لیکن اُسے انھیں ساتھ نہیں لے آنا چاہیے تھا۔ یہ اس کے کسی کام کی نہیں ہیں۔ وہ صبح کو ٹوٹا ہوا کنڈا اور کتابیں غائب دیکھ کر کیا سمجھے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ اُسے ایسی باتیں اپنے ذہن سے بالکل نکال دینی چاہئیں وہ چور ہے۔ اس کا کام کسی شخص سے مرعوب یا متاثر ہونا نہیں۔ اگر اس نے کتابیں چرائی ہیں تو کیا بُرا کیا ہے؟ چور کو کچھ نہ کچھ تو چرانا ہی چاہئے تھا۔ چور کو کبھی کسی جگہ سے خالی ہاتھ نہیں لوٹنا چاہئے۔ لیکن اس کی باتیں کتنی عجیب تھیں ــــ اس کی نظریں ــــ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ــــ ہونہہ اسے کیا؟ وہ چور ہے۔ ایسے لوگوں سے متاثر ہونا اس کے پیشے کی توہین ہے۔ لیکن آج کی رات بڑی مایوس کن بڑی منحوس رہی ہے۔ آج اس کا وار خالی گیا ہے۔ دراصل اس کے مکان کی کھڑکی سے کودتے وقت تصویر کے فریم کے ٹوٹنے سے آواز پیدا ہوئی تھی۔ یہ کتنا بُرا شگون تھا اور وہ نہایت بے دلی سے روشنی سے بچتا بچاتا تاریکی میں چلتا گیا۔

کئی دنوں سے اسے اپنا ذہن ایک شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسی شکنجے سے نکلنے کے لئے اس نے آج خوب شراب پی تھی۔

تو دن چور کا ایک دن سادھ کا۔ آخر وہی ہوا۔ اس کی غیر محتاط عادتوں نے اسے پولیس کے ہتھے چڑھا دیا۔ ایک چوری کے بعد تفتیش کر کے اس سے مال برآمد کر لیا گیا۔ پولیس کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ مال کے علاوہ کچھ سیاسی کتابچے بھی اس کے ہاں سے برآمد ہوئے تھے۔ اسے تھانے میں

تین دن تک مار مار کر بے حال کر دیا گیا۔ چوتھے دن تھانے دار نے اسے بُلا کر سمجھایا ـــــ "یہ خطرناک کتابیں رکھنا چوری، ڈاکہ زنی سے بھی بڑھ کر جرم ہے۔ سچ سچ بتاؤ ورنہ تمہیں گولی مار دی جائے گی"۔ وہ لرز گیا۔ اس نے وہ کتابیں پڑھی تھیں اور خاص طور پر یہ کتاب ـــــ "ملک میں لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کو سزا دو"۔ تو کئی دفعہ پڑھی تھی لیکن یہ کتابیں اتنی خطرناک کیوں تھیں یہ اسے معلوم نہ تھا اور اسی کم علمی کے باعث اس کی ساری روح میں خوف سے تھرتھری پیدا ہوگئی۔ وہ صاف صاف بتانے سے اس لئے گھبراتا تھا کہ اس سے اس کی ایک اور چوری پکڑی جائے گی اور اُسے پھر مار مار کر بیحال کر دیا جائے گا۔ آخر پولیس نے اسے لالچ دے کر ان کتابوں کے بارے میں پوری اطلاع اور ایسے لوگوں کی سرگرمیوں کی رپورٹ دینے پر آمادہ کر لیا۔ وہ پولیس کے تشدد اور جیل سے جلد از جلد نجات چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ایسا کرنے کا ذمہ لے لیا ـــــ اور اسے رہا کر دیا گیا۔

اب اس نے اپنا پہلا پیشہ چھوڑ کر نیا کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن جیل سے رہائی کے چند روز بعد اس پیشہ کی تبدیلی نے اس کے ذہن کو خلا میں معلق کر دیا۔ نہ جانے اس کے ضمیر میں یہ نئے نئے کانٹے کہاں سے اُگ رہے تھے۔ اس نے ان چار خطرناک کتابوں کے متعلق جنھیں پولیس اٹھا کر لے گئی تھی بار بار سوچا تھا لیکن اس کے ذہن نے الجھنوں سے پاک ہونے سے صاف انکار کر دیا اور اس نے ان الجھنوں پر فتح حاصل کرنے کے لئے جلد از جلد خود کو اپنے نئے کام میں غرق کر دینا چاہا۔

آج وہ اس عجیب سے نوجوان سے ملنے اس سے دوستی پیدا کر کے ان کاغذات خطرناک سیاسی باتوں کے راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ صبح کو جب تیار ہو کر چلنے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اُس عجیب نوجوان کی ساری شخصیت اس کے ذہن میں کوندنے لگی۔ اس کی وہ باتیں اسے ڈرانے لگیں جنھوں نے اس رات پہلے پہل اس کے تمام ارادوں کو بُری طرح پچھاڑ دیا تھا۔ آخر اپنے آپ کو اس کی شخصیت اس کی چبھتی ہوئی گہری نظروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے پولیس والوں سے لئے ہوئے پیسوں سے خوب شراب پی۔ شراب پینے کے بعد وہ دوبارا اس کے گھر کی طرف روانہ ہوا تو اس کے قدموں کی طرح اس کے ارادے اس کے خیالات بھی ڈگمگانے لگے۔ وہ اپنے نشے کو کم کرنے کے لئے سڑکوں پر، پارکوں اور باغوں میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا اب وہ مکمل آزادی اور اپنی مرضی سے کھلم کھلا جہاں چاہے پھر سکتا تھا اس احساس نے اس کے نشے کو اور بھی بھڑکایا۔ اب وہ پولیس والوں سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ دن کی روشنی اور کھلی فضا میں جہاں چاہے گھوم سکتا ہے۔ اب اسے کون روک سکتا ہے، کون پوچھ سکتا ہے۔ اب وہ پولیس والوں کا معاون ہے۔ اب وہ آزاد ہے۔ جب وہ اس کے مکان میں داخل ہوا تو دبلے نوجوان نے پہلے اسے اس طرح گھورا جیسے وہ اسے پہچان ہی نہ سکا ہو۔ پھر وہ زور سے ہنسا۔

"اوہو تو یہ تم ہو۔ آج تو بڑے شریفانہ روپ میں نظر آ رہے ہو دوست! اور پھر دن دہاڑے۔ بہرحال آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا کہو میری کتابیں لائے ہو؟"

"کتابیں" ـــــ اور اُسے محسوس ہوا کہ اس کے رگ و ریشے میں لہریں لیتا ہوا نشہ ڈھل رہا ہے۔ اس نے کہا۔

"مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں اُس رات اپنی کمینہ حرکت سے باز نہ رہ سکا لیکن یہ کتابیں ہی کچھ ایسی تھیں کہ میں آپ سے پوچھے بغیر انھیں لے جانے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے اب چوری کرنا چھوڑ دیا ہے"۔

"چوری کرنا چھوڑ دیا ہے بڑی حیرت کی بات ہے۔ بڑی مدت کے بعد تم دکھائی دیئے ہو لیکن اس پیشے کو چھوڑنے کے بعد بھی تمہارا چہرہ کچھ اطمینان اور سکون کا حامل نہیں معلوم ہوتا"۔ اس نے اپنی گھبراہٹ کو چھپانے اور دُبلے نوجوان کی تیکھی گہری نظروں سے اپنی حفاظت کرنے کے لئے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ـــ "میں آپ سے کچھ اور کتابیں لے کر پڑھنا چاہتا ہوں"۔

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتابیں کس قسم کی ہیں؟" ـــ دُبلے نوجوان نے مسکرا کر پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اب تک کمرے کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کی ہر چیز کو پرکھنے، تولنے لگیں۔ ایک چھوٹی تپائی پر دُبلے نوجوان کی تصویر بغیر فریم کے پڑی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ دو بکس بغیر تالے کے پڑے ہوئے تھے۔ لیکن وہ تالے والا بکس کہیں نہیں تھا۔ اس نے نوجوان کی طرف جواب اپنے خشک بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گھما کر کہا۔

"میں آپ سے اسی قسم کی کچھ کتابیں لینے آیا ہوں۔ دراصل میں آپ کی باتوں اور ان کتابوں سے بڑا متاثر ہوا ہوں"۔

دُبلا نوجوان ہنسا پھر اُسے سر سے لے کر پاؤں تک بڑی تجسس نظروں سے گھور کر کہنے لگا۔

"دوست! تم اس سفید پتلون اور سفید قمیص میں بڑے بنے ٹھنے نظر آ رہے ہو۔ کیا تم نے پھر جوتوں کی دوکان کر لی ہے؟ اب تو تم پناہ گیر معلوم نہیں ہوتے۔ اب تو تمہیں پناہ مل گئی ہے نا!"

وہ نوجوان کی اس بات پر مصنوعی ہنسی ہنسنے لگا۔ پھر خود کو سنجیدہ بناتے ہوئے کہا:

"وہ کتابیں ـــــ دراصل میں آپ کے ساتھ مل کر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کی تحریک سے بہت ہمدردی ہو گئی ہے۔" وہ خفیہ پولیس کی بتائی ہوئی باتیں کہہ رہا تھا۔

"ہماری تحریک! کونسی تحریک؟" ـــــ نوجوان نے مُسکرا کر اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں چبھو دیں۔ وہ گھبرا گیا۔ نوجوان کرسی سے اٹھا اپنے سگریٹ کا ٹکڑا فرش پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل دیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا:

"ہاں یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ اس معزز پیشے کو چھوڑ کر اب تم نے کیا دھندا شروع کر رکھا ہے؟"

"دھندا؟" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "میں آج کل رسالوں، کتابوں کی دوکان کھولنے کی کوشش میں ہوں۔"

"تو کیا اسی لئے مجھ سے کتابیں مانگنے آئے ہو؟" دُبلے نوجوان نے پوچھا۔

"میں ان کتابوں کو خفیہ طور پر بیچوں گا۔ کتابوں کا وہ بکس کہاں ہے؟" اس نے کمرے میں نگاہیں پھرا کر آخر پوچھ ہی لیا۔ نوجوان ہنسنے لگا۔

"بھائی تمہارے ان کتابوں کے لے جانے سے ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں تم سارے بکس ہی کو نہ لے اُڑو۔ اسی لئے ہم نے بکس کو خود ہی غائب کر دیا۔" پھر وہ دُبلے نوجوان سے اپنی دوستی ظاہر کرنے کے لئے کتنی ہی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

اس عجیب نوجوان سے تین چار ملاقاتوں کے بعد اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کی باتوں، اس کی شخصیت سے پھر سحر زدہ ہوتا جا رہا ہے اسی لئے وہ خفیہ پولیس میں بھی کوئی تسلی بخش رپورٹ درج نہ کرا سکا نہ ہی کوئی کتاب یا کاغذ لا کر انھیں دے سکا۔ کیونکہ دُبلا نوجوان اس سے ملنے کے باوجود کبھی کوئی کاغذ یا کتابچہ اس کے ہاتھ میں نہیں دیتا تھا۔ وہ خود ہی اُسے اپنے پاس بٹھا کر وہ کتابیں پڑھ کر سُناتا۔ بڑے دھیمے اور ملائم انداز میں اس کے ساتھ باتیں کرتا۔ اُن سب کتابوں میں اُسے کوئی بات خطرناک محسوس نہ ہوتی وہ سوچتا کہ معلوم نہیں کہ ان کتابوں سے پولیس والے کیوں اتنا ڈرتے ہیں لیکن اسے تو بہرحال پولیس ہی کی مدد کرنی چاہیئے۔ اور اس لمحے پھر اُس کے ذہن میں اذیت ناک کشمکش ہونے لگتی۔ اُس کے ضمیر میں اُگے ہوئے کانٹے اسے چبھنے لگتے۔ پھر وہ سوچتا کہ وہ عجیب نوجوان کتنا نڈر، مخلص اور ملنسار ہے۔ اس نے پہلی رات اُسے چور سمجھتے ہوئے بھی اپنا دوست، اپنا بھائی کہا تھا۔ وہ خود بھی اسے دوست کہہ چکا تھا۔ دوست کو دھوکا اور فریب دینا کتنا ظلم، کتنی پست اور کمینہ حرکت ہے۔ وہ اپنے دوست کو قید نہیں کرا سکتا لیکن وہ پولیس والوں سے بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اسی لئے وہ خبریں گھڑ گھڑ کر رپورٹ دے دیتا لیکن جلد ہی پولیس نے اُس پر زیادہ بھروسہ کرنا چھوڑ دیا۔ پولیس نے ایک روز دُبلے نوجوان کو ایک ویران جگہ پر تحفظ امن عامّہ کی خاطر گرفتار کر لیا۔

یوم مئی آ پہنچا۔ اس سے کچھ دن پہلے پولیس نے اپنی تمام سرگرمیاں زیادہ تیز کر دیں۔

پولیس انسپکٹر نے اُسے بلا کر دھمکایا ـــــ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم دیانتداری اور محنت سے کام نہیں کر رہے۔ اگر تم نے اچھی طرح سے کام نہ کیا تو تمہیں بھی انہی لوگوں کا ساتھی سمجھ کر گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ اب پوری طرح سے کام کرو۔ رات کو ان لوگوں کے اڈے پر جا کر یوم مئی کے جلسے اور جلوس کے متعلق تمام اشتہاروں کا پتہ لگاؤ۔" انسپکٹر کے دفتر سے باہر نکل کر وہ سوچنے لگا کہ اس کا دوست تو اب جیل میں جا ہی چکا ہے اب وہ آسانی سے اپنا کام سرانجام دے سکے گا۔ لیکن اس کے ذہن میں کوئی الجھن سی دھڑکنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ پھر تزلزل کے نرغے میں جا رہا ہے۔ پولیس آج رات شہر بھر میں مشتبہ لوگوں کے گھروں پر چھاپے مار کر انھیں گرفتار کرنا اور یوم مئی کے اشتہاروں پر

قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ اشتہار آج رات لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر یا سائیکلو اسٹائل ہو کر علی الصباح تمام کارخانوں، منڈیوں سکولوں اور کالجوں میں پہنچ جائیں گے اور صبح کو ہر راستے، ہر دیوار پر چسپاں نظر آئیں گے پھر ہر طرف سے جلوس نکلنے، جلسے ہونے اور انگریزوں اور امریکیوں کے خلاف نعرے لگنے شروع ہو جائیں گے لہٰذا رات شرارت کی جڑ ان اشتہاروں پر قبضہ کر لینا چاہیئے اسی لئے خفیہ پولیس آج رات پوری قوت صرف کر کے اپنی ساری مشینری کو حرکت میں لانا چاہتی تھی۔ اور اُسے بھی جو اس مشینری کا ایک پرزہ تھا اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے اس مکان پر جانا تھا جہاں دُبلا نوجوان رہا کرتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اشتہاروں کی تلاش میں آج رات پولیس بھی وہاں چھاپہ مارے گی اس لئے اُسے پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں موجود ہونا چاہیئے۔ وہاں جانے سے پہلے اس نے اپنے ڈولتے ہوئے خیالات کو سہارا دینے اور اپنی قوت کو جمع کرنے کے لئے خوب شراب پی اور آدھی رات کو تیار ہو کر وہاں جا پہنچا۔

دروازہ کھلنے کے بعد جب اُس نے اندر قدم رکھا تو وہاں سوائے ایک سترہ اٹھارہ سالہ خوبصورت لڑکے کے اور کوئی دکھائی نہ دیا۔ اسے دیکھ کر پہلے تو اسے مایوسی ہوئی پھر اس پر رحم آیا لیکن رحم فوراً ہی دل سے نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر آج بھی اُس نے اپنا فرض ادا نہیں کیا تو پولیس اُسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ لڑکے نے جب اُسے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ تو اس نے دُبلے نوجوان کا نام لے کر کہا کہ وہ اس کا دوست ہے پھر اس نے اپنا ایک فرضی نام بتا کر لڑکے سے ہاتھ ملا کر مُسکراتے ہوئے کہا ــــ "جیل سے میرے دوست نے آپ سے ملنے اور آپ کی مدد کرنے کے لئے کہا ہے۔ کل یومِ مئی ہے اس لئے آپ اشتہارات اور پمفلٹ مجھے دیدیں تاکہ میں انھیں اپنے علاقہ میں تقسیم اور چسپاں کر سکوں۔"

نوجوان تنومند لڑکے کو اس کے شراب میں بھیگے ہوئے لہجے کے باعث اس پر شبہ ہوا اور اس نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک گھورتے ہوئے کہا: "مجھے کسی اشتہار کا علم نہیں ہے۔"

"آپ کو علم نہیں۔ لیکن میں تو خوب جانتا ہوں آپ ....." اس کے ہکلانے کے باعث اس کی موٹی بھاری آواز ٹوٹ گئی۔

"یہاں کوئی اشتہار نہیں ہے۔" نوجوان نے کرسی سے اُٹھ کر کڑک کر کہا اور تن کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ جب کچھ حیران ہو کر کچھ سہم کر کرسی سے اُٹھا تو نوجوان نے اُسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا ــــ "نکلو یہاں سے ورنہ جاسوس کہیں کے۔"

اس کے سڈول بازوؤں کی مچھلیاں تڑپیں پھر ساکت ہو گئیں۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جسم میں تیرتا ہوا نشہ فرار ہو رہا ہے۔ وہ اس سترہ اٹھارہ سالہ خوبصورت لڑکے کی ہمت اور جرأت پر ششدر رہ گیا۔ یہ سب کے سب اتنے نڈر، اتنے بے خوف اور دلیر کیوں ہوتے ہیں؟ اُس نے سوچا کہ دلیری اور بے خوفی سچائی سے پیدا ہوتی ہے۔ سچ۔ جھوٹ۔ نہیں سچ۔ جھوٹ۔ جھوٹ۔ جھوٹ۔ سچ۔ دُبلا نوجوان، خلوص، دوستی، دلیری، یہ نوجوان لڑکا۔ اُس کے ذہن میں یہ سب کچھ ڈوبنے، اُبھرنے لگا۔ اُسے ایک چکر سا آ گیا۔ اُس نے خود کو بڑی مہیب دلدل، بڑی گہری خلیج میں پھنسا ہوا محسوس کیا جیسے وہ ایک بھیانک خلا میں اُلٹا لٹک رہا تھا۔ معاً اس نے اپنے پاؤں زمین پر ٹکے ہوئے محسوس کئے۔ اس نے خود کو اس مہیب دلدل۔ گہری خلیج سے باہر محسوس کیا۔ اس کے قدم کمرے کے فرش پر اور مضبوطی سے جم گئے۔ اس کا تزلزل، اس کی ذہنی کشمکش اور بیچارگی اس سے الگ ہو کر دُور جا گری وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آج رات یہاں پولیس چھاپہ مار رہی ہے تم ....." وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ اس کی آواز گلے میں آ کر اٹک گئی۔ نوجوان لڑکے نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں ــــ "تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔" نوجوان نے پھر اس کے سارے سراپے اور آنکھوں کو گھورا اور پرے ہٹ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے گردن جھکا کر اپنی تمام سرگزشت اُس نوجوان کو سُنا رہا تھا۔ پہلی رات چوری کرنے کے لئے کھڑکی سے کودنے سے لیکر آج تک کے تمام حالات اُس نے سنا دیئے۔ پھر آنسو پونچھ کر اس کے حسین چہرے پر نظریں جما کر کہنے لگا۔

"اب یہ تم پر منحصر ہے کہ مجھ پر یقین کرو یا نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے دوست کے ساتھی ہو اور اسی تحریک کے فرد ہو تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

نوجوان لڑکا کچھ دیر تک چپ چاپ اُسے گھورتا رہا پھر بولا "لیکن میں یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں؟" اور وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں

اِدھر اُدھر پھرنے لگا "ابھی تھوڑی دیر میں تمام اشتہارات، تمام پمفلٹ یہاں آنیوالے ہیں" وہ اس طرح کہنے لگا جیسے اپنے آپکو سُنا رہا ہو "صبح تک ان کا تقسیم ہونا اور چسپاں ہونا نہایت ضروری ہے۔ کل یوم مئی ہے۔ کل تمام محبِ وطن عوام سامراجی اقتدار کے خلاف سڑکوں، گلیوں، کوچوں اور بازاروں میں مارچ کریں گے۔ اُن تک اشتہار اور پمفلٹ پہنچنا نہایت ضروری ہے ورنہ ....."

"اُن تک اشتہار ضرور پہنچیں گے۔ پولیس آنے والی ہوگی۔ تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ تم جہاں کہو گے میں اشتہار لے کر پہنچ جاؤں گا۔ میں ہر قیمت پر وہاں پہنچوں گا۔ خواہ مجھے رینگ کے ہی کیوں نہ آنا پڑے۔"

نوجوان کے کمرے کو ناپتے ہوئے قدم رُک گئے اور وہ اس کی کرسی کے پاس آکر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"میرا یقین کرو دوست! میں چور ضرور ہوں۔ مجھے جاسوس اور مخبر بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن میرا ضمیر بک نہیں سکا۔ میں انسانوں میں نے تمہارے اس ساتھی کو دوست کہا تھا۔ میں تمہیں بھی اپنا دوست کہتا ہوں۔ میں تمہیں ....."

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے۔" نوجوان بولا "صرف اشتہار محفوظ رہنے چاہئیں اور صبح لوگوں تک پہنچ جانے چاہئیں۔"

"تمہارے یہاں رہنے سے نہ تم محفوظ ہو نہ اشتہار۔ سنو وہ آہٹ ہو رہی ہے۔ شاید۔ آؤ اس طرف کھڑکی سے تمہیں باہر نکال دیتا ہوں۔"

نوجوان لڑکا کھڑکی کی طرف بڑھ گیا وہاں کھڑے ہو کر اسے وہ جگہ نہائی جہاں سے اشتہار تقسیم ہونے تھے اور جلد از جلد اشتہار لے کر وہاں آجانے کو کہا پھر اس کی طرف واپس آیا۔ اُسے بازو سے پکڑ کر ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں گھورا۔ پھر کھڑکی کھول کر باہر کود گیا۔

اس کا خیال صحیح تھا۔ آہٹ واقعی ہو رہی تھی۔ آہٹ تیز ہو گئی۔ پھر دروازہ ہولے سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ پولیس نہیں ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر ایک بہت بڑا بنڈل دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیا اور بنڈل لانیوالے سے جو اندر آنے کیلئے قدم بڑھا رہا تھا جلدی سے کہا،

"یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ پولیس آرہی ہے۔"

پھر اس نے کنڈی چڑھا دی اور اندر آکر روشنی میں بنڈل کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اُس نے آج کہیں سے بہت بڑی دولت اڑا لی ہو۔ اسی وقت بھاری بوٹوں کی تیز تیز آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اُس نے اطمینان سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے پر کھٹکھٹاہٹ ہونے لگی۔ اس نے کھڑکی کی طرف نظر دوڑائی پھر کمرے کا آخری بار جائزہ لیا۔ ایک طرف تپائی پر اس کے دوست ـــ دُبلے نوجوان کی بغیر فریم کے تصویر پڑی تھی۔

"یہ تصویر رات کی تاریکی میں آنے والوں کا خیر مقدم کرتی۔ اُن سے باتیں کرتی ہے" اسے اپنے دوست کے اس رات کے الفاظ یاد آگئے۔ وہ بڑے سکون اور خوشی سے مسکرا دیا۔ کمرے میں دروازہ توڑنے کا شور بڑھنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے دوست کی تصویر اٹھائی۔ اسے بنڈل کے ساتھ ملا کر سینے سے لگایا اور کھڑکی کھول کر باہر کود گیا۔

فضا میں سیٹیوں کی آواز گونج گئی لیکن وہ پولیس کی سیٹیوں سے بے نیاز روشنی سے بچتا بچاتا بڑے جوش سے نوجوان لڑکے کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف لپکا جا رہا تھا۔ سیٹیوں کی چیخیں زیادہ بلند، زیادہ تیز ہو گئیں اور کتوں نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ (انجمن ترقی پسند مصنفین کراچی میں پڑھا گیا)

ایک خفیہ میٹنگ (بقیہ صفحہ ۳۶)

نہ گئے ہوں اور ان دوستوں میں نہ جا ملے ہوں جو ہمارے نہ ہو کر بھی ہمارے ہیں، تو اس سرکلر کی ہدایتوں پر بڑی مردانگی سے عمل کیجئے۔ بھول جائیے کہ ہم نے کوئی "چنا نامہ" شائع کر کے اپنے آپ پر بوجھ ڈال لیا ہے۔ ان ہی ہدایتوں کو ہی اصل چنا نامہ سمجھئے اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ سبھا کی جان پر قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ اگر اپنے ایمانداری سے ان ہدایتوں پر عمل کیا، تو دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو ہم سے ہمارا حق چھین سکے۔ مندرجہ ذیل نعرے صرف آپ لوگوں کے لئے ہیں:۔

چنا نامہ ـــــــ مردہ باد!

کل ملک بدیشی سبھا ـــــــ زندہ باد!

وفادار ساتھیو ـــــــ بھاگو مت!

ڈورتھی جون سین

غیاث احمد گدی

"پورا نام کیا لکھوں ـــ ڈورتھی لامار؟"

ڈبے پتلے بنگالی جیولر کی آنکھیں عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے طنز سے مسکرائیں۔ اور وہ اینگلو انڈین لڑکی جو اپنے سونے کا ہار جیولر کو دے چکنے کے بعد سوچ کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور جس کے بال ریشمی نہیں تھے اور جس کے فراک کے اُڑے ہوئے رنگ نے بنگالی جیولر کو اسقدر گہرا طنز کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، چونک اٹھی جیسے کسی نے ایک موٹی گالی جڑ دی ہو۔ ہوا میں اُڑتے ہوئے بھورے بالوں کی ایک لٹ اس کی آنکھوں کے پاس آگئی تھی۔ گردن کی ہلکی سی جنبش سے اُس نے بالوں کی لٹ کو پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ڈورتھی جون سین! ـــ لامار ہوتی تو ہندوستان کے ایک معمولی سے شہر کی ذلیل سی دوکان میں اپنا ڈیوریہ بیچنے نہ آتی .... اور نہ ہی ....!" وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔ سفید کاغذ پر دوڑتی ہوئی فاؤنٹین پن کی سنہری نب کو دیکھنے لگی جو ننھے خوبصورت حروف بناتی ہوئی بڑی تیزی سے اپنے پیچھے سیاہ نقشِ پا چھوڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

"اس پر دستخط کر دیجئے میڈیم ـــ!" بنگالی جیولر نے کہا۔

تیزی سے دوڑتی ہوئی نب کب رُکی اُسے اس کا خیال بھی نہ رہا۔ اچانک بڑے سے سفید موٹے کھاتے کی تحریر پر اس نے ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ اور پھر جلدی سے جیولر کی بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کر دیئے۔ ایک سو دس روپے کے نوٹ سنبھالتی ہوئی وہ سائیکل کے اگلے چکے کو دبا کر ہوا دیکھ رہی تھی کہ پھر بنگالی جیولر کی آواز نے اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا شیشہ انڈیل دیا۔

"اور روپے کی ضرورت پڑے تو بے تکلف آجایئے گا میڈیم! زیور نہ بھی ہو تو کوئی ہرج نہیں۔ صرف آپ کا ہونا کافی ہے بس"

اس کے جی میں آئی کہ تمام نوٹ چاک کر کے کمینے جیولر کے منہ پر دے مارے۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی دوسرے لمحے ہی اُس کے ذہن میں جون کھانستا ہوا بے بسی کی حالت میں نمودار ہوا۔ اور وہ چپ چاپ گھر کی طرف جانے والی سنسان سڑک پر ہو لی۔

ڈورتھی جانتی تھی کہ جیولر صرف جیولر ہی نہیں بلکہ دلال بھی ہے اور لڑکیوں کو پھانس کر وہ شہر کے کارخانہ داروں، مل مالکوں، اور رئیس افیسرس کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح وہ کافی روپیہ کما لیتا ہے۔ اینگلو انڈین لڑکیوں کی تو وہ ٹوہ میں رہتا ہے۔ جسے خریدار خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔ اس طرح دوسری لڑکیوں کے مقابلہ میں اسے زیادہ دلالی مل جاتی ہے۔ اور اُس نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس جیولر کے پاس جانا مناسب سمجھا تھا۔ یہ جیولر شہر کے ایک کنارے پر رہتا تھا۔ اس نے سوچا زیور بیچتے ہوئے اُسے کوئی جانا پہچانا ہوا آدمی نہ دیکھ پائے گا۔ اسی سوچا تھا اگر آدمی آپ ٹھیک ہو تو کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ جیولر کو اتنی جرأت ہی نہ ہوگی کہ وہ کسی شریف خاتون کو آوارگی کی دعوت دے سکے۔ وہ عورتیں تو آپ ہی جیولر کے پاس اس غرض سے آتی ہیں جو کمینی ہیں، جنھیں گناہ نے کچھ اس قدر ملوث کر دیا ہے کہ وہ چند روپے یا ایک لمحاتی عیش کے لئے اپنی عصمت تک بیچ ڈالتی ہیں اور یوں وہ اپنی ذلت کا سامان آپ پیدا کرتی ہیں۔ انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کو تباہ کر دیتی ہیں۔ وہ تو شریف ہے۔ جیولر کو کیسے جرأت ہو سکتی ہے۔

لیکن بنگالی جیولر اپنی کمینگی سے باز نہ آیا۔ اس نے ڈورتھی کو بھی گناہ کی دعوت دیتے ہوئے جھجک محسوس نہ کی۔ اور آج وہ بنگالی جیولر کی اُچھالی ہوئی کیچڑ کو اپنے دامن پر صاف دیکھ رہی تھی ـــ ڈورتھی سوچتے سوچتے پھر اپنے خیالوں کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔ سائیکل دوڑ رہی تھی اور مکانوں کے پیچھے تیز گز نے والی اکیلی اور بیوہ کی چھاتی کی طرح ویران سڑک پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ سیاہی مائل سبز درختوں کی قطار پیچھے کھسکتی جا رہی تھی۔ سائیکل پر بیٹھے بیٹھے ڈورتھی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سڑک کا بایاں موڑ قریب تھا۔ جہاں سے اس کے گھر کی طرف جانے والی سڑک مڑتی

تھی۔ سُرخ اینٹوں والا گرجا اُس کے سامنے تھا۔ گرجا کی عین پیشانی پر کندہ تھا "یسوع نے کہا اُٹھ! اور لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔!" ڈورو تھی نے سوچا کاش اُسے کہیں خداوند یسوع مل جاتا۔ اُس وقت وہ اپنا سر پوپے خلوص سے اُس کے قدموں پر ڈال کر کہتی "اے مردہ لڑکی کو زندہ کرنے والے مقدس خدا! تجھ سے ایک بے بس اور لاچار لڑکی دعا کر رہی ہے کہ مجھے تیری ماں دورکاس میری عصمت کی قسم کہ میری عصمت کی موت سے پہلے خود مجھے موت آجائے۔ مجھے اس جہاں سے اُٹھالے، اپنے پاس عرش کی بلندی پر، جہاں پہنچکر کوئی بنگالی جیولر مجھ پر کیچڑ نہ اُچھال سکے۔"

گرجا خراب لانگ پیچھے رہ گیا تھا لیکن ڈورو تھی کو یسوع کہیں نہ مل سکا ـــــ جب وہ اپنے کمرے کے قریب آئی تو اندر سے جون کے کھانسنے کی آواز نے اُسے چونکا دیا وہ جلدی سے سائیکل کو دروازے والے نیم سے لگا کر اندر لپکی۔ لیکن اتنی دیر میں جون کی کھانسی بند ہو چکی تھی۔ اور وہ تکیے کے سہارے نیم دراز حالت میں کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ تولیے سے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کو خشک کر رہا تھا۔ جیسے میلوں کی مسافت طے کر لینے کے بعد وہ بالکل نڈھال ہو گیا ہو۔ ڈورو تھی نے خلاف توقع جون کا چہرا اُترا ہوا دیکھا۔ جون کے کانوں میں جب ڈورو تھی کے قدموں کی چاپ پہنچی تو اُس نے گردن گھما کر کہا۔

"ڈورو تھی ڈارلنگ ـــ؟ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا ـــــ!"

"کیوں۔؟ کیسی طبیعت ہے تمہاری ـــ؟" ڈورو تھی سامنے والے سٹول کو پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئی اور جون کے ہاتھ سے تولیہ لے کر اس کے پسینے کو خود پونچھنے لگی۔

"کچھ نہیں ڈورو آج ذرا کھانسی آگئی ہے ـــ شاید خون بھی آیا ہے ـــ!"

"خون ـــ؟" ڈورو تھی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں کسی نے تیز اور زہر میں بجھا ہوا نشتر چبھو دیا ہو۔ تین مہینوں کے بعد آج پھر خون آگیا تھا۔ ڈورو تھی نے دیکھا جیسے وہ ڈوب رہی تھی۔ سمندر کے بیچوں بیچ، طوفان کی یلغار میں۔ ڈوبنے سے بچنے کے لئے اس نے انتہائی کوشش کی۔ ہاتھ پیر مارے، تڑپی، اُچھلی اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ جلد ہی ساحل سے جا لگے گی تو یکایک اُسے پھر کسی غیر مرئی ہاتھ نے سمندر کے بیچوں بیچ پھینک دیا۔ پھر وہی طوفان، وہی تھپیڑے۔ وہ سوچ کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ پھر آپ ہی آپ چونکی۔ دیکھا تو جون ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہا ہے۔ اداس، غمزدہ۔ جیسے ڈورو تھی کے دکھوں کے ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل سے واقف ہو۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں سلگتی ہوئی آگ میں اُس کے ساتھ خود بھی جل رہا ہو۔ ڈورو تھی جس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اور جو بھول گئی تھی کہ ڈاکٹر نے جون کے سامنے مغموم رہنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ اپنی آنکھوں پر اُمڈ آئے۔ دل کے خون کو چہرہ پھیر کر خشک کیا کہ جون دیکھ نہ پائے۔

"میرے جانے کے بعد کہیں گئے تھے ـــ؟"

"ہاں ذرا سامنے سڑک تک۔ اکیلے گھر میں پڑے پڑے طبیعت گھبرا رہی تھی۔ سوچا ذرا ٹہل لوں۔ جی بہل جائے گا۔ آتے آتے بہت تھک گیا تھا ڈارلنگ ـــ!"

ڈورو تھی جانتی تھی کہ ڈاکٹروں نے جب اُسے بستر سے اٹھنے تک کی ممانعت کر رکھی ہے تو اس کے اس طرح چلنے پھرنے سے خون آگیا ہوگا۔ وہ جون کو ایک منٹ بھی تنہا نہیں چھوڑتی تھی۔ لیکن اس کی محنتوں پر آج پانی پھر گیا تھا جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ کاش وہ آج اُسے تنہا چھوڑ کر نہ جاتی۔ یا جانے سے پہلے اُسے ہر طرح کی تاکید کر جاتی۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ کمرے سے باہر نکل آئے۔ اور آنکھوں کے سیلاب کو بہہ جانے دے تاکہ اس کے دل کا سارا غبار، سارا درد دھل جائے۔ لیکن وہ جون کو چھوڑ کر نہ جا سکی۔ اس نے سوچا کیا اُسے جون سے پہلے موت نہیں آسکتی کیا جون سے پہلے وہ خود نہیں مر سکتی؟ انسان کتنا مجبور ہے۔ وہ سوچتی رہی ..... سوچتی رہی ..... اور آفتاب دُور گھنے درختوں کے نیچے اُتر گیا دھیرے دھیرے فضا میں دھند پھیلنے لگی اور اداس ماحول اور بھی اداس ہو گیا۔ ڈورو تھی پلنگ پر بیٹھ کر جون کے سر کو اپنی گود میں لئے آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ اس کی نگاہیں دُور آسمان پر پھیلی ہوئی شفق پر لگی ہوئی تھیں جو دھندلکے میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

جون اپنا سر اس کی گود میں رکھ کر سو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر کو اُٹھا کر تکیے پر رکھ دیا۔ کمرے میں دھندلکا اُترا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لٹے

ہوئے انسان کی طرح بوجھل قدموں سے لیمپ تک گئی اور لیمپ روشن کر دیا۔ اس نے دیکھا میز پر بسکری والا لڑکا نہ جانے کب کا روٹی رکھ گیا تھا۔ روٹی دیکھ کر جیسے اس کی سوئی ہوئی بھوک بیدار ہو گئی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ صبح سے اب تک صرف دو توسوں اور چائے کی ایک پیالی پر ہے۔ اس نے سوچا اُسے کچھ کھا لینا چاہیئے۔ بھوک تو آدمی کو اور نڈھال کر دیتی ہے۔

"کھوں ..... کھوں ..... وہ ..... او ..... !"

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس کا شوہر کھانسی کے باعث نیند سے جاگ اٹھا۔ اور پھر کھانسی کا تسلسل کچھ اس طرح بندھ گیا کہ ڈورو تھی ڈر گئی مبادا اُسے کچھ ہو نہ جائے۔ جون کھانستا ہی جا رہا تھا اور ڈورو تھی اسے بازوؤں کا سہارا دیئے اس کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ نہایت گھبرائی ہوئی۔ پھر جون کی کھانسی دھیرے دھیرے تدریجی طور پر تھم گئی۔ اور وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈورو تھی کے بازوؤں میں جھول گیا اور سر کو پلنگ سے نیچے کر کے تھوکتا رہا۔ ڈورو تھی متوحش نگاہوں سے چراغ کی روشنی میں اس کے تھوک اور کھنکھار میں خون کی سُرخی دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

"دیکھو ڈورو خون تو نہیں ـــــ !؟"

ڈورو تھی نے پلنگ سے نیچے جھانک کر دیکھا اور کوشش کرنے کے باوجود وہ جھوٹ نہ بول سکی۔ وہ سچ بھی نہ بول سکی۔ خاموش رہی، دل میں اُٹھتے ہوئے طوفان کو دبائے، آنکھوں سے بہہ آنے والے سیلاب کو تھامے ـــ کچھ لمحوں کے بعد جون نے خود ہی جھانک کر دیکھا۔ لیمپ کی مدتوق روشنی میں فرش پر جا بجا خون کے دھبے نظر آئے۔ ڈورو تھی نے دیکھا کہ یہ دیکھ کر اچانک اس کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ اور پیشانی اور جسم پر پسینے بڑی تیزی سے بہنے لگے ہیں۔ وہ تولیہ لے کر جون کے پسینے کو خشک کرنے لگی۔ اس نے سوچا کہ اس وقت اُسے ضبط کرنا چاہیئے۔ وہ جون کو کیا سنبھالیگی وہ تو خود نڈھال ہوتی جا رہی ہے۔ وہ خود برسوں کی مریض نظر آنے لگی ہے۔ اور پھر جب اس کی کیفیت کی طرف جون کا خیال گیا تو وہ متوحش نظروں سے دیکھتے ہوئے، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا ڈو۔ و ؟ تم اس قدر گھبرا کیوں رہی ہو ـــــ ؟؟"

اور اچانک ڈورو تھی کو احساس ہوا کہ اس کا یوں پریشان ہو جانا۔ اس کے بیمار خاوند کے لئے کس قدر مضر ثابت ہو سکتا ہے۔ جون کے لئے یہ زہر سے کم نہ ہوگا۔ اس نے جون کی پیشانی پر ایک طویل محبت آفریں بوسہ دیا اور بولی۔

"نہیں ڈارلنگ! کچھ بھی تو نہیں ـــــ !!" اور یہ کہتے کہتے اس کا دل بھر آیا۔ اس کے جی میں آئی کہ آج وہ جون سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے کچھ اس قدر کہ اس کا درد دھل کر بہہ جائے۔ وہ لرزتا ہوا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے رہی ..... دبائے رہی .....

"بہت خون آیا ہے ـــــ ہے نا ڈورو تھی ـــــ ؟"

اور ڈورو تھی نے سوچا کہ جواب میں کہہ دے، نہیں تو۔ مگر وہ سامنے پڑے ہوئے خون کو دیکھ رہی تھی۔ ایک سخت اور تلخ ہی حقیقت جس سے انکار ممکن نہیں۔ وہ جون کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ اب جون اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر جنگلے سے باہر کھلے ہوئے آسمان کو تک رہا تھا۔ جہاں درختوں کے جھنڈ پر سے چاند ابھر رہا تھا جس کے چہرے پر بھی زردی چھائی ہوئی تھی۔

نہ جانے کس کے سوگ میں، نہ جانے کس کے غم میں .....!

اور اب تو اسے جون کی زندگی سے مایوسی ہو چلی تھی۔ وہ جون کے پلنگ کے قریب اسٹول پر بیٹھی اپنے خیالوں میں ڈوبی رہتی۔ اس کے کانوں میں جیسے کوئی کہتا رہتا "یہ سب جھوٹ ہے ڈورو تھی۔ یہ ڈاکٹر سب جھوٹ بولتے ہیں۔ جون اب جی نہیں سکتا۔ بیس روز کی لگاتار محنتوں اور انتھک کوششوں کے بعد جب اس کی صحت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا تو اسے کتنی مسرت ہو رہی تھی جیسے شش جہات کی دولت مل گئی ہو کتنی مصیبتوں سے وہ اس کا علاج کراتی رہی۔ دفتر کے منیجر سے پیشگی مانگا، اس نے دھتکار دیا۔ نوکری چھوٹ گئی۔ ڈاکٹروں کی خوشامد کی حتیٰ کہ اس کمینے جولر کی گالی تک سننا پڑی۔ اس دوران میں اس کا نوکر بھی بھاگ گیا۔ جون کے علاج کے ساتھ ساتھ گھر کے سارے چھوٹے بڑے کام اُسے خود سنبھالنے پڑے۔ اور اب اس کی تمام محنتوں، کوششوں پر پانی پھر گیا تھا۔ جیسے ساحل کے قریب آئی ہوئی ڈورو تھی کو پھر کسی غیر مرئی ہاتھ نے سمندر کے نیچے دھکیل دیا ہو۔ یہ دیکھ کر اُسے کتنا صدمہ ہوا۔

سمندر میں ڈوبی ہوئی ڈورو تھی نے سوچا، اگر جون مر گیا تو ـــــ ؟؟؟

جیسے کسی نے اس کے سینے پر میخ رکھ کر زور سے ہتھوڑا دے مارا ہو۔ اس نے جھنجھلا کر اپنے ذہن میں ابھرتی ہوئی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا۔ وہ ہر حالت میں جون کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ دیر وہ خالی الذہن سی جون کی طرف دیکھتی رہی جس کے چہرے کی سُرخی اس کے خون کے ساتھ بہہ گئی تھی۔ اور جون ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ ہڈیوں کے ڈھانچہ جون کی طرف دیکھتے دیکھتے اس نے اپنے ماضی کی طرف جھانک کر دیکھا جہاں وہ جون کے ساتھ زندگی کے حسین ترین لمحات گذار چکی تھی۔ زندگی کا کاروں مسکراہٹوں اور رنگینیوں کے جلو میں گذر رہا تھا۔ اس وقت جون کس قدر خوبصورت اور وجیہ تھا کہ وہ اسے دیکھتی ہی رہتی اور کبھی نہ تھکتی۔ جب جون لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آتا اور اپنے بھرے بھرے بازوؤں کی گرفت میں لیکر اپنا شہد آگیں ہونٹ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا تو ڈورتھی کو احساس ہوتا کہ جون کے ہونٹوں کی مٹھاس بوسے کے ذریعہ سے اسکی روح میں اُترتی جا رہی ہے اور اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اس شہد میں بھیگ گیا ہے۔ اور وہ سوچتی کہ کاش تمام زندگی اسی کیفیت کی لذت کے سہارے گذر جاتی۔ اسی طرح وہ جون کی گرفت میں قید رہتی اور صدیاں گذر جاتیں۔ اے کاش! لیکن پھر وہ جون کے دفتر چلے جانے کے بعد حد درجہ مغموم رہتی۔ تنہائی کا عارضی احساس اسکی حیات پر کچھ اس طرح مسلط ہو جاتا کہ وہ بارہا جون کو دیکھنے کے لئے اس کے دفتر تک جانے کا ارادہ کر لیتی۔ مگر صرف ارادہ۔ اور جب کبھی جون کو دفتر سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی تو پردے میں رہنے والی ایک ہندوستانی خاتون کی طرح بے چین ہو اٹھتی۔

گھر میں ایک نوکر تھا۔ تنہائی اور بیکاری کے اذیت ناک لمحوں سے چھٹکارا پانے کے خیال سے وہ کسی مصروفیت میں کھو جانا چاہتی تھی۔ اور جب اس نے اس عندیہ کا ذکر جون سے کیا تو جون نے صلاح دی کہ وہ کہیں نوکری کر لے۔ وہ جون کی باتوں کو کب نہ مانتی تھی۔ اس نے حامی بھر لی۔ تھوڑے دنوں بعد ڈورتھی ایک دفتر میں نوکر ہو گئی۔ دفتر جانے سے ایک گھنٹہ قبل ہی وہ اور جون گھر سے نکل جاتے۔ وہ سائیکل کے آگے بیٹھی رہتی۔ راستے میں اکا دکا آنے جانے والے راہگیر انھیں بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتے اور سائیکل کو تارپیڈ اتی ہوئی نکل جاتی۔ اور جب آس پاس کوئی آدمی نہ ہوتا تو جون اپنا ایک چوتھائی بوجھ ہی پیڈال دیتا اور پھر بے خیالی میں اسکی گردن کے نیچے سے اپنا منہ نکالکر اس کے گالوں کو چوم لیتا۔ سائیکل ڈگمگا کر رہ جاتی اور وہ بظاہر غصے کا مظاہرہ کرتی اور جون ایک طویل قہقہہ لگاتا ــــ جون اسے دفتر میں چھوڑ کر اپنے دفتر کو ہو لیتا۔ اور جب وہ دفتر سے نکلتی تو دیکھتی کہ جون سائیکل لئے اس کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کبھی جون کسی وجہ سے خلاف معمول نہ آسکتا تو پھر وہ گھر میں جاکر جون سے خوب لڑتی۔ بالکل اپنے پڑوس میں رہنے والی مسلمان عورت کی طرح ــــ ڈورتھی کی زندگی پر جون اپنی تمام تر لاابالیوں کے ساتھ چھایا ہوا تھا۔ دفتر میں کچھ کر رہی ہو، اس وقت بھی جون اُسکے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہوتا یا سینما دیکھ رہا ہوتا یا اس کے گالوں کو چومنے کے لئے بڑھ رہا ہوتا۔ کام کرتے وقت وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح جون اُسکے سامنے نہ آجایا کرے۔ اس طرح تو وہ کچھ بھی نہ کر سکیگی۔ ایسی جذباتیت بھی کیا ہے ــــ! اُسے وہ دن آج بھی یاد ہے جب اُس نے نوٹس لیتے ہوئے بے خیالی میں کاپی کے حاشیے پر جا بجا "جون ڈارلنگ" لکھ دیا تھا۔ جسے اس کے قریب بیٹھنے والی لڑکی نے بتایا تھا۔ اور وہ چونکے اس کو مٹانے میں محو ہو گئی تھی کیسی شرمندگی محسوس کر رہی تھی اس وقت وہ ــــ!

اور اب جون کی کھانسی نسبتاً کم ہو گئی تھی۔ شاید دوا اور انجکشن نے اثر کیا تھا۔ یا شاید نقاہت کے باعث وہ کھانس بھی نہ سکتا تھا۔ ڈورتھی اوگا لان اُسکے قریب لے آئی۔ اس نے کھنکھار کر اس میں تھوک دیا۔ دو دن سے قریب قریب خون آنا بالکل بند ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی تھوک کے ساتھ ہلکی سُرخی آ ہی جاتی۔ پلنگ کے نیچے اوگا لان رکھ کر ڈورتھی نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے ڈورو؟ کیا میں مر جاؤں گا؟" جون نے گلاس واپس دیتے ہوئے کہا۔ جیسے بالکل ہار گیا ہو۔

"کیسی باتیں کرتے ہو ڈارلنگ ــــ! ڈاکٹروں نے تو امید دلائی ہے کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ دیکھو خون بھی آنا بند ہو گیا ہے۔ اور پسپر بھی نہیں رہتا۔ ایسی باتیں سوچ کر تم کیوں اپنے کو ہلکان کرتے ہو۔ خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیا کرو ڈارلنگ ــــ خدا کے لئے..... میرا کلیجہ پھٹ جاتا ہے ــــ!" اور یہ کہتے کہتے ڈورتھی کی آنکھیں بھر آئیں لیکن اس نے ضبط کر لیا۔ آنکھوں کے آنسو آنکھوں ہی میں خشک ہو گئے۔ جون چپ چاپ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صاف اور بے داغ آسمان، ڈورتھی کی زندگی کی طرح حسین اور پاکیزہ آسمان کی وسعت کو وہ تک رہا تھا۔ اچانک اس نے چہرہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ڈورو تمھیں یاد ہے وہ شام؟ ہماری شادی کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے ہنی مون منانے کے لئے ہم ہارجلنگ گئے ہوئے تھے۔ صاف و شفاف جھیل کے کنارے بیٹھی تم مجھے نغمے سُنایا کرتی تھیں۔ بائرن کی نظمیں۔ بیشکن کے نغمے، ٹیگور کے گیت، یا کبھی کبھی چاندنی راتوں میں سفیدے کے درخت تلے مون لائٹ اینڈ

شیڈو (MOON LIGHT AND SHEDOW) اس وقت زندگی کتنی خوبصورت تھی ڈورو ۔۔۔؟ اور اس روز جب میں نے تمہیں شیلے کی نظم سنانے کو کہا تو تم نے یونہی ناز سے کہا تھا "نہیں"۔! پھر بڑی منت وسماجت کے بعد تم کتنی پرسوز آواز میں گانے لگی تھیں" جب تم نہیں ہوتے" جیسے ساری کائنات تمہاری آواز کے سحر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ ڈارلنگ کیا مجھے تم وہ نغمہ آج پھر سناؤ گی؟ وہی "جب تم نہیں ہوتے" وہی شیلے کی نظم ۔۔۔۔!" اور جون نے آسمان کی طرف چہرہ پھیرتے ہوئے بڑے ملتجی انداز میں دیکھا۔ جون کے منع کرنے کے باوجود ڈورو تھی اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسکے جی میں آیا کہ وہ کہدے کہ اس سے اس وقت کچھ گایا نہ جائے گا۔ وہ گذرے ہوئے خوشی کے لمحوں کی یاد دلاکر اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ جون کا پریشان ہو جانا اس کے لئے سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں گائے گی۔

"تم گاؤ گی ڈارلنگ ۔۔۔؟" ۔۔۔ اور جیسے ڈورو تھی کے اندر سے آواز آئی "ہاں گاؤں گی" اور وہ گانے لگی۔ ہلکی ہلکی، مدھم مدھم آواز میں۔ جیسے کوئی روح کو زخمی کرتا چلا جا رہا ہو اور اس کا احساس تک نہ ہو رہا ہو۔

جب نقرئی آواز کھو جاتی ہے۔ ذہنی فضا پر تھرتھراتی رہتی ہے۔

خوشبو، جب مخملیں پھول پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ اُس حس میں زندہ رہتی ہے جس کو اس نے بیدار کر دیا ہے۔

گلاب کی پتیاں، جب گلاب بکھر جاتا ہے۔ محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔

اسی طرح تیرے خیال پر جب تو میرے پاس نہیں ہوتا ۔۔ خوشی آرام کرتا ہے۔

رفتہ رفتہ جون کی حالت سنبھلتی جا رہی تھی۔ اگرچہ اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا اور قے جسناً زیادہ ہونے لگی تھی۔ لیکن ڈورو تھی اور ڈاکٹروں کو یقین تھا کہ جون مائل بہ صحت ہے۔ خون آنا قطعی بند ہو گیا تھا اور بخار بھی نہیں آتا۔ قے اور دست تو شاید موسم کی خرابی یا دواؤں کے زیادہ استعمال کی وجہ سے ہوتے تھے۔ ڈورو تھی کی محنت اور روپے خلاف توقع ضائع نہیں ہو رہے تھے لیکن جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے۔ اسے ایک فکر سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ پیسے کا خرچ زیادہ تھا اور آمدنی کا راستہ مسدود۔ اس نے اپنا ہار بیچ دیا۔ کچھ سامان فروخت کر دیا۔ بنک میں جون کے نام سے رکھے ہوئے وہ روپے جو جون کے والد مرتے ہوئے اُسے دیگئے تھے قریب قریب ختم ہو گئے تھے۔ وہ کہاں جائے۔ اس تاریک دنیا میں۔ اُسے دُور دُور نزدیک روشنی کی ایک کرن بھی تو نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ڈورو تھی چپ تھی۔ آس پاس اندھیرا تھا۔ وہ ڈورو تھی جو جون سین تھی لا مارنہیں تھی۔ جو ہندوستان کے چھوٹے سے شہر میں مفلس و قلاش پڑی تھی۔ کوئی بھی نہ تھا جو اس کی آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو خشک کرتا۔ مایوسی کے اس تیرہ و تار ماحول سے نکالتا۔ اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا، جسے بیچ کر وہ اس کا علاج ۔۔۔۔۔"

"اگر زیور نہ ہو تو کوئی ہرج ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ میڈیم ۔۔۔ صرف آپ کا ہونا کافی ہے"۔۔۔۔ جیسے دُور، بہت دُور سے ایک مخنی سی آواز آ رہی تھی۔ اور وہ بنگالی جیولر اس اتھاہ تاریکی میں مینارۂ نور کی طرح اُبھرتا سا۔ کھائی دیا ۔۔۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ۔۔۔۔ بنگالی جیولر ۔۔۔۔ اور ڈورو تھی نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی تصویر کو بڑی بے دردی سے نوچ پھینکا ۔۔۔۔ اگر زیور نہ ہو ۔۔۔۔ اگر زیور نہ ہو ۔۔۔۔ اگر زیور نہ ہو ۔۔۔۔ ڈورو تھی نے گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"ڈورو تھی ۔۔۔! ڈورو۔ تم بولتی کیوں نہیں ۔۔۔؟؟"

"ہاں"۔ وہ بولی۔ مگر جیسے اس کے پاس بولنے کو اور کچھ رہ نہ گیا ہو۔

"ڈورو تھی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اب میری باتوں کا جواب بھی دینا گوارہ نہیں کرتیں۔ کل اسٹریپٹو مائی سین (STREPTOMYCIN) کے انجکشن بھی نہیں دلائے جا سکے۔ ڈاکٹروں نے سینی ٹوریم میں داخل کرانے کو کہا تھا تم سے وہ بھی نہ ہو سکا۔ آخر تم کیا چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں۔؟" یہ کہتے کہتے جون کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا گلا رندھ گیا اور ڈورو تھی کو ایسا لگا جیسے کسی نے سینے میں نشتر چبھو دیا ہو۔ وہ تڑپ اُٹھی

"نہیں نہیں جون ڈارلنگ ایسا مت کہو۔ خدا کے لئے ایسا مت کہو ۔۔۔!" اس کا جی بھر آیا۔ اور وہ سب کچھ بھول کر، سب کچھ فراموش کر کے اس کے گالوں سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور یہ دیکھ کر جون بھی ضبط نہ کر سکا۔ گھنٹوں ..... جیسے سارا دُکھ، سارا درد گھل کر بہہ رہا ہو۔ جیسے کائنات

میں بجز دونوں کے اور کچھ نہ ہو۔

"ڈورو تھی ـــــ ؟" اور ڈورو تھی بدستور سائیکل میں ہوا بھرتی رہی۔

"ڈارلنگ ـــــ ؟" ڈارلنگ چپ رہی!

"ڈورو تم مر تو نہیں گئیں ـــ ؟"

"کیا ہے ڈارلنگ ۔؟" خیالوں میں کھوئی ہوئی ڈورو تھی چونکی۔ اور اس نے سوچا کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش وہ یہ سب دیکھنے سے پہلے مر گئی ہوتی۔ اے کاش ۔!

"تم آج کہاں جا رہی ہو ڈورو ـــ ؟"

ڈورو تھی نے پمپ سائیکل سے نکالتے ہوئے کہا: "روشنی لانے ـــ گھر کی تاریکی کے لئے روشنی تو چاہیئے ہی ـ !"

"میں سمجھا نہیں تم آج کیا کہہ رہی ہو ـــ ؟"

"سچ کہہ رہی ہوں ڈارلنگ ـــ پڑوس والی مسلمان عورت کہتی ہے کہ جنت میں پھول ہوتے ہیں اور جہنم میں آگ۔ میں آج جہنم میں جا رہی ہوں۔ جہنم سے روشنی لانے ـ!" اسکی آواز میں درد تھا۔ روحانی کرب اور اذیت کا پرتو ـــ اور وہ باہر نکل گئی۔ ڈورو یہ مکانوں اور درختوں سے گھری ہوئی سنسان اور بیوہ کی چھاتی کی طرح ویران سڑک کے سینے پر سائیکل دوڑتی رہی۔ آہستہ آہستہ جیسے چکّے کی ہوا نکل گئی ہو۔ اور ڈورو تھی سائیکل پر بیٹھی اپنے ماحول سے لاپرواہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی۔ آج اُسے یہ سب کچھ کرنا پڑیگا۔ آج وہ خود اُس پستی میں گرنے جا رہی ہے کچے دھاگے سے بندھی ہوئی۔ ایک غیر محسوس طاقت کے ماتحت سوچتی ہوئی آنکھوں سے بہہ آنے والے سیلاب کو روکے ہوئے۔

سُرخ اینٹوں سے بنی گرجا کی عمارت اُسکے قریب آ گئی تھی۔ اُسکی نگاہیں آپ ہی آپ یسوع کے مجسّمے پر جا لگیں۔ یسوع کے دونوں ہاتھ کھُلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کسی کو پناہ میں لے لینا چاہتا ہو۔ اور اس کے چہرے پر ایک نورانی مسکراہٹ تھی۔ اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں۔

"لڑکی اُٹھ ..... !" "لڑکی اُٹھ ..... !!" "اُٹھ لڑکی اُٹھ ..... !!!" ڈورو تھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے جی میں آئی کہ اس آواز پر لبیک کہے۔ اور یسوع کے قدموں پر گر کر اتنا روئے اتنا روئے کہ اس کا سارا درد، سارا غم بہہ جائے۔ لیکن جون ـــ ؟

اور اس کی سائیکل آگے بڑھ گئی ـــــ

"لڑکی اُٹھ !" اس پستی سے، لڑکی اُٹھ ..... !!! ـــ یسوع کی آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

"لڑکی ....."

اور اس کی سائیکل جیسے آپ ہی آپ ایک چکّر کاٹ کر گھوم گئی اور ڈورو تھی اُتر کر یسوع کے قدموں پر گر پڑی اور پہروں روتی رہی۔

اور جب یسوع کے قدموں سے الگ ہوئی تو فضا پر دھندلکا چھانے لگا تھا۔ اور اُس نے محسوس کیا۔ جیسے واقعی اس کے دُکھ کا بار گراں ہلکا پڑ گیا ـــــ اُسے جون کا خیال آیا اور وہ سائیکل لئے تیزی سے اپنے گھر کی طرف لوٹ گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ جا کے جون کو سینے سے چمٹا لیگی اور کہیگی دیکھو ڈارلنگ میں کتنی خوش ہوں۔ دیکھو میں روشنی لے آئی ـــ ایک مقدس روشنی .....

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ کمرے میں دھندلکا گہرا ہو گیا ہے اور اس دُھندلکے میں جون بے خبر سو رہا ہے۔ اور بے خیالی میں اُسکا ایک ہاتھ پلنگ سے نیچے لٹک رہا ہے۔ اور کمرے میں اس کا گایا ہوا شیلے کا نغمہ ابھی تک گونج رہا ہے۔

گلاب کی پتیاں،
جب گلاب بکھر جاتا ہے
محبوب کی سیج پر بکھیر دی جاتی ہیں۔
اسی طرح، ترے خیال پر جب تو میرے پاس نہیں ہوتا
خود عشق آرام کرتا ہے

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

دو امریکی نظمیں

نکول سگویلین

سپاہی کی لاش

وہ کس کی گولی سے مرا؟
کون جانے!
وہ کہاں پیدا ہوا تھا؟
کہتے ہیں جو ویلانو میں!
وہ ملا کہاں؟
سڑک پر مرا پڑا تھا!
ساتھیوں نے دیکھا اور اُٹھالیا
اس کی محبوبہ آئی ہے اور اسے چوم رہی ہے
اس کی ماں آئی ہے اور رو رہی ہے
افسر آیا ہے
"اسے دفن کرو"
بس اتنا کہہ کر چلا جاتا ہے
سا رے گا ما پا دھا نی
وہ مردہ سپاہی جا رہا ہے
سا نی دھا پا
سپاہی کی اہمیت ہی کیا ہے؟
سا سا رے رے رے گا گا گا ما
سپاہیوں کی کیا کمی ہے؟

(ترجمہ)

ونی صنوز مارن

تین پرولتاری

خنجر
اپنے بوجھ سے ہانپتا ہوا
پہاڑ پر چڑھ رہا ہے
آہستہ آہستہ
(اس کے پُرامید کان چوٹی کی طرف اُٹھے ہوئے ہیں)
معمار!
اینٹ پر اینٹ چُن رہا ہے
(آہستہ آہستہ گنگنا رہا ہے)
خدا!
محنت سے سیاروں کی تخلیق کر رہا ہے ——
ایک کے بعد ایک
(اس کی خاموشی پُراسرار ہے)
تین پرولتاری!

(ترجمہ)

ایک پشتو نظم

سید رسول رضا

باغی دہقان

ہمارا تمہارا خدا ایک ہے
جب کہ ہم دونو ہی اس کے بندے ہیں تو پھر
یہ تفریق کیوں ہے یہ تقسیم کیوں ہے
یہ کیوں ہم گدا اور تم شاہ ہو
یہ کیوں بھوک سے ہم تڑپتے ہیں اور تم
خدا کی وسیع سرزمین کے اکیلے ہی وارث بنے ہو
یہ کیوں اتنے مجبور ہیں ہم کہ سجدہ تمہیں کر رہے ہیں
اُسے بھول کر جس نے پیدا کیا ہے
تمہارا ستم اور انگریز کا ظلم سہتے ہیں ہم
کیونکہ تم بھیڑیئے ہو
اور ہم بے زبان اور مظلوم بھیڑوں کے ریوڑ کی مانند
خاموش ہیں

یہ کھیتی یہ دانے یہ برسات
ان سب کا مالک خدا ہے
جلال ان کو دیتی ہے محنت ہماری
مگر اس کے حاصل پہ قابض ہو تم یہ عجب ماجرا ہے
کبھی ہاڑ کی ہم اُبلتی دوپہروں میں جلتے ہیں
اور پھر کبھی پوہ کی زمہریری فضاؤں میں دم توڑتے ہیں
اگر عیش و عشرت کی شاداب جنت میں تم بس رہے ہو
ہمارے یہ معصوم بچے جو بھوکے ننگے ہیں بیمار ہیں
اور ہم ہیں کہ بیکس ہیں لاچار ہیں
ہمارے گھروں میں تو مٹی کا اک ٹمٹماتا دیا بھی نہیں ہے
یہاں تو اندھیرا ہی رہتا ہے اک دائمی اور بھیانک اندھیرا
ہمارے لہو سے تمہارے محل جگمگاتے ہیں ان میں چراغاں ہے ہر سُو
سدا عیش و عشرت میں تم ہو مگن اور ہم ہیں کہ محنت کے تھے میں جتے ہیں
یہ پیمانہ ہاتھوں میں تھامے ہو جس کو ہمارے ہی سر سے بنا ہے
ہمارے ہی خوں سے یہ لبریز ہے
تم مئے سُرخ کہہ کر جسے پی رہے ہو
ہمارا ہی دل بھون کر تم ــ گزک کی طرح کھا رہے ہو
تم نے شیروں کو گیدڑ بنایا ہے

زمیں یہ زمیں تو تمہاری نہیں ہے
زمیں یہ زمیں تو ہماری نہیں ہے
یہ سب کی ہے اور سارے وارث ہیں اس کے

(ترجمہ)

دیوندر اسر

جائزے

(تبصرے کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

نقوشِ زنداں ——

"نقوشِ زنداں" سید سجاد ظہیر کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط انھوں نے وقتاً فوقتاً سینٹرل جیل لکھنؤ سے اپنی بیوی کے نام تحریر کئے ہیں۔ کیونکہ ان خطوط کی غرض اشاعت نہ تھی اس لئے ان کی اہمیت کافی نجی ہے، لیکن یہی نجی پن ان خطوط کی سماجی اہمیت اور ادبی قدر کو دوچند کر دیتا ہے۔ اسی لئے ان خطوط میں تصنع یا بناوٹ نہیں اور نہ ہی 'فن پارے' بنانے کے لئے ادبی شعبدہ بازی کے جوہر نظر آتے ہیں۔ اور سچی میں سماج اور فن کی اثر انگیزی کا راز مضمر ہے۔ ان سیدھے سادے نجی خطوط میں ایک نارمل انسان کے جذبات، احساسات، خیالات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ وہ قاری کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ محبت کا درد، جدائی کی تڑپ، وصل کی خواہش، ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں، گھریلو مسائل، سماجی رشتے، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور غم و دکھ یہ سب کچھ سماج و غیر کے سماجی شعور میں ڈھل کر اور اس کی انفرادیت کا رنگ لے کر ان خطوط کو انسانی زندگی کے لازوال نقوش بنا دیتے ہیں۔ یہ خطوط نجی ہونے کے باوجود اتنی وسعت اور گہرائی کے حامل ہیں کہ قاری تمناؤں سے بھرپور زندگی کو اس خوش آئند منزل تک لے جانے کے لئے اپنے اندر اُمنگ، جذبہ، تڑپ حرارت، قوت اور زندگی محسوس کرتا ہے۔

"نقوشِ زنداں" اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور آدرش زندگی کا آئینہ ہے۔ یہ مجموعہ کن خوبیوں کا حامل ہے ان کو بیان کرنا مشکل ہے۔ انھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نقوشِ زنداں کو سجاد ظہیر کی بیوی رضیہ سجاد ظہیر نے مرتب کیا ہے اور مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ صفحات ۲۷۲ ہیں اور قیمت تین روپے بارہ آنے

فکر تونسوی

آزادی کے بعد ——

مشہور ترقی پسند امریکی مصنف ہاورڈ فاسٹ کے ناول FREEDOM ROAD کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ احسن علی خاں نے کیا ہے اور کتب پبلشرز بمبئی نے شائع کیا ہے۔

اردو میں بلند پایہ ناولوں کے ترجموں کی ایک اور کڑی ہے جو نہایت حوصلہ افزا اور مستحسن ہے۔ یہ ناول انگریزی کے بیسٹ سیلرز اور اہم ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ اس میں اس امریکہ کے آزادی پسندوں کی جدوجہد کو ابھارا گیا ہے، جس کا رجعت پسند اور جنگ باز حکمراں طبقہ آج اس سے بھی زیادہ بھیانک ستم توڑ رہا ہے جو اس کے اجداد نے اس ناول کے آزادی پسندوں پر امریکی خانہ جنگی کے عہد میں توڑے تھے۔ ہاورڈ فاسٹ نے دکھایا ہے کہ امریکہ کے مظلوم اور پسماندہ عوام کس شاندار اور بلند عزائم کے ساتھ اپنی آزادی حاصل کرتے ہیں اور سچائی اور امن اور محبت اور خوشحالی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

خانہ جنگی کے بعد جبکہ آزادی پسند عوام کی جاں توڑ جدوجہد کے بعد امریکی جاگیرداروں کی زمینیں کسان عوام میں بانٹ دی گئی تھیں، تو اس وقت کا استحصالی طبقہ تلملا اٹھا تھا اور انھوں نے مسلسل سازشیں کر کے دوبارہ زمینوں کو ہتھیانے کیلئے مکروہ اور غلیظ قسم کے طریقے استعمال کئے تھے۔ اور ان طریقوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کسان عوام مسلح جدوجہد پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہاورڈ فاسٹ کے اس ناول کے کردار اس جدوجہد کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ موت کی آندھی نہیں بلکہ زندگی کے نقادوں کی طرح گونجتے ہیں۔

احسن علی خاں نے نہایت خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش اردو کے ترقی پسند ادب اور ہندوستان و پاکستان کے مظلوم اور ابھرتے ہوئے عوام کیلئے ایک تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔ غیر ملکی ترقی پسند ادب کی اشاعت پر ہماری جمہوری آزادی کی جدوجہد میں ایک بہترین معاون ثابت ہوتی ہے اور اس ناول سے ایک بہترین معاون ہاتھ آ ساتھ شامل ہوا ہے۔

کتابت اور چھپائی پر اگر کافی زیادہ توجہ دی جاتی تو اچھا تھا۔ ۴۳۲ صفحات کی قیمت ساڑھے پانچ روپے ہے۔

گرمی بلاشبہ شدید ہے
لیکن.....

روح افزا

ٹھنڈا اور تسکین دہ ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی

{مشہور طبی و سوشل رسالہ "ہمدرد صحت" کا نمونہ مفت طلب فرمائیں}

Hamdard PRODUCT

کامنی ہیر آئیل

کامنی ہیر آئیل بالوں کو بڑھاتا ہے۔ پیچ و خم دیتا ہوا خوب خوش نما بناتا ہے۔ بالوں کو گرنے نہیں دیتا جڑوں کو مضبوط، بالوں کو نرم اور چمکدار بناتا ہے گنجے پن دُور کرتا ہے اور نئے بال پیدا کرتا ہے اس کے قدرتی اجزاء بالوں کو سیاہ بنائے رکھتے ہیں سفید بالوں کو رفتہ رفتہ سیاہ کر دیتا ہے۔ یہ بقوی دماغ ہے نزلہ ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ پکنگ اور خوبصورتی میں دلایتی تیلوں کا مقابلہ ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بھینی بھینی خوشبو میں کبھی بیلا، کبھی نرگس، کبھی رات کی رانی کی مہک ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آتی معلوم ہوتی ہے پاس سے گزرنے والا خوشبو سے مسحور ہو کر مکھوم کر دیکھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ گویا باغ کے تمام مشہور اور دل پسند پھولوں کا ایک نادر و نایاب مجموعہ ہے جو "کامنی ھیر آئیل" میں آپ کو ملے گا

قیمت فی شیشی عہ (ایک روپیہ آٹھ آنہ) دو شیشیاں یا اس سے زیادہ منگانے پر محصول ڈاک میں کفایت رہے گی۔ تھوک کا کام کرنے والے حضرات ایجنسی کا معاملہ خط و کتابت سے طے کریں۔

بھارت نیشنل کمپنی نئی سڑک دہلی

سبیلاء

سجاد ظہیر

نقوشِ زنداں

مشہور عوامی لیڈر سید سجاد ظہیر نے سنٹرل جیل لکھنؤ
اپنی بیوی رضیہ سجاد ظہیر کو خطوط لکھے

خطوط ○ جن میں حسرتیں اور تشنہ کامیاں موجزن ہیں
○ اور حسرتوں اور تشنہ کامیوں کی دیوار ڈھا دینے کا عزم ہے
○ اور ایک ایسے خوش آئند مستقبل کی بھرپور ترجمانی ہے جس میں خاوند
اور بیوی کے درمیان جیل کی آہنی سلاخیں حائل نہ ہوسکیں گی

سید سجاد ظہیر کے ان خطوط کو کتابی صورت میں جمع
کر دیا گیا ہے قیمت 3/12

مکتبہ شاہراہ دہلی

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

سالانہ نو روپے
ششماہی پانچ روپے

ستمبر
۱۹۵۱ء
قیمت بارہ آنے

مکتبۂ شاہراہ - دہلی ۶

انڈیکس

راہ نما ۱۲ ۱۲ ۱۲ ۳۰

مقالے

سجاد ظہیر — سری نواس لاہوٹی ، ۵

اردو شاعری میں امروہہ کی توسیع — شمیم احمد ، ۱۲

نظمیں

پاکستانی دانیالوں سے — غلام ربانی تاباں ، ۲۵

جشنِ جمہوریت — مخمور جالندھری ، ۲۷

مستقبل — جمیل ملک ، ۲۹

دعوت — کمال احمد صدیقی ، ۳۰

ماں — نریش کمار شاد ، ۳۱

غزلیں

احمد ظفر ، حلیم صابر ، ۳۲

افسانے ، خاکے

سکنڈ لیڈی — مہندر ناتھ ، ۳۳

للی — ہنس راج رہبر ، ۳۸

ے پالک — صدیقہ بیگم ، ۴۳

لاشیں — گوربچن سنگھ ، ۵۲

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک ترکی نظم

موت — ناظم حکمت ، ۵۴

جائزے

جارج برنارڈ شاہ (نا انصاری) فکر تونسوی ، ۵۶

نالہ پابند نے (اختر انصاری اکبرآبادی) نریش کمار شاد ، ۵۶

ساتھیوں کا صفحہ ، ۵۷

شاہراہ بند نہ ہوگا ——— ، ۵۸

واحد علی بانگے ، انور عظیم

ہربنس گمبھیر ، سری رام چندھوک

شمیم احمد ، احمد سعدی

خورشید علی بیتاب ، نہال رضوی

بنسی نردوش

○ پبلشر : منشی عبدالقدیر - مکتبۂ شاہراہ - دہلی

○ پرنٹر : کمنہ پیتھو پریس - دہلی

راہنما

اداریہ

ادب اور سیاست میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آج اس بات سے کوئی بھی دیانتدار ادیب انکار نہیں کر سکتا اور چونکہ ایک دیانتدار ادیب انسانیت کی ضمیر کی آواز ہوتا ہے اور جہاں کہیں انسانیت پر ظلم ہوتا ہے، اس کی روح تلملا اُٹھتی ہے اور وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس ظلم کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے اس لئے سیاست کا گہری نظر سے مطالعہ اس پر اور بھی فرض ہو جاتا ہے۔

اپنے اس افتتاحیہ میں ہم اپنے ملک کی چار برس کی سیاست کا مختصر جائزہ لے رہے ہیں اور ملک کے ادیبوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اور بھی گہرائی سے ملک کی سیاست کو سمجھیں اور آئندہ کے لئے اپنے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔

شہنشاہیت یا ڈکٹیٹری کا دور، جس میں عوام کو حکومت کے بدلنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں ختم ہو چکا ہے اور اسکی جگہ لوک شاہی یعنی جمہوریت قائم ہو چکی ہے یا لوگ اس کے لئے جد وجہد کر رہے ہیں جمہوریت میں عوام حکومت کے نمائندے خود منتخب کرتے ہیں اور جو حکومت گروہ نمائندے عوام کی مرضی کے مطابق کام نہ کریں تو ... رائے کے مطابق انھیں گدی سے اُتار دیا جاتا ہے۔ ہندوستان بھی ایک جمہوری ملک کہلاتا ہے اور اس کے دو دھان میں بھی عوام کو مذکورہ بالا حق حاصل ہے جس کا عملی ثبوت آنے والے بڑے الیکشن میں دیا جائیگا۔

ہر جمہوری ملک کی حکومت پر فرض ہوتا ہے کہ وہ گاہے بگاہے اپنی کارگزاری عوام کے سامنے پیش کرتی رہے، مشکلات کے حل کی تجاویز رکھے اور بتائے کہ کن ذرائع سے اور کتنے عرصہ میں وہ فلاں فلاں مشکل پر قابو پا لیگی تاکہ عوام حکومت کے قول وفعل کا جائزہ لے کر طے کر سکیں کہ ملک کی بہتری اور خوش حالی کیلئے انھیں حکومت کا ہاتھ بٹانا ہے یا وقت کی ذمہ دار شخصیتوں کے ہاتھوں سے حکومت کی باگ ڈور لے لینا ہے۔

ملک کی آزادی اور ملک میں اپنی حکومت قائم ہونے کے بعد چار برس تک ہمارے ملک کی حکومت نے عوام کے سامنے اپنی کوئی کارگزاری نہیں رکھی کبھی کبھی کچھ باتیں ضرور دہرائی جاتی رہی ہیں ـــــ آزادی کے ساتھ ساتھ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے کی باتیں، ملک کی تقسیم اور اس کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کی خانہ بربادی کی باتیں، کشمیر پر پاکستان کے حملے اور باپو کی ہتیا کی باتیں۔ غذا کی کمی اور اشیا کے دام بڑھنے کی باتیں اور پھر بغیر کسی تشریح کے اپنے کارناموں کا بکھان اور ابھی مزید کارنامے کرنے کا ارادہ اور عوام سے اپیل کہ وہ بہتر شہری بنیں، صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، آبادی کی روک تھام کے لئے برتھ کنٹرول کریں، کم کھائیں اور زیادہ اُگائیں اور اپنے اندر قربانی کا مادہ پیدا کریں۔ لیکن ملک کے بھوکے ننگے عوام اس زبانی جمع خرچ سے مطمئن نہ ہوئے اور آخر ملک کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کمال مہربانی کے ساتھ کل ہند کانگریس کمیٹی کے بنگلور کے حالیہ جلاس کے موقع پر اپنی حکومت کی کارگزاری ملک کے سامنے پیش کر دی۔

ظاہر ہے کہ یہ رپورٹ پچھلے چار برس کی پوری تاریخ نہیں ہو سکتی۔ اس میں کچھ واقعات ہو سکتے ہیں اور باقی اِدھر اُدھر کی باتیں۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ اس مختصر سی جگہ میں ہم اس مختصر سی رپورٹ کا بھی بھرپور جائزہ نہ لے سکیں گے۔ یہاں ہم صرف چند نمونے اور ایک دیانتدار کانگرسی کی ان کے بارے میں رائے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

آزادی کے ساتھ ساتھ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے سے لے کر اشیا کے دام بڑھنے کی باتیں دہرانے کے بعد پنڈت جی نے اعتراف کیا کہ ملک کے حالات سدھارنے کے چکر میں حکومت بڑے بڑے چکروں میں پھنستی چلی گئی اور کام سنبھلتے ہوئے بھی نہ سنبھلا۔ نتیجہ کے طور پر عوام اور حکومت میں تعاون کی کمی ہوئی۔ یہ کمی بڑھتی گئی اور ان چار برس میں ـــــ زبردست کوششوں کے باجود ـــــ حکومت کے کاموں کے تئیں عوام کی بے رخی حد تک پہنچ چکی ہے۔

ہم پنڈت نہرو کی صاف گوئی کے مداح ہیں اور اسی لئے بڑے احترام لیکن دکھ کے ساتھ ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر اس حد تک بڑھی ہوئی بے اطمینانی کے بنیادی اسباب کیا ہیں۔ یہ بے دلی کیونکر دُور ہوگی۔ عوام کب تک صبر کا دامن تھامے رہیں گے۔ انھیں کب تک قربانی کا بکرا بننا ہوگا؟

اس اعتراف کے بعد پنڈت جی نے اپنی حکومت کے کارنامے گنائے ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں۔ ریاستوں کا ملایا جانا، سائنسی کھوج میں معرکے کی ترقی، دریاؤں پر بند باندھنے کی اسکیمیں، شہزار تھیوں کا بسانا، پلاننگ کمیشن کا قائم ہونا، نئے دھان کا اجرا، زمینداری سسٹم کو ختم کرنے کی تجویزیں، ہندو کوڈ بل ایسے انقلابی قدم کے لئے قانون بنا ڈالنا وغیرہ!

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ یہاں اس رپورٹ کا بھرپور جائزہ لینا بہت مشکل ہے اور ہم اسے غیر ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کے عوام بخوبی جانتے ہیں کہ حکومت کی ان معرکے کی ترقیوں کا ان کی بنیادی ضروریات ـــــ روٹی اور روزی پر کیا اثر پڑا ہے۔ اس رپورٹ پر بالتفصیل تبصرہ کرتے ہوئے مشہور کانگریسی لیڈر پنڈت سندر لال جی کے اخبار 'نیا ہند' میں سریش رام بھائی نے لکھا ہے کہ "اس ساری رپورٹ میں پنڈت جی کی صرف ایک بات کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہمارے گلے سے نہیں اُترتی اور وہ ہے ان کا یہ ماننا کہ سرکار اور جنتا میں بدمزگی بڑھی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان چار برس میں سوائے اس بدمزگی کے کسی دوسری چیز کی پیداوار نہیں بڑھی۔ اس سے کہیں زیادہ دُکھ ہمیں اس بات کا ہے کہ جن تین چیزوں پر پنڈت جی سب سے زیادہ زور دیتے ہیں ـــــ وگیان کھوج۔ ندی اسکیمیں اور پلاننگ کمیشن۔ وہ ملک میں ترقی لانے کے بجائے تباہی لانے والی ہیں"۔

ایسی اسکیموں پر عوام کا کروڑوں روپیہ ضائع ہو جانے پر دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے سریش رام بھائی مزید لکھتے ہیں کہ "ہم بکے جا رہے ہیں اپنے پونجی پتیوں کے ہاتھوں میں اور ہم سب بکے جا رہے ہیں امریکہ اور برطانیہ کے پونجی پتیوں کے ہاتھوں میں اسی کا نام ترقی ہے۔ اسی کا نام وہ بنیادی چیز ہے جس پر پنڈت نہرو ہمیں قربان ہو جانے کو کہتے ہیں"۔ وہ بار بار پنڈت نہرو کے اسی ایک جملے کو دُہراتے ہیں کہ "دراصل حکومت کے تئیں جنتا کی بے رخی بڑھی ہے" اور اپنے تبصرے کو ختم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ بے رخی ہی ایک سچائی ہے۔ یہی آزاد ہندوستان کی خود مختار حکومت کے کارناموں کا ایک سرٹیفکیٹ ہے، یہی ملک کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ سب سے بُرا حادثہ ہے، سب سے خطرناک حادثہ ہے"۔

ساتھیوں سے

شاہراہ کے گزشتہ شمارے میں شاہراہ کی تشویشناک اقتصادی حالت کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے شاہراہ کو بند کرنے یا جاری رکھنے کا مسئلہ آپ ساتھیوں کے سامنے پیش کیا تھا تاکہ آپ کے مفید مشوروں کی روشنی میں اسے جاری رکھنے یا بند کر دینے کے فیصلہ پر عمل کیا جا سکے اس کے ساتھ ہی آپ ساتھیوں سے اپیل کی گئی تھی کہ صرف اقتصادی مجبوریوں کی بنا پر عوامی تحریکوں کے ہمنوا اور صلح اور صحت مند ادب اور آرٹ کے اس بیباک نقیب کی آواز بند نہ ہونے دیں اور ہم نے یقین دلایا تھا کہ اگر ہر ساتھی شاہراہ کا ایک بھی نیا ساتھی بنا سکا تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی آواز میں رخنہ نہ ڈال سکے گی۔

ہم بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ شاہراہ کے ساتھیوں نے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ ہر قیمت پر شاہراہ کو بچانے کا اقرار کیا ہے۔ کئی ایک نے ایک ایک کے بجائے چار چار اور پانچ پانچ نئے ساتھی بنائے ہیں۔ کئی ایک نے اپنی بساط کے مطابق ہزار مالی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے اور بہت سوں نے اپنے حصہ کا ایک نیا ساتھی بنایا ہے اور بہت سوں نے عنقریب بنانے کا یقین دلایا ہے۔

ہم ان تمام ساتھیوں کی پُرخلوص عوام دوستی اور ادب نوازی کی قدر کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ آخری لمحہ تک انکی کوششوں کو رائیگاں نہ جانے دیں گے اور اس کے ساتھ ہم اپنے ان ساتھیوں کو ایک بار پھر انکے مقدس فرض کا احساس دلاتے ہیں جنھوں نے ابھی تک اپنے مفید مشورے نہیں دیئے اور نہ ہی اپنے حصہ کا ایک نیا ساتھی بنایا۔

پاکستان کے ساتھی اپنا چندہ جاوید ایجنسیز پوسٹ بکس ۱۸۱۸، کراچی کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ منی آرڈر کے کوپن پر لکھ دیں کہ اس رقم کو شاہراہ کے حساب میں جمع کر لیا جائے اور منی آرڈر کی رسید ہمیں بھجوا دیں تاکہ ہم فوراً ان کے نام شاہراہ جاری کر سکیں۔

سجاد ظہیر

(سوانح)

سری نیواس لاہوٹی

(اس مضمون کی ترتیب میں، میں نے راہل جی کی کتاب "نئے بھارت کے نئے نیتا" سے مدد لینے کے علاوہ رضیہ سجاد ظہیر، ڈاکٹر حسین ظہیر اور ڈاکٹر رشید جہاں سے بھی معلومات حاصل کی ہیں۔ اس لئے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ سری نواس لاہوٹی)

اُردو کے نوجوان ادیبوں میں سجاد ظہیر کا بہت بلند مقام ہے۔ ان کی تصانیف کو عوام بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب وہ اپنے جونپور ضلع کی پوربی بولی بولتے ہیں تو کوئی بھی انسان ان کو اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں کہہ سکتا۔ وہ بالکل سادہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ مگر چکنے والی چیز کو کتنا ہی اندھیرے میں رکھا جائے وہ چمکتی رہے گی۔ ان کو دوستوں اور خاندان میں "بنے" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

سجاد ظہیر ۵ نومبر ۱۹۰۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد سر وزیر حسن وہیں پر وکالت کرتے تھے۔ سر وزیر کا خاندانی مکان موضع کلاں پور ضلع جونپور میں ہے۔ بنے کی والدہ سکینۃ الفاطمہ بہت با اخلاق اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ صوبۂ متحدہ میں اعلیٰ خاندان کی شاید وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے پہلے پہل پردہ کو خدا حافظ کہا۔ سکن بی بی، گاؤں والے بیچارے اس نام کو آسانی سے ادا کر سکتے ہیں کو شاید الہ آباد اور لکھنؤ کے تہذیب یافتہ ماحول میں گفتگو کرتے ہوئے اتنی خوشی محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ اپنے سیکے کے گاؤں شاہ گنج کے جاہل کسانوں سے گفتگو کرتے ہوتی ہے۔ سکن بی بی کے پانچ لڑکوں میں بنے چھوٹے اور سب سے پیارے ہیں۔

لڑکپن میں بنے کو کہانیاں سُننے کا بڑا شوق تھا۔ اور گھر میں جونپوری خادموں کو جو بھی کہانیاں یاد تھیں سب کو ایک ایک کر کے سُن لیا۔ اس وقت سید وزیر حسن (بہت جلد میں سر کا خطاب ملا) ایک اچھے وکیل ہی نہیں بلکہ قومی خیالات کے حامل، شہر کے مشہور آنریریوں میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بنے کو گھر بیٹھے ہی ملک کے بڑے بڑے قائدین کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جو مہمانوں کی حیثیت سے سید صاحب کے یہاں آیا کرتے تھے۔

جب بنے پانچ برس کے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں قاعدہ بغدادی تھما کر مولوی صاحب کے پاس بھیجا گیا۔ وہ تین سال تک گھر ہی میں مولویوں کے پاس اُردو، عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ فارسی کی گلستاں اور بوستاں کو بنے نئے مولوی صاحب کے پاس ہی ختم کر دیا۔ بنے کو صبح سویرے اُٹھ کر مولوی صاحب کے پاس قرآن پڑھنے کے لئے جانا پڑتا تھا۔ صبح کی نیند کتنی پیاری ہوتی ہے اور پھر کھلنڈرے لڑکوں کے لئے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔ بنے میاں کے لئے ہر روز صبح کا یہ اُٹھنا اور مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لئے جانا زندگی کی سب سے کڑوی بات معلوم ہوتی تھی اور وہ ہر روز حیلہ حوالہ کیا کرتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لئے ہر روز انھیں ڈانٹ سننی پڑتی تھی۔ گھنگھرو، مٹھائیوں اور نئے کپڑوں کی وجہ سے بنے میاں نے اللہ کے نام پر زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ روزہ بھی رکھا۔ ابھی اللہ میاں کے عدم وجود کی جانب ان کے خیالات مائل نہیں ہوئے تھے۔ بھوپرے کی میٹھی نیند سے محروم ہو جانے کی وجہ سے مولوی صاحب ان کو شیطان معلوم پڑتے تھے۔ اور بنے دل ہی دل میں دعا کیا کرتے تھے کہ "اگر مولوی صاحب مر جائیں تو اللہ میاں ہے"۔ مولوی صاحب تو نہیں مرے لیکن اللہ میاں کے متعلق اس وقت انھوں نے کیا خیال کیا اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔

گورنمنٹ جوبلی اسکول اس وقت لکھنؤ کا سب سے اچھا اسکول تسلیم کیا جاتا تھا۔ بنے ۱۹۱۷ء میں یعنی ۹ سال کی عمر میں بنے میاں کو پانچویں درجہ میں شریک کرایا گیا۔ بنے کو ہاکی، فٹ بال وغیرہ کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن وہ والدہ کی آنکھ بچا کر ہی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل سکتے تھے۔ کیونکہ سکن بی بی کا خیال تھا کہ لکھنؤ کے لڑکے بڑے آوارہ ہوتے ہیں۔ انھیں تاش کے کھیل سے سخت نفرت تھی اس لئے بنے کو گنجفہ ہاتھ میں لینے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ بنے میاں کو ابتدا ہی سے ادب کا خاص شوق تھا۔ یہ وہ تیرہ سال کے ہونے تک انھوں نے کئی شاعروں کے دیوان چاٹ ڈالے۔

شیعہ خاندان میں پیدا ہونے اور پھر لکھنؤ کے شیعہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے وہاں کا محرم بننے میاں کو بہت اچھا معلوم ہوتا تھا۔ خاص طور پر مجلسوں میں جب تیئیں کے مرثیوں کو پڑھا جاتا تھا تو وہ جبر کرکے بھی اپنے آنسوؤں کو نہیں روک سکتے تھے۔ لیکن ان کو اکثر محرم کے زمانہ میں لکھنؤ کے بجائے ماما کے یہاں رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ ان کی والدہ کو اپنے میکے کا محرم زیادہ پسند تھا۔ بننے میاں بہت ہی رحم دل واقع ہوئے تھے جب ملازم لڑکوں پر ڈانٹ پڑتی تو ان کا کلیجہ پسیج جاتا تھا۔ قحط کے زمانہ میں خریدی ہوئی لونڈیوں کی جب پٹائی ہوتی تھی تو وہ اپنی والدہ کے پاس فریاد کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اپنے سے چار سال بڑے بھائی حسین ظہیر بننے کے گہرے دوست تھے۔ جب کبھی یہ دونوں لڑ پڑتے تو ان کی والدہ کو بیچ بچاؤ کرنا پڑتا تھا۔

اردو۔ انگریزی اور تاریخ بننے کے پسندیدہ مضامین تھے لیکن حساب سے ان کا دم گھٹ جایا کرتا تھا۔ مگر یہ مضمون ناگزیر تھا اس لئے پڑھنا پڑتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ سرکاری ملازمین ہر جگہ اپنی خیر خواہی کو جتلانے کے لئے واجب اور غیر واجب طریقوں سے جنگ کے نام پر چندہ وصول کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں جوبلی اسکول کے صدر مدرس سے ان کی جھڑپ ہوگئی۔ صدر مدرس نے کہا کہ "تمہارے والد کے پاس لاکھوں روپیہ ہے" بننے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے فوراً جواب دیا کہ "انکم ٹیکس بھی تو دینا پڑتا ہے"۔ اس وقت بننے کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ بننے اور صدر مدرس کی جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علموں کی اکثریت نے بانڈز نہیں خریدے۔

اسکول کے پرنسپل اینگلو انڈین تھے۔ ۱۹۱۵ء کی بات ہے کہ اسکول کا سالانہ جلسہ منایا جا رہا تھا۔ اس جشن کے دوران میں پرنسپل صاحب کی بیوی کو بھی اردو میں تقریر کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے ہندوستانیوں کی نمک حلالی کے بہت سے قصیدے سنائے۔ بننے کو یہ باتیں نہ صرف ناگوار گذریں بلکہ ان سے ایک طرح کی نفرت پیدا ہوگئی۔ اسی سال بننے کو مسوری جانے کا بھی موقع ملا اور انھیں ہمالیہ کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوا۔

"جنگ بڑے اعلیٰ مقاصد کے لئے لڑی جا رہی ہے"۔ اس نعرے کو دہراتے دہراتے انگریزوں کے حلق خشک ہو رہے تھے لیکن جب مسز اینی بیسنٹ نے ہندوستان کے لئے "ہوم رول" دینے کی تجویز پیش کی تو انھیں فوراً نظر بند کر دیا گیا۔ لکھنؤ والے اس کے خلاف احتجاج بلند کرنے کے لئے رفاہ عام ہال میں جلسہ منعقد کرنا چاہتے تھے لیکن ناظم ضلع نے اس کی اجازت نہیں دی۔ گیارہ سال کے بننے پر ان باتوں کا گہرا اثر پڑا۔ ۱۹۱۷ء کا ماہ دسمبر ہماری قومی تاریخ میں ایک یادگار مہینہ رہے گا۔ اس سال لکھنؤ میں کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا۔ کئی سالوں تک جیل میں زندگی بسر کرنے کے بعد لوکمانیہ تلک اس اجلاس میں شریک ہونے کے لئے لکھنؤ پہنچے۔ گاڑی سے گھوڑوں کو ہٹا دیا گیا اور عوام نے اس گاڑی کو اپنے ہاتھوں سے کھینچا۔ پورا لکھنؤ "تلک مہاراج کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ کانگرس کے اسی اجلاس میں کانگرس اور مسلم لیگ کا تاریخی معاہدہ ہوا۔ اس وقت وزیر حسن مسلم لیگ کے معتمد عمومی تھے اس لئے بننے میاں کو بارہ سال ہی کی عمر میں ملک کے مشہور قائدین کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مسز سروجنی نائیڈو، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کئی دفعہ انکے مکان پر آئے۔ اور ہفتوں قیام کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بننے کی تعمیر میں ان واقعات کا بہت بڑا حصہ رہا ہے تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔

بننے اب اخبارات کا مطالعہ بھی کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ کا "سیارہ" نامی اخبار جسے خود ان کے چچا سید شبیر حسن نکالتے تھے جب تک شائع ہوتا رہا بننے اسے پابندی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پبلک لائبریری میں جا کر وہ "ماڈرن ریویو" بھی پڑھا کرتے تھے۔ روسی انقلاب کے بارے میں اس وقت ان کو صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ انقلابیوں نے شیعہ ایرانیوں پر ظلم کیا ہے۔ اور امام رضاؑ کے مقبرہ پر گھوڑے دوڑائے گئے ہیں لیکن بننے کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ روس میں انقلاب ہو گیا ہے۔ کیونکہ انقلاب کا لفظ ان کو بہت پسند تھا۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بننے میں وسیع النظری پیدا ہونے لگی۔ ۱۹۲۰ء میں ان کے والدین کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لئے تشریف لے جا رہے تھے اور انھوں نے ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ بننے کو بھی اپنے ہمراہ لے جانے پر آمادگی کا اظہار کیا تو بننے کو بہت خوشی ہوئی۔ ہندوستان سے باہر کی دنیا کیسی ہے اس کو دیکھنے کے لئے بننے بہت بے چین تھے۔ قافلہ بمبئی پہنچا۔ ایک نوکر کو ہمراہ بننے کچھ سامان کی خرید کے لئے بازار گئے لیکن کسی جیب کترے نے ان کا پاکٹ غائب کر دیا۔ جس میں صرف ستر روپے تھے۔ اس کے

جدبتے بغیر کچھ خریدے مایوس لوٹے۔ سمندر اور جہاز کو دیکھ کر انھیں بڑی خوشی ہوئی۔

کربلا سے واپسی کے بعد بنے دوبارہ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہوگئے۔ (۱۹۲۱ء میں انھوں نے درجہ دوم کے ساتھ میٹرک کا میاب کیا اردو۔ انگریزی اور سائنس میں انھوں نے اچھے نمبر حاصل کئے تھے۔ لیکن ریاضی نے ان کی لٹیا ڈبو دی۔

ملک میں عدم تعاون اور خلافت کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ بنے کے دل میں جوش پیدا ہوا لیکن انھوں نے تعلیم ترک نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی ان کو راہ پر لگانے والا نہیں ملا۔ ۱۹۲۲ء میں لکھنؤ کرسچین کالج میں شریک ہوئے۔ ان کے مضامین فارسی۔ انگریزی اور تاریخ تھے۔ اس وقت کالج میں رنگا ایر اور ہرکرن ناتھ مصرا اور اسی طرح کے دوسرے قائدین کی تقاریر ہوا کرتی تھیں جس میں بنے پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ اس وقت ان کے والد اودھ چیف کورٹ کے جج تھے اور قومی ذمہ داریوں کا بوجھ بنے نے سنبھال لیا تھا۔ اب وہ کھدر پہننے لگے تھے۔ اور گوشت کھانا اور پلنگ پر سونا چھوڑ دیا تھا۔ اس دوران میں وہ پابندی کے ساتھ متن ماہ تک قرآن کی تلاوت بھی کرتے رہے خاندان والوں نے بنے کو خبطی سمجھا۔ والد بنے کی ان حرکتوں پر مسکرا دیتے تھے۔ اور والدہ پریشان ہوا کرتی تھیں لیکن کوئی بھی ان کی راہ میں روڑا نہیں اٹکاتا تھا۔ لکھنؤ میں سروجنی کے لڑکے کی قومی زندگی اور سادگی مشہور ہوگئی تھی۔

۱۹۲۳ء اور ۲۴ء میں بنے نے کئی انگریزی اور فرانسیسی مصنفوں کی تصانیف کو پڑھ ڈالا۔ ان میں اناطول فرانس اور رسل کی کتابوں نے بنے کے دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ رسل کی کتابیں پڑھنے کے بعد بنے پورے طور پر دہریہ ہوگئے۔ انٹرنس کا میاب کرنے کے بعد جامعہ لکھنؤ میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔ تاریخ۔ معاشیات اور انگریزی ان کے خاص مضامین تھے۔ اس وقت کانپور میں "میرٹھ کانسپریسی کیس" کی شنوائی ہو رہی تھی۔ اور اخباروں میں روس۔ ماسکو اور لینن اور انقلاب کا نام زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ روس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش ابھر آئی اور انھوں نے کتب خانہ میں جتنی بھی کتابیں ان کو دستیاب ہوسکیں ایک ایک کرکے پڑھ لیا۔ یہاں اس امر کے وضاحت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ان کتابوں کی اکثریت مخالف روسی خیالات سے بھری ہوئی تھی۔

ادھر کچھ دنوں سے بنے کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی اور اکثر فرنش رہا کرتے تھے۔ بیماری کے دوران میں انھوں نے ۱۹۲۶ء میں بی۔اے کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی۔ اب انھیں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانا تھا۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر انھیں ایک سال کے لئے رک جانا پڑا۔ اس دوران میں وہ فارسی اور ہندی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں بنے ولایت کے لئے روانہ ہوگئے۔ مارسیلز میں انھوں نے پہلی دفعہ یورپ کو دیکھا اور اس سے متاثر ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی حسین ظہیر ہیڈلبرگ (جرمنی) میں کیمیا کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پیرس میں آکر ان سے ملاقی ہوئے بنے نے دو تین دن پیرس میں رہ کر وہاں کی چیزوں کو دیکھا اور اس کے بعد چار روز لندن میں قیام کرکے آکسفورڈ چلے گئے۔ اور جامعہ میں داخلہ لے لیا۔ تاریخ جدید۔ معاشیات اور سیاسیات کو انھوں نے منتخب کیا۔ اس وقت ان کے استاد پروفیسر کول تھے۔ جامعہ آکسفورڈ میں رجعت پسندوں کا زور تھا اور تمام استاد قدامت پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

آکسفورڈ میں زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اس لئے کہ ان پر دق کا حملہ ہوگیا اور انھیں مجبوراً جامعہ کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہ یہاں سے سوئٹزرلینڈ چلے گئے جہاں ایک سینی ٹوریم میں بغرض علاج شریک ہوگئے۔ سال بھر کے قیام کا بنے پر کافی اثر پڑا۔ اور وہ یہاں فرانسیسی زبان اور ادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ روس اور کمیونزم سے متعلق بھی ان کو کافی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہیں پر انھیں پہلی دفعہ سینی ٹوریم کے ڈائرکٹر کی مہربانی سے سوویت فلم "مسدر" دیکھنا نصیب ہوا۔ ان کے ساتھ اس وقت ڈاکٹر حسین ظہیر بھی تھے۔

صحت ٹھیک ہو جانے کے بعد ۱۹۲۸ء میں بنے دوبارہ جامعہ آکسفورڈ میں شریک ہوئے۔ اب وہ مستقل مزاج اور کمیونسٹ بن چکے تھے۔ یہاں پر ان کی پارلیمنٹ کے کمیونسٹ رکن سکلت والا سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت محمود الظفر بھی یہیں تعلیم پا رہے تھے۔ اس لئے قدامت پسندوں کے اس قلعہ میں بنے اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کرتے تھے۔ لندن میں ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر احمد جیسے اور بہت سے ہندستانی

نوجوان ساتھی موجود تھے۔ اور ان ہی کی ایماء پر بنے لندن کی ہندوستانی کانگریس پارٹی کے رکن بن گئے۔ آکسفورڈ میں ہندوستانی طالب علموں کی ایک انجمن ہے۔ بنے اس کے نمائندے کی حیثیت سے فرانکفرٹ میں ہونے والی مخالف سامراجی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ان کو سوویت نمائندوں سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ سوویت نمائندوں نے ہندوستان کے بارے میں بہت کچھ باتیں دریافت کیں اور جدوجہد آزادی سے متعلق اپنی کامل ہمدردی کا اظہار کیا۔ اسی سال لندن میں سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس نکالا گیا تھا۔ بنے بھی اس میں شریک ہوئے اور ان کو پولیس کی لاٹھیاں کھانی پڑیں۔

(۱۹۳۲ء میں آکسفورڈ سے بی۔ اے کامیاب کرنے کے بعد ڈنمارک۔ جرمنی۔ ہالینڈ۔ آسٹریا اور اٹلی کی سیر کرتے بنے ہندوستان واپس ہوئے سوئٹزرلینڈ کے دوران قیام میں انھوں نے "انگارے" میں شائع ہونے والی بہت سی کہانیاں لکھ لی تھیں۔ جو ترقی پسند خیالات کی نمائندہ تھی ہندوستان میں اس کتاب کے شائع ہوتے ہی اس کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ سجاد ظہیر کی پہلی تصنیف نہیں تھی۔ بلکہ اس سے قبل بھی انھوں نے کئی کہانیاں لکھی تھیں جو "زمانہ" میں شائع ہوئیں۔)

(ہندوستان میں چند ماہ قیام کے بعد وہ دوبارہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ اب ان کا قیام لندن ہی میں تھا اور وہ اپنا زیادہ تر وقت سیاسی کاموں میں صرف کرنے لگے تھے۔ یہ مزدوروں کے جلوسوں میں شامل ہوتے اور ان کی جماعتوں میں کام کیا کرتے تھے گول میز کانفرنس کے وقت جب گاندھی جی لندن پہنچے تو بنے اور ان کے ساتھیوں نے گاندھی جی سے ان کے لائحہ عمل پر گفتگو کی اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔ اسی زمانہ میں بنے ہندوستانی طالب علموں کی یونین کی جانب سے شائع ہونے والے اخبار "بھارت" کی ادارت کرنے لگے اور اس سے علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے "نیو انڈیا" کے نام سے اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس وقت یہ قانون کے طالب علم تھے لیکن ان کا بیشتر وقت رالف آف ڈیوڈ گسٹ اور دوسرے ادبی کاموں کی صحبت میں گذرتا تھا۔ اور قانون جسے وہ پڑھنے کے لئے لندن میں ٹھیرے ہوئے تھے ایک غیر اہم سی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ بالکل معمولی، غیر ضروری اور اہمیت سے خالی! چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"ہم رفتہ رفتہ سوشلزم کی طرف مائل ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفہ کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کے سلجھانے میں مدد دے سکے۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیں۔ جیسے جیسے ہم اپنے مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کر کے تاریخی، سماجی اور فلسفیانہ مسئلوں کو حل کرتے اس نسبت سے ہمارے دماغ روشن ہوتے اور ہمارے قلب کو سکون ملتا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی۔"

اسی زمانہ میں بنے نے ڈاکٹر ملک راج آنند اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ہندوستانی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور اس کے معتمد عمومی منتخب ہوئے۔ اس کے بعد جب فرانس میں رومارولاں۔ آراگوان اور دوسرے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں نے ایک مخالف فسطائی ادیبوں کی انجمن کی بنیاد ڈالی اور اس کا پہلا اجلاس پیرس ہی میں منعقد ہوا تو اس وقت سجاد ظہیر ہی ہندوستانی ادیبوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور ہندوستان کی جانب سے بین الاقوامی ادیبوں کے اس اجتماع کو بھرپور یقین دلایا کہ ہم ہندوستانی ادیب بھی ان کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ چنانچہ وہ اس کانفرنس کا حال اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"یہ پہلا موقع تھا جب قریب قریب دنیا کی ہر مہذب قوم کے ادیب باہم صلاح و مشورہ کے لئے ایک مقام پر جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ تہذیب و تمدن کو رجعت پسندی اور تنزل کی اٹھتی ہوئی لہر سے بچانے کے لئے ان کو انفرادیت کو خیرباد کہہ کر خود اپنی جماعت کو منظم کرنا ضروری ہے۔ صرف یہ ایک موثر طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے وہ ترقی و فلاح کی قوتوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کو افزائش و نشوونما کا پورا موقع دے سکتے ہیں۔ اور اس طرح جماعتی حیثیت سے اپنی ہستی کو ایک انقلاب انگیز

عمدہ میں فنا ہو جانے سے بچا سکتے ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی کانفرنس میں مختلف خیال اور عقیدہ کے ادیب جمع تھے لیکن ایک چیز کے بارے میں وہ سب متفق تھے۔ وہ یہ تھی کہ ادیبوں کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ آزادیٔ خیال و رائے کے حق تحفظ کی کوشش کرنی چاہیئے۔ فاشزم یا سامراجی قوتیں جہاں بھی ادیبوں پہ جا بجا نہ پابندیاں عائد کریں یا ان کے خیالات کی بنا پر ان پہ مظالم کریں اس کے خلاف پُرزور احتجاج کرنا چاہیئے۔ دوسری چیز جو اس کانفرنس میں سب محسوس کرتے تھے یہ تھی کہ ادیب اپنے حقوق کا بہترین تحفظ اسی حالت میں کر سکتے ہیں جب وہ عوام کی آزادی کے "متحدہ محاذ" کا جزو بن کر محنت کش طبقوں کی پشت پناہی کریں۔"

۱۹۳۵ء میں بنّے بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہوئے۔ یورپ کے دوران قیام کا انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جو "یادیں" کے نام سے شائع ہوا ہے بڑے ہی دلچسپ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ یہ مضمون کیا ہے گویا اس وقت کی پوری یورپی سیاست کا ایک واضح عکس ہے جس کو انھوں نے بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور یہی اندازِ بیان اور طرزِ تحریر بنّے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اپنی واپسی کے دوران میں بنّے کچھ دنوں کے لئے پیرس میں رُک گئے اور اپنا زیادہ تر وقت انھوں نے "لندن کی ایک رات" کے لکھنے میں صرف کیا۔ لیکن اس کے علاوہ انھوں نے وہاں کے ترقی پسند ادیبوں سے بھی راہ و رسم پیدا کی۔ جن میں رومارولاں۔ لوئی اراگوں۔ آندرے جید جیسی قابلِ ذکر ہستیاں ہیں۔ ان ادیبوں سے انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے متعلق بھی تبادلہ خیال کیا تاکہ ان لوگوں کے تجربات کی بنیاد پر ہندوستان میں بھی ایسی انجمن کی تنظیم کی جا سکے۔ جب انھوں نے اراگوں سے دریافت کیا کہ ہمارا ارادہ بھی ہندوستان میں اس تحریک کو شروع کرنے کا ہے اور اس کے لئے ہم آپ کے تجربات سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں تو اراگوں نے خاص فرانسیسی طرز سے دونوں ہاتھ اٹھائے اور مسکرا کر جواب دیا کہ:

"یہ نہ پوچھئے۔ ادیبوں کی تنظیم سے بڑھ کر مشکل دنیا میں اور کسی جماعت کی تنظیم نہیں۔ ہر ادیب اپنا راستہ الگ نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم ہمیں مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ زمانہ کے حالات خود ادیبوں کو اپنے آرٹ کی حفاظت اور ترقی کے لئے تنظیم کرنے پہ مجبور کر رہے ہیں۔"

ہندوستان واپس ہونے کے بعد والدین کو بنّے سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ آخر انھوں نے پانی کی طرح روپیہ خرچ کر کے آٹھ سال تک یورپ میں ان کو تعلیم دلوائی تھی۔ گھر والوں کو اُمید تھی کہ بنّے بیرسٹر بن کر آئے ہیں اور اب کچھ کر سکتے ہیں ـــ بنّے نے الہ آباد میں وکالت شروع کر دی لیکن وکالت صرف بیرسٹری کی سند حاصل کر لینے سے تھوڑے ہی چلتی ہے۔ اس کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے۔ نسلی امتیازات کے دلدل میں پھنسے ہوئے انگلستان کے اعلیٰ طبقات کے معاشرے کی بہ نسبت انھیں انگریز کمیونسٹوں کا معاشرہ بہت ہی متاثر کن معلوم ہوا اور بہت سے قابلِ ذکر ہندوستانی طالب علموں کی طرح یہ بھی اس جانب متوجہ ہوئے۔ بنّے اس معاشرہ کا جتنا قریب سے مطالعہ کرتے گئے اتنا ہی ان پر زیادہ اثر پڑا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور انھیں قومی آزادی اور بین الاقوامی امن کا راستہ صاف طور پہ دکھائی دینے لگا۔ ملک کی مذہبی۔ سیاسی اور سماجی گتھیاں ایک ایک کر کے ان کے سامنے آنے لگیں۔ لیکن ان گتھیوں کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آکسفورڈ کا طلسمان اور بیرسٹر بن جانا ایک ضمنی چیز تھی۔ بنّے نے تو اپنے آپ کو ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے ڈھال لیا تھا۔ اسی لئے وہ وکیلانہ دل و دماغ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت کانگرس کے کاموں میں صرف ہونے لگا۔ اس وقت جواہر لال نہرو صوبائی کانگرس کمیٹی کے صدر تھے اور بنّے الہ آباد سٹی کانگرس کمیٹی کے معتمد منتخب ہوئے۔ اسی زمانہ میں وہ دو سال تک کانگرس صوبائی اسمبلی کے رکن بھی رہے۔ ۱۹۳۶ء میں وہ کل ہند کانگرس کمیٹی کے رکن منتخب کئے گئے اور مسلسل ۹ سال تک اس کے رکن رہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد ۱۹۴۵ء میں دوسرے کمیونسٹ ساتھیوں کے ساتھ انھوں نے بھی کانگرس سے استعفیٰ دیدیا۔ کانگرس کا رکن رہتے ہوئے ساتھ ساتھ وہ سوشلسٹ پارٹی کے بھی سرگرم کارکن بن گئے۔ اور اسی زمانہ میں "نیا بھارت" کے نام سے ہندی ہفتہ وار اخبار نکالنے لگے۔ ۱۹۳۶ء میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی گئی اور بنّے اس کے معتمد چنے گئے۔ اس دوران میں انھوں نے "بیمار" نامی ایک ڈرامہ بھی لکھا جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ الہ آباد کے قیام کے دوران میں

وہ مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم میں بھی حصہ لینے لگے اور صوبائی کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے میں انھوں نے بھاروداج کا بھی ہاتھ بٹایا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اور جولائی ۱۹۳۷ء میں یہ گرفتار ہوئے اور کانگرس منسٹری کے برسر اقتدار آنے کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔)

۱۹۳۸ء میں بنے کے سر پر سہرا باندھا گیا اور امیر بارات گئی۔ بیوی (رضیہ) بھی انھیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی مصنفہ ملیں۔ شادی کے بعد انھوں نے جامعہ اردو آباد سے پہلے درجہ میں ایم۔ اے کا میاب کیا۔ دولہا۔ ان کا جوڑا بہت اچھا رہا۔ اس میں کسی کو شبہ نہیں۔ لیکن ابتداء میں اس محبت کی رستہ کشی جاری رہی۔ ایک امیر خاندان کی سید زادی اور پھر سر سید و زیر حسن کی بہو جس کے سب لڑکے کوئی آئی سی۔ ایس۔ کوئی ڈاکٹر اور کوئی بیرسٹر۔ رضیہ کو شادی کے وقت بہت خوشی ہوئی کہ ان کے شوہر ایک بہت بڑے خاندان کے سپوت اور آکسفورڈ کے گریجویٹ اور بیرسٹر ہیں۔ اور جن کی شہرت ہر ایک کی زبان پہ ہے۔ مگر جب رضیہ بنے کے گھر آئیں اور بنے میاں کا جائزہ لیا تو ان کا ماتھا ٹھنکا اور انھوں نے اپنے میاں کو پاگلوں کے راستہ سے ہٹا کر صحیح راستہ پر لگانا اپنا فرض سمجھا کیونکہ ان کو اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اور میاں کو بھی ان سے کافی محبت تھی۔ رضیہ جب بنے کو ان کے متعین کئے ہوئے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتیں تو میاں مسکرا دیتے اور پھر اپنی راہ پر چلنے لگتے۔ رضیہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ مگر یہ بات تو ان کے بس کی نہیں تھی کہ وہ میاں کے دوستوں کی محفل میں بھی ان کا پیچھا کرتیں اور ان کو باز رکھ سکتیں رضیہ بنے میاں کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں مصروف ہی تھیں اور وہ کسی وقت ان سے صاف طور پر کہہ دینا چاہتی تھیں کہ اپنی موجودہ زندگی میں یا تو مجھے منتخب کرنا ہوگا یا پھر اپنے کاموں کو۔ بنے اس کا کیا جواب دیتے۔ شاید اس کے متعلق غور کرنا ہی بے سود تھا۔ لیکن محبت اور سیاسیات کی اس رستہ کشی کے دوران میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کا تاریخی دن آن پہنچا۔ اور بنے میاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ دوران نظر بندی میں سجاد ظہیر نے رضیہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں وہ ہر تحریکی کارکن کے لئے نشان راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں وہ رضیہ کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

"میں تو صرف اس امید پر جیتا ہوں کہ ہم اپنی جذباتی یگانگت کی بنا پر اپنی مشترکہ زندگی کا مستقبل میں ایسا نقشہ بنائیں جہاں ہم ذہنی اور رومانی توازن بھی جسمانی میل کے ساتھ ساتھ قائم کر سکیں۔ ہماری گذشتہ ناہمواریاں اور ناکامیاں اس کام میں ہماری مددگار ہوں گی۔ اور اس وقت مجھے کوئی وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ کیوں ہم اپنی اس نئی مشترکہ زندگی کو مکمل طور پر کامیاب نہ بنا سکیں کیوں نہیں۔ مجھے تم سے بے انتہا محبت ہے۔ مجھے تم پسند ہو۔ اچھی لگتی ہو۔ تم میں وہ ذہنی صلاحیت ہے جس کی میں اپنی شریک زندگی میں ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ ہمارے ارادے بلند ہیں۔ ہم دنیا میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارے جذبات میری طرف سے کیسے ہیں۔ میں بہ دل و جان تمہارے خطوں کے پیم رس سے بھرے ہوئے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے کو سچا اور مخلص ماننے کی کوشش کرتا ہوں۔ پھر ہم اگر اس حد تک ایک ہیں تو کمی کیا رہ جاتی ہے۔ زندگی ہمارے سامنے نئے نئے مسئلے نئی گتھیاں اور مشکلات حل کرنے کے لئے برابر پیش کرتی رہے گی۔ لیکن اس مستحکم اعتماد۔ ہمدردی عشق اور محبت کے مضبوط بازو ہماری مدد کریں گے۔ اور میری جان ہم دونوں مل کر مشکل سے مشکل مہم سر کر لیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔ کیا غم ہے کہ ہم نے اپنی زندگی سے بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا ہے۔ لیکن زندگی کو اس کے لمحات اور وسعت سے نہ ناپو۔"

(یہ ان ہی خطوط کا نتیجہ ہے کہ رضیہ کو اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کرنی پڑی اور وہ ان کی راہ میں رخنہ بننے کے بجائے ایک سچے مددگار کی حیثیت سے کمر باندھ کر تیار ہو گئیں۔ پورے دو سال جیل میں نظر بند رہنے کے بعد ۱۴ مارچ ۱۹۴۲ء کو بنے جیل سے رہا ہوئے۔ اور پھر اپنی راہ پہ چلنے لگے۔

رضیہ ترقی پسند خیال کی حامی ہونے کے باوجود بھی مذہبی خیالات پہ کاربند تھیں۔ میاں روٹی نہیں کھاتے اس کی ہمیشہ ان کو فکر دامنگیر رہتی تھی۔ لیکن اس رہائی کے بعد سے ان کے خیالات میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی اور وہ اپنے میاں کو پاگل سمجھنے کے بجائے انسانیت کا خدمت گار سمجھنے لگیں۔ آخر کار رضیہ کی مراد بر آئی اور بنے میاں بمبئی جیسے بڑے شہر میں رہ کر روزی کمانے لگے۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر بن گئے اور ان کو ۲۵ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملنے لگی۔ رضیہ بھی ان کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگیں۔ اور بنے ان کو جو کھانا کھلاتے وہ

ان کو سر و زر حسن کے دسترخوان سے بھی زیادہ میٹھا معلوم ہونے لگا۔

سجاد ظہیر جیل سے رہا ہونے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر پر بلا لئے گئے۔ اور ان کے ذمے "قومی جنگ" کی ادارت سونپ دی گئی۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا اُردو لکھا پڑھا آدمی ہو گا جس نے "قومی جنگ" اور "نیا زمانہ" کا نام نہ سُنا ہو۔ سجاد ظہیر نے بمبئی کے قیام کے دوران میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی دفتر کو لکھنؤ سے بمبئی منتقل کر لیا اور سارے ہندوستان میں ترقی پسند ادیبوں کو منظم کرنے لگے۔ سیاسی کاموں کے بعد ان کے پاس جو کچھ بھی وقت باقی بچتا اس کو انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے میں صرف کیا اور جگہ جگہ ترقی پسند ادیبوں کے جلسے منعقد کروائے اور ایک نئی زندگی اور نئی راہ کا پیام دیا۔ تالیف و تصنیف کے متعلق یہاں پر زیادہ کچھ روشنی ڈالنا بیکار ہے۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے جو بھی کتابیں شائع ہوئیں ان میں کسی نہ کسی حیثیت سے سجاد ظہیر کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے کئی سال سے مسلسل رکن رہتے آئے ہیں اور ان کی تنظیمی صلاحیتوں کے پیشِ نظر بھی مارچ ۱۹۴۸ء میں کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس نے انھیں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا معتمد عمومی منتخب کیا۔ اس لحاظ سے وہ پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کے معتمد عمومی ہیں۔ گذشتہ تین سال میں انھوں نے نہ صرف پاکستانی عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ وہاں کی مزدور اور کسان تحریک کو بھی بہت آگے بڑھایا ہے اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ پاکستان کے پولیس راج نے عوام کی سیاسی بیداری سے خائف ہو کر وہاں کے ہر دلعزیز رہنماؤں کے ساتھ گذشتہ مئی میں سجاد ظہیر کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔ اور ان پر ایک من گھڑت سازشی مقدمہ چلا رہی ہے۔ جو "راولپنڈی کانسپریسی" کے نام سے حیدر آباد سندھ میں چلایا جا رہا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا واحد ٹرائیل ہے۔ جہاں نہ تو ملزمین کو اپنی پسند کے وکیل مقرر کرنے کا حق ہے اور نہ عوام اس مقدمہ سے واقف ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا کے جمہوریت پسند انسانوں نے ایک ہو کر یہ آواز بلند کی ہے کہ یا تو سجاد ظہیر اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے یا انھیں غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کی رائے عامہ فاشزم کے پیروؤں اور اسلام کے نام نہاد پجاریوں کو کہاں تک متاثر کر سکتی ہے۔

بہر حال بقول جنتا کے آدمی ہیں۔ اور اس لئے انھیں عوام کی زبان اور اس کے گیتوں اور شاعری سے بہت زیادہ پریم ہے۔ انھوں نے پوربی بھاشا میں لینن پر ایک آلہا لکھا ہے اور جب وہ خود اس کو جونپور کے دھوبیوں کی زبان میں سُناتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیہاتی اپنی زبان میں عوام کو انقلابی پیام دے رہا ہے۔

—o—

پرکاش پنڈت کے افسانوں کے افراد متوسط طبقے کی اکائیاں ہیں جنھیں یہ سلجھا ہوا افسانہ نگار متوسط طبقے کے پریشان کن سوالات حل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ہر ذہین افسانہ نگار اور ادیب کی طرح پرکاش پنڈت نے اپنے سماجی، ماحول اور ذہنی کاوش سے اس سماجی شعور کو پالیا ہے جس کے بغیر موجودہ سماج کے تکلیف دہ سوال کسی طرح حل نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ان کے افسانے حیات آفریں ہوتے ہیں۔

(کرشن چندر)

پرکاش پنڈت کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ

میراث

ایک تہذیبی امانت

جسے ماضی کے عوام نے اپنی جمہوری روایات سے بھر پور کیا
جسے حال کی عوامی جدوجہد نے توانائی اور چمک بخشی
اور ——— جسے پرکاش پنڈت آنے والے دور کو سونپتا ہے

قیمت تین روپے

مکتبۂ شاہراہ دہلی

اُردو شاعری میں امرد پرستی کا تصوّر اور میر

شمیم احمد

ہندی شاعری کی دو خصوصیات عام طور سے بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سنسکرت اور ہندی شاعری مرد کی محبت عورت سے اور عورت کا پریم مرد سے بیان کرتی ہے۔ قدیم اُردو میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی عشقیہ شاعری میں اپنی کئی عورتوں اور بیگموں کو رنگین اور رسیلے ناموں سے یاد کیا ہے اور دوسری خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے جو نہایت دلکش اور دلآویز بھی شمار کی جاتی ہے کہ اس میں عموماً تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے جو ہندی کی شیرینی اور مٹھاس کو اور بڑھا دیتی ہے۔ دوسری خصوصیت سے ہمارے نقادوں نے اندازہ لگایا کہ سنسکرت اور ہندی شاعری بھی محبوب کے لئے صرف فعل مذکر استعمال کرتی ہے اور چونکہ سنسکرت اور ہندی شاعری کا محبوب کرشن ہے۔ لہٰذا وہ محبوب کے لئے صرف فعلِ مذکر استعمال کرنے پر مجبور ہے لہٰذا اردو شاعری نے فعلِ مذکر کا استعمال ہندی شاعری سے لیا ہے۔ میرے خیال میں جتنا یہ خیال پست ہے اتنا ہی بے سروپا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہندی اور سنسکرت شاعری میں عموماً فعلِ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے یہاں محبت کا منتہا کرشن ہے۔ یہ ہندی اور سنسکرت شاعری کے تصوف کا ایک پہلو ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ہندی شاعری میں عورتوں نے برابر کا حصہ لیا ہے۔ لہٰذا ان کا تخاطب فطرت کے عین مطابق ہے لیکن ان باتوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ صرف فعل مذکر استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ جب بھی کسی شاعر نے اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر شاعری کرنی چاہی ہے تو اس میں کوئی مجبوری کوئی اخلاقی قید حائل نہیں ہوئی۔ بلکہ ہندی اور سنسکرت شاعری میں عورت کو جس تصوّر سے دیکھا گیا ہے وہ بہت انوکھا اور پیارا ہے۔ اس کے برعکس اُردو زبان میں عورت اور مرد کے لئے فعل تو الگ الگ آتے ہیں لیکن اس کی شاعری میں صرف فعل مذکر استعمال ہوتا ہے۔ یعنی عورت کے لئے بھی فعلِ مذکر کی ترکیب لائی جاتی ہے۔ مثلاً عورت کا تزکرہ ہے۔

آنکھوں میں طالبِ دیدار کے سرسوں پھولی ڈال کر آیا جو وہ زرد دوپٹہ سر پہ

وہ پری رکھتا ہے ایسے پیارے پیارے ہاتھ پاؤں یا جان ہیں، دل ہیں، جگر آنکھوں کے تارے ہاتھ پاؤں

لہٰذا یہ الزام کہ اردو شاعری نے ہندی شاعری سے فعلِ مذکر کا استعمال سیکھا بالکل بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ہندی اور سنسکرت شاعری میں عورت کے متعلق جو احساسات رہے ہیں وہ کئی مرکزی اور اہم لحاظ سے بلند ترین اخلاقیات اور روحانیت کے حامل رہے ہیں۔ ہندو کلچر نے سب سے پہلے عورت ذات کے لئے ایسے پاکیزہ اور اخلاقانہ احساس کو جنم دیا کہ اس کے فیض سے عورت سیتا، پاروتی اور ساوتری کی طرح زندہ ہے۔ ان عورتوں کی تخلیق کر کے سنسکرت اور ہندی شاعری نے اور ہندوستانی کلچر نے ہندوستانی نسوانی آبادی کو کیا بنا دیا ہے وہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہابھارت میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ بیوی محبت کرنے میں ماں ہے اور ساتھ دینے میں بہن اور خدمت کرنے میں بیٹی اور بستر پر بیسوا ہے۔ اور یہی نہیں سنسکرت اور ہندی شاعری نے عورت کو جس زندگی کے ماحول اور پس منظر میں پیش کیا ہے۔ ہندو کلچر نے عورت کی ذیلیت اور نسائیت کے نقوش اُبھارنے کے لئے جن تیوہاروں روزانہ زندگی کے جن لطیف مشغلوں کو عورت کے لئے پیدا کیا ہے۔ بقول فراق بہ حیثیت ماں، بہن، بیٹی اور بہو کے جن رسوم اور جن جذبات سے اسے متعلق اور مزین کر دیا ہے۔ وہ ایسے ہیں جن سے عورت کے تصوّر اور تصویر کے نقوش اتنے لطیف ہو جاتے ہیں کہ اس سے زیادہ لطیف تصوّر اور کہیں نہیں ملتا۔ اور یہ ان ہی شعراء کا احسان ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندی اور سنسکرت شاعری عورت کا مرد سے اور مرد کا عورت سے تخاطب مذکر اور مونث دونوں فعلوں میں کرتی ہے (لیکن آج کل بغیر ثبوت اور دلیل کے کسی کے کہنے پر یقین نہیں کیا جاتا یہ ایک نقاد اور ادیب کی توہین کے مترادف ہے) تو ملاحظہ ہو رگ وید کو ہندوؤں میں وہی حیثیت حاصل ہے جو مسلمانوں میں قرآن شریف کو۔ رگ وید میں سب سے محبوب شخصیت اُشس دیوی کی ہے صرف رگ وید میں ہی نہیں بلکہ سنسکرت کی بھی سب سے اہم اور محبوب دیوی یہ اُشس دیوی ہے جو رگ وید میں صبح

کی دیوی ہے اور اس کی ثنا وصفت میں بیسیوں بھجنوں میں شاعروں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ ہوں :۔

۱۔ اشُس دیوی ایک درخشاں دوشیزہ ہے جو آسمان میں پیدا ہوئی ہے اور دیئی وس کی لڑکی ہے۔

۲۔ وہ اندھیری رات کی درخشندہ بہن ہے۔

۳۔ وہ اپنے عاشق کے نور سے یعنی سُوریہ کے نور سے درخشاں ہوتی ہے۔ سوریہ اس کے راستہ پر پیچھے سے شعاعیں چمکاتا ہے اور اس طور سے اس کا تعاقب کرتا ہے جیسے کوئی نوجوان کسی دوشیزہ کا۔

۴۔ وہ ایسے منور رتھ میں سوار ہو کر نکلتی ہے جس کو نال گائیں اور گھوڑے کھینچتے ہیں۔

۵۔ کسی رقاصہ کی طرح وہ شوخ لباس پہن کر اپنے سینے کا اُبھار دکھلاتی ہے۔

۶۔ وہ ایسی دوشیزہ ہے جو نور کی پوشاک سے آراستہ ہو کر مشرق میں رونما ہوتی ہے اور اپنی بہار حسن کو بے نقاب کرتی ہے۔

۷۔ لاجواب حُسن سے متجلی ہو کر وہ اپنے نور سے چھوٹے بڑے کسی کو محروم نہیں کرتی۔

۸۔ وہ آسمان کے دروازے کھول دیتی ہے اور خانۂ ظلمت کے در کشادہ کر دیتی ہے۔

۹۔ اس کی روشن شعاعیں مویشی کے گلوں کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔

۱۰۔ وہ رات کی کالی پوشاک کو اُتار کر ارواحِ خبیثہ اور نفرت خیز تاریکی کو دفع کر دیتی ہے۔

۱۱۔ وہ پیروں والی مخلوقات کو جگاتی ہے اور پرندوں کو اڑاتی ہے اور وہ ہر شے کی جان ہے۔

۱۲۔ جب اشُس چمکتی ہے پرندا اپنے گھونسلوں سے اُڑ جاتے ہیں اور اپنی خوراک تلاش کرتے ہیں۔

۱۳۔ وہ شیریں اصوات کی رخشندہ محرک ہے اور سریلی آوازوں کی بہار کی سردار ہے۔

۱۴۔ وہ دیوتاؤں کے حکم اور ریت کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتی اور ہمیشہ وقت پر ظاہر ہوتی ہے۔

۱۵۔ وہ اپنی ریت کا راستہ جانتی اور پہچانتی ہے اور کبھی اپنی راہ نہیں بھولتی۔

۱۶۔ جس طرح اگلے زمانے میں وہ چمکتی تھی اب بھی چمکتی ہے اور آئندہ بھی نور پھیلاتی رہے گی۔ وہ لافانی ہے اور کبھی بوڑھی نہ ہوگی۔

اس سے زیادہ شاعر ایک عورت، ایک دیوی اور ایک محبوبہ کی کیا تعریف کر سکتا ہے اور جب بھی سنسکرت اور ہندی شاعری کے شعراء اس قسم کی کوئی لافانی چیز پیش کرتے ہیں تو اس میں آفاقیت کے عناصر سموئے ہوئے ہوتے ہیں اور عورت کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ یہ تو مثال سنسکرت شاعری کی تھی ہندی شاعری کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو :

چھوٹی موٹی کامنی سب ہی بِس کی بیل　　بیری مارے دانوں دے اور یہ مارے ہنس کھیل

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں چھوٹی موٹی ہوں یا نازک ہوں سب زہریلی بیل کی مانند ہوتی ہیں۔ دشمن داؤں دے کر مارتا ہے اور یہ ہنستی کھیلتی قتل کرتی ہیں۔ اور پھر قدیم اُردو کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

اوپر سے ایک تریا اُتری جس نے بہت بھجایا　　پی کا نام پہ پیتم پیارے اپنا نام نہ بولی

ایسی ہزاروں مثالوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ اُردو نے فعل مذکر ہندی اور سنسکرت سے لیا ہے۔ لاعلمی کی دلیل ہے۔ ایک گروہ تو یہ تھا جو فعل مذکر کو ہندی سے لانے پر مصر ہے اور دوسرا گروہ اس کے برعکس یہ مانتا ہے کہ اردو شاعری نے فعل مذکر کا استعمال فارسی شاعری سے لیا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اُردو شاعری پر اور اُردو شاعروں پر امرد پرستی کا الزام لگاتا ہے اور ہندی کی ان خصوصیات کی بنیاد پر جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں اردو کے خلاف خیر فطری فعل کے استعمال پر بہت لے دے کرتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط فہمی پہلی غلط فہمی سے زیادہ خطرناک ہے آیئے اس کو بھی دیکھ لیں۔ ہر زبان کی شاعری زمانے کے ماحول اور تہذیب اور قوم کی معاشرت اور مزاج سے ظہور میں آتی ہے۔ ہر زبان کی ترقی میں قومی اثرات ہی اس شاعری کی خصوصیات ہوتے ہیں۔ اور قوم کی چند خاص خوبیاں شاعری ہی میں نمایاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا اُردو

شاعری میں فعل مذکر کا استعمال ہمارے قومی رجحانات، تہذیب و معاشرت کے مطابق ظہور میں آیا ہے۔ اور یہ قومی سرمایہ اور روایتیں ہمیں ایران سے براہِ راست ملی ہیں جس طرح ہندی شاعری کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ وہ عام طور سے عورت کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح اُردو کی یہ خرابی یا خوبی اس کے مزاج اور اس کی معاشرت سے ہی ہمیں میسر آئی ہے۔ جو ہمیں ایران سے منتقل ہوئی ہے۔ کیونکہ ہندوستان نے سب سے زیادہ اثر ایران سے قبول کیا ہے۔ اور خصوصاً مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت پر ایران ہی چھایا ہوا ہے۔ لہٰذا فعل مذکر کا استعمال اُردو زبان کی مذہبی اور تہذیبی روایت ہے۔ آپ کہیں گے کیا اُردو شاعری کا مزاج یا اس کی تہذیب امرد پرستانہ ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں اس کی تہذیبی روایت کو پرکھنا پڑے گا لہٰذا پہلے ہم چلئے اُردو غزل کے تجزیہ کے یہ دیکھتے ہیں کہ ہم نے فعل مذکر کا استعمال اُردو زبان سے سیکھا ہے وہاں اس غیر فطری فعل کو استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اردو شاعری نے فعل مذکر کا استعمال اصل میں فارسی شاعری سے سیکھا ہے کیونکہ فارسی میں مذکر اور مونث کے لئے ایک ہی فعل آتا ہے۔ اور علاوہ اس کے تہذیبی سرمایہ بھی ہمیں فارسی سے میسر ہوا۔ لہٰذا جن وجوہ سے فارسی شاعری نے فعل مذکر کا استعمال کیا اور بعد میں احساس ہونے کے باوجود وہاں کے لوگ اسے چند مجبوریوں کی بنا پر ختم نہیں کر سکے۔ بالکل وہی صورت اُردو کو بھی پیش آرہی ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ فارسی شاعری میں فعل مذکر کیوں استعمال ہوا؟ ظاہر ہے کہ جس تہذیبی سرمایہ سے ہم فعل مذکر استعمال کرنے پر مجبور ہوئے اس کے ابتدائی نقوش عرب ہی سے آئے ہوں گے۔ لیکن عرب کی شاعری میں عورت مرد سے اور مرد عورت سے تخاطب کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب سے ایران میں آکر مذہبی اور تہذیبی اقدار میں ضرور فرق ہوا ہے۔ لہٰذا ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ فارسی نے فعل مذکر کا استعمال کیوں شروع کیا اور اس کی کیا وجوہ تھیں؟

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام ایران میں فروغ پایا تو اس کے نیز اثر ایران کے تخیل میں عرب کی شاعری کی جو خصوصیات تھیں اس میں پیدا ہو گئیں یعنی عربی عزم، جفاکشی اور یک جہتی یہ اثرات ایران پر اتنے اثر انداز ہوئے کہ بقول ابن خلدون عربی ثقافت اور کلچر کی حقیقی ترویج یا تو ایرانی علماء کے ہاتھوں ہوئی یا ان عربوں کے ہاتھوں جنھوں نے ایرانی علماء سے کسبِ فیض کیا۔ لیکن عربی اثر چونکہ خارجی تھا لہٰذا وہ زائل ہونا شروع ہو گیا اور آخر کار یہ اثر فردوسی کے شاہنامہ پر بالکل ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ایران کی اصل فطرت غالب آنے لگی اور فلسفہ کی طرح ڈالی گئی۔ اسی طرح عجمی اسلام تصوف کے رنگ میں بھی رنگنے لگا۔ اور بعض پابندیاں اور قیود غیر ضروری معلوم ہونے لگیں۔ عرفانِ الٰہی کے لئے شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے سالک تلاش ہونے لگے۔ توسل اور توسط کے مراحل قائم ہوئے۔ اور اس سلسلے میں محبوبِ حقیقی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے محبوبِ مجازی کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ قرار پایا کہ محبوب مجازی ہمجنس ہو۔

یہ کیوں؟ بقول مجید ملک اس لئے کہ استدلال یہ کیا گیا کہ وہ محبت جو جنس بالمقابل سے کی جاتی ہے اس کا مقصد محض جسمانی کیف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگر بفرضِ محال کوئی متلاشیِ حق کسی حسینہ سے بے لوث محبت کرنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو یہ ممکن نہیں کہ محبوبہ بھی بے لوث ہو۔ اس لئے عرفانِ حق کے لئے یعنی محبوبِ حقیقی تک پہونچنے کے لئے ہمجنس سے محبت کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ محبت جسمانی تعلقات کے لوث سے بالکل پاک ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ صوفیا کے اس خیال نے جو چیز اخلاق کی دنیا میں ذلیل اور متروک تھی اسے قابلِ تعریف بنا کر ایرانی ادب پر علانیہ ممتکن کروا دیا۔ اس طرح یہ سلسلہ شروع کیا گیا۔ جو تھوڑے عرصہ میں اسلام کے اجزا میں شمار ہو کر اسلامی تہذیب کے مترادف ہو گیا اور تصوف اسلام قرار دیدیا گیا۔ اس میں شعرائے عموی نے اپنے مجنسوں کو مخاطب کر کے جنسی شاعری شروع کر دی اور شعرائے خواص نے متصوفین کے نظریہ کے مطابق فرضی یا اصلی محبوبوں کی محبت کو حقیقت تک پہونچانے کے لئے زینہ بنا کر اور ان کو مخاطب کر کے اشعار کہے۔ اس طرح علم و دانش اور جہالت پاکبازی اور ہوس ایک ہی نقطۂ نظر پر مرکوز ہو گئی۔ رفتہ رفتہ تخیلات نے عشق اور ہوس کاری میں فرق نہیں رکھا۔

فارسی کی نشاۃ ثانیہ میں جب صاحب نظر شعراء نے اس غیر فطری عمل کو محسوس کیا اور اس کو بدلنا چاہا تو وہی حالات اور نظریات جو تصوف کا جامہ

پہن کر عین مذہب ہو چکے تھے بیچ میں حائل ہونا شروع ہوئے اور چونکہ وہ شعراء بھی اسی ماحول میں اسی تہذیب میں پیدا ہوئے تھے اور پلے بڑھے تھے لہٰذا یہ اثرات ان کے مزاج میں بھی راسخ ہو چکے تھے۔ اسی بنا پر انھیں صرف فعل مذکر ہی نہیں بلکہ تمام مذہبی اقداروں کے خلاف بغاوت کرنی پڑی تھی۔ جو ظاہر ہے کہ ناممکن تھی اور ان ہی حالات میں اردو نے بھی اپنا ڈانڈا اس سے جا ملایا۔ لہٰذا فعل مذکر کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف اثرات اور مذہب کے وہ نظریات بھی ساتھ آگئے جو ایران میں رائج تھے اور وہی عقیدے اور خیالات ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اختیار کئے جو ایران کی امتیازی خصوصیات تھے۔ فارسی شاعری کی اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نے مذہبی مجبوریوں اور اخلاقی قیود کے ساتھ وہ عقیدے جو وہاں پھیلے ہوئے تھے اسی صورت میں خود بھی قبول کر لئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو شاعری میں فعل مذکر کا استعمال ہو تو رہا ہے لیکن یہاں اس کا تصور کیا ہے؟ کیونکہ ایران میں ایک جسمانی تصور بھی ہے جو عملاً فروغ پایا تھا۔

وہ یہ کہ ایران ایک زمانے میں تمام عالم اسلام پر چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کے سپاہی جو فتوحات کے لئے جاتے تھے وہ اپنے خاندانوں کو اتنے دور دراز مقامات پر نہیں لے جا سکتے تھے اور مفتوح ممالک کے باشندے ان سے فطرتاً کھنچے رہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی فوج کے نوخیز لڑکوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر لئے۔ اور وہ جب اپنے وطن واپس آئے تو وہ "علت" جو ایک عادت بن چکی تھی۔ رفتہ رفتہ تمام ایران میں پھیل گئی۔ کیونکہ فعل مذکر اردو نے فارسی سے اسی طرح قبول کر لیا تھا لہٰذا اردو شاعروں پر یہ الزام عائد ہوا کہ انھوں نے "امرد پرستی" بھی کی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ اردو شاعری میں عورت کا ایک خاص مقام ہے اور ایک خاص تصور ہے۔

اردو شاعری میں عورت کے متعلق دو خاص تصورات ہیں۔ ایک تصور عورت کے جسمانی تصور اور جنسی تعلقات پر مبنی ہے اور دوسرا تصور جنس سے بالکل مبرا ہے۔ پہلی قسم کی شاعری لکھنؤ کے بہت سے شعراء نے اور چند دہلوی شعراء نے بھی کی جو مبتذل مانی گئی۔ اور نظیر کو تو رذیل بھی کہہ دیا گیا۔ اور دوسرے قسم کی شاعری دہلی کے شعراء کے علاوہ لکھنؤ کے چند اچھے شاعروں نے کی جو اردو کا اصل مزاج مانا گیا۔ یعنی اردو شاعروں اور شاعری کا عشق ایک حقیقی عشق ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ یا میں کسی افلاطونی عشق کے قائل ہیں۔ بلکہ عشق کے متعلق میرا تصور یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ ایسے محبوب کی تلاش رہتی ہے۔ جو ہمارے مختلف احساسات اور جذبات کے عین مطابق ہو یعنی ہم اپنے گونا گوں اور متضاد جذبات کا عکس اس میں دیکھ سکیں۔ میرا مطلب اس سے یہ نہیں ہے کہ عشق بغیر ناکامی کے مکمل نہیں ہوتا بلکہ ہم تو اپنے محبوب کو اپنانے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن کچھ حالات اور چند اخلاقی قیود ایسی ہیں جو ہماری اس آئندہ کو پورا نہیں ہونے دیتیں۔

ہمارے جذبات اور احساسات میں جنسی جذبہ کے علاوہ بہت سی اور قسم کی بھی خواہشیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم اپنی محبوبہ کو جو ہماری بیوی بھی ہے کبھی ماں بھی کہنا چاہتے ہیں تو کبھی بہن اور کبھی کبھی تو بیٹی کی طرح بھی چاہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم اپنی تہذیب اور معاشرت کے مطابق اور اخلاقی قیود کی بنا پر اس کو اس طرح نہیں چاہ سکتے۔ اور خیر ہم تو الگ رہے ہماری آج کل کی بیوی تو کبھی بھی بیوی کے ساتھ ماں، بہن اور بیٹی ہونے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ ہم بغیر اس تصور کے اپنی محبوبہ کے ساتھ صحیح معنوں میں عشق نہیں کر سکتے۔ یعنی جس میں جنسی جذبہ کا گذر نہ ہو۔ یہی مجبوری تمام اردو شعراء کو پیش آتی رہی۔ لہٰذا انھیں ایک تصوراتی اور تخیلی محبوبہ بھی پیدا کرنی پڑی جس کے یہاں جنسی جذبہ بھی مقدم نہ تھا۔ بلکہ ہم اسے اپنی طبیعت کے مطابق چاہ سکتے تھے۔ ادھر سماجی حیثیت میں عورت کا مقام صرف جنسی تعلقات تک محدود رہا اور ہے۔ اسی حیثیت میں جب بھی ہمارے شعراء نے عورت کو عورت کی صورت میں پیش کیا تو اس میں ابتذال آگیا۔ یعنی عورت کا مقصد ہمارے یہاں ایک ایسی عورت ہے جو ہماری جنسی ضروریات کو پورا کرتی ہے لہٰذا ہمارے شعراء کو اس سے بچنے کے لئے ایک ایسی صورت اختیار کرنی پڑی جہاں عورت کا تصور سماجی عورت کے تصور کی طرح نہ ہو۔ بلکہ ہم اسے اپنے جذبات کی اعلیٰ قدروں کا ذریعہ بنا سکیں اور مادرانہ محبت، خواہرانہ شفقت اور دخترانہ خدمت کے ساتھ ساتھ ایک محبوبہ کی طرح چاہ سکیں۔ ایسی صورت اس وقت ممکن تھی جبکہ ہمارا نظام اخلاق اس کی اجازت دیتا اور کسی قسم کی اخلاقی قیود بیچ میں حائل نہ ہوتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک تخیلی محبوبہ کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا گیا جو ان قیود سے بالاتر تھی۔ ہم اپنی محبوبہ کو جن تصورات کے تحت دیکھنا چاہتے تھے وہ اس نظام اخلاق میں ناممکن تھی۔ لہٰذا ہمارے شاعروں کو ایک ایسا فعل لانا پڑتا ہے جو عورت کی سماجی شخصیت کو ظاہر نہ کرے حالانکہ مراد اسی سے ہو۔ آپ خود سوچئے کہ ایسا فعل مونث کی

ترکیب میں تو ہو نہیں سکتا تھا البتہ فعل مذکر کے استعمال میں یہ مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ جبکہ ایران میں اس کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ لہٰذا فعل مذکر ہی شاعری کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس دعوی کے ثبوت میں یہ شعر ملاحظہ ہو جبکہ اُردو زبان میں دونوں فعل استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس شعر میں جو اُردو کے پہلے غزل گو شاعر کا ہے یہ احساس بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اُردو کے اولین شاعر یعنی خسرو اور قلی قطب شاہ کے یہاں فعل مونث استعمال ہوتا ہے لیکن جب سے اُردو نے ایک خاص صورت اختیار کی اور فارسی کی اصنافِ شاعری کی نقل کی گئی تو غزل میں وہی مجبوری درپیش آئی لہٰذا ولی بھی غزل میں فعل مونث استعمال نہ کر سکے۔ ملاحظہ ہو:

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کا واہ کیا کہنا — میرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے

اس شعر میں یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ محبوب کا اس جنس سے تعلق ہے مگر یہ ایک نمونہ تھا اس شاعر کا جس نے اُردو زبان۔ اردو کلچر کا آغاز کیا۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ایک چیز اور پیش کرتا ہوں کہ ولی سے میر تک اور میر سے داغ تک جب بھی کسی نے عورت یا لونڈے کا تذکرہ کیا ہے اس میں ابتذال آگیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ جب بھی میر نے کہا کہ "اس عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں" اور "دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے، عام عشاق کا تمام کیا" وغیرہ اور مصحفی نے جب بھی کہا کہ "لہنگے کی جھپ دکھا کر سختی نے مار ڈالا" یا "ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں" ان کے عام شعروں سے کتنے پست اور مبتذل ہیں۔ اسی طرح داغ کی پوری شاعری تو نہیں مگر پچاسی فیصد اشعار ابتذال میں داخل ہیں یعنی وہاں عورت کو سماجی آرٹ کار کی حیثیت میں دیکھا گیا ہے۔ داغ کے یہاں تو عورت طوائف ہی ہے۔ حالانکہ برعکس اس کے اس تصوراتی اور تخیلی محبوبہ یا عشق کی صورت میں جو شعر لکھے گئے ہیں۔ وہ ظاہر ہے کہ کیا ہیں۔

ذرا اس پر بھی غور فرمائیے کہ دہلی کے شعراء کو نہایت متین اور شائستہ، سنجیدہ اور سنبھلا ہوا بتایا جاتا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ ان پر "امرد پرستی" ایسا غیر فطری الزام بھی لگایا جاتا ہے۔ اور جہاں کی شاعری کو پست اور مبتذل بتایا جاتا ہے وہاں یہ فطری صورت میں موجود ہے۔ یعنی لکھنؤ کی شاعری میں عورت سے خطاب کے علاوہ عورت کی طرف سے شاعری بھی کی گئی ہے۔ مگر سوائے مبتذل خیالات کے کچھ دھیان میں نہیں آتا، سوائے اس کے کہ اُردو شاعری میں عورت کا تصور اور ہیئت یا محبوبہ کی حیثیت کیا ہے۔ یہ بات لکھنؤ میں کیوں پیدا ہوئی اس لئے کہ وہاں عورت کو سماجی حیثیت میں دیکھا گیا تھا۔ جو حضرات اُردو کے اس فعل مذکر کو غیر فطری بتاتے ہیں کیا انھوں نے کبھی سوچا کہ اس کی بنیادیں اور جڑیں کہاں پیوست ہیں؟ اور اس غیر فطری لہجہ کی وجہ کیا ہے؟ ذرا فیض کا یہ قطعہ سنیئے:

وقفِ حرماں و یاس رہتا ہے — دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو — مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

کیوں صاحب کیا اس میں فیض نے کسی لونڈے سے خطاب کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو جو آپ اُردو شاعروں کے متعلق کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہی شبہ مجھے خود آپ پر ہوتا ہے۔ اگر آپ فیض صاحب سے یہ کہیں کہ وہ اس قطعہ کے تیسرے مصرع کو یوں کر دیں کہ "تم تو غم دے کے بھول جاتی ہو" تو وہ شاید اس پر راضی نہ ہوں۔ اگر آپ وجہ پوچھیں گے تو وہ کوئی معقول وجہ شاید نہ بتا سکیں لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ اس مصرع کو دوسری شکل دینے پر یوں تیار نہیں کہ اس میں انھیں روایت کے مطابق ابتذال کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے مجھے اس قطعہ میں میر کی آواز سنائی دیتی ہے۔

آپ اس موقعہ پر ان شاعروں کا حوالہ دیں گے جو عورت سے خطاب کر چکے ہیں یا فعل مونث استعمال کر چکے ہیں۔ مثلاً اختر شیرانی۔ لیکن اختر شیرانی اور ان کے علاوہ جو اصحاب بھی اس قسم کی شاعری کر چکے ہیں ان کی شاعری سوائے جنسی جذبات کے اور کچھ بھی نہیں اسی لئے ہمارے سنجیدہ آدمیوں کو وہ مبتذل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کوئی بلند اور سوچی سمجھی ہوئی یا فکری شاعری نہیں کر سکتے۔ آپ یہیں دیکھئے کہ اختر شیرانی صاحب کی "میری سلمیٰ" اور ان کی تقریباً سب کی سب شاعری لے لیجئے لیکن جو بات فیض کے اس قطعہ میں ہے وہ ان نظموں میں کہاں۔ کیونکہ وہ نظمیں جنسی جذبات کی آسودگی کے لئے لکھی گئی ہیں اس لئے اس کے کہنے کا ڈھنگ بھی وہی ہے فعل مونث کا استعمال اسی لئے ہے۔ اور اس قطعہ میں،

خطاب تو عورت ہی سے ہے لیکن جنس سے مبرا ہے۔ اسی لئے یہ عجیب اثر پیدا کرتا ہے اور اسی وجہ سے اس کے کہنے کا ڈھنگ بھی بالکل الگ ہے یعنی اختر شیرانی کی نظموں کی طرح فعل مونث استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ یہی اُردو شاعری کا مزاج ہے۔ لیکن میں نے اب تک اس کی بنیادی چیز نہیں بتلائی یعنی کیا وجہ تھی جو ہم فعل مذکر استعمال کرنے پر مجبور ہوئے؟

آپ کہیں گے کہ ہم تو تجھ کو تیرے ہی ہتھیار سے شکست دیتے ہیں کہ جب دنیا کی تمام شاعری اور خصوصاً ہندی کے شعراء عورت سے خطاب کرکے اور فعل مونث استعمال کرکے بلند شاعری کرسکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اُردو شاعر عورتوں سے تخاطب کرکے اور فعل مونث استعمال کرکے بلند شاعری نہیں کرسکتے بلکہ جب بھی وہ فعل مونث استعمال کرتے ہیں تو ان کی شاعری میں جنسی جذبات کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ مبتذل ہوکر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا یا تو ہمارے شعراء کا نظام اخلاق ٹھیک نہیں یا پھر "کچھ اور" ہے؟ بس آپ آج تک یہی سوچ سکے ہیں اسی وجہ سے آپ اپنے شاعروں سے مطمئن نہیں اور آپ ان پر طرح طرح کے الزام دھرتے ہیں۔ میرے خیال میں اُردو شاعروں کی بدقسمتی کی حد ہے کہ دنیا بھر کے لوگ اپنے شاعروں کے کلام کو الہام سے کم درجہ نہیں دیتے۔ انھیں اپنی کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کم نہیں سمجھتے۔ ان کے مجسمے قائم ہوتے ہیں اور یادگاری کتب خانے اور انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ اور اُردو کے بہترین شعراء پر ان کے نقاد "امرد پرستی" اور عیاشی کا الزام دھرتے ہیں اور ان کی تمام شاعرانہ خدمتوں اور عظمتوں کو مٹی میں ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا، کبھی غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ایسا کیوں ہوا ہے یا پھر یہ "کچھ اور" کیا ہے؟ اور اس کی وجہ کیا ہے؟

میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہر قوم اور مذہب ایک الگ تہذیبی سرمایہ رکھتا ہے اور اسی تہذیبی سرمایہ پر اس قوم کی شاعری کھڑی ہوتی ہے۔ اور وہی خصوصیات لئے ہوتی ہے یعنی ہر شاعری اپنے مذہب یعنی قوم اپنے نظام اخلاق کی چند مخصوص خصوصیتیں لئے ہوتی ہے۔ ان ہی اثرات اور اسی ماحول میں وہ اپنا مزاج بناتی ہے۔ اُردو شاعری نے ویسے تو ہندی سے جنم لیا اور یہیں کے تمدن سے اُٹھی ہے لیکن اس کا مزاج اور اس کی پرورش فارسی کے زیر اثر ہوئی اور اسی کی تہذیبی قدریں بھی اختیار کرلیں اور چونکہ جو مذہبی ذمہ داریاں اور خصوصیتیں اور مذہب کی تمام قدریں ایران میں تھیں وہ ہندوستان میں بھی رواج پاگئیں! اور پھر ہونے پر سہاگہ یہ کہ اُردو کے شروع کے تمام شعراء مسلمان تھے اور اپنا تہذیبی سرمایہ الگ رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری پر۔ ان کے لہجہ پر۔ ان کے طرز تخاطب پر۔ ان کے فکری سرمایہ پر اسلام اور خصوصاً ایرانی اسلام کے نظام اخلاق اور تہذیبی روایات کا اثر پڑا لہٰذا اردو شاعری کا مزاج مسلمانوں اور خصوصاً ایرانی تہذیب اور نظام اخلاق کے تحت ظہور میں آیا۔ اور ادھر ہندی شاعری کی تمام روایتیں اس کی تمام خصوصیتیں اس کی تہذیبی اور اخلاقی فضا کی حامل ہیں۔ میں صرف عورت کے متعلق ہی دیکھوں گا۔ ہندوؤں کی تہذیب کے مطابق وہ اپنی بیوی کو صرف جنسی تسکین کے لئے ہی نہیں چاہتے بلکہ وہ ان کے یہاں ایک ماں اور ایک بہن ایک بیٹی کی حیثیت میں بھی چاہی جاتی ہے۔ جب انھیں اخلاق کی تمام قدریں جن سے محبت ظہور میں آتی ہے۔ جہاں سکون، امن و شانتی کے چشمے پھوٹتے ہیں ایک ہی پیکر میں تیر آجاتے ہیں اور وہ بھی محبوبہ ایسی ہستی میں تو ان کی بلند وجدانی قوتیں اور اخلاق و محبت کی دھارا کوئی راہِ فرار اختیار نہیں کرتی۔ بلکہ وہ بہ اطمینان تمام اپنے جذبات اور احساسات کا عکس جمیل ایک ہی وجود میں دیکھ سکتا ہے۔ جو اس کے نزدیک تمام دنیا سے عزیز اور قریب ہے۔ یہ مزاج ہندو تہذیب کا ہے۔ مہابھارت میں بیوی کو کن کن انداز سے دیکھا گیا ہے اور ہندو تہذیب اسے کس نگاہ سے دیکھتی ہے اسے فراق کی زبانی سُنیئے:

ہے بیاہتا پر روپ ابھی کنوارا ہے — ماں ہے پر اور ہے جو وہ شیرہ ہے
وہ مود بھری مانگ بھری گود بھری — کنیا ہے سہاگن ہے جگت ماتا ہے
ماں، بہن اور چہیتی بیٹی — جیون ساتھی بھی اور گھر کی رانی
یہ سب ہوتے ہوئے سراسر دیوی — اور سیج پر بیسوا یہ بس کی پُتلی

آپ نے دیکھا کہ عورت کا تصور ان کے یہاں کیا ہے۔ ایک محبوبہ، بیوی کے علاوہ ماں، بہن، بیٹی اور دیوی تک ہے۔ اب آپ خود بتلایئے کہ جب آپ اپنی محبوبہ میں وہ سب چیزیں چھپے آپ چاہتے ہیں۔ جو آپ کے مزاج کے مطابق ہے۔ جس کو آپ عشق کہتے ہیں۔ جو ان ہی چیزوں کا نام ہے

جو آپ اپنی محبوبہ میں دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کے لئے کون سی رکاوٹ ہے جو آپ کو بلند خیالات اور اپنے کے لئے روک سکے۔ اس کے برخلاف مسلمان شعراء کا تہذیبی سرمایہ دیکھئے کہ وہاں محبوبہ کو صرف بیوی کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسے کسی اور شکل میں دیکھنا ناممکن ہے۔ اور بیوی کا مصرف صرف جنسی جذبات کی آسودگی ہے۔ اُسے ماں، بہن اور بیٹی کے تصور میں دیکھنا گناہِ عظیم خیال کیا جاتا ہے۔ ننانوے فیصدی سے زیادہ مسلمان اس پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ بیوی کو ماں بہن اور بیٹی کے تصور میں دیکھنا یا اس کو اس قسم کی خواہشوں سے چاہنے سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ بتائیے اس صورت میں فرار کے سوا اور کیا چارہ رہ جاتا ہے۔ اور اس ہی جگہ سے فعلِ مذکر کی بنیاد پڑتی ہے کیونکہ بغیر ہیئت بدلے ہوئے وہ اپنی محبوبہ سے ہمکلام نہیں ہو سکتا۔ گاندھی جی نے جب اپنی دھرم پتنی کو ماں کہا تھا تو وہ ان کی تہذیب تھی لیکن مسلمانوں نے کتنی پھبتیاں کسیں تھیں اور کتنا مذاق اڑایا تھا۔ حالانکہ بہ صورت دیگر ہم اپنی تہذیب اور معاشرت کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ جہاں ہماری محبوبہ مجبوراً مذکر کے بھیس میں چھپی ہوئی ہے۔

اردو زبان اور اس کی شاعری اسی تہذیب اور معاشرت میں پلی بڑھی ہے۔ اپنے ایک جائز اور فطری جذبہ کو پورا کرنے کے لئے آپ خود بتائیے کہ کیا صورت کی جائے کیونکہ ولی سے لے کر میر تک اور میر سے مجھ تک کوئی بھی باشعور آدمی اپنی محبوبہ کو جنسی تحریکات اور صرف جنسی جذبہ کی تسکین بنانا نہیں چاہتا۔ بلکہ ہماری طبیعت اسے اپنی متضاد قسم کی محبتوں سے چاہتی ہے۔ اور یہی مذہبی پابندیوں کی وجہ سے گناہِ عظیم ہے۔ لہٰذا ہم اسے "غیر فطری" بھیس میں دیکھتے ہیں۔ اور جب ہم اس عورت کو جس سے ہم جنسی تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جس کی اجازت مذہب بڑی خوشی سے دیتا ہے۔ خطاب کرتے ہیں یعنی سماجی حیثیت میں ظاہر کرتے ہیں تو اس میں ابتذال آ جاتا ہے۔ اور جب ہم اس ابتذال سے ہٹ کر اس عورت کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں جو ہماری محبوبہ ہے۔ جو ہماری ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے۔ جہاں ہمارے جذبات اور احساسات آسودہ ہوتے ہیں۔ جہاں بلند خیالات اور جذبات پائے جاتے ہیں تو ہماری معاشرت ہماری تہذیب ہمارا مذہب اپنا بھیانک پنجہ ہماری طرف بڑھاتا ہے اس سے بچنے کے لئے ہم اپنی محبوبہ کی ہیئت ہی تبدیل کر دیتے ہیں اور اس تصور سے عشق کرنے لگتے ہیں اور جب وہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی تو ہم میں ناکامی کا احساس اور نا اُمیدی اور یاس پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ نا امیدی خاصۂ طبیعت بن کر کچھ کرنے کو اُکساتی ہے۔ بلند خیالات اور احساسات اس ناکامی اور اس تصور کا نامہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی طرح اُردو اس تھوڑی سی مدت میں دنیا کی کسی عشقیہ شاعری سے بلند احساسات میں کم نہیں رہتی اور اسی طرح ایک تیر پیدا ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ جب ہم جنسی جذبات کی آسودگی کے لئے کسی عورت یا لونڈے کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری گھٹن اور گندے جذبات کی وجہ سے اس میں ابتذال پیدا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ یہ جذبہ ہمارے بڑے شاعروں کے یہاں ایک فیصدی بھی نہیں ہوتا۔

اور پھر ہمارے محترم نقاد صاحبان پر مرگی کے دورے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جلانے لگتے ہیں۔ دیکھو یہ "امرد پرست" تھا۔ یہ رکیک جذبات کا حامل تھا اور اس طرح نقاد بنتے جاتے ہیں اور کیچڑ اچھالی جانے لگتی ہے۔ اور ہماری نئی نسل ان تنقیدوں کو پڑھ کر اپنے پرانے شاعروں سے بھی بدظن ہو جاتی ہے انھیں "امرد پرست" اور شہوت پرست سمجھنے لگتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ انھیں بیمار اور انحطاط پرست کہنے لگتی ہے اور ان تمام خرابیوں کو دُور کرنے کے لئے ہمارے نئے شاعر جنسی شاعری شروع کر دیتے ہیں تاکہ اُردو کو پچھلے "ذلیل جذبات" سے اور اس غیر فطری لہجہ سے نجات دلائی جائے۔

کلیم الدین احمد صاحب ہوئے یا عطا اکبر اور ان کے ساتھی ان سب کی بکواس پر حیران دنیا ہو تو فی ہے (وہ معاف فرمائیں) لیکن مجھے ان سے یہ ضرور عرض کرنا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کو تو کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کیجئے۔ میں ان لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اس موضوع پر تنقید نہ فرمائیں مگر کم از کم عمل جراحی سے پہلے چند اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جب بھی کوئی نقاد تنقید میں ایسی ذمہ داری سنبھالتا ہے تو اس پر فرض ہوتا ہے کہ وہ جس زبان کی جس چیز پر تنقید کر رہا ہے اس زبان کی ترقی اور اس زبان کے مزاج اور اس کی شعریات کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ اس کے تہذیبی اور اخلاقی پس منظر سے پوری طرح واقف ہو۔ اور اس کے بعد سب سے اہم بات یہ کہ ہر ادیب اور شاعر کو اس کے ماحول اس کی تہذیب اور اس کے جذبات کی روشنی میں تول کر تنقید کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اپنے ماحول، اپنی تہذیب اور اپنے عادات و جذبات کے

مطابق اس پر تنقید کرنا اس زمانے کی اس قسم کی غلط تنقیدیں ہمارے ادب کو بہت نقصان پہنچا رہی ہیں۔ اور خصوصاً ہمارے ادب کے طالب علم تو ان تنقیدوں کو پڑھ کر اپنے شاعروں کے متعلق اس قدر بدتر اور شرمناک رائے قائم کرتے ہیں کہ جن کو بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

اوپر کی چند بنیادی باتوں کے بعد یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اردو کے جس "غیر فطری" فعل کے استعمال کرنے پر اور جس بنیاد پر اُردو شاعروں پر "امرد پرستی" کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ اگر ہم کسی زبان کی کوئی خاص بات بعض مجبوریوں کی بنا پر اختیار کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس پر عمل بھی کرنے لگے ہیں۔

اُردو شاعروں کی فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد ہمیں ایک میر کی ہی شخصیت نظر آتی ہے جن کی شاعری میں اخلاق، محبت کی، اعلیٰ قدریں اور عزتِ نفس، خود داری اور عزت و وجاہت کی تمام خصوصیات ملتی ہیں۔ اسی لئے سب سے زیادہ ہے وہ ہے جو ہوئی ہے وہ میر پر ہی ہوتی ہے کہ ایسا بلند اور اتنا بڑا شاعر "امرد پرست" تھا۔ بلکہ ایک حد تک اُردو کا حقیقی محرم ان ہی کو سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اگر میں آپ کے نقطۂ نظر سے بھی دیکھوں تو اس کے ہزاروں اشعار میں سے مشکل سے ستر اسی اس قسم کے شعر ملیں گے۔ لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں کہوں کہ جب سے انسانی فطرت اور انسانی مزاج کی نمو ہوئی ہے۔ اسی وقت سے اس میں جنسی جذبہ زندگی کی تیسری اہم ضرورت کی طرح موجود ہے۔ یعنی جنسی جذبہ کی اہمیت ابتدائے آفرینش سے ہے۔ لیکن اس کے دو ڈھنگ ہیں۔ ایک تو وہ جنسی جذبہ جو صحت مند عناصر پر قائم ہے اور دوسرا وہ غیر صحت مند جنسی جذبہ جس میں گھٹن، جذباتیت، ناآسودگی اور تھکاوٹ عام ہوتی ہے۔ یہ صحت مند جنسی جذبہ زندگی کی دوسری اہم قدروں کے ساتھ ہمیشہ زندگی کو سنوارتا رہا۔ لیکن دوسری طرف غیر صحت مند جنسی جذبہ شاعروں کی جنسیات کو ہمارے سامنے لاتا رہا اور یہی غیر صحت مند جنسی جذبہ ہماری تہذیب کے منافی ثابت ہوا اور اسے ذہنی عیاشی سے موسوم کیا جاتا رہا۔ تو وہ صحت مند جنسی جذبہ جس طرح ظہور میں آتا رہا اسی طرح یہ ذہنی عیاشی بھی اپنی نیرنگی دکھلاتی رہی۔ کیونکہ زندگی کا اگر کوئی بھی رُخ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے تو ہم زندگی اور اس زمانے کے مزاج کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسی لئے زندگی کی عکاسی کرنے والے فنکار زندگی کے کسی کونے کو بھی تشنہ نہیں چھوڑتے۔ اردو شاعری میں یہ خصوصیت تقریباً سب ہی میں آئی ہے۔ مگر بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو اپنے جنسی جذبہ اور دوسرے الفاظ میں ذہنی عیاشی کو ہمارے سامنے نہیں لانے ہیں بلکہ اپنی شاعری کا بلند حصہ ہی جو جنس سے پاک ہوتا ہے اور اعلیٰ کلام کہلاتا ہے وہی ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ہمارے ایک معمولی شاعر سے بھی ہمیں میں صحت مند نہیں ہوتے۔ ایک طرح کی وہ ادب کے ساتھ غداری بھی کرتے ہیں اور ہمیں دھوکے میں بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ولی اللہ، مومن، مجاہد، محرم اسرار بنا کر لاتے ہیں۔ حالانکہ اس شاعر کی ذہنی عیاشی اور ناآسودگی کی داستان اسی کی شاعری میں اس کے خاص خاص دوستوں سے ہی سُنی جا سکتی ہے۔ جو اگر سامنے لائی جائے تو آپ میر پر اعتراض نہ کریں لیکن اس شاعر میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو بے دھڑک ہمارے سامنے پیش کر دے اور یہی ایک شاعر کو بڑا شاعر اور عوامی شاعر بننے سے روکتی ہے۔ صرف اردو پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر شاعر کے یہاں اس کے اچھے اور بُرے خیالات ہمارے سامنے آتے ہیں کیونکہ بغیر دونوں رُخوں کے لائے ہوئے شاعر کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی اور نہ ہم ایک ایسے شاعر کو انسان سمجھتے ہیں جو عام انسانی احساسات اور جذبات سے اتنا بلند ہو کر بات کرے جس کا تصور بھی بار معلوم ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میر نے اپنی ذہنی عیاشی کے لئے بھی غیر فطری فعل کیوں استعمال کیا تھا؟ میر کے پڑھنے والوں کو محسوس ہوا ہوگا کہ میر نے اپنی ذہنی عیاشی میں بھی عورت کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر کے سامنے عورت کے دو مقام نہ تھے۔ صرف ایک مقام تھا ایک ہی تصور تھا اور وہ وہی جو ان کے شعروں کی جان ہے۔ ان کے یہاں عورت غالب کی متاجان اور چناجان یا مصحفی کی سفّن اور ولی والیاں نہ تھی۔ بلکہ عورت ان کے یہاں اپنے خاص تصور کے مترادف تھی۔ اسی وجہ سے ہر عورت کو وہ اپنی محبوبہ کی قدروں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان کے یہاں مجنوں میں بھی عورت جاندار ہی دکھائی نظر آتی ہے اور اس کو ساتھ لے کر اپنے احساسات کو اسی طرح پیش کرتے ہیں جو ان کے کلام کا جوہر ہے۔ لہٰذا ذہنی عیاشی کے لئے بھی انھوں نے اس صنف کو ڈھونڈا جو نہیں ورثہ میں ملی تھی اور جو اپنی میں جنسی آسودگی کے کام آتی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں عملاً تو کہا ایک آدمی تصور میں بھی اپنے آپ کو کسی تیسرے عورت سے وابستہ نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی عورت کا تذکرہ اپنی زبان پر لا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قابل غور بات یہ ہے کہ لونڈوں کے متعلق مضمون باندھنا اس زمانے کی فیشن تھا

جس طرح زاہد اور ناصح کی روایت یہ تھی کہ ان کا مذاق اُڑایا جائے اور ان پر پھبتی کسی جائے۔ اسی طرح لونڈوں کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا فرائض شاعری میں تھا۔ میر کے ان خال خال اشعار میں جہاں لونڈوں کا ذکر آتا ہے وہاں کچھ تمسخرانہ رنگ نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ادق افکار اور دماغ سوزی کے بعد تفریحاً دل خوش کر رہا ہے۔ یہی ذہنی عیاشی میر کی شخصیت کو پورا کرتی ہے اور اس زمانے کی رسم اور تہذیب کو دکھلاتی ہے۔ اس غیر فطری اور تصنع آمیز اخلاقی نظام کے کھوکھلے خول کو دکھلاتی ہے۔ جہاں عورت صرف رنڈی ہے۔ جہاں کسی شریف عورت کا گذر نہیں ہے۔ کسی شریف عورت سے مخاطب ہونا گناہِ عظیم ہے۔ جہاں مہر کے روپیوں سے صرف جنسی تسکین کے لئے اسے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ اس کے بعد کے دَور میں جنسی جذبات اتنی شدت سے اُبھرے کہ وہ صرف اس کا شعار ہو کر رہ گئے اور ہماری نئی شاعری کے متعلق اب بھی یہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بہت سے شاعر اور تقریباً سب ہی فعلِ مذکر استعمال کرنا نہ چھوڑ سکے۔ کیا حسرت۔ یگانہ اور دیگر غزل خواں حضرات کے ساتھ ساتھ فیض اور ان کے دیگر باشعور ساتھیوں کو آنے والے دور میں "امرد پرست" ٹھہرا دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ اب بھی فعلِ مذکر استعمال کرتے ہیں؟ کیا ہم پھر بھی اس کے نتائج اور اس کا صحیح طور پر تجزیہ نہ کر سکیں گے میر مومن (مومن کا وہ تصوّر اور وہ حدود جو اسلام کے مطابق ہے اور جہاں کسی غیر عورت کا تصور حرام ہے) "فوق البشر" نہ تھے جو اپنے جذبات کو چھپاتے پھرتے۔ وہ آدمیوں کی طرح ایک آدمی تھے لیکن ایسے آدمی جہاں آدمی کو میسّر ہے انسان ہونا۔ عام شاعروں اور بڑے شاعر میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں معتدل رہتا ہے۔ آج کل کے بیشتر شعرا جب بھی جنسی مسائل پر کچھ لکھتے ہیں تو اس میں غرق ہو کر صبر اور عقل کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں بے اعتدالیاں بہت ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہماری نئی شاعری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صرف جنسی جذبات کا گورکھ دھندا ہے۔ لیکن میر جب بھی جنس سے متعلق ہو کر کچھ لکھتے ہیں تو صرف اس کے ہو نہیں رہتے بلکہ اعتدال کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اول تو ان کے یہاں ایسے اشعار ہیں کہاں اور اگر ہیں تو وہ ہمیں اس میں بھی سنجیدہ نظر نہیں آتے بلکہ مذاق کرتے نظر آتے ہیں۔ ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہیں بھی ایک انسان کی ذمہ داری سے نیچے نظر نہیں آتے۔

غزل کے اس تجزیہ سے میری کوششوں پر یوں پانی نہ پھیر دیجئے گا کہ آپ سوچنے لگیں کہ میں اُردو میں فعلِ مذکر کے خلاف ہوں۔ اگر کبھی فعل مونث استعمال کرنے کا سوال اُٹھا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اس کا مخالف ہوں گا۔ کیونکہ فعل مذکر سے کئی فائدے بھی ہیں۔ اوّل تو فعل آفاقیت کا مظہر ہو گیا ہے کیونکہ ہم جب بھی جنس سے بلند ہو کر بات کرتے ہیں یا اظہارِ عشق کرتے ہیں تو ہمارا محبوب صرف محبوب ہوتا ہے۔ اس کا ایک حسین تصوّر اور اس کے قرب کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی ہیولیٰ یا جسمانی تصور ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ اور محبت کے غم کی جھلک غمِ آفاق اس وقت بن سکتی ہے جب ہم جنس سے بلند ہو کر بات کر سکیں اور جنس سے مبرّا شاعری کریں اور اصل میں وہی عشقیہ شاعری کہلانے کی مستحق بھی ہے۔ دوسرے ہمارا مزاج فعلِ مذکر کا اور اس تصوّر کا عادی ہو چکا ہے اور اس کو بدلنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ جب تک ہم اپنے اس نظام اور اپنی اخلاقی قیود کو تبدیل نہ کریں گے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے تو ہم کیسے فعل مونث استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ اس ماحول اور اس معاشرت کے ہوتے ہوئے عورت کا تصور وہی رہے گا جو اُردو شاعری میں رہا ہے تو اس تجزیہ سے میری مُراد "امرد پرستی" اور فعلِ مذکر کے استعمال کا سُراغ اور پتہ لگانا تھا نہ کہ مخالفت کرنا۔ اور میرا مدعا یہ بھی تھا کہ اُردو شاعری اور اُردو شاعروں پر "امرد پرستی" کا جو الزام لگ رہا ہے اُسے دیکھوں کہ کہاں تک درست ہے۔ اور اس میں کہاں تک حقیقت ہے۔ جب اُردو غزل پر مضمون ہے اور ساتھ ساتھ میر کا بھی تذکرہ آ گیا ہے تو کیوں نہ میر کے متعلق بھی کچھ کہتا چلوں۔

مجھے اپنے ترقی پسند ہم اہیوں اور دوستوں سے شکایت ہے کہ ان کی توجہ کی سب سے مستحق جو شخصیت تھی وہ اسے نظر انداز کر گئے ہیں۔ بڑے تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ اُردو کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے جو شخص تمام اُردو ادب پر چھایا ہوا تھا اسے ہی نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ سب سے توجہ کی مستحق وہی شخصیت ہو سکتی تھی۔ میر اُردو کے نشاۃ ثانیہ میں کیوں نہ مقبول ہو سکے۔ اس کی بظاہر دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ سے جو بیتری پھیل گئی تھی اور ادھر غیر ملکی حملہ آوروں سے بدتر سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے تمام لوگوں میں ایک دل شکستگی اور اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ آگے چل کر یہ اضمحلال جمود کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ یہ جمود ایک حد تک زندگی سے قطع تعلق کر چکا تھا۔ لیکن جب زندگی کے اثرات اُبھرنے شروع ہوئے اور ساتھ ساتھ جمود کی حالت تبدیل ہونا شروع ہوئی اور اس طرح ایک نئی تحریک پیدا ہوئی۔ ظاہر ہے کہ جب بھی کوئی نئی تحریک تازہ اور زندگی سے

بھرپور کسی فرسودہ اور پرانے حالات و ماحول میں سے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے اسی ماحول پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔ سب سے پہلا نشانہ وہی فرسودہ ماحول ہوتا ہے جس سے وہ پیدا ہوئی۔ یہ فطری امر ہے اور بغیر اس کے زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تو جدید اردو ادب بھی ان حالات سے گذرا۔ اپنے پرانے ماحول سے اُٹھ کر نئی زندگی شروع کرتے ہوئے جذباتیت آ جاتی ہے۔ جسے ہم وقتی ہنگامہ خیزی یا جذباتی ہیجان کہتے ہیں۔ اس جذباتی ہیجان اور انقلاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پرانے ماحول اور پرانی زندگی کو توڑ پھوڑ کر زندگی کے لئے نئی راہیں بنائی جائیں۔ اور اس جذباتی ہیجان میں وہ ہر پرانی چیز کی مخالفت کرتا ہے۔ اس میں کھوٹوں کے ساتھ ہیرے بھی تول دیئے جاتے ہیں۔ تو جاگیردارانہ نظام کے بعد جو جمود، فسردگی اور اضمحلال پیدا ہو چکا تھا اور اس ماحول میں جو شخص پیدا ہوئے تھے اور اس میں مرے تھے ان کے متعلق یہ جذباتیت نہایت شدت سے ابھری اور ذرا سی دیر میں اس دور کے سارے ادب کو، ادیبوں اور شاعروں کو رجعت پسندی کے لیبل کے ساتھ بند کر کے سمِ قاتل قرار دیدیا گیا۔ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور واقعی ایسی صورت میں میر کے متعلق غلط فہمی کا امکان تھا۔ حالانکہ اس جذباتیت کے دور میں بھی سوجھی سمجھی اور معقول باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ مگر برا ہو اس جذباتیت کا اس نے پورے پچاس سال تک اس شاعری کے خلاف بھی جد و جہد جاری رکھی جو اس کے نظریہ کی تائید کرتی تھی۔ ایک تو وجہ یہ تھی میر کی نامقبولیت کی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کلیاتِ میر چھ ضخیم دیوانوں پر مشتمل ہے جو علاوہ مہنگے ہونے کے اس وجہ سے بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکے کہ اس میں بعض غیر ضروری باتیں زیادہ تھیں۔ حالانکہ دنیا کی کوئی شاعری ایسا شاعر نہیں پیدا کر سکتی جس نے اتنا کہنے کے بعد بھی سب ایک ہی معیار کی شاعری کی ہو۔ اس کے لئے ایک عمدہ اور مستند انتخاب کی ضرورت تھی جو ضخیم بھی نہ ہوتا اور میر کو بغیر کسی دقت کے ان کی شاعری میں صحیح معنوں میں دیکھا جا سکتا۔ لیکن اب جذباتیت اور ہنگامہ خیزی کا وقت ختم ہو چکا ہے اور زندگی میں اعتدال پیدا ہو چکا ہے۔ نئی تحریک نے جو اثرات ہم پر ڈالے تھے اب ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور جو انقلابی تحریکیں اٹھی تھیں وہ اب زندگی کی اہم حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ لہٰذا اس اعتدال اور بہتر ماحول میں ہم سوچ سمجھ کر ہمارا سب تنقید کر سکتے ہیں۔ اور اچھے برے کو خوب اچھی طرح پرکھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے نئے نقادوں نے اپنی تنقید کی بنیاد پرانی تنقیدوں پر رکھی اور پہلے مضامین کو ذرا ہلکا کر کے سامنے پیش کر دیا۔ یا پھر ان لوگوں پر توجہ دی جو اردو کی نشاۃ ثانیہ سے تعلق رکھتے تھے یعنی غالب سے اقبال تک اور پرانے ادب کو اسی طرح جھوٹ سے رکھا۔ اس سے پہلے کہ ہم یہ دیکھیں کہ غالب اور اقبال ترقی پسند تھے یا میر۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم ان شاعروں کو کن ترقی پسند اصولوں سے دیکھیں گے۔

ہمارے سامنے ترقی پسند ہونے کے دو سب سے بڑے اصول ہیں۔ جن پہ ہم ہر آدمی کو پرکھ سکتے ہیں۔ اول تو ادب کا بقول احمد ندیم زندگی آمیز اور زندگی آموز ہونا اور دوسرے ترقی پسند اور نئے رجحانات کا ساتھ دینا۔ ان دو اصولوں پر جب ہم ان دو شاعروں کو پرکھتے ہیں، تو میر سے اقبال تک ہم کسی کو بھی زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگر میر اس زمانے میں ہوتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ صاحب ادب کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟ تو وہ یہی جواب دے سکتے کہ جو میرا زندگی سے۔ کیونکہ میر کی شاعری ان کے دور اور ان کی داخلی زندگی کا عکس ہے۔ اب دوسرا اصول یہ کہ نئے رجحانات کا ساتھ دینا۔ تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ میر کا زمانہ جاگیردارانہ نظام کے ڈوبنے کا وقت تھا۔ کوئی تحریک، کوئی خیال، کوئی تصور ایسا نہیں تھا یا سرمایہ دارانہ نظام کا احساس اس وقت تک نہیں تھا جس کا میر ساتھ دیتے لیکن میر کے بعد غالب کے زمانے میں سرمایہ داری کی صورت متعین ہو چکی تھی۔ ان کے سامنے انقلابی تحریکیں اٹھ چکی تھیں۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب، جاگیردارہوں کی عمر اور ان کی بقا کے لئے دست بدعا ہیں نہیں بلکہ کوشاں بھی نظر آتے ہیں اور پھر اقبال تو ایک ایسے زمانے میں تھے جبکہ سرمایہ داری کی بھی عمر ختم ہو چکی تھی اور ایک نیا نظام پوری طرح ابھر چکا تھا جس کا ایک کامیاب تجربہ ایک ملک میں ہو بھی چکا تھا لیکن اقبال نے کیا کیا؟

ان حقائق کے بعد ہم ان تین شاعروں کو ایک اور طریقہ سے بھی پرکھ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت کیسی تھی یعنی ان کی شاعری سے جو شاعر ابھرتا ہے وہ کیسا ہے؟

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال ایک بہت بڑے شاعر تھے۔ ایک ایسے زمانے میں تھے جبکہ عوامی تحریکیں پوری طور سے ابھر چکی تھیں اور جبکہ دنیا دو طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر اقبال بہت تعلیم یافتہ اور قابل شخص تھے۔ انھوں نے فلسفے، مذاہب اور عوامی تحریکوں کے متعلق بھی خوب اچھی طرح پڑھا تھا، دیکھا تھا اور سوچا تھا۔ لیکن ہم کس قدر مایوس ہوتے ہیں کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اقبال حقائق سے فرار کر کے خلاؤں میں سیر کرنے لگے ہیں۔ اور ایک ایسا تصورِ زندگی پیش کرتے ہیں جو اس مادی اور سائنسی زمانے میں قطعاً ناقابلِ قبول اور مضحکہ خیز ہے۔ اقبال کا مردِ مومن نشتے

کے فوق البشر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یعنی اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ پیچھے کسی ایسے زمانے میں لوٹ کر جانا چاہتے ہیں جہاں یہ ان کا نظریہ قابل قبول ہو سکے۔ زندگی کے ان موجودہ حقائق میں اس مادی اور سائنسی زمانے میں تصوراتی دنیا بسانا اور خلا میں بسر کرنا رجعت ہے اور فرار بھی اور نئے عوامی رجحانات کا ساتھ نہ دینا زوال پسندی کی نشانی ہے۔ میرے خیال میں اردو کا سب سے سنگین المیہ اور واقعہ اقبال کی تصوراتی اور ضد کی شاعری ہے جبکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو کر زندگی کے حقائق سے واقف ہو کر اس ترقی یافتہ اور انقلابی دور میں ہمیں سینکڑوں سال پیچھے لوٹانا چاہتے ہیں۔ اقبال نے علاوہ اپنی شاعری کے ویسے بھی بھوپال کے شیش محل میں بیٹھ کر مرزا "مومن" سے کہا تھا کہ "تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر" یعنی اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال فرما رہے ہیں کہ اے مسلمانو! اے عام لوگو! توکل اور قناعت کی زندگی بسر کرو کیونکہ تمہیں یہی تعلیم دی گئی ہے اور ہمیں اپنے "شیش محل" میں "توکل اور قناعت کی زندگی بسر کرنے دو۔ اقبال سے پہلے غالب کے یہاں بھی تقریباً یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ غالب کے زمانہ میں موجودہ دور کی طرح نہ معاشی ابتری تھی نہ طبقات کی تقسیم ہوئی تھی۔ کوئی عوامی تحریک بھی اس وقت موجود نہ تھی۔ لیکن ان کے زمانہ میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کی آخری جنگ ہو رہی تھی۔ غالب چاہتے تو سرمایہ داری کا ساتھ دے سکتے تھے۔ مگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کے علاوہ عام جاگیرداروں کی بقا کے ساتھ ساتھ غالب ان سے ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ علاوہ اس کے غالب کے زمانے میں وہ انقلاب رونما ہوا تھا۔ جس کا جواب عوامی تحریک کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ نے نہیں دیا۔ یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت جو ایک عوامی بغاوت تھی اور نئے غلامی کے جوئے سے باہر نکلنے کی کوشش۔ لیکن اس ہنگامہ خیزی میں ہم غالب کو زیادہ پریشان نہیں دیکھتے اور نہ ایک غزل اور ایک خط کے قطعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس دور میں ان تمام واقعات کو خود دیکھ رہا ہے۔ ان کو تباہی کا البتہ احساس ہے اور اس پر بھی وہ انگریزوں کے قتل و غارت کو جائز ٹھہراتے ہیں یعنی حکمراں طبقہ کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ جاگیرداری بہرصورت برقرار رہے۔ انھیں انقلابی تحریک سے کوئی ہمدردی نہیں معلوم ہوتی اور تباہی کو وہ یوں جائز ٹھہراتے ہیں کہ عوام نے انگریزوں کے ساتھ کیا نہیں کیا جو انگریز ان کے ساتھ نہ کرتے۔ غالب سے پہلے میر کو دیکھتے ہیں جو غالب سے پہلے ایک ایسے زمانہ میں تھے جبکہ جاگیرداری کے جیل جلاؤ کا وقت تھا لیکن کوئی ایسی صورت نہ تھی جو جاگیرداری کے بعد ظہور میں آتی۔ البتہ یہ ہوا کہ جاگیرداری کی آخری عمر اور اس کی تباہی کی وجہ سے عام طور پر ایک شکستگی، مایوسی اور اضمحلال پیدا ہو گئی تھی اس مایوسی اور اضمحلال کی تصویر کشی کے معنی تھے عوام کے جذبات و احساسات کی تصویر۔ علاوہ اس کے میر خود بھی ان حالات میں پیدا ہوئے تھے۔ پریشانی روزگار نے انھیں بھی بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس کی تلاش میں وہ آگرہ سے دہلی گئے اور اس کے بعد زندگی کے چند جھٹکے اور ساتھ ساتھ رشتہ داروں اور بہی خواہوں کی بے اعتنائی اور روزگار کا نہ ہونا، دوستوں کی لاپروائی نے غم دوراں کو بھی داخلی زندگی کا ایک حصہ بنا دیا۔ یہ احساس اس شدت سے ابھرا کہ میر جنون میں مبتلا ہو گئے۔ اور جب اچھے ہوئے تو دنیا کی ان تمام مصیبتوں کو بھول کر اور دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ چاہے آپ اسے خودداری کہہ لیجئے خواہ کچھ اور۔ لیکن آپ کو میں فرار اس لئے نہیں کہنے دونگا کہ یہ نہیں ہوا کہ میر زندگی کو بھول کر کسی اور تصور میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ بلکہ انھوں نے زندگی کے تمام اثرات اور اس وقت کے احساسات کو اور بھی شدت کے ساتھ اپنے سامنے پیش کیا۔ ان کا یہ احساس اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا یہی چیز ہے کہ ہم اسے فرار نہیں کہہ سکتے بلکہ داخلی زندگی کے کسی انتہائی ردعمل کہہ سکتے ہیں۔ عام طور سے میر کی اس خودداری کو یا ردعمل کو لوگ اس ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ عوام سے دور رہتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ نفرت کا تو خیر کوئی جواب نہیں۔ البتہ جو وہ عوام کے ساتھ تھے اس سے زیادہ وہ جاگیرداروں اور نوابوں کے ساتھ تھے۔ اگر وہ عوام سے بیزاری برتتے تھے تو سربازار نوابؔ وقت سے یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ "سربازار یہ بات چیت کرنا شرفا کا شیوہ نہیں" لہٰذا یہ اعتراض تو نہایت لغو ہے۔

میر کے اشعار میں اضمحلال اور مایوسی اس زمانے کی پیداوار تھی لیکن میر کے اشعار پڑھنے سے کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ مایوسی یا دل شکستگی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے شعروں میں اس زمانے کے اثر سے سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ان کے اشعار میں تعمیر پسندی ہے۔ جہاں غم کا احساس ہوتا ہے اور شدید لیکن ہمیں رد کچھ کرنے پر اکساتا ہے۔ دوسرے میر کی زندگی میں جو حادثات پیش آئے اور آگرہ سے دہلی پہنچنے پر جو ان کے ساتھ سلوک کئے گئے، پریشانی روزگار وغیرہ جس کی صحیح تصویر میر کی مثنوی خواب و خیال میں ملتی ہے۔ اور یہی غم زمانہ داخلی احساس کے ساتھ مل کر زندگی کا شدید احساس بن گئی اور سوز و گداز کی صورت میں ظاہر ہوئی لیکن میر صرف یہی نہیں بلکہ میر اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ انھوں نے داخلی شاعری کو آفاقیت میں تبدیل کر دیا۔

ان کی شاعری ایک آدمی کا احساس نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری زندگی، پورے ماحول، پورے زمانے کے جذبات اس میں دھڑک رہے ہیں۔ میر نے اپنے غم کو سب کا غم اور سب کے غم کو اپنا غم بنا دیا ہے اور جب وہ کہتے ہیں:

جو اس شور سے میر روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ میر نے ہمیں ایک احساس دیدیا جہاں بڑے بڑے پانی مانگ جاتے ہیں۔ اس شعر کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی معراج کی حقیقت اب سمجھ میں آئی ہے۔ یہی میر کی شخصیت ہے۔ فراق نے بالکل سچ کہا ہے کہ "میر کے دل و دماغ کا شخص ایشیا تو کیا یورپ میں بھی کم پیدا ہوتا ہے"۔

اب ہم میر اور ان کے بعد دو بڑے شاعروں کو ایک اور نقطۂ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔

بڑا شاعر اور عوامی شاعر حقیقتاً وہی ہوتا ہے جو ایسی باتیں کہے جو ہماری عام زندگی سے تعلق رکھتی ہوں اور ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا لہجہ اور کہنے کا ڈھنگ اور سادگی ایسی ہونی چاہیئے جسے ہر عام آدمی سمجھ سکے اور اسی طرح محسوس کر سکے جس طرح کہنے والا محسوس کر رہا ہے۔ ایسی سادہ اور عام فہم زبان ہو جو جاہل سے جاہل آدمی بات کو سمجھ لے۔ اور محسوس بھی کرلے تو ہمیں اقبال کو اس صف سے نکال دینا پڑتا ہے کیونکہ ان کی شاعری "فلسفہ" ہے اور ایسا فلسفہ جو "پیغمبرانہ" ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان بھی فلسفیانہ ہے جو عوام تو خیر کیا خاصے پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ لہٰذا ان کو اس صف سے نکالنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک صاحب نے یہی اعتراض اقبال پر کیا تھا تو ایک صاحب کو بہت غصہ آیا تھا اور انھوں نے معترض کی تمام تحریروں پر یہی فتویٰ صادر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ بے جان اور لغو ہیں۔ حالانکہ موصوف کا اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا جہالت کی دلیل ہے۔ کیونکہ شاعری چند آدمیوں کی میراث نہیں۔ اور نہ چند آدمیوں کے سمجھنے کے لئے ہے۔ اور جب عوام جاہل ہوں اور خصوصاً ہندوستان کے جہاں پڑھے لکھے آدمیوں کا تناسب دس ہزار میں ایک بھی نہ ہو۔ ادب زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور زندگی ہمارے یہاں عوام ہیں۔ لہٰذا ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال کی شاعری عوام کے لئے نہیں ہے۔ اقبال کے بعد غالب کا نمبر آتا ہے۔ یہاں پر ایک فلسفی نظر آتا ہے۔ مگر غالب نرے فلسفی نہیں بلکہ ایسے خیالات کا بھی اظہار کرتے ہیں جو عام لوگوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن ان کے یہاں آفت یہ ہے کہ ان کے خیالات کو ادا کرنے کے لئے جو الفاظ اور کہنے کا ڈھنگ ہے وہ نہایت عالمانہ ہے۔ یعنی وہ فارسی سے زیادہ قریب ہے۔ لہٰذا وہ بھی تقریباً عوام کے لئے ناقابل فہم رہتے ہیں۔ اب رہے میر تو ان کے متعلق کچھ لکھنا فضول ہے۔ کیونکہ میر سے لے کر موجودہ دور کے عوامی شاعر کی شاعری نہ اتنی عوام کے قریب ہے اور نہ اتنی عام فہم ہے جتنی میر کی شاعری اور ساتھ ساتھ زود اثری میں تو کوئی ان کے سامنے ٹھہرتا نہیں ہے۔ میر کے شعر جاہل سے جاہل آدمی سمجھ لے گا اور اسے اسی طرح محسوس بھی کرے گا۔ لہٰذا اس زمانے کا بھی اور اس سے پہلے زمانے کا سب سے بڑا عوامی شاعر میر ہے اور میر ہی ہو سکتا ہے۔

ان حقائق کے بعد ہمیں یہ خوب اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا ترقی پسند اور عوامی شاعر میر ہی تھا۔ غالب اور اقبال کو ترقی پسند صفوں میں شامل کرنا اور میر کو رجعت پسند زوال پسند سمجھنا موجودہ دور کے نقادوں کی بے انصافی اور لاعلمی کی دلیل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجوہ تھیں جس کی وجہ سے غالب اور اقبال کو ترقی پسند سمجھا جاتا رہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری جب سے عالم وجود میں آئی ہے اس وقت سے اس کا مخصوص لہجہ مخصوص سادگی اثر و گداز کے علاوہ اور چند مخصوص روایتیں سب ایک ہی لے میں ہوتی آئی ہیں۔ اور یہ طرز اور یہ ڈھنگ و خصوصیات خسرو سے لے کر مومن تک برستور موجود رہیں۔ غالب پہلے شاعر تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے فلسفہ کی بنیاد رکھی اور ان خیالات کو ادا کرنے کے لئے نئے نئے الفاظ اردو میں داخل کئے جو فارسی سے لئے گئے تھے یا اس سے بنائے گئے تھے۔ اس کی وجہ سے غالب کی عام غزل بھی ان کے عالمانہ اور فلسفیانہ دماغ کی وجہ سے نئے نئے الفاظ، نئے نئے خیالات اور نئی طرز ادا اور نئے انداز کے ساتھ ظہور میں آئی اور بجائے سوز و گداز اور یاسیت کے انھوں نے شگفتہ انداز میں غزلیں کہیں۔ یہی فرق تھا جو غالب کو پہلے شاعروں سے بالکل الگ کر دیتا ہے اور پڑھنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس نے کیونکر اردو کو نئی چیز دی اور نئی نئی راہیں نکالیں لہٰذا غالب ترقی پسند تھے۔ ان کا طرز تحریر اور فلسفیانہ مسائل اور اردو روایت سے بغاوت نقاد کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمارے نقاد اس سلسلے میں اپنی شہرت کے بھی خواہشمند رہے۔ لہٰذا انھوں نے غالب کو بے دھڑک ترقی پسند ٹھہرا دیا۔ اور ان کی شاعری میں سے کچھ ایسی چیزیں تلاش کرلیں جو ان کے خیال کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً غالب کا یہ شعر ہمارے نقاد اکثر غالب کی ترقی پسندی

کی دلیل میں دیتے ہیں۔

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اور اقبال نے ایک سرے سے شاعری کی ہیئت ہی تبدیل کر دی یعنی انھوں نے اپنے افکار تمام کے تمام نظم میں سموئے۔ اور اردو کی روش کو ہی تبدیل کر دیا علاوہ اس کے ان کے تخیلات بھی کم از کم اردو کے لئے بالکل نئے تھے۔ اس کے علاوہ اقبال نے کئی نظمیں مزدوروں اور کسانوں پر بھی کہی ہیں۔ حالانکہ ان کی اہمیت اقبال کی نظر میں بھی اور ہمارے نزدیک بھی انکی شروع شروع کی "وطنیت" سے زیادہ نہیں۔ مگر ہمارے نقادوں نے اسے ہی اقبال کی شاعری کی اصل اساس قرار دے کر انھیں ترقی پسند ٹھہرا دیا۔ میرے خیال میں غالب تو خیر کسی صورت سے اس کے احاطے میں آتے بھی ہیں مگر اقبال کو ترقی پسند کہنا زیادتی ہے۔

میر غالب سے پہلے اور اقبال سے تو کافی عرصہ پہلے تھے۔ اور میں ان کے متعلق بتا چکا ہوں کہ ان کے سامنے کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جس سے وہ منسلک ہوتے حتیٰ کہ اس وقت تک کوئی تصور بھی نہ تھا اور اس وقت تک تو یورپ میں بھی سرمایہ داری کو آنے میں دس پندرہ سال اور درکار تھے لہٰذا ان کے یہاں عوام سے ہمدردی اور ان کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی اور ان کی سماجی تصویر کھینچنا میر کے عوامی شاعر ہونے کی دلیل ہے۔

یہ شعر ملاحظہ ہو:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہے گویا چراغ مفلس کا

مفلس کی حالت اس کے درد و غم کی تصویر اس سے زیادہ موثر انداز میں شاید ہی کوئی پیش کر سکے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میر سارے جہاں کے درد کو اپنا درد سمجھتے تھے اور اسی لئے ان کی شاعری میں آفاقیت کے عناصر کثرت سے سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بیسیوں شعر میر کے دیوان میں جا بجا مل جائیں گے جہاں عوام کی تکلیفوں کا اور ان کے درد و غم کا شدید احساس ہے۔ اوپر کے شعر میں چاہے "چراغ مفلس" کو دل سے تشبیہ دے دیجئے خواہ دل کو "چراغ مفلس" سے۔ حالت مفلس ہی کی بیان ہوتی ہے (اور میر خود کو مفلسوں میں ہی شمار کرتے ہیں) مفلس کی حالت کیسی ہے "شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے" پڑھئے اور سوچئے کیا کوئی شعر ہماری شاعری میں اور بھی ایسا ہے؟

ایسے سینکڑوں اشعار میں ہمیں آفاقیت ملتی ہے۔ سارے جہان کے عوام کے درد کی جھلکیاں ملتی ہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک انسان ملتا ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ میر ہماری ہی شاعری میں نہیں دنیا کے بہترین شعراء میں بہت بلند درجہ رکھتے ہیں۔

آنے والے دور کا باشعور نقاد میر کے متعلق یہی فیصلہ کرے گا۔ میں پھر کہوں گا کہ ہمارے ترقی پسند بھائی اور دوست میر کا مطالعہ کریں اور غور و محنت سے اس کا انتخاب کریں تو جہاں عوام سے ہمدردی، ان کے احساسات، خلوص، محبت، انسانیت کے وہ تھرتھراتے ہوئے جذبات ملیں گے کہ جو آپ کو شاعری کا مقصد اور اس کی بلند ترین تحریکات کا سبق سکھائیں گے جہاں سے آپ کو بہترین مواد مہیا ہو سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آنے والا دور میر کو ایک بہت بڑا ترقی پسند اور عوام دوست شاعر سمجھے گا۔

نٹ ھیمسن — نوبل پرائز یافتہ مصنف کا شاہکار ناول

بھوک

○ جو ایک بھوکی روح کی جانگداز چیخ ہے۔
○ جو ایک بھوکے کو انقلاب کا جنگجو سپاہی بناتا ہے۔
○ جو انسان کے کردار، اخلاق اور زندگی پر بھوک کے مذموم اثر کی داستان ہے۔
○ جو بھوک کی بیخ کنی پر انسان کو کمربستہ کرتا ہے۔

قیمت تین روپے

مترجمہ: مخمور جالندھری

مکتبہ شاہراہ - دھلی ۶

غلام ربانی تاباں

پاکستانی دانیالوں سے

بتاؤ کہ تم پاسباں خود کو کہتے ہو آزادیٔ فکر و گفتار کا

اور شہری حقوں کا

یہ انصاف ہے ——— ؟

یہ کیسی عدالت ہے' ملزم' کو جس نے بنایا ہے' مجرم'

اُٹھاؤ ذرا' ضابطہ فوجداری'

"شہادت کا قانون" دیکھو

نظائر ——— تمہاری عدالت کے یہ فیصلے ہیں

انھیں دیکھ جاؤ

تمہارے ہی قانون نے ملزموں کو "صفائی" کا حق بھی دیا ہے

عدالت کا ——— قانون کا خون کرنے سے پہلے

دلوں کو ٹٹولو

یہ انصاف ہے ——— ؟

یہ جمہوریت ہے ——— کہ فسطائیت ہے ——— ؟

ابھی یاد ہے جرمنی کا وہ آتش زنی کا فسانہ
جسے ہٹلری ڈاکوؤں نے
بہانہ بنایا تھا جمہوریت کا گلا کاٹنے کا
بہانہ بنایا تھا 'احرار' کو پھانسیوں پر چڑھانے کا ـــــ لیکن
فسانہ کا انجام بھی تم نے دیکھا
وقت کا فیصلہ سُن چکے ہو
کون جیتا ـــــ اور کون ہارا

عوام اس طرح سے تو کچلے نہیں جا سکیں گے
یہ بند و سلاسل ـــــ یہ پھانسی کے تختے
بدلتے ہوئے وقت کے تیز دھارے میں بہہ جائیں گے
ادیب اور شاعر
(وہ سجاد ہو ـــــ فیض ہو ـــــ قاسمی ہو
ظہیر اور ممتاز ہوں)
زمانہ کی کشتی کے یہ ناخدا ہیں
شکستِ نظامِ کہن کی صدا ہیں
صداؤں کو پابند کیسے کرو گے ـــــ؟
اگر یہ نہ ہوں گے کوئی اور ہوں گے
صدائیں بہر حال اُٹھتی رہیں گی
فضا میں ترانے بکھرتے رہیں گے

مخمور جالندھری

جشنِ جمہوریت

رہگذاروں پہ دھمک اور سجیلے پہرے
پھر کسی نے ہمیں بہکایا کہ آزاد ہیں ہم
تخت ہے، تاج ہے، منصب ہے ہماری رائے
ایک جمہوریۂ عظمیٰ کے افراد ہیں ہم

آج چھٹی ہے حکومت کی طرف سے اُن کو
مول لے لیتی ہے یہ چند نوالوں سے جنھیں
اور پھر اپنے تماشوں میں اضافے کے لئے
کھینچ لاتی ہے کڑے خوف کے بھالوں سے جنھیں

جمع ہے جاہ و حشم آج پھر یہ دل کے تلے
گھر سے نکلے ہیں وہی لوگ فراغت ہے جنھیں
صبح بھی جن کی سبھا، شام بھی بن کی جلسہ
اپنے پندار کے دکھلاوے کی عادت ہے جنھیں

اور جو دیس کی قوت ہیں فضیلت ہیں وہ لوگ
اُن کا ہر لمحہ تگ و تاز ہے کیسے آئیں
آج کے دن بھی وہ اس فکر سے آزاد نہیں
چولھا روشن ہو، کسک کم ہو جو پیسے آئیں

آج کے دن کوئی میلا ہے وہ سُن لیتے ہیں
جانا بھی چاہیں تو پل بھر کو نہیں جا سکتے
میلے جانے کی نفاست کے بھی وہ اہل نہیں
مُنہ تو دھو سکتے ہیں کُرتہ نہیں دھلوا سکتے

میلے میں جانے سے کرمے نے یہ بہتر جانا
چارپائی جو ہے ٹوٹی ہوئی اُس کو بُن لے
رادھا نے چاہا کہ چوکے سے نپٹ کر فوراً
شب کے ایندھن کے لئے تھوڑے سے تنکے چُن لے

گندی نالی سے اُٹھاتا ہے غلاظت نانک
ویسا بازار میں بیٹھا ہے لئے گھاس اور پھوس
اور ٹینکوں پہ، مشینوں پہ، حسیں فنّوں پر
رہگذاروں سے گذرتا ہے حکومت کا جلوس

اور ان ٹینکوں پہ گھوڑوں پہ، حسیں فنّوں پہ
بڑی سرکار، زمیندار نظر آتے ہیں
حرص، تکذیب، غبن، سود، اجارہ، رشوت
سبھی اقسام کے بٹ مار نظر آتے ہیں

آہنی فوج کے، پولیس کے دکھلاوے کو
جشنِ جمہور ریاکار ہی کہہ سکتے ہیں
جشنِ جمہور کے پردے میں یہ مذموم مذاق
سچّے انسانوں کے غدّار ہی سہہ سکتے ہیں

جشنِ جمہور نہیں، یہ تو ہے جشنِ قوّت
اک بہانہ ہے ہمیں لوہے سے دہلانے کا
کوئی حیرت نہیں ایسے میں ہمارا سودا
اور بڑھتا ہے جو اس لوہے سے ٹکرانے کا

ایک بار اور ہم ایسے میں قسم کھاتے ہیں
اپنی دھرتی پہ بہت جلد وہ دن لائیں گے
جشنِ جمہور کا دن جب یہ گلی کوچوں سے
لوگ خوشبوؤں سے ریشم سے لدے آئیں گے

جمیل ملک

مستقبل

فلسفی کتنے تجھے ڈھونڈھ کے تھک ہار گئے
آج تک پا نہ سکے تیری حقیقت کا سُراغ
اُن کے ادراک کو حیرت کے سوا کچھ نہ ملا
گو جلاتے رہے "تحقیق و تجسس" کے چراغ

اپنے ماحول سے ناواقف و بیگانہ یہ بُت
دُور ہی دُور سے بس دیکھا کئے عالم کو
اور ہم ـــــ جاں سے بھی نزدیک تجھے دیکھتے ہیں
اپنے ماحول نے دی ہے وہ بصیرت ہم کو

اپنی ہی ذات میں گم فلسفہ دانوں سے، رفیق!
تجھ کو مستور ہی رہنا تھا سو مستور رہا
ہم تجھے پالیتے ہیں کانوں، ملوں، کھیتوں میں
کچھ بھی ہو ہم سے تو مستور نہیں رہ سکتا

کمال احمد صدیقی

دعوت

یہ ہر اک سمت وحشت خیز ہنگاموں کی بیزاری
بہ یک پروازِ کاش اُس منظرِ رنگیں پہ چھا جاؤں!
میں خود بھی چاہتا ہوں زندگی کے آبگینے میں
کبھی دوشیزۂ رومان کے آنسو بھی چھلکاؤں!

یہ کس کے ساز کی بیداریاں ہیں آبشاروں میں؟
اشارہ کر رہا ہے کون انگڑائی کے عالم کو؟
صدائیں گنگھروؤں کی گونجتی ہیں کوہساروں میں
ہوئی ہیں جمع دوشیزائیں کس کے خیر مقدم کو؟

"اُلٹتے ہی رہو گے پردہ ہائے روز و شب؟ کب تک؟؟
تمہیں ہے جستجو جس کی، یہاں پر وہ مسرت ہے!
یہاں آؤ، یہاں کی نرم اور دل کش فضاؤں میں
تمہیں ہر منظرِ رنگیں پہ چھا جانے کی دعوت ہے!!"

نشاطِ رنگ و رقص و نغمہ کو جاوید کر ڈالوں؟
طرب زارِ تخیل کو فضا کا کیا سہارا ہے؟؟
خیال آیا کہ دل جلنے لگا، آنکھیں دہک اُٹھیں
یہ انگاروں کی وادی سے مجھے کس نے پکارا ہے؟

محبت ہے مجھے نوخیز اور دل کش نظاروں سے
چناروں، کوہساروں، آبشاروں، لالہ زاروں سے
شراب و شعر سے اور رقص و نغمہ کی بہاروں سے
حسیناؤں سے، دوشیزاؤں کے رنگیں اشاروں سے!

مری نظروں میں ہے "نانِ شبینہ کی حقیقت بھی
ابھی جکڑی ہوئی ہے زندگی "بجلی کے تاروں" سے!
میں آؤں گا، ضرور آؤں گا ہر منظر پہ چھا جانے
نکلنے دو ذرا "محنت" کو "سونے کے حصاروں" سے!!

نریش کمار شاد

ماں

ماں تری پیار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کی تھکن
ایک سنگین حقیقت ہے کوئی راز نہیں
ایک گمبھیر خموشی ہے ترے دل پہ محیط
کوئی آواز نہیں، کوئی بھی آواز نہیں

تھرتھراتی ہے تری جھلسی ہوئی سانسوں میں
بلبلاتی ہوئی مجروح اُمنگوں کی پکار
رنگ و نکہت سے تہی ہے تری دُنیا جس میں
کبھی پھوٹا نہ اُجالا کبھی آئی نہ بہار

یہی کچلا ہوا احساس ہے جس کی تلخی
سُکھ کے سرچشمۂ سرمست میں ڈھلنے کے لئے
میری شادی کی ضیا پاش تمنّا بن کر
تیرے سینے میں جلاتی ہے مسرّت کے دیئے

دیئے توڑ کے کیسے میں تجھے سمجھاؤں
میری شادی بھی ترے غم کو نہ راس آئے گی
پھر بھی اُٹھے گا بدستور ترے دل سے دھواں
تیرگی پھر بھی مرے ذہن پہ منڈلائے گی

پھر بھی آرام کے بازو کسی ناگن کی طرح
اپنے حالات کی گردن میں حمائل ہوں گے
وہی بے رنگ شب و روز کا رونا ہوگا
وہی اُلجھے ہوئے جاں سوز مسائل ہوں گے

تجھ میں اور تیری مسرت میں ہیں جب تک حائل
اس ستم کار تمدّن کے پُرانے پردے
غیر ممکن ہے کوئی چاند سے چہرے کی دلہن
اپنے ماحول کی ظلمت میں اُجالا کر دے

احمد ظفر

○

ہزاروں غم ہیں جو دل میں چھپا رہا ہوں میں
برائے اہلِ نظر مسکرا رہا ہوں میں

یہ میری شدتِ جذبات بھی عجب شے ہے
ہنسی ہنسی میں کئی زخم کھا رہا ہوں میں

اک آنے والی مسرت کی ابتدا ہوں گے
قدم قدم پہ جو صدمے اُٹھا رہا ہوں میں

کبھی تو آئے گی میری طرف نگاہِ سحر
ہر ایک راہ میں آنکھیں بچھا رہا ہوں میں

جمالِ مہرِ درخشاں لئے جمالِ سحر!
حیاتِ تازہ کے ہمراہ آرہا ہوں میں

جو حریت کے لبوں سے اُتر رہے ہیں ظفر
بطرزِ نو وہی نغمے سُنا رہا ہوں میں

حلیم صابر

○

کوششِ ناتمام نے مارا
گردشِ صبح و شام نے مارا

موت سے ہمکنار ہونے تک
"زندگی" تیرے نام نے مارا

اک نظر اک سلام نے لُوٹا
اک ادا۔ اک پیام نے مارا

جانتا ہوں مآلِ بادہ کشی
ساقیا! احترام نے مارا

دیکھے پھر عشق کو فریبِ وفا
حُسنِ بالائے بام نے مارا

اُن کو پا کر بھی اُن کو پا نہ سکا
دل کو احساسِ خام نے مارا

دُور منزل نہ تھی مگر صابر
رہبروں کے نظام نے مارا

سکنڈیل

صفدر ناتھ

میں نہیں چاہتا کہ اس وقت، کہانی سنا کر آپ کو بور کروں۔ دراصل میرے ذہن میں طوائف کے متعلق ایک کہانی ہے۔ یوں تو آپ کو لفظ طوائف سے نفرت ہوگی۔ اور مجھے بھی ہے۔ لیکن مجھے طوائف کے علاوہ اس نظام سے نفرت ہے، جہاں طوائفیں جنم لیتی ہیں، اور جنہیں کراس اندھیرے میں مرجاتی ہیں۔ میں ایک بار ایک طوائف کے گھر گیا تھا۔ کیا آپ کسی طوائف کے گھر گئے ہیں۔ شرمائیے نہیں، بتا دیجئے گا۔ خیر آپ بتانا پسند نہیں کرتے، تو میں ہی بتا دیتا ہوں۔ اس کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اسے کمرہ کہنا لفظ کمرہ کی توہین کرنا ہے۔ نہایت گندہ اور بدبودار۔ بہت میلا کچیلا۔ بے سروسامانی اور سامنے کی دیواروں پر ننگی تصویریں۔

طوائفیں اکثر دن کو سوتی ہیں اور رات کو جاگتی ہیں، کئی رات کو سوتی ہیں اور دن کو جاگتی ہیں۔ کئی دن بھر بھی جاگتی ہیں اور رات بھر بھی۔ کیونکہ تجارتی نکتہ نگاہ سے گاہک اور موت کا کوئی وقت معین نہیں۔ کسی وقت آجائے۔ کب آجائے۔ اور رنڈی کے کوٹھے پر ہر شخص جا سکتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ تو اس کمرے میں ایک عورت نہ رہتی تھی، بلکہ تین عورتیں۔ یعنی تین طوائفیں۔ اور باہر ایک جنگلہ۔ جیسے پنجرہ یا گھر میں جانوروں کو رکھا جاتا ہے۔ یہ تین طوائفیں ایک کمرے میں کیوں رہتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک طوائف اپنا جسم بیچ کر اپنے کھانے کا خرچ نہ چلا سکتی تھی، اس لئے تین طوائفیں اکٹھی رہتی تھی، تاکہ کم سے کم کرایہ دینا پڑے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ وہ کس قسم کی طوائفیں تھیں، خوبصورت یا بدصورت، جوان یا بوڑھی۔ ان کے کپڑے، ان کی گفتار، ان کی بول چال۔ ان کا جسم، ان کا رنگ روپ، یعنی تمام چیزوں سے آپ واقف ہونا چاہتے ہیں۔

جس جگہ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اسے فارس روڈ کہتے ہیں۔ اور وہاں کے رہنے سہنے کا طریقہ، بول چال۔ اور کپڑوں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ محض پیٹ پالنے کے لئے جسم کو بیچا جاتا ہے، یہ سب باتیں چھوڑ کر ایک نہایت اہم بات کا ذکر کرتا ہوں۔ اس کمرے میں نوماں کی تصویر ٹنگ رہتی تھی۔ سامنے نذرانۂ پیار پر گنیش جی براجمان تھے۔ اور قریب کی ایک چوکی پر لکشمی دیوی کی ایک مورتی تھی۔ جس کے گلے میں پھولوں کا ہار تھا۔ اگربتی سے کمرے کی ہوا متعفن ہو رہی تھی، اس دن مجھے معلوم ہوا کہ صرف بلیک مارکیٹ کرنے والے خدا کا نام نہیں لیتے۔ طوائفوں کا بھی خدا ہوتا ہے۔ وہ بھی مندروں اور مسجدوں میں جاتی ہیں۔ تاکہ ان کے گاہکوں میں اضافہ ہو۔ اور ان کی زندگی آرام و آسائش سے گذر سکے۔ خدا کا استعمال یہاں نہایت ہی بیک ورڈ دکھائی دیتا ہے ہو سکتا ہے کہ ان کے استعمال سے ہمارے پنڈت اور ملا ناک بھوں چڑھائیں اور اپنی متبرک اسمبلی میں یہ ریزولیوشن رکھیں کہ طوائفوں کو اس طرح پرماتما المعروف خدا کے نام کو یوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس قسم کے ریزولیوشن کی اطلاع دراصل ہندوستان کے پرائم منسٹر کو ملنا چاہیے مجھے نہیں۔

بہرحال اس قسم کی طوائفوں کو چھوڑ کر ایک اور قسم کی طوائفیں ہوتی ہیں۔ جو نہایت ہی شاندار کمروں میں رہتی ہیں۔ ایک خوبصورت فلیٹ۔ ڈرائنگ روم صوفہ سیٹ۔ گراموفون۔ ریڈیو۔ فرش پر دریاں۔ دریوں پر قالین۔ اور قالینوں پر پلنگ۔ اور پھر شراب، لذیذ کھانے۔ کرسیاں میزیں۔ اور پردوں کے پیچھے خوبصورت بستر اور پھر نواب زادے۔ سیٹھ۔ ساہوکار۔ شکر سب آتے ہیں نیچے ان کی کاریں کھڑی رہتی ہیں۔ عشق کرتے ہیں، نیچے ان کے ڈرائیور لوگ مانیوں میں گپ شپ کرتے ہیں اور پھر اسی انتظار میں صبح ہو جاتی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی باتیں آپ کو پسند نہیں۔ اور نہ ہی ان باتوں سے کوئی کہانی بنتی ہے۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ آپ کو ایک کی کہانی سناؤں۔ اگر آپ ایک منٹ کے لئے اپنی آنکھیں بند کریں۔ تو آپ کی آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹا سا گھر دکھائی دے گا۔ باورچی خانے میں آپ کی ماں کھانا پکا رہی ہے آپ کا چھوٹا بھائی کالج گیا ہوا ہے۔ آپ کے والد کو پنشن ملی ہوئی ہے۔ لیکن پنشن سے گذارہ نہیں چلتا۔ وہ دن رات بیمار رہتا ہے دمہ اور کھانسی سے۔ آپ کی بہن جوان ہو گئی ہے۔ اور ماں ہر روز اس کی شادی کے لئے تکرار کرتی ہے اور آپ کو اپنی بہن کے لئے کوئی در نہیں ملتا

شاعرہ

کبھی کبھار آپ کی بہن ایک لڑکے میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ اور اسکی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اور پیلے زرد گال ایک تھوڑے عرصے کے لئے خوشی سے تمتما اٹھتے ہیں۔ وہ اسی خوشی میں ایک نہایت ہی بے ہودہ گیت گاتی ہے " آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے "، یا کوئی اور گیت۔ ماں یہ گیت سنتی ہے۔ لڑکی کو ڈانٹتی ہے۔ آپ اپنی ماں کو جھڑکتے ہیں۔ لیکن ماں کہتی ہے۔ کہ نلاں لڑکا اس راستے سے گزرتا ہے وہ گھور گھور کر بملا صرف صابرہ، صرف ہر نام کور کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ سن کر آپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ مساوات اور آزادی کا سارا تصور آپ کے ذہن سے مٹ جاتا ہے۔ اور آپ اپنی بہن کو آنسا مارتے ہیں۔ کہ پجاری کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے اور پھر ساری عمر کے لئے آپ کو اسے کھلانا پڑتا ہے۔ یا کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ آپ کا بیمار باپ چاہتا ہے کہ اس کا لڑکا کہیں نوکر ہو جائے۔ آپ چاہتے ہیں آپ کے چھوٹے بھائی کو کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن اسے نوکری نہیں ملتی۔ آپ کو نوکری نہیں ملتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کہیں نوکری مل جائے، اور آپ اپنی بیمار بہن کو کسی اچھے سینی ٹوریم میں بھیج دیں۔ باپ کے پھیپھڑوں کا ایکسرے کرالیں۔ چھوٹے بھائی کی شادی کر دیں۔ یا باپ کو ہر مہینے روپے بھیجیں۔ لیکن اکثر یوں نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو کچھ اور ہوتا ہے۔ جس کا میں یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا۔

میں نے آپ سے کہا۔ کہ میں آپ کو کوئی ایسی کہانی سناؤں گا جس سے آپ کی طبیعت مضمحل اور افسردہ ہو جائے۔ یوں تو میرے ذہن میں بہت سی کہانیاں ہیں۔ یعنی دہی گاؤں والی کہانی۔ نہایت خوبصورت اور دلچسپ کہانی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں۔

قبلہ! میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ میں نے اپنا بچپن ایک گاؤں میں گذارا۔ میں جوان ہوا اور مرنے کے لئے اس گنوار بے رحم شہر میں آگیا۔ بڑا خوبصورت گاؤں تھا وہ۔ چاروں طرف پہاڑ۔ میرے گاؤں کے ساتھ ایک صاف شفاف ندی بہتی تھی۔ سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی برف بھی۔ کیا آپ نے برف کو گرتے دیکھا ہے۔ شہر والے کیا جانیں، برف کا یہ منظر، میرے گاؤں میں ٹھنڈے پانی کے چشمے تھے۔ جن کا پانی۔ گیہوں اور مکئی کے کھیت، دھان کے کھیت۔ پگڈنڈیاں۔ ہری ہری گھاس۔ چیڑھ کے درخت، اور جب رات پڑتی تھی تو پہاڑ سو جاتے تھے۔ جنگل سو جاتے تھے۔ ندی سو جاتی تھی۔ دھان کے کھیت سو جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار کوئی گیدڑ چیختا ہوا چیڑھ کے درختوں سے سرسراتی ہوئی گذرتی۔ یا پیر امام بخش کے مقبرے پر بھوت ناچتے۔ کوئی لال پری ناچتی ہوئی سڑک پر سے گذر جاتی۔ کسی کے قدموں کی آہٹ آتی۔ اور ہم لوگ آپس میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور پھر امام بخش کے مقبرے پر جا کر اس سے تعویذ لیتے۔

اور پھر پیر امام بخش کہتا " بیٹے اچھے وقت پر تم لوگ آئے ہو۔ گاؤں پر آفت آنے والی ہے۔ اور اس آفت کو صرف ایک لڑکی ٹال سکتی ہے "۔ پیر امام بخش اس لڑکی کا نام بتاتا ہے۔ پیر کی آنکھوں میں بجلی کوندتی ہے۔ آنکھیں ایک لمحہ کے لئے چمکتی ہیں۔ گاؤں کے سب لوگ کہتے ہیں۔ اے امام بخش کے پیر! وہ لڑکی ضرور آئے گی اور اس مقبرے پر اپنی ناک رگڑے گی۔ کیا وہ لڑکی اس رات آئی تھی؟ یہ بات اس کہانی میں بتانے کی ضرورت نہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس گاؤں کا نمبردار کیا کرتا تھا۔ کسانوں پر ظلم ہوتا تھا یا نہیں تحصیل کا تھانیدار جب اس گاؤں میں آتا تھا تو گاؤں کے رہنے والوں پر کیا کیا ظلم ہوتے تھے۔ اور جب کبھی اس ریاست کے راجہ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ تو گاؤں کے سب نوجوانوں، بچوں، بوڑھوں کو لکھ پر حملہ بولنا پڑتا تھا اور آخر میں راجہ صاحب شیر کو مارتے تھے اور ان کی تصویر Illustrated weekly میں چھپتی۔ مرے ہوئے شیر پر ان کے پاؤں۔ چہرے پر جلال ہاتھ میں دونالی بندوق اور سامنے شیر اور نیچے لکھا جاتا تھا " مہاراجہ ادھیراج، نقوشانتھ جی مہاراج کا بہادرانہ کارنامہ "۔ لیکن آپ اس نوٹو میں ان انسانوں کی صورتیں دیکھنا چاہتے ہیں جو ہزار کی تعداد میں ڈھول پیٹتے ہوئے ننگے پاؤں، بغیر دونالی بندوق کے شیر کو گھیر کر لائے تھے لیکن ان لوگوں کا اس میں کہیں نام و نشان ہی نہیں۔

کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوٹو ایک اچھی کہانی کی تخلیق کی جا سکتی ہے۔ لیکن جس شخص کے متعلق میں کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ اس کے متعلق [illegible] نہیں، نہ وہ راجہ ہے، نہ مہاراجہ، نہ نواب، نہ سیٹھ وہ محض ایک مزدور ہے۔ جو دن رات محنت کرتا ہے۔ فیکٹری میں یا سلائی کی [illegible] سمت کے بنڈل تیار کر تلے ہے۔ یا اندھیرے کمرے میں فلم کو دھوتا ہے۔ اور پندرہ سال متواتر کام کرنے کے بعد اس کی آنکھوں کی [illegible] بینائی ختم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھار یہی مزدور کسی مشین کے نیچے آجاتا ہے اور کٹ کر مر جاتا ہے۔ اور یہ کہانی اس کے متعلق نہیں جو پیراشوٹ لیکر ہوائی جہاز سے اترتا ہے، اور اترتے ہی اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اور یہ کہانی اس مزدور کے متعلق بھی نہیں جو نمک کی کان میں کام کرتا

شاعر

ہے۔ نہریں کھودتا ہے۔ کھیت میں ہل چلاتا ہے۔ یا اس مصور کے متعلق نہیں۔ جس کی کوئی تصویر نہیں خریدتا، یا اس مصنف کے متعلق نہیں جس کی کتاب کوئی پبلشر چھاپنے کے لئے تیار نہیں۔ یا اس شخص کے متعلق نہیں۔ جو موت کے کنوئیں میں اپنے آپ کو آگ لگا کر کودتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر اپنے بچوں کا پیٹ بھر سکے۔ یا ان سرکس کی لڑکیوں کے متعلق نہیں۔ جو چپاس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتی ہیں۔ یا اس Horse کے متعلق نہیں جو Ring میں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی کا جوا کھیلتا ہے۔ یا اس اکسٹرا لڑکی کے متعلق نہیں، جو لپ اسٹک پوڈر لگا کر قطار میں کھڑی ہو جاتی ہے اور جانتی ہے کہ اس کے پیٹ کا دارومدار صرف اسی بات پر ہے کہ ڈائریکٹر اسے دیکھ کر فوراً چن لے وہ لمحہ جو انتخاب سے پہلے اور انتخاب کے بعد گذرتا ہے۔ وہ کتنا المناک ہوتا ہے۔ زندگی کا سارا المیہ اسی سکنڈ کے گرد طواف کرتا ہے۔ یہ کہانی اس ناچنے والی لڑکی کے متعلق نہیں۔ جو ایک ریستوران میں اس قسم کے کپڑے پہن کر ناچتی ہے۔ کہ آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ لڑکی عریاں ہے۔ لیکن لباس اس کے جسم پر ہے۔ وہ ہنستی ہے۔ مسکراتی ہے۔ آنکھ مارتی ہے۔ اور آپ کو اس کی بے حیائی پر غصہ آتا ہے۔ لیکن آپ کی نگاہیں، اس کے خوبصورت بلاؤز پر ہیں، جو بلاؤز ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور آپ وہ ہر چیز دیکھ سکتے ہیں۔ جس کے لئے آج تک آپ کی نگاہیں ترستی رہی ہیں۔ اور لڑکی ناچتے ناچتے گھڑی کی طرف دیکھ رہی ہے، کب اس کا وقت ختم ہو، اور وہ گھر جائے۔ منیجر سے کچھ روپے قرض لے، اور اپنے باپ کو دے تاکہ وہ شراب پی سکے۔ اور جو روپے بچیں وہ لیکر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہالی وڈ کی کوئی نیم برہنہ فلم دیکھے۔ اور پھر شراب پی کر وہ اپنے.....

اور میں اس دوست کے متعلق کوئی کہانی سنانا نہیں چاہتا۔ جو ہر روز بہانے بنا کر مجھ سے آنے ادھار لیتا ہے۔ تاکہ وہ دو وقت کھانا کھا سکے اور اور جس طرح اپنے دوست پر غصہ آتا ہے کہ وہ کام کیوں نہیں کرتا، وہ مارا مارا کیوں پھرتا ہے۔ اس کا کیوں کوئی گھر نہیں، بستر نہیں ماں نہیں بہن نہیں کوئی بیوی کیوں کہ وہ آوارہ گھومتا ہے وہ اپنے گھر کیوں نہیں چلا جاتا۔ اپنے باپ کے پاس۔ اور پھر وہ شخص جھوٹ کیوں نہیں بولتا ہے۔ اسے اپنی عزت اور خودداری کا پاس نہیں۔ وہ لڑکی میری طرف دیکھتی کیوں نہیں۔ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی۔ میں کار کیوں نہیں خرید سکتا۔ پیدل کیوں گھومتا ہوں۔ وہ میری قیمتی مانگ کر لے گیا تھا۔ لیکن اس نے میری قمیض واپس نہیں کی۔ میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ آگیا۔ لیکن میں اسے کھانے پر بلا نہ سکا۔ کیوں کہ گھر میں راشن کم تھا۔ اس نے مجھ سے ناشتہ کے لئے آٹھ آنے مانگے۔ اور میں نے آٹھ آنے دینے سے انکار کر دیا اور جب وہ چلا گیا تو مجھے شرمندگی کا احساس ہوا، میرے پاس روپے تھے۔ لیکن مجھے کرایہ دینا تھا۔ ایک فلم دیکھنا تھی، بس یونہی نہیں دے سکا۔ میں والد کو روپے بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ بھیج سکا۔ میری بہن بیمار تھی، لیکن کچھ نہ کر سکا۔

یہ کیوں ہوتا ہے۔ اور اگر ایسے ہوتا ہے۔ تو کیسے ہوتا ہے۔ اگر ایسے نہیں ہوتا، تو کیسے ہو سکتا ہے۔

میرے خیال میں اس قسم کے خیالات اور واقعات کسی کہانی میں آنے نہیں چاہئیں۔ اسی لئے میں نے ان میں سے کسی خیال کے اردگرد کہانی کا تانا بانا نہیں بنا۔ مجھے خود ان واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ میرے ذہن پر ان واقعات اور احساسات کا کوئی اثر پڑتا ہے۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کو جوہو کی بیکراؤں غروب آفتاب کا وقت ہو۔ یا لنچ کا۔ یا پھر شام کا۔ یعنی کوئی وقت۔ یعنی وقت ہو، جب آپ جا سکیں۔ میرا کیا ہے۔ میں تو بے کار ہوں۔ میں تو ہر وقت جا سکتا ہوں، مجھے صرف آپ کا خیال ہے۔ یہاں ہوٹل ہیں۔ ہوٹلوں میں آپ ٹھہر سکتے ہیں۔ جیب میں دام چاہئیں۔ یہاں بڑی خوبصورت عورتیں آتی ہیں۔ بڑے بڑے سیٹھ آتے ہیں۔ خوبصورت مرد بھی آتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بیٹھ کر سمندر کے کنارے پر کھمن توس، آم، سنگترے، سیب انار، شراب۔ ڈرائنگ روم۔ بوائے۔ بنگ بلیں یہاں لوگ لٹاتے ہیں۔ نہا کر کھانا کھاتے ہیں۔ گپیں ہانکتے ہیں..... عجیب زندگی ہے۔ فکر کم ہے، عیش زیادہ ہے۔ یہاں کوئی ترس نہیں کھاتا۔

ناریل کے درختوں کے نیچے شراب کی بوتلیں کھلتی ہیں۔ شاید اب نہ کھلتی ہوں کیوں کہ Prohibition کا زمانہ ہے۔ ناریل کے درختوں کے نیچے نہیں کھلتیں، تو بند کمروں میں کھلتی ہیں۔ باہر سمندر کا نیلا پانی، اندر کسی کی نیم باز آنکھیں۔ لمبی لمبی گہری نیلی آنکھیں ٹھنڈی ہوا۔ نرم آنکھیں۔ بھرے ہونٹ۔ آپ اس کو دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کو دیکھتی ہے۔ وہ مسکراتی ہے۔ آپ مسکراتے ہیں۔ نگاہیں ملتی ہیں۔ اور ناریل کے درخت اپنے گہرے سائے دونوں پر ڈالتے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے آپ بھول جاتے ہیں۔ کہ اس شہر میں کہیں اندھیرا نہیں۔ کوئی اندھا لنگڑا نہیں۔ کوئی غریب، بیکار انسان نہیں

شاعر

کوئی طوائف نہیں، کوئی مزدور نہیں۔ کوئی کسان نہیں۔ کوئی ادیب نہیں۔ افسانہ نگار۔ شاعر۔ اپاہج۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں۔

اگر آپ واقعی مجھ سے تنگ آگئے ہیں اور جو کہانی میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ وہ سننا نہیں چاہتے تو جانے سے پہلے، میرے گھر کی سیڑھیاں تو دیکھتے جائیے۔ یہ سیڑھیاں سنگ مرمر کی نہیں ہیں۔ یہ ایسی سیڑھیاں نہیں ہیں جن پر ٹاٹ بچھائے گئے ہوں۔ نہایت میلی، گندی، بدبودار سیڑھیاں ہیں۔ یعنی ان سیڑھیوں کو دیکھ کر آپ اس بلڈنگ کی عزت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان سیڑھیوں پر برسوں کے عزت کے نشان دکھائی پڑتے ہیں۔ پہلی سیڑھی چڑھیں گے تو وہاں آپ کو ایک کچرہ نظر آئے گا۔ نہایت دبلا۔ پتلا۔ ننگا۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا۔ ناک بہتی ہوئی۔ اور وہ سیڑھی چڑھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ اگر سیڑھیاں چڑھتے وقت دائیں طرف آپ کی نگاہ چلی گئی۔ تو چھوٹے سے دالان میں جہاں اندھیرا زیادہ ہے اور روشنی کم۔ آپ کو چند چارپائیوں پر کچھ بھیانا دھندلے نظر آئیں گے۔ وہ رات بھر کام کرتے رہے ہیں اس لئے اس وقت سوئے ہوئے ہیں۔ قریب ایک بالٹی ہے جس میں تمام گھروں کا گندا رکھا ہوا ہے۔ اب آپ نے ناک پر رومال رکھ لیا ہوگا۔ پہلی بار میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ جب میں پہلا پہلا اس بلڈنگ میں آیا تھا۔ تو بلڈنگ کی بدبو سے میرا دماغ متعفن ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا۔ کہ اس بلڈنگ کے لوگ، اس سرانڈ، اس بدبو، اس غربت، اس مفلسی کی چار دیواری میں کیونکر رہتے ہیں۔

لیکن اب میں یہ سوال نہیں کرتا۔ چار سال سے یہاں رہتا ہوں، اور یہ بدبو یہ سڑاند، یہ بچے، یہ مفلسی، یہ بیماری۔ یہ ننگا ہیں میری زندگی کا ایک جزو بن گئیں ہیں۔

کئی بار میرے جی میں آیا کہ میں ان سیڑھیوں کو صابن سے دھو ڈالوں۔ ان ساری سیڑھیوں پر فنائل چھڑک دوں۔ ان پر ایک ٹاٹ بچھا دوں تاکہ ان پر ہر کوئی ننگے پاؤں نہ رکھ سکے۔ کوئی میلے، گندے، مٹی سے بھرے ہوئے قدم نہ رکھ سکے۔ لیکن جب میں ان سیڑھیوں کے آر پار دیکھتا ہوں تو ایک عجیب نظارہ سے ذہن کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سامنے ایک کمرہ میں پنجاوہ سوچی رہتے ہیں۔ ادھر والے کمرہ میں سترہ بھیا رہتے ہیں۔ باجو والی کھولی میں ایک بڑھیا بیمار ہے، تپ دق ہے۔ سبھی لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ بڑھیا کھانستی رہتی ہے۔ سامنے والے کمرے میں ایک چڑچڑے دماغ کی عورت رہتی ہے، وہ صبح سویرے اٹھ کر چلاتی ہے، اور اپنی زبان میں سب کو گالیاں دیتی ہے۔ اور پھر کام پر چلی جاتی ہے۔ اوپر والے کمرے میں ایک پارسی رہتا ہے اس کا باپ اس دن کہنے آیا تھا۔ کہ تم اپنی ماں کو اپنے پاس بلا لو۔ پارسی نرس نے کہا۔ میں اپنی ماں کو یہاں نہیں بلا سکتا۔ تم نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا تھا اب میں کام پر جاتا ہوں۔ دو وقت کا کھانا کھا سکتا ہوں۔ میرے پاس تمہاری بیوی کے لئے روپے نہیں۔ سامنے کی سڑک پر اس بلڈنگ کے بچے آوارہ گھومتے ہیں۔ گبرٹ لاری یا کار کے نیچے بھی نہیں آتے۔ ذرا تعداد تو کم ہو جائے۔ مائیں بچے جنتی ہیں اور خدا کا شکر بجا لاتی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز ہے ہمارا کوئی قصور نہیں۔ اور اس بلڈنگ کی سیڑھیاں دیکھتی ہیں۔ اور خاموش رہتی ہیں۔ اس کے پیچھے پہ پہیشہ گندے بچوں نے اپنے قدم رکھے۔ میلی۔ سوکھی ہوئی۔ گندی عورتوں نے اترتے چڑھتے ہوئے، ان سیڑھیوں پر تھوکا۔ مردوں نے ان سیڑھیوں پر اپنی بیویوں کو دھکا دیا۔ تاکہ وہ مر جائیں۔ اور گھر کا گلا دبا اچھی طرح چل سکے۔ کبھی ان سیڑھیوں پر آسودہ دلوں نے جھانک کر نہ دیکھا۔ خوبصورت بچوں نے اپنے نرم پاؤں سے انھیں پیار نہ کیا۔ نہ ہی نئی نویلی دلہنوں نے اپنی ساڑھیوں سے انھیں چھوا۔ رات کے اندھیرے میں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کسی نے ایک دوسرے کا بوسہ نہ لیا۔ وہ بوسہ جس میں نشاط اور محبت کی گرمی ہوتی ہے۔ سیڑھیاں چڑھتے پڑھتے کبھی کسی کے ہاتھ ایک دوسرے سے مس نہ ہوئے۔ میں نے سوچا یہاں صابن کے استعمال سے کچھ نہ ہوگا۔ محض سیڑھیاں دھونے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہاں تو کچھ اور ہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہاں عزت اور خلافت کی جزئیات نگاری نہیں کرنا چاہتا کہ تصویر کشی سے ایک خوبصورت کہانی بن سکتی۔ اور نہ ہی کہانی کو ایسے ماحول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ ناک بھوں چڑھائیں۔

لیکن میں جس کہانی کو سنانا چاہتا تھا۔ اس میں واقعی سیڑھیوں کا ذکر نہ ہوگا۔ کیونکہ مجھے ان سیڑھیوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اور نہ میں ان چیزوں کو اپنی کہانی میں فٹ کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تو یونہی ذکر آ گیا۔ کیونکہ ان سیڑھیوں سے باہر بھی زندگی ہے۔ بڑی خوبصورت اور حسین۔ جنوب کی طرف جائیے۔ وہاں آپ کو اپنی معاشرت کا اعلیٰ نمونہ ملے گا۔ پرانی تہذیب، پرانا کلچر، پرانا آرٹ ان تہ خانوں کے سینوں میں جاگزیں ہے۔ اونچے

نیچے کلس۔ دیوتاؤں کی تصویریں۔ پرانے آرٹ۔ وہ زندگی جو تھی اور مٹ گئی اور جسے آپ دیکھ سکیں گے۔ اگر آپ جنوب کی طرف نہ جانا چاہتے ہوں تو مال کی طرف رخ کیجئے گا۔ دہلی جائیے۔ لال قلعہ دیکھئے گا۔ قطب مینار، جنتر منتر، دہلی کے پناہ گزیں وہ آپ کو دکھ درد کی ایک کہانی سنائیں گے۔

لیکن آپ آگے جا سکتے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ چلئے ذرا آگے ——— آہستہ آہستہ قدم اٹھائیے گا۔ شور وغل زیادہ نہ ہو۔ کہیں ان کی نیند میں خلل نہ آنے پائے۔ یہ دیکھئے ہال کے بیچوں بیچ وہ سپیکر صاحب تشریف فرما ہیں، ادھر پرائم منسٹر اور پھر ہال میں آپ کے نمائندے۔ شفاف براق کپڑوں میں ملبوس۔ وہی سفید کھدر۔ جو اب ریشم سے زیادہ نرم ہو گیا ہے۔ کہیں سے پگڑ دکھلتا ہی جاتا ہے۔ سروں پہ کھدر کی ٹوپیاں۔ بالکل ایک تاج کی طرح۔ جو بادشاہ اپنے وقتوں میں پہنا کرتے تھے۔ ان کے چہروں سے شادابی ٹپکتی ہے چہروں پہ رعب، عسکریت۔ نگاہوں میں غرور۔ تھکن نام کو نہیں۔

آپ جانتے ہیں انھیں۔ یہ آپ کے نیتا ہیں۔ میرے نیتا ہیں۔ ہم سب کے نیتا ہیں۔ تعارف کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج لفظ Socialism پہ مباحثہ ہو رہا ہے۔ آپ بھی تشریف رکھئے۔ بحث میں حصہ لیجئے گا۔ بہت سے سکنڈیل ہیں۔ سیمنٹ سکنڈیل۔ کلاتھ سکنڈیل۔ آئرن سکنڈیل۔ پیپر سکنڈیل۔ ڈالر سکنڈیل۔ روٹی سکنڈیل۔ میرج سکنڈیل۔ لو سکنڈیل۔ پالیٹیکل سکنڈیل۔ منسٹری سکنڈیل۔ مدھ بھارت سکنڈیل۔ اتر بھارت سکنڈیل۔ راشٹریہ بھاشہ سکنڈیل۔ اردو سکنڈیل۔ ہندی سکنڈیل۔ لیکن گنوانے سے کوئی فائدہ نہیں اور کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے ہندوستان میں ان سکنڈیل کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

کیا خیال آپ کا۔ کیا آپ میرے خیال سے بہت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو ایک رنگین کہانی سنانے آیا تھا۔ میں آپ کو ضرور کہانی سناؤں گا۔ جائیے گا نہیں۔ کوئی دھوکا نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ میں آپ کو لفظ Scandal کا مطلب سمجھانے نہیں آیا۔ لیکن کیا کروں کہ یہاں لنڈیں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ لیکن خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ زندگی اتنی گڈمڈ ہو گئی ہے کہ آپ کو میری کہانی سمجھنے اور سننے میں محنت کرنا ہوگی۔ جبھی جا کر آپ اس سکنڈیل کو حل کر سکیں گے۔ لیکن اس سے آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ جو کہانی میں سنانا چاہتا تھا۔ میں اس کے انجام تک آ گیا ہوں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ میں نے آپ کو دھوکا تو نہیں دیا؟

○

چاندی کے تار، نئی بیماری، مائی ڈارلنگ ہوٹل، پاکستان سے ہندوستان تک، جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ افسانوں کے ان چھ مجموعوں کا مصنف ہے

اور اب مہندر ناتھ اپنا اولین ناول

اوسی اور سیتا

پیش کرتا ہے

قیمت۔ تین روپے

مکتبہ شاہراہ دہلی

مہندر اپنے فن کے ارتقائی دور میں ہے۔ اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہمہ گیر وسعتوں کا حامل ہو گیا ہے۔ مہندر رومان پرست نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت نگار ہے اس وجہ سے اس کے بیان میں تلخی، شدت، اور احساس ناآسودگی ہے۔ وہ انسانیت کے باب میں رومان و محبت کی ہلکی ہلکی شعاعوں سے گذر کر طبقات کے اقتصادی کس بل کو دیکھتا ہے یہ نیا رجحان بہت کم افسانہ نگاروں میں پایا جاتا ہے

(ممتاز حسین)

للّی

ہنس راج رہبر

"دیکھ بہن! للّی کا گھر والا آگیا" شیلا نے اپنی پڑوسن گوراں سے کہا اور گوراں۔ شیلا کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھتی ہوئی بڑے اشتیاق سے بولی:۔

"اچھا! کہاں ہے؟"

"وہ، ورے چارپائی پر جو سفید ٹوپی پہنے بیٹھا ہے۔ برادری کے چار پانچ آدمی چھوڑنے آئے ہیں"

"بہت دنوں بعد لوٹا ہے"

"للّی کی ماں بڑی خوش ہے۔ مہمانوں کے آگے پیچھے گھوم رہی ہے۔ پر جب اس کے بہنوئی نے للّی سے پوچھا۔ کہو، رکھو گی نا اسے اپنے پاس۔ تو للّی نے جھٹ جواب دیا۔ میں کیا کہوں۔ اس کی مرضی ہے۔ رہنا ہے تو رہے، جانا ہے تو جائے"

شیلا نے للّی کا جواب کچھ اس انداز سے دہرایا کہ گوراں بے ساختہ ہنس پڑی اور ساتھ ہی ہاتھ مل کر اس نے للّی کی بے باکی پر تعجب کا اظہار بھی کیا۔

پھر یہ خبر آناً فاناً ساری بلڈنگ میں پھیل گئی۔ گوراں نے لکشمی کو اور لکشمی نے سوما کو سنائی اور اس طرح ایک کان سے دوسرے کان پڑتی اور پھیلتی چلی گئی۔ بات معمولی سی تھی لیکن اسے سننے اور سنانے میں ہر ایک عورت خاص سرگرمی کا اظہار کر رہی تھی اور اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ ویسے یہاں ہر خبر یونہی پھیلتی تھی اور ہر ایک عورت اس پر رائے زنی کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی۔ بعض اوقات ان خبروں کی بدولت انھیں آنگن میں جمع ہو کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصہ موضوع مل جاتا تھا۔ لیکن للّی کے گھر والے۔ نتھو کا یکایک لوٹ آنا محض ایک خبر نہیں تھی بلکہ ایک ایسا اہم واقعہ تھا جو ایک عرصہ سے ان کی اپنی زندگی کا جزو بنا ہوا تھا اور جس کی بدولت آج للّی ساری گلی کی ہیروئن بنی ہوئی تھی۔ تبھی تو یہ عورتیں اس میں اتنی دلچسپی لے رہی تھیں۔ ایک دوسری کو سنا رہی تھیں اور ایک ہی بات کو بار بار دہرا رہی تھیں۔ ہر ایک عورت کا لب و لہجہ اپنا تھا اور اسے دہرانے کا ڈھنگ بھی اپنا تھا۔ لیکن جب وہ للّی کے یہ الفاظ دہراتی تھیں "رہنا ہے تو رہے جانا ہے تو جائے" تو ہر ایک عورت کا سُر لگ بھگ ایک ہی ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ الفاظ ادا کرتے وقت انھیں للّی کی شخصیت کو اُجاگر کرنا ہوتا تھا۔

للّی جمعدارنی ہے۔ نیچے گلی میں رہتی ہے۔ تین بچوں کی ماں ہے، جوان اور تندرست ہے اور رنگ روپ میں بھی عام عورتوں سے کافی اچھی ہے۔ اس کے سب سے بڑے بچے کی عمر گیارہ سال ہے، وہ لڑکا ہے اور اس کا نام چمن ہے، للّی چمن کو باقی دو چھوٹے بچوں کی طرح پیار کرتی ہے۔ لیکن کبھی جب کوئی گستاخی کر بیٹھتا ہے یعنی اس کا کہا ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو وہ اسے سپیٹ بھی دیتی ہے سارا سارا دن وہ گائے کے اپچھڑے کی طرح کھیلنا کودتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی کسی کو فکر نہیں۔ فکر کیا ہوگی اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ آزادی کے بعد بھی ہندوستان میں تعلیم بیکار رسی شے ہے۔ چمن اپنے باپ کی طرح میونسپلٹی یا ریلوے کے جمعداروں میں بھرتی ہو جائیگا۔ ایک جمعدارنی مل جائے گی اور وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالے گا۔ یہی صدیوں پرانی روایت ہے جو اس کے باپ نتھو کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے اور چمن کو نتھو سے وراثت میں ملے گی۔ گاندھی جی کے اچھوت اُدھار نے اس وراثت کو کسی قدر شدہ ضرور کر دیا ہے۔ مگر بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں آیا۔

چمن کا باپ ۔ للّی کا گھر والا جس کا نام نتھو ہے ۔ ریلوے بھنگیوں میں ملازم تھا ۔ کُل ملا کر ساٹھ ستر روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی تھی ۔ اس جنگالی کے زمانہ میں ایک کنبہ دار آدمی کے لئے یہ آمدنی بہت ہی تھوڑی ہے ۔ لیکن وہ اس سے مطمئن تھے ۔ روکھی سوکھی کھا کر گذر بسر کرتے تھے اور آرام سے رہتے تھے ۔ یہاں بیوی کو ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی اس لئے اُن میں کبھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوتا تھا ۔ نتھو میں اور خواہ کوئی عیب ہو وہ لڑاکا اور جھگڑالو نہیں تھا ۔ شرافت سے رہتا تھا ۔ للّی ایسا متناسب جسم، گورا چٹا رنگ اور خد و خال کی تراش اس طبقہ کی عورتوں میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے اسلئے اس کی طرف نگاہیں ہی نہیں بعض اوقات انگلیاں بھی اُٹھ جاتی تھیں ۔ وہ صاف ستھرا پہنتی اور سلیقے سے رہتی تھی یعنی اسے بھی اپنی خوبصورتی اور امتیازی حیثیت کا احساس تھا ۔ لیکن وہ طبیعت کی اوچھی نہیں تھی ۔ اس احساس نے اُسے چنچل بنانے کے بجائے کچھ زیادہ ہوشیار بنا دیا تھا ۔ اور اس نے اپنی اس انفرادیت کو خاوند اور بچوں میں گھلا ملا دیا تھا ۔ جس سے اس کا گھر سچ مچ کا گھر بنا ہوا تھا جس میں فاختہ کے گھونسلے کا سا امن اور سکون تھا ۔

زندگی جب امن اور اطمینان سے گذر رہی ہو تو اس میں چھوٹے چھوٹے حادثے بھی موت کی طرح بھیانک نظر آتے ہیں ۔ للّی کے گھر میں یکایک ایک بہت بڑا حادثہ رونما ہوا اور اس حادثہ کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی اس لئے صرف للّی ہی نہیں محلے والے بھی حیران اور ششدر رہ گئے جس طرح اب نتھو کے لوٹ آنے کا چرچا ہو رہا تھا اسی طرح سال ڈیڑھ سال پہلے یہ سنسنی خیز خبر پھیلی تھی کہ للّی کا گھر والا اسے چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے ۔

للّی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا ۔ وہ چپ رہی ۔ گیا سو گیا ۔ اب اس کے کہنے سننے سے کچھ بننے سنورنے کا تو تھا نہیں ۔ اُلٹا اور بگڑنے کا احتمال تھا ۔ وہ چرچا کرے گی تو دوسروں کو بھی زبان کھولنے کا موقع ملے گا ۔ اگر دس بیس نتھو کو بُرا کہیں گے تو پانچ دس خود اسے بھی بُری کہنے والے نکل آئیں گے لیکن للّی کے چُپ رہنے سے کیا ہوتا تھا ۔ بات تو چھڑ چُکی تھی اور وہ چھڑی ۔ سب لوگ ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے ۔ کچھ لوگوں کا تو کام ہی دیواریں جھانکنا ہوتا ہے وہ کھوجتے رہتے ہیں کہ کون سی اینٹ کہاں سے اُکھڑی ہوئی ہے ۔ ذرا ذرا سے واقعات کو خوب سونگھتے جانچتے ہیں اور بال کی کھال اُتارتے ہیں ۔ سب جانتے تھے کہ نتھو کو للّی سے کوئی شکایت نہیں تھی ۔ اس کے باوجود وہ چلا گیا اس لئے یہ واقعہ اہم تھا اور اسی لئے یہ جاننا ضروری تھا کہ اس کا سبب کیا تھا ؟ اس سلسلہ میں دو طرح کی باتیں مشہور ہوئیں ۔ ایک رائے یہ تھی کہ وہ جوئے میں تنخواہ کا سارا روپیہ ہار گیا اور پھر للّی کے ڈر سے لوٹ کر گھر نہیں آیا ۔ اور دوسری رائے یہ تھی کہ بھنگی بستی میں جہاں ان کی برادری کے لوگ اور کچھ رشتہ دار رہتے تھے وہ اکثر آیا جایا کرتا تھا ۔ وہاں اسے کسی دوسری عورت سے عشق ہو گیا ۔ وہ عورت شاید اس کی بہن کی نند تھی یا اس کی بہن کے دیور کی بیوی تھی ۔ رشتہ خواہ کچھ ہو وہ عورت تھی اور جوان تھی ۔ نتھو کو اس سے عشق ہو گیا ۔ ظاہر ہے کہ عشق کسی سماجی یا سیاسی آئین کو قبول نہیں کرتا ! وہ اس عورت کو لے کر بھاگ گیا ۔

نتھو چونکہ شریف تھا اس لئے لوگوں کو یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ اُس نے جوا کھیلا ہو اور پھر عشق کی بات تو ایک دم ناقابلِ اعتبار معلوم ہوتی تھی ۔ کیونکہ جو آدمی اتنا شریف ہو کہ اس پر جوا کھیلنے کا الزام بھی عائد نہ ہو سکے تو وہ عشق کیا کرے گا ؟ پھر وہ عورت للّی سے زیادہ حسین کیا ہو گی ! اس لئے اگرچہ نتھو کے بارے میں یہ دونوں ہی باتیں کہی اور سُنی جاتی تھیں لیکن ان میں سے ایک بھی درست ثابت نہیں ہوئی تھی ۔ ویسے ہونے کو تو یہ دونوں باتیں ہی بیک وقت درست ہو سکتی ہیں ۔ انسان خواہ کتنا ہی شریف ہو اس کے دل میں حُسن اور آسودگی کی تمنا ہمیشہ رہتی ہے ۔ ناآسودہ حسرتیں روح کو مضطرب اور بے چین کئے رکھتی ہیں ۔

نتھو نے غریبی اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی ۔ عمر کڑی محنت کرتے گذری تھی ۔ تنگی اور ترشی میں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا ۔ زندگی اس ڈھنگ سے بسر ہوتی تھی کہ ہزاروں ارمان دل میں رہ جاتے تھے ۔ تمام تلخیوں اور محرومیوں کے باوجود اسے اگر کوئی تسکین تھی تو صرف یہ کہ للّی اس کی بیوی تھی ۔ اس لئے وہ جواری اور اوباش نہیں بنا تھا ۔ کولہو کے بیل کی طرح چپ چاپ ایک ہی دھرے پر چل رہا تھا اور اس سماج میں ایک دھرے پر چلتے رہنا شرافت کی بہترین سند ہے ۔ چنانچہ نتھو بھی شریف تھا ۔ لیکن شریف ہو کر بھی انسان انسان ہی رہتا ہے بیل نہیں بن جاتا ۔ نتھو بھی انسان تھا اور بے شک للّی اسکی بیوی تھی ۔ لیکن ہمارے اس سماج میں بیوی حسین ہو سکتی ہے مگر خاوند کی معشوقہ اور دلبر نہیں ہوتی ۔ میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا بن گیا ہے کہ دونوں

ایک سماجی بندھن میں بندھے ہوئے زندگی کی گاڑی کھینچتے ہیں اور رسم و رواج کا غیر مرئی ہاتھ انھیں صدیوں سے پٹی پٹائی راہ پر ہانکتا رہتا ہے۔ اس راہ پر چلتے چلتے زندگی اس قدر خشک اور بے کیف ہوگئی ہے کہ اکثر یہ جوا پھینک کر بے راہ روی اختیار کرنے اور کسی بھی سمت میں بھاگ کھڑے ہونے کو جی چاہتا ہے اور اسی جذبہ کے تحت اس بظاہر پُرامن زندگی میں حادثے بھونچال کی طرح آتے ہیں۔ نتھو بھی اپنی اس زندگی سے مطمئن نہیں تھا۔ صدیوں پرانی روایت نے اسے اکتا دیا تھا۔ للی کی بدولت اسے جو تسکین ملتی تھی اس سے اس کی نیت نہیں بھرتی تھی۔ للی تو گھر میں بیٹھی رہتی تھی محنت مزدوری وہ کرتا تھا۔ جھڑکیاں اور گھرکیاں سہتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جو سکھ اور سکون ملتا تھا وہ بالکل ہیچ اور معمولی تھا۔ اسے جس مقدار میں خون سُکھانا پڑتا تھا اس کے عوض مسرت بہت کم نصیب ہوتی تھی۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے اس بے کیف زندگی سے عاجز آکر جوا کھیلا ہو اور عشق بھی کیا ہو۔ جوا میں ہار کر اس نے عشق کو معراج تک پہنچانے کی سوچی ہو اور وہ اس عورت کو لے بھاگا ہو۔

للی جوئے اور عشق کی اس منطق سے ناواقف تھی۔ اس نے اپنا حسن، جوانی اور روح تک خاوند کے لئے وقف کر دی تھی وہ اس سے بھی اسی ایثار کی توقع رکھتی تھی۔ لیکن نتھو نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ہرجائی ثابت ہوا تھا۔ جس مرد نے اس کی ذرا بھی پروا نہیں کی وہ کیوں اس کی پروا کرے گی۔ اس نے گھر والے کے خلاف ذرا بھی شکایت نہیں کی۔ وہ جس ڈھنگ اور اطمینان سے پہلے رہتی تھی اسی ڈھنگ اور اطمینان سے رہتی رہی۔ زندگی کو اپنے ہی بل بوتے پر چلانے کے لئے اس نے محلہ میں صفائی کا کام شروع کر دیا۔ یہ محلہ اس نے ایک کام چور جمعدارنی سے خریدا تھا یعنی اسے سو سوا سو روپے قسطوں میں دینا منظور کر کے اس کا کام خود سنبھال لیا۔ اور وہ کام اس محنت اور لگن سے کرتی تھی کہ لوگ اس سے بے حد خوش تھے اور حیران تھے کہ للی خاوند کی موجودگی میں کبھی بھی دوہرا نہیں کرتی تھی وہ اب روزی بھی کما رہی تھی۔ بچے بھی پالتی تھی اور اسی طرح بن سنور کر رہتی تھی۔ جیسے نتھو کے وہاں رہنے یا چلے جانے میں اسکے نزدیک کوئی فرق ہی نہ تھا۔

فرق تھا تو شیلا، گوراں، سوما اور اس بلڈنگ کی دوسری عورتوں کے لئے۔ جن کے گھر والے کلرکی یا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے تھے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھیں کہ مرد کے بغیر اکیلی عورت گھر کا خرچ چلا سکتی ہے۔ اس لئے وہ نتھو کے یکایک غائب ہونے کی خبر سُن کر بہت پریشان ہوئی تھیں اور اپنے آپ اس چنتا میں گھلتی رہی تھیں کہ للی بے چاری کیا کرے گی؟ اپنا اور بچوں کا پیٹ کیسے پالے گی؟ ایسا سوچ کر جہاں انھیں للی سے ہمدردی پیدا ہوتی تھی وہاں نتھو پر غصہ بھی آتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ بستا گھر نگاڑ دیا۔ لیکن بیچ میں کسی نے دلیل پیش کی۔ گھر کہیں نہیں بگڑتا۔ ان کا کیا ہے؟ دھرم کرم تو کچھ ہوتا نہیں بس کسی طرح پیٹ بھرنا ہے۔ للی کوئی دوسرا گھر کرے گی اور چین سے رہے گی جس جمعدار کے بھی جائے گی وہی اپنے بھاگ کو سراہے گا۔ اور اس کے پاؤں دھو کر پیئے گا۔

لیکن جب للی نے دھرم کی لاج بھی رکھ لی اور بستا گھر بھی بگڑنے نہیں دیا تو ان عورتوں کے دل میں اس کی وقعت اور بڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہمدردی سے پیش آتی تھیں اور حتی الوسع اس کی امداد کرتی تھیں۔ بلیک مارکیٹ زوروں پر تھی۔ کپڑے کے دام روز بروز بڑھ رہے تھے پھر بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا وہ خود تنگی ترشی میں دن گذارتی تھیں اور پھٹا پرانا سی جوڑ کر پہنتی تھیں لیکن جب کبھی للی کو ضرورت آپڑتی وہ اس کے لئے دھوتی، کرتہ، دوپٹہ یا اور کوئی کپڑا جھٹ نکال کر دیتی تھیں۔ صبح شام اگر کبھی کھانا فالتو پک رہتا تو فوراً آواز دیتیں "للی! جمن کو بھیج دے روٹی لے جائے" اور ہفتہ کے روز سے جو ایک روٹی پر ایک گھر سے ملتی تھی اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔

تین چار مہینے اسی طرح گذر گئے۔ للی اپنا کام تندہی سے کرتی تھی اور جھاڑو دیتے وقت یوں سکرایا کرتی تھی جیسے اسے محنت مشقت سے روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہو۔ اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ رنگ پٹے کی جگہ کچھ سُرخ دکھائی دینے لگا ایک دن بھنگی بستی سے گیارہ بارہ سال کا کوئی لڑکا گلی میں آیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر دریافت کرنے لگا کہ یہاں ایک عورت للی اور اس کے بچے رہتے تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں للی ہوں اور یہ میرے بچے ہیں" فوراً للی نے جواب دیا۔

لڑکا گھبرایا اور فوراً اُلٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا۔ لاکھ بُلانے پر بھی اس نے گھوم کر نہیں دیکھا۔ للی کے نکڑ پر چلا کر دم لیا۔

مگر لڑکے کی آمد کسی سے چھپی نہیں رہی۔ یہ خبر بھی اور خبروں کی طرح پھیل گئی۔ شیلا، گوراں اور سوما نے اس پر کافی دیر تک دماغ لڑایا اور آخر

اس نتیجہ پر پہنچیں کہ بھنگی کے اس لڑکے کو تلی کے گھر والے نے بھیجا تھا۔ وہ تلی اور بال بچوں کی خیر خیریت جاننا چاہتا تھا۔ آدمی گھر سے چلا جائے لیکن اس کے گھر کا مرہ تو نہیں جاتا۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد بات کھلی معلوم ہوا کہ جس عورت کے ساتھ نتھو بھاگ کر گیا تھا وہ چھ سات روز بعد ہی اپنے گھر لوٹ آئی تھی اور کہہ دیا تھا کہ میں تو اپنی موسی سے ملنے گئی تھی۔ اس برادری میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے جھوٹی ہونے پر بھی اس کی بات پر یقین کر لیا گیا۔ نتھو بھی کچھ عرصہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد بہن کے گھر لوٹ آیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کے لئے بہن کے گھر میں ہی نہیں رشتے داروں کے دل میں بھی کافی جگہ تھی اور اپنوں کے لئے یہ جگہ کبھی کم نہیں ہوتی۔ وہ گھر لوٹنا چاہتا تھا مگر شرم کے مارے آ نہیں سکتا تھا اور تلی سے ڈرتا تھا۔ وہ لڑکا سچ مچ اسی نے بھیجا تھا۔ اب کسی شخص کی زبانی یہ پیغام بھیجا تھا کہ تلی اگر اسے آ کرلے جائے تو وہ گھر لوٹنے کو تیار ہے۔ لیکن تلی نے صلح کے اس پیغام کا نہایت تمسخر مزاجی سے جواب دیا "میری جوتی اسے لینے جاتی ہے"

شیلا نے یہ بات سُنی اور پڑوسیوں کو سُنائی اور اپنے خاوند دنود کو سُنائی۔ شیلا شروع ہی سے تلی میں خاص دلچسپی لے رہی تھی۔ تلی کو اپنا کام آپ کرتے اور خود مختار زندگی بسر کرتے دیکھ کر اسے دلی راحت اور تسکین حاصل ہوتی تھی۔ گوراں۔ شیلا۔ سوما اور دوسری عورتیں بھی اس کے باعث تلی میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی تھیں۔

شیلا کا خاوند دنود ایک روزانہ اخبار کے دفتر میں اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ مطالعہ کے باعث زمانہ کے جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقف تھا۔ وہ موجودہ سماجی ڈھانچے سے بیزار تھا۔ اور اس کی روح ایک نئی زندگی کے لئے تڑپا کرتی تھی۔ اس نے اپنی تڑپ کا ایک حصہ شیلا کی روح میں بھی منتقل کر رکھا تھا۔ وہ اسے ہر روز اخبار کی خبریں سُنایا کرتا تھا اور دیس بدیس کے حالات بتا کر کہا کرتا تھا کہ جہاں انسان نے لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کر لی ہے وہاں عورت کو بھی مردوں کے برابر دفتروں اور کارخانوں اور دوسری جگہوں میں کام کرنے کا حق حاصل ہے وہاں عورت اپنی روزی کے لئے مرد کی محتاج نہیں ہے۔ اور جب کسی قسم کی محتاجی نہ ہو تبھی مرد اور عورت میں سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔ تبھی زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ہم تو محبت کا سوانگ بھرتے ہیں۔ زبان سے خواہ کچھ بھی کہیں عورت کو اپنی لونڈی سمجھتے ہیں۔ ہمارے دیس میں بھی جب تک عورت اپنی روزی آپ نہیں کمائیگی وہ مرد کی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

شیلا اَن پڑھ تھی اور اُس نے ایک چھوٹے سے قدامت پسند شہر میں پرورش پائی تھی۔ جب تک وہ باپ کے گھر تھی پڑھی لکھی عورتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اسے ان کے چلن اور طور اطوار پر شک گزرتا تھا۔ مگر اب اس کا خیال کچھ بدل گیا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ جو عورتیں پڑھ لکھ کر استانیاں بن جاتی ہیں۔ تار گھر یا ڈاک خانے وغیرہ کسی بھی دفتر میں کام کرتی ہیں وہ گھر میں بند ان پڑھ عورتوں کے مقابلہ میں کہیں خوش نصیب ہیں۔ انھیں پیٹ بھرنے کے لئے مردوں کا مُنہ تو نہیں تاکنا پڑتا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں ایک تمنا کسمسا اُٹھی تھی اور وہ دنود سے کئی بار کہہ چکی تھی "میں کیا کروں۔ مجھے تو کسی نے پڑھایا ہی نہیں۔ مجھے ایک مشین ہی لا دو اور نہیں تو سینا پرونا ہی سیکھ لوں" دنود کہنے کو کہہ دیتا تھا "ہاں تمہارے لئے مشین ضرور خریدوں گا" لیکن اسے جو تنخواہ ملتی تھی اس سے گھر کا خرچ ہی مشکل سے چلتا تھا۔ مشین خریدنے کے لئے اتنے پیسے کہاں سے بچتے؟ شیلا یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس بات سے نہایت دُکھی رہتی تھی اور دکھ کا اظہار وہ کئی بار طعنے کی صورت میں بھی کرتی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ تم مشین کیوں نہیں خریدتے۔ تم بھی مجھے اوروں کی طرح اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہو"

دنود کی روشن خیالی اور شرافت کے باوجود شیلا کو عملی زندگی میں اپنی غلامی کا سو طرح احساس ہوتا تھا اور ایک دو مرتبہ تو وہ چڑھ کر کہہ بھی چکی تھی "میں یہ جانتی ہوں کہ تم یہ دھونس اس لئے جماتے ہو کہ مجھے روٹی کما کر دیتے ہو۔ لیکن میں تمہارے بنا کوئی بھوکی نہیں مر جاؤں گی۔ تلی بھی تو اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے"

دیئے سے دیا جلنے کی طرح شیلا کی روح میں جو شعلہ روشن تھا اس نے وہی شعلہ گوراں اور سوما کی روح میں بھی روشن کر دیا تھا۔ کیا ہوا اُن کے گھر والے روزی کمانے باہر جاتے تھے۔ وہ بھی تو گھر کے سینکڑوں کام کرتی تھیں۔ کھانا بناتی۔ کپڑے دھوتی اور بچے پالتی تھیں۔ گھر گرہستی

کے چھوٹے بڑے کام جو انھیں دن رات کرنے پڑتے ہیں اگر اُجرت پر کرانے پڑیں تو شاید خاوند کی آمدنی سے دوگنا روپیہ بھی اس کے لئے کافی نہ ہو۔ اور اس تنخواہ میں کبھی گذارہ نہ چلے۔ مثلاً گوراں کا گھر والا یتیم چند سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ مہنگائی بھتہ ملا کر ایک سو پانچ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی لیکن مزاج ایسا تھا کہ جیسے لاٹ صاحب بن گیا ہو۔ گوراں کو ایسا ڈانٹتا ڈپٹتا تھا جیسے دفتر میں بڑے بابو کی جو جھڑکیاں سہنا پڑتی تھیں اس کا سارا انتقام بیوی سے لے رہا ہو۔ آٹھ بجتے ہی دفتر جانے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ کھانا بنانے میں دو منٹ کی دیر ہو جائے تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا اور بھوکا چلے جانے کی دھمکی دیتا تھا۔ گوراں سب سہتی تھی اور منت خوشامد کر کے مناتی رہتی تھی۔ لیکن اب اس نے بھی ایک روز تنگ کر کہہ دیا "بھوکے جانا ہے تو جاؤ۔ انگیٹھی میں تو کوئلے ہی جلیں گے۔ میں اپنی دیہہ نہیں جلا سکتی۔ جتنا ہم عورتیں جھکتی ہیں اتنا تم مرد شیر ہو جاتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے سوروپلی میں سارا گھر چلاتی ہوں" اس کے بعد بابو پریتم چند کی ناک کچھ سیدھی رہنے لگی ہے۔ اور تیوری چڑھانے سے پہلے دس مرتبہ سوچتے ہیں۔

شیلا اور گوراں کی طرح سوما اور لکشمی نے بھی اپنی اس حالت کو محسوس کر لیا تھا اور اسی کارن وہ للی سے عملی ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ گرللی نے ایک مرد کے بھاگ جانے پر دوسرے مرد کی غلامی لکھوالی ہوتی تو وہ ایک عام سی بات ہوتی اور للی ان کی نگاہ سے گر جاتی لیکن اپنی آن پر قائم رہ کر اس نے جیسے عام شہادت کا درجہ حاصل کر لیا تھا اسے دیکھ کر شیلا، گوراں، سوما سبھی کو تسکین ملتی تھی۔ اس کی مثال زندگی کو متحرک اور باعمل بناتی تھی۔

پھر نتھو مختلف ڈھنگوں سے پیغام بھیجتا رہا لیکن للی انھیں برابر ٹھکراتی رہی۔ نہ وہ اسے بلانے جاتی تھی اور نہ وہ خود آنے کو تیار تھا۔ جانتا تھا کہ ذات برادری کے لوگ طعنہ دیں گے "چل تو بھی کوئی مرد ہے، عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے" گھر آنے کو جی بہت چاہتا تھا لیکن یہ ضد اور ہٹ دھرمی اسے روکے ہوئے تھی۔ سوچتا تھا کہ للی کے سامنے گردن کیسے اُٹھے گی۔ اگر اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو اب تک دس مرتبہ گھر آ گیا ہوتا۔ لیکن جو عورت اس قدر عزت اور وفا کا پاس رکھتی ہے اس کے سامنے مرد کو بھی عزت اور وفا کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ اسی لئے وہ للی کو زیادہ چاہتا تھا، اسی لئے وہ گھر آنے کے لئے زیادہ بے تاب تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اور وہ جھوٹی لاج چھوڑ کر اور برادری کے چار بزرگ آدمیوں کو ساتھ لے کر للی کے دروازے پر آ گیا۔ اسے للی سے جس سلوک کی توقع تھی وہی ہوا۔ وہ چپ اور گمبھیر بنی رہی۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں بولی۔ جب پنچایت کے بزرگ نے صلح کی بات چیت چھیڑی تو اس نے بظاہر ملائمت لیکن بڑے ہی فخر سے جواب دیا "میں کیا کہوں جانا ہے تو جائے رہنا ہے تو رہے"

شیلا، گوراں اور سوما بھی ان الفاظ کو دُہراتے ہوئے فخر محسوس کر رہی تھیں۔ اور ان کی نگاہ میں للی کا قد پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔

۱۹۵۰ء کے خاتمہ کے ساتھ تاریخی ارتقا میں ایک اور کڑی کا اضافہ ہوا

اور اسی کے ساتھ

اُردو ادب میں بھی ایک اور تاریخی دستاویز کا اضافہ ہوا

۱۹۵۰ء کا

بہترین ادب

مُرتّبہ

سردار جعفری پرکاش پنڈت

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ - دہلی ۶

لے پالک

صدیقہ بیگم

اس کے رہن سہن کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ لے پالک ہے۔ بلکہ ریشماں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلاہٹ اس گھر میں پلی بڑھی ہے۔ پھر شکل و صورت بھی ماشاءاللہ ایسی تھی کہ دیکھتے ہی بنے۔ اور اب تو سن کا تقاضہ بھی تھا۔ سولہ سترہ برس کی ہونے کو آئی تھی، لڑکی ذات سیلاب کی طرح بڑھتی ہے۔ دن دونی رات چوگنی۔ یوں تو پہلے ہی سے اس کا رنگ گورا چٹا تھا۔ اور اب تو اس میں سرخی بھی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اور چہرے کا تو کہنا ہی کیا۔ روز بہ روز اس کے گالوں میں چمک آتی جا رہی تھی۔ لیکن اس عمر کے باوجود اس میں وہی بچپنا تھا۔ دس بارہ سال کی لڑکیوں کی سی اچھل کود، سارے گھر میں دھما چوکڑی مچائے رہتی۔ لیکن کام میں اتنی تیز کہ اُدھر زبان سے نکلا، اور اِدھر ریشماں کام میں جٹ گئی جس دن سے گھر میں قدم رکھا تھا۔ خوب بے تکلف ہو گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھول گئی تھی کہ کہیں اور پیدا ہوئی ہے۔ بات بات میں بچوں کی سی ضد، بچوں کی طرح ٹھنکنے لگتی۔ اور جس بات کو بھی ضد کرتی کرا کے چھوڑتی۔

طلعت کے لئے سینڈل آیا۔ بس اس نے اپنے پرانے چپل اُتار کر پھینک دیے۔

"میں تو نہیں لگائے پھروں گی ان لینتروں کو ——— مجھے تو سینڈل چاہئیے۔ ایسے ہی جیسے طلعت باجی کا سینڈل ہے، بس میں ایسے ہی لوں گی"۔ اب سب نے بہتیرا سمجھایا کہ اگلے مہینے میں آجائے گا۔ مگر اس کی ایک نہیں ہزار نہیں ——— دوپہر کو تو اس غم میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ آخر مجبور ہو کر لانا ہی پڑا۔ اور اس کی ایسی ہی باتوں پر تو سارے گھر کو اس پر پیار آتا تھا ——— اور اگر اس سے کوئی غلطی ہو جاتے تو بچہ سمجھ کر چپ ہو جاتے آخر عقل ہوتی تو ایسی باتیں کرتی ——— اور پھر وہ شوخ بھی اتنی کہ ادھر چائے کی پیالی بات میں لی ادھر چھوٹ کر چینا چھن بکھر گئی۔

اور وہ چپ، مگر جب بیگم غصہ ضبط کرتے ہوئے کہتیں۔

"ارے کیسے ٹوٹ گئی یہ پیالی، منحوس! ———"

تو جواب میں اس نے نورجہاں کی طرح دوسری تو نہ توڑی۔ لیکن ایسا بھاڑ سا منہ کھول دیا جیسے اس کے ٹوٹنے سے وہ گھبرا گئی ہو۔

"کیا بتاؤں بھابی، بس ہاتھ سے چھوٹ گئی"۔ اس کی سہمی ہوئی شکل دیکھ کر بھابی کو بھی رحم آگیا ——— اور وہ بگھل گئیں۔

"اونھ ——— پرائے کو ٹوٹ بھی جانے دے، چینی کی پیالیاں ٹوٹا ہی کرتی ہیں"۔ اور اب جو اسے شہ ملی تو بس پھر کیا تھا۔ اس کے مکڑے کوڑے میں پھینکتے پھینکتے اس کے جسم میں بجلی کی سی پھرتی آگئی۔

"بڑی کمزور ہوتی ہیں۔ یہ مٹ گئی پیالیاں" ——— اور بیگم کا پارا چڑھنے لگا۔ اس کا جلد سنکر سارا گھر ہنسی سے لوٹ پوٹ گیا۔ بیگم کا غصہ بھی اتر گیا۔ نسیم کا تو یہ حال کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"ارے ریشماں، بڑی کمزور ہوتی ہیں یہ پیالیاں" ——— پھر تو طلعت اور نسیم نے کئی دن اس کو پریشان کیا۔ ایک آدھ بار تو اس نے کہہ بھی دیا کہ کمزور نہ ہوتیں تو ایسے ایک اشارے میں ٹوٹ جاتیں"۔ پھر اس کو اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا اور چڑھنے لگی ——— اور بیگم یہ کہہ کر چپ ہو گئیں کہ ——— "بچاری یتیم ہے، اس کا دنیا میں بیٹھا ہی کون ہے۔ جو کچھ ہیں ہم ہی ہیں۔ اب اس پر ڈانٹ ڈپٹ کر کے کون اس یتیم کا جیرا اپنے اوپر لے ——— ادھر ریشماں کی سب سے بڑی ڈھال تھی۔ کتنا بڑا نقصان کر دے مگر کوئی اسے کچھ نہ کہتا۔ آخر اللہ ماری یتیم جو تھی ——— پھر یہ بھی کہ جہاں یہ بات تھی وہاں یہ بھی تھا کہ کسی کام سے تامل نہ تھا اور پھر اتنی پھرتی سے کام کرتی کہ سارا گھر دیکھتا رہ جاتا ——— تھکنا کسے کہتے ہیں یہ تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ آج آٹھ سال اس کو اس گھر میں آئے ہو گئے تھے۔ اور جو بیس گھنٹے گھر میں اسی کے نعرے گنتے تھے اور وہ دو پیسوں پر تگنی کا ناچ ناچتی تھی۔ کسی نے آواز دی فوراً اس کی خدمت میں جا حاضر ہوئی۔ ایک کام چھوڑنا اور دس میں ہاتھ ڈالنا تو اس کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔ اور جسم میں پھرتی اس غضب کی

تھی کہ برتن مانجھ رہی ہے اور طلعت نے آواز دی "اری ریشماں ذرا ادھر تو سننا" اور وہ برتن پھوڑ چھاڑ انہیں ہاتوں سے اس کے کمرے میں پہنچ گئی اور اس کے کام میں لگ گئی۔ لیکن ابھی وہ کام ختم بھی نہ ہوا تھا کہ نسیم نے آواز دی "اری ریشماں کدھر ہے یہاں تو آنا ــــــ" اور گھر کی خاموشی کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی اس کے دندناتے ہوئے پیروں کی آواز سنائی دیتی۔ اس کے قدموں کی آواز سنکر سب لوگ سمجھ جاتے کہ ریشماں ہوگی۔ جو نہ جانے زمین سے کب کا بدلا لے رہی ہے۔ تبھی تو جب بیگم بہت خوش ہوتی تو "اری ریشماں سنبھل کر چل، آخر یہ زمین بھی کیا کہتی ہوگی، کوئی اس پر اس طرح چلتا ہے" لیکن ریشماں کو بھلا ایسی باتوں کی کہاں پرواہ ہوتی، وہ تو بس ایک کان سے سنتی اور دوسرے سے اڑا دیتی۔ جیسے کسی نے کچھ کہا ہی نہیں۔ اور پھر ذرا سی دیر میں دیکھو تو ریشماں کوئی بے کام کا کام لئے بیٹھی ہے۔ بے کار تو اسے کسی نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا، ایسی لڑکی کو بھلا ڈانٹنے سے کیا فائدہ۔ بس اُسے تو اپنے کام سے کام ــــــ سمجھانے کی تو بات ہی اور ہے۔ اگر کوئی ڈانٹ بھی دے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چکنا گھڑا تھی وہ تو جس پر ایک بوند بھی پانی کی ٹھہر جائے تو بات ہے۔

ریشماں کی سب سے بڑی کمزوری اس کا نہانا تھا۔ چنانچہ آج جب بیگم نے اسے نہانے پر زور دیا تو بس۔

"بھابی تمہارا احسان مانوں گی، مجھے نہانے کے لئے مت کہا کرو ــــــ اگر میں تم کہو گی کہ نل کے نیچے بیٹھی رہ ریشماں تو سچ کہتی ہوں اگر ایک منٹ کو بھی اٹھوں نل کے نیچے سے تو جو چور کی سزا وہ میری ــــــ مگر بس جاڑے میں مجھ پر رحم کیا کرو"

لیکن بیگم اس کی عادت سے واقف تھیں انھیں جب اُسے نہلانا ہوتا تو پھر کسی شرط پر نہ چھوڑتیں، وہ کتنا ہی منہ بناتی، جاڑے کا واسطہ دیتی، بخار چڑھا لیتی۔

"بھابی ــــــ نہ جانے مجھے کیوں سردی لگ رہی ہے کہیں بخار تو نہیں ہوگیا"، وہ زکام سے سوں سوں کرنے لگتی "زکام ہوگیا ہے بھائی جان سے دوا منگوا دینا"، اور بیگم اس کی ان تمام چالبازیوں سے واقف ہوگئی تھیں۔

"ہاں آتے دے بھیّا کو ــــــ میں آپ ساری دوا منگوا دوں گی، لے بس تو نہالے، پانی چولہے پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے ــــــ اور ہاں دیکھنا بالوں کے لئے کھلی بھی بھیگی رکھی ہے۔ خوب اچھی طرح بالوں کو صاف کر لینا۔ کتنے گندے ہو رہے ہیں، سارے کے سارے الجھے ہوئے ہیں ــــــ" مگر اس کے جواب میں اس نے اپنے سر کو اس زور سے جھٹکا دیا۔ جیسے بھابی کوئی بڑی بیوقوفی کی بات کر رہی ہیں اور آہستہ سے اس نے کہا "بس تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی میری بات"، اور پھر ایک آخری کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "بھابی بس آج کے دن معاف کر دو۔ کل کے دن ضرور نہالوں گی ــــــ اور بال بھی خوب اچھی طرح دھو لوں گی۔ پھر دیکھنا سوکھ کر کیسا نکھرتے ہیں یہ بال"

"اچھا نہانے نہیں جائے گی، اٹھوں پھر بڑی باتیں بنانی آگئی ہیں۔ گز بھر کی زبان ہوگئی ہے کچھ کہتی نہیں، اسی لئے یہ حال ہے" اور اب تو وہ اور بھی مجبور ہوگئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اب یہ کام کرنا ہی ہے تو وہ پھر ریشماں ہوگئی اور اس کے جسم میں وہی پھرتی آگئی اور اپنی عادت کے مطابق جلدی جلدی کپڑے لیکر پانی رکھ غسل خانے میں پہنچ گئی اور کسی نہ کسی طرح اس مصیبت کو بھی حل کر ڈالا۔ چنانچہ آدھے گھنٹے کے اندر ہی جب کہ بیگم ابھی صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں وہ چھپاک سے جو بھاگی ہے تو بیگم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اری ریشماں ــــــ یہ کیا آفت آگئی ہے تیرے اوپر ــــــ بس نیا ئن پہن کر نکل بھاگی"، اور ریشماں کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا ــــــ اس نے گز بھر کی زبان نکالی اور "ہائے اللہ" کہہ کر الٹے پاؤں غسل خانے میں پہنچ گئی اور بیگم نے چلانا شروع کر دیا۔

"کیا مصیبت ہے یہ لڑکی بھی، جوان لڑکے لڑکیوں کا گھر ہے اور اس کو نام کو شرم دھیا بھی نہیں رہ گئی، آخر کوئی حد ہوتی ہے ــــــ مانا کہ ہر کام جلدی ہو۔ مگر یہ بھی کیا ضروری ہے کہ ہر کام ادھورا ہو ــــــ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ خالی نیا ئن پہنے چھاتی ہلاتے نکل کھڑی ہوئیں"۔ اور اس وقت ریشماں کا حال کچھ نہ پوچھو "کانو تو ہو نہیں بدن میں"، پھر جو چپ چاپ نکلی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کئی دنوں کے لئے رخصت ہوگئی، خاموشی سے سر کو جھکائے، بدن چرائے ہوئے طلعت کے کمرے میں جا پہنچی، ادھر طلعت کا یہ حال کہ تکیے میں منہ دیئے اوندھی پڑی تھی ہنسی کے مارے برا حال ــــــ ریشماں کا منہ لال ہو رہا تھا، سارا جاڑا کافور ہو چکا تھا "ارے طلعت باجی کیا ہوگیا ہے"؟

"پہن آئیں جمپر ـــــــ بڑی اچھی لگتی ہوں گی بنیائن پہنے"

"نہیں مانو گی، کہوں بھابی سے"

ادھر بیگم صاحبہ نے آواز دی "ارے ریشماں کہاں گھس گئی تھی جا کے، چل ادھر بال سکھا لے، تو میں کنگھی کر دوں"

"اب پھر ایک اور آفت آگئی" وہ جھنجھلا گئی ـــــــ مگر اسے ایک نئی ترکیب سوجھی۔

"بھابی! تم اپنا کام کرو میں طلعت باجی سے کرالوں گی کنگھی" ـــــــ لیکن جب مصیبت آتی ہے تو کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ طلعت نے بھی ٹکا سا جواب دیدیا

"جاؤ امی سے ہی گند ھواؤ اپنا چونڈا ـــــــ مجھے آپ فرصت نہیں ہے اور پھر جوئیں بھری ہوں جس سر میں، اس میں تو میری جوتی بات لگاتی ہے، بس چلو یہاں سے" اور اب اس کے سامنے کوئی چارہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ کمرے سے چپ چاپ نکل جائے، دل ہی دل میں وہ طلعت کو کوستی جا رہی تھی ـــــــ مجھ سے بھی تو کوئی کام پڑے گا۔ بتا دوں گی میں بھی ـــــــ اور وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی بیگم کے سامنے آکر بیٹھ گئی ـــــــ اور پھر بیگم کے ہاتھ میں اس کے لمبے لمبے بال آگئے تھے اور وہ انھیں پھریرا کرتی جا رہی تھیں ساتھ ہی ساتھ ان کا کچھ بھی شروع ہو گیا

"ارے ریشماں ـــــــ اب جوان ہو گئی ہے بچی نہیں رہی، ذرا عقل کے ناخن لیا کر۔ اب تیرے وہ دن نہیں رہے کہ جہاں چاہے پھرا کرے آخر یہ ڈھائی گز کا ڈوپٹہ کس دن کے لئے ہے اور یہ جوتے جس کے لئے اتنے فعل بکھیرے تھے انھیں بھی کبھی پہن لیا کر یا خسم کے سر پہ بجانے کیلئے رکھے ہیں ـــــــ تو سمجھ گئی نا، ڈوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا کر۔"

"مگر بھابی تم کچھ کہو یہ ڈوپٹہ مجھ سے نہیں اوڑھا جاتا، کام کاج میں برابر الجھتا ہے اب تم ہی بتاؤ سر دقت کیسے گھمیں ڈالے رہوں"

یہ سننا تھا کہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

"ـــــــ دیکھ ریشماں سمجھائے دیتی ہوں کہ اب جو میں نے تجھے بغیر ڈوپٹے کے دیکھا ـــــــ کام ہو یا نہ ہو مگر ڈوپٹہ ضرور ہونا چاہیے کبھی طلعت کو بھی بغیر ڈوپٹے کے کمرے سے باہر نکلتے دیکھا ہے ـــــــ تجھے تو نام کو بھی شرم نہیں رہی، اب دیکھوں کیسے نہیں اوڑھا جاتا ـــــــ"

"ادھ ـــــــ طلعت باجی کا اور میرا مقابلہ ـــــــ ان کی بات اور رہے" وہ ٹھنکنے لگی۔

"نہیں ریشماں! میں نے کہہ دیا ہے اور بس یہ میرا فیصلہ ہے اب دیکھوں تجھے بغیر ڈوپٹہ کے" ـــــــ اب تو مجبوراً اسے سر تسلیم خم کرنا پڑا، مرتی کیا نہ کرتی، بیگم کا غصہ وہ اچھی طرح جانتی تھی یا تو کبھی غصہ آتا نہیں یا جب آتا ہے تو کسی کے قابو کی نہیں رہتیں، اسی لئے ریشماں نے چپ چاپ رہنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی، لیکن بیگم کا بھی تو یہ ہے کہ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع کر دیتی ہیں ـــــــ

"اور ہاں دیکھو، اب نسیم کے کمرے میں بھی اس طرح بے دھڑک نہ گھس جایا کر اکیلے"

"اکیلے نہیں تو پھر جب کام ہو تو کسے لے جایا کروں، کوئی اور تو ان کے کام کو بات لگاتا نہیں" اب اسی دن مجھے بخار آگیا، اور ان کے کالج جانے کا وقت ہو گیا مگر کسی نے بھی تو ان کو کھانا نہ دیا ـــــــ خود جا کر انھوں نے باورچی خانے سے نکالا ـــــــ میں نے اٹھنا چاہا مگر طلعت باجی نے جو ڈانٹ بتائی تو میں بھی پڑی دیکھتی رہی آخر کیا کرتی تم ہی بتاؤ ـــــــ اور طلعت باجی بس کرسی پر بیٹھی سوئٹر بنتی رہیں ان سے تو کچھ بھی نہ ہو سکا اور دن اور سلائی ایک طرف رکھ کر کھانا ہی نکال دیں اب تم ہی بتاؤ پھر کسے لے کر جاؤں، پھر میں ہی کیا ہے۔ اللہ ماری ایسی کوئی آفت آرہی ہے۔"

اس نے بے خبری میں گردن کو جھٹکا دیا اور بیگم نے جھنجھلا کر کہا "ارے ٹھیک سے سر کر ـــــــ گھمائے چلی جا رہی ہے سر ادھر اُدھر ـــــــ بڑی آئی ہے کام کرنے والی سدا سے تو نے ہی تو اس گھر کا انتظام کیا ہے ـــــــ تو نہ ہوتی تو بس کوئی کام تھوڑے ہوتا بڑی بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے لگی ہے"

اور وہ چپ تھی کہ طلعت کمرے سے نکل پڑی۔

"کیا چغلی ہو رہی ہے میں سمجھتی ہوں اس ریشماں کی بچی کو ـــــــ ذرا موقع ملا اور یہ ادھر کی ادھر لگا دیتی ہے۔ کس روز نہیں ملا تھا بھائی جان کو کھانا، ادھر آؤ بتاؤں تجھے ـــــــ" یہ سننا تھا کہ بیگم نے بھی رخ بدل دیا۔

"اچھا چلو اپنے کمرے میں، چل آئیں لڑنے کیلئے، سچ تو کہہ رہی ہوں تم سے کوئی کام ہوتا ہے بس اون اور سلائی لئے بیٹھی رہو ــــ یہ بھی نہیں ہوتا کہ صبح شام بھیا کو کھانا ہی کھلا دیا کرو، اور اب میں کہے دیتی ہوں کہ آج سے نسیم کا سارا کام تجھے کرنا پڑے گا۔ ریشماں نہیں کریگی"

مگر یہ سنکر تو ریشماں بجائے خوش ہونے کے اور الجھ گئی، اسے تو بھائی جان کا کام کرنے میں خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ نسیم اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا تھا اور کوئی کام ہوتا تو بڑے پیار سے کہتا تھا۔ یہ نہیں کہ طلعت کی طرح، جیسے ٹوکری میں بھر کر کوئی کوڑا گھورے پر انڈیل دے۔

"ریشماں! لے یہ ڈوپٹہ جا کر دھوپ میں ڈال دے" کیسا ہی ضروری کام کرتی ہو مگر بیگماں کا حکم ہے ٹال تھوڑا ہی سکتی ہے۔ چاہے کسی کا کام ہو یا نہ ہو مگر ان کا حضور ہو اگر کہیں کہہ دیا کہ باجی ذرا ٹھہر جاؤ ابھی تھوڑی دیر میں کر دوں گی ــــ تو بس آفت۔

"بس آتا میرے کمرے میں تو میں تمہیں بتاؤں گی" جیسے سارے گھر میں اٹھنے کا تو ایک کمرہ ہے، اور ادھر بھائی جان، اللہ میاں کی گائے، کہیں ہی غلطی ہو جائے مجال ہے جو کچھ کہہ جائیں..... اب اسی روز ساری سیاہی میز پوش پر الٹ گئی، لیکن ان کے لئے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ــــ بس یہ کہکر چپ ہو گئے۔

"میز پوش اس وقت تک پاک نہیں ہوتا۔ جب تک اس پر سیاہی نہ گرے ــــ لے کر کونے میں ڈال دے اور بکس میں سے نیا نکال لا، جس روز امی کہیں جائیں گی بس خاموشی سے دھو لینا ــــ"

اور وہ چور ہو گئی تھی کتنی دیر اُسے اپنے ہاتھوں پر غصہ آیا جنہوں نے اچھی بھلی رکھی ہوئی دوات الٹ کر رکھ دی ــــ بلکہ اگر بھائی جان اس روز غصہ میں ناراض ہوتے تو شاید اس کو خیال بھی نہ ہوتا لیکن ان کے کچھ نہ کہنے سے اسے دن بھر الجھن ہوتی رہی، حالانکہ ایسا کوئی نقصان بھی نہ ہوا تھا مگر نہ جانے کیوں اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی بڑا نقصان ہو گیا ہو تمام دن اسے وہی خیال بار بار آتا رہا ــــ اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کی زبان پر ٹافی رکھی ہوئی ہے میٹھی میٹھی ٹافی اور وہ اسے چوس رہی ہے کتنی خوش ذائقہ ہوتی ہے یہ کمبخت ٹافی بھی۔ ایک دو ٹافی میں جتنا چاہے کام کرا لو، اور وہ خوشی خوشی ہر کام کر ڈالتی اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ کہ سب کے سامنے کھاؤ اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی کیا کھا رہا ہے ــــ اب ایک دن جب نہ جانے کس خیال میں میٹھی وہ ٹافی چوس رہی تھی کہ طلعت نے دیکھ لیا طلعت بھلا کہاں معاف کرنے والی تھی، پوچھ ہی تو بیٹھی ــــ "کیا کھلائی ہو رہی ہے بیگم صاحبہ" اور ریشماں نے ایک ہی مرتبہ میں اس کو ختم کر لیا اور منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ دو منٹ کوئی بات ہی نہ کی، آخر بیگم کو پوچھنا پڑا کہ کیا بات ہے ــــ

"کچھ نہیں طلعت باجی کی عادت جانتی ہی ہو ہر بات میں بین میخ نکالتی ہیں" "اب دیکھو لگا دی چوری کہ کیا کر رہی ہو ــــ سچ مچ اللہ کی قسم، میں نے بادرچی خانے سے ایک لقمہ بھی چوچھپا کر کھایا ہو تو سمجھو زہر کھایا ہے"، اور اس نے بھاڑ سا منہ کھول دیا ــــ "اور دیکھو کیا کر رہی ہوں"، لیکن وہاں دھرا کیا تھا ساری زبان صاف کی صاف رکھی تھی، پانی سے دھلی ہوئی ــــ اور طلعت بات کہکر چور ہو گئی اور وہ بھی کوئی چوری تھوڑا ہی لگا رہی تھی، مگر چور کی داڑھی میں تنکا تھا ــــ الٹا بیگم نے طلعت کو ڈانٹا۔

"طلعت بڑی بدزبان ہو گئی ہو بھلا ایسے بھی کوئی کہتا ہے مانا کہ چھوکری اچھل چکا ہے مگر ایسی عادت اپنی ریشماں کی نہیں ــــ پھر اگر کھا بھی لیا تو کوئی غیر تھوڑا ہی ہے ــــ تمہاری اپنی بہن ہے گھر میں رہتی ہے تو کیا پیٹ کہیں اور رکھ کر آئے گی ــــ"، اور ریشماں خوش ہو گئی اور پھر ــــ دوسرے لمحے اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ طلعت نے اُسے کچھ کہا تھا۔ وہ تو طلعت سے اتنی محبت کرتی تھی کہ ذرا سا بھی گھڑی بھر کو اسے اداس یا پریشان دیکھا بس لپٹ گئی اس کے گلے میں اور دن بیتتی رہ جاتی ــــ "ارے ہٹ پرے کو ــــ جوئیں چڑھا دو گی میرے"

اور وہ بس یہی کہے جاتی ــــ "میری اچھی سی باجی ناراض ہو گئیں تم تو ــــ"

"چل دور ہو ــــ میں ناراض وراض نہیں ہوں ــــ میں تو یونہی کہہ رہی تھی کہ کیا کھا رہی ہو ــــ"؟

"بس اتنی سی بات تھی ــــ مگر سچ مچ باجی تم نے کہا تو ایسے ہی تھا۔ جیسے میں چھپ کر کھا رہی تھی کوئی چیز"، اس نے منہ پھلاتے ہوئے کہا جیسے اس کے تصور ہی سے اس کو کوئی کچوکا لگا ہو

"اچھا کہا تو کرے کیا کرتی ہے، بڑی آئیں وہاں سے اتنی باتیں سنوا دیں امی سے اور اب بھی چین نہیں ہے ــــ وہ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ڈپٹ کر کہتی "اچھا بس چپ رہو، طلعت باجی معاف کر دو مجال ہے جواب کچھ کہوں" اور وہ دونوں ہات جوڑ کر کھڑی ہو گئی ــــ اور طلعت کے منہ چھوٹ گئی

"بس اب تو چھوڑ دے میرا پیچھا، جاؤ معاف کر دیا"، بس پھر کیا تھا اتنی سی بات ہی اس کو خوش کرنے کے لئے کافی تھی "طلعت باجی لاؤ تمہارے ہاتھ پاؤں دبا دوں"، اور مشیتر اس کے کہ وہ کچھ کہے وہ بغیر جواب سنے ہی اپنے کام میں مشغول ہو گئی اور طلعت کو بھی اس کے سامنے ہار ماننی پڑی اور کام کرنے کی اسی ان تھک عادت کی وجہ سے نسیم کہا کرتا تھا

"طلعت اپنی ریشماں کو تو بس یہ سمجھو کہ جن ہے اپنے قبضے میں، وہی علاؤالدین والا کہ آواز دو اور سامنے، پھر یہ بھی کہ جو کام کہو منٹوں میں کر کے رکھ دیتی ہے اور تم سوچتی ہی رہ جاؤ کہ اب کون سا کام بتایا جائے وہ تو سامنے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کہ اس کے لئے ایک کتا پالوں اور جب ریشماں کو کوئی کام نہ ہو اور کام کو پوچھے تو بس یہی کہہ دوں کہ جا دکتے کی دم سیدھی کر دو"، اور نسیم نے ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ریشماں پٹاخ سے بول پڑی "ہاں بھائی جان ضرور پالو اور ایک بلی بھی پالنا مجھے بلی بڑی اچھی لگتی ہے نرم نرم میاؤں میاؤں کرتی ہوئی پوسی، پچ پچ بڑی اچھی لگتی ہے۔ تم پال لو، بس میں اس کی دیکھ بھال کیا کروں گی"، اور وہ تو کچھ اور بھی بولتی کہ بیگم کے کانوں تک اس کی آواز پہنچ گئی ——— "اچھا بلی پالیں گی نواب زادی ——— چل تو سہی چڑیل کہیں کی، گیہوں بکھرا ہوا پڑا ہے اور تجھے بلی پالنے کی لگی ہوئی ہے۔ اور بس ایسے وقت میں اسے یہ زبردستی کا کام بھاگتا وہ محسوس کرنے لگتی کہ گھر میں وہی اکیلی کام کرنے والی ہے جیسے نوکر ہی تو ہے۔ اس کا جی چاہتا کہ کمرے میں جا کر چارپائی پہ اوندھی ہو کر گر پڑے اور خوب دھاڑیں مار مار کر رو دے۔ بھلا کوئی بات بھی ہے ایک منٹ کو بھی آرام تو نہیں جیسے کوئی انسان تھوڑا ہی ہے۔ ایک تو تھوڑی دیر کے لئے بھائی جان بات کرتے ہیں اور بھابی ایک نہ ایک کام لے کر بیٹھا دیتی ہیں۔ ایسے ہی وقت انھیں کام بھی سوجھتا ہے ——— اور اس کا جی بس الجھ ہی تو جاتا۔ طلعت باجی سے تو کام لے لیں اس طرح پٹ سے منع کر دیں تو بات نہیں۔ اسے پان والی بات یاد آجاتی۔ جب امی نے آواز دی تھی "ارے طلعت ذرا مجھے ایک ایک پان تو بنا دے"، تو اس نے کیسا الٹا امی پر ٹال دیا تھا اس لئے کہ بیگم صاحبہ خود تو اپنی سہیلیوں بہنوئیوں سے گپ لڑا رہی تھیں اور الٹا اسی پر حکم چلا دیا

"ارے ریشماں کہاں مر گئی ذرا دیکھ امی بلا رہی ہیں"، اور خود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی اور کیوں ہوتی وہ کوئی ریشماں تھوڑا ہی تھی جو ہر کسی کا کام کر دے اور دو منٹ کسی سے ہنس کر بات بھی نہ کر سکے۔

مگر ایسی باتیں ریشماں کتنی دیر سوچتی۔ ایسی باتوں کے سوچنے میں وہ دو تین منٹ سے زیادہ وقت ضائع نہ کرتی اور پھر جو کام میں لگتی تو بس پھر اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی بس کام سے کام ——— پھر من دو من گیہوں اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ تو بات کی بات میں صاف کر کے رکھ دیتی اور اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ ابھی ذرا سی دیر پہلے اسی گیہوں کے پیچھے اسے بیگم نے ڈانٹا تھا یا یہ کہ اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام لیا تھا لو گیہوں صاف کرتے وقت اگر اسے کوئی فکر رہتی تو بس یہی کہ کسی طرح یہ ختم ہو اور وہ دوسرے کام میں لگے۔ دراصل اس سے بہت دیر تک ایک جگہ بیٹھا بھی نہ جاتا تھا اور پھر یہ بھی کہ ہر نئے کام کو وہ دلچسپی سے کرتی تھی اور جہاں دلچسپی کا سوال ہو وہاں ہر کام اچھا ہوتا ہے ——— اور پھر اگر بھائی جان کا کام! وہ بڑے فخر سے کہتی :-

"طلعت باجی! اپنے بھائی جان سب سے اچھے ہیں۔ بڑے سیدھے ہیں کبھی کچھ نہیں کہتے ایک تمہارا کام کر دو تو دس باتیں الگ سے سنو ——— اور پھر بھائی جان ٹانی" ——— وہ کہتے کہتے رک گئی

"کیسے ٹانی ———"، طلعت چونک پڑی جیسے کسی نے سوتے سے پکی نیند میں جگا دیا ہو۔

"ارے باجی، ٹانی تم نہیں جانتیں، اچھا اب ملے گی تو میں تم کو ضرور کھلاؤں گی بڑے مزے کی ہوتی ہے ٹانی ——— بھائی جان بڑے شوق سے کھاتے ہیں مجھے بھی کبھی کبھی دے دیتے ہیں ——— بڑی مزے دار ہوتی ہے یہ ٹانی طلعت باجی ———" وہ ٹانی کا ذکر کچھ اس طرح کر رہی تھی جیسے اس کا مزہ بار بار اس کے منہ میں آ رہا تھا۔

"اچھا ———" طلعت اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بات کرنے کے بجائے کچھ سوچ رہی ہے اور اچھا بھی اس نے کچھ اسی بے خیالی میں کہا ——— ریشماں کے لئے کسی بات کا چھپانا تو جیسے بالکل ہی ناممکن تھا اس لئے نہیں کہ وہ جھوٹ بول نہیں سکتی تھی بلکہ وہ جانتی ہی نہ تھی کہ جھوٹ بولنا کسے کہتے ہیں اور پھر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ اس کو کیوں چھپایا جائے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے فوری غصے کے

ڈر سے وہ یہ کہدے کہ "میں کچھ نہیں کھا رہی ہوں" اور اس کے ثبوت میں ٹافی ٹالم کی ٹالم بگل جائے مگر یہ بات اس کے ذہن میں کبھی نہ آسکتی تھی کہ وہ ٹافی کو چھپا کر کھائے بلکہ اگر اس کو کچھ ڈر تھا تو بس یہ کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس نے نعمت خانے سے کوئی چیز نکال کر کھائی ہے اور یہ بات سچ ہے کہ اس نے نعمت خانے سے کوئی چیز نکال کر نہیں کھائی تھی چنانچہ ٹافی کو چھپا کر کھانا اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ یہ اور بات ہے کہ خواہ مخواہ دوسروں کو دکھا کر کھانے میں کوئی ایسی بات نہ تھی یہی وجہ ہے کہ اب جب طلعت سے بھائی جان کی تعریف کر رہی تھی تو ٹافی کا ذکر نہ کرنا اس کی نظر میں ان کی ایک بڑی اچھائی پر پردہ ڈالنا تھا۔ اور اس طرح کسی کی بات پر پردہ ڈالنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جب طلعت نے منہ بنا کر پوچھا۔

"اور کیا کہا تھا بھائی جان نے"

"کچھ نہیں کہتے کیا ـــــ بس دے دی ٹافی ـــــ میں ان کا اتنا کام بھی تو کرتی ہوں، اب مجھے چوڑیاں لا کر دینے کو کہا تھا بھائی جان نے ـــــ کہنے لگے ایسے ننگے ہاتھ اچھے نہیں لگتے ـــــ تم اتار کر دیکھو اپنی چوڑیاں، ننگے ننگے ہاتھ"

اور طلعت نے مسکرا کر کہا "اچھا تو چوڑیاں آرہی ہیں آپ کے لئے"

"اور کیا! تم بھی منگواؤ گی کیا، کہدینا بھائی جان سے، نہیں تو میں ہی کہہ دوں گی ایک ساتھ آجائیں گی دونوں کے لئے" اس نے انتہائی معصومیت سے طلعت کے طنز کو نہ سمجھتے ہوئے کہا اور اصل ویسے بھی وہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ طنز کسے کہتے ہیں چنانچہ جب طلعت نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں، میرے لئے منگوانے کی، بس تم ہی منگواؤ وہ بڑے پیسے بگل رہے ہیں" وہ تو کچھ بھی نہ سمجھ سکی کہ طلعت کس بات پر اس سے ناراض ہو گئی۔ آخر اس میں ناراض ہونے کی بات ہی کیا تھی۔ پھر چوڑیوں میں ایسی کون سی بری بات تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ طلعت کو ہو کیا گیا ہے۔

"اچھا جاؤ کہنا ـــــ ہم بھی دیکھ لیں گے، اپنے بھائی جان ہی تو لا کر دیں گے۔ کوئی غیر نہیں، بڑی آئیں نکائت کرنے والی ـــــ" بھلا ریشماں کسی سے دبنے والی تھی، اور پھر جب کہ یہ بات اپنی جگہ پر سچ تھی کہ اس کے ہاتھ ننگے تھے۔ کتنے دن ہو گئے چوڑیاں پہنے، بیگم نے کئی بار کہا کہ اپنی ریشماں کے ہاتھ میں چوڑیاں نہیں ہیں اور چوڑیوں والی آتی نہیں اور یہ طلعت باجی ہیں کہ ان کا بس چلے تو لبرہی گھر میں رہیں جیسے اور کسی میں جان ہی نہیں ہے اور کسی کا جی چاہتا ـــــ اور پھر یہی نہیں طلعت نے بیگم سے کہہ بھی دیا۔ لیکن بیگم کے مزاج کو سمجھنا بھی آسان نہیں تھا۔ وقت کی بات ہے کون سی بات کیسی پڑتی ہے۔ جب انھوں نے سنا تو انھیں بھی کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ الٹا طلعت ہی پر گرجیں

"اچھا جاؤ اپنا کام کرو، کون سا عید ہے اگر اس کے لئے چوڑیاں لا بھی دے گا۔ آخر ریشماں کے اور رکھا ہی کون ہے جو اب اس کا خیال کریگا جو کچھ ہیں وہ ہم ہی ہیں ـــــ ارے اپنے گھر میں ہے تو بہن برابر ہے، تم کو تو آپ اس کا خیال رکھنا چاہیئے پھر نسیم کا کام بھی تو کرتی ہے تم سے تو ہوتا نہیں، برابر اس کا خیال رکھتی ہے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتی ـــــ" اور طلعت اپنا سا منہ لیکر رہ گئی۔ حالانکہ اس کے جی میں تو آیا کہ وہ کہدے "امی تم نہیں سمجھتیں کیا بات ہے، بڑھیا ہونے کو آئی اب یہ بات بھی مجھے بتانی پڑے گی کہ کیوں لا کر دینے کو کہا ہے اور پھر چھپا کر اسے ٹافی بھی تو کھلاتے ہیں" ـــــ مگر یہ سب وہ سوچتی رہ گئی۔ اس کی زبان سے کچھ بھی نہ نکلا۔ مگر اسے یہ تو تسلی ہو ہی گئی تھی کہ اس نے اپنا فرض پورا کر دیا امی کے کان میں بات تو ڈال دی، اب یہ ان کا کام تھا کہ وہ اس ریشماں کی رو ک تھام کرتیں۔ مگر ان کے کچھ عقل بھی ہو تو بات ہے اور وہ جل بھن کر رہ گئی پھر نسیم نے سب کے سامنے اس کو چوڑیاں لا کر دیں۔ باریک باریک رنگین چوڑیاں اور اس وقت کچھ نہ پوچھو کہ ریشماں کا کیا حال تھا اسے اچھی سے اچھی چوڑیاں پہن کر بھی کبھی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی۔ جتنی آج نسیم کی دی ہوئی ان چوڑیوں کو دیکھ کر۔ طلعت نے بہتیرا منہ بنایا مگر جب امی کا سہارا ہو تو پھر کون کچھ کہہ سکتا تھا اور ریشماں نے جلدی سے نسیم کا کوٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کمرے میں جا کر ٹکا آئی اور یہی نہیں اس نے نسیم کے منہ دھونے کے لئے پانی بھی لوٹے میں رکھ دیا "اور کچھ کام ہے بھائی جان؟" اور بھائی جان نے بڑے پیار سے اس کیطرف دیکھتے ہوئے کہا "اری ریشماں جا پہلے چوڑیاں تو پہن لے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوڑیاں لیکر طلعت کے کمرے میں پہنچ گئی" طلعت باجی لو پہنا دو مجھے چوڑیاں" اور طلعت کو بھی اس کی اس معصومیت پر ہنسی آگئی وہ چوڑیاں پہن کر پھر اسی طرح اچھل کود میں لگ گئی۔ اب ایسی لڑکی کو آخر کوئی کیا کہے اور بیگم کا حکم تو

اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔

"ہاں، ریشماں دیکھ اب تو نسیم کے کمرے میں نہ گھس جایا کر اکیلی"

"طلعت باجی جو جاتی ہیں" بھلا ریشماں خاموش ہونے والی تھی۔ اور پھر اس کا کہنا بھی تو ٹھیک تھا۔ مگر بیگم نے تو طلعت ہی کو حکم دیا کہ اب نسیم کا سارا کام اسے کرنا پڑے گا۔ ریشماں نہیں کرے گی۔

ریشماں کا منہ اتر گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کے سارے کام ختم ہو گئے۔ کوئی کام رہ ہی نہیں گیا۔

"تو پھر میں کیا کیا کروں گی؟"

"ارے پگلی تیرے لئے گھر میں کوئی کام ہی نہیں رہ گیا" اور وہ چپ ہو گئی اب اس کا جواب بھی کیا دیتی

ادھر طلعت نے کہا "اچھی بات ہے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے گھور کر ریشماں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "اور پہن چوڑیاں" اس کے جواب میں اس نے بھی اسی انداز سے آنکھیں پھرائیں جیسے کہہ رہی ہو "ہاں مجھے بھی دیکھنا ہے تم سے ان کا کام کیسے ہوتا ہے، پہلے اپنا کام تو کر لو" وہ چوٹی گندھوا صحن سے اٹھ کر چلی گئی مگر اس کا دھیان طلعت کی طرف لگا رہا بڑی بنی پھرتی ہیں! ہر کام کے لئے تو ریشماں ہے۔ اٹھ کر ایک گلاس پانی تو پیا نہیں جاتا کام کریں گی ــــــ" اری ریشماں بھنو ذرا میرا بلاؤز تو صحن سے اٹھا لا" کام کے لئے کیا "ریشماں بھنو" کہتی ہیں اور جب کام نکل جائے تو پھر وہی "ریشماں کی بچی" کتنی مرتبہ منع کیا کہ نام ٹھیک سے لیا کرو مگر بیگم صاحب کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا ــــــ اب چل میں بھائی جان کا کام کرنے انھیں ضرور وہ ٹافی دیدیں گے۔ دیں گے بھی کہنا کبھی جی لگا کر تو کوئی کام نہیں کرتیں اور چلی ہیں ٹافی لینے اس کا دماغ الجھنے لگا اور ٹافی کا ذائقہ اس کے منہ میں پھر آنے لگا۔ وہ دیر تک یہی باتیں سوچتی رہی۔

پھر جب وہ اپنے کام میں لگ گئی تو اسے خیال بھی نہیں رہا کہ کوئی بات ہوئی تھی سارا غصہ کافور ہو چکا تھا۔ اور وہی پہلے والی ریشماں تھی اور اپنا اسی چستی سے کام میں سارا دن لگی رہی یہاں تک کہ جب شام کو سب کھا پی چکے تو چھپاک سے طلعت کے کمرے میں جا پہونچی۔

"کیا کر رہی ہو باجی سر میں درد ہے کیا جو پڑی ہو" اور پھر حسب دستور اسی تکلف سے اس کے سرہانے جا کر بیٹھ گئی اور ہلکے ہلکے طلعت کا سر دبانے لگی۔

"باجی! آج تو کوئی اچھی سی کہانی سناؤ۔ وہی شہزادے والی"

"ارے کون سے شہزادے والی" طلعت نے بے خیالی میں کہا۔ حالانکہ اس کا آج کہانی سنانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

"ارے وہی شہزادے والی اور کونسی"

"چل دور ہو، بڑی آئی شہزادے والی"

"سچ سچ طلعت باجی مجھے اس طرح دتکارا مت کرو جیسے کوئی کتے کو دور کرتا ہے بس مجھے یہی بات بری لگتی ہے اب تمہارا سر دباؤں اور اوپر سے مجھے دتکارتی ہو" ــــــ اور یہ سنکر طلعت نے اپنے سر کو اور زور سے ٹھکا دیا ــــــ "میں نے کب کہا تھا کہ تم میرا سر دباؤ بس آ گئی اوپر سے احسان کرنے۔ جاؤ بھائی جان کا سر دباؤ۔ وہی تم کو ٹافی کھلاتے ہیں، چوڑیاں لا کر دیتے ہیں۔ میں کہاں سے ٹافی لا کر دوں گی۔"

اور طلعت کا یہ طعنہ وہ سمجھ گئی جس ماحول میں وہ رہتی تھی وہاں طعنہ سمجھنا کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ صبح سے اسی قسم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر وہ اور باتوں کی طرح اس کی بھی پرواہ نہ کرتی۔ اگر بھائی جان کا نام بیچ میں نہ آجاتا۔

"تمہیں طلعت باجی نہ جانے بھائی جان سے کیوں چڑ ہے۔ تم بھی کہہ دو لا دیں گے۔ چوڑیاں۔ رہ گئی ٹافی کی بات، تو اب ٹافی ہی ٹافی کھانا۔ آخر بھائی جان کا کام کروگی آپ کھلائیں گے ٹافی نہیں تو میں آپ کہہ دوں گی۔" وہ گھسیانی ہو کر بول رہی تھی۔ چنانچہ بات آئی گئی ہو گئی۔ رات آنکھ جھپکتے گذر گئی، صبح اور ریشماں حسب دستور اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ کیاریوں میں پانی دے رہی تھی کہ بھائی جان نے آواز دی۔ بس وہ بالٹی چھوڑ چھاڑ پہونچ گئی ان کے کمرے میں ــــــ "کیا ہے بھائی جان"

"ارے بھئی ریشم، کالج کا وقت ہو گیا ہے اور ابھی تک کھانا ندارد، اس طرح میرا خیال رکھو گی۔ اچھا جاؤ ٹافی نہ دوں گا"۔ نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ابھی لائی بھائی جان، آپ ہاتھ دھوئیے" اور وہ سب کچھ بھول گئی۔ ادھر نسیم نے بات بھی نہ دہرائے تھے کہ وہ کھانا لیکر پہونچ گئی اور میز پر لگا کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرانے لگی۔ "کہئے بھائی جان اور کچھ؟" اس نے آنکھیں چمکا کر کہا۔

"بس ریشماں! تم ہو تو سب کچھ ہے"، نسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تو ہوں ہی، مگر یہ تو بتائیے کہ اور کچھ بھی چاہئے" اور یہ کہکر وہ یہ جا وہ جا۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا۔ اور وہ جلدی جلدی پاؤں نکال رہی تھی اور اس کے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر خوش کیوں ہے اور ابھی وہ پانی ہی نکال رہی تھی کہ اس کی نظر طلعت پر پڑی جو بڑے اطمینان سے انگڑائی لیتی ہوئی ڈوپٹہ سنبھالتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی اور اسے دیکھتے ہی ریشماں کو کچھ یاد آ گیا۔ اور اس کے ماتھے پر ایک ہلکی سی سلوٹ پڑ گئی۔ جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ "طلعت باجی! ــــ لو یہ پانی بھائی جان کو دے آؤ، کھانا کھا رہے ہیں۔ یا پھر میرے ساتھ چلو۔ میں رکھ آؤں گی"، اور طلعت کو ہنسی آ گئی۔ لیکن ریشماں کے چہرے پر گھبراہٹ کے بھی کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اسی طرح خوش تھی اور آپ ہی آپ مسکرا رہی تھی۔

"اچھا جا رکھ آ"، طلعت نے ہنستے ہوئے کہا۔ اتنا سننا تھا کہ بس اس کے جسم میں پھر بجلی سی دوڑ گئی اور اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ گلاس لیکر نسیم کے کمرے میں پہونچ گئی ــــ "بس اب اور کچھ نہیں"، انہوں نے ٹافی نکال کر سامنے رکھ دی "لو یہ کھا لو۔ شاباش بڑے کام کی ہے اپنی ریشم"

اور ریشماں نے بڑی مرجھائی ہوئی شکل بناتے ہوئے کہا "میں نہیں لیتی دیجئے گا طلعت باجی کو"۔

"کیوں طلعت کو کیوں"، نسیم نے لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔

"جلتی ہیں جو ــــ" وہ کچھ سمجھ کر چپ ہو گیا اور ریشماں نے سر جھکا کر بڑبڑانا شروع کر دیا۔ "نہ جانے انھیں یہ میرا ٹافی کھانا کیوں برا لگتا ہے وہ بھی کیا روز روز کھاتی ہوں اب انھیں کھلا دیا کیجئے میں نہیں کھاؤں گی۔ اب جو آپ کا کام کریں گی"۔ ریشماں کو سچ مچ غصہ آنے لگا تھا۔ اسے کل کی بھولی بسری بات یاد آ گئی تھی۔

"اچھا خیر ــــ لو یہ کھا لو ــــ میرے کہنے سے پھر دیکھا جائے گا" ــــ اس نے مسکرا کر ٹافی منہ میں ڈال لی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"مت بتانا طلعت کو ــــ"

"اچھی بات ہے"، اس نے کچھ سوچ کر کہا اور آج پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ طلعت سے ہر بات نہ بتانی چاہئے۔ اور اس نے ٹافی کو منہ میں کچھ اس طرح رکھ لیا جیسے کوئی راز منہ میں بند کر لیا ہو اور تھوڑی دیر کیلئے تو غیر ارادی طور پر اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ نسیم سے بھی کوئی راز رکھے ہوئے ہو۔ اس نے ٹافی کو اور زندگی سے ہونٹوں میں بھینچ لیا۔ اور ایک بار اچھل کر وہ ریشماں ہو گئی ــــ ادھر بیگم نے جو اسے نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو انھیں جیسے کچھ یاد آ گیا انھوں نے آہستہ سے کہا "ارے ریشماں! تجھ سے کیا کہا تھا کہ مت جایا کر نسیم کے کمرے میں اور تو اچھل کر پہنچ جاتی ہے۔ ذرا بھی تو تجھے ہوش نہیں"،

"ارے بھابی بس کھانا ہی تو دینے گئی تھی۔ طلعت باجی اپنے کمرے میں تھیں۔ بھائی جان کو کالج جانے میں دیر ہو رہی تھی انھوں نے مجھے آواز دی اور میں چلی گئی۔ ــــ اور ہاں جو پانی کے لئے طلعت باجی سے کہا تو انھوں نے کہدیا کہ جا تو ہی دے آ ــــ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں"، ریشماں کافی سے زیادہ زور سے بول رہی تھی۔ چنانچہ بیگم بھی ایک طرف خاموش ہو کر چل دیں یہ سوچتی ہوئی ــــ "ابھی نادان ہے ذرا بڑی ہو گی تو خود ہی یہ حرکتیں چھوڑ دیگی۔ سن کا تقاضہ ہے ــــ"

مگر جب نسیم نے اپنی شادی کی بات پر صاف صاف کہدیا کہ وہ کہیں شادی نہ کریگا اور اگر کریگا تو اسی کے پالک لڑکی سے جس کا نام ریشماں ہے تو جیسے سارے گھر کی انسان دشمنی دعل کر صاف ہو گئی۔ وہ اپنی ریشماں جس کا ابھی تھوڑی دیر پہلے کون رکھا تھا جو بیچاری تھی۔ اب ایکدم پوری حرافہ ہو گئی جس نے میرے سارے نسیم پر کوئی جادو کر دیا تھا ــــ اور بیگم یہی کہتی رہیں کہ ان کا نسیم تو بالکل معصوم ہے اس پر اسی چھوکری نے کچھ کر دیا ہے ــــ اور پھر کوئی شکل صورت ہو تو کوئی بات بھی ہے کہ چلو لڑکے کا ایک پری چہرہ آ گیا مگر وہ تو بھتنی ہے بھتنی ــــ رنگ گورا ہے تو کیا جیسے کوڑھ کے داغ، آنکھیں بڑی بڑی کالی کالی جنھیں دیکھ کر دور ہی سے ڈر لگے۔ کون اسکو خوبصورت کہے گا جسم پر کچی کچی کھال جیسے کسی نے مڑھ کر ابھی رکھ دیا ہو اور تیل کی مالش سے خوب چمکا دیا ہو۔ کوئی صورت میں صورت ہے کسی طرح برداشت کر بھی لیتے مگر وہ تو لے پالک تھی۔ ہڈی کا داغ کہیں چھوٹ سکتا ہے، اب اس سے بیاہ کر کے کون اپنی ہڈی میں بل ڈالے۔ کوئی لڑکا اور ہو تو یہی کچھ تسلی ہو کہ چلو خاندان تو چلا گا اور بیگم نے بھی طے کر لیا کہ جو بھی ہو گا اپنے لاڈلے کی شادی وہ لے پالک سے نہیں کریں گی۔ ..... دو چار ہفتہ میں کورنے ترسے، سارے گھر میں یہی باتیں ہونے لگیں ریشماں بھی اسی گھر میں رہتی تھی اس سے کوئی کہاں چھپاتا۔ اس نے بھی الٹی اڑتی سنی ہی لی کہ معاملہ کیا ہے ــــ "ہائے اللہ" اس کا داغ ٹھن سے رہ گیا۔ آخر یہ حادثہ ہے!

بھائی جان کو بچے سلھائے یہ کیا ہو گیا، لیکن پھر اس کو جیسے کوئی سکون مل گیا ـــــ اور ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نسیم نے اسے آواز دی۔

"اری رشیم ذرا ادھر تو سن" آواز سنتے ہی جیسے اسکے سارے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ بدن کا تو رواں رواں کھڑا ہو گیا جیسے کوئی ہرن شکاری کی چاپ سے اپنے کان کھڑے کر لے، مگر اسکو آواز پہچاننے کیلئے اپنے کان کھڑے کرنے کی ضرورت تھی وہاں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ اسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا، فرش پر رکھا چھن سے آواز آئی ـــ کیسی آواز، اس کے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، پھر اس نے دوسرا پاؤں اٹھایا اور بہت آہستہ سے فرش پر رکھا مگر فرش تو جیسے چینی کا ہو گیا تھا اس نے گھبرا کر پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے سارے گھر کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں ـــــ اور سب چھپ چھپ کر دروازوں کی اوٹ میں سے جھانک رہے تھے۔ جیسے کسی نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ نسیم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

"کیا ہے بھائی ـــــ جان" اس سے بھائی جان بھی تو ٹھیک سے نہیں کہا گیا۔

"اری رشیماں ـــــ کیا بات ہے تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے"۔

مگر وہ کیا بتاتی ـــــ اس کو تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں گھبرائی ہوئی تھی

"کوئی بات بھی بتاتے ہو یا جاؤں"۔

"ارے آج کیا ہو گیا ہے رشیم بی"

"تم کام بتاتے ہو یا پھر جاؤں ـــــ بھابی اور طلعت باجی نہ جانے کیا ....."

"بھابی اور طلعت باجی ـــــ کیا بات ہوئی"

"کچھ بھی تو نہیں ـــــ اچھا میں جاتی ہوں"۔ اور یہ کہکر وہ مڑی ہی تھی کہ نسیم نے روک لیا۔

"اچھا لو ـــــ یہ ٹافی تو کھا لو" ـــــ "نہیں ـــــ میں نہیں لیتی یہ ٹافی کوئی دیکھ لے گا"

"کوئی دیکھ لے گا تو کیا کرے گا۔ کوئی کسی کی چوری ہے تجھے آج ہو کیا گیا ہے رشیماں"

"اوہ" رشیماں نے بھوں سکوڑتے ہوئے کہا پھر کچھ ایسی شکل بنائی جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہی ہو "بھائی جان آپ بھی بڑے بیوقوف ہیں جو اتنی سی بات نہیں سمجھتے" مگر پھر اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ ٹافی لے لی اور کمرے سے باہر نکل گئی اور اتفاق کی بات بیگم دوسرے کمرے سے نکل رہی تھیں۔ انھوں نے جو رشیماں کو نسیم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تو ٹھٹک گئیں ـــــ "اری رشیماں کی بچی.. کیا کر رہی تھی کمرے میں" اور رشیماں کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ـــ وہ تو نہیں بوجھ کر رہ گئی ـــ اس نے ٹافی کو خوب اچھی طرح مٹھی میں بھینچ لیا اور اسکی زبان سے تو جیسے کوئی لفظ ہی نہیں نکل رہا تھا۔ اسکی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے

"جھاڑو دینے گئی تھی کمرے میں" ـــــ "ایسے دی جاتی ہے جھاڑو ـــ بات منہ صاف، دھوں کا نشان نہیں ... چپہ فرش پہ جھاڑو بھی سمائی نہ دے۔ ایسے دیتا ہو گا کوئی جھاڑو ..... دیکھو رشیماں میں صاف صاف کہے دے رہی ہوں اگر تمکو اس گھر میں رہنا ہے تو عزت کے کیساتھ رہو۔ یہ سب چال فریب نہیں چلیں گے جس ہانڈی میں کھانا اس میں چھید کرنا۔ ڈائن بھی دس گھر چھوڑ کر کھاتی ہے .... تجھے تو نام کو بھی شرم لاج نہیں۔ اچھے بھلے لڑکے کو اندھا بنا کے رکھ دیا ہے اس حرافہ نے ..... اور تیرا بھی کیا قصور میری تھی جو میں نے پاؤں کی جوتی کو پاؤں میں نہیں رکھا .... ورنہ تیری مجال تھی جو آنکھ اٹھا کر دیکھتی میرے لال کی طرف ـــ بھول گئی اپنی اوقات ..... بیگم کا غصہ اور بڑھتا اگر طلعت اسکو ہٹا کر ایک طرف نہ لے جاتی۔

لیکن رشیماں سر جھکائے اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے بات کی گرفت سے ٹافی چھوٹ گئی ..... وہ بے خیالی میں اسے پیروں سے روندنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ کسی کے بولنے کا انتظار کرتی رہی جو اسکی طرف سے بولے گا مگر کوئی آواز نہیں سنائی دی وہ یہ سوچتی ہی رہ گئی کہ اب بھائی جان ضرور بولیں گے ..... اسکی طرف سے وہ لڑیں گے۔ اور جلدی سے کمرے سے نکل کر ایک ٹافی اس کے منہ میں ٹھونس دینگے ..... اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہیں گے۔

"اری رشیماں! تو مت گھبرا، میں جو موجود ہوں ..... تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ..... میں نے تو طے کر لیا ہے کہ تجھ سے شادی کروں گا چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے"

مگر بھائی جان نے کچھ بھی تو نہیں کہا۔ البتہ اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال بڑی تیزی کے ساتھ آیا کہ وہ ڈائن ہے ـــــ حرافہ ہے ـــــ پاؤں کی جوتی ہے ـــــ لے پالک ہے ـــــ ہاں ہاں لے پالک ـــــ!

لاشیں

گوربچن سنگھ

رات کی خوفناک تاریکی موت کا سیاہ کفن بن کر اس چھوٹے سے شہر پر چھا چکی تھی۔ لیکن اس تاریکی میں بھی جلتے ہوئے گھروں اور سلگتی ہوئی عمارتوں کی آگ کسی پھٹنے والے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کیطرح چمکتی دکھائی دے رہی ہے۔ چاروں طرف ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی وہاں پہرہ دینے والے فوجیوں کے بوٹوں کی چاپ سڑک کی چھاتی پر ہتھوڑوں کی چوٹ کیطرح گونجنے لگتی۔ کبھی کسی رونے والے کتے کی آواز اس ویران ماحول میں ایک کپکپی سی پیدا کر دیتی تھی۔ رہ رہ کر شہر کے کسی گوشے سے گولیوں کے چھوٹنے کی آواز آتی اور اس کے بعد وہی ہولناک سناٹا ساری فضا پر مسلط ہو جاتا۔

بوڑھی کوموا اپنے منہدم مکان کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں، جو کسی طرح بموں کے نشانے سے بچ گئی تھی، بیٹی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کے اکلوتے لڑکے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ چوٹ کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔ کوٹھری میں گھنا اندھیرا ہونیکی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کی لاش اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

موت کے وقت اس عظیم سفر کی آخری گھڑیوں میں بھی جب اس کے پیارے بیٹے نے اسکی گود میں سر رکھکر کراہتے ہوئے اپنی جان دی تھی۔ تب بھی وہ اس کا منہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ اس کا وہ لال، جسے وہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ آج ظالم موت کا تیروں کیطرح اندھیرے میں سب کی نظروں سے چھپ کر اس کی زندگی چرا لے گئی تھی اور وہ کس قدر مجبور تھی..... اسکے اتنے قریب بیٹھ کر بھی وہ اسکی حفاظت نہ کر سکی..... اسے ایک نظر دیکھ بھی نہ سکی..... بوڑھی کا دل بھر آیا۔ اور اسکی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے..... اُف..... کیسی پر درد موت تھی غریب کی..... اور اس حادثہ اور موت سے پہلے..... ہاں..... اسے اپنے بیٹے کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو کل اس نے شہر کے حفاظتی مورچے پر جاتے ہوئے اس سے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ماں آج تاجروں کے جانبازوں نے اپنے سر پر موت کا کفن باندھ لیا ہے۔ آج ہمیں امریکی دندوں سے اپنی حفاظت کرنی ہے آج ہماری عزت خطرے میں ہے۔ ہماری جان اور ہمارا ملک اور تمدن سب خطرہ میں ہے۔ آج ظالم ہمارے خون سے اپنی پیاس بجھانے پر تلا ہوا ہے۔ ہمارے معصوم بچے، کمزور بوڑھے..... عورت اور مرد سب ان کے بموں اور گولیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم جیتے جی انھیں شہر میں داخل نہیں ہونے دینگے اور اگر اس جنگ میں میں اور دوسرے ساتھی قربان ہو گئے، تو گویا ہماری زندگی کا اصل مقصد پورا ہو چکا ہوگا..... " وہ سوچنے لگی۔ جو مٹی اسطرح اپنے دیس کی آزادی کے لئے قربان ہو گیا۔ میں بیکار اس کے سرہانے بیٹھکر یوں آنسو بہا رہی ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہئے۔ اور اس نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ ڈالے۔

لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوا کہ اسکے بیٹے کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ اور رفتہ رفتہ گزرنے والات کی یہ گھڑیاں، ان کے ساتھ بڑھنے والی ٹھنڈک لاش کو اور بھی بگاڑتی جا رہی ہے۔ لاش اکڑ کر کچھ عجیب سی ہو گئی ہے..... اس نے ہاتھ سے چھو کر لاش کی حالت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اسی وقت کوٹھری کے باہر ایک کتا چوں چوں کرتا ہوا ایک سخت نر دردوں سے بھونک اٹھا۔ وہ کتا انھیں کا تھا جو ایک دیوار تلے دب کر زخم کھا چکا تھا۔ لیکن اب لنگڑا کر چلتا تھا۔ وہ بے زبان جانور اب بھی اس کرکراتی ہوئی سردی میں گھر کے باہر کھڑا گویا پہرہ دے رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ فرد ہی لیڈر کی لاش کے قریب کھڑا ہوگا۔ لیڈر جو اسے بہت پیار کرتی تھی۔ جو اسوقت ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ تلے موت کی گہری نیند سو رہی تھی دشمن کی گولیوں نے اس معصوم لڑکی کا سارا جسم چھید کر رکھ دیا تھا۔ اور اب وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس اس طرح پڑی تھی جیسے کوئی ذبح کی ہوئی بھیڑ یا بکری جسے قصابوں نے اذیت دے دے کر مارا ہو..... اُف کل کی رات کتنی خوفناک تھی..... جب غنیم کی فوج سارے شہر پر آگ برساتی ہوئی شمالیں تانے داخل ہو رہی تھی وہ رات اس شہر کی لڑائی کی آخری رات تھی جب ملک کے نوجوان سپاہیوں نے اپنے سر پر موت کا کفن باندھ لیا تھا۔

اس کا جوان بیٹا۔ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ، شہر کی حفاظت کرتا ہوا گھائل ہو گیا تھا جب شہر پر دشمنوں کا دباؤ بڑھ گیا اور کئی حصوں سے وہ شہر میں داخل ہو چکے تو لڑنے والے شہری سپاہیوں کے کچھ دستے پیچھے ہٹ کر ایک نیا حفاظتی مورچہ سنبھال رہے تھے۔ شہر کی عورتیں اور جوان لڑکیاں خود ہتھیار لے کر غنیم کی بڑھتی ہوئی فوج کے دباؤ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے گولیاں کھا رہی تھیں۔ تاکہ اس عرصہ میں پیچھے ہٹنے والی فوج آسانی سے اپنے پچھلے مورچوں کو سنبھال لے۔

لیلا نے اپنے بھائی کی بندوق لیکر متواتر چھ گھنٹوں تک دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ جب وہ درجنوں کی تعداد میں بھوکے بھیڑیوں کیطرح ٹوٹ پڑے اور اسکے گولیوں کی جھڑی لگا دی۔ تب وہ مقابلہ کرتی ہوئی کسی درخت کے کٹے ہوئے تنے کیطرح لڑکھڑا کر نیچے گر پڑی تھی۔ وہ آزاد دیش کی ایک معصوم لڑکی۔ جو قوم کے سرسبز

اور شاداب کھیت کا ایک ہرا بھرا پودہ تھا۔ پھل اور پھول بھی

اس کی آنکھوں کے سامنے کل کی اس بھیانک رات کی تصویر کھنچ گئی۔ جب کچھ نوجی اسکے بیٹے کے نیم مردہ جسم کو سڑک پر سے اٹھا کر لائے تھے۔ انھوں نے کہا تھا "ماں، ہمیں دکھ ہے ہمارے ہزاروں ساتھیوں کیطرح یہ ساتھی بھی آج ہم سے بچھڑ رہا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں اس بات کی خوشی بھی ہے کہ یہ ہم سب سے پہلے اپنا فرض نبھانے میں کامیاب رہا۔ آج اس نے دھرتی ماتا کو سب سے پہلے اپنی قربانی بھینٹ کی ہم تو پیچھے پٹ رہے ہیں اپنے ان مورچوں کو سنبھالنے کیلئے جہاں دشمن کی آخری قبر کھودی جائیگی جہاں جھوٹ اور سچائی کی آخری جنگ ہوگی لو سنبھالو دیس کی اس امانت کو ادا سکی حفاظت کرو تاکہ یہ اطمینان سے مر سکے کہیں دشمنوں کے ہاتھ پڑ کر اسکی توہین نہ ہو،

اور تب لیلا نے کہا تھا۔ "جاؤ میرے بھائیو! تم اپنے نشانے کیطرف بڑھکر فتح حاصل کرو۔ ہم تو دھرتی کی امانت کو اپنی آتما سمجھتے ہیں۔ ہم تب تک اس امانت کی حفاظت کرتے رہینگے جب تک کہ ہماری جان میں جان ہے ..... " لیلا نے متواتر چھ گھنٹوں تک لڑنے کے بعد اپنی جان دی تھی اور اسکے کچھ ہی گھنٹے پہلے اس کے بھائی نے ٹیکیاں لے لیکر اپنی جان دی تھی۔ وہ مرنے سے پہلے پانی مانگ رہا تھا۔ لیکن اسکے گھر میں پانی کی ایک بوند تک نہیں تھی جو وہ اپنے بیٹے کے منہ میں ٹپکا سکتی۔ اس نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی تھی .....

ایسی حالت میں بھی آخری مرتبہ اسکی زبان سے نکلا تھا..... "کوریا آزاد رہے گا"..... اپنے بیٹے کے ان آخری الفاظ کو یاد کرتی ہوئی خاموش اور مغموم مٹی وہ اس چھوٹی سی کوٹھری کی تاریکی کو گھورتی رہی اسکے بیٹے کے وہ الفاظ گویا ابھی اس چھوٹی سی کوٹھری میں گونج رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی..... کہاں ہے کوریا۔ کہاں ہے کوریا کی شان۔ اسکی شاندار روایتیں۔ اور اسکی عزت کہاں ہے اسکا امن..... اسکی آزادی..... اس دھرتی پر گونجنے والے آزادی کے گیت..... ان کے ترانے؟ اسے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُسکے کان سوائے بموں کے دھماکوں کے اور کچھ بھی نہیں سن رہے تھے۔ رہ رہکر اسکی نظریں تاریکی کے دبیز پردوں سے ٹکرا کر آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھیں مگر اس تاریکی کے پردے کے پیچھے وہ کچھ بھی دیکھ رہی تھی تو وہ تھی کوریا کے عوام کی قربانی بوڑھوں، بیوہ عورتوں اور مردوں کی قربانیاں۔ ہمارا گھر جلی حالت کھنڈروں سے بھی بدتر تھی۔ وہ کوریا کی لٹی ہوئی عزت دیکھ رہی تھی۔ ٹھری گلا لاشیں دیکھ رہی تھی۔ غلامی کی بیڑیاں دیکھ رہی تھی۔ سنگینیں۔ توپیں اور بندوقیں اور آگ۔ وہ ظلم اور ظالم کا بھیانک روپ دیکھ رہی تھی۔ کچھ سال اس نے جاپانیوں کی غلامی میں رہکر اپنی بربادی کا یہ تماشہ دیکھا اور آج امریکہ کی اس اندھیر گردی میں وہ اپنی تباہی دیکھ رہی تھی۔ آج ڈالر کی شیطان اپنی خونی زبان نکالے، منہ کھولے سارے کوریا کے لوگوں کو نگل جانیکے لئے تیار تھا وہ اس کے بیٹے کو نگل چکا تھا۔ اسکی بیٹی کو نگل چکا تھا۔ اس کا ماضی رہ رہکر اسکے ذہن میں ابھر آتا تھا۔ اب اس کا بیٹا اس کے پاس نہیں تھا۔ اسکی بیٹی اسکے پاس نہیں تھی۔ گھر کا صرف ایک کتا رہ گیا تھا جو باہر بیٹھا کبھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتا تھا۔ ..... یکایک وہ کتا زور سے بھونک اٹھا۔ اس کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ تلخ اور تیز تھی وہ سمجھ نہ سکی کہ بات کیا تھی۔ لیکن کوئی خاص بات ضرور تھی۔ مُنے ٹک ہوا... شاید کوئی دوسرا بھوکا کاکا لیلا کی لاش خراب کر رہا ہے اس لئے اسکا اپنا کتا بھونک رہا ہے فوراً ہی اس نے دیکھا دونوں کے جھگڑنے کی آواز سنی۔ وہ پھرتی سے اٹھکھڑی ہوئی۔ متواتر کئی گھنٹوں سے ایک ہی جگہ پر چم کر بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کا سارا جسم سن پڑ گیا تھا۔ اٹھتے ہی اس کے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں سامنے آنے لگے وہ ڈولتی ڈگمگاتی آگے بڑھی اس نے بڑی مشکلوں سے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر دروازہ کھولا۔ باہر جھانک کر اس نے دیکھا۔ اندھیرا۔ تاریکی۔ بالکل تاریکی اور ہولناک سناٹا... ! گویا سنگدل موت کا سایہ چار سو پھیلا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ قدرت کی تاریکی کو..... سامراج کی تاریکی کو..... اس نے دیکھا دونوں کتے جھگڑتے ہوئے گھر سے دور..... سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ چکے تھے۔ اور لیلا کی لاش ..... اس ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں اسی طرح جھکی پڑی تھی جیسے وہ کسی دشمن کی گھات میں نشانہ باندھے ہوئے ہو وہ اپنی بیٹی کی اس لاش کیطرف دیکھتی رہی جسے نو ماہ تک اُسنے اپنے پیٹ میں رکھا تھا جسے جنم دیکر اس نے اپنی چھاتی کا دودھ پلایا تھا جسے پال پوس کر اس نے جوان کیا تھا آج وہ مرحوم رودلا کی دیش کیلئے اپنی جان دیکر آرام کی گہری نیند سو رہی تھی ماں کا جی چاہا وہ آگے بڑھکر اسکا منہ چوم لے۔ اور اسے کوٹھری میں لے آئے۔ وہ ڈولتی ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھی..... ! یکایک ایک طرف سے چمچماتی ہوئی روشنی اسکے چہرے پر پڑی اسکی آنکھیں چندھیا گئیں وہ پھر بھی تیزی سے آگے بڑھی اور اپنی بیٹی کی لاش اٹھانے کی کوشش کرنے لگی وہ روشنی اسکا پیچھا کرتی ہوئی وہاں بھی چمک اٹھی۔ اس نے ہوشیاری سے لڑکی کی لاش اٹھائی اور پھرتی سے کوٹھری کیطرف بڑھنے لگی کوٹھری میں پہونچ کر اس نے کواڑ اندر سے بند کرنے چاہے اسکا دل بڑی سرعت سے دھڑک رہا تھا۔ یہ روشنی ..... یہ شعاعیں ..... وہ خوف محسوس کر رہی تھی..... اور سڑک پر دوڑنے والے فوجیوں کے بوٹوں کی چاپ سنکر وہ سہم گئی..... یہ دشمن کے بوٹوں کی چاپ تھی وہ درندے کچھ ہی لمحوں میں اس کے دروازہ تک پہونچ چکے تھے اور آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے بڑی مشکل سے وہ انکی زبان سمجھ سکی۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ "ایک دشمن یہاں چھپا بیٹھا ہے۔ آؤ پٹرول چھڑک کر سارے گھر کو آگ لگا دیں ..... " دوسرا کہنے لگا "ہم نے دیکھا۔ وہ ایک عورت تھی... نہیں دو عورتیں..... ہیں دیکھکر وہ یہاں چھپ گئیں تھیں۔ دشمن ہوتا تو وار کرنے سے نہ چوکتا۔ چلو مزا ہے آج کی رات یہیں کٹے ..... " اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ناظم حکمت

موت

کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید
جانتا ہوں جب میں تھا سویا ہوا
خواب کی دنیا میں تھا کھویا ہوا
جیل کی اس سرد و تیرہ کوٹھری میں بے خطر
آ گئے تم سامنے والی وہ کھڑکی پھاند کر
جانتا ہوں تم نے وہ شیشی دوا والی اٹھائی تک نہیں
ارغوانی گولیوں والی وہ ڈبیا بھی ہلائی تک نہیں
اپنے ہاتھوں میں لئے اک دوسرے کے ہاتھ کو
آ گئے تم میرے بستر کے سرہانے دوستو
ہے تمھارے سب کے چہروں پر ستاروں کی چمک
لالہ زاروں کا تبسم، ماہ پاروں کی چمک!
کیا نہیں بیٹھو گے تم اے میرے پیارے دوستو
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید

کیا یہ کم دلچسپ ہے اے ساتھیو!
میں سمجھتا تھا کہ تم مرحوم ہو
چونکہ جنت اور جہنم پر نہیں میرا یقیں
اور خدا سے بھی مری کوئی شناسائی نہیں
اس لئے میں سوچتا تھا زندگی میں بارہا
پیش اک سگریٹ بھی تم لوگوں کو کب میں کر سکا
کیا یہ کم دلچسپ ہے اے ساتھیو!
میں سمجھتا تھا کہ تم مرحوم ہو

اور تم کھڑکی کے رستے کوٹھری میں آ گئے
میری آنکھوں پر غبار نور بن کر چھا گئے
اس لئے کیا اب نہیں بیٹھو گے میرے دوستو!
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید

ہاشم! اے بھائی مرے! اعثمان کے لختِ جگر
کس لئے ہو تم زبوں حال و پریشاں اس قدر
سخت حیرت ناک ہے یہ واقعی
کھو چکے تھے تم تو اپنی زندگی
سنگدل رنج و مصائب کی اندھیری راہ میں
شہر استنبول کی شاداب بندرگاہ میں
آہ وہ ظالم جہاز
فتنہ ساماں، فتنہ ساز
جس پہ ہاشم کوئلے ڈھوتے ہوئے
پاؤں پھسلا۔ تم اچانک گر پڑے
ہائے کتنے روح فرسا تھے وہ لمحاتِ ملال
خون سے بھیگا ہوا تھا جب تمھارا بال بال
ہولے ہولے ڈوبتی جاتی تھی نبضِ زندگی
کون جانے تھی تمھیں کتنی اذیت اس گھڑی
اس لئے تم کیوں کھڑے ہو بیٹھ جاؤ میرے پاس
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید

اور تم یعقوب! اے آلامِ دنیا کے شکار

اے پہاڑی گاؤں کے باسی ! اے میرے یارِ غار
میں سمجھتا تھا کہ تم بھی مر چکے ہو حلقۂ غم توڑ کر
اپنے بچوں کیلئے ورثے میں آفاتِ زمانہ چھوڑ کر
گرمیوں کی دوپہر کو ایک گورستان میں
ہم سبھوں نے مل کے دفنایا نہیں تھا کیا تمھیں ؟
لیکن اے یعقوب ! تم زندہ ہو اور زندہ رہو
میں خلوصِ دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید

اور تم احمد جلیل !
اے ادیبِ بے عدیل
میرے ساتھی ! میں نے دیکھا اپنی آنکھوں سے تمھیں مرتے ہوئے
اور لوگوں کو تمھاری لاش کو تابوت میں دھرتے ہوئے
اور شدّت سے مجھے احساس یہ ہونے لگا
اپنے قد سے تو تمھیں تابوت بھی چھوٹا ملا
نیچے رکھ دو چھوڑتے ہو میری اس بوتل کو کیوں
ہیں تمھاری وہ بُری عادات اب تک جوں کی توں
تشہ آور شے نہیں
یہ دوا ہے مے نہیں
زندگی کی تلخیوں کو بھول جانے کے لئے
درد کی بڑھتی ہوئی شدت گھٹانے کے لئے
چاک دل سیتے تھے تم
کس قدر پیتے تھے تم
مار ڈالا تھا تمھیں تو یورشِ آلام نے
لیکن اب زندہ کھڑے ہو تم بھی میرے سامنے
آؤ آؤ میرے پاس آؤ مرے پیارے جلیل
میں خلوص دل سے کہتا ہوں تمھیں خوش آمدید

اور اپنے شعر میں با افتخار و باجلال
کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال
"عادل و منصف ہے کتنی موت کی خونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر"

تم اے ہاشم ! کس لئے حیران ہو
کیا نہیں تم جانتے اس شاہ کو
چند سکوں ۔ چند لقموں کے لئے
مر گیا جو کوئلے ڈھوتے ہوئے

اور اپنے شعر میں با افتخار و باجلال
کہہ گیا ہے فارسی کا شاعرِ دیرینہ سال
"عادل و منصف ہے کتنی موت کی خونیں نظر
ایک ہی سا وار کرتی ہے گدا و شاہ پر
او تم یعقوب ! اے بھائی مرے
آج یوں خندہ بہ لب ہو کس لئے
کب ہوئے تھے شادماں تم زندگی میں اس طرح
مسکرائے تھے کہاں تم زندگی میں اس طرح

اور تم احمد جلیل
اے ادیبِ بے عدیل
چھوڑ دو بوتل دوا کی چھوڑ دو
اپنے غصّے کی کلائی موڑ دو
اب یہ غصّہ کام آ سکتا نہیں !
کیونکہ میرے دوست مجھکو ہے یقیں
عادل و منصف ہے ظالم موت کی خونیں نظر
تم تقاضہ کر رہے ہو میرے ساتھی کیوں مگر
"کس لئے تخصیص ہے یہ موت ہی کے واسطے
زندگی بھی خوگرِ انصاف ہونی چاہیئے"
اور اپنے شعر ــــ چھوڑو خیر اب یہ داستاں
یہ مگر کیا ؟ جا رہے ہو سب کے سب اب تم کہاں
مجھ سے کیا ناراض ہو اے دوستو
جا رہے ہو کیوں رکو اے دوستو

(ترجمہ : نریش کمار شاد)

جائزے

فکر تونسوی

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

(مندرجہ ذیل کتب تبصرے کے لئے موصول ہو چکی ہیں)

(۱) پرانے خدا (کرشن چندر) مکتبہ جامعہ دہلی
(۲) نئی بیماری (مہندر ناتھ) "
(۳) گاندھی خاں بادشاہ کے دیس میں "
(۴) آپ کا بچہ (ڈاکٹر مونگا) "
(۵) اگ کے اس پار (فارغ بخاری۔ رضا ہمدانی) گوشہ ادب لاہور
(۶) کاروان منزل (گوپی ناتھ امن)
(۷) کلیات اکبر الہ آبادی۔ بزم اکبر کراچی
(۸) زندگی کے سائے (پرل بک) لاجپت رائے اینڈ سنز
(۹) شیکسپیر کی کہانیاں (ترجمہ سردار جعفری) کتب پبلشرز بمبئی
(۱۰) اردو (جگن ناتھ آزاد) دہلی کتاب گھر

جارج برنارڈ شا ــــــ مصنف و مرتب:۔ ظ انصاری

پبلشرز:۔ مکتبہ برہان، اردو بازار، دہلی
قیمت:۔ تین روپیہ آٹھ آنے۔ صفحات:۔ دو سو اسی (۲۸۰)

جارج برنارڈ شا انگلستان کا وہ نامور مفکر ادیب ہے جو گذشتہ پچاس برس کی ادبی تاریخ میں ایک تہلکہ مچا دینے والی شخصیت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس عظیم فنکار نے بالخصوص فن ڈرامہ میں اور خیالات و نظریات کے بے باکانہ اظہار میں دنیا کے فنکاروں کو تاریخ حیات کے ایک نئے موڑ سے روشناس کرایا ہے اور اس پر خود عمل پیرا ہو کر خیال و عمل کا یادگار سنگم تعمیر کیا ہے۔

کتاب کے ذریعہ ظ انصاری صاحب نے اردو داں عوام کو جارج برنارڈ شا کے ساتھ تعارف کرانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ کتاب میں شا کی مختصر زندگی، اس کے ادبی ارتقا، اس کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے حیاتیاتی نظریوں، اس کے ڈرامے، ناول اور دوسری تحریروں کی تلخیص میں بڑے دلآویز اور جامع انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ پوری کتاب میں ایک عنصر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ شا موجودہ سامراجی نظام اور استحصال کا سخت مخالف ہے عملی زندگی میں بھی اور علمی زندگی میں بھی۔ اگرچہ وہ اس نظام کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے طریقہ کے متعلق آخری دم تک کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچ سکا۔ مگر اُسے مارکسی فلسفہ حیات سے جو گہری محبت تھی۔ اور انگلستان کی پارلیمنٹری جمہوریت کے کھوکھلے پن سے جس قدر نفرت۔ اس کے نتیجہ کے طور پر اسکے فن میں ہمیشہ تیز طرب اور جذبہ کار فرما رہا کہ عوام کا معیار زندگی بلند ہونا چاہیئے۔ اور سامراجیت اور سرمایہ داری کے اس لٹیرے نظام کو تباہ کر دینا چاہیئے۔

میرے خیال میں ظ انصاری صاحب نے اس پہلو پر زور دیکر عوامی تحریکوں اور خود شا کے ساتھ مخلصانہ انصاف کیا ہے اور اب (اگر حالات نے بہتر اور ایماندارانہ رُخ اختیار کیا) جب بھی کبھی جارج برنارڈ شا کا اصلی کام یعنی اسکے ڈرامے ہمارے اردو میں منتقل کئے گئے اور عوام تک پہنچے تو اسوقت ظ انصاری صاحب کی یہ کتاب انکے لئے (شا) کو سمجھنے میں بڑی معاون ثابت ہوگی۔ کتابت، طباعت خاصی ہے۔ برنارڈ شا کی تصویر کی عدم موجودگی بُری طرح کھٹکتی ہے۔

نالہ پابند نے ــــ مصنف:۔ اختر انصاری اکبرآبادی۔ قیمت دو روپیہ

مبصر:۔ حلقۂ ارباب فکر ۳ کاشانۂ حمید، رتن تلاؤ۔ کراچی۔

"نالہ پابند نے" اختر انصاری اکبرآبادی کی اسّی غزلوں اور نو گیتوں کا شعری مجموعہ ہے۔ مجموعی طور پر ان کا کلام قدیم و جدید رجحانات کا ایک ایسا سنگم ہے جسے پرانی شاعری کے رچے ہوئے سادہ۔ لطیف اور شائستہ اسلوب اور نئی شاعری کے صالح اور سلجھے ہوئے تفکر نے بہت حد تک استحکام عطا کی ہے۔ اس سنگم کی بنیادیں اور بھی استوار ہو جاتیں اور اسکی تحکامت میں مزید فنی توازن پیدا ہو جاتا اگر اختر انصاری صاحب اپنی غزلوں کو پرانی شاعری کے ان نظریات سے شعوری طور پر بچانے کی کوشش کرتے جن کے ڈانڈے بالآخر زندگی کی گنجلک اور منفی قدروں سے ملتے ہیں۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے انکی شمولیت مجموعہ کی ادبی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کا باعث نہیں بن سکی کیونکہ ان میں نہ تو زندگی اور سماج کی کسی خارجی حقیقت کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور نہ انداز بیان کی اس گمبھیرتا اور گھلاوٹ کی چاشنی نظر آتی ہے جو مصنف کی غزلوں کے بیشتر اشعار کی نمایاں خصوصیت ہے۔

ساتھیوں کا صفحہ

ساتھی،

ہم شاہراہ میں "ساتھیوں کا صفحہ" کے عنوان سے ایک صفحہ جاری کر رہے ہیں تاکہ شاہراہ کے پڑھنے اور لکھنے والے ساتھیوں میں باہمی تعلقات استوار ہوں اور دُور و نزدیک کے ساتھی ذہنی طور سے ایک دوسرے کے قریب تر آسکیں ایک دوسرے کو پہچان سکیں اور باہمی خط و کتابت کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر سکیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل خالی جگہیں پُر کر کے جلد از جلد ہمیں بھجوا دیں تاکہ ہم انھیں سلسلہ وار شاہراہ میں شائع کر سکیں۔

نام .. .. عمر .. ..

پتہ .. ..

زندگی کے متعلق نقطۂ نظر .. ..

.. ..

دلچسپیاں یا مشغلے .. ..

شاہراہ کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچانے کے سلسلہ میں آپ کی سرگرمیاں ..

.. ..

.. ..

"شاہراہ" بند نہ ہوگا

"شاہراہ" کی اقتصادی حالت کے متعلق پڑھ کر صدمہ ہوا۔ شاہراہ ایک ہردلعزیز عوامی رسالہ ہے۔ اگر اس طرح شاہراہ کی آواز بند ہوگئی تو ہمارے لئے انتہائی درجہ دکھ کی بات ہوگی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آج ادب سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص شاہراہ کی آواز بند نہ ہونے دیگا۔ میں عنقریب ہی کچھ خریدار کا چندہ آپ کو بھجوا رہا ہوں۔ چونکہ میں ایک مزدور ہوں اس لئے میں نے اپنے مزدور ساتھیوں کو آپ کی اپیل پڑھ کر سنائی۔ وہ شاہراہ کو بچانے کے لئے اپنا پیٹ کاٹ کر چندہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ شاہراہ کو زندہ رکھنا ہم سب کا قومی فرض ہے۔ آپ ہر ماہ مجھے پانچ پرچے بھجوا دیا کیجئے۔ فروخت کر کے ان کی قیمت بھیجنا نہ کر دیا کروں گا۔ (واحد علی بانگے مسجد نسترن باغ۔ بھوپال)

سیوا میں مبلغ اٹھارہ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال ہیں۔ آپ جن دو اصحاب کو چاہیں سال بھر کے لئے مفت رسالہ جاری کر دیجئے۔ اس کے علاوہ تین اور پتے درج کر رہا ہوں جن کے نام شاہراہ وی پی سے بھیجدیجئے گا۔ میں عنقریب ہی شاہراہ کے اور بھی نئے ساتھی بناؤں گا۔ امید ہے آپ ہمارے شاہراہ کو بچانے اور ترقی دینے میں اور بھی زیادہ مصروف ہوں گے۔ (ہربنس گمبھیر، گمبھیر سوپ فیکٹری، کلکتہ)

فوری طور سے چھ ماہ کے چندے کے ساتھ میرے دوست اندر سنگھ کو، جن کا پتہ درج کر رہا ہوں۔ شاہراہ وی۔ پی سے بھیج دیجئے۔ اور ساتھی بھی بنا رہا ہوں۔ (انور عظیم، رانچی)

شاہراہ ہمارا محبوب رسالہ ہے۔ اس کے ہر صفحہ سے انسانی ہمدردی سے لبریز سماج کی گرم سانسوں کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور پھر ہماری ادبی و کلچرل زندگی کے ہر موڑ پر اس کے فاضلانہ مقالوں، جاندار افسانوں اور نظموں نے نظریاتی ہتھیار سے لیس ہو کر عوامی ذہن و شعور کی ترتیب میں جس جرأت، بیباکی اور سلامت روی کا ثبوت دیا۔ اس کی موجودگی میں کسی علم دوست کے قلم سے سوائے حیرت و احترام کے اور کیا ٹپک سکتا ہے۔

میں اپنے دو دوستوں کے پتے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ انھیں سالانہ خریدار بنا لیجئے اور پرچہ بذریعہ وی پی ارسال کرا دیجئے۔ ہفتہ عشرہ تک دو تین سو کے نام اور بھیجوں گا۔ (سری رام چندر ہوک جرنلسٹ۔ لکشمی بلڈنگ بمبئی ۳)

تین ساتھیوں کے پتے بھیج رہا ہوں۔ ان کا چندہ جاوید انجینیر کراچی کو ارسال کر دیا گیا ہے۔ منی آرڈر کی رسید میں ساتھ منسلک ہیں۔ امید ہے کم سے کم تین چھ خریدار اور بن جائیں گے۔ (شمیم احمد، محلہ ٹورا آباد۔ سیرپور خاص (پاکستان))

شاہراہ کی اقتصادی مجبوریوں کا حال پڑھ کر دکھ ہوا۔ میں اس سلسلہ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں کہ شاہراہ کے زیادہ سے زیادہ ساتھی بناؤں۔ سردست آپ ہر مہینے شاہراہ کی دس کاپیاں مجھے بھجوا دیا کیجئے۔ ہر ماہ پیسے روانہ کر دیا کروں گا۔

(احمد سعدی، نیا بانپورہ سیدپور (پاکستان))

شاہراہ کی اقتصادی حالت کی خبر پڑھ کر دل کو جو تکلیف ہوئی اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ جہاں ترقی پسند ادب اور ان کے معمار تاراج ہیں ترقی پسند ادب کے چاہنے والوں کی حالت بھی کچھ کم دگرگوں نہیں ہے۔ خود مجھے نہ جانے کس جرم کی پاداش میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے اور نہایت تنگ دستی کی حالت میں اپنا گذارہ کر رہا ہوں۔ لیکن شاہراہ کا تحفظ تو ہم سب پر فرض ہے۔ سردست میں ایک شششاہی خریدار مہیا کر رہا ہوں جو ایک پولیس کانسٹیبل کا بیٹا ہے۔ پتہ بھیج رہا ہوں وی پی سے پرچہ روانہ کر دیجئے۔ کوشش جاری رہے گی۔ (خورشید علی بتیاب معرفت خواجہ بدرالدین صاحب کوارٹر نمبر ۱۱۵ حیدرآباد)

میں پوری قوت سے اس بات کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کو ایک سے زائد خریدار دے سکوں۔ فی الحال میں نے اے علی زیدی اخبار والے فاضل نگر لکھنؤ کو ہر ماہ شاہراہ کی پانچ کاپیاں منگانے پر راضی کر لیا ہے۔ آپ ہر ماہ انھیں وی پی سے پانچ کاپیاں بھجوا دیا کریں۔ (نہال جوہری کشمیری محلہ لکھنو)

یہ جان کر دکھ ہوا کہ "شاہراہ" ان دنوں اقتصادی پریشانیوں سے دوچار ہے لیکن میں آپکو دلاسا دلاتا ہوں کہ شاہراہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری آواز ہے۔ محنت کش عوام کی ترجمانی کا بیڑا اٹھانیوالا یہ رسالہ کبھی بند نہیں ہو سکتا ہم سب اسکی بقا کیلئے اپنی طرف سے کوئی بھی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ شاہراہ کا وجود برقرار رکھنے کیلئے ہر ماہ پانچ روپیہ کی حقیر رقم آپکو پہنچا کریگی۔ میں جلد ہی کچھ ساتھیوں کا سالانہ چندہ بھی بھجوا رہا ہوں۔ (منشی زدوش اسسٹنٹ ایڈیٹر "خدمت" سری نگر)

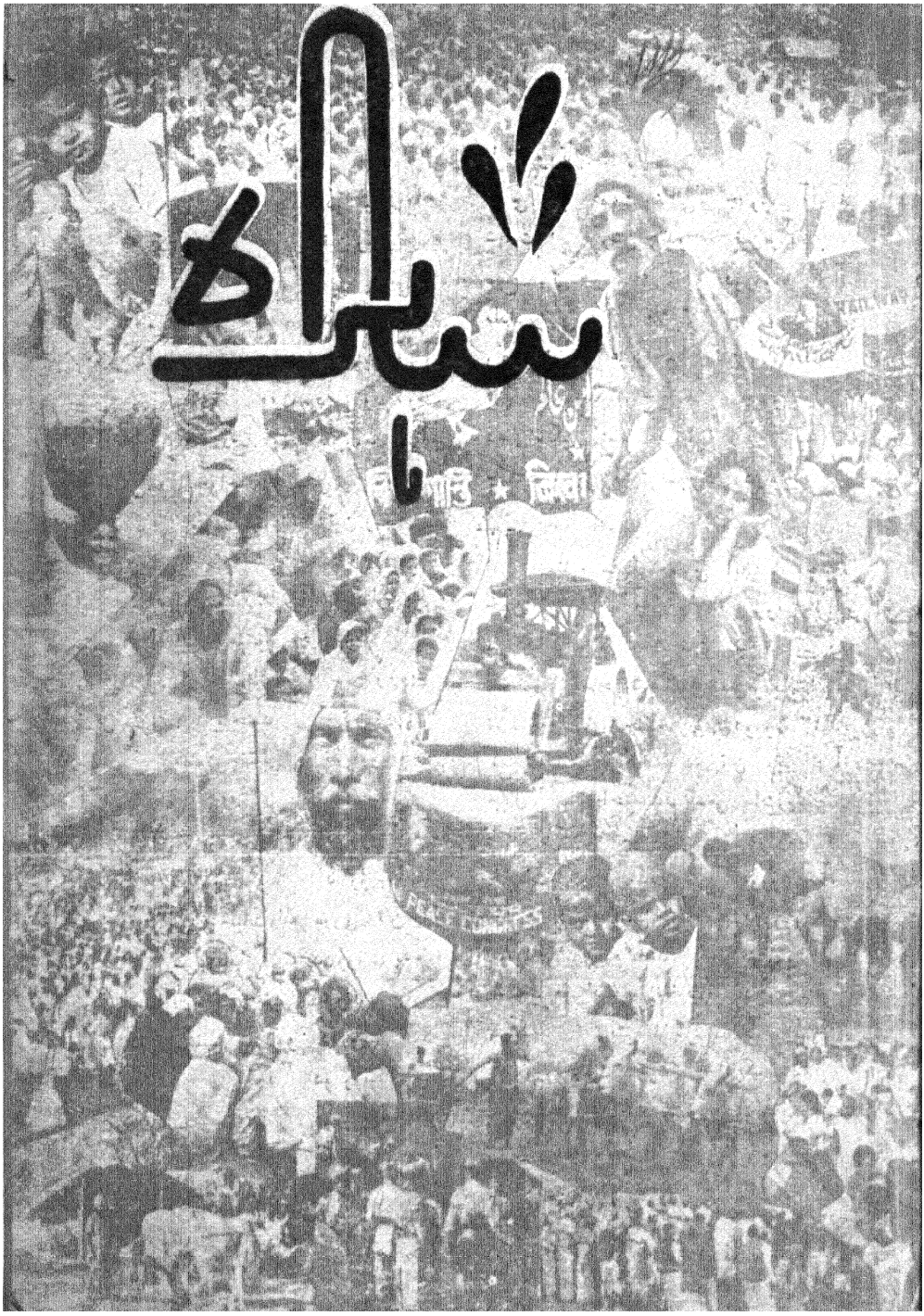
सिख

آپکے محبوب فن کاروں کی منتخب کتابیں

افسانہ -

طلسم خیال — کرشن چندر — دو روپے
کشمیر کی کہانیاں — " — تین روپے
ٹوٹے ہوئے تارے — " — دو روپے
ہوائی قلعے — " — دوروپے چار آنے
تین غنڈے — " — دو روپے آٹھ آنے
سمندر دور ہے — " — دو روپے بارہ آنے
ایک گرجا ایک خندق — " — تین روپے آٹھ آنے
میں کون ہوں — خواجہ احمد عباس — تین روپے
تارو بود — بلونت سنگھ — تین روپے
سنہرا دیس — " — چار روپے
ایسی بلندی ایسی پستی — عزیز احمد — چار روپے
منٹو کے افسانے — منٹو — چار روپے
صحرا نورد کے خطوط — مرزا ادیب — چار روپے
منزل منزل — اے حمید — تین روپے
چوٹیں — عصمت چغتائی — تین روپے
کلیاں — " — تین روپے آٹھ آنے
ہائے اللہ — ہاجرہ مسرور — دو روپے آٹھ آنے
آگ کے آغوش میں انور — دو روپے آٹھ آنے
بھرے بازار میں — حیات اللہ انصاری — تین روپے
کلنک — سرلا دیوی — دو روپے بارہ آنے
چند — سعادت حسن منٹو — تین روپے چار آنے
نوک نشتر — کنہیا لال کپور — دو روپے
شیشہ و تیشہ — " — دو روپے
چنگ و رباب — " — دو روپے آٹھ آنے

ناول، رپورتاژ -

ٹیڑی لکیر — عصمت چغتائی — چھ روپے آٹھ آنے
شکست — کرشن چندر — تین روپے
صبح ہوتی ہے — " — دو روپے چار آنے
مادام بواری — فلابیئر — چھ روپے
رقص ناتمام — عزیز احمد — تین روپے آٹھ آنے
قلی — ملک راج آنند — چھ روپے آٹھ آنے
دھانی بانکیں — عصمت چغتائی — ایک روپیہ
چھٹا دریا — فکر تونسوی — دو روپے

نظم -

امن کا ستارہ — سردار جعفری — ایک روپیہ چار آنے
خون کی لکیر — " — تین روپے آٹھ آنے
نئی دنیا کو سلام — " — تین روپے
تلخیاں — ساحر لدھیانوی — تین روپے آٹھ آنے
تلاطم — مخمور جالندھری — دو روپے آٹھ آنے
گنجینہ — یگانہ — تین روپے آٹھ آنے
جلال و جمال — احمد ندیم قاسمی — سات روپے
خم کاکل — سیف — دو روپے
خرابات — عدم — دو روپے آٹھ آنے
نقش فریادی — فیض احمد فیض — دو روپے
ماورا — ن م راشد — دو روپے آٹھ آنے
۴۸ کا شعری ادب (انتخاب) — دو روپے
دستک — نریش کمار شاد — دو روپے
جنون و حکمت جوش — یک روپیہ
فکر و نشاط — " — دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ شاہراہ - اردو بازار - دہلی

ترقی پسند مصنفین کا ترجمان

شاہراہ

ایڈیٹر

پرکاش پنڈت

سالانہ فی روپے
ششماہی پانچ روپے

اکتوبر
۱۹۵۱ء
قیمت بارہ آنے

مکتبۂ شاہراہ - دہلی ۶

راہ نما

اداریہ

شاہراہ کے قارئین کی طرف سے شاہراہ کے سلسلے میں ہمیں اکثر مشورے موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ وہ شاہراہ کو اپنا رسالہ سمجھتے ہیں۔ اور اسے بہتر سے بہتر بنانے میں ہماری اعانت کرتے ہیں۔ اور ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ شاہراہ کو موجودہ بلند معیار پر لانے میں ساتھیوں کے نیک مشوروں کا بہت بڑا دخل ہے۔

گذشتہ دنوں ہمارے چند ساتھیوں نے ہماری توجہ اس امر کی طرف دلائی ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے شاہراہ کا اداریہ ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ادب اور سیاست کے تعلق سے انھیں انکار نہیں ہے۔ لیکن انھیں اندیشہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا ایک نمایاں ادبی پرچہ ہونے کی حیثیت سے دوسرے ادبی پرچے شاہراہ کے اداریہ کی تقلید نہ کرنے لگیں۔ اور اس طرح ادبی مسائل پر سیاسی مسائل کو ترجیح نہ دینے لگیں۔

ساتھیوں کا یہ اعتراض اپنے آپ میں کافی حد تک درست ہے۔ بلاشبہ ادھر کچھ ماہ سے ہم ادبی مسائل کی بہ نسبت سیاسی مسائل پر زیادہ بحث کر رہے ہیں۔ لیکن ادب اور سیاست کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنے کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آج سیاست ادب پر کس حد تک اثر انداز ہو رہی ہے گذشتہ چار برس سے ہمارے ملک کی سیاست ایک بحران میں مبتلا ہے۔ اور سیاست کا یہ بحران زندگی کے ہر شعبے پر براہ راست اثر انداز ہو رہا ہے ——— ادب اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ لہٰذا جس حد تک سیاست ادب پر اثر انداز ہو رہی ہے اسی قدر اور اسی شدت کے ساتھ ہم اس کا جائزہ لینا اپنا ادبی فرض سمجھتے ہیں۔

آج اگر ہم ہندوستان میں اردو زبان کو ایک یتیم زبان محسوس کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اردو زبان میں پہلے سا رس اور لوچ نہیں رہا اور اس کی تمام خوبیوں کی میعاد پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تک تھی بلکہ اس کا باعث ہمارے ملک کی موجودہ سیاست ہے۔ جو زبان کلچر اور ادب ایسی قدروں کے ساتھ نہ صرف بے انصافی برت رہی ہے بلکہ ان کی آفاقی انسانی شعور کے ارتقا میں روڑے اٹکا رہی ہے۔

آج اگر ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد زیادہ ہونے کے بجائے روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک کے عوام ثانوی تعلیم حاصل نہیں کرتے اور انھیں جاہل رہنے میں لطف آتا ہے۔ بلکہ اس کا سبب ہماری موجودہ سیاست ہے۔ جو عوام کی تعلیم کو اپنے حق میں ہم قاتل سمجھتی ہے۔

اور آج اگر ہمارے ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو تعمیری ادب دستیاب نہیں ہوتا اور گمراہ کن لٹریچر کے ذریعہ ان کے ذہنوں کو پراگندہ اور مسموم کیا جا رہا ہے۔ تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تعمیری ادب نام کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ یا عوام کا رجحان اس طرف نہیں ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری موجودہ سیاست تعمیری ادب سے خوفزدہ ہے۔ تعمیری ادب کی نشر و اشاعت کو وہ اپنی موت کا پیام سمجھتی ہے۔ اور اس کا بین ثبوت وہ پریس ایکٹ ہیں جن کی رو سے ترقی پسند رسالے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان سے ضمانتیں طلب کی جاتی ہیں۔ ان پر سنسر بٹھائے جاتے ہیں۔ ان کے ایڈیٹروں کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے۔ اور ملک کے ادیبوں کو بغیر ان کا جرم بتائے جیلوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔

اس صورت حال میں ادب اور سیاست میں کوئی حد فاصل قائم کیے بغیر اگر ہم ادب پر کم اور سیاست پر زیادہ بحث کرتے ہیں۔ تو اس غرض سے کہ ہمارے عوام موجودہ سیاست کی خامیوں اور اہلہ فریبیوں کو سمجھ سکیں۔ اور بہتر سیاست کے لئے جد وجہد کر سکیں۔ کیونکہ جب تک ملک کی سیاست خام رہے گی۔ ہمارا سماج بہتر نہیں بن سکتا۔ اور جب تک سماج بہتر نہ ہوگا۔ ملک کے ادیبوں سے ادب عالیہ کی تخلیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ادب، سیاست، اور سماج کے تعلق کو ہمارے ملک کے سب سے بڑے افسانہ نگار منشی پریم چند نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

ادیب سماج اور سیاست کا رشتہ بالکل اٹوٹ ہے۔ سماج آدمیوں کے گروہ کا

ذادراہ

راہ نما — ادارہ، ۳

مقالہ

پریم چند اور گاندھی ازم — ھنس راج رہبر، ۵

نظمیں

عنوان ڈھونڈنے والے شاعر سے — فراق گورکھپوری، ۱۵

ایران — غلام ربانی تاباں، ۲۴

یہ لوگ — بلراج کومل، ۲۵

ماضی اور حال — احمد راہی، ۲۶

رونمائی — ام، امام، ۲۷

غزلیں

حبیب جالب، امین راحت چغتائی ۲۸

افسانے خاکے

چار دانوں کی کہانی — خواجہ احمد عباس، ۲۹

برلن کی تیاری — بلونت گارگی، ۴۱

کرشن چندر کے نام (ایک خط) — اوپندر ناتھ اشک، ۴۷

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک اسپینی نظم

آرزو — پبلو نرودا، ۵۸

جائزے

آپ کا بچہ اور اس کی پرورش (ڈاکٹر مونگا) پ۔پ، ۵۹

پرانے خدا (کرشن چندر) پ۔پ، ۵۹

شاہراہ بند نہ ہوگا — ۶۰

قادر جاوید — زیڈ عابد شہابی

سیدہ اختر — مدھوش

عطاالرحیم — رفیق جابر

یونس پرویز

○ پبلشر: منشی عبدالقدیر۔ مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

○ پرنٹر: کھنہ لیتھو پریس۔ دہلی

تو کہتے ہیں۔ سماج میں جو نفع نقصان اور سکھ دکھ ہوتا ہے وہ آدمیوں پر ہی ہوتا ہے
سیاست میں جو سکھ دکھ ہوتا ہے وہ بھی آدمیوں پر پڑتا ہے۔ ادب سے لوگوں کا ارتقا
ہوتا ہے۔ ادب سے آدمی کے خیالات اچھے یا بُرے بنتے ہیں۔ انہیں خیالات کو لیکر
آدمی جیتا ہے۔ اور ان تینوں چیزوں کی پیداوار کا باعث آدمی ہے "۔۔۔۔

آدمی! آج ہمارے دیس میں آدمی کی جو درد شا " ہو رہی ہے۔ اس کا باعث موجودہ سیاست نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب تک سماج، سیاست اور ادب کو بنانے اور سنوارنے والا آدمی اس خود غرض اور پر فریب سیاست اور اس کے "ناخداؤں" کو نہیں سمجھ لیتا۔ ہمارے ادب کی کشتی بھنور میں پھنسی رہے گی۔ آج سیاست کو نظر انداز کر کے محض ادب کی باتیں کرنا۔ روم کی آتشزدگی کے موقع پر نیرو کا ستار بجانا ہے۔ ادب اور سیاست کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا وقت کی سچائی سے منہ موڑنے اور جھٹلانے کے مترادف ہے انہیں تقاضوں کے باعث ہمیں اپنے اداریوں میں سیاست کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ادیب فکر کرنا ہم اپنے ادبی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور آج تو جگر مرادآبادی بھی کہتے ہیں کہ :۔

" شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل "

" سُرخ آنچل "

شاہراہ کے قارئین حیرت اور افسوس کے ساتھ یہ خبر پڑھیں گے کہ حکومت ہند نے مکتبہ شاہراہ کی ایک کتاب "سُرخ آنچل" پر جو اردو زبان کی تیرہ (۱۳) منتخب افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور جسے پرکاش پنڈت نے مرتب کیا تھا۔ زیر دفعہ ۲۹۲ فحش لٹریچر کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ عتاب ممتاز شیریں کے ایک افسانہ "ایسی پستی ایسی بلندی" پر نازل ہوا ہے۔

پاکستان کے ساتھی اپنا چندہ جاوید ایجنسیز پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۸ کراچی کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ منی آرڈر کے کوپن پر لکھ دیں کہ اس رقم کو شاہراہ کے حساب میں جمع کر لیا جائے اور منی آرڈر کی رسید ہمیں بھجوا دیں تاکہ ہم فوراً ان کے نام شاہراہ جاری کر سکیں۔

پریم چند اور گاندھی ازم

ھنس راج رہبر

سب جانتے ہیں کہ پریم چند ہمارے دیس کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور ناول نویس ہو گذرے ہیں اور ابھی تک کوئی دوسرا ادیب اس عظمت کو نہیں پاسکا۔ جو منشی پریم چند کو حاصل ہے۔

لیکن ان کے متعلق دو مختلف خیال ظاہر کئے جاتے ہیں ایک خیال یہ ہے کہ منشی پریم چند حقیقت نگار اور ترقی پسند ادیب تھے اور حقیقت نگاری اور ترقی پسندی ہی ان کی عظمت کا باعث ہے اور اس کے برعکس دوسرا خیال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ عینیت پرست اور سدھار وادی تھے۔ گاندھی جی نے اپنی سیاسی رہنمائی میں جو اصول مقرر کئے اور جو پروگرام پیش کیا۔ پریم چند نے ان ہی اصولوں اور پروگرام کو ادب میں پیش کیا۔ یعنی گاندھی وادی ہی ان کے ادب کی بنیاد ہے اور یہی ان کی عظمت کا باعث ہے۔ اس لئے ہندی زبان کے بعض نقادوں اور ادیبوں نے پریم چند کو ہندی سہایتہ کا گاندھی بھی کہا ہے چونکہ اس مکتب خیال کے لوگ گاندھی جی کو ایک بہت بڑا ترقی پسند نیتا مانتے ہیں۔ اس لئے اس اعتبار سے ان کے نزدیک پریم چند بھی ترقی پسند ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ پریم چند کا نظریہ اور شخصیت بحث طلب ہے۔ وہ کیا تھے اور کیا چاہتے تھے؟ اس سلسلہ میں ہم تب ہی کسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں جب عینیت پرستی اور ترقی پسندی کے فرق کو سمجھ لیں اور دیکھ لیں کہ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں کس خیال کی اشاعت کی ہے اور آخری عمر میں ان کی طبیعت کا رجحان کیا تھا۔ اس کے لئے ہمیں پریم چند کے ادب اور گاندھی واد کا دیس کی تاریخی اور سماجی پس منظر میں جائزہ لینا ہوگا۔

(۱)

دنیا بھر کے فلسفی بنیادی طور پر دو مختلف اور متضاد مکتب خیال میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک مکتب خیال کے فلسفی وہ ہیں جو مادے کی اولیت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مادہ ہی دنیا کی اصل ہے۔ مادہ مثبت اور منفی عناصر سے مرکب ہے۔ مثبت اور منفی عناصر کا تضاد انھیں ہمہ تصادم رکھتا ہے عناصر کے اس داخلی تضاد کے باعث مادہ پیہم حرکت میں رہتا ہے اور اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ شعور خیال اور دنیا کے مختلف نظام ان ہی تبدیلیوں کے مظہر ہیں۔ اس لئے انسان کا شعور اور خیالات مادی حالات سے تشکیل پاتے ہیں یعنی مادی حالات انسان کو بناتے ہیں، انسان مادی حالات نہیں بناتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خیالات ایک بار وجود میں آکر اپنی ایک مستقل ہستی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور وہ پھر مادی حالات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک انسان اپنے خیالات کی مدد سے مادی تبدیلیوں کی رفتار کو سست یا تیز کر سکتا ہے۔ جوں جوں مادی حالات تبدیل ہوتے ہیں اس کے مطابق سماج، نظام حکومت، قاعدے قانون، رسم و رواج اور خود انسان تبدیل ہوتا ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق جو آدمی تبدیل شدہ مادی حالات کی حقیقت کو قبول کرتا ہے اور اس کے مطابق خود تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ترقی پسند ہے یا حقیقت پرست ہے اور اگر وہ حالات کے ساتھ بدلنے سے انکار کرتا ہے۔ اپنے پرانے خیالات سے چپٹا رہتا ہے تو وہ غیر ترقی پسند یا رجعت پرست ہے۔

دوسرے مکتب خیال کے فلسفی روح کی اولیت میں یقین رکھتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق روح یا آتما اور تمام آتماؤں سے بھی ایک بڑی آتما یعنی پرماتما ہی اصل ہے۔ باقی سب نقل ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک خیالات اپنی ایک مستقل اور آزاد ہستی رکھتے ہیں۔ دنیا کے مادی مظاہر خیالات کا پرتو ہے۔ مثال کے طور پر آپ جو کتاب پڑھ رہے ہیں وہ اس لئے کتاب ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ میں "کتاب" پڑھ رہا ہوں۔ جوتا اس لئے جوتا ہے کہ جوتے کا خیال پہلے سے آپ کے ذہن میں موجود ہے ..... دھایہ کہ نظر آنے والی تمام چیزیں خیالات کا پرتو ہیں ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں اس لئے مٹتی اور ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ انسانی جسم بھی خیال کا پرتو ہے۔ لہذا فانی ہے۔ اس جسم میں جو آنکھ دیکھتی، بولتی اور محسوس کرتی ہے۔ وہ روح یعنی آتما ہے جو لافانی ہے جسم مٹ جاتا ہے روح پھر بھی قائم رہتی ہے۔

گیتا کے اس فلسفہ کے مطابق آتما امر ہے۔ وہ مرتی نہیں چولا یعنی جسم بدلتی ہے۔

جب مادّے کی کوئی ہستی نہیں وہ محض خیال کا پرتو ہے۔ تو مادی حالات کے خیالات پر اثر انداز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا میں اگر بے ایمانی، ہوس پرستی اور خود غرضی بڑھ گئی ہے تو اس کا باعث یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں بُرے خیالات بڑھ گئے ہیں اچھی صحبت اور ایدیش سے ان کے خیالات تبدیل کر دیجئے۔ ان کو نیک بنا دیجئے تو بے ایمانی، ہوس پرستی اور خود غرضی آپ ہی آپ مٹ جائے گی۔ کسی بھی برائی کو مٹانے کے لئے خیال کی تبدیلی کے علاوہ کسی مادی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس فلسفہ کا نام عینیت پرستی ہے اور اس کا دوسرا نام اصلاح پسندی یا سدھار واد ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق کوئی بھی بُرے سے بُرا آدمی کسی بھی وقت خیالات کی تبدیلی یا ہردیہ پریورتن سے یکایک نیک اور دیوتا بن سکتا ہے۔

یہ فلسفہ انسان کو داخلیت پسند بناتا ہے اور دنیا کو بہتر بنانے کے لئے انفرادی اصلاح کا تقاضہ کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اسی فلسفہ پر رکھی گئی ہے۔ اس فلسفہ کے ذریعہ نظام حیات کو بہتر بنانے والے اصلاح پسند یا سدھار وادی کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک مادہ محرک نہیں جامد ہے۔ اس کی صرف ایک صفت یہ ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے۔ دنیا چونکہ مادی اور جامد ہے اس لئے اسے حرکت میں لانے والی ایک غیر مرئی طاقت مطلق ہے جس کا نام خدا یا پرماتما ہے۔ دنیا کی اصلاح کے لئے وہ وقتاً فوقتاً دلی پیغمبر یا رہنما بھیجتا ہے اور ان ہی ولیوں، پیغمبروں اور رہنماؤں کی بدولت تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں۔

یہ فلسفہ بھی مادی حالات سے پیدا ہوا اور مادی حالات کے مطابق ترقی کرتا رہا۔ سامنتی ترقی کا دور مذہبی فلسفہ کی ترقی کا دور تھا۔ اس فلسفہ نے جابر قدرت کے مقابلہ میں انسان کو خود اعتمادی عطا کی اور اس نے وحشت اور بربریت کے دور سے گذر کر بڑی بڑی ریاستیں اور سلطنتیں بنائیں۔ منظم اور پُرامن زندگی بسر کرنا سیکھا۔ فلسفہ، قانون اور فنون لطیفہ میں بے حد اضافہ کیا۔ ترقی کے اس دور میں سامنتی نظام سے بہتر نظام، انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ قیامت آئے تو آئے ورنہ انسان اپنی مرضی سے اس میں اصلاح تو کر سکتا تھا۔ لیکن اس میں کوئی بنیادی تبدیلی اسے گوارا نہیں تھی۔ اس کا مذہبی فلسفہ اسے بتاتا تھا کہ یہ نظام قادرِ مطلق خدا نے بنایا ہے۔ انسان کی مرضی کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ آقا اور غلام اس قادرِ مطلق ہستی کی رضا اور قضا، سزا اور جزا کے محتاج ہیں۔ وہ اپنے اپنے فرائض تندہی اور وفاداری سے سرانجام دیں اور اپنی قسمت پر شاکر رہیں۔

ہندوستان، یونان، مصر اور ایران انسانی تہذیب کے گہوارے ہیں۔ ان میں سے کسی بھی ملک کا فلسفہ دیکھ لیجئے، مادے یا روح کی اوّلیت کو ماننے والے دو سکول صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب دنیا سامنتی جگ میں داخل ہوئی تو روح کی اولیت کو ماننے والے فلسفہ کی جیت ہوئی اور مادے کی اولیت کے فلسفہ نے ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ انسان علم اور تجربہ ابھی اتنا وسیع نہیں ہوا تھا کہ وہ قدرت کے مظاہر کی اور سماجی تغیرات کی اپنے مادی فلسفہ کے مطابق توضیح کر سکتا۔ اس لئے سامنتی جگ عینیت پرستی کے فلسفہ کا جگ تھا کیونکہ یہ فلسفہ سامنتی جگ کے معاشی رشتوں کی قابل قبول توضیح کرتا تھا۔

ہندوستان کی ابتدائی ویدمالا میں وشنو خارجیت کا اور شو داخلیت کا سمبل ہے۔ سانکھیہ درشن اور نیائے درشن وغیرہ ہندو فلسفہ کے چھ شاستر مانے گئے ہیں۔ وہ ہر ایک ہندو کے نزدیک مقدس اور قابلِ احترام ہیں۔ لیکن ان میں بنیادی طور پر اختلاف مائے ہے۔ کسی میں مادے کی اولیت اور کسی میں روح کی اولیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اپنشدوں میں یہ بحث جاری رہی اور رفتہ رفتہ مادّے کی اوّلیت پر روح کی اولیت کا فلسفہ غالب آیا۔ اپنشدوں کے فلسفہ ہی سے بدھ مت اور جین مت نے جنم لیا۔ وہ آتما اور پرماتما کی ہستی کو بے شک قبول نہ کرتے ہوں لیکن دونوں مت عینیت پرستی پر قائم ہیں۔ اس کے بعد مہابھارت اور گیتا کے بھاگوت مت نے آتما اور پرماتما کی ہستی کو بلا عذر تسلیم کر لیا ہے۔ گیتا کے مطابق شریر مرتا ہے۔ لیکن آتما امر ہے اور اسی فلسفہ کے مطابق انسان کی مادی جدوجہد آگے بڑھتی ہے۔ کرشن ارجن سے کہتا ہے۔ کشتری کا دھرم لڑنا ہے۔ مرنے اور مارنے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ آتما امر ہے۔ اس لئے نہ کوئی

کسی کو مارتا ہے اور نہ کوئی مرتا ہے۔ جیئو گے تو اس دنیا پر راج کرو گے۔ ورنہ سورگ میں جاؤ گے یعنی اپنشدوں کے بعد ہمارے دیش میں عینیت پرستی کے فلسفہ کو عروج حاصل ہوا۔ بدھ، ویاس اور شنکراچاریہ مختلف ڈھنگ سے اسی ایک فلسفہ کی توضیح و تشریح کرتے تھے، اس کے بعد جنو اور شو میں بھی کوئی بھید نہیں رہ گیا۔ دونوں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئے۔ بیک وقت خارجیت اور داخلیت کے سمبل بن گئے۔ مثال کے طور پر شو جی دنیا کی پرورش بھی کرتا ہے اور اسے ناش بھی کرتا ہے جب وہ خوش ہوتا ہے تو بھگتوں کو ورودان دیتا ہے اور انسانوں کی بہتری کے لئے گنگا کو اپنی جٹاؤں میں دھارن کیے سورگ سے دھرتی پر لاتا ہے انسانی نسل کو بڑھاتا ہے یعنی اسے تخلیق کرتا ہے اسی لئے شو کے مندروں میں شیخ لنگ کی پوجا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شو کا ایک اور روپ بھی ہے جب وہ انسانی کھوپڑیوں کی مالا گلے میں ڈال کر تانڈو ناچ کرتا ہے، اور انسانوں کا سنگھار کر کے اپنی بنائی ہوئی دنیا کو اپنے اندر سمیٹتا ہے۔

اس فلسفہ کے مطابق سنسار مایا ہے جسے ایشور اپنی مرضی کے مطابق بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ پے در پے بیرونی حملوں اور دنیاوی شکستوں کے باعث اس فلسفہ میں جس قدر خارجیت کی مقدار کم ہوتی گئی اسی قدر داخلیت کی مقدار بڑھتی گئی یہاں تک کہ ہندوستان کے بیشتر عوام جو دیہات میں رہتے تھے اور کھیتی باڑی پر گذارہ کرتے تھے ملک کے سیاسی نظام سے بے نیاز ہو کر اپنے زرعی معاشی نظام سے پورے طور پر وابستہ ہو گئے۔ بارش نہیں ہوتی تھی۔ کھیت سوکھتے تھے تو وہ اندر دیوتا کی پوجا کرتے تھے بیل ان کے کھیت جوتتا تھا۔ وہ نہ صرف اناج اگانے بلکہ اسے خوشوں سے نکالنے اور ڈھو کر لانے میں مدد دیتا تھا۔ اس لئے کسان اسے بھائی اور بیٹے کی طرح پیار کرتا تھا اور گائے جو بیل کو جنم دیتی تھی۔ کسان کو اور اس کے بچوں کو دودھ پلاتی تھی یقیناً ماتا کہلانے کی مستحق تھی۔ احترام اور پرستش کے قابل تھی۔ صدیوں زرعی معاشی نظام سے بندھا رہنے کے کارن ہندوستان کے عوام ایک ساکن اور جامد قسم کی زندگی بسر کرنے لگے جس میں قدامت پسند عقیدہ پرستی بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ اس میں بہت سے توہمات داخل ہوتے گئے اور پرانی بوسیدہ روایات ان کی محنت کو چوستی اور خراج حاصل کرتی رہیں۔

انھیں دوبارہ حرکت میں لانے کے لئے ایسی ہل چل کی ضرورت تھی۔ جو پیداوار کے طریقوں اور معاشی تعلقات کو بدل دیتی۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں ان تعلقات کو بدلنے کی کوشش کی۔ ستی اور دختر کشی وغیرہ کے خلاف قانون بھی پاس کئے۔ لیکن غدر کے بعد سیاسی مصلحتوں نے ان کا ہاتھ روک دیا۔ انہوں نے سامنتی عناصر کو ختم کرنے اور دیہاتیوں کا معاشی نظام زندگی بدلنے کی بجائے اسے جوں کا توں قائم رہنے دیا لیکن دیہاتوں کی پہلی خود کفالتی ختم کر دی۔ ان پر زمینداروں کے کروں، سرکاری ٹیکسوں اور عدالتوں کا خرچ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ زمیندار کے کارندے سرکاری افسر اور پیادے الگ ان کا خون چوسنے لگے جس سے ہمارا کسان غریب سے غریب تر ہوتا گیا۔

اس ہندوستان میں گاندھی جی ۱۸۶۹ء میں اور پریم چند ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے آغاز میں گاندھی جی نے اپنی سیاسی زندگی کی اور پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں کا خمیر ہندوستان کی خاک سے اٹھا تھا اور ہندوستان کی پرانی روایات دونوں کے شعور میں رچ بس گئی تھیں اور وہ دونوں اصلاح پسند یا سدھار وادی تھے۔ لیکن دونوں نے مختلف ماحول میں جنم لیا تھا اور مختلف ماحول میں پرورش پائی تھی۔ دونوں کی ذاتی خواہشات اور ارادے مختلف تھے۔ اس لئے دونوں کے سدھار واد میں بنیادی فرق تھا۔

اس کا سماجی پس منظر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اب اس فرق کو سمجھنا ہے اسے سمجھنے کے لئے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ان اصلاح پسندی کی طبقاتی بنیاد کیا تھی۔ گاندھی جی کی اور پریم چند کی اصلاح پسندی کے ڈانڈے کیوں اور کہاں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور ڈانڈے مل جانے سے پریم چند کے ادب اور آرٹ کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچا۔ اور آخر میں پریم چند کی اصلاح پسندی نے گاندھی جی کی اصلاح پسندی سے کون سی الگ راہ اختیار کی۔ اگر پریم چند ترقی پسند تھے تو کیا گاندھی واد بھی ترقی پسند فلسفہ تھا؟

(۲)

بیسویں صدی کے آغاز میں جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا تو یہ ایشیائی عوام کی بیداری کا دور تھا۔ سرمایہ داری اپنی سامراجی دور میں داخل ہو چکی تھی اور اسے اپنے پہلے اقتصادی سنکٹ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں چھوٹے سے ایشیائی ملک جاپان نے یورپ کی ایک بہت بڑی طاقت زار روس کو شکست دی تھی اور وہاں ایک انقلاب رونما ہوا جو ناکام رہا لیکن اس نے دنیا کو ہلا دیا۔

اس وقت ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک میں زبردست ابھار پیدا ہوا۔ پریم چند نے آزادی کی اس تحریک سے متاثر ہو کر "سوز وطن"

کی کہانیاں لکھیں۔ اس کتاب کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا اور ان کی تحریر پر پابندی لگا دی۔ جس سے پریم چند برطانوی حکومت کے سخت مخالف بن گئے۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ ادب جنگ آزادی کو آگے بڑھانے کا موثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ ورنہ انگریز ان کی کتاب ضبط نہ کرتا۔ ان کی قلم پر پابندی نہ لگاتا۔

آزادی کی بیداری کے ساتھ ساتھ پڑھا لکھا درمیانہ اور اونچا طبقہ سماجی اصلاح کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا اور سماج سدھار کی تحریکوں میں آریہ سماج کی تحریک سب سے زیادہ موثر اور مقبول تھی۔ پریم چند نے اس تحریک کے زیر اثر "بیوہ" اور "بازار حسن" سماجی ناول لکھے۔ اس سے پہلے ایک اور ناول "جلوۂ ایثار" لکھا تھا جو نیم سماجی اور نیم سیاسی ہے۔ اس کا ہیرو بالاجی بیک وقت سماجی نیتا اور سیاسی لیڈر ہے اور اس کا کردار ماحول کی پیداوار نہیں پریم چند نے اپنے قلم کے اعجاز سے اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔

ہماری قومی تحریک کی باگ ڈور بھی ایسے ہی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی جو خیال پرست واقع ہوئے تھے۔ قومی تحریک کو جنم دینے والی اقتصادی حقیقتوں پر ان کی نظر کم جاتی تھی۔ وہ یہ جذباتی نعرہ بلند کرتے تھے کہ "سوراج ہمارا پیدائشی حق ہے"۔ "بھارت ماتا زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے" اس لئے ہم دیش بھگت بن کر ان زنجیروں کو کاٹیں اور ماتا کے سچے سپوت ہونے کا ثبوت دیں۔ اور لوگوں میں دیس بھگتی کے ان خیالات کا پرچار کرنے کے لئے دھارمک میلے کئے جاتے تھے۔ چھترپتی سیواجی کا دن منایا جاتا تھا۔ رام نومی اتسو ہوتے تھے۔ انگریزی حکومت کے تشدد سے بچنے کے لئے دھارمک میلوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن کانگریسی نیتا در اصل عقیدت پرست تھے ہندوستان کی قدیم تہذیب میں یقین رکھتے تھے اور انگریزوں کو نکال کر دیس کی پرانی عظمت کو واپس لانا چاہتے تھے۔ وہ انگریزی حکومت کو نہ صرف دیس کی سیاسی اور اقتصادی غلامی بلکہ سماجی پستی کا بھی باعث سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ انگریزوں سے وابستہ ہر ایک چیز سے نفرت کرتے تھے۔ مغربی تہذیب فلسفہ اور سائنٹفک علوم کو بھی دیس کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔

ان رہنماؤں میں بال گنگا دھر تلک لاجپت رائے اور وپن چندر پال قابل ذکر ہیں اس سے پہلے گوپال کرشن گوکھلے اور رمیش چندر دت وغیرہ کانگریس کے لیڈر تھے۔ وہ ان کے مقابلہ میں اس لئے معتدل یا ماڈریٹ سمجھے جاتے تھے کہ وہ برطانوی جمہوریت میں یقین رکھتے تھے اور اور ان کا خیال تھا کہ انگریز یہاں بھی جمہوری اصلاحات نافذ کریں گے اس لئے وہ انگریزی حکومت کے ساتھ سمجھوتہ اور مصالحت کی پالیسی اختیار کرتے تھے اور ملک کے لوگوں کو قدامت پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانے کے لئے مغربی تہذیب اور سائنٹفک خیالات سے استفادہ کرنے کا پرچار کرتے تھے۔ اس لئے ان پر مغرب زدہ ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا۔

رجنی پام دت نے ان دونوں کی سیاست کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گوکھلے اور ان کے ہم خیال رہنماؤں نے انگریزوں سے جمہوری اصلاحات کے نفاذ کی جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ درست نہیں تھیں لیکن مغربی تہذیب اور علوم سے استفادہ کرنے اور ملک کو توہم پرستی اور قدامت پسندی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں وہ ترقی پسند واقع ہوئے تھے۔ اس کے مقابلہ میں تلک اور لاجپت رائے انگریزوں سے کوئی بے جا توقعات وابستہ نہ کر کے ملک کے انقلابی ابھار کی رہنمائی کرنے میں درست تھے۔ لیکن انھوں نے مغربی تہذیب کے مقابلہ میں جو قدیم ہندو تہذیب کی عظمت کا پرچار کیا۔ اس سے قدامت پسندی اور توہم پرستی کو سہارا ملا۔ اور اس پہلو سے وہ رجعت پرست واقع ہوئے تھے۔ اور چونکہ وہ مادی حقیقتوں کو نظر انداز کرتے تھے اس لئے دیس میں صنعتی ترقی کے باعث جو متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا اور جو انگریزی سامراج اور سرمایہ داری کی تاریخی ضد تھا اس پر ان کی نظر نہیں گئی۔ حالانکہ لینن نے ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا کہ ــــ "ہندوستان کا پرولتاری طبقہ اسقدر باشعور ہو چکا ہے کہ وہ طبقاتی بنیاد پر سیاسی عوامی جدوجہد کو آگے بڑھا سکتا ہے ــــ" جب کسی بھی سیاسی تحریک میں اقتصادی اور تاریخی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے اس کی بنیاد جذباتی نعروں پر رکھی جاتی ہے تو اس سے انارکزم اور انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ عوام کا شعور کند ہوتا ہے اور خود دیس بھگتی توہم پرستی بن جاتی ہے۔ اس لئے بقول رجنی پام دت اس دور کے یہ گرم دل کانگریسی رہنما انارکسٹ تھے۔

ہمیں کانگریس لیڈر شپ کے اس تجزیہ سے پریم چند اور گاندھی جی کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

پریم چند سیاست میں ان رہنماؤں سے اور ادب میں جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے۔ چارلس ڈکنز، ٹالسٹائے، رومان رولاں اور ٹیگور سے متاثر تھے لیکن سب لوگوں پر رہنماؤں اور ادیبوں کا اثر یکساں نہیں ہوتا۔ ہر ایک آدمی ان سے اپنے فطری رجحان کے مطابق اثر قبول کرتا ہے اور فطری رجحان اس کے طبقاتی شعور سے پیدا ہوتا ہے۔

پریم چند نچلے درمیانہ طبقہ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے دیہات میں رہ کر پرورش پائی۔ ان کے پتا ڈاک خانہ کے ملازم تھے۔ بیس روپیہ ماہوار سے ملازمت شروع کی اور آخری عمر میں چالیس روپے تک پہنچے۔ اس کے علاوہ گاؤں میں تھوڑی سی موروثی زمین تھی جس کی بٹائی آتی تھی۔ اس طرح ان کی حالت عام کسانوں سے قدرے اچھی تھی۔ لیکن زندگی کی ضروریات مشکل سے پوری ہوتی تھیں۔ پھر پرانے رواج کے مطابق پتا نے پریم چند کی شادی تیرہ سال کی عمر میں کر دی اور بیوی کا انتقال ہونے پر آپ بھی بڑھاپے میں دوسری بیوی بیاہ لائے اور چند ہی سال بعد مر گئے۔ غریب پریم چند پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ ایم۔ اے پاس کر کے وکیل بننا چاہتے تھے۔ لیکن میٹرک سے آگے نہ پڑھ سکے اور میٹرک پاس کرنے کے لئے بھی سخت جد وجہد کرنا پڑی۔ بھوکے پیاسے رہتے تھے اور ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ بعد میں ماسٹر بنکر اپنا، سوتیلی ماں، اس کے بچوں اور بیوی کا پیٹ پالتے۔ رہے اور پرائیوٹ طور پر بی۔ اے پاس کیا۔

وہ درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کی طرح آدرش وادی تھے۔ بڑے بڑے خواب دیکھتے تھے۔ بارہا ہوا میں اڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ان کا دامن کھینچ لیتی تھیں۔ اور دھرتی پر لوٹ آنے پر مجبور کرتی تھیں۔ ادر خیال پرست ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے ان کا گہرا بنا رہا۔ مذہبی قدامت پسندی سے، جسے وہ کسانوں کا خون چوستے دیکھتے تھے۔ اور جس کے وہ خود شکار ہوئے تھے۔ ان کا کبھی سمجھوتہ نہیں ہوا

وہ جس آدرش میں یقین رکھتے تھے وہ مادی حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہو رہا تھا۔ پریم چند نے اپنے آئیڈیل کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:-

اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت ابتداء ہی سے آئیڈلسٹوں کا زریں خواب رہی ہے۔ پیشوایان دین نے مذہبی اخلاقی اور روحانی بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ نبیوں نے اخلاقی بنیادوں پر مساوات کی یہ عمارت کھڑی کرنی چاہی۔ مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی اور آج ادنیٰ اور اعلیٰ کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ آزمودن جہل است کے مصداق اب بھی دھرم اور اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو ہمیں ناکامی ہی ہوگی کیا ہم اس خواب کو پریشان دماغ کی خلاقی سمجھ کر بھول جائیں۔ تب انسان کی ترقی اور تکمیل کے لئے کوئی آئیڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس آئیڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے۔ جس کے لئے انسان نے نہ جانے کتنی قربانیاں کی ہیں۔ جس کی تکمیل کے لئے مذاہب کا ظہور ہوا۔ انسانی معاشرت کی تاریخ اس آئیڈیل کی تاریخ ہے۔ اسے مسلمہ سمجھ کر ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کرنی ہے۔ جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کر لیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۶ء)

ظاہر ہے کہ پریم چند نے یہ آئیڈیل آخری عمر میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس عقیدہ تک وہ بھی پہنچ سکے جب زندگی کی ٹھوس مادی حقیقتوں سے ٹکرا کر ان کے صدیوں پرانے مفروضے اور بھرم ٹوٹتے رہے۔ جب وہ زندگی کے تجربہ سے سیکھتے اور آگے بڑھتے رہے۔ پریم آشرم میں اپنے ہیرو یعنی پریم شنکر کے بارے میں لکھتے ہیں: "زندگی انھیں نئے نئے تجربات کا مکتب نظر آتی تھی"

ان کا یہ ہیرو امریکہ سے نئی تعلیم حاصل کر کے آیا ہے۔ برادری اور دیہات کے لوگ اس سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ بدیس جا تو آکر کے وہ اپنے دھرم سے گر گیا۔ دھرم اور برادری میں واپس آنے کے لئے وہ پراشچت کرے۔ لیکن وہ برادری کے ان بے ہودہ تقاضوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اپنے نئے خیالات کا پرچار کر کے لوگوں کو قدامت پسندی اور توہم پرستی سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ وہ

وقت خود وہ اصولوں کا پابند نہیں۔ وہی اصول قابلِ احترام ہیں جو انسانی زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔ پریم چند لکھتے ہیں :۔

" زندگی کے تجربہ نے انھیں سکھایا کہ اصولوں کی بہ نسبت انسان زیادہ قابلِ عزت ہے "

بقول پریم چند اس ناول کا یہ آدرش ہیرو ہے یعنی خود پریم کے ڈھنگ سے سوچتا ہے لیکن آدرش وادی ہوتے ہوئے بھی حقیقت پسند ہے لکھتے ہیں :۔

" پریم شنکر در پردہ کہا کرتے تھے کہ میں کاشتکاروں کو شاید ہی کوئی ایسی بات بتا سکتا ہوں جس کا علم انھیں نہ ہو۔ محنتی تو ان سے زیادہ دنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ کفایت شعاری، نفس کشی، خانہ داری سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے افلاس کی ذمہ داری ان پر نہیں بلکہ ان حالات پر ہے جن کے تحت انھیں اپنی زندگی گذارنا پڑتی ہے۔ وہ حالات کیا ہیں باہمی نفاق، خود غرضی اور ایک ایسے نظام کا وجود جو انھیں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہے۔ لیکن ذرا زیادہ غور کرنے پر معلوم ہو جائے گا۔ یہ تینوں شاخیں ایک ہی بڑی شاخ سے نکلی ہیں اور یہ وہی نظام ہے جس کے وجود کا انحصار کسانوں کے خون پر ہے "

اس ناول کا ایک کردار دکھرن بھگت مذہبی خیالات کا بوڑھا آدمی ہے۔ ایک مرتبہ سرکاری ملازموں نے اسے بے گار میں پکڑ لیا اور اسٹینس کورٹ کا گھاس چھیلنے کو کہا۔ انکار کرنے پر اسے جوتوں سے پیٹا گیا۔ اس بے عزتی سے اس کا دل اتنا کھٹا ہوا کہ اس نے گھر آکر سالگ رام کی مورتی اٹھائی، اسے بُرا بھلا کہا اور سب کے سامنے توڑ کر بولا " آج آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ یہ نرا مٹی کا ڈھیلا ہے۔ تیس سال کی بھگتی کا یہ بدلا "

ظاہر ہے کہ پریم چند ریاسی طور پر ایک ایسی تبدیلی چاہتے تھے جس سے دوسروں کی محنت لوٹ کھسوٹ پر قائم یہ نظام ختم ہو اور زمین کسانوں کو ملے کیونکہ پریم شنکر جوالا سنگھ سے کہتا ہے " زمین کا مالک کسان ہے جو اسے جوتتا ہے " اور وہ سماجی طور سے بھی قدامت پسند نہیں تھے۔ وہ پریم شنکر کے ذریعہ مغربی تہذیب اور نئے خیالات کو پھیلانا چاہتے تھے تاکہ مذہبی قدامت پسندی اور توہم پرستی دور ہو۔

انھوں نے ہماری سیاسی اور سماجی تحریکوں سے صحت مند اثرات قبول کئے تھے۔ سیاسی طور پر وہ ملک کو مکمل طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ انگریزوں سے انھوں نے کسی قسم کی امیدیں وابستہ نہیں کیں۔ بقول منشی دیانارائن نگم ایڈیٹر زمانہ۔ وہ سیاست میں ہمیشہ گرم دل کا ساتھ دیتے تھے اور ہر طرح کی بھکمتہ پرستی کے خلاف تھے۔ ویسے انھیں انگریزوں کی ہر ایک چیز سے چڑھ نہیں تھی۔ وہ مغربی تہذیب کی خوبیوں اور سائنٹیفک خیالات اپنانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بلند پایہ مغربی ادیبوں کا بغور مطالعہ کیا اور ان سے اثر قبول کرکے ہمارے ادب میں حقیقت پسندی کو رواج دیا۔

(۳)

پریم چند جب یوں تجربہ سے سیکھ رہے تھے اور حقیقت سے متاثر ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس وقت ہماری سیاسی سٹیج پر گاندھی جی رونما ہوئے۔ جب پریم چند نے گوشۂ عافیت لکھا اس وقت ہماری سیاسی یا سماجی تحریکوں پر گاندھی جی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ پہلی عالمگیر جنگ نے کسانوں کی بھوک اور عوام کی لوٹ کھسوٹ کو اور بڑھا دیا تھا۔ جیسا کہ ہر ایک جنگ کا خاصہ ہوتا ہے۔ سکے کی قیمت گر گئی تھی اور ضروریات کی چیزیں مہنگی ہو گئی تھیں۔ اس سے عوام کی مشکلات ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ گئی تھیں۔ وہ حرکت میں آرہے تھے ان کا سیاسی شعور بڑھ رہا تھا۔ انگریزی فوجوں کی پیہم شکستوں کے باعث سامراج کی طاقت سے ان کا اعتماد اُٹھ گیا تھا۔ اور دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات انھیں متاثر کر رہے تھے۔ اس جنگ کے دوران میں روس کا اکتوبر انقلاب برپا ہوا جس سے ظلم و جبر اور لوٹ کھسوٹ کے اس نظام کی بساط اُلٹ گئی اور دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں پہلی مرتبہ مزدوروں کسانوں کا راج قائم ہوا۔ اس سے بھی لوگوں کا سیاسی اور طبقاتی شعور بڑھا اور ہندوستان کے عوام قومی آزادی کی جدوجہد کے لئے اس حد تک تیار ہو گئے تھے کہ ماڈریٹوں کی بھکمتہ پرست پالیسی انھیں مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔

چنانچہ جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے جن آئینی اصلاحات کا اعلان کیا انھیں ماڈریٹوں کے علاوہ تمام طبقوں نے ٹھکرا دیا۔ اور نتیجے کے طور وسیع پیمانے پر جلوس، جلسے، ہڑتالیں اور مظاہرے شروع ہوئے۔ لاٹھیاں اور گولیاں چلنے لگیں۔ عوام نے بھی تشدد کا جواب تشدد سے دینا شروع کیا اور جلیانوالہ باغ ظہور میں آیا۔ سارے ہندوستان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

اس وقت گاندھی جی سول نافرمانی کا پروگرام لے کر سامنے آئے جس میں سکولوں، کالجوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اداروں سے عدم تعاون اور بدیسی بائیکاٹ کا پروگرام شامل تھا۔ انھوں نے اس اجتماعی تحریکوں کے پروگرام کو اہنسا وادی ڈھنگ سے چلانے کو کہا اور چھ ماہ میں سوراج دلانے کا وعدہ کیا۔

گاندھی جی گجرات کے ایک شہر پوربندر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پتا ریاست کے دیوان تھے گھر میں برت، پوجا پاٹھ اور تمام مذہبی رسوم کی پابندی سختی سے ہوتی تھی۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے لئے پشچاتاپ کیا جاتا تھا۔ گاندھی جی نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور اس ماحول میں ان کے سنسکار بنے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب انھوں نے پتا کے پیسے چرا کر سگریٹ وغیرہ پیئے۔ تو بعد میں ایک خط میں پتا کو سب حالات لکھ کر اس پاپ کا پشچاتاپ کیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ گیتا کا بھاگوت مت اور شومت سانتی جگ کا فلسفہ ہے۔ انگریزوں کی بدولت یہاں نوآبادیاتی نظام قائم ہوا۔ سانتی عناصر اور پرانا زرعی معاشی نظام بدستور بنا رہا۔ اس لئے یہ فلسفہ بھی قائم رہا۔ گاندھی جی کا خاندان سامنت شاہی سے اور اس فلسفہ سے سیدھے طور پر وابستہ تھا۔ گاندھی جی یہ امید لے کر ولایت پڑھنے گئے کہ لوٹ کر باپ کی جگہ دیوان بن جائیں گے کیونکہ ان کا بڑا بھائی تعلیم کافی نہ ہونے کی وجہ سے یہ عہدہ نہیں پا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ تعلیم کے دوران میں بھی ذہنی طور پر بھی ذہنی طور پر اسی سانتی طبقہ سے وابستہ رہے اور انھوں نے لندن میں رہ کر بھی مغربی تہذیب کے اثرات قبول نہیں کئے۔ انھوں نے بارہا اپنی تقریروں اور تحریروں میں مشین اور مشینی تہذیب کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ مشین اور اس کی تہذیب ہی انسان کی موجودہ بے کاری، افلاس اور زوال کا باعث ہے۔ اسلئے وہ عمر بھر کھدر اور دیہاتی دستکاریوں کو فروغ دینے کا پرچار کرتے رہے۔

انھوں نے اپنی سیاسی زندگی جنوبی افریقہ میں شروع کی۔ گورے اور کالے کا نسلی امتیاز ختم کرنے کے لئے انگریزوں کے خلاف ستیہ آگرہ کی تحریک چلائی اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انھیں انگریزوں سے نفرت نہیں ہے جنوبی افریقہ کے بوئر باشندوں کے خلاف جنگ میں گھائل انگریز سپاہیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد وہ عالمگیر جنگ کے دوران میں لوٹ کر ہندوستان آئے۔ انھیں یقین تھا کہ انگریز حکمرانوں نے جنگ کے بعد آزادی دینے کا جو وعدہ کیا ہے۔ اسے وہ ضرور پورا کریں گے۔ اس لئے وہ جنگ کے دوران میں رنگروٹ بھرتی کرانے کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

گاندھی جی سیاست میں ماڈریٹ تھے اور گوپال کرشن گوکھلے کے معتقد تھے۔ گوکھلے کو یقین تھا کہ انگریز جمہوریت پسند ہیں۔ اس لئے جب ہندوستان اس قابل ہوگا تو وہ یہاں بھی جمہوری نظام قائم کریں گے۔ اس وقت اگر ہم کامن ویلتھ میں بھی شامل رہے تو وہ ہندوستانی کامن ویلتھ ہوگی۔ کیونکہ ہمارے دیس کی آبادی برطانوی سلطنت کے تمام دیسوں سے زیادہ ہے۔ شائد ان کا خیال تھا کہ کامن ویلتھ کا ممبر ہونے پر ہندوستان کو اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی ملے گی۔ لیکن ۱۹۱۱ء کے دربار کے موقع پر جب ان کی پرائمری تعلیم لازمی قرار دینے کی تجویز بھی نہیں مانی گئی تو ان کا یہ اعتماد ٹوٹ گیا اور انھوں نے کہا کہ برطانوی نوکر شاہی سے کسی طرح کی امیدیں وابستہ کرنا بھول ہے۔ عملی زندگی سے یہی تجربہ چین کے قومی رہنما سن یات سین نے حاصل کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی جمہوری ممالک سے چین کو متحد کرنے اور ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے چینی نوجوانوں کو امریکہ اور برطانیہ میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھیجا۔ تاکہ وہ مغربی تہذیب اور جمہوری اصولوں سے استفادہ کریں۔ لیکن آخری عمر میں سرمایہ دارانہ مغربی جمہوریتوں میں ان کا اعتماد نہیں رہا اور انھوں نے چین کو روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے کہا۔

مگر گوکھلے کے تجربہ کے باوجود گاندھی جی کا انگریزی حکمراں طبقے کی شرافت میں اعتماد قائم رہا۔ لیکن وہ گوکھلے کی طرح مغربی تہذیب اور سائنٹیفک خیالات اپنانے کے حق میں نہیں تھے بلکہ اس معاملہ میں وہ تلک اور لاجپت رائے کی طرح ہندوستان کی قدیم تہذیب کو اس سے بہتر سمجھتے تھے۔ ست اور اہنسا کا پرچار کر کے "رام راج" لانا چاہتے تھے یعنی پورے طور پر احیا پرستی کے قائل تھے۔ ٹالسٹائے سے بھی انھوں نے وہی مذہبی فلسفہ قبول کیا۔ جس سے انکے گاندھی داد اور اصلاح پسندی کی تائید ہوتی تھی۔

رجنی پام دت نے گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات کے حق میں تھے اور انھیں قبول کرنے کی حمایت کرتے تھے۔

۱۸۸۰ء کے قریب ایسے واقعات ظہور میں آئے۔ جن سے خود سرکاری رپورٹوں کے مطابق معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے کسانوں اور درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں میں اقتصادی بے چینی اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے۔ اس بے چینی اور نفرت کو آئینی اور اصلاحی شکل دینے کے لئے آئی۔ سی۔ ایس محکمہ کے ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ہیوم نے وائسرائے ڈفرن کے مشورہ سے کانگریس کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد اینی بسینٹ، اینڈریوز اور پیرا بہین۔ جس کسی بھی انگریز عورت اور مرد نے ہماری تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اسے پُرامن راہ پر چلانے کی کوشش کی۔

۱۹۱۹ء کی اصلاحات مسترد ہونے کے بعد جب عوامی جد و جہد شروع ہوئی تو نہ صرف سامنت اور جاگیر دار بلکہ انگریز کے سہارے پلنے والا نوکری شاہی اور سرمایہ دار طبقہ کو بھی یہ خوف پیدا ہوا کہ جو عوام انقلاب کے ذریعہ انگریزوں سے آزادی حاصل کریں گے وہ ہر طرح کے جور جبر اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ مصلحت اسی میں تھی کہ عوامی انقلابی ابھار کو پرامن راہ پر ڈالا جائے۔ اور گاندھی جی کا ست اور اہنسا کا پروگرام اس کے لئے نہایت موزوں تھا۔

گاندھی جی نے اپنے سچ کی تشریح میں بہت کچھ لکھا اور ان کی خود نوشت سوانح حیات کا نام ہی EXPERIMENTS WITH TRUTH یا "تلاش حق" ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے ساری عمر سچ ہی بولا ہو لیکن ہم ان کے سچ کا مطلب آج تک نہیں سمجھ سکے۔

ماؤزے تنگ اپنی کتاب "چین کی نئی جمہوریت" میں لکھتے ہیں۔

"ہر دور کی صرف ایک ہی سچائی ہوتی ہے۔ اس سچائی کا تعین داخلی شیخی بگھارنے سے نہیں بلکہ خارجی عمل سے ہوتا ہے۔ لکھوکھا انسانوں کا محض انقلابی عمل ہی اس سچائی کو پرکھنے کی کسوٹی ہو سکتا ہے۔"

ہمارے دیس کے اس تاریخی دور کی سچائی کیا تھی؟ برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف عوام کی نفرت اور غصہ بڑھ رہا تھا اور وہ اسے ختم کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن گاندھی جی نے انھیں اپنے "دشمن" سے بھی محبت کرنے کا آپدیش دیا۔ ظالم حکمرانوں سے جھوٹی اُمیدیں وابستہ کیں اور ان کا ہر دیہ پریورتن کرنے کے لئے ستیہ آگرہ کا اندولن چلایا۔

نو آبادیاتی ڈھانچہ کے باعث دیس میں اس فلسفہ کے لئے فضا سازگار تھی۔ بیشتر آبادی کسانوں پر مشتمل تھی جو زمین سے بندھے ہوئے تھے۔ ہمارے مزدور بھی اسی کسان طبقہ سے آئے تھے۔ پریم چند بھی کسانوں سے اور درمیانہ طبقہ سے گہرا تعلق رکھتے تھے چنانچہ جائداد کے تحفظ کے اس فلسفہ کو قبول کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس پروگرام سے دیس کو آزادی ملے گی اور جائداد کے تحفظ کا یہ نظام ختم ہوگا۔

دراصل پریم چند کے ذہن میں یہ تضاد پہلے سے موجود تھا اور وہ اس لوٹ کھسوٹ کے نظام کو ختم تو کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سدھار اور ہردیہ پریورتن سے کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کا یہ فلسفہ عوام کے طبقاتی شعور کو کند کرتا ہے۔ کیونکہ وہ سرمایہ داروں کو سرمایہ کے اور زمینداروں کو زمین کے ٹرسٹی بتاتے ہیں۔ بھگوان نے انھیں سرمایہ دار اور زمیندار بنایا ہے۔ انھیں ختم کرنے کی

بجائے ان کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ اپنے سرمایہ کو غریبوں کی بھلائی کے لئے صرف کریں۔ پریم چند بھی شروع میں ایسا ہی یقین رکھتے تھے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں زمینداروں اور امیر آدمیوں کا "ہردیہ پریورتن" یعنی تالیف قلب ہوتی ہے "بیوہ" اور "بازارِ حسن" میں امیر آدمی ان ناداروں کی جان ہیں۔ وہ بیواؤں اور یتیموں کی بہبودی اور اصلاح کے لئے اپنی دولت وقف کرتے ہیں۔ وہ سماج کی طبقہ داری تقسیم کو نہ دیکھ کر انفرادی برائی بھلائی میں یقین رکھتے تھے۔ "بیوہ" کا بدری پرشاد بہت بڑا زمیندار ہے لیکن نیک انسان ہے۔ بیوہ پورنا کے لئے چار ہزار روپے بنک میں جمع کراتا ہے۔ لیکن اس کا بیٹا کملا پرشاد کمینہ اور بدمعاش ہے اور آخر میں اس کا بھی ہردیہ پریورتن ہوجاتا ہے۔

"پریم آشرم" یعنی "گوشۂ عافیت" میں طبقاتی شعور بہت اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ بلراج کو جو روس کے انقلاب سے متاثر ہے اور کسانوں اور مزدوروں کا راج قائم کرنا چاہتا ہے پس منظر میں رکھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں پریم شنکر کو ابھارتے ہیں جو اصلاح پسند اور انسان دوست ہے جو آشرم کھول کر اور محض تعلیم و تربیت کے ذریعہ زمینداروں کو اپنی زمین سے دست بردار کرا دینے میں اعتماد رکھتا ہے جو خود چوٹ کھا کر ڈاکٹر پریم ناتھ کو کسانوں کے عتاب سے بچاتا ہے۔ اسی ناول میں گیان شنکر خود غرض، کمینہ اور ظالم زمیندار ہے۔ لیکن اس کا بیٹا مایا شنکر آپ ہی آپ اپنی زمینداری سے دست بردار ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے لکھن پور ایک آدرش گاؤں بن جاتا ہے۔ جہاں سکول اور لائبریری ہے اور کسان خوشحال ہیں۔

اس لئے پریم چند کی اصلاح پسندی کا گاندھی جی کی اصلاح پسندی سے ڈانڈا مل جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ گاندھی واد سے متاثر ہوکر انھوں نے پہلا ناول "پردۂ مجاز" لکھا۔ جو غالباً ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا اس وقت کانگریس تحریک بند ہوچکی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کی جگہ ہندو مسلم دنگے شروع ہوگئے تھے۔ اس ناول کا ہیرو چکر دھر ایم۔ اے پاس ہے اور عوام کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہندو مسلم دنگا روکتا ہے۔ عوام کی خدمت میں جیل جاتا ہے۔ جب آسامیوں پر ظلم ہوتا ہے تو وہ جگدیش پور کے راجا کے پاس فریاد لے کر جاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ظلم چھوٹے حکام کرتے ہیں۔ راجا نیک ہے وہ اس کی فریاد سنے گا۔ فریاد نہیں سُنی جاتی۔ ظلم اور بڑھتا ہے۔ تنگ آکر کھاس مزدور مجسٹریٹ اور راجا کی پولیس پر حملہ کرتے ہیں۔ تب چکر دھر خود زخمی ہوکر مجسٹریٹ کو مزدوروں کے غصہ سے بچاتا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں۔

"وہ سوچ رہا ہے۔ یہ خونریز ہنگامہ کیوں ہوا۔ میں نے تو بھول کر بھی کسی سے یہ تحریک نہیں کی۔ یہ ہماری نیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پیغامِ صلاح میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہماری نیت صاف ہوتی تو مخلوق کے دلوں میں راجاؤں پر چڑھ دوڑنے کا جوش ہی پیدا نہ ہوتا۔"

لیکن "پریم آشرم" میں پریم چند نے غوث خاں کے قتل کی تائید کی ہے اور منوہر کو بہادر اور بیر آتما لکھا ہے۔ یہ گاندھی واد کا اثر ہے کہ وہ ظلم کے خلاف عوام کے غصہ کو نیت کا قصور بتاتے ہیں اور راجاؤں کی حفاظت کی فکر کرتے ہیں۔

گاندھی جی اور ان کے چیلے ہر برائی کو داخلی قرار دیتے ہیں اور نیت کا قصور بتاتے ہیں غلامی بھی ہماری نیت کا قصور ہے اگر ہندوستانی اپنی نیتیں درست کرلیں۔ تو انگریز ایک دن کے لئے بھی ان پر راج نہیں کرسکتے۔ انھوں نے تو بہار اور کوئٹے کے زلزلوں کو بھی عوام کی بُری نیتوں اور پاپوں کا پھل بتایا تھا جس کی ٹیگور نے سخت مخالفت کی تھی اور آج بھی لوگوں کو اپنی نیتیں درست کرنے کے لئے کہا جارہا ہے۔ رشوت خوری، کتبہ پروری بے ایمانی اور بلیک مارکیٹ اس لئے ہے کہ لوگوں کی نیتیں خراب ہیں۔ جن کسانوں کی بابت پریم چند نے اپنے تجربہ کی بنا پر کہا ہے کہ دنیا میں ان سے زیادہ محنت کوئی نہیں کرتا۔ انھیں محنت کرنے اور زیادہ اناج اگانے کا اپدیش دیا جارہا ہے۔

ہم جسے اپنا رہنما مان لیتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ پریم چند نے چونکہ گاندھی جی کو لیڈر مانا تھا اور خود بھی ان کے پروگرام کے مطابق سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوگئے تھے اس لئے وہ ان کے فلسفہ کی بھی تائید کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی ذہنی افتاد اور فطری رجحان گاندھی جی سے مختلف تھا اور وہ اصولوں کی بہ نسبت انسان کو عزیز سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے ذہن نے گاندھی جی کے فلسفہ کو کبھی قبول نہیں کیا۔

یہی نیت کا قصور بتانے والا چکر دھر دوسرے ہی لمحہ اس فلسفہ پر شبہ کا اظہار کرتا ہے "پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا؟"

نیت کو بھی وہ خارجی اور مادی حالات کی پیداوار سمجھتے تھے۔ "موٹھ" کہانی میں لکھتے ہیں:

"جس کا خانۂ آرزو ہمیشہ اندھیرا رہا ہو جس کی خواہشیں کبھی مسکرائی نہ ہوں۔ اس کی نیت خام ہو جائے تو تعجب کی بات نہیں۔"

پریم چند کی یہ حقیقت پسندی انکی اصلاح پسند کہانیوں اور ناولوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے آدرش ہیرو گاندھی واد کے فلسفہ کو پوری طرح قبول نہیں کرتے۔ انکے ذہن میں ہمیشہ ایک تضاد موجود رہتا ہے۔ "میدان عمل" میں سود خور اور بے ایمان سمر کانت اور دھنی رام جیسے سیٹھوں کا ہیرو یہ پریورتن ہوتا ہے۔ اور اس کا ہیرو امرکانت کسانوں کے حملے کو روک کر ان کی بے چینی کو ستیہ گرہ کی شکل دیتا ہے مگر پریم چند نے اپنے اسی ہیرو کی بابت لکھا ہے:

"امرکانت انقلاب ہی میں ملک کی نجات سمجھتا تھا۔ ایسے انقلاب میں جو عالمگیر ہو۔ جو زندگی کے غلط اصولوں کا، مہلک رسم کا اور مہلک بندشوں کا خاتمہ کر دے۔ جو ایک نئے دور کا حامل ہو۔ ایک نئی دنیا آباد کرے۔ جو مٹی کے ان گنت دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ کر زمین و زر کرے جو انسان کو ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکنے والے نظام حکومت سے آزاد کر دے۔"

پریم چند کے اس حقیقت پسند شعور کا گاندھی جی کے مذہبی عقیدے سے آخری سمجھوتہ ممکن نہیں تھا اسلئے انکی اصلاح پسندی کے ڈانڈے ایک بار گاندھی جی سے مل کر پھر رفتہ رفتہ الگ ہوتے گئے۔ اس سلسلہ میں انکی کہانی "بھاڑے کے ٹٹو" قابل ذکر ہے جس کا ہیرو پرکاش جیل سے رہا ہونے کے بعد سوچتا ہے:

"دنیا سب کے لئے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنیکا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ ڈاکہ ہے، نہ چوری چوری۔ دولتمند اگر اپنی دولت کو خوشی سے نہیں بانٹتا تو اسکی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ ہے۔ دولتمند اسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اسکا بنایا ہوا قانون سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہے اسکے سامنے وہ سبھی ملزم ہونگے جن کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے جیل سے نکلنے ہی اس نے جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا خفیہ انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ ہتھیار جمع کئے جانے لگے۔"

نمک تحریک کے گاندھی اروِن پیکٹ میں ختم ہو جانے کے بعد نوجوان جیلوں سے یہی شعور لے کر نکلے تھے۔ انھیں گاندھی واد میں ذرا بھی اعتماد نہیں رہ گیا تھا۔ "قاتل" کہانی کا ہیرو دھرم ویر اپنی گاندھی وادی ماں سے کہتا ہے:

"پکٹنگ کرنا اور جلوس نکالنا اور جے بلا ڈالکر جیل چلے جانا بچوں کا کھیل ہے۔ اس سے قومیں آزاد نہیں ہوتیں۔ آزاد ہونے کیلئے ظالم طبقہ کا خون بہانا پڑیگا۔"

"کفن" اور "گئودان" میں ان کا شعور اور آگے بڑھتا ہے۔ یہاں یہ احساس بڑی شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ خون چوسنے والا یہ نظام آدمی کی قوتِ کار کو سلب کر لیتا ہے۔ اسی لئے گھیسو اور اس کا بیٹا مادھو کام چور بن جاتے ہیں اور اس سماج اور اس کے رسم و رواج اور بندشوں کا ذرا بھی احترام نہیں کرتے۔ "گئودان" ان کی حقیقت نگاری کا شاہکار ہے۔ اس ناول میں انھوں نے موجودہ سماج کو اپنے ہی ظلم کے باعث ٹوٹتا دکھایا ہے۔ ہوری دن رات محنت کرتا ہے لیکن اس سخت محنت کے باوجود اس سماج میں وہ اپنی پوزیشن کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ زمین بیچ کر کسان سے مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر بھی دکھوں کا بوجھ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ بالآخر وہ ان کے تلے دب کر مر جاتا ہے۔ پیدا ہونا اور مر جانا معمولی حادثے ہیں۔ صرف دُکھ ہی اس کی زندگی کی ایک حقیقت ہے اور موت بھی اس دُکھ کا انت نہیں کر سکتی۔ اسے کسان اپنے بچوں کے لئے وراثت میں چھوڑ جاتا ہے۔

قاری کی تمام تر ہمدردی ہوری کے ساتھ رہتی ہے۔ آخر تک ہوری کے ساتھ رہتی ہے۔ ہوری اُردو دادرہندی ادب کا بہترین کردار ہے۔ اگر ہمارے ادب کی یہی رفتار رہی جو ہے تو شاید آئندہ پچاس سال میں بھی ہم ہوری کا بدل پیش نہ کر سکیں۔

بھرم ٹوٹنا کوئی معجزہ نہیں ارتقائی عمل ہے۔ "منگل سوتر" ادھورے ناول سے ظاہر ہے کہ "کفن" اور "گئودان" کے بعد بھی پریم چند کا یہ ارتقائی عمل جاری تھا۔ بیشک وہ ابتدا میں اصلاح پسند تھے اور سیاسی اعتبار سے انھوں نے گاندھی واد کو بھی اپنایا لیکن بقول احتشام حسین "پریم چند کی عظمت یہ ہے کہ وہ زندگی کے سفر میں کسی مقام پر رُکے نہیں"۔ اصلاح پسندی اور گاندھی واد ان کی خوبی نہیں کمزوری ہے۔ "ڈائل کا قیدی"۔ "پردۂ مجاز" اور "میدان عمل" وغیرہ کہانیوں اور ناولوں میں جہاں کہیں انھوں نے اس فلسفے کا پرچار کیا ہے۔ وہاں ان کے کردار غیر حقیقی اور ان کی تخلیق غیر دلچسپ ہو گئی ہے۔ ان کا آرٹ اور کردار نگاری وہیں اپنی معراج پر نظر آتی ہے جہاں انھوں نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی عکاسی کی ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ پریم چند کا ہمارے عوام کی زندگی سے گہرا تعلق تھا وہ انسان دوست واقع ہوئے تھے اور اصولوں کی بہ نسبت انسان کی زیادہ قدر کرتے تھے۔ اس لئے کوئی بھی عوام دشمن فلسفہ ان کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ "مس پدما" کہانی سے ظاہر ہے کہ فرائڈ کا فلسفہ انھوں نے پڑھا اور اسے عوام دشمن سمجھ کر مسترد کر دیا۔ گاندھی جی کے سیاسی پروگرام کو انھوں نے اس لئے اپنایا کہ اس سے دیش کے عوام کو آزادی ملیگی۔ گاندھی واد کو انکا ذہن اسلئے قبول نہ کر سکا کہ انھیں یہ فلسفہ عوامی مفاد کے منافی نظر آتا تھا۔

فراق گورکھپوری

عنوانِ نظم ڈھونڈھنے والے شاعر سے

(۱)

عنوان نظم کا ڈھونڈھنے والے جانے تو کس پھیر میں ہے
سڑکوں پہ نکل، بازاروں میں جا گلیوں کے چکر کاٹ کبھی
اِن چلتی پھرتی راہوں میں
تانگوں میں، بسوں میں، ٹراموں میں
ٹھیلے والوں، رکشے والوں، یکے والوں
کے اڈوں پر
اسٹیشنوں کے ہنگاموں میں
ٹرینوں کی ریلوں پیلوں میں
کاندھوں سے جہاں کاندھے چھلتے ہیں ایسے میلوں ٹھیلوں میں
راہوں پہ کھیلتے بچوں میں
دفتر کو جاتے بابوؤں میں
بیڑی والوں خوانچے والوں میں
تمبولیوں کی دوکانوں پر
ٹولوں میں محلوں میں قصبوں میں شہروں میں دیہاتوں میں
کھیتوں میں جھک مار رہے ہیں ان کنگال کسانوں میں
ملوں کارخانوں فیکٹریوں کے پٹ کٹے کامگاروں میں
بی۔اے۔ایل ایل بی، ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی
پڑھے لکھوں کی ٹولیوں میں
کہنے کو جن کی "اچھی خاصی" نوکریاں ہیں اُن کے
گھروں میں
بازاروں، اسکولوں، کالجوں اور وکالت خانوں میں
سول لائنوں اور پرانی گلیوں اور بستیوں میں
گنگا جمنا کے گھاٹوں پر
جیون کی راہوں باٹوں پر

وہ چہرے نظر آجائیں گے
وہ باتیں پڑیں گی کانوں میں
جو بڑے رزم ناموں سے بڑھ کر
مہا ناٹکوں سے بڑھ کر
دُکھ درد کی ماری اِس دُنیا کی ہیں مُنہ بولتی تصویریں
جو زہر میں ڈوبی مہا جنی تہذیب کے گھور بھیانک پن کی
پلکوں پلکوں میں رام کہانی کہتی ہیں
جو دھرم راج اور رام راج کا سارا بھید بھرم کھودیں
وہ آنکھیں پڑیں گی شاعر پر جن آنکھوں سے نرک
جھانکتا ہے
وہ لوگ نظر آئیں گے تجھے جو اُلٹی سانسیں لیتے ہیں
جن کی ہر چال مورچھا[1] ہے ہر گام پہ تیور آجائے
جو پھرتے ہیں اپنی گردن سے اپنی لاشیں لٹکائے
جو اپنے جیتے مُردوں کو چلتے ہیں کاندھے دیے ہوئے
اے شاعر کیا
یہ اپنے پاؤں چلنے والے جنازے تو نے دیکھے ہیں؟
ان چلتے پھرتے مرن کرنکا گھاٹوں[2] کی شوبھا دیکھی؟
سینوں کی چتاؤں سے جیسے دن رات دُھواں سا
اُٹھتا ہے
اس جیون۔دُکھ سے لدے کارواں میں تیرا دم گھٹتا ہے
ان پیاری بھیانک تصویروں کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کبھی

---

[1] مورچھا۔ عالم غشی
[2] بنارس میں مرن کرنکا گھاٹ پر مُردے جلائے جاتے ہیں۔

یہ تیرے ہر خوابِ شیریں کا مُنہ بھبھوڑ کر رکھ دیں گی
ترے ساکت بے جان تخیّل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیں گی
یہ زندہ موت
اے کاش چوم لے ترے مردہ تخیّل کو
اس چُمبن[1] کے امرت سے وہ جُگ جُگ کو امر ہو جائیگا
تو عنوانوں کو ڈھونڈھ رہا ہے عنواں تجھ کو ڈھونڈھ رہے ہیں
وہ دیکھ
ہزاروں عنواں لاکھوں عنواں
تجھ کو گھیرے ہوئے ہیں
اَن گنت مضامیں ٹھٹھ کے ٹھٹھ ہیں لگے ہوئے
جھوٹی سونی داخلیت کو چھوڑ
اپنے تخیّل سے چھو اس دھرتی کو
اس دُنیا سے رشتہ تو جوڑ
کیا عنواں کا ہے کال یہاں
دنیا کے
جیون کو لگا لے چھاتی سے
پھر دیکھ کہ موضوع اور عنواں
پھٹ پڑیں گے تجھ پر جیسے جوبن جیون پر پھٹ پڑتا ہے
جیسے اک دیکے اگن کُنڈ سے لاکھوں شعلے بھڑک اٹھیں
یا جیسے سرکہسار دُھواں اُٹھتا ہے مست گھٹاؤں کا
جیسے پردوں کو چھیڑتے ہی اَن گنت ساز بج اُٹھتے ہیں
جیسے موسم کے بدلتے ہی صحرا گلشن جاگ اُٹھتے ہیں
یا رن پڑتے ہی اُبل پڑیں لاکھوں میانوں سے تلواریں
یا جیسے
مُردہ سماج میں انقلاب آتے ہی جان پڑ جاتی ہے
یا جیسے
جوالا مکھی نیند پوری لیکر پھٹ پڑتا ہے
عنواں اور موضوع برابر برس رہے ہیں
دیکھ ان گنت چھاتیوں سے، پھنکتی کوکھوں سے
وہ رہ رہ کے دھواں اُٹھتا ہے، اسی دھوئیں کے
بادل سے، ــــ بجلی اور پانی
بن کر برس رہے ہیں، ٹوٹ رہے ہیں
لاکھوں عنواں لاکھوں موضوع
آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں خیال کی اس بجلی سے
اس برکھا سے
اندیشے کا بال بال بھیگ اُٹھتا ہے
غم کے اور خوشی کے چھینٹے چھٹ جاتے ہیں
عنوانوں کے اس طوفاں میں
پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں، شاعر، فکر و بیاں کے
سانس اُکھڑ جاتی ہے، ہوائی نغموں کی
اُتر خلا سے
اس قرباں گاہِ انساں کو
اس خون بھری دھرتی کو
چھو لے
جیون کے بلیدان بھوم کو چھو لے
لہو میں تر زخموں کو چُوم چُوم لے
دیکھ نظر بھر کے دھرتی کو
لاکھوں عنوان خاک اور خون میں لوٹ رہے ہیں
کتنا بھیانک سناٹا ہے
گھلے گھلے تارے ہیں، دھرتی دھواں دھواں ہے
صبر و سکوں کے مُنہ پر ہوائی چھوٹ رہی ہے
مرگ و حیات کی یہ سرگوشی
ہستی اور عدم کی اُف یہ کانا پھوسی
اُف یہ اشارے بے شمار گونگے ہونٹوں کے
جیون کی ان گنت پکاریں بے زبان ہیں
لاکھوں عنواں تجھ کو آج قسم دیتے ہیں
لاکھوں عنواں تجھ سے دانی[2] مانگ رہے ہیں
تجھ سے اپنی رام کہانی مانگ رہے ہیں

---

[1] چُمبن = بوسہ

[2] دانی = قوتِ بیان و اظہار

ان عنوانوں کو نغموں سے امر بنا دے
دنیا کو اپنی لے کا آئینہ دکھا دے

(۲)

ارے مہابھارت سے کئی گنا بڑھ کر تھا
بہت بھیانک بہت اہم تھا
وہ گھور بھیانکر مہا جدھ جو پانچ مہادیپوں[1] میں
چھ برسوں تک انگارے برساتا ہوا تمام ہوا
دیش دیش میں، دیپ دیپ میں موت کی دیوی
ناچ رہی تھی
ہٹلر نے اتنے سپاہیوں کو اس رن میں جھونک دیا تھا
ہر فوجی کے لئے
اتنے لوگ کام کرتے تھے جن کی گنتی
لاکھوں نہیں کروروں تک پہونچے گی
دنیا کا سب سے زبردست لشکر
روس پر ٹوٹ پڑا تھا
روسیوں کا مقابلہ
روسیوں کی قربانی
دنیا کی تاریخ جنگ کا
سب سے خونی سب سے اہم باب ہے
سب سے تابندہ رخشندہ ورق ہے
روس امر ہو گیا
اس آتشکدہ میں پڑ کر
مرغ سیاہ سے ٹکرا کر
آگ اور فولاد کی بڑھتی ہوئی چٹانیں
چور چور ہو گئیں
تو عنوان ڈھونڈھتا ہے
موضوع سوچتا ہے
یہ بھی سوچا
کتنے بھیشم پتامہ، کرن بھیم، ارجن، ابھیمنیو
کتنے درونا چاریہ، جدھشٹر، اشوتھاما
کتنے رام، لکشمن، انگد، مہابیر، دریودھن
کتنے پرتھوی راج، غوری، بابر، سانگا
کتنے رستم، کتنے سہراب، کتنے افراسیاب
کتنے اکبر، رانا پرتاپ، کتنے اورنگ زیب، کتنے
شواجی
کتنے ٹیپو، کتنے سرنگا پٹم
کتنے مہوبا، کتنے پانی پت، کتنے چھتیس گڈھ
کتنے راجستھان، کتنے چتوڑ، کتنے بھرتپور
کتنی ہلدی گھاٹیاں
کتنے جلیاں والے
دھول میں، دھوئیں میں، دھائیں دھائیں میں دھماکوں
میں اڑ گئے

جگ جگ کو امر ہو گئے
کرک کھشیتر کے رن سے
بہت بڑا رن تھا
اسٹالن گراڈ کا رن
وہاں کے بچے بوڑھے تک
آگ میں کود پڑے تھے
نہیں
خود آگ کے بے پناہ شعلے بن کر
لہراتی بجلی بن کر
دشمن پر ٹوٹ پڑے تھے
دشمن کی آگ کو
یہ آگ نگل گئی
سٹالن گراڈ کا بچہ بچہ
بیک وقت صدیوں کی
تاریخی جنگوں کے
امر بہادریوں کا
اوتار بن گیا
روس کی ہر عورت درگا بن گئی

---

[1] پانچ مہادیپ = ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا

روس نے رہتی دنیا کو
چھتیس کرور بازوؤں سے
بچا لیا
کچ لوہے کی ہر سنسیا
گانڈیو دھنش[1] بن گئی
ہتھوڑے
بجر[2] بن گئے
کارخانوں کے پہیے
لاکھوں چکر سُدرشن بن کر ٹوٹ پڑے
ماسکو سے برلن تک
نازی سینا کو چیر گئے
بھگدڑ مچ گئی
روس کو
بے لاگ چبا جانے والوں کے
دانت کھٹے ہو گئے
لال سینا نے
جنگ کا پاسا پلٹ دیا
دنیا کا پاسا پلٹ دیا
برلن پر دھاوا بول دیا
رائخستاغ پر ہنسیا اور ہتھوڑا لہرا اُٹھے
جیون کے انمول مان[3] مٹنے سے
بال بال بچ گئے
یہ سنگرام[4]
دیو دُنج سنگرام[5]
سے بہت اہم تھا
بہت بڑا تھا

روس میں جو آگ لگی تھی
وہ خون چاٹ کے باغ بن گئی
روس کی پاک دھرتی
لہلہا اُٹھی جگمگا اُٹھی
لاکھوں کرشنیتروں سے ادھک دمک اُٹھی
غیبی بصیرت رکھتا ہوا سنجے کوئی
اس عظیم مہابھارت کو
اس مہاکاویہ کو
جو اس کے دیکھتے ہوا
امر وانی دے دیتا
تو لوک لوکانتر
گونج اُٹھتے اس کہانی سے
اندھے دھرتراشٹروں کی آنکھیں کھل جاتیں اور
تو ہے کہ تیرے آگے اپنے گرم خون سے
اتنی گیتا میں لکھ گئے روس کے شہید
پھر بھی تجھے اپنی نظموں کے واسطے
عنوان ہاتھ آتے نہیں
سچ ہے سامنے کی چیزیں
ہاتھ نہیں آتیں، دکھائی نہیں دیتیں
دُور کے ڈھول سہانے والی مثل ہے
دُنیا سے منہ موڑ کر دُنیا کو ڈھونڈھنا
پاگلوں کا کام ہے منہ موڑ کر دنیا سے
عنوان کی تلاش شاعری نہیں ہے دیوانگی بھلے ہی ہو
اندھے اور بہرے رہ کر شاعری نہیں ہوتی
دھرتی سے اسہیوگ[1] اندھا کر دے گا تجھے
بہرا کر دے گا تجھے گونگا کر دے گا تجھے
مُردہ کر دے گا تجھے
یہ دھرتی جو ناچتی ہے گاتی ہے، اسی کے تو
بادل اُڑے ہوئے پسینے ہیں، اسی کے تو

---

[1] گانڈیو دھنش = وہ کمان جو سمندر کے دیوتا نے ارجن کو دی تھی فتح مہابھارت کے لئے [2] بجر = اندر کا حربۂ جنگ جو بجلیوں سے بنا ہوا ہے [3] مان = قدر۔ قدریں [4] سنگرام = لڑائی۔
[5] وہ جنگ جو فرشتوں اور شیاطین کے درمیان ہوئی۔

[1] اسہیوگ = ترک تعاون

عکس ہیں یہ تہہ افلاک
اسی کے تو
سورج چاند تارے سب آرتی اُتارتے ہیں
جیون، کالا، کوتا
سب اسی دھرتی پر
اُگتے ہیں، پنپتے ہیں پروان چڑھتے ہیں
ہاں تو
اے کھوئے کھوئے شاعر
تو کھو گیا ہے
عنوان نہیں کھوئے ہیں
روس۔ جرمنی سنگرام
دنیا کی سب سے بڑی جنگ تھی
کتنے والمیکوں کو کتنے ویدویاسوں کو
کتنے ہومروں، ورجلوں، کتنے فردوسیوں کو
کتنے پشکنوں، کتنے رونددرناتھوں،
کتنے گورکیوں، کتنے ٹالسٹایوں کو
کتنے ابوالفضلوں، فیضیوں، کارلائلوں کو
لاکھوں رزم ناموں کے لاکھوں نظموں کو تاؤں
رچناؤں کے
سامان دے گئی، خزانے لٹا گئی
یہ جنگ ——————
اور سُن
امریکہ انگلستان
تماشا دیکھتے رہے روس کے جلنے کا
کبھی کبھی دو ہلکے ہاتھ چلا دیتے تھے
کہنے کو ہم بھی پانچ سواروں میں تھے
لہو لگا کر ہم بھی شہیدوں میں شامل ہیں
دوسرا مورچہ[1] اب کھلتا ہے اب کھلتا ہے
سوچا یہ تھا

روس اور جرمن سنگرام
دو سانپوں کی لڑائی ہے
دونوں مر جائیں گے
سانپ مرے لاٹھی بھی نہ ٹوٹے
سوچا یہ تھا
کہ جلی بھنی دُکھ کی ماری دُنیا سے
اشتراکیت کا، جمہوریت کا، ترقی کا
مزدور راج کا نام مٹ جائے
پھر تو پانچوں گھی میں ہیں
پھر تو چاندی ہے یاروں کی
پھر تو پو بارے ہیں اپنے
یہ بین الاقوامی
وشواس گھات
یہ جہاں دشمنی
یہ چرچل کی رائچس نیت[2]
ٹھیک ہے
جنگ کے باوجود
ہٹلر ان کا باپ تھا ٹو چچا تھا
مسولینی خالو تھا اور جتنے ٹوڈی
اور کوزلنگ تھے
سب ماموں بھانجے تھے
یہ تو گھر کی لڑائی تھی
قسمت سے روس آ پھنسا تھا——
وہ روس کہ جس کو ڈبل کراس کرنا ہے
شاعر! یہ سب ہو گیا تری آنکھوں کے آگے
اب تک تیری زباں کا شعلہ سویا ہوا ہے
ترا دماغ، ابھی تک سپنے دیکھ رہا ہے
اونیند کے ماتے
اب تک تیری شاعری

---

[1] دوسرا مورچہ یا دوسرا محاذ یا سکنڈ فرنٹ

[2] نیت = پالیسی DOUBLE CROSS

خواب کی بڑبڑاہٹ تھی
پرانی داد تہذیب کی
گھنٹی ڈکار تھی
تیرے نغمے تیرے الاپ، تری میٹھی لے۔
کلورو فارم کی دھونکنیاں تھیں دھواں تھیں
خواب میں ان خیالی خزانوں کو پاکر
یہ نہ سمجھا کہ خواب میں پاکے دولت
کوئی دولتمند نہیں ہو جاتا
اسی سے تو کچھ چونک کر اب تجھے یہ پتہ چل رہا ہے
کہ دیوالئے کا دیوالیہ رہ گیا تو
اسی سے تو اب نظم کی سرخیاں
نظم کے نام عنواں موضوع
تو ڈھونڈتا پھر رہا ہے
جنگ ہو امن ہو عشق ہو حسن ہو
کوئی عنوان ہو کوئی موضوع ہو
شاعری کے لئے زندگی شرط ہے
زندگی سے فرار
آج تک شاعری کا محرک نہیں بن سکا
زندگی شرط ہے زندگی سے خلوص
دھرتی کے ذرّے ذرّے سے ہمدردیاں
رنج و محنت کشوں سے ہم آہنگیاں
زندگی سے تعاون، محبت، لگن
شرط ہے
چھوت کرتا ہے تو زندگی سے اگر
زندگی چھوت تجھ سے کرے گی
شاعری اور عنوان و موضوع بھی
چھوت تجھ سے کریں گے
اور تو عنوان و موضوع رہ جائے گا ڈھونڈھتا
——— بات آئی سمجھ میں؟

(۳)

بات سے بات اکثر نکلتی ہے شاعر
تونے رومانیہ کا نام سُنا ہے؟
ہنگیری بھی کسی دیش کا نام ہے؟
اہل بلغاریہ کی خبر ہے تجھے؟
تجھ کو چیکوسلاوک قوم کا ہے پتہ؟
تونے البانیہ کا نام سُنا ہے!
اور پولینڈ کا؟
کچھ خبر ہے کہ باشندے اِن دیسوں کے
کیا سے کیا بن گئے کیا سے کیا کر گئے
وہ بھی انسان ہی ہیں ہماری طرح
پھر بھی کیا کر گئے پھر بھی کیا بن گئے
ان لوگوں نے
کاٹ ڈالے ہیں صدیوں کے پاپ
نئے تمدّن کی کھیتی لہلہا رہی ہے
ان دیشوں میں جیون ساگر ٹھاٹھیں مار رہا ہے
ان دیشوں کی دھرتی سونا اُگل رہی ہے
ان دیشوں کے آکاش امرت برساتے ہیں
روس اور ان دیسوں کے کاندھے سے کاندھے ملے ہوئے ہیں
سب مل کر آگے بڑھتے ہیں
قدم مارتا آگے بڑھتا ہوا کارواں
کئی گھاٹیوں کے موڑوں سے گذر رہا ہے
اور منزلیں گرد کی طرح اُڑی جاتی ہیں
کل تک بالکان کے یہی دیش تھے
یورپ میں مرغوں کی جہاں پالی لڑتی تھی[1]
یورپ کا نرم اور نچلا پیٹ بتاتے تھے چرچل ان کو[2]
سرمایہ داری اور سامراج کے پنجے
ان دیشوں نے توڑ دیئے
ان دیشوں میں نئی زندگی نئے تمدن کی کرنیں جگمگا رہی ہیں

---

[1] THE CLOCK-PIT OF EUROPE
[2] THE SOFT UNDERBELLY OF EUROPE

وہ زرّیں توپھوٹ رہی ہے
اشتراکیت کی صبحوں میں
جیون کا گھڑا دمک اُٹھا ہے
یہ دیش ——————
حقیقتوں کے خزانے لُٹا رہے ہیں آج
دنیا کی تاریخیں بدل رہے ہیں یہ دیس
دیکھ عنوانِ نظم دیکھ موضوعِ نظم
آج ان دیسوں کے ذرّے ذرّے کی پیشانی پر
ہیں جھلکتی کئی نظموں کی سُرخیاں

(۴)

کبھی کبھار تو شاعر تیری نظر
اخباروں رسالوں پر پڑ جاتی ہوگی
زندگی سے اس درجہ ترکِ تعاون بھی کیا
خیر جانے دے، تو نے سُنا
چین کے لوگوں نے جن کی تعداد آدھا ارب ہے
تُو تو کچھ اوبنے سا لگا
جیسے اُکتا گیا جیسے گھبرا گیا
تجھ کو گنتی، شمار، آنکڑے
خشک و بے معنی چیزیں نظر آتے ہیں
ان سے ہوتی ہے وحشت تجھے
یہ مگر یاد رکھ
آنکڑوں کا اثر جس پہ ہوتا نہیں
آنکڑے جس کو بے چین یا مطمئن
کر نہیں سکتے وہ آدمی آدمی ہی نہیں
اس پہ تہذیب کا کچھ اثر ہی نہیں
اس کی تخئیل میں جان ہی کچھ نہیں
چھوٹی موٹی دماغوں کو کیا واسطہ
زندگی شاعری اور سچائی سے
چھوٹی عینیت ہی
گھبراتی ہے آنکڑوں سے
ہاں تو آدھے ارب چینیوں نے سُنا

آدمیت کی تاریخ ہی دی بدل
ایشیا کی تو تقدیر ہی دی بدل
جنم جنم کا پاپ کاٹ کر
جنم جنم کے لئے رکھ دیا
چینیوں کی ایک ایک سانس میں
کئی مہابھارت پنہاں ہیں
نئے تمدن کے سُورج کا نیا اُفق
دیوارِ چین ہے۔
آج امریکہ اسی سورج سے ٹکرا کر
سر پھوڑ رہا ہے
کوریا میں
نظم کے عنوانوں کے لشکر
اُگتے ہیں ذرّے ذرّے سے
دیکھ شہادت گاہِ کوریا
شانِ بدر، ناموسِ کربلا

(۵)

برما میں ملایا میں ویت نام میں
تو اتنے ناموں سے گھبرا نہ اٹھا ہو ——
شاعری اور جغرافیے میں
گہرا رشتہ ہے
دھرتی
اور دھرتی کا جغرافیہ
شاعری زندگی کے یہ گہوارے ہیں
دھرتی کا سنگیت امر ہوتا ہے
سدا سہاگ یہی سنگیت ہے شاعر
ہوائی گیت
ہواؤں پہ تیر کے رہ جاتے ہیں
اور خلاؤں میں گم ہو کے رہ جاتے ہیں
آج کئی دیسوں میں اس دھرتی پہ
سامراج اور قومیت میں
سامراج اور وطنیت میں

جمہوریت، سامراج میں
فیصلہ کن جنگیں جاری ہیں
اور تو سو رہا ہے
عنوان کو رو رہا ہے
خود کو خلا میں کھو رہا ہے
آج تیری زبان پر
فالج گر پڑا ہے
کس سنکوچ نے شاعر
ہونٹ سی دیئے ہیں تیرے
تیرے خیالوں کا
مُنہ بند ہو گیا ہو جیسے
دانت بچی[1] ہو گئی ہے تجھ کو
یہ تو وہ جگ ہے شاعر
جس کے اشاروں سے
جس کے سہاروں سے
"پنگ چڑھیں گرو رگھن موک ہوئیں واچال"[2]

(۶)

دُور نہ جا شاعر
پھر بھارت پر ایک نظر کر
یہاں جو سچی جھوٹی آزادی ہے
صاف روس کی قربانیوں کا ثمرہ ہے
اسٹالن گراڈ فتح ہو جاتا
تو مغرب سے ہٹلر مشرق سے ٹوجو
دلی میں آکر ہاتھ ملاتے
کتنوں نے اس کو سمجھا ہے
کتنوں نے اس کو سوچا ہے
کہ روس ہار جاتا تو
دُنیا کا، بھارت کا
حال کیا ہوتا آج
روس مٹ جاتا تو
دُنیا میں بچتا کون
روس مر جاتا تو
دنیا میں جیتا کون
گاندھی واد[3] نے
ہند کو جھوٹی دکھاوٹی
آزادی دلوائی
نام کی آزادی
کام کی نہیں
ڈالر سامراج اور اسٹرلنگ سامراج کی
ٹھنڈے سہانے زہریلے پیارے سائے میں
سیٹھوں کا راج ہے
چور بازاریوں کا راج ہے
بیماریوں کا راج ہے موت کا راج ہے
رشوت کا راج ہے
بے روزگاری اور بھوک کا راج ہے
کتنی اُداسی ہے
ماحول کی سانسیں رُکی ہوئی ہیں
فضاؤں کا دم گھٹ رہا ہے
دھرتی کی نبضیں چھوٹ گئی ہیں
جو ہو لیکن
اس مہاجنی راج سے
رن پڑ چکا ہے
لاٹھیاں، بیڑیاں، گولیاں، پھانسیاں
بپھری ہوئی جنتا کی اگن پہ کھچا ہے
ایسے میں شاعر
چپ لگ گئی ہے تجھ کو

---

[1] دانت بچی =
[2] تلسی داس کا مصرع ہے یعنی لنگڑے لونجے پہاڑوں پر چڑھ جائیں گونگے بول اٹھیں۔
[3] گاندھی واد :- GANDHISM

چپ رہتے رہتے
چھالے نہیں پڑ گئے
تیری زبان میں
آنکھیں بند رکھتے رکھتے
چیک نہیں گئی پلک پلک سے
جاگ اب من کی جوت جگا لے
کوئی اس حکومت سے
خوش نہیں ہے
زندگی اور شاعری
ودیا اور کلا
سب کے لئے جان لیوا ہے
یہ بے ایمان نظام
یہ مہاجنی حکومت
سب کا اعتبار اٹھ گیا ہے
لیڈروں منسٹروں پر سے
بھوکی، ننگی، ستائی ہوئی
جنتا کی سانسوں سے
بارود کی بو آ رہی ہے
یہی تو وقت ہے
نظم کے تانڈو[1] کا

اے زندہ جوالا مکھی
پھٹ جا
اور جنتا دشمن طاقتوں پر
اپنے نغموں کی
پگھلی آگ برسا دے
لاوا برسا دے
موت برسا دے
جیون برسا دے
زہر برسا دے
امرت برسا دے
جگ کے تیور دیکھ شاعر
بھارت کے للاٹ پر
قیامت کی نشانیاں دیکھ
نظم کے تانڈو کا
یہی تو وقت ہے
دیش کو انقلابی نغموں
کی آتش باری سے نہلا دے
تیرے آگ اگلنے والے منہ سے
نئی زندگی نئی صبح کا
سورج نکلے

---

[1] تانڈو = شیو یا مہادیو کا رقصِ اجل

کیا آپ اپنے حصے کا

شاہراہ

کا ایک نیا ساتھی بنا چکے ہیں؟

اگر نہیں

تو آج ہی توجہ دیجئے اور شاہراہ کے تحفظ میں ہمارا ہاتھ بٹائیے

غلام ربانی تاباں

ایران

نظر تو آنے لگے زندگی کے کچھ آثار
کھلا نشانِ سحر ظلمتوں کی وادی میں
سجا ہے میکدہ خیام کا بہ طرزِ نو
بہار آئی ہے پھر بوستانِ سعدی میں

عوام جاگ اُٹھے ہیں ــــ سُلا نہ پائینگی
ہزار وعدہ و پیماں کی لوریاں ان کو
نئے شعور نے گرما دیئے ہیں قلب و جگر
خرید اب نہ سکیں گی تجوریاں ان کو

سمجھ چکے ہیں وہ شاطر فرنگیوں کی چال
فریب ان کی سیاست کا اب نہ کھائینگے
بھلا یہ رستم و سہراب کے جگر گوشے
رذیل گیدڑوں کی بھبکیوں میں آئینگے؟

ابھی تو ایک سے پیچھا نہیں کٹا ہے مگر
حریص نظروں سے تکتا ہے دوسرا صیاد
ہزار دعویٔ تعمیرِ خلد کے باوصف
چمن میں آگ لگا دے گا یہ جہیم نژاد

جہانِ نو سے بصد ادعائے ربطِ دلی
سلام آتے ہیں تازہ پیام آتے ہیں
مگر یہ خوب سمجھتے ہیں ساکنانِ چمن
کہ ہر پیام کے پردے میں دام آتے ہیں

یہ تیل تیل نہیں خونِ گرمِ معدن ہے
نہ پینے دیں گے لہو اب سفید جونکوں کو
بجھانا چاہیں جو طوفان شمعِ آزادی
تو بڑھ کے سینوں پہ روکیں گے تند جھونکوں کو

بلراج کومل

یہ لوگ

اس شام کی رنگینی سے جو بات چلی تھی
شب بھر وہ مری فکر کو سہلاتی رہی تھی

جو لوگ وہاں آئے تھے سب شوخ جواں تھے
ہر بات پہ ہنستے تھے، اُچھل پڑتے تھے اک دم
کتنے ہی مضامین دماغوں نے نوازے
کچھ حُسن کی، کچھ عشق کی، کچھ خواب کی باتیں
محبوب کی آنکھوں میں اُتر جانے کے ارماں
ساقی کی اداؤں سے لپٹنے کی اُمنگیں
ہونٹوں پہ کوئی آہ کسی یادِ حسیں کی
کچھ رنگِ سیاست پہ نگہِ فکر کی رحمت
لوگوں کے، زمانے کے، کتابوں کے فسانے
اُمید کی پلکوں پہ کسی شکوے کے آنسو
سینوں کی کسی تلخیٔ بے نام کے لب پر
آخر میں کسی جنگ کی افسردہ حکایت

محفل کی تمازت میں بڑے ناز سے بیٹھے
یہ لوگ کسی زلف کو سلجھاتے رہے تھے

اک میں بھی تھا خاموش و پریشان وہاں پر
ہر لمحہ مری نظروں نے محفل کو ٹٹولا
شاید کہیں مل جائے کوئی ننھا شرارہ
اک نقطہ جہاں رکتی ہیں مقصد کی نگاہیں
یہ لوگ مرے دوست مسرت کے بھکاری
باتوں کے سوا ان میں کوئی بات نہیں تھی

چپ چاپ مرے اُٹھ کے چلے آنے پہ دل نے
احساس کے کانوں میں دھڑک کر یہ کہا تھا:
یہ لوگ پریشانیٔ تسکین کے مارے
ناکام تمناؤں کے تنکوں کو سنبھالے
خوابوں کے سمندر میں بھٹکتے ہیں مسلسل
گو تم بھی ہو ان میں سے مگر ان سے جُدا ہو
گر آتے ہو ہر روز انھیں ملنے کی خاطر
یوں آؤ کہ محفل کو کوئی نقطہ سجھا دو
تسکینِ نگہ و دل کے نئے ڈھنگ سکھا دو۔!؟

احمد راہی

ماضی اور حال

——— میں جہاں تھا
وہاں تیرگی تھی، خموشی تھی، افسردگی تھی
میرے کان نغموں سے محروم تھے،
سسکیاں میرے ہونٹوں کی میراث تھیں
میری آنکھیں کسی شعلۂ نور کی منتظر تھیں،
میری زندگی راکھ کا ڈھیر تھی!

——— میں یہاں آ گیا
اس تیرے خلد میں
اُن مسلسل دُکھوں سے، غموں سے، اذیت سے بچنے کی خاطر
کہ جن سے فقط ایک میں ہی نہیں،
میرے جیسے کئی اور بھی جاں بلب تھے
تیرا خلد میرے لئے، میرے جیسے کئی دوسروں کے لئے
روشنی، نغمگی، سرخوشی کی علامت تھا یہ!

——— میں جہاں ہوں
وہاں تیرگی ہے، خموشی ہے، افسردگی ہے
مرے کان نغموں سے محروم ہیں،
سسکیاں میرے ہونٹوں کی میراث ہیں
میری آنکھیں کسی شعلۂ نور کی منتظر ہیں،
مری زندگی راکھ کا ڈھیر ہے!

۱۹۴۱ء

رونمائی

کب سے سرمایہ پرستوں نے بنایا یہ سماج ؟
زندگی موت کے پنجوں میں ہے لرزاں کب سے ؟

دوڑتا کب سے ہے انسان کی شریانوں میں زہر؟
کب سے ظلمات کے نرغے میں گرفتار ہے دہر؟

کب بچھائے گئے راہوں میں رسومات کے جال؟
کب سے طاری ہے زمانے پہ فسونِ طبقات

آدمی کب سے ہے ابلیسِ توہّم کا غلام ؟
کب زر و سیم پہ قائم ہوا مجذوم نظام ؟

اپنے بچّے کی بھی گر پہلے پہل دیکھئے شکل
جذبۂ عشق سے بازی گرئ سیم و طلا

نذرؔ کچھ" کیجے کہ مقیاسِ محبّت ہے یہی
اور سب جھوٹ ہے بس ایک صداقت ہے یہی

ہر طرف پھیلی ہوئی سونے کی زنجیریں ہیں
زیست سکّوں کے ترحم کے سوا کچھ بھی نہیں

جس میں لیلائے محبّت کا جگر بھی ہے اسیر
یہاں اُٹھتا ہے زر و سیم سے انساں کا خمیر

ساتھیو! توڑ دیں یہ سلسلۂ سیم و طلا
آؤ! نابود کریں لعنتِ اوہام و رسوم

آؤ! لیلائے محبّت کو اب آزاد کرائیں
جہل و افلاس و غلامی کے نشانات مٹائیں

ساتھیو! گلشنِ آدم میں خزاں کیا معنی ؟
تا کجا محفلِ احساس میں سکّوں کی کھنک
آ رہی ہے نئے انداز سے سلمائے حیات
اس کی پیشانی پہ ہے سُرخ ستارے کی لہک

حبیب جالب

○

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے
کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے
آج بھی نگاہوں سے وحشتیں نہیں جاتیں
آج بھی نگاہوں میں کائنات ویراں ہے
تیرے گیسوؤں ہی پر میری جاں نہیں موقوف
ذرّہ ذرّہ ہستی کا آج کل پریشاں ہے
ٹوٹنے ہی والا ہے اب فسوں تشدّد کا
بے کسوں کے اشکوں میں انقلاب پنہاں ہے
مل ہی جائیگی منزل کٹ ہی جائیگی مشکل
اے مرے نئے ساتھی کس لئے ہراساں ہے

امین راحت چغتائی

○

اک زمانے کی خاک چھانے ہیں
تیرے درویش کس کی مانے ہیں
تیرہ راتوں میں صبح کی دُھن میں
جن پہ بیتی ہے وہ ہی جانے ہیں
غم تو بس آپ کا حقیقت ہے
اور جتنے ہیں سب فسانے ہیں
تجھ سے بھی ہو سکی نہ چارہ گری
جو دِوانے تھے وہ دِوانے ہیں
جیسے تیرہ سے، جیسے روشن سے
کیا جُدائی کے بھی زمانے ہیں!
جن کو ملنا ہو، مل ہی لیتے ہیں
اک نہ ملنے کے سو بہانے ہیں
چھوڑو راحتؔ جی طوفِ بادہ و جام
بے مروّت شراب خانے ہیں

بلونت گارگی

برلن کی تیاری

پٹیالہ سکریٹریٹ کے منشی نے جو پٹیالہ شاہی پگڑی باندھے ہوئے تھا میرے پاسپورٹ کے کاغذات دیکھ کر پٹیالہ شاہی زبان میں کہا۔

"تمہارے سارٹی فکیٹ میں ڈاکٹر نے یہ لکھا ہے کہ پاسپورٹ لینے والے شری بلونت گارگی کی صحت جسم اور دماغ تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہمانوں یہ کیسے پتہ چلے جو تم جہاز کا سفر بھی کر سکدے ہو ـــــ ڈاکٹر تے یہ مُڑ لکھو اکر لاؤ۔ کہ تم سفر کے قابل ہو۔ کیا پتہ آپ جہاز میں ہارٹ فیل ہونے پر مر جائیں ـــــ"

یہ کہہ کر اس نے کاغذات کا پلندہ مجھے واپس تھما دیا۔ میں اس سے کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت اس کا ایک دوست آگیا جو محکمہ آبکاری میں داروغہ تھا۔ منشی اور داروغہ باتیں کرنے لگے۔ داروغہ منشی کو شراب کی قسمیں گنوا رہا تھا ـــــ "سنگترے اور انناس کی شراب، کدو اور کریلوں کی شراب، گڑ اور چھال کی شراب ـــــ"

میری بات دب کر رہ گئی اس کے بعد میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے پاس گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے سکریٹری کے پاس بھیجا۔ سکریٹری نے انڈر سکریٹری کے پاس، انڈر سکریٹری نے چھوٹے سکریٹری کے پاس ـــــ اور ان سب نے مل کر مجھے پھر اسی منشی کے حوالے کر دیا جسے آتے دیکھ کر منشی نے کہا۔

"تم پھر آگئے ہو۔ جی، کام تے ہانے ہی کرنا ہے اُدھر کے افسران کیاں تاں باتاں ہی باتاں ہیں۔ تم نوں ہم نے کہہ دیا کہ ڈاکٹر کا سارٹی فکیٹ دبارہ بنوا کے لاؤ"

میں نے منت کی۔ "جی آج ۱۸ر جولائی ہے۔ میں ۱۸ر جولائی تک چلا جانا چاہتا ہوں۔ مجھے ہر حالت میں یکم اگست تک پیرس پہنچنا ہے۔"

پیرس کا نام سنتے ہی منشی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور اس نے کہا۔ "تم اگر پیرس گئے تو وہاں ہوٹل میں ننگی ناچتی ہوئی عورتوں کو ضرور دیکھنا۔ جب ہاڈے پچھے مہاراج ادھر آئے تھے۔ تو وہاں کا سب نظارہ کرتے تھے۔ اجی، پیرس تو اندر پوری ہے اندر پوری ـــــ"

پھر وہ اس عورت کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ جو فرانس کی عورت نہیں، بلکہ پیرس کی کسی اندھیری گلی یا گندی ہسپیلی کوٹھری کی پیداوار تھی۔ وہ پیرس کے خوبصورت باغوں، آزاد دریاؤں اور نوجوان لڑکیوں کے قہقہوں اور گیتوں سے ناآشنا تھا۔ وہ جو لیو کیوری کے پیرس کی باتیں نہیں کر رہا تھا، بلکہ قرونِ وسطیٰ کے پٹیالہ شاہی پیرس کی باتیں کر رہا تھا ـــــ "تم برلن جا رہے ہو۔ تو ایک دو دن پیرس سے ہوتے ہوئے جانا۔ وہاں کی شرابیں پٹیالہ کی بند بوتل کو مات کر دیتاں ہیں ـــــ"

یہ کمپرسنکر میں نے پھر عرض کیا ـــــ "جناب! میرا پاسپورٹ جلدی تیار کر دیجئے۔ مجھے جانا ہے۔ ریل گاڑی کا سفر کرتے کرتے جولاہے کی نال کیطرح نرپکوٹ سے پٹیالہ، اور پٹیالہ سے فرید کوٹ ـــــ اسٹیشن کے نلکے تک پہچاننے لگے ہیں۔ اب مہربانی کیجئے۔"

اس نے کہا۔ "اچھا، اب تم کو کیا تکلیف دینی ہے۔ آپ نے ریل گاڑی کے سفر میں تو پچاس روپے خرچ کر دیئے۔ سہیں بھی پوچھا ہوتا" یہ کہکر اس نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ لیکن میرے پاس شملہ سے بھٹنڈہ جانے کے لئے کرایہ تھا۔ میں ایک مجرم کی طرح منشی کے آگے پھر گڑگڑایا۔ اس نے اس وقت دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا ـــ "ہم آپ کے کاغذات کو آج ہی آگے روانہ کر دیں گے۔ آگے آپ کی قسمت!"

میں مطمئن ہو کر دوسرے روز بھٹنڈہ لوٹ آیا۔ برلن جانے کی بھرگاؤں بھر میں آگ کیطرح پھیل گئی۔ میرا بڑا بھائی بھرے بازار میں تمکنت کے ساتھ گویا

"ہم پچھلے چھ سال سے منصوبے کر رہے تھے کہ ایک بار بلونت کو ولایت بھیج کر گاؤں کا نام اونچا کر دیں گے۔ لو، آخر وہ دن آ ہی گیا" اس اعلان کرتے ہوئے کہا۔ "اگلے سنیچر کو بلونت یورپ جا رہا ہے۔"

"یورپ کہاں ہے؟"

"جرمنی"

"جرمنی؟"

"جرمنی! ــــــ برلن!"

میرے برلن جانے کی خبر سارے گاؤں میں گویا آگ بن کر پھیل گئی۔ اس سے پہلے ہمارے گاؤں سے کبھی کوئی جرمنی نہیں گیا تھا۔ صرف پہلی جنگ میں رنگ ریزوں کا ایک دستہ بھرتی ہو کر باہر چلا گیا تھا۔ پہلے فرانس گیا، وہاں سے ٹرکی، پھر اٹلی اور پھر فرانس۔ کہتے ہیں کہ وہ جرمنی کی حدیں داخل نہیں ہوا تھا، کہ لڑائی ہی کہیں مار گیا۔

دو ماہ بعد اس کی ماں کے پاس اس کے مرنے کی اطلاع پہنچی۔ اس کی ماں "مہتاب" "تابو" کہا کرتے تھے۔ کئی دن تک روتی رہی۔ چھاتیوں پر دو ہتڑ مار مار کر انگریزوں کو کوسنے دیتی تھی اور کہتی تھی۔ "ہائے رے انگریزا! تیرا بیڑہ غرق ہو۔ تیرا جنازہ اٹھے"

اس واقعہ کو آج پینتیس برس ہوئے کو آئے۔ اس وقت میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد دوسری جنگ چھڑی۔ گاؤں کے سبھی لوگ خوش تھے۔ چڑی نار جو اپنے چبوترے پر بیٹھا اپنا نجارا سنگا رہا تھا۔ "اب تپہ چلے گا اس انگریز کو۔ ہوش ٹھکانے آجائیں گے بچہ جی کے"

نتو تلعی گر بولا۔ "اجی یہ جرمنی انگریز کا بھرکس نکال دے گا"

لیکن تھوڑے دنوں بعد جب جرمنی نے روس پر حملہ کر دیا۔ تو سارے گاؤں میں ماتم چھا گیا۔ مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے۔ لوگ گاؤں کی چوپال میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ سب سے بھی انگریز کا پراپیگنڈہ سمجھتے تھے۔ چڑی سنار بولا۔

"یہ سب انگریز کی شرارت ہے۔ جرمنی نے روس پر حملہ نہیں کیا۔"

تلکو پنڈت نے کہا۔ "ابے جرمنی کو نہ کار آگیا ہے۔ نہ کار اور ابھیمان تو برہمن کو بھی پاپی بنا دیتے ہیں۔ راون چاروں وید پڑھا ہوا تھا۔ لیکن اسے بھی ابھیمان کا ڈنڈ ملا یہ ہٹلر بھی راون کا روپ ہے۔ بس اب کی موت آئی سمجھو" دوسری جنگ کے سبھی داؤں پیچوں کو رامائن کے حوالوں کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔ آخر نتو تلعی گر بولا۔

"آہ انگریز اس بار بھی بچ کر نکل گیا۔ بس اب تو صرف جرمنی اور روس میں ٹھنے گی۔ یہ انگریز تو قیمہ دکھانے والے ہیں۔"

لڑائی تیز تر ہو گئی۔ چیزوں کے بھاؤ چڑھ گئے۔ آٹے اور کھانڈ کا راشن ہو گیا۔ اچھے اچھے، کھاتے پیتے گھرانے گندم اور شکر کو ترسنے لگے۔ بنگال میں قحط پڑا۔ تو سارا ہندوستان کانپ اٹھا۔ اس لرزہ کی ایک تھرتھری نے ہمارے گاؤں کو بھی جھنجھوڑ ڈالا۔ لوگ قحط کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ جنگ خوروں کے خلاف بولنے لگے۔ چند گھبرو دوں کا جو فوج میں بھرتی ہو کر گئے تھے۔ پتہ نہیں چلتا تھا۔ ان کی تنخواہ آنی بند ہو چکی تھی۔ چاروں کے دو لڑکے جنہیں جبراً طور پر بھرتی کر لیا گیا تھا۔ برما کی لڑائی میں مارے گئے۔ گاؤں کے سبھی لوگ جنگ کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے جنگ جلدی ختم ہو۔ تاکہ بھاؤ گریں۔ اور چیزیں سستی ہو جائیں۔ جاپان کا سلک پھر آنے لگے۔ وہاں کے ربڑ کے کھلونے اور سوم کی گڑیا۔ اٹلی کے گبرزن اور کیل اور جرمنی کی دوائیاں پھر سے ملنے لگیں۔

ہٹلر مارا گیا۔ جرمنی ہار گیا۔ نازی لیڈروں کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ اور لڑائی ختم ہو گئی۔ جرمنی پر انگریز، امریکی اور روسی فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس پر گاؤں میں پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"سنا ہے، جرمنی کو انگریز اور امریکنوں اور روسیوں نے بانٹ لیا ہے۔"

"زیادہ مال کس کے ہاتھ لگا؟"

"زیادہ تو انگریزوں اور امریکیوں نے ہی ہڑپ لیا۔ یہ ناموں، بھانجہ بڑے بدمعاش ہیں، لوگوں کو ایک دوسرے سے بھڑا کر اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں ــــ"

تلکو اور نتو انگریزوں کو گالیاں دینے لگے۔

اس کے بعد سنا ہے واقعات ہوئے۔ جرمنی کے مشرقی حصہ میں سے روسی فوجیں واپس چلی گئیں اور وہاں کے عوام نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن مغربی جرمنی پر انگریز اور امریکی فوجوں کے پنجے بدستور گڑے رہے۔

اور پھر ہندوستان کی بھی تقسیم ہوئی۔ پنجاب کے دو حصے ہو گئے۔ نتو تلعی گر اور تابو خاندان میں مارے گئے ہمارے فسادزدہ گاؤں کے چہرے

پر سیاسی اور اقتصادی چھینا جھپٹی کی گہری خراشیں تھیں۔ چڑی سنار اور تلکو پنڈت اور چندو نائی اب چوپال پر بیٹھ کر پہلے سے جوش کے ساتھ باتیں نہیں کرتے تھے بنسی رام ہیڈ ماسٹر کی پنشن ہو گئی تھی۔ چچا کشوری جو ریلوے میں گارڈ تھا۔ پچھلے دس سال سے ریٹائر ہو چکا تھا۔

چڑی سنار، تلکو پنڈت، چندو نائی، بنسی رام ہیڈ ماسٹر اور چچا کشوری ـــــ سبھی گاؤں کی زندگی سے ریٹائر ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے چلے جانے کے بعد تو یوں محسوس کرتے تھے، جیسے کسی نے انہیں زندگی کے کھیل کے عین بیچ میں اپنے ساتھیوں سے کھینچ کر الگ کر دیا ہو۔ اب کھیل کا کیا لطف۔ اب کس سے کھیلیں۔ گاؤں کی کھڈی میں تانے بانے کی طرح یہ دونوں فوجیں رہ رہی تھیں۔ ہنر اور کیسر کی رنگت میں سکھ قوم کی سنہری دھاری تھی۔ یکدم جیسے کسی نے کھڈی کو اکھاڑ پھینکا ہو۔ سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔

ان پرانے بزرگوں کی جگہ اب نئی پود نے سنبھال لی تھی۔ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھی بھی گاؤں میں بس گئے تھے۔ گاؤں کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں شرنارتھیوں کا پرشور دھارہ آکر مل گیا تھا۔ اب تالاب کا پانی شفاف، چمکدار اور بلوریں نہیں تھا۔ بلکہ بھورا، میلا لہ اور گدلا ہو گیا تھا۔

اس کے بعد کشمیر کی لڑائی، گاندھی جی کا قتل، امن تحریک، کوریا کی جنگ سب واقعات تیزی کے ساتھ آئے۔ نمبردار اور مزارع تیل اور دنگریز، کھیت مزدور اور کاریگر، لوہار اور کمہار، شاہ اور اس کی آسامیاں، بوڑھے اور جوان اپنے اپنے چھوٹے پیمانے پر تیزی سے بھاگتے ہوئے ان واقعات پر رائے زنی کرتے۔ تلکو، چندو، بنسی رام ہیڈ ماسٹر، چڑی سنار اور چچا کشوری۔ جہاں کہیں کوئی انگریز، امریکن یا جرمنی کی بات چلتی، اپنی رائے ضرور دیتے۔

جب گاؤں تک آنے والی لاری بند ہو گئی اور پتہ چلا کہ پٹرول کی کمی کی وجہ سے اب شہر سے ہر تیسرے دن لاری آیا کرے گی تو پھر سب ایندھن کے تیل کے جھگڑے چھیڑنے لگے ـــــ تلکو پنڈت جس کی عقیدت میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی، کشن لیکر کھانستے ہوئے بولا۔

"یہ انگریز جلتی پر تیل چھڑکتا ہے۔ کہاں ایران اور کہاں ولایت۔ بھلا کوئی پوچھے، ایران کے تیل کے چشموں کا تو کیا لگتا ہے؟"

"یہ انگریز نفاق کی جڑ ہے۔ کوریا میں دو کوریا ہو گئے۔ یہاں دو پنجاب، وہاں تین جرمنی، اب ایران پر آنکھ ہے بڑا بے ایمان ہے انگریز۔"

"یہ گورا تیسری جنگ چھیڑ کر رہے گا۔" چندا سنگھ جو فوج میں نوکر تھا اور اب ایک ماہ کی چھٹی پر آیا تھا کہنے لگا ـــــ "چاچا! یہ انگریز تمہارا خیر خواہ نہیں۔ جتنا امریکن۔"

تلکو پنڈت بولا۔ "دونوں کی ملی بھگت ہے۔ جیسے دوکان پر شاہ اور منیم بیٹھے ہوئے ہوں، ایک آسامی کو دلاسا دیتا ہے۔ اور دوسرا اس کی گرہ کاٹتا ہے۔ اندر سے دونوں ایک ہیں ـــــ"

"تو پھر جنگ ہوگی یا نہیں؟"

"شاید ہی ہو ـــــ برابر کی چوٹ ہے۔ روس اور امریکہ۔ روس چپ سادھے بیٹھا ہے۔ اور امریکہ اس چپ سے ڈرتا ہے۔"

چندر سنگھ بولا ـــــ "آپ کا خیال ہے کہ امریکہ ڈرتا ہے؟ گو نہیں۔ وہ تو بلکہ للکار رہا ہے۔ کہ اتر دے میدان میں۔ خم ٹھونک کر۔ ٹاڑ رہا ہے لیکن روس ہالے کے اس پار کھڑا ہے۔ شاید ڈرتا ہے۔"

بنسی رام ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ "روس گونگا پہلوان ہے۔ منہ سے کچھ نہیں بولتا۔ مگر گونگے کی پکڑ سے خدا بچائے۔ اگر ٹوٹ پڑے تو ایسی پٹخنی دے کہ چوپڑ یا ایڑی کے دانے پر سبھی دھرے رہ جائیں۔"

امن تحریک کے چلتے گاؤں گاؤں ہونے لگے۔ ہمارے گاؤں سے بھی امن کی آواز اٹھی۔ یہ آواز ان نوجوانوں کی آواز بن گئی۔ جو امن کا جھنڈا اٹھائے دنیا کے کونے کونے سے برلن میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ برلن کے اس امن جلسہ میں شامل ہونے کے لئے ہندوستان کے ہر حصے کے نوجوان تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے بھی پاسپورٹ کے لئے درخواست دی۔

بٹھنڈہ ضلع میں میرے پاسپورٹ کے کاغذات گاؤں کے چودھری، شہر کے کوتوال، سپرنٹنڈنٹ پولیس، انسپکٹر۔ سی۔ آئی۔ ڈی اور ڈپٹی کمشنر سبھوں کی تفتیش اور پوچھ تاچھ کے مرحلے طے کر کے پٹیالہ سرکار کے بڑے دفتر میں پہنچ گئے تھے۔ اس لئے مجھے بٹھنڈہ سے فرید کوٹ، فرید کوٹ سے پٹیالہ، پٹیالہ سے بٹھنڈہ اور پھر بٹھنڈہ سے فرید کوٹ اور پٹیالہ ـــــ پورے چھ چکر لگانا پڑے۔ اور اب پاسپورٹ ملنے کی پوری امید ہو گئی تھی۔

اب یہ خبر گاؤں بھر میں پوری طرح پھیل چکی تھی کہ میں برلن جا رہا ہوں ـــــ جب چچا کشوری کو پتہ چلا۔ تو وہ مجھے ملنے کے لئے آیا۔ چچا کشوری

لال ہماری برادری کا پہلا باغی شخص تھا۔ آج سے چالیس برس پہلے اس نے ایک چمار کے ساتھ بیٹھکر کھانا کھا لیا تھا۔ یہ بات اس سال کا سب سے اہم واقعہ تھی۔ لوگ کہتے تھے۔ کشوری کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہے۔ چمار کا جوٹھا کھا یا خدا بچائے۔

بابو کشوری لال، باغی کشوری لال، آریہ سماج کی اسٹیج پر کھڑا ہو کر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں، پرماتما نے سبھی انسانوں کو ایک سا بنایا ہے۔ برہمن اور چمار میں کوئی فرق نہیں۔ اگر سناتن دھرم مجھے دھکا رتا ہے۔ تو میں آج سے آریہ سماج کو قبول کرتا ہوں"

اس کے بعد وہ ہر اتوار کو آریہ سماج کی بھجن منڈلیوں کے بھجن اور اپدیش سننے کے لئے آریہ سماج مندر میں جانے لگا۔ کہتے ہیں ان دنوں کشوری لال کے سر پر گھنے سیاہ بال تھے۔ اور گانٹھوں والی لمبی چوٹی تھی۔ لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اس کے سر کے بال جھڑے ہوئے ہی دیکھے۔ ۳۵ سال کی ہی عمر میں اس کا سر رنڈ منڈ ہو گیا تھا۔ چاچا سر پر کڑوے تیل کی مالش کرتا۔ کئی بار جب وہ کونڈے میں بادام رگڑتا۔ تو اس کا سر پالش کئے ہوئے آئینے کی طرح چمکنے لگتا۔ اس نے دو بار شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن رشتہ داروں نے رکاوٹ ڈالی۔ سبھی کہتے، بوڑھا ہوتے کو آیا اور اب سہرہ باندھنے چلا ہے ——— اس پر اس نے انیم کھا کر دو بار مرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے انہیں رشتہ داروں نے مرنے بھی نہ دیا پچھلے پندرہ برس سے اس نے شادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے چھوڑ دیئے تھے۔ طوفانی دریا میں تیرتے تیرتے، یہ تیراک اب تھک چکا تھا۔ اب اس کا بدن شل ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں رہ گئے تھے۔ تیرنا اب بھی رہا تھا۔ لیکن ایک مردہ کی طرح۔

وہ عمر بھر آریہ سماجی رہا۔ اس نے تھوڑی بہت سنسکرت بھی پڑھ لی تھی۔ بادام رگڑتے وقت وہ اونچی اونچی آواز میں سنسکرت کے اشلوک پڑھا کرتا۔ یا سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے نہاتے وقت انہیں گایا کرتا۔ اسے انگریزی لباس، انگریزی زبان، انگریزی حکومت سے سخت نفرت تھی آریہ سماج کا سجگت ہونے کی وجہ سے، جب اسے پتہ چلا کہ ہٹلر بھی اپنے آپ کو آریہ کہتا ہے۔ تو اس کے دل میں ہٹلر کے لئے بڑی عزت پیدا ہو گئی۔ وہ ہٹلر کو آریہ سماجی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اسے جنگ میں جرمنی بھیج دیا جائے۔ تو ہٹلر ضرور اس سے ہاتھ ملائے گا۔ وہ سوچا کرتا کہ ہٹلر اور مجھ میں کتنی ہی باتیں ملتی ہیں:۔

(۱) ہٹلر کنوارا ہے۔ میں بھی کنوارا ہوں (۲) ہٹلر آریہ سماجی ہے، میں بھی آریہ سماجی ہوں (۳) ہٹلر انگریزوں سے نفرت کرتا ہے، میں بھی انگریزوں کا دشمن ہوں (۴) ہٹلر سنسکرت زبان اور ویدوں کو مانتا ہے اور میں بھی۔ (۵) ہٹلر میری طرح نہ گوشت کھاتا ہے اور نہ سگریٹ پیتا ہے

چنانچہ جہاں کہیں موقع ملتا وہ ہٹلر کی تعریف کرتا۔ اور انگریزوں کو گالیاں دیتا۔ جب ہٹلر جنگ میں ہار گیا۔ تو چاچا کشوری کو بہت افسوس ہوا۔ وہ سوچتا تھا، کہ اب انگریز اور امریکن، جرمنی کے بنائے ہوئے بم، جہاز، ریڈیو، مشین، سب چیزیں اپنے ملک میں لے جائیں گے۔ چاچا کبھی کبھی آہ بھر کر کہتا۔ "ارے ہمارے ویدوں میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ ہمارے بزرگوں کے پاس اگنی بم اور پرانو بم تھے۔ لیکن ہمارے آج کل کے پنڈت مہاشوں کو سنسکرت پڑھنا ہی نہیں آتی۔ وہ تو تلک کھینچنا اور چوٹی بڑھانا ہی جانتے ہیں۔ ویدوں کا اصلی نسخہ تو جرمنی کے پاس ہے۔ انہیں ویدوں کو پڑھ کر جرمنی نے اڑن بم اور اگنی بم تیار کئے ہیں۔ ان انگریز اور امریکنوں میں اتنا بھیجا کہاں ہے۔"

چاچا کشوری اب بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی چندیا اب زیادہ دمکتی ہے۔ اس کی صاف چکنی چندیا کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ایک بھی سفید بال نہیں لیکن چھوٹی چھوٹی، تراشی ہوئی مونچھوں سے جنہیں وہ خضاب سے سیاہ کر دیتا ہے۔ اس بات کا پتہ نہیں چلتا۔ شاید وہ گھٹیا خضاب استعمال کرتا تھا کیونکہ اس کی مونچھوں کا رنگ سکول کے طالب علم کی پنسل کی سیاہی کا سا تھا۔ پچھلے تین سالوں سے اس نے خضاب لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے اس کے بال جڑ سے سفید اور اوپر سے بھورے، مٹ میلے تھے۔ خضاب اور برش سے عاجز آکر آخر اب وہ مہندی لگانے لگا ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں حنائی رنگ کی ہیں۔ آنکھوں پر عینک کمانی کی عینک لگائے، ان گیروی مونچھوں سے وہ ایک مسلمان خوجہ نظر آتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"بھوشت! سنا ہے تم جرمنی جا رہے ہو؟"

"ہاں چاچا!"

"کب لوٹو گے؟"

"ایک مہینے تک"

"اچھا اچھا" اس نے بڑے نرم لہجہ میں تائیدی طور پر سر ہلایا اور پوچھا۔ "یہ جرمنی کبھی اٹھے گا بھی، یا یہ انگریز اسی طرح اس کی گردن دبوچے رہیں گے؟" ــــــ اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ بڑے یقین کے ساتھ بولا "میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جرمنی کے لوگوں کو ابھرنے سے کوئی قوت نہیں روک سکتی۔ جرمنی قوم لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ اسے کوئی جکڑ کر نہیں رکھ سکتا۔ یہ جرمنی دماغ ہی تھا جو ایٹم بم تیار کر سکتا تھا۔ اور میں نے سنا ہے کہ جرمنی نے چار ایٹم بم بنائے بھی تھے۔ جنہیں امریکہ والے چرا کر لے گئے۔ ان میں سے دو بم تو امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے تھے۔ ہائے کتنے خوبصورت شہر تھے وہ دونوں۔ بس اب دو بم ان کے پاس باقی ہیں۔ سب جرمنی سے چرائے ہوئے" ــــــ "میں نے کہا" چاچا! تم ٹھیک کہتے ہو۔ امریکہ نے ٹیکنالوجی ماہر ایٹم بم دنیا چرائی ہے۔ لیکن اب وہ ہیروشیما اور ناگاساکی ایسے حادثے نہیں دہرا سکیں گے۔"

"تم برلن جا رہے ہو" اس نے دوبارہ پوچھا "ہاں!"

"تم میرے لئے وہاں سے ایک چیز لا سکو گے؟" "ہاں ہاں! ضرور"

اس نے آہستہ آہستہ اپنی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑا تڑا کاغذ نکالا۔ اور مجھے تھما کر کہنے لگا "میرے لئے وہاں سے جرمنی مارکہ شاہی خضاب لے آنا پچھلے ۸ برس سے یہ خضاب مارکیٹ میں نہیں آ رہا ہے۔ آٹھ سالوں سے میں نے اپنے بالوں میں یہ خضاب نہیں لگایا جب سے میں نے یہ گھٹیا دلایتی خضاب لگانا شروع کیا ہے۔ میرے بال بھر گئے ہیں۔ جرمنی والے خضاب کی کون ریس کریگا" ــــــ میں نے اس مڑے تڑے کاغذ کی شکنیں درست کیں۔ آٹھ سال پرانا شیشی کا بیس بہت مدھم اور پھیکا سا ہو گیا تھا۔ اس پر ایک بادشاہ کی تصویر تھی جس کی داڑھی سیاہ تھی۔ اور اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ جو میں پڑھ نہ سکا۔ کاغذ کو تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا۔ اور چاچا کشوری لال سے اقرار کیا کہ جرمنی سے میں شاہی خضاب ضرور لاؤں گا ــــــ چاچا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد چمڑی سنار مجھ سے لپٹ گیا۔ "بولو نت! تم جرمنی جا رہے ہو۔ تو میرے لئے ایک کانٹا لیتے آنا میں نے ایک کانٹا سن بتیس میں خریدا تھا۔ سولہ سال ہو گئے اس جرمنی کانٹے کو۔ ڈنڈی اب بھی چاندی کا فرق بتاتی ہے۔ لیکن پیندے گھس گئے ہیں۔ تم اگر کانٹا لے آؤ، تو میں اپنی دوکان کا نام دھرم کانٹا گھر رکھ لوں" ــــــ پھر خیر دنائی آیا۔ اس نے راجہ مارکہ جرمنی استرے کی فرمائش کی۔ اتنے میں میری بیٹھی ہرشی دوڑا ہوا آ گئی۔ وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے، اس کے ہاتھ میں کھدر کا ایک چھوٹا سا جھنڈا تھا۔ اس نے کہا "چاچا! یہ کھدر میں نے اپنے ہاتھوں سے ہی کاتا ہے۔" کھدر کے اس ٹکڑے پر نیلے سوت سے ایک ٹیڑھا میڑھا پرندہ کا ڈھانچہ تھا۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ فاختہ تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "جرمنی کے بچوں کو" ــــــ میں نہیں جانتا۔ کہ ننھی ہرشی یہ فاختہ کا جھنڈا کیوں بنا کر لائی۔ یہ بیڈول سا خاکہ مضحکہ خیز تھا۔ اسکی چونچ، دم سے کہیں بڑی تھی۔ اس کے دونوں پنکھ دو مختلف سمتوں کو اڑ رہے تھے۔ پاؤں دو نقطے سے معلوم ہوتے تھے۔ نہ جانے معصوری کے کون سے معصوم کو سامنے رکھ کر اس نے یہ تصویر بنائی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے اس کے ننھے اور کچے ہاتھ اس کے تخیل میں اڑتی ہوئی فاختہ کو پکڑ نہ پائے ہوں۔ یہ فاختہ چشمے کی ہنسی کی طرح تھی۔ سنگیت رس میں ڈوبی ہوئی، لیکن آوازوں اور سروں کے قواعد سے آزاد ــــــ مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر ہرشی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "چاچا جی! آپ برلن جا رہے ہیں۔ میرے لئے آپ وہاں سے کیا لائیں گے؟" ــــــ میں جب بھی گاؤں جاتا ہوں وہ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی ہے۔ "چاچا جی! آپ میرے لئے وہاں سے کیا لائے ہیں؟" ــــــ میں ہمیشہ اقرار کرتا ہوں کہ اگلی بار ضرور کچھ لاؤں گا۔ لیکن پچھلے دس سال میں یہ اقرار ایک بار بھی پورا نہ ہو سکا ــــــ برلن سے اسکے لئے میں کیا لاؤں؟ گڑیا، چابی سے چلنے والی ریل گاڑی، ہوائی جہاز، تصویروں والی کتاب، آنکھیں بند کر نیوالی میم، باجہ، گھڑی۔ لیکن یہ تو سب عام چیزیں ہیں جنہیں ہر شخص کئی بار لا کر دے چکے ہیں ــــــ یہ گڑیا، یہ باجا، یہ گھڑی ــــــ تو پھر کیا لاؤں؟ ــــــ اور میرے دماغ میں آنے والے برلن کے اس میلہ کی تصویر ابھر آئی۔ ہزارہا لڑکیاں ناچ رہی ہیں، لڑکے گا رہے، کھیل رہے ہیں۔ دوڑ رہے ہیں۔ تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ ساری قوموں، ساری زبانوں، ساری نسلوں اور سارے رنگوں کے امتزاج سے مشرکہ جذبے کا ایک ولولہ ابل رہا ہے۔ نغموں کے رنگیں پر سر ہلا رہے تھے۔ رنگا رنگ کے بنارسے اور جھنڈے تتلیوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ مسکراہٹیں اور قہقہے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور میں نے سوچا اتنی خوبصورت اور پیاری چیزوں میں سے کوئی نہ کوئی چیز میں ہرشی کے لئے ضرور لے آؤں گا۔ جو امنگ نیا عزم، گونجتا ہوا، اس کا نعرہ، نوجوان طالب علموں کے ارادوں کی دھڑکن، بیدار نگاہوں کی کرنیں ــــــ کوئی سی بھی چیز!

لیکن ان سب غیر مرئی چیزوں کو ہرشی کیسے مانگے گی۔ وہ تو ایسی چیز چاہے گی جسے وہ چھو سکے۔ پکڑ سکے۔ اور اسے اپنی سہیلیوں میں لے جا کر اونچی آواز

میں کہہ سکے ۔ "دیکھو! میرے چاچا برلن سے کیا لائے ہیں ، دیکھو ——— !"

مجھے اس طرح گم سم دیکھ کر ہرشتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور کہا ۔ "چاچا جی! آپ کیا سوچ رہے ہیں، بتائیے نا آپ میرے لئے کیا لائیں گے ؟"

میں اسے کوئی جواب نہ دے سکا ۔ صرف اتنا کہہ سکا ۔ اس بار میں تیرے لئے ضرور کچھ لاؤں گا ۔ جب شام ڈھلی تو میری ماں نے پوچھا "للت! تو نے تیاری کرلی ۔" میں نے کہا ۔ "ہاں ماں ماں !"

"تیرا سارٹی فکیٹ تیار ہوگیا ہے ۔ ؟"

"ہاں ماں ۔ ہاں ! دو دنوں تک میرا پاسپورٹ تیار ہو جائے گا ۔ اب اس میں کوئی کسر نہیں ۔ بس میرے پٹیالہ پہنچنے کی دیر ہے ۔ یہاں کے افسران نے میرے کاغذات منظور کر کے آگے بھیج دیئے ہیں ۔ دو دنوں تک پٹیالہ جاؤں گا ، اسکے بعد دہلی ، پھر بمبئی اور پھر جرمنی چلا جاؤں گا ۔"

"تو اکیلا ہی جا رہا ہے بیٹا ! یا دوسرے ساتھی بھی تیرے ساتھ جا رہے ہیں ؟ ——— ماں بہت سے لوگ جا رہے ہیں ۔ بڑے بینک کے بڑے افسر کا لڑکا جا رہا ہے ۔ دہلی سے کچھ لوگ جائیں گے ، بمبئی سے ، کلکتہ سے ، ——— ساری دنیا سے لوگ وہاں اکٹھے ہو رہے ہیں" ——— ماں اندر کوٹھڑی سے ایک چکلی نکال لائی ۔ سرخ کپڑے پر چاندی ایسے سفید چمکتے کڑھے ہوئے تھے ۔ اس نے کہا ۔ "یہ اصلی ریشم ہے ۔ تب نے اسوقت منت مانی تھی کہ بڑا ہو کر اگر تو کھارے پانیوں کے پار گیا تو میں تجھے یہ چولا دوں گی ، ——— یہ کہہ کر ماں نے ۔ وہ دھیا سپید چمکتوں والا چولا تہہ کر کے میرے ٹرنک میں رکھ دیا ۔ وہ میرے بہت قریب آگئی ۔ اس کا منہ میری گردن کو چھو رہا تھا ۔ وہ منہ میں کچھ بڑبڑائی ——— "دیا ! جوان بچے ، بچوں پر پیل کی چھاؤں بنکر رہنا ۔"

تیسرے روز میں رات کی گاڑی سے بٹھنڈہ سے پٹیالہ چلا آیا ۔ میری ماں ۔ میرا بڑا بھائی ۔ ہرشی ، اور چچا کشوری مجھے گاڑی پر چھوڑنے آئے ۔ جب گاڑی چلنے لگی ۔ تو ماں نے کچی لسی کا گڑوا زمین پر انڈیل دیا ۔ اور اپنے پلو سے بندھا ہوا مٹی کا ڈھیلہ میرے ہاتھ میں تھما دیا ۔

گاڑی چل پڑی ۔ رات کے اندھیرے میں سب لوگ جلدی ہی گم ہوگئے ۔ گاڑی چیخیں مارتی ہوئی بھاگی جا رہی تھی ۔ بٹھنڈے کے اردگرد پھیلی ہوئی ریت بھی دور تک چھوڑنے آئی ۔

اس کے بعد میں پٹیالہ میں دو دن رہا ۔ تین دن ، پانچ دن ، دس دن ۔ ہر روز سکریٹریٹ کے چکر لگاتا رہا ۔ میرے پاسپورٹ کے کاغذات ایک دفتر سے دوسرے دفتر ۔ ایک میز سے دوسری میز اور ایک دراز سے دوسری دراز میں گھومتے رہے ۔ چچا کشوری کا شہنشاہی خضاب چڑی سنار کا دھرم کانٹا ۔ چندو نائی کا راجس استنا ۔ ہرشی کا تحفہ ، ماں کا چولہ ، سب سیکریٹریٹ کے اردگرد چکر لگاتے رہے ۔

آخر میں پھر اسی پٹیالہ شاہی منشی کے پاس گیا ۔ اس کے سامنے جھک کر اپنی پریشانی کی ساری داستان بیان کی ۔ اور کہا ——— "منشی جی ! مجھے ہر روز کہا جاتا ہے ۔ کہ کل پاسپورٹ ضرور مل جائے گا ۔ اس کل کی زنجیر میں اتنے دن خراب ہو گئے ہیں ۔ آج ۲۸ تاریخ ہے ۔ اگر مجھے آج پاسپورٹ نہ ملا ۔ تو میں کسی طرح بھی جرمنی نہیں پہونچ سکوں گا ۔ میں نے چیک ۔ اور ہیضے کے ٹیکے بھی لگوائے ہیں ۔ اگر آپ تکلیف فرما کر مجھے آج ہی .... پاسپورٹ دے دیں ۔ تو ———"

منشی منہا ۔ کس کر بندھی ہوئی پیچ دار دو منزلہ پگڑی جو ایرن پراٹی کی طرح مڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی ۔ اسکی انکھیں پھڑپھڑائیں ۔ اور اس نے کہا ۔

"تم تو بھولے شمبھو ہو ۔ تم کو پٹیالہ میں رہتے اتنا عرصہ ہوگیا ۔ اب بھی تم پٹیالہ شاہی کی باتیں نہیں جانتے ۔ تم کو ایسے کئی کل اور دیکھنے پڑیں گے ۔"

"شاہراہ" میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

کرشن چندر کے نام

انور عظیم

(کوریا کے محاذ جنگ سے ایک انڈین امبولنس ڈرائیور کا خط)

میرے پیارے کہانی لکھنے والے ——— ،

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں خط لکھنے کی خواہش میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی۔ کیسے پیدا ہوئی۔ پہلے تو کوئی جان پہچان نہ تھی۔ اور مزیدار بات تو یہ ہے کہ میں نے تمہیں اس وقت کوئی خط نہیں لکھا۔ جب میں اپنے دیش میں تھا۔ سچ ہے آدمی وطن سے دور ہو کر وہاں کی ایک ایک چیز کو یاد کرتا ہے۔ معمولی معمولی تفصیلات کی فلم آنکھوں اور ذہن میں ہر وقت دوڑتی رہتی ہے۔ باہر کی فلم در اصل سلولائڈ کی فلموں سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوتی ہے (اور خاص طور سے ہندوستانی فلموں سے) ——— لیکن تم سے جان پہچان رسمی نہ ہونے پر بھی میں نے تمہاری بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ان کہانیوں میں قناعت پایا ہے۔ میں نے اتنی ہی سچائی بھی پائی ہے۔ اور میرا خیال ہے سچائی سے بڑھکر کوئی چیز حسین نہیں ہوتی۔ سچائیاں جو ماضی نے ہمیں دی ہیں۔ سچائیاں جو ہم تخلیق کر رہے ہیں۔ سچائیاں جو مستقبل کے دھڑکتے سینے میں چھپی ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں تم مجھے میری عبارت دیکھ کر اپنا نقال نہ سمجھنے لگو ——— میں اور تمہاری نقل۔ کہاں ہنس، کہاں کوا ——— اچھا دیکھو یہ تشبیہ کیسی بھونڈی رہی۔ خیر ——— مجھے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا۔ مجھے تو اپنے من کی بات تمہارے من تک پہنچانا ہے۔ کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے رچ کر ایک حسین سی کہانی بن جائے۔ تمہاری تخلیق کی دنیا میں، تمہارے فن کی کہکشاں میں پہنچ کر درد کی طرح جگمگا اٹھے۔ اس لئے کہ یہ بات صرف بات ہی نہیں، ایک دکھی انسان کی روح بھی ہے۔ ان گنت نامراد آرزوؤں اور ناآسودہ خواہشوں کی روح!

بھئی ——— میں کوئی خاص پڑھا لکھا آدمی نہیں۔ ورنہ تم ہی سوچو میں اپنے ملک سے ہزاروں میل دور کوریا کے بیاباں میں آگ اور خون کے بھاگ کا تماشہ کیوں دیکھتا ——— تماشہ ہی نہیں دیکھتا ہوں۔ بلکہ اس میں حصہ لے رہا ہوں (وقت دیباچہ اس لئے کہ آج کوریا میں شہر، پارک، کالج، اسکول ہسپتال، گاؤں اور کھیت کے نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ تہذیب، دولت، انسانیت کی ترقی کے سنہرے کلس گر گیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہمارے ضمیر کے آفتاب اور مہتاب نے لہو میں ڈوب کر خودکشی کر لی ہے)

ہاں تو میں ان دنوں کوریا میں امبولنس ڈرائیور ہوں۔ اور ہندوستانی میڈیکل مشن کے ساتھ صحرا نوردی کر رہا ہوں۔ اب تو مارا مارا بھی پھر نہیں سکتا۔ معذور اور بیکار ہو کر ہسپتال میں پڑ گیا ہوں۔

چند ہی دن تو بیتے۔ سیئول کے پاس دو طرفہ فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ امریکی فوجیں پیچھے ہٹتی گئیں اور پھر سنبھل کر گولیوں کی بارش کرتی ہوئی دو چار قدم آگے بڑھتی گئیں۔ امریکی بمباروں کے ٹڈی دل آتے اور جن دیو کے قصوں میں اڑتی ہوئی سیاہ چمکیلی مچھلیوں کی طرح ہمارے سروں پر سے گذرتے چلے جاتے۔ شمالی کوریا کی فوجوں پر برابر بم برس رہے تھے۔ پٹرول جیل گرتی، دھماکہ ہوتا، آن واحد میں زمین سے شعلوں کا جنگل اگ آتا، قہقہہ زن، ہمہ تن باتیں کرتا جنگل۔ آگ کی مہیب زبانیں۔ آسمان کا سینہ چاٹنے کے لئے اوپر اٹھتیں ——— آہ اور کراہ کی صدائیں ان دھماکوں میں سسک سسک کر سو جاتیں۔ لیکن یہ سلسلہ بڑھتا ہی جاتا تھا ——— دھند لکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دھواں دھواں فضاؤں میں گیس اور زہر سما گھل گیا تھا۔

میں اپنی امبولنس کار لیکر ایک چھتنار درخت کے سائے میں کنارے پر کھڑا تھا۔ چاروں طرف بڑے اونچے اونچے گھنے پہاڑی جنگل تھے۔ جلے ہوئے اور گرے ہوئے جنگل اور اب اس وقت جنگ کے طوفان میں، بموں کی گھن گرج میں، ٹیس کی طرح اٹھتی ہوئی گونج میں، ہر چیز متزلزل اور پر مہیب نظر آتی تھی۔ دھرتی اپنا محور چھوڑ کر کہیں گری جا رہی تھی، ناچتی ہوئی ایک جلتی ہوئی گیند کی طرح پھسلتی ہوئی ——— دھڑام، چرچر، جھرجھر، دھڑام!

ٹھیک اسی وقت، بڑھتے ہوئے دھند لکے اور لرزو بخار میں ٹرانزسٹر سیٹ بجاتی ہوئی کئی گولیاں امبولنس کار کے پاس سے، اس کے بھنی اور چھت کو چاٹتی ہوئی آگے نکل گئیں۔ درختوں کے پتے جھرجھرا کر گر پڑے۔

اب کیا بتاؤں اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ اس وقت میری ایمبولنس گاڑی میں دو امریکی سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ وہ مرتعش ہونٹوں میں جلدی جلدی سگریٹ لگاتے اور جلا کر دیتے۔ ان کی چند منٹ قبل کی ساری سرمستی گم ہو گئی تھی۔ خالص میاری امریکی شراب کا نشہ تو اب ہرن ہوا تھا کہ اگر اس وقت انھیں کوریا سے ہزاروں میل دور لے جا کر کسی شراب کی خلیج میں گھنٹوں غوطہ دیا جاتا تو بھی ان کے کانوں میں بموں کے دھماکے ختم نہ ہوتے۔ اور ان کی آنکھوں میں شعلوں کی لپکتی ہوئی زبانوں پر ناچتی ہوئی موت کا سایہ چھایا ہی رہتا۔ لیکن اس وقت تو ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان دونوں امریکنوں نے سہتے سہتے باہر کی طرف چھوٹے سے لوہے کے روزن سے جھانک کر دیکھا، جنگل کی پہاڑی ڈھلوان کیطرف، ــــــ جدھر سے سیاہ جنگلوں سے بہت آگے پہاڑی کی چڑھائی کے پاس سے سرخ سرخ روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ یہ روشنی ڈوبتے سورج کی شفق رنگ نہ معلوم ہوتی تھی جو گھنے اور وحشی درختوں کے کوہستانی سلسلوں سے کترا کر، چھپ چھپ کر دھندلکے میں درختوں کی شاخوں، پتیوں اور صحرائی بیلوں پر منعکس ہو رہی ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ چھوت تھی دور پٹرول جیل سے جلتے ہوئے شہر اور جنگل کی۔ ہاہا جلتے ہوئے جنگل میں تپہ نہیں کتنے انسان محبس رہے تھے۔ اس جنگل میں تپہ نہیں کتنے چھاپہ مار چھپے ہوئے تھے۔

دونوں امریکی سپاہیوں نے دوسری طرف جھانک کر دیکھنا چاہا اور اپنی گھبراہٹ اور جلد بازی میں انھوں نے اسٹریچر پر پڑے ہوئے ایک انگریز سپاہی کو کچل دیا۔ وہ بڑے زور سے چیخ پڑا۔ اُف اس کی چوٹ کھائے ہوئے کتے کی سی چیختی آواز۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ وہ دونوں اچھل کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ جیسے ان کے پیر کسی زندہ بم پر پڑ گئے ہوں۔ وہ مجروح انگریز سپاہی (جس کا نام جانسن تھا)، دیر تک زیر لب گالیاں بکتا رہا اور کوستا رہا ــــــ اوہ! ہی ای ای ــــــ یو بیسٹ، ــــــ رینن ــــــ سن آف اے بچ ــــــ یو سوائن ــــــ ہوا ــــــ اوہ ہی ای ای ــــــ"

دونوں امریکی سپاہی سکتے میں آ گئے۔

لیکن اس کی گالیاں سنکر انھیں قہقہہ لگانے کی سوجھی۔ اس حرامی پن پر مجھے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن میں کر کیا سکتا تھا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ البتہ دور جلتے ہوئے جنگل کی جھلاہٹ کبھی کبھی بھڑک کر اس جنگلی گوشے کو بھی دھندلی روشنی بخش دیتی تھی اور درخت کے پتے برس کے بے شمار داغوں کی طرح سانگ اٹھتے تھے ایسی چکبری روشنی میں میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن کچھ معلوم نہ ہو سکا ــــــ مگر میں نے انھیں دن کی روشنی میں پہلے بھی دیکھا تھا ان دونوں کی عمر بہت کم تھی (جیسی اکثر جی۔ آئی کی تھی) ان میں سے ایک ذرا گول گپ سا گدیلے بدن کا امریکی تھا دوسرا چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے کاہ گوجر کے رنگ کی معلوم ہوتی تھیں۔ ویسی ہی کترائی ہوئی۔ گہرائی گھبرائی۔ اور جنگلی سی۔ دوسرے کی آنکھیں اس کی چپٹی ناک کیطرح کشش سے خالی تھیں لیکن ان کا رنگ کافی دلکش تھا۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر اپنے گاؤں کے تالاب پر بھی ہوئی کائی کے دو سبز نقطے قریب قریب تیرتے ہوئے یاد آجاتے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے گولیوں کی اڑان کا رخ بدل گیا اور درختوں کی جھرجھراہٹ ذرا دور چلی گئی ــــــ رفتہ رفتہ ان دونوں امریکیوں کی آوازیں میں سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا ــــــ

"ــــــ فلپ، ــــــ ادھیسو۔ میں تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، ــــــ کب کدھر سے حملہ ہو جائے گا پتہ ہی نہیں چلتا ــــــ غضب کے لڑاکو ہیں یہ کھیڑیے ــــــ معلوم ہوتا ہے فٹی فٹی کا کرسمس بھی یہیں جنگلوں میں منانا ہوگا ــــــ"

"اور اس وقت کون زندہ رہے گا اور کون نہیں ــــــ اس کا کیا بھروسہ ہے ــــــ ہونہہ"

مارلو نے تھوڑی دیر چپ سادھے رہنے کے بعد جواب دیا۔

"فلپ ــــــ اب ایمبولنس وان یہاں سے نکال لے جانے کی کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی۔ سڑک دور چھوٹ گئی ہے ــــــ اور اس طرف تو موت کا منہ کھلا ہے۔ دشمنوں کی گولیاں زیادہ برس رہی ہیں ــــــ اور آہستہ آہستہ ہماری فوجیں ــــــ Encircle ہوتی جا رہی ہیں۔ لگتا ہے سیول ہاتھ سے نکل جائے گا ــــــ"

"نک ان سیول ــــــ نک ان سیول ــــــ" اندھیرے میں مارلو کی آواز کتے کی غراہٹ سے کم نہ تھی۔ مارلو چپ ہو گیا۔

"یس نک ان سیول ــــــ نو ہوپ سیول ــــــ اوہ ــــــ آور لائف از ان سٹارک ڈینجر (OUR LIFE IS IN STARK DANGER)

• نیل دی مٹرتہ ـــــ اوہ ـــــ آی ایم مارٹلی افریڈ ۔۔ (I AM MORTALLY AFRAID!)

گولیوں کا طوفان پھر زور پکڑ رہا تھا۔ اور درختوں میں پھر ہلکی ہلکی جھرجھراہٹ شروع ہو گئی تھی جیسے اولوں کی بارش ہو رہی ہو۔ جھرجھرتڑتڑ ـــــ! دونوں امریکنوں کی آواز پکے ہوئے گھاؤ کی طرح تھم کر رہ گئی خود میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ جیسے پورے جسم میں برف کی سوئیاں تیر رہی ہوں۔ میں نے اپنی ٹوپی کو اپنی پیشانی پر جھکا لیا۔ اپنے دستانوں میں اپنا منہ چھپا کر اپنی دونوں کہنیوں کو اپنی رانوں پر ٹکا کر ایڈیٹنگ کی طرف جھک گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ اور دونوں امریکیوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔ چانک وہی مجروح انگریز امبولنس وان کے پچھلے حصے میں کتے کی طرح پھر چیخا۔ اور میں چونک گیا۔ میں نے سر اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

گولیوں کی آواز پھر دور ہو گئی۔ سڑک کیطرف سے دھماکہ کی تیزی بڑھ گئی اور سیوں کیطرف شعلوں کا پولا چمن لہرا اٹھا۔ میں نے حملہ آوروں کا رخ بدلتا دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ میں نے جیب سے سگریٹ نکالا اور لائٹر سے جلایا اور لائٹر ہی کی جھلملاتی روشنی میں پلٹ کر دیکھا تو دونوں امریکی غائب تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پچھلے حصہ میں آیا۔ ہوا کے جھونکے سے لائٹر بجھ گیا۔ اور میں اسٹریچر میں اٹک کر گرتے گرتے بچا۔ میں نے دوبارہ لائٹر کی گھرنی گھمائی اور ایک چھوٹی سی لو جھٹ سے میری انگلیوں کے اوپر لگ آئی، تھرتھراتی، لرزتی لو۔ ـــــ اور میں نے اسکی خوفزدہ زرد روشنی میں اس انگریز مجروح کو جھک کر دیکھا۔ اس کے منہ سے خون رس رس کر نکل رہا تھا۔ اور اس کی پیشانی پر بوٹ سے کچلنے کا نشان موجود تھا۔ دونوں امریکی سپاہیوں نے جلدی میں خوف سے بھاگتے ہوئے اسے بڑی طرح کچل دیا تھا۔ اب اس کے لب آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے اور بہت غور سے سننے سے جو بات سمجھ میں آتی تھی وہ یہ تھی ـــــ "بیٹ، ـــ کیبل ـــــ سوائن ـــــ ـــــ نک ان بیٹ ـــــ"

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے اس مجروح جانسن، انگریز سپاہی کو فوراً ہسپتال کے پڑاؤ پر نہیں پہنچایا تو یقیناً وہ جان بحق تسلیم ہو جائے گا۔ میں تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ میں برابر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اس انگریز سپاہی کے لئے جس کا نام جانسن تھا، رسک لینا چاہیے یا نہیں۔ اس سے میری بہت گہری ملاقات تھی ـــــ بہت گہری اور پرانی! ـــــ شروع کی ملاقات میں وہ مجھ سے بہت ہلکی پھلکی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک روز ہم دونوں ایک چٹان پر بیٹھے جھاگوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کا خونی ناچ دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت جذبات میں آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اچانک مجھ سے بہت بے تکلف ہو گیا ـــــ کہنے لگا۔

"ڈیر ـــــ ڈیر ـــــ تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے۔ جانتے ہو ـــــ" اس کی آواز رازدارانہ سرگوشی میں بدل گئی "جانسن کی ایک بڑی حسین سی کبوتری ہے ـــــ ہو ہو ـــــ میری محبوبہ پھول کی طرح چھونے میں نرم ہے، لیکن ہے بڑی ناک ٹھرکی ـــــ یوں ہو جاتی ہے ہاپ، ہو ہو ـــــ" وہ شفق کو دیکھتے ہوئے بولے جا رہا تھا۔ اور میں اس کے چاؤ سے بھرے گھنا رچہرے کو دیکھ رہا تھا۔ "وہ لندن کے ٹیلیفون ایکسچینج میں اپرنٹس ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ ہو ہو ـــــ میں آدمی ذرا نکمو اور خشک ہوں ـــــ لیکن وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے۔ وہ اپنی نظمیں سناتی۔ میں اگر اس کی معمولی نظموں کی بھی تعریف کر دیتا ـــــ دیکھو! جھوٹ بولنا تو میں پاپ سمجھتا ہوں۔ لیکن حسن کی خوشامد میں ایک آدھ جھوٹ بول لینے میں مجھے تامل نہیں ہے۔ جبکہ حسن کی طرح جھوٹ بھی معصوم ہو ـــــ"

اس نے اس کے بعد اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے میریا کی تصویر نکل آئی۔ اس وقت امبولنس وان میں، جب میں جانسن کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں جانسن کی محبوبہ میریا کی تصویر جھلک اٹھی۔ میریا بیڈمنٹن کا ریکٹ لئے اندھیرے میں ابھر رہی تھی ـــــ اس کی مسکان کی طرح نرم مسکراہٹ، اس کی باہنوں کا دلاویز خم، آنکھوں میں جلتی ہوئی نیلی روشنی، پیشانی پر بکھرے ہوئے خم بہ خم آراستہ بال ـــــ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک دھماکہ ہوا اور اسکی آنکھوں سے ریکٹ ٹوٹ گیا۔ اس کی ریشمی قمیص پرچ کر مرغی کے پروں کی طرح اڑ گئی۔ اس کے لبوں کا تبسم کھرچ کر کہیں گر گیا ـــــ اور ان نیلی آنکھوں میں گرد ہی گرد بھر گئی ـــــ اب ان کی نیلی چمک آنسوؤں کے تار میں بہہ رہی تھی ـــــ میریا، میریا، ـــــ

• تمہارا جانسن کوئی معمولی نوجوان نہیں ہے ـــــ اس کی محبوبہ بڑی حسین ہے ـــــ وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ـــــ وہ لندن ٹیلیفون ایکسچینج میں اپرنٹس ہے۔" میں نے اسٹارٹ دیا۔ انجن چلنے لگا۔ درختوں اور چٹانوں کے تیز دانتوں سے بچے گاڑی نکال کر میں تھوڑی دیر تک رکا۔ لڑائی کا مرکز دھند

ہو گیا تھا۔ اور اب جنگ کی نقاریں تھکن پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں طرف سے گولیوں کی آندھی کی شدت کم ہو رہی تھی۔ میں بائیں طرف موڑ کر گاڑی دوڑانے لگا میں نے ہڈلائٹ نہیں جلائی۔ لیکن فٹ لائٹ جلانا ضروری تھا۔ ورنہ گاڑی ادھر ادھر ہو گئی نہیں کہ میرا جنازہ بھم۔

مجروح جانسن اب اور زیادہ کراہنے لگا تھا۔ اس کی کراہ میں موت کا کرب شامل تھا۔ اور جیسے جیسے مجھے اس کی موت کا یقین ہوتا جاتا تھا میرا دم حلق میں اٹکنے لگا تھا۔ چند ہی دن پہلے تو اس نے مجھے اپنی محبوبہ کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کیسی بھوکی رخشندگی پیدا ہوئی تھی۔ اس کی لمبی لمبی انگلیاں تصویر کے گالوں اور بالوں پر کتنی نرمی سے تیر رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس جنگ کے بعد واپس جائے گا۔ میریا بیوی بنکر اس کی آغوش میں چلی آئے گی۔ میریا اور جانسن نے اپنے بچے کے بارے میں، ابھی سے بازی لگائی تھی۔ اس کے بال سنہرے ہوں گے۔ آنکھیں بھوری، میریا کی طرح، بال جانسن کی طرح گھنگھریالے اسے یقین تھا وہ میریا سے بازی جیت جائے گا ــــ ہا ہا ہا ــــ اس کا قہقہہ پہاڑیوں سے گونج کر دور دور سے صدائے بازگشت کی حماقت دہرا رہا تھا

ہسپتال کے پڑاؤ پر جب اس کا اسٹریچر بنکا لگایا تو اس نے گیس کی روشنی میں آنکھیں کھولیں۔ اور ایک دلخراش چیخ ماری۔ اس کی آنکھیں ڈراؤنی ہو گئی تھیں۔ اور یہ کیطرح باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے چاروں طرف بیقراری سے دیکھا۔ تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے اس نے اپنی جیب سے تصویر نکالی۔ اس نے تصویر کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ میں نے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تصویر پکڑا دی ــــ اکھڑی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے کہا۔

"تھینک یو"

اور پھر اس نے ایک صدیوں سے تشنہ انسان کی طرح تصویر کو اپنے منہ پر مل لیا۔ جیسے وہ تصویر نہیں تھی بلکہ اس کے خوابوں کی ٹھنڈی، حسین اور کومل دنیا تھی۔ اس کے پورے بدن کی لرزش اچانک رک گئی اور وہ پتھر کے گرے ہوئے مجسمے کی طرح ساکت ہو گیا۔ تصویر اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور میرے بوٹ کے پاس آکر گر گئی۔ میں نے تصویر اٹھائی۔ میریا کی تصویر تھی۔ وہی بانکپن۔ کنوارا تبسم۔ چمک کی ہوا میں اڑتی ہوئی قسمیں، بیڈمنٹن کا ریکٹ، مکر کا دلفریب خم، اور بالوں کا لہردار انتہام جیسے کہسار کی تہہ بہ تہہ گہری ہوتی ہوئی شام ــــ آنکھوں کی شوخی ــــ لیکن یہ سب میں اپنی یاد کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، اس لئے کہ پوری تصویر خون سے رنگ گئی تھی، صرف ریکٹ کا ایک حصہ بے داغ تھا ــــ! میں نے تصویر ہسپتال پڑاؤ کے احاطے کے حوالے کر دی ایک بار مڑ کر دوڑتے ہوئے جانسن کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ زبان اور آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔ اب خون کا چکنا بند ہو گیا تھا۔ ان نکلی ہوئی آنکھوں میں کیسی گھٹن تھی، کیسی مری ہوئی آرزو، محبت کی کتنی پیاس ــــ اس کی آنکھیں واقعی ازل سے ہی پیاسی تھیں۔ اب وہ اپنی محبوبہ سے کبھی بھی بازی نہ جیت سکیگا

میں نے اپنے ایمبولنس وان میں بیٹھ کر اسٹارٹ کر دیا۔ اور گاڑی جنگلی راستوں سے محاذ کے رخ پر دوڑنے لگی۔ رات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ اندھیرا موت سے زیادہ بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی اچٹتی اور پھر ٹھیک سے بھر بھر ہموار طور پر چلنے لگتی۔ جانسن کی آنکھیں، اس کی زبان، اس کا قہقہہ ــــ سب میں اس کا قہقہہ جیسے جکڑ گیا تھا۔

"ــــ وہ بڑی ذہین شاعرہ ہے ــــ شفق کی لالی کو دیکھ کر اس کے گال جل اٹھتے تھے ــــ وہ بہت معصوم ہے ــــ سارا حسن ہماری رعنائی، ساری شاعری معصومیت میں ہے، زندگی کی معصومیت اور حلاوت میں ــــ"

گاڑی کسی پتھر سے ٹکرا کر پھر ایک بار اچٹ گئی۔ میں نے سنبھالا لیا۔ اور راستہ کاٹ کر اپنے خیال میں زیادہ ہموار راستے سے گزرنے لگا۔ لیکن گاڑی کا رہ رہ کر ہچکولے کھانا بند نہیں ہوا۔ میں نے گاڑی روک دی۔ جنگل کے پیٹ میں میں نے گاڑی کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا۔ بار بار میں اس اندھیرے میں راستے کے بارے میں سوچنے پر زور دینا چاہتا تھا۔ لیکن بار بار مجھے جانسن یاد آ رہا تھا۔ اس کا اکڑا ہوا تھرتھراتا ہوا فریادی جسم، اس کی اینٹھی ہوئی، باہر کو نکلی ہوئی زبان جس میں پڑا ہوا خون جم کر آہستہ آہستہ سیاہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے ایک اور سگریٹ سلگایا۔ اور فلیش لائٹ ہاتھ میں لیکر ایمبولنس گاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے سمت کا پتہ لگانے کے لئے بٹن دبایا۔ روشنی کا فوارہ درختوں اور جھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹیلوں پر پڑتا ہوا اس سمت میں مڑ گیا۔ جدھر سے میں آیا تھا۔ میں اسی راستے پر بڑھنے لگا۔ انجن گڑگڑا اور مشین گنوں کی دھوم دھڑکا پھر تیز ہو گئی تھی۔ معرکے کی جنگ ہو رہی تھی۔ خون آشام دانت کاٹی جنگ۔ جیسے کوریا کی زندگی اور موت کا فیصلہ اسی رات کو ہونا تھا۔ امریکی فوجیں اپنی حاصل کی ہوئی فتح کی سرحد سے نیچے اترنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اور دوسری طرف شمالی کوریا کے سپاہی جنگ کا پانسہ پلٹ

دینے کی قسم کھائے ہوئے تھے ـــــــ دو تین گولیاں ایمبولنس گاڑی سے آکر ٹکرائیں۔ اور میرے خطرے کا احساس بڑھ گیا۔ میں نے فلیش لائٹ گل کر دی، اور اندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ پھر گولیوں کا انتظار کرنے لگا۔ سوکھے ہوئے گرے پتے اور پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چرمرائے تو میں سمجھا کسی کی چاپ کی آہٹ ہے۔ لیکن پھر وہ آواز بند ہو گئی۔ گولیاں نہیں آئیں۔ میری ناک میں زمین سے اٹھتی ہوئی جلتے ہوئے زندہ گوشت کی بو گھسنے لگی۔ جیسے کہیں قریب ہی چمڑے یا کپڑے کا پلندہ جلایا گیا ہو۔ میں نے اس تے کرانے والی بو سے بچنے کے لئے بائیں طرف منہ پھیر لیا۔ اندھیرے میں ہر طرف منہ پھاڑے ہوئے خوفناک سائے سے نظر آتے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بائیں طرف جیسے کوئی غار تھا۔ میں فلیش لائٹ کا بٹن دبانا ہی چاہتا تھا کہ گولیاں پھر برس پڑیں۔ سانس جیسے تیز دانت والے چاقو کی نوک پر گھٹتے ہی درمیان سے کٹ کر آدھا اندر اور آدھا باہر رہ گئی ہو۔ میں نے دم سادھ لیا۔ میں چند قدم آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اور آگے بڑھا تاکہ ایمبولنس وین سے میں دور نکل جاؤں۔ ہوا زور زور سے جھکڑ کی طرح چلنے لگی تھی اور بائیں طرف ان دیکھے غار سے سڑے ہوئے مردوں کا تعفن اور تیز ہو گیا تھا۔ میرا بدن پسینے سے لت پت تھا اور میرا فوجی کپڑا پیر سے گردن تک چپک گیا تھا۔ لیکن پسینے کی نمکین کھٹاس بھی سڑاند کی تلخی کو مٹانے میں ناکام تھی۔

میں سچ کہتا ہوں۔ اسوقت میں کتے کی طرح اپنے لگا تھا۔ ـــ ـــ ـــ

نے جلتی ہوئی فلیش لائٹ کو اس کا رخ اپنی طرف کر کے ایک بڑے سے پتھر پر پٹک دیا۔ اور اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ ہلکے ہلکے ذبح ہوتے ہوئے بکری کے بچے کی طرح ممیا رہا تھا۔ میں نے فلیش لائٹ اٹھا کر اس کے چہرے کو روشنی میں دیکھا۔ کوئی ڈھائی سال کا بچہ ہوگا۔ اس کی آنکھیں کھلیں، اس کے ننھے ننھے لب تھرتھرائے اس نے اپنی دونوں باہیں پر تولتی ہوئی چڑیا کے پروں کی طرح پھیلائیں ——— اور پھر میں نے دیکھا ایک انسان کی گود میں ایک انسان کا ننھا بچہ بغیر کچھ کہے بغیر روئے، بغیر ٹھٹکے کس طرح مسکراتا ہوا مر جاتا ہے۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ مسکراتے ہوئے مر جانا ——— بچہ خواب میں ماں کو پکارتے ہوئے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ لیکن اس وقت وہ کیوں مسکرایا میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا ہے۔

میں اسی طرح بیٹھا کسی چیز کا انتظار کر رہا تھا ——— ابھی ابھی جو بچہ مسکرایا تھا، کیا وہ مر بھی سکتا ہے۔ شائد اس کی آنکھیں کھل جائیں، شائد اپنی ہاتھوں کو پھر پھیلائے۔ شائد اس کی کچلی ہوئی ٹانگوں میں پھر زندگی دوڑ جائے اور وہ دوڑتا دوڑتا اپنی ماں کی بھری بھری چھاتیوں پر منہ گاڑ دے اور دودھ پینے لگے۔ لیکن اس طرف ماں کی چھاتیاں خون میں لت پت ادھڑی پڑی تھیں اور اس طرف بچہ میری گود میں ٹھنڈا پڑا تھا۔ میں نے اس بچے کو اسی طرح دونوں عورتوں کے بیچ سلا دیا۔ اور فلیش لائٹ بجھائے بغیر اٹھ کھڑا ہوا ——— ابھی میں ان مردوں کو پار کر کے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ میرے گھٹنے پر ایک جلتی ہوئی سلاخ گھس پڑی ——— جلتی ہوئی گولی ——— میں تمتما کر گر پڑا ——— میرے ہاتھ سے فلیش لائٹ دور جا پڑی اور میں اندھیرے میں غرق ہو گیا۔ اندھیرے کی دلدل میں ——— اندھیرے میں! اندھیرے میں!

ایک ہفتہ سے میں ہسپتال کے عارضی پڑاؤ میں پڑا ہوا ہوں ——— مجھے انڈین میڈیکل مشن کے لوگ اٹھا کر یہاں لائے ہیں ——— میں چھ روز تک بیہوش رہا۔ کل صبح مجھے ہوش آیا۔ بھور کا وقت تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ سامان میں بیماروں کے کونجنے کی آواز آ رہی تھی ——— شائد شمالی کوریا اور چینی سپاہی ہماری فوجوں کو ڈھکیلتے ہوئے بہت آگے نکل گئے تھے ——— میرا سر بندھا ہوا تھا اور میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو میں نے محسوس کیا کہ میرے سر میں بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے جب سر اٹھا کر اپنے پیر کی طرف دیکھا تو مجھے سفید پٹیوں، بھیگی ہوئی روئی اور گاؤز سے آگے جھانکتی ہوئی انگلیاں اور پلستر کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا۔ میرا پیر بھی دوسرے ہو گیا تھا۔ اور اس میں جیسے لوہار کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ اور کیا بتاؤں مجھے وہ جھانکتا ہوا پیر کا اگلا حصہ نہ جانے کیوں رسیلے میٹھے ٹکڑے کی طرح نظر آیا، سرخ اور پیلا، اور انگلیاں پکے ہوئے جامن کی طرح ——— میرے پاس پہنچ کر ڈاکٹر نے سمت بندھائی، اس کی آنکھیں اور بے ریا مسکراہٹ نے بڑا سہم کیا ——— بنگالی ڈاکٹر بولا ——— "کیوں بھائی ——— اب تو تم چنگا ہو جائے گا ——— پیر ٹھو ——— تھوڑا کاٹنا ہوگا ——— ہم بولتا ہے گنگرین بڑا ڈیجیز ——— نو ڈیئے۔ یس"

اس کے بعد پیر کی گولی نکل کر ٹھیک میرے دل میں لگی۔ ذرا سوچو۔ مجھے کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ میں کتنا گھبرایا ہوں گا، اندر ہی اندر تڑپا ہوں گا ——— یہ سنتے ہی ہر وقت ایک بیاکلی میری آنکھوں میں جھولنے لگی ——— نیلگی بیاکلی ——— میں ایک مجروح ہرن کی طرح ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ میں نے سر اٹھا کر اپنے سوجے ہوئے پیر کو دیکھا۔ جامن کی طرح سیاہ۔ انگلیاں مجھے اشارے کرتی ہوئی معلوم ہوئیں ——— ہمیں بچاؤ ——— ہمیں اپنے آپ سے مت جدا کرو ——— ہم تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں ——— میں نے آخری بار بے بسی میں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ مجھے اسکی مسکراتی ہوئی نمکین آنکھوں میں اسوقت جلاد کا مہم صمیم نظر آیا

"ہا ہا ——— تم گھبراتا ہے ——— ڈارتا ہے ——— ہاش ——— ساب ٹھیک ٹھاک ——— ہاں ٹھیک ٹھاک ——— ہے"

اور دوپہر تک ساب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ——— گھٹنے کے پاس سے میری ٹانگ چھانٹ دی گئی۔ وہ موٹی، بھرپور، مضبوط ہندوستانی ٹانگ جسے چین گئی۔ میری ٹانگ کیا چینی، مجھ سے میری، میدانوں اور حوصلوں کی دنیا چین گئی

ٹانگ کے کٹنے کے بعد ہر پل ٹیس سے تو قدرے نجات مل گئی ہے۔ لیکن میرے اندر ایک اور انسان ہے جس کا دل مسوستا رہتا ہے۔ کیسی پیاری حسین اور توانا ٹانگ تھی وہ۔ اس ٹانگ نے میرے ساتھ کتنی وفا کی تھی۔ وہ مجھے کہاں کہاں لئے پھری تھی، کھیتوں میں، کھلیانوں میں، شہروں میں۔ کھیل کے میدانوں میں اور مرغزاروں میں۔ شادی کے وقت گھوڑے پر۔ جب مائیں پیر کی رکاب ٹوٹ گئی تھی تو اسی پیر نے پورے جسم کا بوجھ سہار کر مجھے موت کے منہ سے بچا لیا تھا ——— ایک بار میں نے اپنے گاؤں کے پالتو کتے کو اسی ٹانگ سے وہ رولا دیا تھا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا ——— اور اب اسی ٹانگ سے

میں ہیومنس ڈے کا اسٹارٹر دبایا کرتا تھا ـــــ اور اب میرے پاس میری وہ بیتہ رفیق، میری پیدائشی جیون ساتھی، میری ٹانگ نہیں رہی ـــــ کوریا کی جنگ اسے کھا گئی تھی۔ کرشن! سوچو تو ـــ اب مجھے بیساکھی پر چلنا ہوگا۔ میں ڈرائیو نہیں کر سکوں گا۔ کتنی محرومی ہے میری، کتنی اذیت ہے مجھے۔ میں کیا بتاؤں۔ آنسو تو میری آنکھوں میں دریائے یالو کے پانی کی طرح جم گئے ہیں ـــــ اور میں ہر طرف اپنی غم آگیں آنکھوں کو نچاتا ہوں۔ اور یہ دیکھ کر، اور بھی غم زدہ ہو جاتا ہوں کہ میری طرح کتنے ہیں، جن کے رفیق ان سے چھن گئے ہیں۔ کسی کی ناک اڑ گئی ہے کسی کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے ہیں۔ کسی کی آنکھ کی جگہ صرف خول رہ گیا ہے۔ اندھے اور محرومی۔ یہ ظلم ہیں، ظلم سے بھی زیادہ خوفناک چیز ہے۔ ـــــ کل سے آج تک اپنی زندگی کے اس موڑ پر میں اکیلا پڑا سوچ رہا ہوں۔ اپنے وطن سے ہزاروں میل دور مجھے اپنی پچھلی زندگی کی یادیں ستا رہی ہیں۔ اور میں جیسے سنیما دیکھ رہا ہوں۔ یہیں اپنے بڑیں پڑے پڑے، خود بخود، یادوں کی فلم کا فیتہ کبھی سایہ در سایہ اور کبھی آفتاب در آفتاب گھومتا چلا جا رہا ہے۔ میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ تصویریں اور چمک اٹھتی ہیں۔ تفصیلات میں اور تازگی، ایک پراسرار سنسنی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دل پر ایک آرا چلنے لگتا ہے۔ اور ارادوں پر چلتا ہے تو یاسمت ڈھاتا ہے، اسکو تم میرے پیارے نقاد، اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔

میں جب یہاں آیا تھا تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں دنیا میں امن قائم کرنے والی فوج کی خدمت گذاری کے لئے بھیجا جا رہا ہوں۔ یہاں آکر دیکھا کہ میں اس فوج کے ساتھ ہوں، جس میں امن کا کوئی جذبہ نہیں ـــــ شعلوں کے کھلیان، آگ کے کھیت، آگ کے باغ، دھوئیں پھینکتے ہوئے بلے، ویران شہروں کے قبرستان ـــ یہی سب تو دیکھا میں نے۔ میں نے دیکھا کس طرح ایک امریکی سپاہی بلے میں پڑے ہوئے چھوٹے بچوں کے جسموں پر ـــ کھڑا کتے کی طرح پیشاب کرتا ہے، کھلکھلاتا ہے۔ اور قہقہہ لگاتا ہے، اور اس کی گردن میں، اس گن ہار کی طرح جھولتی ہے ـــــ پھر میں نے دیکھا منہدم مکان کے تنہا دھوئیں پھینکتے ہوئے ستون سے مٹکی ہوئی ایک سرخ فراک پر نشانہ لگانے کی بازی لگائی جاتی ہے۔ اور، اور جس کی گولی فراک کے ٹھیک سینے میں پڑتی ہے وہ اس کوریائی عورت کو جیت لیتا ہے جس کے لئے حق کا قضیہ کھڑا ہو جاتا ہے ـــــ کوریائی عورت چیختی ہوئی امریکی سپاہیوں کے نیچے میں چلی جاتی ہے۔ فراک چیتھڑے ہو کر رہ جاتا ہے، اور یہ سب تماشہ پنیر گوشت، شراب اور عورت کے درمیان ناچتے ہوئے، بھبکتے ہوئے امریکی قہقہوں میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے ـــــ تو یہ سب دیکھا میں نے ـــ دنیا میں امن قائم کرنے والی لڑائی میں یہی تو ہوتا ہے، ایں؟

مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا ہے۔ جب میری ملاقات جان سے شروع شروع میں ہوئی تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ندی میں برف جم گئی تھی اور درختوں سے شبنم سفید سیپ کیطرح جھڑتی تھی۔ پچھلی تمام سردیوں کی یاد اس برف بار سردی کے سامنے ماند پڑ گئی تھی خود ٹھنڈے ملکوں میں رہنے والوں کا کلیجہ ہر اس کیساتھ جتنا ہوا محسوس ہوتا تھا ـــــ اسی زمانہ میں جبکہ امریکیوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کرسمس سے پہلے پہلے پنجوریا کی سرحد تک کوریا فتح کر لیا جائے گا۔ اچانک شمالی کوریا اور چینی سپاہیوں نے جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا اور پھر جو بھگدڑ مچی ہے، اس کا حال تو تمہیں اخبار سے معلوم ہی ہوا ہوگا۔ میں بھی بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا بھاگتی ہوئی فوجوں کے ساتھ جانسن کا دستہ بھی تھا۔ اس نے اپنی خوبصورت پھیلی ہوئی اتھلی سبز آنکھوں کو میچ کر اور سگریٹ کا بھرمنہ دھواں نکال کر کہا تھا

"تم ہندوستانی ہو ـــــ ہندوستانی گڈ، ہندوستان گڈ ـــــ میری گڈ ـــــ میں نے ہندوستان دیکھا ہے، ـــ تاج محل ـــ ایورا کا غار ـــ کشمیر منانے کر کشمیر بھی پنجاب کی طرح، بنگال کیطرح ـــــ کوریا کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا ـــ اوہ، مٹ وس بلاڈی کوریا ـــــ"

"کیوں کوریا میں کیا ہوا؟"

" ا .... اوہ، ـــــ / ٦٤٧٤٧٤٧٤ fw ٦٤٧٤٧٤٧٤ "

" جہاں ـــــ اور ہندوستانی؟"

" وہی ـــــ لیکن ان کا کوئی تجربہ نہیں ـــ وہ تو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں ـــــ"

پھر وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اس آنکھیں سلوٹوں میں اس طرح چھپ گئیں کہ اسکی آنکھوں کی سبزی کا رنگ غائب ہو گیا اور ہلکی ہلکی ٹماٹ معلوم ہونے لگی، جگنو کی طرح ٹمٹماتی ہوئی!

"میں نے سوچا تھا کہ کرسمس تک واپس چلا جاؤں گا ـــ میریا سے شادی کر لونگا ـــ اب ہم زیادہ انتظار نہیں کر سکتے ـــ محبوب کے پیار میں کتنی جنت چھپی ہوئی ہے ـــ تم جانتے ہو ـــ؟"

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میری آنکھیں سیول سے آگے اس چھوٹے سے شہر پر تھیں جہاں دھوئیں کے بڑے بڑے درخت زمین سے اکھڑ کر آسمان کی طرف اڑتے چلے جا رہے تھے۔

اس نے سوچا تھا وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلے گا۔ اس کے ساتھ جھیلوں میں تیرے گا۔ اور برف پر اسکیٹنگ کرے گا۔ اور پھر ایک حسین مرغزاروں میں چلا جائیگا ایکھنڈگی پر سکون اور خوبصورت گودیں ـــــ چڑیلوں کی چھپاہٹ کے سائے ہیں۔ برف کی وادیوں میں، جہاں نیم منجمد چشمے نرم روی کیساتھ، حاملہ عورت کیطرح آہستہ آہستہ نشیب میں اترتے ہوں گے۔ شیری اور سیب کے پیڑ آہستہ آہستہ گنگنائیں گے۔ فاختہ اڑکر ایک درخت سے دوسرے درخت پر جا بیٹھیگی ـــــ اور وہاں، تھکے سلانے والی اور جذبات میں ترنگ بھرنے والی وادی میں، اس کی حسین، معصوم اور ملائم باہوں والی میریا اسے اپنی شاعری سنائے گی اور وہ اس کے گالوں کو تھپتھپائے گا۔ اور آنکھیں موند کر اور بادلوں کے پر لگا کر شفق زاروں کیطرف اسے اپنے سینے سے لگائے اڑ جائے گا خوابوں کے سلونے نیل میں بہتا چلا جائیگا۔

اس کی باتیں خواب ناک روبان سے بھری ہوئی ہوتی تھیں ـــــ لیکن وہ تو کہیں تباہ چکا ہوں کہ بادلوں کے پرے پہلے اسے موت کے پر نکل آئے اور وہ اپنی میریا کو چھوڑ کر کہیں اور سدھار گیا ـــــ اور اس وقت، اس بڈ پر، ایک پھر، اس کی پتھرائی اوپر کی طرف نکلی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ اور مجھ سے پھر وہی کہانی کہہ رہی ہیں۔ لیکن ان میں وہ تمنا سے بھری بیقراری نہیں ہے۔ ان لبوں کے باہر زبان لٹکی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت سگریٹ کے سرئی کش نہیں لگا رہا ہے۔ اب تو اس کا جسم بھی وہ نہیں۔ بھاری لمبا تڑنگا، چھ ہاتھ کا جسم، برف کیطرح سپید اور ہوا کے جھونکے سے لڑھکتی ہوئی چٹان کی طرح اٹل۔

میں جانسن کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں اس وقت ہر چیز کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ ماضی اور مستقبل دونوں سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتا ہوں۔ لیکن دونوں سمتوں سے مقناطیسی تار اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور میں اپنی اس عجیب زندگی کو سمجھنے میں ناکام ہوں۔ یہ کیسی عجیب زندگی ہے۔ شائد تم سمجھ سکو۔ تم کافی ذہین، ابلاغ اور دردمند انسان ہو۔ ضرور سمجھ جاؤ گے۔

وہ کیسی خوفناک رات تھی۔ جب امریکی، ترکی اور انگریزی نوعیں اڑتیسویں خط متوازی سے نیچے دھکیل دی گئی تھیں۔ اور میک آرتھر کی ساری ڈویژنیں ٹائن ٹائن فش ہو گئی تھیں۔ بچارے جانباز سپاہیوں کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اپنے ساحل پر مانوس فضاؤں میں محبوباؤں کے گال پر گال رکھ کر مسکرانے کا خواب، ماؤں اور بہنوں کے جلوس قہقہہ لگانے کا خواب، شراب پینے اور رقص کرنے کا خواب ـــــ سارے خواب سوڈا کی بوتل کے کھلتے ہی گیس کیطرح اڑ گئے تھے۔ ان کے اندر موت کی اداسی اور بے کیفی پیدا ہو گئی تھی ـــــ اب امریکی سپاہی اپنی شکست کا بدلہ ہر کمزور، جانداروں اور بیزبان چیزوں سے چکا رہے تھے ہاتھیوں اسٹین گن تھی، سنگینیں تھیں، پھر تکلف کیا تھا ـــــ ہاں اسی رات کی صبح ہو رہی تھی۔ بادل نیچے جھکے جھکے تھے۔ نوح میں بیحد انتشار اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔

پہاڑی علاقہ تھا۔ تقریباً سو سوا سو کوریا کے باشندے قریبی گاؤں سے ڈھور ڈنگر کیطرح ہنکا کر وہاں لائے گئے تھے۔ تمام سپاہی ان کو طرح طرح کی اذیت پہنچا رہے تھے ـــــ وہ نشے میں دیوانے ہو رہے تھے ـــــ وہ وحشیوں کی طرح اچھل کود رہے تھے، گا رہے تھے، نعرے بلند کر رہے تھے، بے ہنگم چیخوں کے نعرے ـــــ لانگ لیو میک آرتھر ـــــ لانگ لانگ، لانگ ـــــ انھوں نے گانا بنایا تھا۔

کوریا کتوں کا ملک ہے، سرخوں کا ملک ہے
اور کتیاں ہمارے عیش کے لئے پیدا کی گئی ہیں
کوریا ـــــ کوریا ـــــ کتوں کا ملک ہے۔

جانسن میرے پاس ہی ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ وہ اسٹین گن پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھکا ہوا تھا۔ وہ غور سے دم بخود ان لوگوں کو گھور رہا تھا۔ ان گنگناتے ہوئے لوگوں کو اچھلتے کودتے سپاہی کبھی سنگینیں بھونکتے، کبھی دانت کاٹتے، کبھی قہقہہ لگاتے۔ عورتوں کے لباس تار تار تھے۔ وہ ننگی تھیں۔ وہ یکجا ہو گئی تھیں اور مرد کندے کھا کھا کر پیچھے ہو گئے تھے۔ میں تو اپنی سانس روک روک کر امریکی تہذیب کا، کوکو کولائی تہذیب کا نادر اور لاجواب رقص دیکھ رہا تھا۔

جانسن جیسے کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں جلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کئی دنوں کی بھوکی تھیں نا؟ نیند تو اڑ گئی تھی غریب کی۔ بھگدڑ میں نیند کس منحوس کو آتی ہے۔ اس نے جاہی لی اور میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنی آستین کو پیٹ کر اپنی کہنیوں کے اوپر سمیٹ لیا۔ حالانکہ دانت کٹکٹانے والی ٹھنڈک تھی۔ اس نے پھر جاہی لی اور جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر مجھے پیش کیا۔ میں نے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک لمحہ کو

میری طرف دیکھا۔ اور پھر سگریٹ جیب میں رکھ لیا۔ اس کے ہاتھ کی دو انگلیوں کے درمیان کے پاس آخری یورپین سگریٹ دب گیا تھا۔ وہ حصہ دھوئیں سے رنگ کر حقے کے تمباکو کی طرح رنگین ہو گیا تھا ــــــ بوڑھی عورتوں، بچوں اور مردوں کو لیکر سپاہیوں کا ایک دستہ کھائی کی طرف بائیں جانب چلا گیا۔

ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سے وہ کھائی صاف دکھلائی دیتی تھی۔ لیکن یہیں جنگل سے منہ پھیر کر بائیں بازو پر ذرا ہٹکنا پڑتا تھا۔ اس کے بغیر کھائی کا پورا نظارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری متجسس نگاہیں اس طرف پھر گئیں۔ ساری عورتیں، بچے اور مرد اس کھائی میں اتار دیئے گئے۔ تقریباً ایک درجن سپاہی اپنے اسٹن گنوں سے کھائی کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ کھائی کے ابھرے ابھرے مستطیل نما لب پر کھڑے تھے۔ وہ مشتعل ہو ہو کر ان کو گھٹنے ٹیکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ پہلے کچھ عورتوں نے اپنے گھٹنے ٹیک کر کچھ بچوں کو اپنی گودیں چھپا لیا۔ اور ان کے بال آگے جھرنے کی طرح گر گئے۔ جیسے جنگل کی چراگاہ میں گائیں شیر کی آہٹ پا کر اپنے بچھڑوں کو اپنے سینے میں لیکر کان پھڑپھڑا رہی ہوں۔ مردوں میں کچھ بوڑھے اور کمزور مردوں نے جھکتے ہوئے سر جھکا دیئے۔ چند ایسے جیالے بھی تھے جنھوں نے اپنا سینہ تان دیا۔ ان میں دو تین ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی تھیں۔ وہ بالکل ننگی تھیں۔ لیکن انھوں نے بھی سینہ تان رکھا تھا۔ اور وہ بھی اوپر اسٹن گن تانے امریکی سپاہیوں کو حقارت آمیز تنفر اور شعلہ بار نگاہوں سے گھورے جا رہی تھیں آہستہ آہستہ ایک بھنک ابھرنے لگی وہی بھنک تدریج ایک تیز طرار نغمے میں بدلتی گئی۔ کنارے پر کھڑے سپاہیوں نے اسٹن گن تھپتھپالی۔ نغمے کی تیز تلوار کی دھار پیدا ہو گئی تھی ــــــ سپاہیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ــــــ تڑتڑتڑتڑ ــــــ تڑتڑتڑتڑ ــــــ تڑتڑتڑ !

کھائی میں انسانوں کا ڈھیر لگ گیا ــــــ نغمہ تھم گیا ــــــ بندوق کا نغمہ دیر تک پہاڑیوں کے سینے سے ٹکرا کر گونج پیدا کرتا رہا۔

امریکی سپاہیوں نے اسٹن گنوں کو گھٹنے میں مار کی طرح ڈال لیا اور تھیلے بجا کر گرد جھاڑنے لگے۔ کوریا کے بیٹے اور بیٹیوں کے خون کی گرد سے زیادہ کیا اہمیت تھی۔ جیسے بیکری میں کیک بنانے کے بعد وہ ہاتھ سے آٹا جھاڑ رہے ہوں۔ بارہ امریکی غازی پھر رقص و نغمہ کی جمی ہوئی محفل کی طرف شادماں و فرحاں لوٹ گئے۔

میں نے جانسن کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا گیا اور اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ بارہ سپاہیوں کے واپس آتے ہی، ان عورتوں کا مول ہونے لگا۔ جو جوان تھیں اور جن کا جسم کوریا کی پہاڑی اور خوبصورت مٹی سے بنا تھا۔ امریکی سپاہی پہاڑیوں کا بنر بہاس نہ چھین سکے تھے لیکن ان کی ہڈیاں اس وقت بالکل مادر زاد ننگی لگ رہی تھیں۔ اور ابھی بھی میری آنکھوں میں ان کے جسم ابھر رہے ہیں اور ڈوب رہے ہیں۔ سپاہی زیادہ تھے اور عورتیں اور لڑکیاں کم تھیں۔ اور کوریا سے اور کمیونسٹوں سے انتقام سب کو لینا تھا۔ اس کار خیر میں کوئی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا ــــــ ایک عورت پر تین تین چار چار سپاہی متعین ہوئے اور اپنے اپنے مال غنیمت کو لیکر سپاہیوں کی ٹولی درختوں کے پیچھے چلی گئی۔ انسان جب ننگا ہو جاتا ہے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ درختوں کا نیم پردہ کے انسانوں کو درندگی کا ایسا شرمناک ڈرامہ کھیلتے ان آنکھوں نے دیکھنے سے کہ اب کبھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ــــــ جانسن کے ہاتھ سے اسٹن گن چھوٹ کر گر گئی۔ ــــــ "کیا سوچ رہے ہو جانسن ؟" میں نے پوچھا

"میں صرف ایک بات سوچ رہا ہوں۔ اگر یہ جنگ کوریا کے ساتھ نہیں بلکہ انگلینڈ کے ساتھ لڑی جاتی تو کیا ہوتا۔ کیا امریکی ہوا باز لندن پر ٹنوں بم نہیں گراتے کیا شیفیلڈ اور مانچسٹر کے کارخانے اور کانپی پٹرول جیلی سے نہ جھلس جاتیں۔ پھر وہاں موسم بہار میں سات رنگ کی اڑتی ہوئی تتلیوں کا کیا ہوتا۔ سیب اور شیری کے درختوں کا کیا بنتا ؟ ــــــ کیا رنگین پھولاروں کی خوبصورت لڑکیوں کے سڈول جسم پر کے ہوئے نیلے، پیلے، کاسنی گاؤنوں کی قوس و قزح نہ ٹوٹ جاتی ؟ وہ کامپٹین کے اسکرٹ اور ان کی لہریں، ان کا پھیلاؤ ــــــ وہ پپاتے ہوئے، کینگ کے دنت جھلاتے کی طرح پر تولے ہوئے سفید براق پھپھیلے جوان بدن ــــــ وہ وادی میں تالیاں پیٹتے، گیت ــــــ شیکسپیئر کے ڈرامے، شاکے فلز، شیلے کی نظمیں ــــــ سوچتا ہوں، سوچتا ہوں ــــــ وہ میرا سر دکھنے لگا!

WHAT A 'HEADACHE?' ــــــ تم ٹھیک سوچتے ہو مرے دوست ــــــ تمہاری میرپا کی شاعری کا مقبرہ بن جاتا، اور اس کا سارا سونا پن سارا حسن اور ساری معصومیت دھوں بنکر اڑ جاتی ــــــ کیوں کیسا ہوتا یہ کھیل ؟ اس کیس کی تمہیت ؟ ــــــ میں جواب دے رہا تھا جانسن کے سوال کا لیکن کچھ اور ہی کہہ رہا تھا وہی باتیں، اپنے گھر، اپنے دفن کے بارے میں۔ اور اپنی آنکھوں سے اس بربریت کا تماشہ دیکھنے پر مجبور ہونے کے بارے میں، اس کمبخت اور انسان دشمنی کے بارے میں جس نے مجھے کویا کے جہنم میں اٹھائیر پھینک دیا تھا۔

اور اس وقت مجھے یہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں۔ اور ایسی سیکڑوں باتیں۔ بم، بزدلی، شکست، انتقام، زنا اور لوٹ کی باتیں یاد آتی ہیں تو سانپ کی طرح ذہن کو اٹھ کر ڈستی چلی جاتی ہیں۔ یہ ظلم نہیں ہے۔ یہ درندگی بھی نہیں ہے۔ یہ اس سے بڑھ کر کوئی اور شے ہے۔ یہ ایٹم بم نہیں، یہ ہائڈروجن بم نہیں، یہ اس سے بھی زیادہ

کوئی خطرناک بم ہے۔ یہ انسانیت کی موت کا بم ہے۔ میرا خیال ہے انسان دشمنی سے زیادہ ٹڈیوں کے خزانے ہیں اور کوئی خطرناک بم نہیں۔

لیکن میں نے دوسری طرف کبھی نہ مرنے والی انسانیت کو بھی دیکھا ہے۔ وہ انسانیت جو موت کی کھائی میں اتر کر سینہ تان دیتی ہے۔ اور زندگی کے دولہے سے بھرا ہوا گیت گانے لگتی ہے۔ وہ انسانیت جو بچے کی پرتولتی ہوئی باہوں اور ایک جنبی ہندوستانی کی گود میں مسکرانے میں ہے۔ تباہ کرشن! اس انسانیت کو کہیں ایٹم گن اور پٹرول بیلی سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اب اس حماقت کا کیا جواب ہے تم ہی بتاؤ ——— تم سوچتے ہوگے۔ میں تمہیں وہی تفصیل تو دے رہا ہوں جن کو تم نے سیکڑوں بار مختلف اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ پھر اس بکواس کی کیا تک ہے۔ ہیں۔ لیکن میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔

میں دراصل اپنی ٹانگ کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں۔ وہ ٹانگ جو میری روح کا ایک حصہ تھی اور جو اب مجھ سے الگ کر دی گئی ہے۔ میں نے اسے کوریا میں دفن کر دیا ہے۔ ہندوستان کا یہ حقیر تحفہ کوریا کے ہزاروں کٹے پھٹے ہاتھوں پیروں اور ودھ سے بھری چھاتیوں کے انبار میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ جب میں واپس اپنے وطن پہونچوں گا تو میں ایک بے روزگار ہوں گا۔ اور میری بیوی مجھے دیکھ کر چیخ پڑیگی۔ وہ تو زار و قطار روئیگی۔ بلکہ میں اسے چپ بھی نہ کرا سکوں گا۔ میری کول بچی خوف سے میرے پاس نہیں آئے گی ——— اور اب تو وہ اتنی ہی بڑی ہو گئی ہوگی جتنی میری کٹی ہوئی مرحوم ٹانگ تھی

پھر تم میری جگہ آکر سوچو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ایک پیر کٹے شوہر کو بیوی کی اس فرد و چیخ سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ اور خود اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی خوفزدہ سہمی سہمی نظروں سے سینے پر کتنی بھاری بھاری سلگتی ہوئی دیواریں بیٹھ جاتی ہیں ——— میں نے ڈی ماب سپاہیوں کو فاقہ اور بیکاری سے مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں جب ہندوستان چھوڑ رہا تھا تو وہاں فاقہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں میرا کیا انجام ہوگا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ میری بیوی پہلے سے مریض ہے ——— اور اب میری کچی ہمارے خوابوں کے مطابق اعلیٰ تعلیم نہیں پائے گی ——— وہ تو شاید ابھی سے کہتی ہوگی:۔

امی ——— میں تو پہلی تاریخ تم کردی ——— ایں ——— متھائی؟ ——— اور ماں اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کو چوم لیتی ہوگی۔

اپنے گاؤں کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔ وہ چھوٹا سا کچی مٹی کا مکان۔ ننھا سا آنگن۔ آنگن کے بیچ میں امرود کا بوڑھا درخت اور اس کے نیچے چوڑے منہ کا کنواں۔ اور قریب ہی پوال چباتی ہوئی کھونٹے سے بندھی لال اور اجلے گھوں والی گھین گائے۔ میری بیوی۔ پتلی دبلی۔ ہر وقت ہونٹ چباتی ہوئی، برتن مانجتی اور بچی کے میلے کپڑے دھوتی ہوئی، ——— اور گاؤں کے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی میری کچی، ناک سڑسڑاتی، زبان نکالے ہوئے۔ گود میں کپڑے کی گڑیا دبوچے، اور پھر میری بوڑھی ماں کی چیخ۔ کنوئیں میں نہ گر پڑنے کی تاکید۔ اور کچی کا شرارتاً گر پڑنے پر اصرار ——— یہ سب باتیں یاد آرہی ہیں ——— یہ علم بھی کتنی حسرت اور کم نصیبی سے بھری ہوئی علم ہے۔

کچھ ہی دنوں بعد وہاں برسات آجائے گی۔ چھوٹے نالوں اور گہری گلیوں میں پانی بہنے لگے گا کہ معلوم ہوگا جیسے بوڑھا آدمی نکسیر پانی سے غرارہ کر رہا ہے۔ لڑکے ڈول پر کھیلنے لگیں گے۔ کھیتوں میں ہلوں کی نوک چل پڑیگی، اور خوب مینہ برسے گا مٹی کی خوشبو دھم دھم اڑیگی ——— ہنڈولے لگ جائیں گے اور سنتی ساریوں کی لمبی لمبی پنگیں اڑیں گی ——— اور میں جانتا ہوں، میری بیوی اپنی نرم ہتھیلیوں میں مہندی رچائے گی، اور میری کچی بھی مہندی لگانے کی ضد تمارے گی۔ اور شام کے وقت جب کڑوا تیل ملکر ہتھیلی سے مہندی چھڑائی جائے گی تو درخت کے کچے دودھ کی بو پھیل جائے گی، اور ماں مٹی کی ہتھیلیاں تھپ تھپ لیپ دیگی۔ چھوٹے بڑے خانی چپراغ کی طرح۔

لیکن تمہاری جان کی قسم، میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں اب ایک پیر کا آدمی ہوں۔ میری بیوی ایک ٹانگ کے شوہر کو کیا پائے گی؟ اب میری بچی کو کیا مل جائے گا۔ مجھ سے؟ لیکن میں یہ باتیں بھول کیوں نہیں جاتا؟ میں اپنے آپ کو ——— لیکن آخر میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہا ہوں بھلا؟

ہاں ——— میں آج بھی اپنے وطن سے، اپنے گاؤں، اپنی بیوی اور کچی سے محبت کرتا ہوں اور یہی چیز میرے جینے کی تمنا جگاتی ہے۔ لیکن اس جنگ اور موت کی دنیا میں جینے کا کیا فائدہ۔ کوریا میں کوئی لڑنا نہیں چاہتا۔ سب اپنے وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ گولیاں چلا رہے ہیں۔ خون بہا رہے ہیں، بم گرا رہے ہیں ——— ڈالر کی خدائی انسان کے اندر پلے ہوئے انسان کو مار رہی ہے ———!

دیکھو دیکھو ——— بیچارا جانسن زبان نکال کر مر گیا ہے۔ کوریا کی کھائیوں میں لاکھوں اور کروڑوں گولیاں دبی پڑی ہیں۔ جو اپنی جانوں کی کیسوں اور اگنداکی خوشبو سمیت دفن ہو گئی ہیں ——— وہ دو کوریائی عورتیں جو مجھے اس رات اندھیرے میں ملی تھیں، زخمی اور مردہ ——— ان کے درمیان ایک نوزائیدہ بچہ

جو خود اپنی بہار میں چھپ گیا تھا۔

میں یہ سب بھول جانا چاہتا ہوں ——— اور یہ کتنا خوفناک ہے، یہ سب کچھ؟

کرشن ——— تم نے جس کو اپنے قلم سے چھو دیا ہے وہ امر ہو گیا ہے۔ تم میری ٹانگ کو بھی اپنے قلم سے چھو دو۔ میں اپنی ٹانگ کو کوریا میں بطور یادگار چھوڑ رہا ہوں۔ تم ایک کہانی بطور تحفہ کوریا کو پیش کرو۔ میں جانتا ہوں تم اپنی کہانی سے جنگ کی دھارا موڑ سکتے ہو۔ تم اس خونی ناچ کو روک سکتے ہو۔ میری ٹانگ تو ختم ہو گئی۔ لیکن جو ٹانگیں اب تک سلامت ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ میری کٹی ہوئی ٹانگ کی کہانی سن لیں؟ کیا تمہیں کچھ اختلاف ہے؟

اگر تم چاہو تو جانسن کی محبوبہ کی، اس کے انار کی شاخ کی طرح لچکدار جسم کی، اس کی محبوبی کی، کوریا کی عورتوں کی، ان کے درمیان مسکراتے ہوئے مردہ بچوں کی، کھائیوں میں دفن جیالے گیتوں کی کہانیاں ساری دنیا کہہ سکتے ہو۔ اور کون باخبر انسان ہے۔ جو یہ کہانیاں سنکر کوریا میں جنگ کو روکنے کی قسم نہیں کھائے گا ——— تاکہ کوریا کے کھیلیانوں، کھیتوں، شعلوں میں جلتے ہوئے شہروں، گیتوں سے پاٹے ہوئے نالوں سے، پھر زندگی انگڑائی لیکر پر نکالے، لگائے، ناچے، ہنسے اور جھوم جائے۔

کیا تم اب بھی میری شہید ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے؟

اوہ ——— کاش یہ بات تمہارے قلم کے خون سے رچ کر ایک حسین سی کہانی بن جائے۔ تمہاری تخلیق کی دنیا میں، تمہارے فن کی کہکشاں میں پہنچ کر درد کی طرح جگمگا اٹھے۔ اس لئے کہ یہ بات، صرف بات نہیں، بلکہ ایک دکھی انسان کی، ایک نہیں لاکھوں دکھی انسانوں کی روح ہے ——— ان گنت نامراد آرزوؤں اور نا آسودہ خواہشوں کی روح ———!

اوہ! میرا پیر تڑپ رہا ہے ——— نرس، نرس۔ ہا ہا ہا ——— ڈاکٹر کیا کہا سرسام، ڈیلیریم ——— نونونو ——— مجھے سرسام نہیں ہو سکتا۔ میں جانسن کو، اس کی محبوبہ کی خون میں لتھڑی ہوئی تصویر کو، مردہ عورتوں، ان کے گیتوں، ان کے مسکراتے بچوں کو نہیں بھول سکتا ——— نہیں نہیں ——— مجھے سرسام نہیں ہے۔

میرے پیارے کرشن چندر، مجھے بچاؤ، دیکھو یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں ——— کہتے ہیں مجھے سرسام ہے! ——— کہتے ہیں میں کیمونسٹ ہوں۔ ——— کیمونسٹ؟

میں تو صرف ایک ایمبولنس ڈرائیور ہوں۔ جس کی ٹانگ کاٹ لی گئی ہے۔

کیا تم میری ٹانگ کے بارے میں کہانی نہیں لکھو گے؟

کیا تم میری دوسری ٹانگ کے لئے، میری بیوی کی مہندی رچی ہتھیلیوں کے لئے (لیکن اب وہ مہندی نہیں لگائے گی ——— وہ میری ٹانگ کا سوگ منائے گی نا؟)

میری بچی کی تتلاتی ہوئی شریر باتوں کے لئے ——— جنگ نہیں کرو گے۔؟

تم چاہو تو کیا نہیں کر سکتے۔

لیکن میں جانتا ہوں یہ خط سنسر کے بعد تمہیں نہیں پہونچے گا ——— یہ باتیں دل ہی میں دفن رہیں گی۔

نہیں، ڈاکٹر، مجھے سرسام نہیں ہے ———

——— نہیں نہیں نہیں ———!

شاعر

رفتار

(بین الاقوامی ادبی انتخاب)

ایک اسپینی نظم

پبلو نیرودا

آرزو

میں ہر آدمی کے لئے چاہتا ہوں
زمین، آگ۔ روٹی۔ گیہوں اور چینی
سمندر۔ کتابیں
یہی میری خواہش ہے وہ جرم لوگو
میں پاداش میں جس کی اب دربدر پھر رہا ہوں
مری جستجو میں ہیں غدار سرکار کے سب گرائے کے منصف
مرا نام جو جا بجا وہ
سدھائے ہوئے بندروں کی طرح کھوجتے ہیں

کوئی دن تھا میں خود بھی تھا ان کا ساتھی
وہ بھولی ہوئی صبح کا ریگ زار درخشاں
وہ اک کان در دازے پر جس کے میں بھی تو تھا ساتھ ان کے
مگر میں نے دیکھا
وہاں ـــــ جس گھڑی اپنے آفت زدہ بھائیوں کو
تو بے ساختہ چیخ اٹھا
بہت دیر تک اب نہ پہنو گے تم چیتھڑے میرے لوگو!
بہت دیر تک بھوکے پیاسے نہیں رہ سکو گے
اٹھو گے بہت جلد تم بن کے فرزند اپنے وطن کے
بنو گے تمہیں آخر کار ان جنگلوں کے مقدس خزانوں کے مالک
تمہارا بھی حصہ ہے دنیا کی رعنائیوں۔ راحتوں اور رنگینیوں میں

اور اب عورتیں اپنے بچوں کی خاطر
نہ آنسو بہانے پہ مجبور ہوں گی "

مگر ظلمت شب میں میری یہ آواز سن کر
حکومت کے فرزند جلا اٹھے تھے
وہ محنت کشوں کو کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے تھے
وہ کہنے لگے میری اس آرزو کی مذمت
مگر پھر بھی مجھکو یہ کامل یقیں تھا
تجھے بھی بہت جلد طاقت ملے گی۔
اسی واسطے چھوڑ کر میں نے ان نیم جاں اور بے روح کٹھ پتلیوں کو
دیا ساتھ لوگوں کا ـــــ محنت کشوں کا

میں اپنے وطن کو
وطن کے فلاکت زدہ ساتھیوں کے لئے چاہتا ہوں
اسی روز روشن کی خواہش ہے مجھ کو
وطن کی ہر اک راہ پر جو اجالے بکھیرے
مجھے چاہیئے روشنی اور ہل کی محبت
مری آرزو ہے کہ میں وہ لکیریں مٹادوں
انھوں نے جو نفرت سے کھینچی ہیں
لوگوں کو روٹی سے محروم کرنے کی خاطر

(ترجمہ۔ نرشی کماشاد)

پرکاش پنڈت

جائزے

(تبصرہ کے لئے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

(مندرجہ ذیل کتب تبصرے کیلئے موصول ہو چکی ہیں)

(۱) گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں (پیارے لال) مکتبہ جامعہ دہلی
(۲) نئی بیماری (ہند ناتھ) " "
(۳) آنک کے اس پار (فانح بخاری۔ رضا مہدانی) گوشۂ ادب لاہور
(۴) شتو لوک گیت " "
(۵) کیمیات اکبر الہ آبادی۔ بزم اکبر کراچی
(۶) کاروان منزل (گوپی ناتھ امن)
(۷) زندگی کے سائے (پال بک) لاجپت رائے اینڈ سنز دہلی
(۸) اردو (جگن ناتھ آزاد) دہلی کتاب گھر
(۹) جنوبی ہند میں دو ہفتے (" ") " " "
(۱۰) شیکسپیئر کی کہانیاں (ترجمہ سردار جعفری) کتب پبلشرز بمبئی

آپ کا بچہ، اس کی صحت اور پرورش ——— مصنف۔ ڈاکٹر پی راج مونگا

پبلشرز:۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی
قیمت:۔ تین روپے۔ صفحات (۲۷۵)

بچے کی پرورش اور اسے اس قابل بنانا کہ بڑا ہو کر وہ انسانی سماج کا ایک کار آمد رکن بن سکے، ایک ایسا آرٹ ہے جو سرمایہ دارانہ ملکوں میں بہت ہی کم نظر آتا ہے کسی بھی ملک کی بہبودی اور ترقی کے لئے اس ملک کے بچوں کا صحت مند اور دانش مند ہونا انتہائی ضروری ہے اور یہ مسئلہ حکومتوں کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بچوں کی پرورش اور تعلیم پر چند ہی توجہ نہیں دی جاتی۔ ابتدائی دور پر ہی کل کی تمام تر ذمہ داری ماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ اور ہمارے ملک کی بیشتر مائیں ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اس آرٹ سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ رسائل کی موجودہ معلومات اور تجربہ سے کام لینے کی بجائے ابھی تک ہمارے گھروں میں پرانے بوسیدہ رواج اور توہمات کے مطابق ہی بچے کی پرورش کی جاتی ہے۔ جس کے باعث ہزاروں معصوم جانیں ہر سال ضائع ہو جاتی ہیں۔ عام تعلیمی اداروں میں جہاں تعلیم کے بعض غیر ضروری پہلوؤں پر بہت زیادہ توجہ اور روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہاں اس آرٹ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ایک ان پڑھ ماں کے لئے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ بڑی بوڑھیوں کی مفید رائے یا محلہ ٹولہ کی دوسری عورتوں کی بنا سوچے سمجھے تقلید کرے۔ ——— ڈاکٹر مونگا کی اس کتاب نے اس کمی کو کافی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کتاب سے بھی صرف پڑھی لکھی عورتیں ہی پورا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ اس کتاب میں بچوں کی پرورش کے سلسلے میں روزمرہ کی پیش آنے والی دشواریوں کو سہل طریقوں سے حل کرنے کے گر بتلائے گئے ہیں۔ بچوں کی غذا اور ان کی دیگر ضروریات ان کا بناس ان کی عادات اور بیماری کی روک تھام کے طریقوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کچھ تصویریں اور نقشہ جات بھی دیئے گئے ہیں تاکہ ان طریقوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ ہم پڑھی لکھی عورتوں سے سفارش کرتے ہیں کہ بچوں کی پرورش اور تعلیم کے سلسلے میں بوسیدہ روایات اور توہمات کو ختم کرنے اور ماڈرن چائلڈ سائیکالوجی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں۔

پرانے خدا دوسرا ایڈیشن

مصنف کرشن چندر ——— پبلشرز:۔ مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی ——— قیمت ڈھائی روپے صفحات (۲۱۳)

"پرانے خدا" کرشن چندر کے بہت پہلے کے لکھے ہوئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جب بقول شخصے وہ رومان پسند زیادہ تھے اور حقیقت نگار کم اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس زمانے کے کرشن چندر اور آج کے کرشن چندر میں زمین آسمان کا فرق ہے آج کرشن چندر کے افسانے ہندوستان کی رنج بھری آواز ہیں۔ وہ بے انصافی، ظلم اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ہیں ہمارے فرض کا احساس دلاتے ہیں۔ اس بوسیدہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہماری تقدیس نفرت کو بھڑکاتے ہیں۔ اور امن بھائی چارے اور اشتراکی سماج کی تعمیر میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "پرانے خدا" کے افسانوں میں یہ صفات موجود نہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں دو ٹوک باتیں بہت کم کہی گئی ہیں۔ لیکن دو ٹوک باتوں کے بجائے طنز کے جس ہتھیار سے کام لیا گیا ہے یہ افسانے مقصد کے اعتبار سے بھی بھرپور ہیں اور ان میں کرشن چندر کی تخلیقی قوتیں بھی اپنی بلندی پر نظر آتی ہیں۔ کرشن چندر ہندوستان کا وہ واحد افسانہ نگار ہے جس کی ہر نئی اور پرانی چیز بڑے اشتیاق سے پڑھی جاتی ہے

شاہراہ بند نہ ہوگا

(۱۰) آپنے ہر خریدار سے ایک نیا خریدار بنانے کی پرخلوص اپیل کی تھی جس سے متاثر ہو کر میں نے جواب میں چار خریداروں کا وعدہ کیا تھا اور اب موقف میں ہوں کہ نہایت مسرت سے اسبات کا اظہار کردوں کہ وعدہ ایفائی کے وقت بجائے چار کے آٹھ خریداروں کے نام اور پتے روانہ کر رہا ہوں ——— مجھ سے زیادہ بہتر طور پر آپ جانتے ہونگے کہ ایک بھی خریدار بنانا کس قدر مشکل کام ہے اور پھر وہ بھی ایک ترقی پسند رسالے کے لئے جس کی مخالفت میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کوئی حربہ باقی نہیں رکھتی۔ میں شہر حیدرآباد میں صرف دو خریدار فراہم کر سکا۔ البتہ یہاں کے اضلاع میں میرے دوست ہیں۔ انکو میں نے بڑی محنت سے خریداری قبول کرنے پر آمادہ کر لیا ہے۔ ہر ایک کے نام بلا مبالغہ آٹھ آٹھ اور دس دس صفحات کے خطوط لکھے۔ ہندوستان کی سیاست کا پس منظر پیش کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کا ماضی، حال اور مستقبل بیان کرتے ہوئے۔ انسانیت کے نام پر اپیل کر کے انکو اخلاقی طور پر مجبور کرنے کے لئے میں نے جواب کیلئے ہر لفافے میں ایک ایک کارڈ اپنا پتہ لکھکر ڈال دیا تھا۔ اور میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ جس موثر انداز میں میں نے ان سے اپیل کی تھی۔ اسکا بہت اچھا اثر ہوا اور کسی نے بھی انکار نہیں کیا۔ ان خریداروں میں مختلف قسم، مختلف ذہنیت اور مختلف پیشوں کے لوگ ہیں۔ کوئی سرکاری دفتر میں ملازم ہے کوئی مدرس ہے، کوئی تاجر ہے۔ کوئی پولیس کا آدمی ہے۔ اور ایک دو پکے سرمایہ دار ہیں مگر ہیں تو ان کے دماغوں تک وہ منور روشنی پہنچانا ہے جس کو دیکھ کر یہ لوگ شاید اُس شاہراہ پر آجائیں جو زندگی کی حقیقی منزل تک پہنچتی ہے۔ حکومت شاہراہ سے ضمانت طلب کر سکتی ہے، "نقوش" کو بند کر سکتی ہے، اور سویرا سے اسکی ضیا پاشیاں چھین سکتی ہے مگر وہ کبھی بھی اس جاندار عوامی تحریک کو ختم نہیں کر سکتی جو آج دنیا کے کروڑوں افراد کے دل و دماغ میں جاگزیں ہے اور میری یہ حقیر سی کوشش اس جاندار عوامی تحریک کی حقیر سی خدمت ہے۔ (قادر جاوید، ۲۰۶ معظم پورہ، حیدرآباد۔ دکن)

(۱۱) یہ پہلے تین خریدار تو پیدا کر لئے میں نے جلد ہی آپکو اور دو چار خریدار دونگا۔ جیسے بھی ممکن ہو شاہراہ کو زندہ رکھئے۔ (زیڈ عابد شہابی۔ مالیگاؤں)

(۱۲) شاہراہ عوام کو راہ صداقت دکھا رہا ہے۔ اور عوام اسکے ساتھ ہیں بحیثیت شاعرہ اور یہ شاہراہ کی خدمت کرنا اپنا فرض تصور کرتی ہوں۔ اور اس کے لئے کوشاں ہوں۔ (سیدہ اختر۔ ننگلور)

(۱۳) یہ پڑھ کر ازحد دکھ ہوا کہ ہندوستان کا بہترین رسالہ "شاہراہ" خسارے میں جا رہا ہے۔ ابھی تک میں صرف ایک گاہک بنانے میں کامیاب ہوا ہوں کوشش جاری ہے۔ (مدھوش، رنبیر کٹیا۔ گجرات)

(۱۴) شاہراہ کا تحفظ ہمارا فرض اولین ہے۔ اور اگر ہمارا یہ محبوب رسالہ بند ہو گیا تو ہماری آواز پاک و ہند میں دب کر رہ جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ میری طرح آپ کی آواز پر ہر ساتھی لبیک کہہ اٹھے گا۔ آئندہ ماہ سے ایک کاپی میرے پتہ پر بھیج دیا کیجئے۔ ایک صاحب کا پتہ اور درج کر رہا ہوں۔ ان کے نام چھ ماہ کے لئے رسالہ جاری کر دیجئے۔ (عطاالرحیم۔ ایوان عطا۔ ایسے بم روڈ۔ کلکتہ)

(۱۵) مجھے شاہراہ بہت عزیز ہے۔ اور عوامی تحریکوں اور ان کے علمبرداروں کی حمایت میرا فرض ہے۔ میں جس ماحول میں زندگی گذار رہا ہوں وہ اگر بورژوا نہیں تو پیٹی بورژوا ضرور ہے۔ لہٰذا احباب سے کسی طرح کی توقع تحصیل حاصل ہے۔ البتہ آپ میرے نام رسالہ جاری کر دیجئے۔ "شاہراہ" سلامت رہے۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ (رفیق جابر۔ ان ٹک کارپینٹڈ، ایونگ ٹائمز، کراچی)

(۱۶) آپ کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ میں نے اپنے شاہراہ کے لئے دو نئے خریدار بنا لئے ہیں ——— شاہراہ کی آواز کسی طرح بند نہ ہونی چاہئے۔ یہ بھارت اور پاکستان کے ۵، فیصدی عوام کے خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی خاموشی انفرادی نہ ہوگی۔ بلکہ ۵، فیصدی عوام کی آواز گھٹ کر رہ جائے گی۔ اس وقت کوئی بھی شخص آپ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا جبکہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی زہریلی ہوائیں اس کشتی کو غرق کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور دریا کی ہر موج اس کو سینہ میں ڈبونے کے لئے بے چین ہے۔ آپ اس کشتی کو مردانگی کیساتھ ساحل کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں ——— میں شاہراہ کا خادم ہوں اور اسکی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔ (یونس پرویز، ۱۰ ای۔ آر۔ انٹر کالج، اعظم گڑھ، یوپی)